اوٹین کریم اور سنو



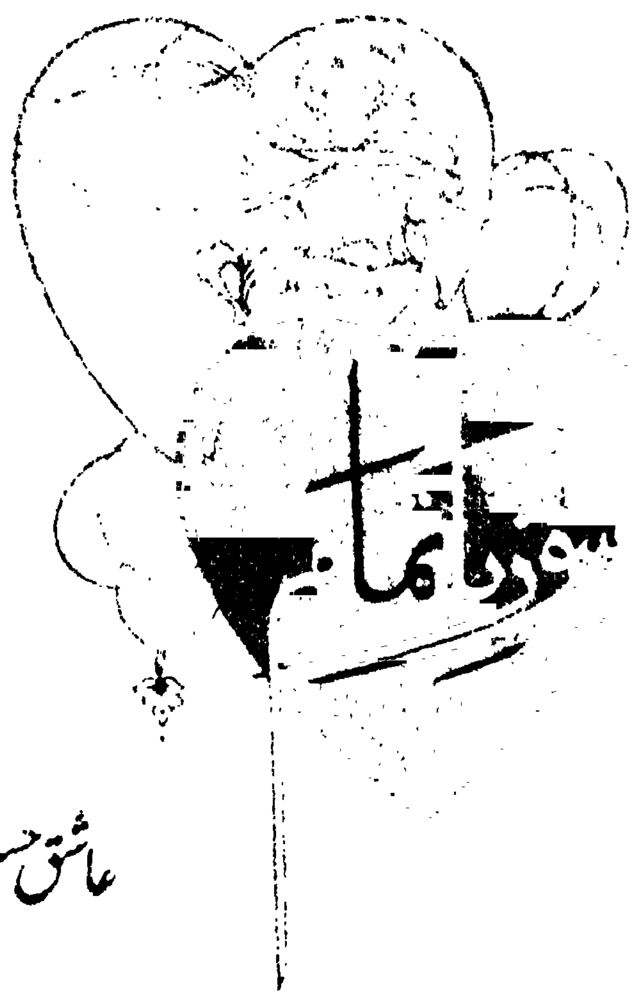
فلم اور سٹیج کے درخشاں ستاروں کے رنگ و روپ کو پائدار بنانے کے لئے بہت احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے اس کے لئے اعصاب اور پٹھوں کی صفائی پرورش کے لئے خوراک اور زندگی بخش طریقوں کی ضرورت ہوتی ہے۔

اوٹین کریم اس بلند معیار کی تمام حاجتوں کو پورا کرتی ہے۔ یہ مسام سے فالتو مواد کو خارج کرتی ہے ان کے بند ہو جانے کو روکتی ہے اور اس طرح جلد کو ہوا سے پورا فائدہ اٹھانے کا موقع دیتی ہے اس سے جلد کی دونوں طرف کے سوراخوں کی پرورش ہوتی ہے۔ جلد کے نیچے خون کے جو ننھے ذرے موجود ہوتے ہیں اس سے وہ تازہ ہو جاتے ہیں اور خون کی گردش صحت کے صحیح اصولوں کے مطابق ہوتی ہے اور رنگ و روپ میں جوانی کی تازگی لوٹ آتی ہے۔

ہر روز سوتے وقت اوٹین کریم کی مالش سے چہرے اور گردن کے اعصاب زور حاصل کرتے ہیں۔ یہ کریم جلد کو ڈھیلا ہونے یا اس پر جھریاں پڑنے سے بچاتی ہے اور بہت آسانی سے قدرتی طور پر نیند کے دوران میں آپ کے حسن میں ایک نئی زندگی لاتی ہے۔

دن کے وقت اوٹین سنو کے استعمال سے ایک ٹھنڈک پہنچتی ہے اور حسن کو دن بھر دھوپ، ہوا، گرد اور پسینے سے محفوظ رکھتی ہے۔

خوبصورتی کو بڑھانے اور قایم رکھنے کے لئے صرف ان دو چیزوں کی ہی ضرورت ہے۔



عاشق حسین بٹالوی

ناشر

ادبی دنیا، لاہور

قیمت

عہ

۸ر

ادبی دنیا جنوری ۱۹۳۹ء

فہرست مضامین ادبی دنیا لاہور

بابت ماہ جنوری ۱۹۳۹ء

جلد ۱۷ — تصویر: پریم بندھن — نمبر ۱

چندہ سالانہ مع محصول ڈاک اور وی پی پانچ روپے۔ ممالک غیر سے دس شلنگ

جیلانی الیکٹرک پریس ہسپتال روڈ لاہور میں باہتمام صلاح الدین احمد پرنٹر پبلشر چھپ کر دفتر رسالہ ادبی دنیا مال روڈ لاہور سے شائع ہوا۔

بزم ادب

ناظرین ادبی دنیا کو نیا سال مبارک ہو اور اس سال وہ اپنے ارادوں اور آرزوؤں میں بیش از بیش کامیابی حاصل کریں!

ادبی دنیا کو سال گذشتہ کے آخری حصہ میں نمایاں ترقی حاصل ہوئی اور ہم اپنے ناظرین اور قلمی معاونین کے ممنون ہیں کہ انہوں نے اپنے تعاون سے ہماری ناچیز خدمات کی عملی داد دی۔ اس دفعہ کا سالنامہ خصوصیت سے کامیاب رہا۔ اور اہلِ ذوق اصحاب نے اس کی یہاں تک قدردانی فرمائی کہ ہمیں اب اس کا دوسرا ایڈیشن چھاپنا پڑا ہے جو چند روز تک طباعت کے مرحلہ سے گذر کر شائع ہو جائے گا۔ سالنامہ ادبی دنیا کے تمام مستقل ناظرین کی خدمت میں مفت پیش کیا جا رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ معمولی چندے میں عام پرچوں کے علاوہ اتنا ضخیم اور حسین مجموعہ بلا قیمت نذر کرنا بڑی بھاری مالی قربانی کا طالب ہے۔ لیکن ہم یہ بارِ گراں اس امید پر برداشت کئے لیتے ہیں کہ ہمارے ناظرین نہ صرف اپنی ذاتی سرپرستی جاری رکھیں گے بلکہ اپنے حلقۂ اثر میں ادبی دنیا کو مقبول بنانے میں ہماری مدد کریں گے۔ سالنامہ تمام ناظرین کی خدمت میں بذریعہ رجسٹری ارسال کیا جا رہا ہے۔ کیونکہ رجسٹری کے بغیر بھیجنے میں پرچے کے گم ہو جانے کا شدید خطرہ ہے۔ ہم نے ایک مطبوعہ چٹھی کے ذریعے سب مستقل خریداروں سے درخواست کی تھی کہ وہ رجسٹری کے لئے تین تین آنے کے ٹکٹ ارسال کر دیں۔ جن صاحبوں نے مطبوعہ فارم کے ساتھ ٹکٹ مرحمت فرمائے ان کی خدمت میں سالنامہ روانہ کر دیا گیا ہے اور جن اصحاب نے ابھی تک توجہ نہیں کی اُن کا سالنامہ محفوظ ہے۔ جب چاہیں ہمارے مطبوعہ فارم کے مطابق رجسٹری کے ٹکٹ بھیج کر طلب فرما سکتے ہیں۔

انعامی مضامین سالنامے کے انعامی مضامین کے سلسلے میں انعامات کا اعلان ہمیشہ دیر سے ہوتا رہا ہے۔ لیکن اس دفعہ ہمیں مسرت ہے کہ یہ فیصلہ بہت جلد ہو گیا۔ تفصیل ملاحظہ فرمائیے۔

علمی مضمون سالنامے کے بہترین علمی مضمون کے لئے ہمارے معزز دوست ملک عطاء اللہ صاحب کلیم ایم۔ اے اسسٹنٹ کنٹرولر ملٹری اکاؤنٹس نے منصور احمد مرحوم کی یاد میں پچھلے برس ایک طلائی تمغہ کی بنیاد رکھی تھی۔ یہ تمغہ اس سال اردو کے نوجوان ادیب میراجی کو اُن کے مضمون "ودیاپتی اور اس کے گیت" پر دیا جانا قرار پایا ہے۔

واضح رہے کہ میراجی کا یہ مضمون جس وقت وصول ہوا تھا اس وقت تک وہ ادبی دنیا کے سٹاف میں شامل نہیں ہوئے تھے۔ اس لئے یہ انعام انہیں مضمون نگار کی حیثیت میں مل رہا ہے۔

منصور گولڈ میڈل کے علاوہ مندرجہ ذیل نقد انعامات ادارۂ ادبی دنیا کی طرف سے دئیے جا رہے ہیں۔

صاحبِ مضمون	مضمون	انعام
۱۔ منشی پیارے لال صاحب شاکر میرٹھی	"جرمن نسل کا ایک اردو شاعر" (ادبی مضمون)	پندرہ روپے
۲۔ کرشن چندر صاحب ایم اے	"جنت اور جہنم" (افسانہ)	دس روپے

صاحب مضمون	مضمون	انعام
۳۔ سید فیاض محمود صاحب ایم اے	"نشتر" (افسانہ)	دس روپے
۴۔ راجندر سنگھ صاحب بیدی	"من کی من میں" (افسانہ)	سات روپے
۵۔ جناب وقار انبالوی	"پنگھٹ" (افسانہ)	سات روپے
۶۔ جناب طاہر قریشی	"قبرستان کی ساحرہ" (ترجمہ شدہ افسانہ)	سات روپے
۷۔ راجہ فاروق علی خاں صاحب	"بدلا ہوا زمانہ" (ڈرامہ)	دس روپے
۸۔ جناب قیوم نظر	"ساقی نامہ" (نظم)	سات روپے
۹۔ جناب اسد ملتانی	(غزل)	پانچ روپے

{ رہیں نہ رند یہ واعظ کے بس کی بات نہیں
تمام شہر ہے دو چار دس کی بات نہیں }

بہترین طبعزاد افسانے کے لئے فقط ایک انعام دس روپے کا مقرر تھا۔ لیکن اس بار افسانوں کا معیار کچھ اتنا بلند رہا کہ جی چاہتا تھا کہ ہر افسانے پر انعام دیا جائے۔ آخر بڑی مشکل سے چار افسانے منتخب کئے گئے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ جن افسانوں اور مضامین پر انعام نہیں ملا وہ کسی لحاظ سے کم درجہ کے تھے۔ بلکہ اس کی وجہ محض ہماری جیب کی تنگی ہے۔ ہمارا بس چلتا تو ہر

مضمون اور ہر نظم کے لئے معقول نذرانہ پیش کرتے۔ لیکن یہ خواب اس لئے شرمندۂ تعبیر نہیں ہوتا کہ بلند پایہ اردو رسائل کی اشاعتیں بہت محدود ہیں۔ اور ذرائع محدود تر۔ اکثر کھاتے پیتے لوگ بھی رسائل مانگ کر پڑھتے ہیں، خرید کر نہیں پڑھتے۔ پھر خریدار کیوں کر بڑھیں اور رسائل اپنے مضمون نگاروں کی خدمت میں معاوضے کہاں سے پیش کریں۔ بہر حال یہ ایک طویل داستانِ الم ہے۔ جس کی شرح فرصت اور صبر دونوں کی طالب ہے جو ہمیں اور آپ کو میسر نہیں۔

سرِ دست ہم نے طے کیا ہے کہ آئندہ اشاعت سے ہر نمبر کے بہترین مضمون اور بہترین طبعزاد افسانے کے لئے دس دس روپے اور ترجمے کی صورت میں سات روپے) کے دو انعامات پیش کئے جائیں۔ بعض احباب کو انعام کے لفظ پر اعتراض ہے اس لئے ہم اس کی بجائے ہدیہ کہتے ہیں۔ تو تجویز یہ ہے کہ بیس روپے ماہوار معاوضے کی صورت میں نہیں بلکہ ہدیہ کے طور پر پیش کئے جائیں سالنامے کے انعامات ان کے علاوہ ہیں۔ کبھی کبھار کسی اچھی سی نظم کے لئے بھی ہدیہ پیش کیا جائے گا۔

ہمیں امید ہے کہ یہ چھوٹا سا قدم جو ادبی دنیا آج اٹھا رہا ہے ہمارے ناظرین کی توجہ اور عملی امداد کی بدولت کسی دن ایک معقول پیش قدمی کی صورت اختیار کرے گا اور ہم اس قابل ہو جائیں گے کہ اُدباء اور اہلِ علم اصحاب کی کچھ خدمت کر سکیں۔ آمین!

ہمارے بعض کرمفرماؤں نے سالنامے کے متعلق اپنی قیمتی آراء کا اظہار کیا ہے۔ یہ آراء کئی پہلوؤں سے دلچسپ ہیں اس لئے ہم نے ارادہ کیا ہے کہ ان صاحبوں کے خطوط کے خلاصے آئندہ نمبر سے شائع کرنے شروع کر دیں۔ اس سے یہ فائدہ مقصود ہے کہ ہمارے قلمی معاونین اپنے آپ کو ہمارے ناظرین کے آئینوں میں دیکھنے لگ جائیں صرف ہماری پسند اور ناپسند پر انحصار نہ رکھیں۔

صلاح الدین احمد

آئینۂ عالم

انگریزی زبان کی عالمگیر حیثیت

"انگریزی زبان صرف اتنے ہی علاقے میں بولی جاتی ہے جس کی وسعت ہمارے اس جزیرے تک ہی محدود ہے۔ نہیں بلکہ یہاں بھی کلیتہً انگریزی نہیں بولی جاتی"۔

یہ تحریر ۱۵۸۲ء کی ہے۔ اس کا لکھنے والا مرچنٹ ٹیلر سکول کا ہیڈ ماسٹر رچرڈ ملکاسٹر تھا جو عرصے میں ایڈمنڈ سپنسر کا اُستاد اور انگریزی کے اولین قواعد دانوں میں سے تھا۔ اس تحریر کے وقت انگریزی بولنے والوں کی تعداد چالیس اور پنتالیس لاکھ کے درمیان تھی۔ اور یہ دوسری یورپین زبانوں کے مقابلے میں پانچویں درجے پر تھی۔ فرانسیسی جرمن، اطالوی اور اسپینی زبانیں تدریج اس سے بلند درجوں پر تھیں۔ لیکن اُنیسویں صدی کے وسط میں انگریزی اول درجے پر پہنچ چکی تھی اور آج کل تو یہ اس قدر مقبول ہو چکی ہے کہ دوسرے اور تیسرے درجے یعنی روسی اور جرمن زبانوں کے بولنے والوں کی مجموعی تعداد بھی اس کے بولنے والوں کی تعداد کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

یہ نہ صرف یورپ ہی میں اولین درجے پر ہے۔ اور دنیا کے دو عظیم ترین براعظموں کی واحد زبان ہے بلکہ ان کی حدود سے پرے دوسرے آباد ترین علاقوں کے باشندوں کے لئے اُن کی اپنی زبان کے علاوہ ترجمانی کا واحد ذریعہ ثابت ہو رہی ہے۔ دنیا بھر کی مجموعی ڈاک کا ¾ حصہ اسی زبان میں لکھا جاتا ہے۔ دنیا کے نصف سے زیادہ اخبارات اسی زبان میں شائع ہوتے ہیں۔ اور دنیا کے ⅗ ریڈیو اسٹیشن اسی زبان کو استعمال کرتے ہیں۔ کسی جہاز کا کپتان انگریزی جانے بغیر سمندر کا سفر نہیں کر سکتا۔ یورپ سے باہر ہر وہ زبان جو ابھی تک اس کے راستے میں قائم ہے (مثلاً اسپینی زبان لاطینی امریکہ میں، اطالوی زبان لیونٹ میں اور جاپانی زبان مشرق بعید میں) صرف ان رعایات کی وجہ سے قائم ہے جو وہ انگریزی زبان سے روا رکھ رہی ہے۔ انگریزی کے ان گنت الفاظ اور فقرے ان زبانوں میں رائج ہوتے چلے جا رہے ہیں اور جاپانی میں تو ان الفاظ کی اتنی بہتات ہو گئی ہے کہ ان کی تشریح کے لئے خاص لغات شائع ہونی شروع گئی ہیں۔ اس کے علاوہ انگریزی زبان فرانسیسی میں، سیاسی گتھیاں سلجھانے کے لئے اور جرمن زبان میں سائنس کے معموں کو حل کرنے کے لئے نہایت اہم حیثیت سے داخل ہو رہی ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ دنیا کی کوئی اور زبان بنی نوع انسان کی اتنی بڑی تعداد کے لئے ذریعۂ ترجمانی نہیں ہے۔ رُوس کی پندرہ کروڑ آبادی میں سے صرف آٹھ کروڑ باشندے اپنی مرضی سے روسی زبان استعمال کرتے ہیں اور باقی وہ لوگ ہیں جن میں قریباً ایک سو مختلف زبانیں رائج ہیں۔ اور رُوس سے باہر تو کوئی شخص بھی روسی زبان نہیں بولتا کیونکہ اس کی نو آبادیاں بھی بلا استثنا، حدود ملک کے اندر ہی واقع ہیں۔ اس کے بعد جرمن زبان کا درجہ ہے۔ اندرونِ ملک میں ساڑھے چھ کروڑ باشندے جرمن زبان بولتے ہیں۔ ستر لاکھ آسٹریا میں۔ تیس لاکھ جرمن سوئٹزرلینڈ میں، قریباً پچاس لاکھ جرمنی اور آسٹریا کے کھوئے ہوئے علاقوں میں، قریباً پچاس لاکھ روس کے جرمن زبان بولنے والے مقبوضات میں جن میں بلقان اور ریاستہائے بالٹک شامل ہیں۔

ان سب کا میزان آٹھ کروڑ پچاس لاکھ سے نہیں بڑھتا۔ اس کے بعد یقینی طور پر معلوم نہیں کہ فرانسیسی کا درجہ ہے یا اسپینی زبان کا لیکن ان دونوں میں سے کسی ایک کے بولنے والوں کی تعداد ساٹھ



پانچ کروڑ سے زیادہ نہیں۔ اس کے بعد اطالوی زبان کا نمبر آتا ہے۔ اور پھر باقی یورپی زبانیں کسی شمار و قطار میں نہیں آتیں۔ ایشیا میں بھی انگریزی کا کوئی رقیب نہیں ہے کیونکہ اگرچہ چینی زبان تیس کروڑ انسانوں کی زبان ہے لیکن چین کے مختلف علاقوں میں زبان کا اتنا اختلاف ہے کہ چینی کو ایک زبان نہیں بلکہ بہت سی زبانوں کے ایک گروہ پر مشتمل سمجھنا چاہیئے۔

چنانچہ انگریزی اس دوڑ میں سب پر سبقت لے گئی ہے۔ اور ابھی سرعت کے ساتھ دُور دراز علاقوں میں پھیلتی جا رہی ہے۔ ایک وہ وقت تھا کہ فرانسیسی زبان تمام مسیحی ممالک کی ثانوی زبان تسلیم ہو گئی تھی جیسا کہ اس سے قبل لاطینی تھی۔ اور اس وقت بھی اس زبان کو سیکھنے والوں کی تعداد ان لوگوں سے بہت زیادہ ہے۔ جن کے لئے یہ بمنزلہ مادری زبان کے ہے۔ لیکن بالشویک۔ جو حقیقت پرست واقع ہوئے ہیں۔ اس کی بجائے انگریزی اور جرمن زبانوں کو مروج کر رہے ہیں۔ جرمنی، سکنڈنیویا اور جاپان کے سکولوں میں انگریزی کی تعلیم باقاعدہ دی جا رہی ہے اور حقیقت تو یہ ہے کہ خود فرانسیسی بھی اس سے بہرہ ور ہو رہے ہیں۔

صحیح طور پر اس بات کا اندازہ لگانا کہ انگریزی نے دُنیا کی ثانوی زبان کی حیثیت سے کہاں تک ترقی کر لی ہے آسان نہیں ہے۔ لیکن چند حقائق اور اعداد و شمار اس پر کسی حد تک روشنی ضرور ڈال سکتے ہیں۔

بلجین قونصل جنرل مقیم ٹوکیو ہامرے کے خیال کے مطابق "جاپان میں انگریزی زبان کا علم ہر یورپین کے لئے لابدی ہے۔ جاپان میں جاپانی زبان کے بغیر گذارہ ہو سکتا ہے لیکن اگر انگریزی زبان سے لاعلمی ہو تو انسان کے لئے کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔ انگریزی جاپان کی تجارتی زبان ہے۔" چین میں سالہا سال سے اس کا سکہ رواں ہے اور ہندوستان میں اگرچہ بہت کم باشندے لکھ پڑھ سکتے ہیں۔ لیکن انگریزی نہ صرف ان کی کاروباری زبان ہے بلکہ سیاسیات کی زبان بھی یہی ہے۔

یہ بات بہت حد تک قرین قیاس ہے کہ دنیا کے طول و عرض میں قریباً بیس کروڑ آدمی انگریزی کو اپنی ثانوی زبان کی حیثیت سے بولتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ان میں سے اکثر صحیح طور پر بول نہیں سکتے لیکن اپنا مطلب ضرور واضح کر سکتے ہیں۔

اس کی ترویج کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ انگریز قوم کے افراد ہر جگہ پھیلے ہوئے ہیں۔ انگریز زمانۂ حال کے سب سے بڑے سیاح، جان جوکھوں میں ڈالنے والے سوداگر اور بڑے جفاکش آبادکار ہیں۔ اس کے علاوہ ان میں یہ کمزوری ہے کہ وہ دوسری زبانوں کے سیکھنے میں عموماً اہل ہیں اور اپنی زبان کو ہر ملک میں ترجمانی کا واحد ذریعہ بناتے ہیں۔

لیکن ان کے علاوہ انگریزی کی مقبولیت کی کچھ اور وجوہات بھی ہیں اور وہ یہ کہ جب اس کا مقابلہ دوسری بلند پایہ زبانوں سے کیا جاتا ہے تو یہ صرف اپنی تعداد اور ناقابل مصالحت خصوصیات کی وجہ سے نہیں بلکہ جیسا کہ جیکب گرم نے آج سے ایک صدی قبل کہا۔ اپنی "وسعت الفاظ و معانی اور اختصار کی خوبیوں کے بل پر جیت جاتی ہے اور اس حیثیت سے دنیا کی کوئی زبان اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔" اس پر ڈاکٹر جیسپرسن ان الفاظ کا اضافہ کرتے ہیں کہ "انگریزی زبان مجھے بدرجہ غایت مردانہ زبان معلوم ہوتی ہے۔ جانمردوں کی ایسی زبان جس میں طفولیت یا نسوانیت کا شائبہ تک نہیں۔" اور اس کے بعد اس کی خصوصیات یوں بیان کرتے ہیں۔" انگریزی سادہ اور آسان ہے۔ اس کی اصوات صاف ہیں۔ اس کے الفاظ اپنی اپنی جگہ گٹھے ہوئے ہیں۔ ان کی ترتیب منطقیانہ ہوتی ہے۔ اور تفاخرانہ ہزلیات سے منزہ۔ اس کی صرف یہی ایک سادگی کیا کم ہے کہ صیغہ ہائے تذکیر و تانیث کی ضرورت نہیں پڑتی اور پھر مخاطب کے لئے صرف ایک ضمیر یعنی You کا اختصار۔

جب معلمین انگریزی کی خوبیوں پر وعظ کہتے ہیں تو ہمیشہ اس کی لغت کی وسعت سے ابتدا کرتے ہیں۔ جو دوسری تمام زبانوں کے مقابلے میں کم از کم دگنی ہے۔ لیکن غیروں کے دلوں کو مسخر کرنے والی یہ چیز نہیں ہے۔ بلکہ اس کے برخلاف لغت کی وسعت انہیں ڈرا دیتی ہے اور اس طرح وہ حتی المقدور مبادیات کے نزدیک ہی رہتے ہیں۔ اور مبادیات کی سادگی اور اختصار ہی وہ شے ہے جو اُن کے دلوں کو مسخر کر لیتی ہے۔

انگریزی نے لاطینی کی لمبی اور طویل ترکیبوں کو اس اختصار کے ساتھ اپنایا ہے کہ اب اُن کی وضع و قطع سے اُن کی لاطینی اصل ظاہر نہیں ہوتی بلکہ وہ خود انگریزی کے چھوٹے چھوٹے الفاظ بن کر رہ گئی

ہیں اور جتنے سہ حرفی اور چار حرفی الفاظ انگریزی میں موجود ہیں۔ یورپ کی کسی دوسری زبان میں موجود نہیں ہیں۔ انگریزی کا کوئی چھوٹا سا مقولہ لیجئے۔ اور پھر اُس کے تراجم دوسری زبانوں میں دیکھئے۔ جس سادگی، عمدگی اور اختصار کو آپ انگریزی میں پائینگے اس کی مثال کسی دوسری زبان میں نظر نہ آئے گی۔

کچھ عرصہ ہوا امریکہ کے ایک محقق لسانیات ڈاکٹر والٹر کرکونل نے اس بات کا حساب لگایا کہ مرقس کی انجیل کے چالیس مختلف زبانوں کے تراجم میں سے ہر ایک میں کتنے کتنے اجزائے لفظی استعمال ہوئے ہیں ان تراجم میں فارسی، ہندوستانی، انگریزی اور فرانسیسی ترجمے بھی شامل تھے۔ اس امتحان میں بھی انگریزی زبان اول نمبر پر رہی کیونکہ اس میں صرف ۲۹۰۰۰ اجزائے لفظی استعمال ہوئے تھے۔ ٹیلیوٹانی زبانوں میں اوسطاً ۳۲۶۵۰، سلافی زبانوں میں ۳۶۵۰۰، لاطینی گروہ میں ۴۰۲۰۰ اور ہندی ایرانی گروہ میں جس میں بنگالی، فارسی، سنسکرت وغیرہ شامل ہیں ۴۳۱۰۰ اوسط رہی۔

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ فرانسیسی بڑی لطیف اور میٹھی زبان ہے۔ اطالوی یا ہسپانوی زبانوں کے مقابلے میں واقعی اسے لطیف تر کہا جا سکتا ہے لیکن جب اس کا مقابلہ انگریزی سے کیا جائے تو اسے مجبوراً کرخت کہنا پڑے گا کیونکہ جس کام میں فرانسیسی کو چھتیس ہزار اجزائے لفظی استعمال کرنے پڑے اسے انگریزی نے صرف انتیس ہزار میں نباہ دیا۔

عام تعلیم یافتہ غیر ملکی اسے اتنا آسان سمجھتے ہیں کہ اسے بچوں کے نرم و نازک الفاظ سے تشبیہ دیتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ جب وہ اُسے بولنے کے بعد اس کے لکھنے اور پڑھنے کی طرف آتے ہیں تو اُن کا خیال بدل جاتا ہے۔ کیونکہ انگریزی کے بعض ہجے خلاف عقل و قیاس ثابت ہوتے ہیں۔ لیکن جہاں تک اس کے بولنے اور سمجھنے کا تعلق ہے لوگ اس کے استعمال سے مطمئن ہیں۔

دُنیا کا سرد ترین شہر

سائنس کی جدید ترین تحقیقات نے دنیا کے سرد ترین شہر کا کھوج نکال لیا ہے۔ آج سے کچھ عرصہ پہلے مشرقی سائبیریا کے ایک شہر ورخویانسک کو سرد ترین مقام سمجھا جاتا تھا جہاں تھرما میٹر میں پارہ جم کر رہ جاتا ہے۔ لیکن حال کی تحقیقات سے واضح ہوا ہے کہ دنیا کا سرد ترین شہر آئی میکون ہے جو اول الذکر شہر سے کئی سو کلو میٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔

اس جگہ کا درجہ حرارت منفی ۱۰۲ فارن ہائیٹ سے بھی کم ہے اور سردی اس قدر زیادہ ہے کہ اگر بالٹی میں سے پانی گرایا جائے تو وہ عام قاعدے کے مطابق زمین پر بہتا نہیں بلکہ گرنے کے دوران میں یخ بستہ ہو جاتا ہے اور زمین کے ساتھ ٹکرا کر ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر جاتا ہے۔

باوجود اس قدر سردی کے وہاں کے لوگ موسم سرما میں کبھی کوئی خاص تکلیف محسوس نہیں کرتے کیونکہ ہوا کی غیر معمولی خشکی اور فضائی سکون حالات کو قابل برداشت بنا دیتے ہیں۔ چنانچہ انہیں وجوہ کی بنا پر آئی میکون کے باشندے بغیر کسی خاص اہتمام کے سائبیریا کے عام لباس پہنے ہوئے اپنے کاروبار میں مصروف نظر آتے ہیں۔

یہ لوگ بہت کم سفر کرتے ہیں اس لئے دوسرے لوگوں کے ساتھ اپنی زبوں حالی کا مقابلہ کرنے کا انہیں موقع نہیں ملتا۔ ایک یا دو سال کا عرصہ ہوا کہ اس علاقے کے چند آدمی کسی سرکاری کام کے ضمن میں ماسکو بلائے گئے تھے جو اگرچہ اُن کے شہر کے مقابلے میں بہت گرم ہے لیکن اس کے ساتھ ہی مرطوب بھی ہے۔ نووارد سردی کی شدت سے چلا اٹھے۔ اور کئی زکام میں مبتلا ہو کر بیمار پڑ گئے۔

مشہور لوگوں کے کمالات

حال ہی میں یہ خبر سنی گئی تھی کہ برلن کے ایک صاحب ڈاکٹر پال ہمتھ بے مثال حافظہ کا نمونہ ہیں کیونکہ وہ ایک سُنی ہوئی تقریر یا کسی ملاقات کی گفتگو اس کے وقوعے سے کئی گھنٹے بعد لفظ بہ لفظ سنا دیتے ہیں۔ اُن کی اس قابلیت نے قدرتی طور پر ہر سننے والے سے خراج تحسین وصول کیا ہے۔

کہتے ہیں کہ اکتساب کمال، کامیابی، قابلیت اور امامت کا طغرائے امتیاز ہے۔ ہمارے بیشتر ہندوستانیوں کی ایسی کئی درخشاں

مثالیں ہیں۔ جو اس امتحان میں پوری اُترتی ہیں۔

سر فیروز سیٹھنا اپنے غیر معمولی حافظے کی وجہ سے بجا طور پر مشہور تھے۔ کیونکہ آپ کسی جلسے کی تقریر پہلے تو لکھا دیتے تھے اور پھر اُس کے کئی گھنٹے بعد اور بعض اوقات کئی دن بعد وہی تقریر لفظ بہ لفظ جلسے میں کر دیتے تھے۔

سر سریندر ناتھ بینرجی کا حافظہ بھی نہایت حیرت انگیز تھا۔ کہتے ہیں۔ کہ احمد نگر کانگریس کا صدارتی خطبہ آپ نے جلسے کے انعقاد سے دو ماہ قبل طباعت کی غرض سے مجلس استقبالیہ کو بھیج دیا تھا۔ صاحب موصوف کو اُس کا طبع شدہ نسخہ اُس وقت ملا جب وہ دیگر حاضرین جلسہ کو تقسیم کیا گیا۔ لیکن سامعین کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب انہوں نے دیکھا کہ سر سریندر ناتھ نہ صرف لفظ بلفظ کی مطابقت کے ساتھ بلکہ ایک ایک کومے کے وقفے کی صحت کے ساتھ اپنا خطبہ حافظے کے بل پر سُنا رہے ہیں۔

مولانا محمد علی مرحوم کو نہ صرف برسوں کی پڑھی ہُوئی کتابوں کی سطروں کی سطریں اور ابواب ازبر تھے بلکہ آپ اُن مضامین کے صفحوں کے نمبر بھی بتا دیا کرتے تھے۔

اس ضمن میں مسٹر سچدانند کا نام بھی خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ جن کی لائبریری بہ کمال حفاظت اُن کے دماغ میں محفوظ ہے۔

میں نے سُنا ہے کہ گوپال کرشن گوکھلے آنجہانی اعداد و شمار کے بڑے شیدائی تھے۔ اگر ایک مرتبہ آپ اعداد و شمار کی تفصیلات کو دیکھ لیتے تھے تو پھر اُن کے ذہن سے اُترنے کا کوئی امکان نہ رہتا تھا اگرچہ آپ بطور احتیاط انہیں اپنی پاکٹ بک میں بھی لکھ لیتے تھے۔ لیکن ان تحریروں سے یادداشت کا مقابلہ کرنے کی نوبت کبھی نہ آتی تھی۔ لارڈ مسٹن اس امر کی تصدیق کرتے ہیں کہ گوکھلے کے حافظے نے کسی ایک موقعہ پر بھی اُن کو دھوکا نہیں دیا حالانکہ ان کے ماتحت ضخیم رجسٹروں اور بڑی بڑی مسلوں کو لئے ہر ایسے موقع کی تلاش میں رہتے تھے۔

چھوٹی چھوٹی تفصیلات کے یاد رکھنے میں ڈاکٹر بدھان چندر رائے کی یادداشت بے مثال ہے آپ کسی واقعے کی تفصیلات جو برسوں پہلے وجود پذیر ہوا ہو ایسی صحت کے ساتھ بیان کرتے ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ مثلاً آپ کو یہ بھی بتا سکتے ہیں کہ اُس وقت ہوا کس سمت کو چل رہی تھی۔ اس وقت آپ کیسا لباس پہنے ہوئے تھے۔ اور کس طرح ہوا کے ایک جھونکے نے آپ کا ایک کاغذ اُڑا کر آپ کا مزاج برہم کر دیا تھا۔ اور اس طرح کی بے شمار تفصیلات۔ ڈاکٹر رائے اُن گنتی کے چند اطبا میں سے ہیں جنہیں اپنی ڈائری دیکھے بغیر برسوں کے دیکھے ہوئے مریض کے حالات کمال صحت کے ساتھ یاد آجاتے ہیں۔

ریاست میسور کے دیوان سر مرزا اسمٰعیل تفصیلات کے یاد رکھنے میں امتیازی درجہ رکھتے ہیں۔ اگر ایک مرتبہ آپ کسی ایسے محکمے کی مسل ملاحظہ کر لیں جس کے حالات کے متعلق آپ قطعاً کچھ نہ جانتے ہوں۔ تو جب کبھی وہ اس محکمے کا جائزہ لینے جائینگے۔ اُن تمام تفصیلات کو زیر بحث لے آئیں گے۔

میں ایک ایسے اخباری نمائندے کو جانتا ہوں جو اگرچہ مختصر نویسی کے علم سے بے بہرہ تھا لیکن مسز اینی بیسنٹ کی تقریر سن کر وہ حرف بہ حرف اپنے دفتر میں آکر بیان کر دیا کرتا تھا۔ یہ عجیب بات ہے کہ مسز بیسنٹ کے علاوہ کسی اور مقرر کی تقریر اُسے یوں یاد نہ رہتی تھی۔

لیکن صرف حافظے کی تیزی ہی اعلیٰ کارگذاری کا معیار نہیں ہے مہاتما گاندھی کو دنیا صرف ایک مہاتما یا سیاست دان کی حیثیت سے جانتی ہے۔ لیکن اس بات کا کتنے لوگوں کو علم ہے کہ وہ اعلیٰ کارگذاری کا ایک زندہ نمونہ ہیں۔ آپ کے بعض کام تو نہایت ہی حیرت انگیز ہیں۔ سوائے مسز اینی بیسنٹ کے گاڑی میں بیٹھ کر بلا تکلف لکھتے رہنے کی واحد مثال صرف آپ ہی کی ذات ہے۔

گاندھی جی میں کچھ ایسی صفات بھی ہیں جن کا امکان دوسرے لوگوں میں نہیں۔ آپ چلتی ہُوئی گاڑی میں بیٹھ کر بائیں ہاتھ سے حجامت بناتے ہیں۔ دائیں ہاتھ سے اپنے اخبار کے لئے مضمون لکھتے جاتے ہیں۔ اپنے کسی ہم سفر سے ہنسی مذاق بھی کرتے جاتے ہیں۔ کسی ایسی گتھی کو بھی سلجھاتے جاتے ہیں۔ جس کا حل چند ہی گھنٹوں کے بعد انہیں اپنے سفر کے اختتام پر پیش کرنا ہوتا ہے۔ کسی اخباری نمائندے سے گفتگو بھی کر رہے ہوتے ہیں اور اسی دوران میں اپنے کسی ساتھی کے ساتھ سیاسیات پر تبادلہ خیالات بھی کرتے جاتے ہیں۔ ان میں سے ہر بات اپنی اپنی جگہ مکمل ہوتی ہے یہاں تک کہ ان میں سے کسی ایک کو بھی کم توجہی کی شکایت پیدا نہیں ہوتی۔

سر سی پی راما سوامی آئر بھی اپنے طرز کار میں سب سے نرالے ہیں آپ کو صبح کے وقت گھوڑے کی سواری کرنے کا شوق ہے۔ اور اس سے ورزش بھی مقصود ہے۔ سواری کے دوران میں ایک یا دو گھنٹے کے اندر اندر آپ کئی کتابیں اور اخبار پڑھ ڈالتے ہیں۔ لیکن ان کی سواری یا پڑھائی کا مقصد فوت نہیں ہوتا اور نہ دونوں کام ایک دوسرے میں حارج ہوتے ہیں۔

سیلز مین شپ ایک ایسا پیشہ ہے جس میں کوئی امتیازی درجہ مقرر کرنا نہایت مشکل ہے۔ اور پھر اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے۔ کہ قوانین اخلاق کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے۔ اخبار کے لئے اشتہار حاصل کرنے میں ہمارے ملک میں فیروز شاہ لالی کا ہمسر مشکل ہی سے کوئی نظر آئے گا۔ بی۔ پی واڈیا ایک کتب خانے کے منیجر کی حیثیت سے آپ کو اتنی کتابیں خریدنے اور پھر اُن کی قیمت ادا کرنے پر مجبور کر دینگے کہ آپ اس بات کا فیصلہ بھی نہ کر سکیں گے کہ ان کتابوں کو کیا کیا جائے

لیکن لارڈ نارتھ کلف کا مندرجہ ذیل واقعہ سیلز مین شپ کے میدان میں ایک ایسا اچھوتا واقعہ ہے کہ اس کی مثال ڈھونڈے سے نہیں ملتی۔ آپ کے ایک ادارے نے ایک سستی سی کتاب "جرمن خطرہ" کے نام سے شائع کی۔ ادارے کے بہترین ایجنٹ باوجود ہزار کوشش کے اس کتاب کی فروخت میں ناکام رہے۔ آخر کار ہارمزورتھ نے (جو ابھی لارڈ نارتھ کلف نہ بنے تھے) اس معاملے کو اپنے ہاتھ میں لیا۔ آپ نے ایک سیکرٹری کو بلا کر مندرجہ ذیل مضمون اپنے ایک اخبار میں شائع کرنے کے لئے لکھایا۔ مضمون کی سرخی تھی ——" وہ کتاب جو فروخت نہیں ہوتی ——کیوں؟

" یہ کتاب ایک ایسے ادارے نے شائع کی ہے جسے اپنے حسنِ انتخاب اور پبلک کے مذاق کے جاننے پر ناز ہے —— ایک بہترین کتاب جو اپنے مصنف کا شاہکار ہے

اور جس نے نفس مضمون کے مطالعہ کو اپنا مقصد زندگی بنا رکھا ہے دلچسپ اور دلپذیر طرز تحریر کا نمونہ۔ اس کے باوجود یہ کتاب بکتی نہیں کتاب کا موضوع ہر برطانوی باشندے سے عملی دلچسپی کا طلبگار ہے۔ ہر برطانوی کی بیوی سے، ہر برطانوی بچے سے۔ کیونکہ انہیں معلوم کرنا ہے کہ کیا اُن کا ملک سال دو سال کے اندر اُن کے ہاتھوں سے یوں ہی نکل جائے گا۔ جس طرح کارتھیج اور روم نکل گئے تھے —— لیکن اس کے باوجود یہ نہیں بکتی۔ کتاب ایسی دلچسپ جیسے کوئی ناول۔ لیکن اس کے باوجود یہ نہیں بکتی۔ ہر معقول انسان ماری کوریلی سے لے کر وزیر اعظم تک اُسے پڑھ چکا ہے اور اس کی زبان پر اُسی کا چرچا ہے۔ —— لیکن اُس کے باوجود عام پبلک اسے نہیں خریدے گی لیکن کیوں؛ سوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی ست؟ —— شاید اخبار کے قارئین میں سے کوئی صاحب وہ بات بتا سکیں جس کے سوچنے سے بڑے بڑے جگادھری عاجز آگئے ہیں۔ اخبار کے کوپن کے ساتھ بہترین توجیہ بھیجنے والے کو ایک سو پونڈ انعام دیا جائے گا۔ مدیر اخبار کا فیصلہ قطعی ہوگا۔ جوابات آئندہ سوموار کو ڈیڑھ بجے دوپہر سے قبل پہنچ جانے چاہئیں"

آئندہ سوموار سے بہت پہلے کتاب کے تمام نسخے فروخت ہوچکے تھے۔

مظفر احمد

جمہوریّت کا نازک دَور!

چند موجودہ حکومتوں کے بنیادی اصولوں کو زیر بحث لانے کا مقصد یہ ہے کہ اس وقت اور آنے والے وقت میں ہم اس قابل ہوجائیں کہ ہندوستانی حکومت کی تشکیل میں ان اصولوں میں سے اکثر کو کام میں لا سکیں۔ اور ہمیں اُمید ہے اور اعتماد بھی کہ ہم جلد ہی اس مرحلے پر پہنچ جائیں گے۔

"کسی حکومت کی قوت کے کیا معنی ہیں؟ —— کسی حکومت کے شہریوں —— عورتوں اور مردوں کی انفرادی قوت کی اجتماعی صورت کا ہی دوسرا نام حکومت کی قوت ہے۔ اور جب یہ منتشر افراد فیصلہ کر لیں کہ وہ اپنے دماغوں اور جسموں کو کبھی غیر کے ماتحت نہیں رہنے دیں گے۔ اور اُنہیں اس بات کا شعور ہو جائے کہ اُنہیں کی اجتماعی حالت کا نام حکومت ہے اور وہی حکومت کی قوت ہیں۔ تو زبانِ خلق ہی نقارۂ خدا بن جاتی ہے۔ اور نئی حکومت کی یہی بنیاد مستحکم ہو جاتی ہے۔ یوں گویا حکومت عوام کی تخلیق کی ہوئی ایک چیز ہو گئی۔ یوں حکومت اُن عوام کی تخلیق ہو گئی۔ جنہوں نے اُسے بنایا جن پر اس کا انحصار ہے اور آسمان یا زمین کی کسی بیرونی طاقت سے

اس تخلیق کا کوئی تعلق نہ رہا۔

اس وقت کی بحث کے مقاصد کے لئے ہم نے جدید حکومتوں کے تین تصورات کا انتخاب کیا ہے۔ پہلا تصور قومیت یا قوم پرستی کا ہے۔ دوسرا تصور جمہوریت یا آزادانہ جمہوری معاملات کا ہے۔ اور تیسرا مذہبی حکومت کا تصور۔ اگر گذشتہ دو سو سال کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے مختصراً جدید حکومت کے بنیادی اصولوں کو ان ہی تین صورتوں میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ زمانے کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ ان کی تعمیل کا درجہ مختلف ہو تو ہو۔ عورتیں اور مرد شہریوں کی حیثیت سے اب نجات کا رستہ دیکھ رہے ہیں۔ خواہ وہ ان تصورات ثلاثہ کے سیل میں ہی کیوں نہ بہہ جائیں۔ پہلا بنیادی تصور قومیت کا تھا۔ دوسرا جمہوریت کا اور تیسرا مذہبیت کا۔ اور ایک لحاظ سے یہ تیسرا تصور پہلے دو تصورات سے اہم تر ہے۔

آئندہ حکومت کا جدید حکومتوں کے تصورات کے ساتھ کہاں تک تعلق ہوسکتا ہے اور آئندہ حکومت کو کس حد تک قومیت کا قائل ہونا چاہیئے؟ آئندہ حکومت صوبجاتی یا نسلی نہیں ہوسکتی۔ یہ بات ہم ایک مثال سے واضح کرتے ہیں۔ جس طرح مذہبی حکومت کی مثال کے طور پر جاپان کو لیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح اس وقت ہم ریاستہائے متحدہ امریکہ کی مثال لیتے ہیں۔ امریکہ کی متحدہ ریاستیں اپنی موجودہ صورت میں ایک ایسی حکومت ہیں جسے قائم ہوئے قریباً ڈیڑھ سو سال ہوئے ہیں۔ نیز یہ حکومت امریکہ کی جنگ آزادی کا نتیجہ ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ امریکہ کی مثال سے بہت لوگ رشک کھاتے ہیں۔ اور یہ ایک قدرتی بات ہے کیونکہ امریکہ کی متحدہ ریاستی حکومت ہمیں بہت سے اچھے سبق سکھاتی ہے۔ یہ بات تو آپ کے خیال میں ہوگی کہ اس حکومت کی تخلیق سے اب تک کی زندگی ابھی باقی دنیا کی یاد میں تازہ ہے یعنی داستان کہن نہیں بن گئی۔ کم از کم تاریخ نے اس زندگی کی یاد کو تازہ رکھا ہوا ہے۔ نیز اس وقت اس ایک حکومت میں بے حد مختلف قوموں کا اجتماع ہے۔ چینی، جاپانی، جرمن، اطالوی، فرانسیسی، انگریز اور کئی اور قومیں اس میں آباد ہیں۔ اس لئے بہترین جدید جمہوری حکومت کی مثال پیش کرتے ہوئے سب سے پہلا نام امریکہ کا آتا ہے فرض کیجئے کہ اس وقت امریکہ میں نسلی سوال پیدا ہوجائے۔ تو آپ خیال کرسکتے ہیں کہ امریکہ کی صورتِ حال کیا ہو؟ اگر ریاستہائے متحدہ کا کوئی اطالوی باشندہ یہ کہے کہ اُس کا تعلق تو اٹلی ہی سے ہے، امریکہ سے نہیں اور اگر اس وقت امریکہ کے تمام شہری قومیت کے بجائے نسل پرستی کو حکومت کا سچا بنیادی اصول ماننے لگ جائیں تو ہم بہت جلد ریاستہائے متحدہ کا خاتمہ دیکھ لیں گے آپ میں سے بہتوں نے جرمنی کے نازی اقتدار کے بعد امریکہ کی متحدہ ریاستوں میں فتنہ انگیزی کی کوششوں پر غور کیا ہوگا۔ اور ہمیں مسرت ہے کہ جرمنی اب اس بات کو محسوس کرچکا ہے کہ اُس کی ایسی حرکتیں مضر قومیت اور خودکشی کے مترادف ہونگی۔ خواہ آپ کی اصل جرمنی سے ہو یا اٹلی، فرانس اور آئرلینڈ سے۔ آپ جس زمین پر آکر زندگی گزارتے ہیں اور موت سے اُس زندگی کی تکمیل کرتے ہیں، آپ کی ہستی اُسی سرزمین کا ایک حصہ بن جاتی ہے اور قومی حکومت کی بنیاد اسی خیال پر ہونی چاہیئے۔ قومی حکومت کا بنیادی تصور یہی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ہم اس وقت آئندہ حکومت کے ماخذ کے متعلق مصروف بحث ہیں۔ اس کے باوجود یہ کہا جاسکتا ہے کہ ابھی بہت عرصے تک یہی بنیادی تصور قائم رہے گا۔ حکومت قومی حکومت ہی رہے گی اور مختلف قوموں اور نسلوں کو اپنے میں جذب کرتی رہے گی۔ کیونکہ جو کچھ بھی ہو ہماری اصل تو ایک ہے یعنی ہم سب کے آباؤ اجداد ایک تھے لیکن جہاں تک ہمارا تعلق ہے اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ہم بھی اس پرانے ملک میں باہر سے آنے ہوئے لوگ ہیں اگرچہ ہمیں آئے اب ایک عرصہ ہو چکا ہے اس لئے ہماری حکومت کی رہنمائی کے لئے قومیت سے زیادہ مناسب بنیادی اصول اور کوئی نہیں ہوسکتا۔ اس کے بغیر ایک بدنظمی کا خدشہ ہے۔ باہمی دشمنی، حسد اور تشکیک کا خدشہ ہے اور ایسی فضا میں حُبُّ الوطنی کو ہرگز فروغ نہیں ہوسکتا۔ لیکن یہ حُبُّ الوطنی کیا شے ہے؟ اس کے معنی جاننے کے لئے آپ کسی بھی زبان کی طرف رجوع کریں بات وہی رہے گی۔ یعنی انسان کا اُسی سرزمین سے تعلق جس پر وہ رہتا ہے۔ کیا حب الوطنی کے اس خواب کی تعبیر ہندوستان میں بھی پوری اُترے گی اس کا جواب آئندہ زمانہ ہی دے سکتا ہے لیکن آج باقی دنیا کا کیا حال ہے آج کوئی انگریز، فرانسیسی، جرمن، اطالوی ——— ہندوستان کے علاوہ کسی بھی ملک کا رہنے والا ——— اپنے ملک کی نسبت سے پہلا جانا فخر کی بات سمجھتا ہے۔ تمام دنیا کے جغرافئے پر نظر ڈال جائیے

کسی چھوٹے سے چھوٹے ملک کا رہنے والا بھی اپنے آپ کو اپنے ملک کی نسبت کے علاوہ کسی اور نسبت سے پکارے جانے کی اجازت نہیں دیتا۔ ایک طرف افغانستان سے لے کر دوسری طرف چین اور جاپان تک چلے جایئے اور پھر وہاں سے باقی دنیا میں پھر آیئے۔ سب جگہوں پر یہی کیفیت ہے۔ یہ معاملہ آپ کے گہرے غور و فکر کا تقاضا کر رہا ہے اور اب بھی وقت ہے کہ آپ یہ بات سمجھیں کہ قومیت۔ کے بنیادی اصول پر ہی حب الوطنی کی تعمیر ہو سکتی ہے۔ اسی اصول پر حب الوطنی کی تعمیر ہو سکتی ہے۔ کہ آپ کا تعلق اُس سرزمین سے ہو جس پر آپ پیدا ہوئے۔ جس پر آپ زندگی بسر کر رہے ہیں اور جو مرنے کے بعد بھی آپ کو قبول کرے گی صرف یہی ایک راستہ ہے اگر آپ آزادی حاصل کرنا اور اُس کے بعد آزاد رہنا چاہتے ہیں۔ تو آپ کی آئندہ حکومت کی بنیاد صرف حقیقی قومیت پر ہی ہو سکتی ہے۔ اور اُس قومیت کی بنیاد مذہبی حکومت کے طور پر ہو گی۔ اور یہی بات ہمیں جمہوریت کے بڑے اور آخری اصول کی طرف لاتی ہے۔

"یورپ میں آج جو کچھ بھی ہو رہا ہے۔ اس کے باوجود ذہن انسانی ہر وقت ایک ہی نصب العین کی طرف راغب ہے اور وہ نصب العین جمہوریت ہے ہم یہ نہیں کہتے کہ دنیا میں اس وقت ایک مستحکم اور مدلل جمہوریت موجود ہے۔ بلکہ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ جن ملکوں میں جدید مفہوم کے مطابق انفرادی آزادی موجود نہیں وہ ملک یکسر جمہوری ہیں ہی نہیں۔ مثال کے طور پر جرمنی کو لیجئے۔ ہم یہ بات ماننے کو تیار نہیں کہ جرمنوں نے اپنی ہستی اور اپنی قوت فیصلہ کو اس قدر بے بس کر دیا ہے۔ اور ہم لوگوں کے لئے جو ابھی غلام ہیں۔ یہ کہنا معمولی بات نہیں کہ فلاں قوم نے اپنی آزادی کھو دی ہے۔

ہمیں کوشش سے سمجھنا چاہیئے کہ آج جرمنی میں کیا کچھ ظہور میں آ رہا ہے۔ یہ جو لوگ کہتے ہیں کہ جرمنی میں ذاتی آزادی مفقود ہے اس کے معنی کیا ہیں؟ جرمنی میں صورتِ حال کس ڈھب پر ہے؟ وہ کیا بات ہے جس نے ۱۹۱۹ء میں ایک مغرور اور شکست خوردہ قوم کو جس کی تمام طاقت اور قوت ضائع ہو گئی از سرِ نو دنیا کی آزاد قوموں کے برابر لا کھڑا کیا ہے؟ ممکن ہے کہ جرمنی نے غلط بنیادوں پر اپنی نئی عمارت کی تعمیر کی ہو۔ کیونکہ یہودیوں پر مظالم کے لحاظ سے میں سمجھتا ہوں کہ انہوں نے خام بنیاد عمل رکھی ہے اور ایک حکومت کے لئے یہ مناسب نہیں ہے لیکن اس بات کو ابھی الگ رہنے دیجئے۔ قومی آزادی کے لئے انفرادی آزادی کا ایثار بھی ایک شے ہے۔ اور جرمنی کے حالات کو ہم اس نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ فرد کو وہاں کم آزادی حاصل ہے۔ اُسے پیدائش سے موت تک ایک سخت نظام کے ماتحت رہنا پڑتا ہے۔ ہمیں اس کا پورا احساس ہے اور ہم ان قوانین کے نفاذ کے طریق و انداز کو اچھی طرح سمجھتے ہیں لیکن ہم اس کے ماخذ اور اس کے انجام کو بھی سمجھتے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ہمارے دیکھتے دیکھتے ہی وہ وقت آ جائے گا کہ جرمنی کے باشندے جان لیں گے کہ نازیت اور ہٹلر کے احکام نے اپنا کام کر لیا اور اب اُن کی کوئی ضرورت نہیں۔ اور یہ باتیں گئی گذری باتیں ہو کر رہ جائیں گی اور جرمنی کی آئندہ جمہوریت اُن مردوں اور عورتوں پر مشتمل ہو گی جنہیں اگرچہ تنظیم کے کولھو میں پیسا گیا ہے لیکن وہ سیرت جسم، ذہنی اور روحانی لحاظ سے بہتر ہوں گے۔ ہمارے دلوں میں ہٹلر کے لئے ایک جذبۂ ستائش ہے۔ آزادی کو حاصل کرنا اور پھر اُس سے اپنے من مانے طریقوں سے کام لینا ہمارے اپنے بس کی بات ہے۔ اگر آج ضرورت کا تقاضا یہی ہو کہ ہمیں اپنی انفرادی آزادی سے دست بردار ہونا پڑے تاکہ وہی آزادی ہمارے ملک کو حاصل ہو جائے تو ہم سمجھتے ہیں کہ ہماری یہ انفرادی قربانی لاحاصل کبھی نہیں ہو سکتی۔ یہ نہایت معمولی بات ہے اور ایسی قربانی باعثِ فخر ہے۔ لیکن یہ بات وہیں کی وہیں رہتی ہے کہ انسان کو اپنے چلن سے اپنی ذاتی آزادی کی بھینٹ دینے کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔ کیونکہ اُس کے ملک کی آزادی ہی اُس کا اصل نصب العین ہے اور اسی نصب العین کے لئے وہ زندہ ہے آزادی کے حصول کا تجزیہ کرنے سے یہ بات نہایت آسانی سے واضح ہو جاتی ہے۔

جرمنی میں زندگی کی ضروریات کے لحاظ سے بڑوں اور چھوٹوں سب کی ضروریات کو یکساں نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ امیر اور غریب سب کے لئے ہر چیز برابر ہے۔ مکمل مساوات کا دَور ہے۔

کہا جاتا ہے کہ انگلستان کے تمام باشندے جمہوریت کے حامی ہیں اور اپنے کو باقی دنیا سے علیحدہ سمجھتے ہیں۔ انگریزوں کی اس جمہوریت کا ہم نے غور سے مطالعہ کیا ہے۔ انگلستان کے لحاظ سے یہ صحیح ہو تو ہو لیکن ہماری جمہوریت کے متعلق کیا کہا جا سکتا ہے؟ اگر آج انگریز جمہوریت کا حامی ہے۔ تو ہندوستان میں اپنی حکومت کے جواز کے لئے کیا دلیل پیش کر سکتا ہے؟ ان باتوں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ لوگ جو جمہوریت کے حامی ہیں اور وہ لوگ جو خود اپنی جمہوریت کو قربان کر دیتے ہیں۔ سب ایک جیسے ہیں۔ مستقبل کی حکومت کی پختہ بنیاد جمہوری اصول کی پہچان ہوگی اور خدا اور حکومت دونوں کی نظروں میں انسانی مساوات کی پہچان ہوگی۔

اس دوران میں جب آپ اپنے وطن کی تعمیر میں حصہ لے رہے ہوں تو آپ کو یہ بات پیش نظر رکھنا ازبس ضروری ہے کہ آپ کی آئندہ حکومت کی بنیاد قومیت ہوگی ایک قسم کی مذہبی حکومت، ایک ایسی حکومت جس کی بنا، آزاد ترین جمہوریت ہوگی۔ ہم اس عظیم ملک کے باشندے ہیں۔ ہمارے اعتقادات خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہوں۔ ہماری زبان خواہ کوئی ہو۔ ہمیں چاہیئے کہ ہم اپنی زندگی اور اپنے افعال کو اس ڈھب پر منظم رکھیں کہ ان سے ایک ایسا احساس پیدا ہو جائے کہ ہم سب ایک ہی قوم اور ایک ہی عظیم فرقہ ہیں حکومت کی نوعیت خواہ کچھ ہو۔ ہمارے لئے اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے لیکن اس کا ہمیں پختہ یقین ہے کہ حکومت کا نصب العین یہی ہوگا کہ قوم کی حکومت قوم کے لئے ہو اور قوم کے ذریعے سے کی جائے۔ یہی ہماری حکومت کا مذہب ہوگا۔

(بھولا بھائی ڈیسائی)

تجدیدِ پیماں

پھر حسنِ معذرت پہ یقیں لا رہا ہوں آج
پھر چشمِ شرمسار سے شرما رہا ہوں آج

پھر کر رہا ہوں عہدِ محبت پہ اعتبار
پھر جامِ جاں گداز پئے جا رہا ہوں آج

پھر کر رہا ہوں یاس پہ تعمیرِ آرزو
پھر بے طرحِ فریبِ وفا کھا رہا ہوں آج

پھر چھا رہا ہے عقل پہ افسونِ بےخودی
پھر بے نیازِ ہوش ہوا جا رہا ہوں آج

پھر توبۂ شباب ہے آمادۂ شکست
پھر مست انکھڑیوں کی قسم کھا رہا ہوں آج

پھر لا کے آسماں سے ستاروں کے تازہ پھول
فرطِ طرب میں راہ پہ برسا رہا ہوں آج

سو بار ہو چکا جو شکستوں سے پائمال
اس دل کو پھر امید سے گرما رہا ہوں آج

پھر کائنات میرے قدم پر ہے سجدہ ریز
اور اس کو پائے ناز سے ٹھکرا رہا ہوں آج

شہید ابن علی

سلام کے جواب میں

سلام اُس پہ کہ جس نے سلام بھیجا ہے — نگاہِ لطف کا رنگیں پیام بھیجا ہے
سلام اُس پہ کہ گر اُس کی مدح ناز کروں — ذرا سی عمر کو میں حشر تک دراز کروں
سلام اُس پہ فدا جس پہ ہر چمن کی بہار — بہشت کے گل و نسرین و نسترن کی بہار
سلام اُس پہ جسے حورِ کہکشاں کہیئے — زمیں کے شب کدے میں نورِ کہکشاں کہیئے
وہ مہ جبیں کہ جسے تارے بھی پیار کرتے ہیں — اور اُس کے قدموں پہ کرنیں نثار کرتے ہیں
مہ و ستارہ کا پیکر، رُخِ حسیں اُس کا — بہار و نور کا بُت جسمِ ریشمیں اُس کا
وہ گُل بدن کہ اگر سیرِ گُل کو آ جائے — غرور، گُل کی نزاکت کا سب مٹا جائے
شمیمِ زلف سے سو جنتیں مہک جائیں — نگاہِ مست سے میخانے تک بہک جائیں
وہ زلف تیرہ کہ دن ہو تو رات ہو جائے — سیاہ، نظروں میں کُل کائنات ہو جائے
وہ شوخ آنکھیں جہاں بجلیاں مچلتی ہیں — وہ نظریں جن سے جواں مستیاں اُبلتی ہیں
کشیدہ ابرو، ہلالِ سیاہ کہیئے جنہیں — کئی دلوں کا مآلِ سیاہ کہیئے جنہیں
شفق سے گُل سے سمن سے بنے ہوئے عارض — بہارِ باغِ عدن سے بنے ہوئے عارض
وہ لعل لب کہ جنہیں آرزوئیں پیار کریں — بہشتیں، غنچوں کی شادابیاں نثار کریں
خرامِ ناز کہ موجِ نسیم رُک جائے — صدائے شوخ کہ قدموں پہ زُہرہ جھک جائے
بُتانِ شہر میں وہ اِس طرح نمایاں ہے — کہ جیسے تاروں میں ماہِ جواں درخشاں ہے
نسیم کی طرح جس دم چمن میں آتی ہے — چمن کی ہر کلی مدحت کے گیت گاتی ہے
وہ پھول ہے کہ بہاروں کا جس پہ سایہ ہے — وہ چاند ہے کہ ستاروں کا جس پہ سایہ ہے

بہ رنگِ مدح یہ تازہ کلام حاضر ہے — اور اس زباں میں "جوابِ سلام" حاضر ہے
اُمیدِ دل کی کلی کھل کے پھول ہو جائے!
ہماری نذرِ محبت قبول ہو جائے!!

اختر شیرانی

رس کا نظریہ

کسی ادبی تخلیق کے حسن و لطافت کو ذہنی گرفت میں لانے کے لئے ادبی تنقید بہترین ذریعہ ہے۔ شاعر ایک حسن کار ہے، وہ خیالات کو الفاظ کا جامہ پہنا دیتا ہے، اُس کا کام مشاطۂ سخن کا ہے۔ لیکن کیفیتِ شعری کو سمجھنے اور سمجھانے میں تنقید ہی ہماری مدد کر سکتی ہے۔ حقیقتِ شعری کی دریافت کے اصول اور حسن کی ترجمانی میں شاعر کی کامیابی کے درجے کو جانچنے کے لئے جن تجزیاتی قوانین کی ضرورت ہے وہ ہمیں ادبی انتقاد ہی میں مل سکتے ہیں۔ شعر و ادب کا وہ حسن جس سے مذاقِ سلیم کو کیف و سرور کا عالم مہیّا ہو سکتا ہے اس کو یہی قوانین نمایاں کر سکتے ہیں۔

عام طور پر سنسکرت میں "النکار شاستر" کے معنی ادبی تنقید کے ہیں لیکن اس کے لغوی معنی روزمرّہ یا محاورہ ہیں۔ "النکار شاستر" کا قدیم مفہوم زیادہ وسعت لئے ہوئے ہے۔ پہلے اس کلمے سے "حُسنِ شعری" مراد تھی۔ لیکن "حُسنِ شعری" میں بھی وہ جزئیاتِ تصور شامل نہیں ہیں جن کا اظہار "ادبی تنقید" سے ہوتا ہے۔ کیونکہ "ادبی تنقید" میں تفہیم و تحسین ——— اور تنقید تینوں باتیں آجاتی ہیں۔ اس کے علاوہ "النکار" کا لفظ ان تمام انتقادی طریقوں پر بھی حاوی نہیں ہے جو آج تک ایجاد ہو کر سنسکرت نقادوں میں رائج ہوئے۔ کیونکہ النکار طریقے کے علاوہ تنقید کے سات اور طریقے بھی ہیں اور ان میں سے کئی النکار سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ اس لئے سنسکرت میں تنقیدِ ادب کا مفہوم جتانے کے لئے لفظ "النکار" کے استعمال کے جواز کے لئے ایک ہی وضاحت کی جا سکتی ہے اور وہ یہ کہ اس استعمال کا آغاز بھاماہنیہ کی پیروی سے ہوتا ہے۔ بھاماہنیہ کے خیال میں شعر کی نمایاں اور بنیادی خوبی صحیح الفاظ اور محاورات ہی ہیں اور صحیح الفاظ اور محاورات ہی ہمیں شعر و ادب کی جمالیاتی کیفیتوں سے محظوظ کر سکتے ہیں۔

بہر حال اس بات میں کسی کو کلام نہیں ہو سکتا کہ تنقیدِ ادب ہی سے شعر و ادب کی صحیح اور مناسب شرح ہو سکتی ہے اور چونکہ علم ادب کسی قوم کے تمدّن کی ایک اہم شاخ ہوتی ہے اس لئے انسانی کارگذاریوں اور ذہنِ انسانی کے ارتقا کی اعلیٰ اور نفیس فضا سے لطف حاصل کرنے اور انہیں سمجھنے میں جو مدد تنقیدِ ادب سے مل سکتی ہے۔ اُسے دیکھتے ہوئے ادبی تنقید کی اہمیّت سے ہرگز انکار نہیں ہو سکتا اس مضمون سے اِسی خیال کے ایک پہلو کی تکمیل مقصود ہے۔

سنسکرت علم ادب میں تنقید نگاری کے آٹھ مختلف سکول ہیں لیکن "رس" اور "دھوانی" کے سکول اِن میں سب سے زیادہ نمایاں اور اہم ہیں۔ ان آٹھ مختلف گروہوں نے جو قوانین وضع کئے۔ ان کی حیثیت خود مختارانہ ہے، وہ ابتدا میں اپنے مقصد کی تکمیل کے لئے ایک دوسرے کے محتاج نہ تھے۔ لیکن بعد ازاں اُن کی قدر و قیمت "رس" اور "دھوانی" کے گروہوں سے اُن کے تعلق کی نسبت سے قرار پائی اور یہی وجہ ہے کہ اب اگر ہم "رس اور دھوانی" کے نظریوں کو جان لیں تو انہی دو نقاطِ نظر سے . . . بلکہ محض رس کے نقطۂ نظر ہی سے سنسکرت ادبی تنقید کے تمام مسئلے کو کافی حد تک سمجھ سکتے ہیں۔ رس اور دھوانی میں بھی چونکہ "رس" کے نظریوں کا گروہ ہی زیادہ اہم اور نمایاں ہے اس لئے اسی کے لئے ہم آج کی فرصت کو وقف کریں گے۔

"رس" کے سکول کی ابتداء سنسکرت کے پہلے شاعر والمیکی سے ہوتی ہے . . . . لیکن "رس" کے صحیح معنی اور مفہوم کو جان لینا بہت ضروری ہے۔ "رس" ایک فنّی اصطلاح ہے جو قدیم ہندوستانی ادب میں رائج تھی۔ قدیم ہندوستان کے علم فلسفہ میں بھی ایک ایسی ہی اصطلاح "دھرم" کی ہے۔ دھرم اور رس دونوں ایسے لفظ ہیں کہ ترجمے میں ایک ایک لفظ سے ان کے صحیح اور پورے مفہوم کو ادا نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ ان دونوں اصطلاحوں کا آغاز اور نشو و نما قدیم ہندوستان کی خالص فضا اور ماحول میں ہوا۔ سنسکرت نقادوں کے مطابق "رس" وہ سرچشمۂ کیف و سرور ہے جو

ذوقِ سلیم رکھنے والے ذہنوں سے پھوٹتا ہے۔ اول، تخلیق شعری کی صورت میں، دوم، داد و تحسین کی صورت میں۔ یہ کیف و سرور شاعری کی شکل اُس صورت میں اختیار کرتا ہے اگر ذوقِ سلیم رکھنے والا شخص اس خداداد شاعرانہ جوہر کا مالک ہو جسے "پرتیبھا" کہتے ہیں اور داد و تحسین کی شکل تب اختیار کرتا ہے کہ متاثر ہونے والا شعری کی بجائے نثری خصوصیاتِ ذہنی کا مالک ہو۔ آنند وردھن سنسکرت نقادوں میں سب سے اونچا درجہ رکھتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ ایک ایسے ذہن سے ہی شاعری کی تخلیق ہو سکتی ہے جس پر "رس" یا کیف و سرور سے متاثر ہونے کی اہلیت پوری طرح حاوی ہو۔ اور اس لئے تخلیق کے بعد اس میں کسی قسم کا کوئی شعوری اضافہ نہیں کرنا چاہیئے کیونکہ یوں اُس میں رس کی کیفیت کم تر ہو جاتی ہے۔ چنانچہ سنسکرت فنِ تنقید میں "رس" اہم ترین موضوع ہے۔ اور اس کے علمی اور ادبی دونوں پہلوؤں پر بحث کی جاتی ہے۔ مندرجہ بالا وجوہات کی بنا پر ہی ہم "رس" کا مفہوم کسی اور لفظ سے ادا نہیں کر سکتے۔ البتہ اس کی وضاحت کے لئے یہ کہہ سکتے ہیں کہ "رس" کے معنی کیف و سرورِ شعری ہیں۔

ایک نقاد نے لکھا ہے کہ شعر کا مطالعہ نہیں کیا جا سکتا، اس سے حظ اٹھایا جا سکتا ہے۔ گویا شعر و ادب کی اپیل ذہن کی بجائے دل کو ہوتی ہے۔ اور ذوقِ سلیم عقل کی بجائے احساس کا دوسرا نام ہے۔ والمیکی نے اپنی رامائن کے آغاز میں لکھا ہے کہ "وپانگیہ" یعنی آکاش بانی الہام، ندائے سروش یا ہاتف کی آواز ہی سے "رس پرتیتی" یعنی کیفِ شعری کا ظہور ہوتا ہے۔ غالب بھی اسی کی تائید کرتا ہے۔ ؎

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں غالب صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

شعر و ادب میں بھی گویا آنکھ مچولی کھیلی جاتی ہے اور اسی کی وجہ سے شعر و ادب کی دلکشی (چمتکار) بڑھتی اور قایم رہتی ہے۔ "رس" کے نظریوں سے شعر و ادب کی دلکشی کے پس منظر میں جو نفسیاتی عمل ہوتا ہے اس کا تجزیہ کیا جا سکتا ہے لیکن "رس" کے متعلق کسی فیصلہ کن بیان کی تفہیم سے پہلے ضروری ہے کہ اُن تمام اصطلاحات کو پورے طور سے سمجھ لیا جائے جن کا اُس بیان کے ساتھ تعلق ہے۔ مثلاً وبھاؤ، انو بھاؤ، ویابھاری بھاؤ، ستھائی بھاؤ۔ اور رس۔ رس کو رس اس لئے کہتے ہیں کہ اِس سے رس ملتا ہے۔ لطف حاصل ہوتا ہے، ایک جمالیاتی کیف سے طبیعت محظوظ ہوتی ہے۔ گویا یہ احساسِ حسن کی ایک ذہنی کیفیت کا نام ہے۔ ستھائی بھاؤ کے معنی ہیں ذہنِ انسانی کی مستقل کیفیت، جو اندرونی طور پر کسی شخصیت میں خوابیدہ ہو۔ یہ کیفیت ہمیشہ ہماری ہستی کا ایک جزو رہتی ہے جیسے یہ ہمیں پچھلے جنموں سے ملی ہو اور نفسیاتی تصور کے مطابق اسی کیفیت پر شعر و ادب اپنی دلکشی سے اثر انداز ہو کر "رس" کی کیفیت پیدا کرتے ہیں۔ چونکہ یہ کیفیت ہمیشہ ہماری ہستی میں موجود رہتی ہے۔ اس لئے اسے "ستھائی بھاؤ" یعنی "مستقل کیفیت" کہا جاتا ہے۔ یہ کیفیت ذہن کی باقی تمام کیفیتوں کو اپنے آپ میں ملا لیتی ہے۔ لیکن اس سے اس کی اپنی ہیئت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ جس طرح سمندر کے پانی میں مختلف دریاؤں کی آمیزش کے باوجود سمندر کی انفرادی شکل قایم رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ کیفیت ہم میں اس استقلال کے ساتھ موجود ہے گویا پچھلے جنموں سے چلی آ رہی ہے اور اس کی بنیادی حیثیت کی وجہ ہی سے "رس" کے نظریے سے متعلق بیان میں اس کیفیت کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

"وبھاؤ" وہ خاص محرکات ہیں جو ان آسودہ اور اندرونی احساسات کو برانگیختہ کرتے ہیں۔ اور یہ تحریک کا عمل "ابھینائے" یعنی اظہار کے ذریعے سے پورا ہوتا ہے۔ خواہ وہ اظہار ڈراموں کی اداکاری کے لحاظ سے نظری ہو، خواہ موسیقی کے لحاظ سے سماعی ہو اور خواہ شعر و ادب کے لحاظ سے محض لفظی اور جب "رس" کی کیفیت پیدا ہوتی ہے تو باقی تمام خیالات ذہن سے غیر شعوری طور پر خارج ہو جاتے ہیں اور یہی حالت ہے جب بنیادی کیفیت (ستھائی بھاؤ) "رس" کی کیفیت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ ان بنیادی کیفیتوں کی تعداد نو (۹) ہے۔

۱۔ رتی (عشق و محبت)
۲۔ ہاسیہ (مذاح)
۳۔ شوک (تاثر۔ رحم۔ غم وغیرہ)
۴۔ کرودھ (غصہ۔ غیض و غضب)
۵۔ اُتساہ (زور۔ قوت۔ طاقت)
۶۔ بھئے (خوف)
۷۔ جگپسا (نفرت۔ کراہت۔ ناپسندیدگی)
۸۔ وسمائے (تحیّر)
۹۔ شمہ (شان، شکوہ، شوکت، وقار)

آخری بھاؤ یعنی کیفیت کو بعض بنیادی کیفیت نہیں تسلیم کرتے

لیکن ابھینو گپت نے، جو ایک زبردست ادبی نقاد ہے۔ اسے قطعی طور پر ایک بنیادی کیفیت تسلیم کیا ہے۔ ہر ادبی تخلیق میں کوئی نہ کوئی بنیادی کیفیت نمایاں اور ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔ مثلاً کالیداس کی شکنتلا اور سیگھ دوت، شکسپیر کی رومیو جولیٹ، نواب مرزا شوق کی مثنوی زہر عشق اور وارث شاہ کی ہیر رانجھا، میں رتی بھاؤ ایک بنیادی کیفیت ہے۔

ویابھچاری بھاؤ وہ ہنگامی یا ثانوی کیفیات ہیں جن کا مستقل یا بنیادی کیفیات کے ساتھ تعلق ہے اور جن سے بنیادی کیفیات کے مکمل اظہار اور ترجمانی میں مدد ملتی ہے۔ مثال کے طور پر نروید یعنی یاس، ناامیدی یا کم ہمتی اور گلانی یعنی تھکن یا ضعف کا تعلق رتی بھاؤ کے ساتھ بھی ہے اور شوک بھاؤ کے ساتھ بھی اور یہ ویابھیر وتن ہیں۔ ان میں سے کسی ذیلی کیفیت کی موجودگی کے بیان سے اُن کی بنیادی کیفیت کی ترجمانی میں مدد مل سکتی ہے۔ مثلاً افسانۂ لیلیٰ مجنوں میں بنیادی کیفیت رتی بھاؤ ہے۔ لیکن مجنوں میں ناامیدی، کم ہمتی اور ضعف کی موجودگی سے رتی بھاؤ کی ترجمانی میں مدد ملتی ہے۔

انو بھاؤ وہ غماز نگاہیں یا رنگ کی تبدیلی (حیا کی سرخی، ڈر کی سفیدی یا زردی) ہے جس سے دل کے اصلی احساسات اور جذبات کا اظہار ہو۔ یہ انو بھاؤ بھی بنفسہٖ "رس" کی اپیل میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ یہ ایک طرح کی اضطراری کیفیتیں ہیں اور یہ دردمند دل یعنی ستو میں لازماً پیدا ہوتی ہیں۔ اس لئے انہیں ستوِک بھاؤ کہتے ہیں۔ یہ تعداد میں آٹھ ہیں۔ ۱۔ بے حرکتی، سکون، ٹھہراؤ (جیسے وہ تحیر آمیز سکون جو کسی خوب صورت عورت کو دیکھنے پر پیدا ہو)

۲۔ رونگٹے کھڑے ہو جانا ۔ ۳۔ پسینہ، ۴۔ رنگ کی تبدیلی ۔ ۵۔ لرزش، کانپنا، ۶۔ آنسو، ۷۔ آواز کی تبدیلی ۔ ۸۔ خود فراموشی۔

بنیادی کیفیت کے عین بعد ہی اِن ذیلی کیفیات کا غیر شعوری طور پر احساس ہو جاتا ہے۔

وبھاؤ کے معنی محرک ہیں۔ وہ محرکات جن کے تلازمِ خیال کا نتیجہ بنیادی کیفیت (ستھائی بھاؤ) کی نشو ونما اور پرورش ہو، "وبھاؤ" کہلاتے ہیں۔ "وبھاؤ" چونکہ ایک زوردار اور اہم جزوِ کلام ہوتا ہے۔ اس لئے اس کی طرف خاص توجہ کی گئی ہے۔ نقادوں نے "وبھاؤ" کی دو قسمیں مقرر کی ہیں ـــــ البمان وبھاؤ اور اُدّی پان وبھاؤ۔ محبت، غصہ، رحم ـــــ یہ سب متعدی جذبات ہیں۔ ان میں فاعل کے علاوہ کسی دوسرے شخص کا تعلق ضروری ہے جس سے محبت ہو، جس پر غصہ یا رحم آئے اور ان جذبات کے مرکزوں ہی سے ان کی ایک معیّن صورت رونما ہوتی ہے۔ ایسی جذباتی کیفیتوں کو المبان وبھاؤ کہتے ہیں۔ لیکن چند باتیں ایسی بھی ہیں جن سے ان متعدی کیفیات کو مزید تحریک ملتی ہے مثلاً چاندنی محبت کو، دھوکا یا غداری غصے کو اور دکھ بھری آہیں رحم کو بھڑکاتی ہیں۔ ان مزید تحریک دینے والی باتوں کو اُدّی پان وبھاؤ کہتے ہیں۔

"رس" کے نظریے کے متعلقہ بیان یعنی "رس سُتر" میں جن اصطلاحات کا دخل ہے، یہاں تک اُن کی وضاحت ہو چکی۔ اب ہم اصل بیان کی طرف رجوع ہوتے ہیں۔ یہ بیان بھرت کا ہے اور بھرت کو سنسکرت انتقادِ ادب کا آدم کہا جاتا ہے۔ بھرت کہتا ہے:

"وِبھاؤ انو بھاو ویابھچاری سَم یوگدّ رسا نِشپاتیہہ" یعنی "بنیادی کیفیت (ستھائی بھاؤ) کے ساتھ محرکات (وبھاؤ) بعد کے اثرات (انو بھاؤ)، اور اضطراری کیفیات (ویابھچاری بھاؤ) کی ایک امتیازی آمیزش سے "رس" کا اظہار ہوتا ہے۔"

گویا بنیادی کیفیت پر ادبی محرکات، بعد کے اثرات یعنی غماز اشارات اور اضطراری کیفیات کی مکمل کارفرمائی سے جو پُرکیف احساسات پیدا ہوتے ہیں انہیں "رس پرتیتی" یعنی رس کا اظہار کہتے ہیں۔

یہاں تک تو راؤں میں کوئی اختلاف نہیں۔ لیکن "سم یوگ" اور "نِشپاتی" کی تشریح میں مختلف خیال پیش نظر ہو جاتے ہیں۔ بھٹ لولّٹ رائے زنی کرتے ہوئے کہتا ہے کہ سَم یوگ (سنجوگ) کے معنی سمبندھ یعنی رشتہ یا تعلّق کے ہیں اور نِشپاتی کے معنی اُت پاتی یعنی تخلیق کے، بلکہ اپنے اثر اور نتیجے کے لحاظ سے اروپ یعنی لگاؤ یا نسبت کے ہیں۔ دوسری چیزوں اور وبھاؤ کے تعلق سے پہلے پہل "رس" اصلی ہیرو میں پیدا ہوتا ہے اور پھر ہمارے ذریعے سے اُس ادا کار (نٹ) میں منتقل ہو جاتا ہے جو ہیرو کا پارٹ کر رہا ہو۔

سری سنکو کا ایک منطقی نقاد ہے، اور وہ "رس" کے عمل کو اخذ اور نتیجے اور علت اور معلول کی توضیح سے بہت غیر شاعرانہ سا نظریہ بنا دیتا ہے۔ اُس کے خیال میں حاصل شدہ اور قابلِ حصول کے باہمی تعلق کا نام سم یوگ ہے، اور نِشپاتی، انومیتی یعنی اس استخراج کا نتیجہ ہے۔

بھٹ نائک کہتا ہے کہ "جب ہیرو یا ہیروئن کے انفرادی جذبات ایک کلیتی کی عمومیت کے حامل ہو جاتے ہیں، تو وہ اپنی وسعت کے لحاظ سے ذوقِ سلیم رکھنے والے دل کے لئے ایک پُرکیف شعور کا باعث بن جاتے ہیں، اور اسی عمل کو "رس پرتیتی" یعنی "رس" کا اظہار کہتے ہیں"۔

"رس" کے نظریے کی آخری اور تسلی بخش شرح ابھینو گپت کی ہے۔ وہ "رس" کو "سمجھائی ہوئی بات" کہتا ہے اور "سمیوگ" کے معنی اس تعلق کے بیان کرتا ہے جو "سمجھانے والے" اور "سمجھائی ہوئی بات" میں ہو۔ نیز "نشپاتی" کے معنی انکشاف یا الہام بتاتا ہے۔

"رس" کے اصول کی الجھنوں کو صاف کرنے میں سب سے پہلی باقاعدہ کوشش بھٹ لولّٹ نے کی۔ وہ کہتا ہے کہ (مثال کے طور پر) ––– "رتی (عشق) کی بنیادی کیفیت (ستھائی بھاؤ) کا محرّک (المبان وبھاؤ) کسی دوشیزہ کا وجود ہوتا ہے۔ بعد از یں محبت کی کیفیت کو چاندنی سے روشن دل پذیر باغات میں ملاقاتوں سے مزید تحریک ملتی ہے اور غمازہ اشاروں اور دزدیدہ نگاہوں (انو بھاؤ) سے اس کا اظہار ہوتا ہے اور اضطراری کیفیات (ویابھچاری بھاؤ) یعنی آرزوؤں اور اُمنگوں سے اس میں استقلال اور پائیداری پیدا ہوتی ہے۔ اس تمام عمل سے یہ بنیادی کیفیت جو پہلے صرف ہیرو یا ہیروئن کے دل میں ہی موجود ہوتی ہے، جذبۂ محبت کی ایک علیحدہ اور مستقل صورت اختیار کر لیتی ہے اور پھر تماشائیوں کی طرف سے اُس اداکار کے لئے اس جذبے کی تخصیص ہوتی ہے جو صورت شکل اور لباس اور عمل کے لحاظ سے ہیرو کی شخصیت کی نقل کر رہا ہوتا ہے۔ گویا اس طور پر تماشائی (سامع یا ناظر) کے لئے اُس کی اپنی تفہیم و گرفتِ جذبات ہی باعث کیف ہوتی ہے، جسے وہ اپنے آپ سے اداکار (یا شاعر کے کلام) تک ایک طرح کی تخمین کے لباس میں پہنچاتا ہے۔ اثرات کے لحاظ سے وبھاؤ ایک علت یا وجہ ہے جو ستھائی بھاؤ (بنیادی کیفیت) کو نشو و نما اور تربیت دے کر پھیلاتی ہے۔ "رس" اولاً ناظر یا سامع کے ذہن کے لئے ایک اجنبی کیفیت کی طرح ہوتا ہے اور بعد میں (اور وہ بھی ثانوی حیثیت میں ہی جس کی وضاحت ہمیں معلوم نہیں ہے) اس کے ذہن میں بار پاتا ہے۔ بعد کے ادبی نقاد اس نظریے کو بعینہٖ قبول کرنے میں پس و پیش کرتے ہیں۔ کیوں کہ اس طرح "رس" کے اظہار میں جس نفسیاتی عمل کو دخل ہے۔ اس کی وضاحت سے پوری پوری عہدہ برائی نہیں ہوتی ہے۔ اس وضاحت کے لحاظ سے "رس" کی تخلیق، نشو و نما اور ترجمانی بہت غیر شاعرانہ سی ہو جاتی ہے۔ جیسے یہ بھی کوئی ریاضیاتی اصول ہو۔

دوسرا نقاد سری سنکو کا "رس" کے اظہار کی وضاحت استخراج کے عمل سے کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ حقیقتاً اداکار میں "رس" موجود نہیں ہوتا۔ بلکہ اُس کی محتاط حرکتوں اور اصلی ہیرو کے افعال اور خصوصیات کی نقل سے ہم یہ نتیجہ نکال لیتے ہیں کہ بنیادی کیفیات اس میں موجود ہیں اور یہ احساس رفتہ رفتہ غیر شعوری طور پر تماشائی کو اس وقت کے لئے یقین دلاتا ہے کہ اصلی ہیرو اور اداکار دونوں ایک ہی شخصیت ہیں۔ اداکار سٹیج پر (اور شاعر اپنے کلام کے ذریعے سے) اصلی ہیرو کے جذبات کی نمایندگی کرتا ہے اور اس میں اُسے اصلی ہیرو کے جذبات کے اکتساب سے مدد ملتی ہے اور ہمارے دل و دماغ ایسے پیش کردہ جذبات کو پہچان اور سمجھ کر اُن سے کیف اندوز ہوتے ہیں اور یوں بنیادی کیفیت تماشائی (یا سامع) کے ذہن میں اپنی آخری منزل یعنی "رس" کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ مختصراً وبھاؤ وہ الفاظ، محاورات، تشبیہیں اور استعارے ہیں جو شاعری میں استعمال کئے جاتے ہیں۔ انو بھاؤ اداکار کی حرکات و سکنات ہیں اور ویابھچاری بھاؤ انو بھاؤ کی محتاط اور ماہرانہ پیشکش کا نام ہے اور ستھائی بھاؤ یعنی بنیادی کیفیت کسی زور دار ادبی بیان سے برانگیختہ نہیں ہوتی بلکہ اس تمام عمل کے نتیجے کے طور پر ظہور میں آتی ہے اور "رس" کی صورت اختیار کرتی ہے۔ سری سنکو کا کہنا ہے کہ یہی وجہ ہے کہ بھرت کے "رس سُوترا" میں بنیادی کیفیت کا ذکر نہیں ہے۔ ہم ایک جذبے کی نقل کو بالکل اسی انداز میں اصل سمجھتے ہیں جیسے ایک بچہ گھوڑے کی تصویر کو گھوڑا کہتا ہے۔ اس تشریح سے ہم یہ تو ثابت کر سکتے ہیں کہ یہ بات غلط ہے کہ "رس" ایک "پراگٹ" شے ہے یعنی ہم میں نہیں بلکہ ہمارے علاوہ کسی اور ذات میں اس کا وجود ہوتا ہے۔ لیکن اس سے ایک اور مشکل درپیش آتی ہے اور وہ یہ کہ یہ نئی تشریح ہمارے اپنے ذاتی تجربے کے خلاف معلوم ہوتی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ محبت کی شاعری سے حظ اندوز ہونے کے لئے ہمیں بنفسہٖ محبت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ گویا اصطلاحی زبان میں کیف (رس) حاصل کرنے کے لئے ہمیں بنیادی کیفیت (ستھائی بھاؤ) کی محتاجی نہیں۔ نیز ہم یہ بھی کہہ

سکتے ہیں کہ ہمارے ذہن میں کسی طرح کا "استخراجی" عمل واقع نہیں ہوا۔ ہمیں کسی جمالیاتی تخلیق کو دیکھتے، پڑھتے یا سنتے ہی ایک پرکیف ذہنی حالت مہیا ہوگئی۔ ہمیں چار کا عدد حاصل کرنے کے لئے دو میں دو کو جمع نہیں کرنا پڑا۔ دو اور دو کو دیکھتے ہی ہمیں حاصل جمع کا احساس ہوگیا۔

بھٹ نائک کی تشریح "رس" کے نظریے کو زیادہ واضح کرتی ہے۔ پہلے دونوں نقاد نظریۂ "رس" کے داخلی وجود کو تسلیم کر کے کہتے ہیں کہ یہ ایک تخلیق کا یا استخراج کا عمل ہے۔ نیز وہ اصلی ہیرو کو "رس" کا ماخذ و منبع معیّن کرتے ہیں۔ لیکن بھٹ نائک اس مرکزِ ثقل کو تبدیل کر کے ناظر یا سامع کو "رس" کی اوّلین منزل مقرر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اگر اداکار یا اصلی ہیرو ہی "رس" کی بنیادی منزل ہے اور وہی پہلے کیف حاصل کرتا ہے تو اس کی حیثیت تو پھر ناظر یا سامع کی ہوگئی وہ اپنا اصلی درجہ کھو بیٹھا۔ اس طرح "رس" ایک خارجی احساسِ کیف بن گیا۔ "رس" کے اس نفسیاتی پہلو پر سب سے پہلے غور کرنے کے لئے بھٹ نائک تعریف کا مستحق ہے۔ اس کے علاوہ "رس" کا نفسیاتی مواد اور وہ طریقہ جس سے اُسے ایک امکانی صورت ملتی ہے، اُسے سب سے پہلے بھٹ نائک ہی نے واضح کیا۔ نیز اُس نے صاف طور پر یہ بیان کر دیا کہ رس (احساسِ کیف) ایک غیر معمولی عمل ہے۔ اور اس کی شرح عام دُنیوی اصول و قوانین کے لحاظ سے کسی صورت میں بھی نہیں کی جا سکتی۔

بھٹ نائک اپنی شرح کو بیان کرنے سے پہلے دوسرے نقادوں کی تشریحات کے کمزور پہلوؤں پر بحث کرتا ہے۔ فرض کیجئے کہ "رس" ایک "پراگت" یعنی خارجی شے ہے۔ خواہ وہ اصلی ہیرو میں ہو یا اداکار میں۔ اس صورت میں اس کا ردِّ عمل ہم پر نہیں ہو سکتا۔ "رس" کی اپیل ہمارے لئے بے اثر رہتی ہے۔ نیز ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ کسی فن کارانہ تخلیق کے مطالعے یا مشاہدے کے بعد اُن کیفیات سے سامع یا ناظر کو کیف حاصل ہوتا ہے جو اس کے ذہن میں پیدا ہوتی ہیں۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ اگر احساسِ کیف کا تعلق ہماری ذات سے ہے تو اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں کہ "رس کے اظہار" کی نمود ہماری ذات میں ہوتی ہے۔ لیکن یہ بات کچھ ٹھیک نہیں معلوم ہوتی کیوں کہ محرکات ادبی کا مقصد یا مرکزِ رجحان تماشائی نہیں بلکہ اصلی ہیرو یا شاعر ہوتا ہے۔ اس کے خلاف ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ محرکات جن سے شاعر یا اصلی ہیرو کو تحریک ہوتی ہے۔ انفرادی نہیں ہوتے بلکہ ان کی حیثیت ہمہ گیر ہوتی ہے اور اسی لحاظ سے یہ ہمارے آسودہ احساسات کو بیدار کرتے ہیں۔ لیکن اس صورت میں ہم دیوتاؤں کی کہانیوں، بہادری کے کارناموں اور عام رزمیہ نظموں سے کیونکر متاثر ہوتے ہیں؟ کیونکہ ایسی تمام بیانیہ چیزیں تو کسی طرح کی داخلی حیثیت نہیں رکھتیں دیوتاؤں کی کارگذاریوں کا انسانی کارگذاریوں کے ساتھ کوئی تعلق ہی نہیں۔ ان میں کوئی نسبت ہی نہیں، اس لئے ہم اُن افعال کے بیان سے کیف کیونکر حاصل کرتے ہیں جن کی ہم میں اہلیت نہیں! اگر ہم یہ کہیں کہ مخصوص لفظوں سے محرکات بنتے ہیں، تو یہ بھی درست نہ ہوگا کیونکہ مخصوص الفاظ کا نتیجہ "رس" کا اظہار نہیں ہو سکتا اور نہ تخلیق محض یا ادائیگی (اداکاری) کا نتیجہ کیف کی صورت پیدا کر سکتا ہے۔

ان باتوں سے یہ نتیجہ نکلا کہ "رس" کا انحصار نہ تفہیم پر ہے، نہ تخلیق پر، اور نہ شعر کے اظہار پر بلکہ اس کی تشریح صرف اس طریق پر کی جا سکتی ہے۔ ادبی الفاظ کے تین مخصوص پہلو ہیں۔

۱۔ لغوی اور ثانوی مفہوم۔

۲۔ تخئیلی مفہوم جس میں رس کو دخل ہو، اور

۳۔ وہ مفہوم جس کی تکمیل صرف اُن ذہنوں میں ہو جو ذوقِ سلیم کے مالک ہوں۔

ابھینو گپت اپنی وضاحت کی بنیاد اشارے اور کنائے کے اصول پر رکھتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اُسے اس وضاحت کا خیال کالیداس کے ایک شلوک سے سوجھا ہے۔

راجہ دُشینت اپنے تخت پر بیٹھا ہوا ہے۔ اُسے رانی ہنس پادِک کا ایک شیریں گیت سنائی دیتا ہے جس میں اُس کی بے اعتنائی کا شکوہ ہے۔ اس کی نگاہوں کے سامنے اچھے مناظر بھی موجود ہیں۔ یہ گیت اور یہ مناظر محرکات بن کر اس کے ذہن کو ایک مرکزِ تفکر پر لے آتے ہیں۔ وہ محسوس کرتا ہے کہ اُسے کچھ یاد آرہا ہے۔ لیکن وہ یہ نہیں سمجھ سکتا کہ یہ یاد آنے والی بات ہے کیا؟ اور اس کے باوجود کہ ابھی چند لمحے پیشتر وہ اچھا بھلا خوش و خرّم تھا، وہ دیکھتا ہے کہ اب اُس کے ذہن پر کسی ناقابلِ بیان غم نے غلبہ پا لیا ہے۔

اس موقع پر کالیداس کا مذکورہ بالا شلوک اس غم کی ایک وجہ کی طرف اشارہ کرتا ہے۔" ایسے موقعوں پر ذہن میں غیر شعوری طور پر کسی گذرے ہوئے جنم کی دوستی کی یاد تازہ ہو جاتی ہے کسی گذشتہ زندگی کا یہ تعلق خاطر اس قدر گہرا ہوتا ہے کہ اُس کا اثر یوں ظاہر ہوتا ہے۔ بیتے ہوئے جنموں کے تاثرات اور واقعات ہمارے ذہنوں میں بہت گہری جڑ پکڑ کر ایک پائیدار صورت اختیار کر لیتے ہیں اور وہ ہماری موجودہ زندگی میں محرکات کے باعث نہایت آسانی سے تازہ ہو سکتے ہیں۔ صرف محرکات کی ضرورت ہے۔ ایسے محرکات شاعری یا ادب میں نہایت آسانی سے مل سکتے ہیں جن سے یہ آسودہ تاثرات یا ورثے میں لیا ہوا تجربات کا ذخیرہ گویا بیدار ہو جاتا ہے۔ اور مختلف احساسات و کیفیات کی بنیاد انہیں پر قایم ہوتی ہے اور پھر ان کیفیات کو المبان وبھاؤ (بنیادی محرک)، اور اُدّی پان وبھاؤ (ثانوی محرک)، سے مزید تحریک ملتی ہے اور اس سارے عمل کا نتیجہ "رس" کے اظہار کی صورت میں ہوتا ہے۔ لیکن بنیادی کیفیت سے احساسِ کیف تک کا یہ عمل ایک پر اسرار عمل ہے۔ ہمیں احساسِ کیف کا شعور ہوتا ہے۔ لیکن اس عمل کے بھید ہم پر نہیں کھلتے "شکنتلا" کے مندرجہ بالا واقعہ میں راجہ دُشینت کو یہ معلوم تھا کہ وہ خوش آیند گیت سُن رہا ہے لیکن وہ اُس پر اسرار عمل کی تہ تک نہیں پہنچ سکتا تھا جس کی وجہ سے اس کے ذہن پر اچانک مسرت کی بجائے غم و افسوس نے غلبہ پا لیا۔ اسی طرح کسی فن کارانہ تخلیق سے ہمیں احساسِ کیف تو ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر کوئی یہ پوچھے کہ یہ احساسِ کیف کیونکر ہوا؟ تو ہم اس کا جواب دینے سے معذور ہیں۔ ہم ایک ڈرامہ دیکھتے ہیں، ہم کوئی گیت سنتے ہیں، کوئی افسانہ پڑھتے ہیں یا کوئی شعر سنتے ہیں اور ہمیں احساسِ کیف ہوتا ہے۔ ان تخلیقات کی نوعیت کے لحاظ سے ہمیں مسرت ہوتی ہے، یا ہم پر ملال کا غلبہ ہو جاتا ہے، بلکہ بعض اوقات اس کیفِ غم و مسرت میں ہم اپنے آپ کو بھول جاتے ہیں۔ ہمیں کبھی یہ خیال ہی نہیں آتا کہ اس حظ اندوزی میں کوئی خاص عمل بھی واقع ہوا یا نہیں، اس لئے ابھینو گپت کا یہ کہنا بہت صحیح ہے کہ ہمیں ایک ناقابلِ فہم طریق پر احساسِ کیف ہوتا ہے اس عمل کو ابھینو گپت اشارے یا کنائے کا عمل کہتا ہے۔ اس لئے اس کے خیال میں "رس ایک سُجھائی ہوئی بات" ہے۔ یہ گویا ایک طرح کی آنکھ مچولی ہے جس میں ہم بہت سی گم شدہ اشیاء میں سے کسی ایک کو تلاش کر لیتے ہیں۔ آنکھ مچولی میں ہم کیوں زید کو جا پکڑتے ہیں، بکر کیوں ہمارے ہاتھ نہیں آتا، یہ محض حسنِ اتفاق ہے بعض دفعہ ایک نہایت غمگین شعر بھی ہم پر اثر نہیں کرتا اور بعض دفعہ ہم ایک مسرت انگیز شعر سے بھی تلازم خیال کی بنا پر غمگین ہو جاتے ہیں۔

گویا اس وضاحت کی بنا پر ابھینو گپت اِس اعتقاد کا حامی ہے کہ انسان پیدایش پر گذشتہ زندگی کے تاثرات اپنے ساتھ لے کر آتا ہے جو اُس کے ذہن میں آسودہ ہوتے ہیں اور تعلیم و تربیت اور موجودہ زندگی کے تجربات اُن آسودہ تاثرات میں ایک ایسی شدت پیدا کر دیتے ہیں کہ وہ شعر و ادب کی تحریک پر بیدار ہو جاتے ہیں۔ ہر ہستی میں پیدائش ہی سے مسرت کی طرف ایک جبلّی میلان اور غم و اندوہ سے ایک جبلّی نفرت موجود ہوتی ہے۔ اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ احساسِ کیف کی تمام صورتوں میں ذہنی فضائے بعید میں تاثرات کی موجودگی ایک لازمی چیز ہے۔ ہم دل و دماغ کو ایک ایسے ساز سے تشبیہ دے سکتے ہیں جس میں بہت سے تار ہیں اور ہر تار مختلف بیرونی یا خارجی تحریکات کا تابع ہے اور یہ خارجی تحریکات اپنے مخصوص و معیّن جذبات و احساسات کی گونج پیدا کرتی ہیں۔ خوشگوار احساسات پیدا ہو کر کسی قسم کی دنیوی یا مادّی صورت نہیں اختیار کر لیتے۔ بالکل اسی طرح ان احساسات کے پیدا ہونے کا عمل کسی واضح ضابطے کا محتاج نہیں ہے۔ یہ ایک تخلیقی اور غیر متعلق سا عمل ہے۔ اثرات اپنی علت کے معدوم ہو جانے کے بعد بھی برقرار رہتے ہیں۔ مثلاً پھول کو سونگھنے کے بعد اُسے ناک سے جتنا جی چاہے دُور کر دیجئے، خوشبو کا اثر —— خوشگوار اثر دیر تک قایم رہے گا۔ یا کسی حسین صورت کو دیکھنے سے جو کیف حاصل ہو سکتا ہے، وہ اس حسین صورت کے نظروں سے پنہاں ہو جانے پر بھی جاری رہتا ہے لیکن "رس" کا اظہار یا کسی ادبی تخلیق سے احساسِ کیف جب تک محرکات موجود ہوں تبھی تک رہ سکتا ہے۔ ایک اچھے شعر کا لطف ہمیں اُسی وقت تک آتا ہے جب تک کہ وہ شعر ذہن میں تازہ اور موجود رہے۔ ایک اداکار کی اداکاری سے احساسِ کیف ڈرامے کے دوران میں ہی جاری رہتا ہے۔ ہم منڈوے یا سٹیج سے علیحدہ ہوئے اور لطف ختم ہوا۔ صرف اُس لطف کی یاد ہی باقی رہ جاتی ہے۔ فن کارانہ تخلیق سے پیدا ہونے والے احساسات اُسی وقت تک رہتے ہیں جب تک ذہن اُن کی مخصوص

کیفیت میں ڈوبا رہے۔ محرکات ایک تخلیقی اور تخئیلی شئے ہیں۔ جن میں اُن کے انفرادی اور عارضی لوازم نہیں ہوتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ذہن ایک بہجت افروز کیفیت کی بلندی پر جا پہنچتا ہے اور اُس ذہن میں جس کی توجہ ایک مرکز پر ہوتی ہے یہ محرکات ایک خوشگوار کیفیت کی تکمیل کرتے ہیں جس طرح ہمیں صندل کے شربت میں صندل اور مٹھاس کا علیحدہ احساس نہیں ہوتا اُسی طرح ہمیں محرکات اور غماز اشارات کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ صرف ایک مجموعی لطف حاصل ہوتا ہے۔

لیکن یہاں پر ایک اعتراض کیا جا سکتا ہے۔ محبت اور اسی قسم کے دوسرے خوشگوار جذبات کے متعلق تو ہم مندرجہ بالا وضاحت پیش کر سکتے ہیں، لیکن وہ فن کارانہ تخلیق جس میں نفرت یا غم یا خوف وغیرہ کا بیان ہو اُس سے ہمیں کیونکر کیف مل سکتا ہے! کیوں کہ نفرت، غم اور خوف کوئی لطف انگیز احساسات نہیں ہیں شیلے کہتا ہے کہ "ہمارے سب سے میٹھے گیت وہ ہیں جن میں ہمارے سب سے غمگین خیالات موجود ہوں"۔ غمگین (ناپسندیدہ) خیالات میٹھے (خوشگوار) گیت کیونکر بن سکتے ہیں۔

اس کے جواب کے لئے ابھینو گپت اپنی تشریح کو دو قدم اور آگے لے جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جبلّی تاثرات وسیع مطالعے سے شدید ہو کر ابھر تو بیدار ہو سکتے ہیں۔ ان جبلّی تاثرات کو ہمارے ذہن میں محرکات اور غماز اشارات بیدار کرتے ہیں اور موسیقی اور رقص وغیرہ سے ان ازسرِ نو جاگے ہوئے تاثرات میں ایک گہرائی اور شدت پیدا ہوتی ہے۔ ان ذرائع کے علاوہ چند اور (لیکن کم اہم) ذریعے بھی ہیں جن کا مختصر بیان ذیل میں کیا جائے گا۔

محرکات اور غماز اشارات اس قسم کے ہونے چاہئیں جو ہمارے ذہنی دائرۂ گرفت میں آسکیں۔ اگر ڈرامے میں محیرالعقل واقعات یا مافوق العادت کردار رکھنے ہوں تو اس کے لئے دیومالائی افسانوں کی طرف ہی رجوع ہونا چاہئے۔ اگر افسانہ شاعر کی اپنی اختراع ہو اور اس میں کردار انسانی ہوں تو مافوق العادت واقعات اور افعال نہیں لانے چاہئیں۔ "رس" کی کیفیت کو لانے کے لئے ایسے لسانی اور دوسرے ذرائع استعمال کرنا چاہئیں جو مناسب اور صحیح ہوں۔ نیز تماشائی (ناظر) یا سامع کو کہانی یا نظم اور کسی تخلیق کے مرکزی موضوع یا بنیادی کیفیت کے متعلق شک میں نہیں رکھنا چاہئے۔ جلد سے جلد اس کی وضاحت کر دینا چاہئے۔ کیونکہ اس کے بغیر "رس" کے احساس میں سامع یا ناظر کو بہت مشکل پیش آسکتی ہے۔ جتنا جلد وہ بنیادی کیفیت کے علم سے نزدیک ہو جائے احساسِ کیف بھی اتنی ہی آسانی ہو جائے گی۔

ان باتوں کے علاوہ سب سے آخر میں لیکن سب سے اہم یہ بات ہے کہ اپنے انفرادی جذبات رنج و غم اور عیش و مسرت سے تماشائی بے نیاز ہو جائے "رس" کی کیفیت کے اثر سے اُنہیں بھلا دے۔ ایک مصنف لکھتا ہے۔ "ادب کا مقصد خوش کرنا ہے۔ انسان کی زندگی کے بارِ عظیم کو ہلکا کرنا، ادب کا مقصد یہ ہے کہ وہ چند لمحوں کے لئے انسان کو اس کے غم اُس کے گناہ، اُس کی شکستہ اُمیدیں اور دوسرے تلخ پہلو بھلا دے"۔ اس مقصد کو اسی طور پر پورا کیا جا سکتا ہے کہ محرکات اور غماز اشارات کی نوعیت میں ایک وسعت ہو۔ یہ کام ایک اور طریقے سے بھی ہو سکتا ہے۔ اچھا رقص، شیریں موسیقی اور دل پسند منظر ہمارے ذہنوں کو عام تلازمِ خیال سے اوپر لے جاتے ہیں۔ ابھینو گپت کہتا ہے کہ ایسے محرکات اُس ذہن میں بھی تحریک پیدا کر سکتے ہیں جو "ذوقِ سلیم" کا مالک نہ ہو۔

کیف ایک تسکین ذہنی ہے۔ ایسی تسکین جس میں احساس ذہنی ہر شئے سے ہٹ کر ایک مرکز پر کام کر رہا ہو کسی بات میں کھوئے جانے سے احساس کیف حاصل ہو جاتا ہے خواہ وہ غم ہی کیوں نہ ہو۔ غالب نے کہا ہے[5]

رنج کا خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

اور ایک اور جگہ سے

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا ؛ درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

یہی "عشرتِ قطرہ" یہی "مشکلوں کا آسان ہو جانا" ہی احساسِ کیف ہے تسکین ذہنی ہے ہمیں تب ہی کسی قسم کا اضطراب ہوتا ہے کہ ہمارا ذہن متضاد مقاصد کا حامل ہو۔ سانکھیہ فلسفی کہتے ہیں کہ متلون مزاجی ہی غم کی پرورش کرتی ہے اگر ہمارا ذہن مسرت کی بجائے غم یا غصے میں مکمل طور پر ڈوب جائے تو ہمیں پھر بھی تسکین ذہنی مل سکتی ہے، ایک احساس کیف ہو سکتا ہے۔ یہ کیف کا منفی تصور ہے۔ محبت یا مسرت سے حظ اندوز ہونا احساس کیف کا مثبت تصور ہے۔ ایچ۔ جی ویلز کا ذیل کا بیان بھی کچھ اسی قسم کی بات سمجھا رہا ہے "موسیقی ہمارے غموں کو مٹا نہیں دیتی، بلکہ انہیں ایک المناک مسرت میں تبدیل کر دیتی ہے"۔

سنسکرت ادب میں جمالیاتی نظریوں کا مختصر بیان ختم ہوا لیکن ان میں سے صرف آخری نظریہ (ابھینو گپت کا) ہی کسوٹی پر پورا اترتا ہے۔

بسنت سہائے

حسّیات

خندہ بہ لب، شگفتہ رُو، ناز سے آرہے ہو تم
میری نگاہِ شوق پر حُسن لُٹا رہے ہو تم

زلفِ دراز کھول کر خود کو چھپا رہے ہو تم
کیفیت و سرور کا پردہ بنا رہے ہو تم

ہیرؔ کے شعرِ دمبدم سوز سے گا رہے ہو تم
کس کے کمالِ عشق کا حال سنا رہے ہو تم

طرّۂ زلفِ عنبریں کھول کے میرے روبرو
نکہت و نور و رنگ میں مجھ کو بسا رہے ہو تم

خندۂ دل نواز سے نغمۂ جاں گداز سے
آنکھوں میں بس رہے ہو تم دل میں سما رہے ہو تم

وادیٔ طور کے عوض کس کا مکاں جلاؤ گے؟
چنگ کے تار تار سے شعلے اٹھا رہے ہو تم

ہاتھ میں لے کے میرا ہاتھ کرتے ہو مسکرا کے بات
دونوں جہاں سے چھین کر اپنا بنا رہے ہو تم

ابرِ کرم سے مست ہوں بادہ کشِ الست ہوں
نظریں اُٹھا کے پَے بہ پَے اور پلا رہے ہو تم

کیف ہے یا سرور ہے خواب ہے یا خیال ہے
رُوٹھ کے سو رہا ہوں میں مجھ کو منا رہے ہو تم

جنبشِ شاخِ گُل نہیں لرزشِ موجِ مُل نہیں
سیرِ چمن کے واسطے مجھ کو بلا رہے ہو تم

ہیرؔ کے حُسن و عشق کا چھیڑ کے ذکر اے نظیؔر
عالمِ بود و ہست کو وجد میں لا رہے ہو تم

اصغر حسین خان نظیؔر

ایک گیت

چاہے نہ مجھے گو دل تیرا، تو مجھ کو چاہ بڑھانے دے،
اِک پاگل پریمی کو اپنی چاہت کے نغمے گانے دے
تو رانی پریم کہانی کی، چپ چاپ کہانی سنتی جا،
یہ پریم کی بانی سنتی جا، پریمی کو گیت سُنانے دے.
یہ چاہت میرا جذبہ ہے، میرے دِل کا میٹھا نغمہ،
اِن باتوں سے کیا کام تجھے، اِن باتوں کو کہہ جانے دے
تُو دُور اکیلی بیٹھی ہے سُکھ سُندرتا کی دُنیا میں،
میں دُور بہا جاتا ہوں پریم کی ندّی میں، بہہ جانے دے
گر بھُولے سے اِس جذبے کا تو گیت جوابی گا بیٹھی،
یہ جادُو سب مٹ جائے گا، اِس کو جوبن پر آنے دے
ہاں، جیت میں نشّہ کوئی نہیں، نشّہ ہے جیت سے دُوری میں،
یہ راہ رسیلی چلتا ہوں، اِس راہ پہ چلتا جانے دے

میراجی

شہر کا جادو

فن لینڈ سے کوسوں دور جنگل میں جھیل کے کنارے ایک کسان اپنی بیٹی اینوناکے ساتھ ایک جھونپڑی میں زندگی کے دن گزار رہا تھا۔ وہ موسم سرما میں جھیل کے اردگرد گاؤں کے مکانوں کی چمنیاں صاف کرتا تھا۔ اس سے دونوں کی گزران ہو جاتی تھی۔ ان کا گھاس پھونس کا جھونپڑا شہر والوں کے عالیشان محلات سے بہت دور تھا۔

جھیل کے کنارے ایک اور کٹیا تھی۔ جس میں ایک بوڑھا ماہی گیر اپنی کہن سال بیوی اور نوجوان بیٹے کے ساتھ رہتا تھا۔ یہ باپ اور بیٹا بھی مکانوں کی چمنیاں صاف کرتے تھے۔ جھیل کا نام اسی لڑکے کے نام پر ورتموڈ پڑ گیا تھا۔

ورتموڈ اکثر جھیل سے مچھلیاں پکڑتا اور شہر میں بیچ آتا تھا۔ چونکہ اس کا باپ بڑھاپے کی وجہ سے کام نہ کر سکتا تھا۔ اسی لئے ورتموڈ ہی سب کام کاج کیا کرتا تھا۔

یہ دو مختصر خاندان ایک دوسرے کے رنج و راحت میں برابر کے شریک تھے۔

اینونا کو بچپن میں مچھلیاں پکڑنے کا بہت شوق تھا۔ وہ ہر روز کشتی میں بیٹھ کر جھیل میں اتر جاتی اور اپنے نازک ہاتھوں سے چپو چلانے میں مصروف ہو جاتی۔ کشتی آہستہ آہستہ پانی کی لہروں میں ارتعاش پیدا کرتی ہوئی آگے بڑھتی تھی۔

اینونا کی سریلی اور دلکش آواز پانی کی لہروں پر گونجتی ہوئی جھیل کے اس پار ورتموڈ کی کٹیا میں جا پہنچتی۔ ورتموڈ اس آواز کو سن کر اپنا مچھلی پکڑنے کا جال اور کانٹے اٹھا کشتی میں بیٹھ کر اینونا کے پاس چلا جاتا۔ کئی گھنٹوں تک یہ دو نوجوان ماہی گیر مچھلیاں پکڑتے رہتے۔ شام کے وقت دو کشتیاں سطح آب پر باہم سرگوشیاں کرتی ہوئی نظر آتیں کنارے پر پہنچ کر دونوں اپنی اپنی مچھلیاں نکالتے۔ اینونا کچھ مچھلیاں پکانے کے لئے الگ کر لیتی اور باقی مچھلیاں ورتموڈ کو بیچنے کے لئے دے آتی۔ پھر وہ دونوں ایک دوسرے سے شب بخیر کہتے ہوئے اپنے اپنے جھونپڑوں کو روانہ ہو جاتے۔ اینونا کا باپ اپنے بڑھاپے کے سہارے کو دیکھ کر بہت خوش ہوتا۔ اس کی آنکھوں میں مسرت کے آنسو چھلکنے لگتے اور وہ ہمیشہ اسی قسم کے سوال سے اپنا سلسلۂ کلام شروع کرتا۔ "آج کتنی مچھلیاں پکڑیں بیٹا؟" "اینونا مچھلیاں ملیں؟" اینونا تمام مچھلیاں باپ کے سامنے رکھ کر یہ کہتی ہوئی۔ "ابا دیکھئے۔ اور بہت سی مچھلیاں ورتموڈ کو بیچنے کے لئے دے آئی ہوں۔" باپ سے چمٹ جاتی۔ پھر . . .

آہستہ آہستہ ان کی آواز سنائی دیتی۔ اور آگ کی مدھم روشنی ان کے ہنستے ہوئے چہروں پر پڑتی . . . اور اینونا اپنے کام میں مشغول ہو جاتی۔ یہ اس کا روزانہ کام تھا۔

(۲)

ورتموڈ نے کبھی اینونا کے سامنے اس کے حسن یا اس کے شیریں نغموں کی تعریف نہ کی تھی۔ اس کو خیال تھا کہ ہر شہری لڑکی اینونا سے اچھا گاتی ہوگی۔ کیونکہ اس نے کسی اور لڑکی کا گانا نہ سنا تھا۔

وہ دل ہی دل میں اینونا کے گانے کی تعریف کرتا تھا۔ اس کو یقین تھا کہ اینونا صرف اسی کو بلانے کے لئے راگ الاپتی ہے۔ اس کا دل ہر وقت اینونا کی یاد میں تڑپتا رہتا تھا۔ وہ ہمیشہ اس کے ساتھ رہنا چاہتا تھا۔ جہاں اینونا کے میٹھے گیت ہوں اور وہ ہو! لیکن یہ بات ناممکن تھی!

ہر دوسرے روز وہ شہر میں تمام مچھلیاں فروخت کر کے اینونا کے لئے اچھے اچھے فراک، کیک، مٹھائی اور پھل خرید کر لاتا اور اینونا خندہ پیشانی سے ان سب چیزوں کو قبول کرتی تھی۔ . . . . . آہستہ آہستہ زمانے کے ساتھ ساتھ چمن روزگار کے یہ دو تر و تازہ پودے نشو و نما پانے لگے۔ اب یہ دونوں جوان ہو گئے تھے۔ ان کا پاک اور بے لوث انس اب انتہائی محبت میں تبدیل ہو گیا تھا۔ وہ دنیا والوں سے دور، بہت دور رہنا چاہتے تھے۔ انہیں ایک لمحہ بھی جدا رہنا سخت ناگوار تھا۔

اینونا کے باپ نے اُس کو باہر جانے سے منع کر دیا تھا۔ وہ مچھلیاں پکڑنے بھی نہ جا سکتی تھی۔ کیونکہ سردیوں میں جھیل کا پانی جم جاتا اور کشتی چلانا بہت دشوار ہو جاتا تھا۔ اس طرح اب اینونا کا گھر سے نکلنا قریب قریب ناممکن ہو گیا تھا۔

اینونا کو ورموڈ سے ملے کئی ہفتے گزر گئے۔ لیکن پھر بھی وہ ایک دوسرے کو نہیں بھولے۔ وہ ہر وقت ایک دوسرے کے تصور میں ہی کھوئے رہتے تھے۔

ورموڈ کو جھیل سے اس قدر اُنس ہو گیا تھا۔ کہ وہ گھنٹوں اُس کے کنارے بیٹھا اینونا کی باتیں یاد کیا کرتا۔ اُس کے قدم اینونا کی جھونپڑی کی طرف جانے کے لئے بڑھتے مگر نہ جانے پھر کیوں رُک جاتے۔ ورموڈ اُس کشتی کو جس میں اینونا مچھلیاں پکڑا کرتی تھی۔ پہروں دیکھتا رہتا اُس کی معصوم باتوں اس کے بھولے بھالے خوبصورت چہرے کی یاد اُس کے دماغ کو اپنے سحر سے مسحور کر دیتی تھی۔ اور وہ دیوانہ وار اُس کا نام پکارتا ہوا واپس لوٹ جایا کرتا تھا۔ اس کی آواز لہروں پر گونج کر اوپر اُٹھتی مگر اینونا تک نہ پہنچ سکتی تھی۔

اِدھر اینونا بھی اکثر چھپ کر اپنی کٹیا سے باہر نکل جاتی اور جھیل تک پہنچ کر اپنی سُریلی اور دلکش آواز میں گانا شروع کرتی۔ وہی گانا جو وہ کشتی میں بیٹھ کر گایا کرتی تھی۔

اُس کی آواز ورموڈ کے کانوں تک پہنچتی۔ وہ جھیل کی طرف دوڑتا ہوا آتا۔ لیکن تلاش کے باوجود اُس کو نہ پا سکتا تھا۔ کیونکہ وہ واپس جا چکی ہوتی۔ ورموڈ افسردہ خاطر واپس لوٹ جاتا۔

(۳)

ان دونوں کی بڑھتی ہوئی محبت اُن کے والدین سے پوشیدہ نہ رہ سکی۔ ایک روز ورموڈ کے ماں باپ ورموڈ کی شادی کا پیغام لے کر اینونا کے بُوڑھے باپ کے پاس آئے۔ اور اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد اُنہوں نے جھجک جھجک کر اپنا مدعا بیان کیا۔ بوڑھے باپ نے اُن کی درخواست بخوشی منظور کر لی۔ . . . . شادی کی تاریخ بھی مقرر ہو گئی۔

دونوں جوان تھے۔ اینونا اور ورموڈ کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ وہ شادی کی تاریخ کا بے چینی سے انتظار کرنے لگے۔ ورموڈ اب ہر روز نئے نئے تحائف خریدتا تھا۔ تاکہ شادی کے موقع پر اپنی اینونا کو دے سکے۔ اُدھر اینونا مچھلی کے چمکیلے پروں کو رنگ کر ہار بناتی تھی۔ لیکن قسمت اُن کی خوشی پر مسکرا رہی تھی۔

وہ دونوں ہر چیز سے بے خبر اُس دنیا میں رہتے تھے۔ جہاں محبت کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔

دن گزرتے گئے۔ بہار پھر رنگ برنگے پھولوں سے آراستہ ہو کر چمنستانِ جہاں کی آرائش میں مصروف ہوئی۔ پرندوں نے اپنے چہچہوں سے اُس کا استقبال کیا۔ خاموش کلیاں ایک بار پھر مسکرانے لگیں۔ جھیل ورموڈ کا پانی پوری آب و تاب سے رواں ہو گیا۔

اینونا خنداں و شاداں جھیل کے کنارے پر آئی۔ اُس نے گلابی لباس زیب تن کر رکھا تھا۔ جس سے اُس کا حُسن زیادہ دلکش ہو گیا تھا۔ وہ کشتی میں بیٹھ کر جھیل میں اُتر گئی اور حسب عادت گانا شروع کیا۔ اُس کی آواز میں ایک خاص کشش تھی۔ جو سننے والوں کو اپنی طرف کھینچتی تھی۔ وہ گاتی رہی اور کشتی چلاتی رہی۔ یہاں تک کہ اپنے گاؤں سے بہت دُور نکل گئی۔

اُس پار چند امیر آدمی شکار کے لئے آئے تھے۔ اُن کے کانوں تک اینونا کی دلفریب آواز جھیل کی لہروں پر ناچتی ہوئی پہنچ گئی۔ وہ سب کے سب کیف سے جُھومنے لگے۔

یہ لوگ جھیل کے کنارے پر کھڑے تھے۔ اُنہوں نے اینونا کو اشارے سے اپنے پاس بُلایا۔ اینونا کشتی کو کنارے پر لے گئی۔ وہ ان کو حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ کیوں؟ اُس نے تمام عمر کسی شہری کو نہ دیکھا تھا۔ اگرچہ اُس نے کئی مرتبہ ورموڈ سے کہا کہ وہ اُسے شہر لے جائے۔ لیکن کسی نے اُس کی تمنا پوری نہ ہونے دی۔ آج جبکہ عرصہ کی آرزو پوری ہوئی تو وہ اُس سے لطف اُٹھا رہی تھی۔

نہ معلوم وہ کتنی دیر تک اُن کو دیکھتی رہی کہ ایک نوجوان نے کہا "آپ کا گانا ہمیں بہت پسند آیا۔ ہمارے شہر میں کوئی بھی لڑکی ایسا نہیں گا سکتی۔ واہ واہ! کیا کہنے!"

اس پر تمام لوگوں نے اُس کی تائید کی اور اینونا کے گانے کو سراہنے لگے۔

اینونا نے تمام عمر میں پہلی مرتبہ اپنے گانے کی تعریف سُنی تو وہ بہت ہی خوش ہوئی اور دل ہی دل میں ورموڈ کو بُرا بھلا کہنے لگی کہ اُس نے تو کبھی بھی اُس کے گانے کی تعریف نہ کی تھی۔ آخر کیوں؟ اینونا سوچ

رہی تھی۔ کہ ایک نوجوان نے کہا۔
"آپ کہاں اور کس کے پاس رہتی ہیں؟ کیا ہمیں ساتھ لے چلیں گی؟"

اینونا نے اس سوال پر بغیر کسی قسم کی حیل و حجت کے اپنی زندگی کا مختصر ورق اُلٹ دیا۔ اور اُن لوگوں کو اپنے باپ کے پاس لے جانے پر آمادہ ہوگئی۔

جب یہ لوگ اینونا کی جھونپڑی میں پہنچے تو اُس کا باپ مچھلی پکڑنے کے بوسیدہ جالوں کی مرمت کر رہا تھا۔ اُس نے جب اپنی بیٹی کو اجنبی آدمیوں کے ساتھ دیکھا تو فوراً ہی اُس کو خیال ہوا۔ شاید یہ امیر آدمی انہیں مچھلیوں کا کام دینے آئے ہیں۔ وہ اپنے خیالات کی منتشر دنیا کو اکٹھا کر رہا تھا۔ کہ ایک نوجوان نے بیس پونڈ کا نوٹ اینونا کے باپ کو دیتے ہوئے کہا۔

"معزز باپ۔ آپ کی بیٹی بہت اچھا گاتی ہیں۔ کیا آپ انہیں ہمارے ساتھ شہر بھیج دینگے؟ ان کی آواز نہایت سُریلی اور دلکش ہے چند دنوں میں شہرت حاصل کرلینگی۔ اور ہزاروں لاکھوں کی مالک ہو جائیں گی۔"

اینونا کا باپ حیرانی میں ہمہ تن گوش ہو کر اس گفتگو کو سن رہا تھا۔ وہ جواب دینے ہی کو تھا کہ اینونا نے باپ سے التجا کی کہ وہ اس کو شہر جانے دے۔ کیونکہ اینونا کو یہ اُمید نہ تھی کہ وہ بھی کسی دن شہر دیکھے گی۔ جانے سے پہلے ورموڈ سے شادی ہو جانے تو اچھا ہے۔

وہ جوان اس بات پر ہنسے اور کہنے لگے "ابھی اس بات کا کونسا موقع ہے؟ ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ جب تم شہر سے واپس آباؤ تو جس سے چاہو شادی کرنا۔ لیکن اس وقت ہمارے ساتھ شہر چلو۔"

شہر کی مشتاق اینونا اُن لوگوں کے ساتھ جانے پر رضامند ہوگئی

اینونا کا باپ بیٹی کو جھیل تک پہنچانے آیا۔ وہ لوگ کشتیوں میں بیٹھ گئے۔ بُوڑھا باپ اپنی زندگی کے سہارے کو اُن کے سپرد کر کے واپس آنا چاہتا تھا کہ اُس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا آگیا - اُس کی سفید داڑھی آنسوؤں سے تر تھی۔ اُس کی آنکھوں کی روشنی ظالم لوگ اس سے ہمیشہ کے لئے چھین کر لے جا رہے تھے۔ آہ! اس لئے صرف اس لئے کہ وہ غریب تھا اور غریبی نے اُس کو ایسا کرنے پر مجبور کیا تھا۔ وہ اپنی بیٹی کو غریب نہ دیکھ سکا۔ اُس نے اُس کو غیر لوگوں کے سپرد کر دیا۔ کشتیاں پانی پر تیزی سے بہے جا رہی تھیں۔ اور بُوڑھا باپ بار بار نگاہیں اُٹھا اُٹھا کر اینونا کو دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

مگر کشتیاں بہت دور جا چکی تھیں . . . . بُوڑھا گھر لوٹ گیا۔

اینونا جب جھیل کا نصف حصہ طے کر چکی تو اُس کو ورموڈ کا خیال آیا۔ اُس نے واپس جانا چاہا لیکن پرندہ ظالم شکاری کی گرفت میں تھا۔ اُس نے اپنی پُرسوز آواز میں ورموڈ کو الوداع کہی۔ اُس کے درد بھرے گیت نے اُس کے ہمسفروں کو بھی آنسو بہانے پر مجبور کر دیا۔ اب اُس کی خوشی، مسکراہٹ، سادگی سب کچھ جھیل کے اُس پار . . . . . ایک جھونپڑی میں رہ گئی تھی۔ اُس کی خوبصورت نیلی آنکھیں آنسو بہا رہی تھیں۔

(۴)

شہر میں پہنچ کر وہ لوگ ایک نہایت پُرتکلف گاڑی میں سوار ہُوئے۔ ایسی گاڑی اینونا نے کبھی نہ دیکھی تھی۔ وہ بہت خوش تھی۔ شہر کے لوگوں کو گاڑی کی کھڑکیوں سے جھانک جھانک کر دیکھ رہی تھی وہ اپنے آپ کو ایک اور دنیا میں تصور کر رہی تھی۔ گاڑی تیز جا رہی تھی

اینونا نے تمام عمر میں اتنے عالیشان مکانات۔ اس قدر خوبصورت اور آراستہ کمرے نہ دیکھے تھے۔ اُس کو نہایت عمدہ بستر دیا گیا۔ اینونا نے آج تک ایسے نرم بستر پر آرام نہ کیا تھا۔ وہ ہر چیز کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی تھی۔ لیکن اب وہ اپنے آپ کو ایک طائر پرشکستہ کی طرح جو ایک قفس میں قید ہو تصور کر رہی تھی۔

اس کے کھوئے ہوئے حواس واپس آگئے تھے۔ وہ پھر آزاد ہونا چاہتی تھی۔ باپ۔ ورموڈ۔ جھیل کا کنارا۔ ان سب کی یاد یکے بعد دیگرے اُس کے دماغ کو بے چین کر رہی تھی۔ اب شہر کو دیکھنے کا جنون اُس کے سر سے اُتر چکا تھا۔ وہ اُٹھی۔ دروازہ کو کھٹکھٹایا، خوب زور سے، لیکن دروازہ نہ کھل سکا۔ تمام رات اینونا نے جاگتے گزاری۔ اُس کی آنکھیں آنسو بہا رہی تھیں۔ اُس کو جھیل ورموڈ کے کنارے یاد آرہے تھے۔ شہر کو دیکھنے کا پیمانۂ شوق لبریز ہو چکا تھا۔

اینونا روتی رہی، تمام رات۔ وہی اینونا جو آنسو کے نام پر مسکرانے لگتی تھی۔ وہی اینونا جو باپ کے سامنے ایک آنسو بھی نکالتی تو بوڑھا باپ ہزار کوششوں سے اُس کو چپ کراتا۔ طرح طرح کی چیزیں دیتا۔ کھلونے لاتا۔

مٹھائی دیتا تا کہ اینونا آنسو نہ بہائے۔ آج وہی اینونا نہ معلوم کتنے آنسو بیکار بہا چکی تھی۔ اور بہائے جا رہی تھی لیکن اس کے باپ کو اس کی خبر بھی نہ تھی رات ختم ہوئی!

صبح ملازم نے دروازہ کھولا اور چائے۔ بسکٹ، انڈے ایک بڑے سے طشت میں لئے داخل ہوا۔ اینونا اس قسم کی چیزوں سے بخوبی واقف تھی۔ ورتموڈ ہمیشہ شہر سے اُس کے لئے یہ چیزیں لے جایا کرتا تھا۔

بھوک نہ ہونے کے باوجود اُس نے چائے پی لی اور ملازم برتن لے گیا۔ کچھ عرصہ کے بعد اینونا کے مہربان میزبانوں نے اُس کو ایک چمکیلے لباس سے آراستہ کیا۔ اینونا اُس لباس میں بہت خوبصورت نظر آ رہی تھی وہ قدِ آدم آئینہ میں اپنے لباس کو بار بار دیکھتی تھی اور دل ہی دل میں اپنے حسن و جمال پر خوش ہو رہی تھی۔ اُس کے بعد اینونا ایک عالیشان اور وسیع ہال میں پہنچی۔ کمپنی کے مالک اور ڈائرکٹر نے اُس کو بتایا کہ جب اسٹیج کا پردہ اُٹھے تو وہ آہستہ آہستہ اسٹیج پر سامعین کے سامنے آئے اور اپنے سر کو خم دے کر گانا شروع کر دے۔ گانا ختم ہونے پر بھی اپنا سر جھکائے اور پردہ گرنے کے ساتھ ساتھ واپس لوٹے۔ اگر دیکھنے والے تالیاں بجائیں تو پھر اسٹیج پر آئے اور جھک کر اس داد و ستائش کو قبول کرے اور واپس چلی آئے۔ اس قسم کے کئی سبق نوآموز اینونا کو دئیے گئے۔ جن کو وہ اپنی قابلیت اور ذہانت سے تھوڑے ہی عرصے میں سیکھ گئی۔ ہر روز موسیقی کا اُستاد اُس کو گانا سکھانے آتا تھا۔ وہ کئی روز تک اینونا کو گانا سکھاتا رہا۔

(۵)

آخر وہ دن آپہنچا جب اینونا کو اسٹیج پر آنا تھا۔ صبح سے اُس کو ہدایات دی گئیں اور کئی مرتبہ ریہرسل کرائی گئی۔

اُدھر گھڑی نے چھ بجائے۔ اِدھر ہال لوگوں سے بھرنے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہال لوگوں سے کھچا کھچ بھر گیا۔ تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ لوگ ایک نئی گانے والی کو دیکھنے کے لئے بیتاب ہو رہے تھے۔ آخر گھنٹی بجی اور اسٹیج کا پردہ اُٹھا۔

اینونا رنگ برنگ کے چمکیلے لباس سے آراستہ، ہیروں کے زیورات سے مزین اسٹیج پر آئی۔ لوگوں نے اُس کا تالیوں سے استقبال کیا۔

لوگوں کی اتنی زیادہ تعداد دیکھ کر اینونا کے پاؤں اسٹیج پر نہ جم سکے۔ وہ لڑکھڑانے لگی۔ اُس کو جھیل ورتموڈ کا خاموش کنارا یاد آ گیا۔ جہاں وہ اور ورتموڈ دونوں سیر کرتے تھے۔ کچھ دیر کیلئے وہ سوائے اس کے کہ وہ جھیل ورتموڈ میں کشتی چلا رہی ہے اور سب کچھ بھول گئی۔ وہ گیت جو اینونا کو اس موقع کے لئے سکھایا گیا تھا۔ اُس نے اپنی سُریلی اور دلکش آواز میں گانا شروع کیا۔ وہی گیت جو ورتموڈ کو بلانے کے لئے وہ جھیل کے کنارے پر گایا کرتی تھی۔ بالکل وہی گیت! اُس کے گیت نے ہال میں گونج پیدا کر دی۔ تمام لوگ ہمہ تن گوش سُن رہے تھے۔ اُن کی آنکھیں اینونا کے چہرے پر گڑی ہوئی تھیں۔ اینونا کا پہلا گیت بہت پسند کیا گیا۔

اینونا گانا ختم کر چکنے کے بعد اسٹیج سے رخصت ہوتی حاضرین کچھ ایسے محوِ حیرت تھے کہ اُن کو یہ بھی معلوم نہ ہوا۔ کہ اینونا کب اسٹیج سے گئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ لوگوں نے بہت دیر کے بعد محسوس کیا کہ اینونا اسٹیج پر موجود نہیں ہے پھر تالیوں کا شور برپا ہوا۔ اینونا اینونا۔ اینونا کے نعرے بلند ہوئے اور پھر اینونا کو اسٹیج پر لایا گیا۔ اینونا اسٹیج پر آئی تو اُس کے حواس قائم تھے۔ اُس نے سر کو خم کر دیا۔ اور چہرے پر اپنی کھوئی ہوئی ہنسی کو لانے کی کوشش کی۔ اُس نے پھر گانا شروع کیا۔

اس عرصہ میں لوگوں نے تالیاں بجائیں۔ خوب۔ واہ واہ کے نعرے بلند کئے۔ اور آخر محفل سرد ختم ہوئی!

دوسری صبح اینونا کے کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک پختہ سال آدمی جو کمپنی کا مالک تھا۔ اندر داخل ہوا۔ اُس نے ایک ڈبہ اینونا کی میز پر رکھا۔ جس میں کئی نوٹ اور چمکتے ہوئے سکے تھے۔ جب اینونا کو یہ معلوم ہوا کہ سب روپیہ اُس کا ہے تو اُس نے چاہا کہ روپیہ لے کر واپس اپنے گاؤں چلی جائے۔

اس پر کمپنی کا مالک ہنسا اور اُس نے کہا۔

"نادان لڑکی! ابھی تو یہ پہلا دن ہے اور اس میں کچھ زیادہ آمدنی بھی نہیں ہوئی۔ اگر تم میرے ساتھ تمام ملکوں میں چلو گی۔ تو ایسے ہزاروں ڈبے نوٹوں سے بھر جائیں گے۔ پھر تمہاری شادی بھی ہو جائے گی۔ اور تم ورتموڈ جیسے کئی گاؤں خود خرید سکو گی۔

اینونا، معصوم سادہ لوح لڑکی اس کی بات پر رضامند ہو گئی۔ اور وہ بوڑھا کھوسٹ مالک جو اُس کی آزاد زندگی کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دینے پر تُلا ہوا تھا۔ ہنستا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

(۶)

اس عرصے میں اینونا اس قدر مشہور ہوگئی تھی۔ کہ ہر شخص اُس کا معترف تھا۔ اخباروں کے صفحات اُس کی تعریف میں سیاہ ہو رہے تھے۔ دیواروں پر اُس کی تعریف کے اشتہار چسپاں تھے۔ وہ دُور دُور کے ملکوں میں کمپنی کے ساتھ گئی۔ اُس کے سراہنے والوں کی تعداد روز بروز زیادہ ہوتی جاتی تھی۔ جب وہ اسٹیج پر گاتی تو لوگ واہ واہ کے بلند نعرے لگاتے لوگوں نے اُس کو "ملکۂ موسیقی" کا خطاب دیا۔ اب وہ دیہاتی لڑکی اینونا نہ تھی بلکہ "ملکۂ موسیقی اینونا" تھی۔

اُس کی تعریف سُن کر کئی شہزادوں نے اُسے دعوتیں دیں۔ کئی شہزادیوں نے اُسے مدعو کیا۔ اور انواع و اقسام کے تحائف دے کر اپنی تعریف کی داد چاہی۔ غریب لوگوں نے پھولوں کے گلدستوں سے اپنی عقیدت ظاہر کی۔ اینونا کو ہوٹلوں میں ہزارہا تحائف ملے جن کے بھیجنے والوں کے ناموں سے بھی وہ واقف نہ تھی۔

اسی طرح ایک ملک سے دوسرے ملک میں اینونا کو لے جایا گیا اُس نے ہزاروں روپے کمائے اور خرچ کر دیئے۔ اُس کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ اب وہ کتنی دولت مند ہے۔ اس عرصہ میں اینونا نے اپنے باپ کو ایک خط لکھا اور چند پونڈ بھی بھیجے۔ مگر گاؤں کے پادری نے جواب میں لکھا۔ کہ اُس کا باپ مر گیا ہے۔ اینونا کو بہت رنج ہوا۔ ـــــ لیکن فوراً ہی اُسے گانے کے لئے تیار کیا گیا۔ آہ۔ اُس کو گانے سے کام تھا۔ وہ سب کچھ بھول گئی تھی۔ شاید درتموڈ کو بھی۔ اب وہ تھی اور موسیقی!

(۷)

ایک رات اینونا اسٹیج پر کھڑی تھی۔ ہال تماشائیوں سے بھرا ہوا تھا۔ سامنے کی گیلری میں بادشاہ شہزادے اور شہزادیاں عمدہ عمدہ لباس پہنے رونق افروز تھے۔ اینونا نے گانا شروع کیا۔ جب وہ اپنے گیت کے مشہور اور ہر دلعزیز حصے کو گانے لگی۔ تو اُس نے اپنا سر اُٹھایا۔ اُس نے اوپر کی گیلری میں ایک آدمی کو اپنی طرف گھورتے ہُوئے دیکھا۔ جو آگے کی طرف جُھکا ہُوا دیکھا۔

اینونا کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اُس کی دل میں درتموڈ کی بُھولی ہُوئی یاد تازہ ہوگئی۔ کیونکہ اُس آدمی کی شکل ہوبہو درتموڈ کی سی تھی اینونا بار بار یہی سوچتی تھی۔ "یہ درموڈ ہی ہے۔" جب تک وہ گاتی رہی اُس کی آنکھیں اُس کے چہرے پر گڑی رہیں۔ وہ اُس کو پہچاننے کی کوشش کر رہی تھی۔ اُس کا چہرہ، اُس کی مسکراہٹ، اُس کی زلفوں کے خم سب درموڈ کے سے تھے۔ "یہ درتموڈ ہی ہے"۔ اینونا کو یقین ہوگیا۔ اُس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اُس کی آواز کانپنے لگی۔ وہ بہت پریشان ہوگئی۔

یہ پریشانی اُس کو ایک مدت کے بعد نصیب ہُوئی تھی۔ جب سے وہ گاؤں سے آئی تھی۔ وہ اتنی پریشان کبھی نہ ہُوئی تھی۔

اینونا نے اُس نوجوان کو بھی اپنے رُومال سے آنکھیں پُونچھتے ہُوئے دیکھا۔ اینونا سب گانے بھول گئی۔ اُس نے پُرانی یاد کو از سرِ نو تازہ کرنے کے لئے وہی گیت جو وہ جھیل درتموڈ کے کنارے گایا کرتی تھی۔ گانا شروع کیا۔ اپنی پوری طاقت سے پوری آواز سے، دل کے پورے احساس سے، اُس کے گانے سے تمام لوگوں کے دلوں میں ایک جوش سا پیدا ہوگیا اور سب اُس کے درد بھرے گیت کے کیف سے جھومنے لگے۔ کئی شہزادیاں آنسو بہانے لگیں۔

بادشاہ نے اپنا قیمتی ہیروں کا ہار اسٹیج پر پھینکا۔ اُس کے بعد پھولوں کی بارش ہوئی۔ اس قدر پھول برسائے گئے۔ کہ اینونا پھولوں میں چُھپ گئی۔ اینونا گاتی رہی۔ ایک مرتبہ دو مرتبہ تین مرتبہ وہی گیت گاتی رہی۔ لوگوں کا اشتیاق بڑھتا گیا۔ جب وہ گانا ختم کر کے واپس چلی گئی تو پھر تالیاں بجا بجا کر اُسے اسٹیج پر بلایا گیا۔ تقریباً چھ سات مرتبہ وہ اسٹیج پر آئی۔ جب اُسے آٹھویں مرتبہ بلایا گیا تو اینونا ہال سے غائب تھی۔ اس مرتبہ اسٹیج کا سیاہ پردہ نہ اُٹھا۔

اینونا اسٹیج سے باہر نکل کر اپنی گاڑی میں سوار ہُوئی۔ اور ملازم کو درموڈ کے بلانے کے لئے بھیجا۔ . . . کچھ عرصہ میں درتموڈ اینونا کے پاس آیا۔ دونوں کر خوب روئے۔ درموڈ بھی گاڑی میں سوار ہوگیا۔

اُس نے اپنی تمام سرگزشت سنانی شروع کی۔ کہ کس طرح اینونا اُس سے ملے بغیر گاؤں سے رُخصت ہوگئی۔ اور وہ اُس کا منتظر رہا۔ لیکن جب وہ واپس نہ آئی تو وہ اُس کی تلاش میں تمام ملکوں میں سرگرداں پھرا کیا۔ مگر کہیں بھی اُسے پا نہ سکا۔ گاؤں کے لوگ جب اخباروں میں اینونا کی شہرت کے متعلق کچھ پڑھتے تو بہت حسد کرتے اور کہتے کہ "ایک چمنی صاف کرنے والے کی بیٹی کیونکر اس رتبہ پر پہنچ گئی"۔

اور جب وہ کہتا کہ اینوناضرور گاؤں آئے گی تو وہ لوگ اس کی ہنسی اُڑاتے۔ تمام شہروں میں تلاش کے باوجود جب وہ نہ ملی۔ تو آخر اس ملک میں پہنچنے پر معلوم ہؤا کہ کل اُس کا گانا ہے چنانچہ وہ بھی بہت مشکل سے گیلری کا ٹکٹ خریدنے میں کامیاب ہوگیا۔ اور اپنی کھوئی ہوئی اینونا کو پالیا۔

اینونا اُس کی باتیں غور سے سُن رہی تھی۔ وہ اُس سے سوال پر سوال کر رہی تھی۔ گویا پانی کا چشمہ بہا چلا جا رہا تھا۔

اُس نے گاؤں چھوڑنے کے بعد کسی سے اپنے دل کی بات نہ کی تھی۔ اُن دنوں روپے کے سوا اور کوئی خوشی حاصل نہ ہو سکی وہ دونوں ایک موضوع سے ہٹ کر دوسرے موضوع پر باتیں کئے جا رہے تھے۔ اینونا اپنی جھونپڑی۔ بوڑھے کتے اور پادری کے متعلق دریافت کر رہی تھی۔ پھر جھیل اور پرانی کشتیوں کا خیال آیا۔

گاڑی تیزی سے جا رہی تھی اور یہ دونوں باتوں میں محو تھے۔ یہاں تک کہ گاڑی ہوٹل کے دروازے پر رُکی۔ اینونا اُتر کر اندر گئی اور ورنموڈ دوسرے روز ملنے کا وعدہ کر کے اُس سے رخصت ہؤا۔ . . . .

تمام رات اینونا کو نیند نہ آئی۔ پرانے خیالات جن کو وہ عرصہ سے بھلا چکی تھی۔ یکے بعد دیگرے اُس کے دماغ میں آ رہے تھے۔

اُس کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنی کُٹیا میں ہے۔ وہ اور ورنموڈ مچھلیاں پکڑنے جھیل میں جاتے ہیں۔ ورموڈ تو کئی مچھلیاں پکڑ لیتا ہے۔ لیکن اینونا تلاش اور کوشش کے باوجود ایک مچھلی بھی نہیں پکڑ سکتی۔ شاید یہ بھی اینونا سے ناراض ہوں۔ پھر سوچتی کہ کس طرح وہ ورنموڈ سے شادی کی درخواست کرے۔ کیا اب وہ اُس کو پسند کرے گا۔

اسی قسم کے خیالات اُس کو پریشان کر رہے تھے . . . . کہ دن نکل آیا۔ سورج اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ نمودار ہُوا۔

اینونا لباس پہن کر اپنے ورنموڈ کا انتظار کرنے لگی۔ . . . دروازہ کھُلا ورنموڈ کمرے میں داخل ہؤا دونوں بہت دیر تک باتیں کرتے رہے خُوب ہنسے۔ اُن کی باتیں کسی صورت بھی ختم نہ ہوتی تھیں۔ وہ پرانے واقعات کو بار بار دُہرا رہے تھے۔ کبھی جھیل ورنموڈ کا ذکر تھا کہ فوراً ہی کُٹیا اور کشتیاں یاد آ جاتی تھیں۔

اینونا نے اپنے پرانا گیت گانا شروع کیا۔ جو وہ جھیل پر گاتی تھی اور جس کا پہلا مصرعہ "ورنموڈ۔ ورموڈ۔ آؤ۔ آ بھی جاؤ" تھا۔

ابھی وہ اتنا ہی کہنے پائی تھی کہ اُس نے اپنا مُنہ دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ لیا۔ کیونکہ اُس کو معلوم ہو گیا تھا۔ کہ اب ورنموڈ اُس سے شادی نہ کرے گا۔ اس خیال نے اُس کو پھر پریشان کر دیا۔

اینونا نے چاہا کہ ورنموڈ کو شہر دکھائے۔ دونوں نے خوب سیر کی شام کے وقت ہوٹل واپس آئے تو اینونا کی میز پر کھانا لگا ہؤا تھا۔ اُس میز پر رنگا رنگ کے پھول۔ چاندی کے گلدستوں میں نہایت خوش اسلوبی سے سجائے گئے تھے۔

نوکر انواع و اقسام کے کھانے میز پر رکھتے جاتے تھے۔ اینونا اور ورنموڈ کھانے میں مشغول تھے۔ لیکن اُن کو اپنی دیہاتی زندگی کا زمانہ یاد آ رہا تھا۔ وہ جَو کی روٹی کو نہ بھُول سکے۔ وہ بار بار اُس وقت کو یاد کرتے جب دونوں روٹیوں کے بچے کھچے ٹکڑے کشتیوں میں بیٹھ کر کھاتے تھے۔

کھانا کھانے کے بعد ورنموڈ اینونا سے وعدہ لے کر کہ وہ بہت جلد واپس گاؤں آئے گی۔ اور اپنی بوسیدہ اور ویران جھونپڑی کو پھر آباد کرے گی۔ اینونا سے رخصت ہؤا۔

ورنموڈ نے گاؤں پہنچ کر تمام لوگوں سے کہا کہ اینونا بہت جلد گاؤں آنے والی ہے۔ لوگ اُس کی اس بات پر بہت ہنسے۔

لیکن ورنموڈ کو یقین تھا کہ اینونا ضرور آئے گی۔ . . . ایک شام ورنموڈ مچھلی پکانے میں محو تھا کہ جھونپڑی کا دروازہ کھُلا اور اینونا نہایت زرق برق لباس میں ملبوس اندر داخل ہُوئی۔ ورنموڈ بہت ہی خوش ہؤا اور اُس نے تمام لوگوں کو اُس کے آنے کی خبر دی۔ حاسد جل بھُن کر رہ گئے۔ اینونا نے اپنی جھونپڑی کو مرمت کرایا اور اُس میں رہنے لگی۔ اُس نے ہفتہ بھر اپنے پیارے گاؤں کی خوب سیر کی۔ دونو کشتی میں بیٹھ کر جھیل میں اُتر جاتے اور مچھلیاں پکڑتے۔ بیچنے کے لئے نہیں صرف شوق کے لئے۔ وہ دونو بہت خوش تھے۔

اینونا سوچتی کہ وہ گاؤں کی عمدہ صاف ہوا کو چھوڑ کر کیوں اتنی مدت تک شہر میں رہی۔ اب وہ کبھی اس جگہ سے نہ جائے گی۔ ایک دن جب اینونا سو کر اُٹھی تو دُھند چھائی ہوئی تھی۔ اور بارش کی زیادتی سے جو تمام رات ہوتی رہی تھی گاؤں کی زمین کیچڑ ہی کیچڑ ہو رہی تھی۔

اینونا تمام دن اپنی کھڑکی میں بیٹھی رہی۔ اُس کا خیال تھا۔ کہ دوسرے روز مطلع صاف ہوگا۔ مگر دوسرے روز اُس سے بھی زیادہ بارش ہُوئی۔ جھیل لبالب بھر گئی۔ جنگل میں پانی ہی پانی ہو گیا۔ ہوا نہایت تندی

اور تیزی سے چلی۔ اینونا اس منظر کو دیکھ کر نہایت اُداس ہوئی۔ کیونکہ وہ تین روز سے جھونپڑی میں بند تھی۔ ورموڈ بھی پانی کی وجہ سے اُس کے پاس نہ پہنچ سکا۔ اینونا واپس شہر جانے کے لئے تیار ہوگئی۔ اور ورموڈ لوٹنے سے بغیر بعید شکل جھیل کو عبور کرکے دوسرے کنارے پر پہنچی۔

کمپنی کا مالک اُس کا منتظر تھا۔ وہ دونوں کمپنی کے ساتھ ساتھ ایک ملک سے دوسرے اور تیسرے میں گئے۔ اینونا گاتی رہی۔ دن مہینوں میں۔ مہینے سالوں میں تبدیل ہوگئے۔ کئی بار کونپلیں پھوٹیں اور پھر مُرجھا گئیں۔ اُدھر اینونا کی شہرت بھی زمانے کے ساتھ ساتھ بڑھتی گئی۔

اب اینونا کی آواز خراب ہونے لگی۔ کئی ایک ڈاکٹروں نے علاج کئے۔ مگر اُس کی آواز میں وہ لوچ وہ کشش۔ وہ جدت نہ رہی۔ پھر بھی وہ گاتی رہی۔ اخباروں میں اُس کی بُرائیاں لکھی گئیں اُس کے گانوں کے برخلاف احتجاج کیا گیا۔ لوگوں نے اُس کی آواز کو بُرا بھلا کہا مگر کمپنی کے مالک نے اُس کو شہرت دینی چاہی۔ وہ اُسے دوسرے شہروں میں لے گیا۔ لیکن اینونا کی آواز ویسی نہ بن سکی جو دیہاتی اینونا اپنے گاؤں سے لے کر آئی تھی۔

اینونا کی آمدنی کم ہوتی گئی۔ وہ اب بھی شان سے رہتی تھی۔ اُس کو یقین تھا۔ کہ وہ پھر ایک بار چمکے گی۔ پہلے کی طرح۔

اخباروں کے ایڈیٹروں نے صاف صاف لکھنا شروع کیا۔ کہ اینونا نہایت بُرا گاتی ہے پھر اُس کو اسٹیج پر لاکر کیوں روپیہ ڈبویا جاتا ہے کمپنی نے اُس کو جواب دے دیا۔ جس سے اینونا کو بہت رنج ہوا۔ اُس نے تمام ہیروں کے زیورات قرض خواہوں کو دے کر اپنا پیچھا چھڑایا۔

وہ اینونا جو کبھی "ملکہ موسیقی" کے نام سے موسوم تھی۔ جس کے ایک ایک قدم پر شہزادے پھولوں کے ڈھیر لگا دیتے تھے شہزادیاں اپنے زیورات دے کر مسرت حاصل کرتی تھیں۔ اُسی اینونا کے لئے اب رہنے کو بھی کوئی جگہ نہ تھی۔ کمپنی کا ظالم۔ بدفطرت۔ لالچی مالک جو اینونا معصوم۔ سادہ لوح۔ دیہاتی اینونا کو اُس کے باپ۔ منگیتر اور گاؤں سے جُدا کر لایا تھا۔ جس نے اُس کی راحت۔ شادمانی۔ ہنسی خوشی سب کچھ چھین لی تھی۔ اُس نے بھی اُس کو ٹھکرا دیا۔

بیکس اینونا کے پاس رہنے کی جگہ بھی نہ تھی۔ اس وقت اینونا کو اپنی کٹیا۔ گاؤں اور جھیل کا کنارا یاد آیا۔ جہاں وہ تمام دن گاتی تھی۔ جہاں کوئی اخبار اُس کے متعلق بُرا بھلا نہ لکھ سکتا تھا۔ کوئی قرض خواہ اُس کو تکلیف دے کر اُس سے اُس کے پسندیدہ زیورات نہ چھین سکتا تھا۔ وہاں وہ کتنے آرام سے اپنی کٹیا میں زندگی بسر کر رہی تھی۔

(۸)

گرمیوں کی ایک شام تھی۔ ورموڈ اُداس اور پریشان جھیل کے کنارے بیٹھا ہوا اینونا کی بیوفائی کا خیال کر رہا تھا۔ کہ اُس نے اُس کو کس قدر دھوکا دیا۔ اگر واپس جانا تھا تو بتا دیتی۔ وہ سوچ رہا تھا۔ اُس کے چہرے سے غم و غصہ کے آثار ظاہر ہو رہے تھے۔

اُس نے دُور جھیل میں سے دُھواں اُٹھتا ہوا دیکھا۔ اُس نے سوچا کوئی اجنبی راستہ بھُول گیا ہے۔ وہ اُٹھ کر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا۔ کشتی تیزی سے اُس کی طرف بہے آ رہی تھی۔ ورموڈ نظریں گاڑے ہُوئے دیکھ رہا تھا۔ کشتی نزدیک آ رہی تھی۔ "اینونا" ورموڈ کے مُنہ سے بے ساختہ نکلا۔

اینونا کشتی میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اُس نے اُداس ہنسی ہنستے ہُوئے کہا۔ "ہاں ورموڈ میں ہی ہوں۔ کیا میں اپنی کٹیا میں رہ سکتی ہُوں؟ بتاؤ رہ سکتی ہوں نا؟ تم خاموش کیوں ہو؟ بتاؤ آ جاؤں؟"

اینونا نے جلد جلد ورموڈ سے پُوچھا۔

ورموڈ خاموش تھا۔

اینونا پھر چلائی۔ "ورموڈ کیا تم مجھ کو نہیں پہچانتے؟ اب میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ میں ویسی ہی مفلس اور نادار واپس آئی ہوں۔ جیسی یہاں سے گئی تھی۔" ورموڈ ہنسا اور کہنے لگا۔ "اینونا آؤ۔ یہ گاؤں تمہارا ہے۔ اچھا ہوا جو تمہارے پاس پیسہ نہیں ہے جتنا روپیہ کم ہوگا اُتنی ہی زیادہ دیر تم یہاں رہوگی۔"

اینونا کشتی سے اُتری۔ دونوں جھیل سے روانہ ہُوئے۔

شام کے وقت جھیل کے دونوں کناروں پر دو چراغ ٹمٹما رہے تھے۔ جن کی مدھم روشنی جھیل کے پانی میں آگ کی چنگاری کی طرح روشن تھی۔ اینونا کے آنے پر لوگ بہت حیران تھے۔ کہ وہ اینونا جو دنیا میں چمک کر آئی ہے پھر یہاں کیوں آگئی۔ . . . . . ؟

ایک دن اینونا جھونپڑی کے کونے میں بیٹھی چمنیاں صاف کر رہی تھی۔ ورموڈ مچھلی کے جال مرمت کرنے میں محو تھا۔ لیکن اُس کی آنکھیں اپنی اینونا کے چہرے پر گڑی ہوئی تھیں۔

دُور . . . . جنگل میں ننھے ننھے پرندے چہچہاکر اینوتا کی واپسی پر درموڈ کو مبارک باد دے رہے تھے ۔ اینوتا کو اُن کی آواز پر رشک آرہا تھا۔

سامنے جھیل درموڈ کا پانی پوری آب وتاب سے بہہ رہا تھا

جھیل کے کنارے دو کشتیاں ایک رسّی کے ساتھ بندھی ہوئی کسی کی منتظر تھیں۔

{ جزاس لائی
{ ناروجین مصنف

(مس) کے۔ احمد شجاع

رباعی

سب بوس کیا خاطرِ غمگیں نے آج
غم دور کیا ساغرِ رنگیں نے آج
وہ توبہ کہ تھی سنگ سے بڑھ کر محکم
توڑا ہے اسے جامِ بلوریں نے آج

سعید احمد اعجاز

غزل

دُور اس دنیا سے ہو کوئی جہاں میرے لئے
(اس جہاں میں تو نہیں امن و اماں میرے لئے)

اک جہاں جس میں نہ ہو فکر و تردّد کا ہجوم
اک جہاں جس میں نہ ہو شور و فغاں میرے لئے

اک جہاں جس میں نہ ہو کچھ ما و تُو کا امتیاز
اک جہاں آزادِ قیدِ این و آں میرے لئے

اک جہاں جس میں نہ ہو علم و خرد کی دار و گیر
ہو نہ جس میں کاوشِ سود و زیاں میرے لئے

اک جہاں جس میں نہ ہو بغض و عداوت کا وجود
اور محبت ہی محبت ہو جہاں میرے لئے

اک جہاں جس میں مجھے امن و فراغت ہو نصیب
زندگی جس میں نہ ہو بارِ گراں میرے لئے

اک جہاں جس میں مرا قول و عمل ہو معتبر
ہر قدم پر ہوں نہ جس میں امتحاں میرے لئے

بے ریائی ہو جہاں کے رہنے والوں کا شعار
اور محبت میں صداقت ہو جہاں میرے لئے

ظاہر و باطن جہاں کے بسنے والوں کا ہو ایک
ہوں نہ خنجر آستینوں میں نہاں میرے لئے

زندگانی ہو جہاں اک خوابِ شیریں کے مثال
ہر نفس جس کا ہو عمرِ جاوداں میرے لئے

جس کا ہر ذرّہ ہو اک دنیائے ناپیدا کنار
جس کا ہر قطرہ ہو بحرِ بے کراں میرے لئے

دُور اس دنیا سے ہو ایسا جہاں میرے لئے
(اس جہاں میں تو نہیں امن و اماں میرے لئے)

جلیل قدوائی

اہتمام

فصلِ گُل آئی ہوا عنبر بداماں ہوگئی سرزمیں ہر دشت کی رشکِ گلستاں ہوگئی
سبزہ زاروں میں بسنتی کھیت لہرانے لگے کوئلیں کوکیں پپیہے پی کہاں گانے لگے
اے سکھی سنتی ہوں میں وہ مہ جبیں آج آئے گا
میرے طالع کو مری تقدیر کو چمکائے گا
شام سے گھر والے ظاہر داریوں میں محو ہیں اُس کے استقبال کی تیاریوں میں محو ہیں

بڑھ رہی ہیں رفتہ رفتہ رات کی تاریکیاں اور تاروں سے مزیّن ہوچکا ہے آسماں
وقت ہے اب مَیں بھی کمرے میں دیا روشن کروں شوق کی تنویر سے ظلمت کدہ روشن کروں
گو امیدِ التفات اُس سے مجھے اِتنی نہیں لیکن اس پر بھی تمنّا ہے وہ آجائے کہیں
وقت سے کچھ دیر پہلے کر کے تزئینِ جمال اور سجا کر جھلملاتے موتیوں سے بال بال
معبدِ اُمید کی تعمیر کا ساماں کروں
اپنے پی کے قلب کی تسخیر کا ساماں کروں

تاجور سامری

عید کا تحفہ

میری شادی کو ابھی ایک ہفتہ بھی نہ گذرا تھا کہ مجھے یک ماہہ فوجی ٹریننگ کے لئے پونا جانا پڑا۔ میں تو جانے کا نام بھی نہ لیتا تھا اور میری بیگم بھی اس کے خلاف تھیں۔ مگر کیا کرتا۔ گھر والے مجبور کر رہے تھے۔ مجھے تو قید ہو جانا تک منظور تھا۔ مگر بیگم کی جدائی منظور نہ تھی۔ بیگم بھی چاہتی تھیں کہ میرے نہ جانے کی کوئی صورت نکل آئے۔ مگر گھر والوں کو کیا کہہ سکتے تھے۔ اگر کچھ کہتے تو خدا جانے کیا کیا طعنے سننے پڑتے۔ سب کہتے "توبہ۔ اتنی بھی زن مریدی کیا! کہ سرکاری کام کی بھی کوئی پروا نہیں"۔ میں یہ طعنے بھی برداشت کرنے کو تیار تھا۔ مگر بیگم بیچاری کا خیال تھا۔ اسے لوگ ہدف ملامت بناتے اور کہتے "نگوڑی نے آتے ہی اچھے بھلے آدمی کو ہاتھوں پہ ڈال لیا ہے۔ اب یہ نہ دنیا کا رہے گا۔ نہ دین کا۔ ہائے توبہ۔ ایک مہینہ کوئی کالے پانی کی قید تھوڑے ہی ہے۔ کہ مرے جا رہے ہیں"۔ غرض معلوم نہیں کیا کیا کچھ سننا پڑتا۔

اس کے علاوہ ایک اور خیال بھی تھا۔ وہ یہ کہ میری شادی پر گھر والوں کا ڈھائی تین سو روپیہ خرچ ہو گیا تھا اور یہ دو تین سو روپیہ خدا کے فضل سے آیا تھا۔ لالہ روپ لعل سُنار کے گھر سے۔ جنہوں نے "پکا پیسہ" فی روپیہ ماہوار سود لکھوا لیا تھا۔ اگر میں ٹھیک وقت پر ٹریننگ پر جا کر وہاں سے دو اڑھائی سو روپیہ لے آؤں تو لالہ روپ لعل کے بہت سے "ہہو دیا نہ" ارادوں پر پانی پھر تا تھا اور اگر ایک دو مہینے بھی گذرتے ہیں تو پھر تین سو کے پانچ سو نو وہ پڑے ہیں۔

خیر ان اور ان کے علاوہ اور بہت سی مجبوریوں کے تحت مجھے پونا جانا ہی پڑا۔ پونا میں مجھے ایک مہینہ رہنا تھا اور عید میں ابھی ایک مہینہ اور دس دن باقی تھے۔ چلنے سے پہلے بیگم صاحبہ نے رخصت کرتے وقت مجھے تنہائی میں تاکید کی تھی بلکہ سچ پوچھئے تو کان کھینچ دیئے تھے۔ کہ "عید پر ضرور واپس آ جانا۔ میں تمہیں عید پر ایک تحفہ دوں گی"۔

روانہ ہونے کو تو میں گھر سے روانہ ہو آیا۔ مگر میرا حال یا میں جانتا ہوں یا میرا دل۔ آپ نہ جانتے ہیں نہ جان سکتے ہیں۔ ایک مہینہ پہاڑ بن کر سامنے آ گیا۔ خدا ہی جانے کہ یہ مہینہ کتنے سالوں کے برابر تھا۔ ختم ہونے ہی میں نہ آتا تھا۔ میں شب و روز بیگم صاحبہ کے خیال میں محو رہتا اور نماز پڑھ پڑھ کر یہی دعا مانگتا کہ الٰہی مہینہ جلد ختم ہو۔

قیامت کی گھڑیاں بن کر رمضان کی پچیسویں یا چھبیسویں کو کورس کا مہینہ ختم ہو گیا۔ عید میں پانچ یا چار دن باقی تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ حضرات جنہوں نے خدا کے فضل سے روزہ تو ایک بھی نہیں رکھا۔ مگر سحری اور افطاری کے ثواب میں باقاعدہ شامل ہوتے رہے ہیں۔ انتیسویں ہی کو عید کا چاند نکال ماریں گے۔ اسی لئے جلد از جلد گھر روانہ ہو جانا چاہیئے۔ چنانچہ فوجی دفتر سے اجازت ملتے ہی میں سب سے پہلی گاڑی پر گھر کو روانہ ہو گیا۔

عید کی نسبت مجھے "بیگم صاحبہ" کے عید کے تحفہ کا بہت انتظار تھا۔ میں سارا مہینہ اسی کش مکش میں رہا۔ کہ بھلا بیگم صاحبہ مجھے کیا تحفہ دیں گی؟ شاید اپنا "دل" نکال کر دے دیں۔ مگر وہ تو پہلے ہی خاکسار کی ملکیت ہو چکا ہے۔ نا معلوم کیا شرارت سوچ رکھی ہو! مجھے اپنی بیگم کی شوخی اور شرارت کا بچپن سے ہی تجربہ تھا۔ زوجیت کے تعلقات تو ابھی شروع ہی ہوئے تھے۔ مگر چونکہ وہ بھی اسی گاؤں میں پروان چڑھی تھیں۔ جہاں میں اپنی زندگی کے دن پورے کر رہا تھا۔ اس لئے علیک سلیک پرانی تھی۔

خیر تو صاحب سارا مہینہ میں اسی کش مکش میں رہا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ بیگم صاحبہ کے تحفہ کے جواب میں میں بھی ایک شاندار تحفہ پیش کروں ایسا کہ بیگم صاحبہ دیکھ کر دنگ رہ جائیں۔ چنانچہ پونا کے یک ماہہ قیام کے دوران میں میں کئی بار بازار میں مارا مارا پھرتا رہا۔ تاکہ بیگم صاحبہ کے لئے کوئی تحفہ خرید سکوں۔ تحفے پسند تو بہت آئے۔ مگر خریدا کوئی بھی نہ گیا بعض تو ایسے تھے جو میری بیگم صاحبہ کے قابل نہ تھے اور بعض ایسے کہ اُن کے قابل "وہ" نہ تھیں بعض کو خریدنے کے لئے مجھے اپنی آمدن کے علاوہ

تن کے کپڑے بھی بیچنے پڑتے تھے۔

پھر ایک اور خیال بھی تھا۔ اگر میں بیگم صاحبہ کے لئے تحفہ خریدنے پر کچھ زیادہ رقم خرچ کر دیتا تو گھر والے کہتے "یہ لونڈا تو بالکل ہاتھ سے نکل گیا۔ ارے دیکھو تو اسے ذرا خیال نہ آیا کہ لالہ روپ لال کا قرضہ چڑھ رہا ہے۔ آخر وہ بھی تو ان ہی کی شادی پر چڑھا تھا۔ وہ ادا ہو جاتا تو اچھا تھا یا یہ کہ بیگم صاحبہ کے لئے تحفہ آگیا! آخر بے چارہ کیا کرے۔ مجبور ہے تحفہ نہ لاتا تو گذر کیسے ہوتی؟"

سارا مہینہ انہی خیالات کی کشمکش میں گذرا اور میں پونا سے کوئی تحفہ نہ خرید سکا۔ ارادہ تھا کہ چونکہ دہلی میں گاڑی بدلنی پڑتی ہے اور وہاں آٹھ دس گھنٹے وقت مل جاتا ہے۔ اس لئے وہاں سے کوئی اچھی اور موزوں چیز خرید لی جائے گی۔ چنانچہ پونا سے میل گاڑی پر سوار ہو کر میں روانہ ہو آیا۔

دوسرے لوگوں کو تو شکایت تھی کہ ٹرین بہت تیز چل رہی ہے اور خطرہ ہے کہ کہیں الٹ نہ جائے مگر مجھے یہ شکایت تھی کہ اڑ کر ابھی کیوں نہیں پہنچ جاتی؟ اور پھر جب وہ بار بار سٹیشنوں پر کھڑی ہو جاتی تو میرا جی چاہتا کہ اسے کچا ہی چبا جاؤں۔ کم بخت سیدھی جا کر ہماری بیگم صاحبہ کے حضور کیوں نہیں ٹھیرتی؟ مگر میری اور دوسرے مسافروں کی شکایتوں کا کچھ اثر نہ ہوا اور گاڑی اپنے وقت پر ہی دہلی پہنچی۔

دہلی پہنچتے ہی میں نے سامان سٹیشن پر جمع کرا دیا اور بھاگم بھاگ بازار پہنچا تاکہ بیگم صاحبہ کے لئے دیکھ بھال کر کوئی تحفہ خرید سکوں۔ گاڑی اندازاً بارہ بجے دہلی پہنچی تھی اور شام کو آٹھ بجے پنجاب ایکسپریس کو روانہ ہونا تھا۔ مجھے دہلی میں سب سے ضروری کام تو بیگم صاحبہ کے لئے تحفہ خریدنا تھا۔ اور اگر اس فریضہ سے فارغ ہو جاؤں تو ارادہ تھا کہ تاریخی عمارات کو دیکھ لوں۔

میں سارا دن بازار میں مارا مارا پھرتا رہا۔ ساڑھیاں۔ بالوں میں لگانے کے جاپانی۔ ولائتی اور سنہری ہر قسم کے کلپ گلوبند۔ بٹن۔ رومال۔ موزے انگشتریاں۔ بٹوے غرض کوئی چیز نہ تھی جو دیکھی نہ ہو بعض چیزیں پسند آئیں۔ مثلاً ساڑھیاں۔ مگر ساڑھیاں پہننے کا ہمارے دیہات میں رواج نہیں۔ بہت سوچ بچار کے بعد فیصلہ ہوا کہ انگشتری خریدی جائے۔ چنانچہ ایک سنار سے سودا کیا گیا۔ بے شمار نمونے دیکھنے کے بعد ایک انگشتری پسند آئی جو سنہری تھی اور اس پر نہایت عمدہ نگینہ جڑا تھا۔ ۲۵ روپے قیمت ٹھیری مگر میں نے محض تسلی کرنے کے لئے دکاندار سے کہا کہ میں چند اور دکانیں بھی دیکھ لوں اگر ۲۵ روپے میں اور ایسی انگشتری خریدی تو آپ ہی سے خریدوں گا۔

بہت دیر تک تو میں دکانوں پر تسلی کرتا پھرا۔ اور آخر میں یہی فیصلہ کیا کہ وہی انگشتری خریدی جائے جس کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ چونکہ وہ دکان سٹیشن کے قریب ہی تھی۔ اس لئے میں واپسی پر خرید لینے کے خیال سے تاریخی عمارات دیکھنے چلا گیا۔ نئی دہلی بھی دیکھی اور چھ ساڑھے چھ بجے کے قریب چاندنی چوک واپس لوٹ آیا۔

مجھے سفر میں صبح کھانا نہیں ملا۔ اس لئے روزہ ہی رکھ لیا تھا۔ پھر بھی دن بھر احترام رمضان کے خیال سے منہ باندھے رہا۔ چونکہ آٹھ بجے پھر ٹرین پر سوار ہو جانا تھا۔ اسی لئے ایک مسلم ہوٹل میں گھس گیا۔ جہاں بہیں رمضان شریف میں کئی اللہ کے شیر میٹھے ڈکار رہے تھے۔ ہوٹل کے مالکوں اور بیروں کو دیکھئے تو ان کی لمبی لمبی ڈاڑھیاں اور نورانی چہرے قابل رشک تھے مگر کرتوت دیکھئے تو یہ کہ خود بھی پانوں کی جگالی فرما رہے ہیں اور مجھ جیسے اور کئی "خوئے بد را بہانہ بسیار" کے مصداق بزرگوں کو کھانا کھلا رہے تھے۔ میں بھی نہایت تمکنت کے ساتھ میز پر جا بیٹھا اور کھانا کھانے میں مصروف ہو گیا۔

ابھی انگشتری خریدنا باقی تھا مکان قریب ہی تھی۔ اس لئے مجھے اطمینان تھا۔ کہ چلتے چلتے لے لوں گا۔ پسند تو کر ہی چکا ہوں۔ یہ میں نے پہلے ہی پوچھ لیا تھا کہ دکان رات کے نو بجے تک کھلی رہتی ہے۔ کھانا کھا کر میں نے چائے منگائی تاکہ کھانے کو معدے کی تہ تک پہنچا دوں۔ ابھی میں چائے پی ہی رہا تھا کہ قریب کی مسجد سے اذان کی آواز آئی۔ میری شامت جو آئی تو میں نے نماز پڑھ لینے کا ارادہ کر لیا۔ دراصل میرا مطلب یہ تھا کہ نماز سے فارغ ہو کر بدرگاہ قاضی الحاجات دعا مانگ لوں گا کہ میری بیوی کو میرا تحفہ پسند آجائے۔

مسجد میں نمازیوں کی کثرت دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ میرے خیال میں تو مسجدیں مسلمانوں کی روایتی شان برقرار رکھنے کے لئے ہوتی ہیں ورنہ نمازیوں کی طرف سے عام طور پر "مرثیہ خوان" ہی نظر آتی ہیں۔ کچھ وقت تو نمازیوں کا روزہ افطار کرنے میں لگا۔ اس سے فارغ ہو کر نماز شروع ہوئی۔ میں "تین رکعت نماز فرض اور پیچھے حاضر امام صاحب کے" کہہ کر کھڑا تو ہو گیا۔ مگر میرے دل میں وقت کی قلت اور انگشتری خریدنے کا خیال جما ہوا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ نماز جلد جلد ختم ہو اور میں بھاگ کر دکان

پہنچوں۔ انگشتری خریدوں اور سٹیشن پر پہنچ کر وطن عزیز اور "دیار بیگم صاحبہ" کی طرف روانہ ہو جاؤں۔

ایک طویل خاموشی کے بعد مولوی صاحب نے قرأت شروع کی اور نہایت مولویانہ انداز میں سورہ فاتحہ کی ابتدا کی۔ مجھے چونکہ بہت جلدی تھی۔ اس لئے مولوی صاحب کی سست رفتاری مجھے پسند نہ آئی۔ سورہ فاتحہ ختم ہوئی تو مولوی صاحب نے سورہ واقعہ کو ابتدا سے پڑھنا شروع کیا۔ میں گھبرا سا گیا۔ مولوی صاحب شاید عید پر اپنے کارناموں کو زیادہ شان سے پیش کرنے کی غرض سے مغرب کی نماز میں سورہ واقعہ جیسی لمبی سورتوں کی تلاوت ضروری سمجھتے تھے۔ مگر میں کیا کر سکتا تھا؟ لاچار و مجبور کھڑا رہا۔ جی تو یہی چاہتا تھا کہ صفوں کو چیرتا ہوا آگے بڑھوں۔ اور مولوی صاحب سے مؤدبانہ عرض کر دوں کہ حضرت نماز میں رکوع بھی ہوتا ہے مگر ساتھ کے مسلمان بھائیوں کے مکوں اور گھونسوں کا رعب یہ ہمت نہ پڑنے دیتا تھا۔

نماز میں میرا خاک بھی دھیان نہ تھا۔ اسی کشمکش میں مبتلا تھا کہ مولوی صاحب نے سورۂ واقعہ ختم کر کے تکبیر کہی اور رکوع میں جھک گئے۔ رکوع بھی طول محشر سے کم نہ ہوا۔ رکوع سے فارغ ہوتے تو قیام میں ستون بن کر ڈٹ گئے۔ یہاں تک کہ میں نے تو یقین کر لیا کہ سو گئے ہیں۔

اس سے آگے سجدہ تھا اور سجدہ کی طوالت کا خیال مجھے کھائے جا رہا تھا۔ ہوا بھی وہی کہ جب مولوی صاحب سجدے میں گئے تو میں نے اور غالباً سب دوسرے مقتدیوں نے بھی یقین کر لیا کہ اب مولوی صاحب صور اسرافیل سے قبل سر نہ اٹھائیں گے۔

حالات کے پیش نظر مجھے نماز ختم ہوتی دکھائی نہ دیتی تھی۔ لوگ تو سجدے میں تسبیحیں پڑھ رہے تھے اور میں دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ کل عید ہے۔ مجھے ضرور گھر پہنچ جانا چاہئے۔ اگر میں گاڑی سے رہ گیا تو گھر نہ پہنچ سکوں گا۔ تو پھر اے خدا! میرا کیا حال ہوگا؟ میری بیگم بےچاری کیا کرے گی؟ اے خدا تو مجھ پر رحم فرما"

مولوی صاحب سجدہ میں تھے۔ میں نے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور امام صاحب کو مقتدیوں سمیت سجدہ میں ہی چھوڑ کر بھاگ جانا مناسب خیال کیا۔ چنانچہ یہ خیال آتے ہی میں نے ہمت کر کے سر اٹھایا اِدھر اُدھر دیکھ کر راہِ فرار تلاش کی۔ مگر دور تک نمازیوں کی صفیں تھیں اور ان میں سے بھاگ نکلنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ دل کی بہت ہمت بندھائی بیگم صاحبہ کی محبت کے واسطے دیئے۔ مگر ہمت نہ پڑی اور ناچار پھر سر بسجود ہو گیا۔

خدا خدا کر کے نماز ختم ہوئی اور میں نماز سنت ادا کئے بغیر بھاگ پڑا۔ صفوں پر سے کودتا پھاندتا باہر آیا تو معلوم ہوا کہ کوئی ذاتِ شریف جوتا نہایت "شرافت" اور "احتیاط" سے اڑا لے گئے۔ جی چاہا کہ امام صاحب اور موذن کو بلا کر جوتے کا مطالبہ کروں۔ مگر ایک تو وقت کم تھا دوسرے سامنے دیوار پر لکھا تھا "اپنے جوتے سنبھال کر رکھئے"۔ یہ موزوں مصرعہ طبع آزمائی اور "احتیاط" کے لئے دیوار پر لکھ دینے کے بعد مولوی صاحب اور موذن صاحب پر کوئی الزام نہ آ سکتا تھا۔ اس لئے میں ہندوستانی مسلمانوں کی اس فرض شناسی کو دعائیں دیتا ہوا باہر نکل آیا ایک تانگہ کرایہ پر لیا۔ پہلے ایک دُکان سے جوتا خریدا۔ پھر انگشتری خریدنے کے لئے سنار کی دکان پر پہنچا۔ سنار نے دوپہر کو میرے سامنے انگشتری ایک ڈبے میں محفوظ کر دی تھی میں نے ۲۵ روپے دئیے۔ سنار نے انگشتری دکھاتے ہوئے وہ ڈبہ میرے حوالے کیا۔ میں نے تانگے پر بیٹھ کر تانگے والے سے کہا کہ "اڑ کر سٹیشن پر پہنچو۔ گاڑی چلنے میں چند منٹ باقی ہیں"

سٹیشن پر پہنچ کر سامان لینے گاڑیبان اور قلیوں سے جھک جھک کرنے میں اتنا وقت لگ گیا کہ ادھر میں نے گاڑی پر قدم رکھا۔ اِدھر گاڑی چھوٹ گئی۔ میں نے انگشتری کو "متاعِ گراں مایہ" سمجھ کر سینے سے لگا رکھا تھا اور دل ہی دل میں مسرور ہو رہا تھا کہ بیگم اس انگشتری کو دیکھ کر کس قدر مسرور ہوں گی! ان کا تحفہ مجھے عزیز تو بہت ہوگا۔ مگر وہ بیچاری اس کا مقابلہ کیا کر سکیں گی! اسی دھن میں محو میں نے چودہ گھنٹے ریل کا سفر کیا اور عین عید کے دن قریباً بارہ بجے اپنے گاؤں میں آوارد ہوا۔

گاؤں کے لوگ اور کنبے کے عزیز میرا انتظار کر رہے تھے بیگم صاحبہ تو میرے اس وقت تک نہ آنے کے سبب سے مایوس ہو کر مرجھائی جا رہی تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی پھول کی طرح کھل گئیں۔ مگر جب ان کو معلوم ہوا کہ میں ان کے لئے پچاس روپے خرچ کر کے انگشتری عید کے تحفہ کے طور پر لایا ہوں (یہ پندرہ روپے میں نے انگشتری کی شان کو بڑھانے کے لئے خود اضافہ فرما لیا تھا) تو وہ کچھ جھینپ سی گئیں۔ کیونکہ اس بےچاری نے بیس پچیس روز کی محنت سے مجھے تحفہ دینے کے لئے ایک اونی گلوبند تیار کیا تھا۔ جو تھا تو بہت خوب صورت! مگر اس بےچارے کی اس تحفے

کے سامنے کیا حقیقت تھی۔

میں نے جلد جلد غسل کیا کپڑے بدلے۔ اپنے تمام دوستوں اور عزیزوں کو بتایا کہ میں بیگم صاحبہ کے لئے سنہری اور سپیشل ولایت کی بنی ہوئی انگشتری لایا ہوں بیگم صاحبہ بھی پھولی نہ سماتی تھیں۔ اپنی سہیلیوں کے سامنے پنجوں کے بل چلتی اور کسی سے آنکھ نہ ملاتی تھیں کنبے کی بڑی بوڑھیاں انگشتری دیکھ دیکھ کر قربان ہوئی جا رہی تھیں اور بنانے والے کو داد دے رہی تھیں۔ میرے دوست میری پسند اور میرے انتخاب کو سراہ رہے تھے۔ میں مسرت وشادمانی کے دریا میں غرق تھا اور بیگم کی طرف جو نظر اٹھاتا تھا تو اگرچہ وہ پیار محبت سے بھری ہوتی تھی۔ مگر اس کا انداز فاتحانہ اور مفتخرانہ تھا۔

ابھی ہم بیٹھے ہی تھے کہ لالہ روپ لال صاحب تشریف لے آئے۔ سب نے بڑھ کر ان کا استقبال کیا۔ ہمارے ہاں دستور ہے کہ قرض خواہ ایسے موقعوں پر کچھ نذر نیاز" قبول فرمانے" آجاتے ہیں۔ گو یہ نذر نیاز کسی حساب کتاب میں درج نہیں ہوتی۔ بلکہ محض قرضخواہ کی تشریف آوری کا صدقہ ہوتی ہے تاہم قرض دار دیتے ہیں۔ اس لئے کہ دینے پر مجبور رہیں۔

لالہ روپ لال صاحب آکر بیٹھے تو سب نے ان سے میری لائی ہوئی انگشتری کا ذکر کیا اور بڑھ چڑھ کر اس کی تعریفیں کیں۔ لالہ روپ لال نے نظریں میری طرف اٹھائیں تو میں نے اپنی کٹی ہوئی مونچھوں کو تاؤ دینا شروع کر دیا۔ انگشتری ابھی تک میرے ہی پاس تھی۔ کیونکہ سب لوگوں کے نزدیک یہ گراں بہا تحفہ بیگم صاحبہ تک پہنچانے کا حق مجھے ہی پہنچتا تھا اور وہ بھی تنہائی میں۔ جو اس وقت تک میسر نہ ہو سکی تھی۔

میں نے بڑے ناز و انداز سے ہاتھ جیب میں ڈالا اور انگشتری لالہ روپ لال جی کو دکھائی۔ وہ دیکھ کر پہلے تو بہت خوش ہوئے اور پھر کچھ ناک بھوں سکیڑنے لگے۔ ذرا دیر دیکھ کر اپنے تھیلے میں ہاتھ ڈالا کسوٹی نکالی انگشتری کو ایک دو جگہ سے کسوٹی پر رگڑا۔ کچھ غور سے دیکھا اور کہنے لگے بابو جی یہ کتنے کو آئی؟

میں نے کہا "جی پچاس روپے کو"

"پچاس روپے کو؟ سچ سچ؟"

میں نے کہا۔ جی ہاں! سچ سچ نہیں تو کیا جھوٹ!

وہ کہنے لگے۔ "تو بابو جی معاف فرمائیے۔ اگر یہ پچاس روپے کو آئی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کو لوٹ لیا گیا ہے۔"

سب لوگ جو مجھ سے ملنے آئے ہوئے تھے۔ سن کر حیران رہ گئے میں نے کہا۔ "لالہ جی۔ آپ کیا فرما رہے ہیں۔ آپ ذرا غور تو فرمائیے"

میری بیگم سامنے کھڑی تھیں۔ انہوں نے بھی میری تائید کرتے ہوئے اپنی لچکدار گردن کو دائیں طرف خمیدہ کر دیا۔

لالہ جی نے کہا۔ "تو پھر آپ ذرا مہربانی کر کے آگ لے آئیے۔ میں ذرا اس کا امتحان کئے لیتا ہوں"

میں اٹھا۔ دوسرے مکان میں اماں جان چولہے کے پاس بیٹھی بچوں کو کھلا پلا رہی تھیں۔ انہوں نے ایک برتن میں مجھے آگ دی اور میں لالہ جی کے پاس فوراً لے آیا۔

لالہ جی نے آگ اپنے سامنے رکھ لی اور کہنے لگے۔ "جب آپ لوگ ہم سے زیور بنواتے ہیں تو کہتے ہیں کہ لوٹ لئے گئے۔ کچھ پلے نہیں پڑنے دیا" مگر میں آپ کو بتا دوں کہ یہ انگوٹھی زیادہ سے زیادہ روپے ڈیڑھ روپے کی ہے" یہ کہہ کر انہوں نے انگشتری کو آگ میں ڈال دیا۔

تھوڑی دیر انگشتری آگ میں رہی۔ لالہ جی نے اسے نکال کر پانی سے صاف کیا اور جب ہمیں دکھائی تو اس کے اوپر کا سنہرا رنگ اتر چکا تھا اور اندر سے کوئی کالی سیاہ دھات نکل آئی تھی۔ یہ دیکھ کر مجھ پر تو گھڑوں پانی پڑ گیا۔ میں نے نہیں دیکھا کہ میری بیگم کس حال میں تھیں۔ کیونکہ اس کے بعد میری نظریں اوپر نہ اٹھ سکی تھیں۔

آہستہ آہستہ مجھے ایسا محسوس ہونے لگا کہ میں مکان میں تنہا رہ گیا ہوں۔ تمام لوگ اٹھ اٹھ کر چلے گئے ہیں۔ میں سر جھکائے اپنی عید اور عید کے انجام پر غور کر رہا تھا کہ اتنے میں کھٹ کھٹ کی آواز آئی۔ میں نے نہیں دیکھا یا نہ دیکھ سکا کہ کون ہے؟ جب وہ نزدیک آئی تو پیروں کو دیکھ کر معلوم ہوا کہ میری چھوٹی سالی ہے۔ اس نے آہستہ سے بیگم صاحبہ کا تیار کیا ہوا گلوبند میری گردن میں ڈال دیا اور کہنے لگی۔ "بھائی جان! آپا نے "عید کا تحفہ" بھیجا ہے اور عید مبارک کہتی ہیں"

محمد فاضل

تجلیات

(۱)

بس کہ پابندِ محبت دلِ خودکام ہوا	موردِ رنج و محن، خوگرِ آلام ہوا
حسنِ بےتابِ محبت کی تجلی کا وفور	دیکھنے کو جو مجھے جلوہ گرِ بام ہوا
ہائے اُس شوخ کی شفقت بھری آنکھوں کا سرور	جن سے سرمستِ محبت دلِ ناکام ہوا
ہائے اُس زلفِ پریشاں کا وہ کیفِ موفور	جس کا ہر حلقہ مرے دل کے لئے دام ہوا
دلِ آوارہ کہ تھا قیدِ محبت سے نفور	آخرِ کار گرفتار ہوا، رام ہوا

دل نہ دینے پہ جو تھا اکبرِ سرکش مغرور
آخر اُس شوخ کا اک بندۂ بے دام ہوا

(۲)

ہو کے مجبور کوئی مائلِ اکرام ہوا	شوقِ گستاخ سے یہ آج عجب کام ہوا
آرزو کے لئے کچھ ناز کا ساماں نہ رہا	جو کرم مجھ سے کہ مخصوص تھا اب عام ہوا
عمر بھر خدمتِ ساقی میں رہا محوِ نیاز	جب کہیں بادہ پرستی میں مرا نام ہوا
آگ سے خاک بنا، خاک سے اکسیر بنا	دلِ بربادِ محبت کا یہ انجام ہوا
دلِ مجبورِ محبت کی بہانہ جوئی	جس جگہہ کوئی گیا اِس کو وہیں کام ہوا
اب وہ کہتی ہیں محبت کو تری آگ لگے	ہم کو بدنام کیا آپ بھی بدنام ہوا

کیوں نہ مقبولِ جہاں میرا سخن ہو اکبر
شعر اُس وقت کہا میں نے جب الہام ہوا

جلال الدین اکبر

شامِ سرما

خاتمے کے قریب آیا دن فصلِ سرما کا مختصر سا دن
دھوپ سے تھا مسرت افزا دن اب ہے افسردگی سراپا دن
جس کو کہتے تھے مہرِ عالمتاب
شامِ سرما میں ہوگیا گمتاب

نظر آتی ہے ہر کرن بے جاں شب سرما کے خوف سے لرزاں
گرم رَو ہے یہ نیّرِ تاباں کہ مسافر ہے کوئی بے ساماں
دامنِ کوہسار پر ہے نظر
ماہنِ سازگار پر ہے نظر!

پہنچے منزل پہ راہ رَو کب کے گھونسلوں میں طیور جا دبکے
کہیں ساماں ہیں راحتِ شب کے کہیں شکوے ہیں نحسِ کوکب کے
بیکسی آہ! اور لمبی رات
بن کے آئی ہے پیکرِ آفات!

دشت و صحرا و کوہسار خموش موجِ دریا و رَودبار خموش
باغ میں مُرغِ نغمہ بار خموش شہر میں اہلِ کاروبار خموش
چل رہی ہے ہوا، مگر چپ چاپ
کانپتی ہے فضا، مگر چپ چاپ!

تکئے خالی ہوئے فقیروں کے ہوئے رخصت مرید پیروں کے
گھر ہیں عشرت کدے امیروں کے رہزنِ ہوش راہ گیروں کے
ہیں غریبوں کے آہ! کاشانے
بے چراغ اور فسردہ غمخانے

محروم

ننھی

ایک نامعلوم خوف اس بچی کے دل میں اپنے باپ کی طرف سے موجود تھا۔ صبح دفتر جاتے وقت وہ عموماً اسے گود میں اُٹھاکر پیار کرلیا کرتے اور وہ اپنی معصومانہ آواز میں جواب دیتی۔ "ابا سلام!" اس کو کس قدر سکون میسر ہوتا تھا جب وہ گاڑی کی ناگوار آواز کو صبح کے خاموش سناٹے میں ڈوبتا ہوا دیکھتی تھی۔

شام کو اُن کی واپسی پر ابا کی آواز ہال میں سے سنائی دیتی "میری چائے یہیں دے جاؤ . . . . اخبار ابھی تک نہیں آیا؟ ملازموں نے اپنے پاس رکھ لیا ہوگا۔ اماں۔ دیکھنا میرا اخبار وہاں ہے کہ نہیں ——— اور میرے سلیپر تو ذرا دے دو۔"

"کینزیا" اماں آواز دیتیں۔ "اچھی بیٹی کی طرح آؤ اور اپنے ابا کے جوتے اُتار دو۔" بچی آہستہ آہستہ دیوار کا ایک ہاتھ سے سہارا کر اُترتی اور انتہائی خاموشی کے ساتھ ہال سے نکل کر ابا کے کمرے کا دروازہ کھولتی تھی۔

اُس وقت وہ عینک لگائے کسی کتاب کے مطالعہ میں مصروف ہوتے اور اپنی نگاہیں اس طرح بلند کرتے۔ کہ معصوم بچی ڈر جاتی۔

"کینزیا۔ لو۔ میرے جوتے اُتارو اور باہر لے جاؤ۔ آج اچھی بچی بنی تھیں کہ نہیں نہ؟

"یہ مجھے ن۔ ن۔ نہیں معلوم ابا۔"

"تم کو ن۔ ن نہیں معلوم؟ اگر تم اتنا ہکلاؤ گی تو تمہیں ڈاکٹر کو دکھانا پڑے گا۔"

جب وہ کسی اور سے باتیں کرتی تو ہکلاتی نہ تھی۔ اُس نے اپنی اس دیرینہ عادت پر بہت کچھ قابو حاصل کرلیا تھا۔ مگر ابا کے سامنے اُس کے مُنہ سے ڈہی رُک رُک کر الفاظ نکلتے تھے۔ کیونکہ وہ اس کوشش میں رہتی کہ کسی طرح اپنے کلمات کو خوبی سے ادا کرے۔

"کیوں۔ کیا بات ہے؟ اتنی پریشان کیوں ہو؟ اماں تم اس بچی کو تعلیم دو کہ اپنے کو اس طرح ظاہر نہ کرے۔ گویا خودکشی کرنے کا ارادہ کررہی ہے . . . . کینزیا۔ چائے کی پیالی میز پر رکھ دو ——— دیکھو سنبھال کے۔ کہیں گر نہ پڑے۔ تمہارا ہاتھ تو ایسے کانپتا ہے جیسے کسی بوڑھی عورت کا اور آئندہ سے اپنا رُومال جیب میں رکھو۔ ہر وقت آستین میں لٹکا رہتا ہے۔"

"اچ۔ چ۔ اچھا۔ ابا۔"

اتوار کے دن صبح کو گرجے میں وہ ان کے نزدیک دوزانو ہو کر بیٹھتی۔ اور جب ابا بلند آواز سے دعا مانگتے تو وہ سوچا کرتی کہ خدا ان کی آواز ضرور سُن لیتا ہوگا۔ اور دوپہر کو دادی اماں اسے نئے نئے کپڑے پہنا کر نیچے بھیج دیتی تھیں۔ کہ جاکر ابا اور اماں سے باتیں کرے۔ لیکن وہ ہمیشہ اماں کو کوئی نہ کوئی رسالہ پڑھتے دیکھتی۔ اور ابا کوچ پر لیٹے رومال چہرے پر رکھے ایک گدگدا تکیہ دونوں ٹانگوں میں دبائے غافل پڑے سوتے ہوتے۔

وہ اُن کے نزدیک جاکر بیٹھ جاتی تھی۔ اور غور سے تکتی رہتی یہاں تک کہ ابا بیدار ہوجاتے اور پیر پھیلا کر وقت دریافت کرتے۔ ——— اور پھر اس کی طرف مخاطب ہوتے تھے۔

"ایسے نہیں گھورتے۔ کینزیا۔ معلوم ہوتا ہے جیسے تم ایک اُلّو ہو۔"

ایک روز جب وہ بخار کی حالت میں اندر لیٹی ہوئی تھی تو دادی اماں نے بتایا کہ ابا کی سالگرہ آئندہ ہفتے میں ہے۔ اور وہ انہیں زرد سلک کا ایک کُشن بنا کر تحفتہ پیش کرے۔

انتہائی محنت کے ساتھ ننھی نے تینوں کناروں کو سی دیا۔ مگر اب سوال پیدا ہوتا تھا کہ اس میں بھرا کیا جائے؟ دادی اماں باہر باغ میں تھیں۔ وہ اُٹھی اور اماں کے کمرے میں پھٹے پُرانے کپڑے تلاش کرنے لگی۔ میز پر اُس کو کاغذ کے چند تختے مل گئے۔ اس نے سبھوں کو جمع کرلیا۔ چاک کرکے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بنالئے اور کپڑے میں

بھر کر چوتھا کنارہ بھی سی دیا۔

اسی رات تمام مکان میں ایک شور بلند تھا۔ ابا کے بہت سے ضروری کاغذات گم ہوگئے تھے۔ تمام کمروں میں ڈھونڈھا گیا۔ نوکروں سے پوچھ گچھ کی۔ آخرکار اماں آئیں اور کہنے لگیں۔

"ننھی۔ تم نے میرے کمرے میں کچھ کاغذ تو نہیں دیکھے؟"

"ہاں۔ ہاں" اُس نے کہا "میں نے ان کے ذرا ذرا سے ٹکڑے کر دیئے۔"

"ہیں!" اماں چلائیں۔ "فوراً کھانے کے کمرے میں آؤ۔"

اور وہ وہاں آئی جہاں ابا سخت پریشانی کے عالم میں ٹہل رہے تھے۔

"ملے؟" اُنہوں نے زور سے کہا۔

اماں نے تمام واقعہ سُنا دیا۔

وہ رُک گئے اور گھور کر بچی کی طرف دیکھا۔ "کیا تم نے لئے ہیں؟"

"ن۔ ن۔ نہیں"۔ اُس نے آہستہ سے کہا۔

"اماں کمرے میں جاکر اُس بیکار چیز کو میرے پاس لے آؤ ——
دیکھنا بچی فوراً ہی سو جائے۔"

وہ روئی تاکہ کوئی اُس سے ہمدردی ظاہر کرے۔ اور روتے روتے ہی بستر پہ جا لیٹی۔ شام کی سیاہی ہر شے پر محیط تھی۔ ایک سکوت کا عالم تھا۔ اور روشنی برابر والے کمرے کے دریچہ میں سے چھن چھن کر اندر فرش پر طرح طرح کے نقش و نگار بنا رہی تھی۔

ابا چقمتی اپنے ہاتھ میں لئے کمرے میں داخل ہُوئے۔

"میں تمہیں اس شرارت پر سزا دینے والا ہُوں"۔ اُنہوں نے کہا۔

"ابا۔ نہیں نہیں" وہ چلائی اور کمبل کے نیچے چُھپ گئی۔

اُنہوں نے تمام کپڑوں کو ایک طرف کر دیا۔

"اُٹھ بیٹھو" وہ چلائے "اور اپنا ہاتھ پھیلاؤ۔ تمہیں یہ سیکھنا پڑیگا کہ جو چیز تمہارے کام کی نہیں اُسے ہاتھ نہیں لگانا چاہیئے۔"

"مگر یہ سب تو آپ کی س۔س۔ سالگرہ کے لئے تھا۔"

اور چقمتی اُس کی چھوٹی سی ہتھیلی پر پڑی۔

کچھ دیر بعد جب دادی اماں نے اُسے کمبل اُڑھا دیا۔ اور اپنے کمزور جسم سے چمٹا لیا۔ تو بچی نے رو کر کہا۔

"اللہ میاں نے ابا کیوں بنائے؟"

"بچی سو جاؤ۔ صبح کو تمام باتیں بھول جاؤ گی۔ میں نے تمہارے ابا کو سمجھانا چاہا تھا۔ مگر رات کو وہ بہت خفا ہو گئے تھے۔"

لیکن بچی نے ان لمحات کو کبھی فراموش نہ کیا۔ دُوسری مرتبہ جب اُس نے ان کو دیکھا تو دونوں ہاتھ پیچھے کر لئے اور اس کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا۔

برابر والے مکان میں ایک اور صاحب رہتے تھے۔ شام کے وقت اپنے بچوں کے ساتھ کھیلا کرتے۔ ننھی یہ سب باتیں دیکھا کرتی تھی اور اُس نے اخذ کر لیا تھا۔ کہ دنیا میں بھی مختلف قسم کے باپ ہوتے ہیں۔

اتفاقاً ایک دن اماں بیمار ہو گئیں۔ دادی اماں اور وہ گاڑی میں بیٹھ کر شہر چلی گئیں۔ بچی اور خادمہ مکان میں تنہا رہ گئیں۔ صبح کے وقت تو کوئی بات نہ تھی۔ لیکن شام کو جب خادمہ اپنے بستر پہ لیٹی تو اُس کو ڈر لگنے لگا۔

"میں کیا کرونگی اگر مجھے کوئی ڈراؤنا خواب دکھائی دیا؟" اُس نے پوچھا "مجھے بہت دفعہ ڈراؤنے خواب دکھائی دیتے ہیں اور پھر دادی اماں مجھے اپنے بستر پہ لے جاتی ہیں —— میں اندھیرے میں نہیں سو سکتی . . . . میں کیا کرونگی اگر مجھے دکھائی دیا؟"

"نہیں۔ تم اب سو جاؤ" خادمہ نے کہا "اور شور مچا کر اپنے ابا کو پریشان مت کرنا۔"

لیکن وہی پُرانا بھیانک خواب دکھائی دیا —— قصائی اپنا چاقو اور رسّی لئے اس کی طرف بڑھا چلا آ رہا ہے۔ اور وہ اپنی جگہ سے ہل بھی نہیں سکتی۔ خاموش کھڑی چلا رہی ہے۔ "دادی اماں۔ دادی اماں!" وہ کانپتی ہُوئی اُٹھ بیٹھی۔ ابا سرہانے روشنی لئے کھڑے تھے۔

"کیا بات ہے؟" اُنہوں نے دریافت کیا۔

"ابا! ایک قصائی —— ایک چاقو —— دادی اماں کہاں ہیں؟"

اُنہوں نے روشنی بجھا دی اور بچی کو گود میں اُٹھا کر اپنے کمرے میں لے گئے۔ اخبار بستر پہ کھلا پڑا تھا —— اور ایک جلا ہُوا سگار لیمپ سے لگا رکھا تھا۔ اُنہوں نے اخبار کو فرش پر ڈال دیا۔ سگار آتش دان میں پھینکا اور بچی کو آرام سے لٹا کر خود اُس کے پاس لیٹ گئے۔ ابھی اچھی طرح نیند بھی نہ آئی تھی۔ اور اس قصائی کی مسکراہٹ اُس کے لبوں پر کھیل رہی تھی کہ ایسا محسوس ہُوا گویا وہ ان سے چمٹ رہی ہے۔ پھر اندھیرے سے وہ خوفزدہ نہ ہُوئی۔

"اپنے پیر میرے پیروں کے نیچے کر دو۔ گرم ہو جائیں گے"۔ ابا نے کہا
تکان کی وجہ سے وہ بچی سے پہلے ہی سو گئے۔ ایک دلچسپ کیفیت
ں پر طاری ہو گئی۔ بیچارے ابا ایسے امیر بھی نہیں۔ . . اور کوئی
ن کے آرام کا خیال بھی نہیں رکھتا۔ . . ان میں دادی اماں سے
یادہ سختی موجود سہی مگر وہ سختی بھی اچھی معلوم ہوتی تھی۔ . . انہیں ہر روز
نت کرنی پڑتی ہے اور اتنے تھک جاتے ہیں۔ کہ ہمسایہ کی سی فرصت
رطبیعت نہیں پا سکتے۔ اور اس نے ان کے تمام کاغذات چاک کر ڈالے
. . . وہ دفعتہً ہلی اور ایک ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

"کیا بات ہے؟" ابا نے پوچھا۔ "کوئی دوسرا خواب؟"

"ابا" بچی نے کہا "میرا سر تمہارے سینہ پر ہے اور میں دل کے چلنے کی آواز سن رہی ہوں۔ پیارے ابا! تمہارا کیسا بڑا دل ہے۔"

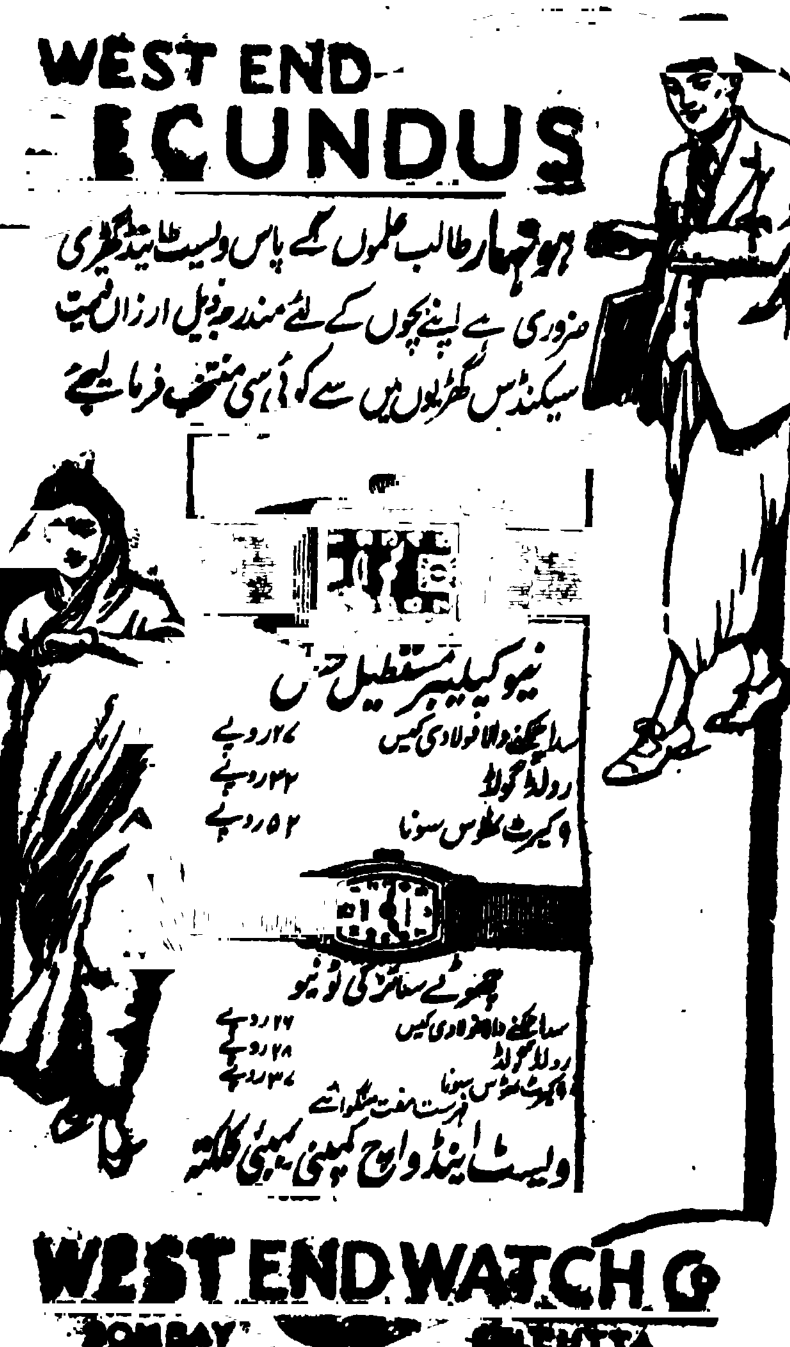
(کیتھرین مینسفیلڈ)

منیب الرحمٰن

رباعی

اٹھ اور جگر گزشتہ کو بھلا میرے ساتھ
دو جام بہار میں اٹھا میرے ساتھ
ہے دیر سے آغوشِ چمن وا ہوا
اے جانِ چمن چمن میں آ میرے ساتھ

سعید احمد اعجاز





سُلطان شہید

(مجاہدِ وطن ٹیپو سلطان شہید کی یاد میں)

اے شجاعِ ازل! اے ہند کے فرزندِ جلیل — تری جرأت تھی غمِ سود و زیاں سے آزاد
زندگی خود ہے ترے ذوقِ شہادت کی قتیل — تو رہا گردشِ دورانِ جہاں سے آزاد
نامرادی تری، آئینِ وفا کی تکمیل — ہے تری یاد زماں اور مکاں سے آزاد
رزم آرا علمِ جیشِ صداقت تجھ سے — باطل افگن ہے ترا نعرۂ آزاد ابھی
زندہ ہے آج بھی مشرق کی شجاعت تجھ سے — ہے ترے نام سے لرزاں ستم ایجاد ابھی

لے گئی عرشِ وفا پر تجھے تقدیر تری! — ہند کو محرمِ اسرارِ وفا تو نے کیا!
گونجتی ہے ابھی آفاق میں تکبیر تری! — حقِ وفاداریٔ مشرق کا ادا تو نے کیا!
عدل کے ہاتھ میں ہے آج بھی شمشیر تری! — پرچم افشاں علمِ دینِ خدا تو نے کیا!
لبِ اقوام پہ جاری ترا افسانہ ہے — حلقۂ جادوئے افرنگ کو توڑا تو نے
سوزِ آزادیٔ مشرق ترا پروانہ ہے — ہند میں پنجۂ شیطاں کو مروڑا تو نے

ہائے! وہ منزلِ الفت سے گذرنا تیرا — حرّیت، سرخیٔ نظمِ مہ و خورشید ہے پھر
حجلہ آرائے شہادت! وہ سنورنا تیرا — انقلابات کی کچھ اور ہی تمہید ہے پھر
غیرتِ عشق کے آغوش میں مرنا تیرا — ہاں، ترا عہدِ وفا عازمِ تجدید ہے پھر
بزمِ امکاں پہ گراں جب تری تنہائی ہوئی — پھر ہے بیدار جلال و حشمِ آزادی
موت، آئی ترے آغوش میں شرمائی ہوئی — وقت کے ہاتھ میں ہے پھر علمِ آزادی

تو ہے وہ بحر، جو شرمندۂ ساحل نہ ہوا — ہند میں آج جو یہ جلوۂ بیداری ہے
وہ مجاہد ہے جو آسودۂ منزل نہ ہوا — سطوتِ غیر، جو مجبورِ نگونساری ہے
مصلحت سے کبھی مانوس ترا دل نہ ہوا — یہ ترے شعلۂ ایثار کی گلکاری ہے
عشق سے مرگ کے شعلوں کو بجھایا تو نے — سرِ تکمیل ترا جذبِ تمام آپہنچا!
جاوداں ہستیٔ فانی کو بنایا تو نے — صبحِ آزادیٔ مشرق کا پیام آپہنچا!

[illegible] صدیقی

حکمرانِ خواتینِ مشرق

مردوں نے عورتوں کو ضعیف القویٰ اور ضعیف العقل قرار دے رکھا ہے، ہندوستان مصر، عربستان، ایران اور یورپ کے قدیم حکماء نے علی العموم عورت کی نسبت جن خیالات کا اظہار کیا وہ تنقیص کی طرف مائل تھے۔

یورپ نے بظاہر عورتوں کو سر آنکھوں پر بٹھا کر بھی کوئی باقاعدہ اور باضابطہ کام ان سے نہیں لیا اور نہ عہد حال کے عورتوں سے متعلق لکھنے والے مصنفین نے عورتوں کی قابلیت کے مختلف پہلوؤں اور حیثیتوں کو پیش کرنے کی کوشش کی "دنیا کی عورتیں" "خوبصورت عورتیں" "نامآور عورتیں" قسم کی سینکڑوں کتابیں یورپ اور امریکہ سے شائع ہوئیں۔ عورتوں کی نفسیات اور دماغی و جسمانی ساخت وغیرہ پر خاصا ادب فراہم کیا گیا۔ مگر اب تک کسی نے یہ بتانے کی کوشش نہیں کی کہ جو عورت آج عدالت العالیہ میں جج بن کر کام کر رہی ہے۔ بیرسٹر بن کر مقدمہ چلاتی ہے۔ منتظمہ بن کر انتظام کرتی ہے۔ کلرک بن کر دفتری کاروبار کر رہی ہے اور دنیا کے مختلف پیشوں اور فنون میں مرد کے دوش بدوش کام کرتی ہے۔ کبھی اُس نے اپنی انتظامی، سیاسی، فوجی اور اخلاقی جرأت اور قابلیت کے ثبوت بھی دیئے ہیں اور عہدِ قدیم و جدید میں اسی عورت نے حکمرانی کر کے ملک اور رعایا کی حفاظت کی ہے اور اپنی سیاسی قابلیت سے ملکوں کو زیر و زبر کر دیا ہے؟

برادران وطن کو یہ بات معلوم کر کے حیرت ہوگی کہ دارا، سکندر، قاسم، محمود غزنوی، محمد غوری، تیمور، بابر اور نادر شاہ سے بہت پہلے طوفانِ نوح سے تین سو سال بعد اور جناب مسیح سے دو ہزار سال قبل سیمی راس نامی ایک عراقی ملکہ نے ہندوستان پر حملہ کیا تھا ——— ایک عورت نے عراق عرب سے براہِ باختر ہندوستان تک فوج کشی کس طرح کی ہوگی غور فرمائیے۔

سنہ ۱۳۰۱ء میں جزیرہ تہیان کی شہزادی ماہ تاباں بھی ہندوستان کے فتح کرنے کا ارادہ کرتی ہے مگر یہ ارادہ پورا نہیں ہو سکتا صرف ابن بطوطہ کا سفرنامہ اس کا گواہ رہ جاتا ہے۔ مہارانی لچھمی بائی (جھانسی) کو ہندوستان اور خصوصاً اہلِ فرنگ کبھی بھول نہیں سکتے جس نے نہ صرف سرموروز کو ناکوں چنے چبوا دیئے بلکہ آزادی کی جنگ میں جون ۱۸۵۹ء، اپنی جان تک نذر کر بیٹھی۔

اس مضمون میں آپ کو صنف نازک کی جرأت و ہمت، سعادت و شقاوت، بہادری و شجاعت ہر طرح کے کارنامے ملیں گے۔ آپ اس میں چاند سلطانہ، لچھمی بائی کی طرح فدائے وطن اور آزادی پسند خواتین کے حالات بھی ملاحظہ فرمائیں گے۔ اور سیمیراس کی طرح "جوع الارض" رکھنے والیوں کے بھی۔

اس کے مطالعہ سے آپ محسوس کر سکیں گے کہ عورت نے دنیا میں کس قدر جدّ و جہد کی ہے۔ سیاسیات، مذہب، شمشیر زنی، فرمانروائی امورِ سلطنت اور ملک داری میں بعض عورتیں آپ کو ہٹلر، مسولینی، اتاترک اور رضا شاہ کے مقابلہ کی نظر آئیں گی۔

اتابک عیش

یہ لائق ملکہ منگو تیمور ابن ہلاکو خاں کی بیوی اور سعد بن اتابک ابوبکر کی دختر تھی ۶۶۲ھ میں اپنے خسر کے کہنے سے سریر آرائے تختِ شیراز ہوئی اس وقت خاندانِ اتابکیہ میں سوائے اتابک عیش کے کوئی مرد اس قابل نہ تھا کہ سلطنت کا بھاری بوجھ اپنے کندھوں پر لیتا۔ غرض یہ نیک اور ہوشمند ملکہ ۶۶۲ھ سے ۶۸۶ھ تک بہت خوش اسلوبی کے ساتھ حکومت کرتی رہی۔

ارغانہ خاتون

چغتائی خاندان کے حکمران قرا ہلاکو بن مواتوخاں بن چغتائی بن چنگیز خاں

کی بیوی تھی ۱۸۵۶ء میں ترابلاؤ خاں کے انتقال کی وجہ سے تخت نشین ہوئی اور ۱۸۶۵ء تک نہایت عدل و انصاف سے حکومت کرتی رہی۔

اہلیا بائی

ہلکر خاندان کی مشہور رانی ہے جو ۱۷۲۵ء میں پیدا ہوئی۔ قدرت نے صورت شکل معمولی دی تھی مگر بلا کی طباع، ذہین اور خلیق تھی تھوڑی بہت پڑھی لکھی بھی تھی اور مذہبی کتب کا مطالعہ ہمیشہ کیا کرتی تھی۔ ملہار راؤ ہلکر کے بیٹے کھنڈے راؤ سے شادی ہوئی اور ایک لڑکا مالے راؤ اور ایک لڑکی بیجا بائی پیدا ہوئی اور ان دونوں بچوں کی ولادت کے بعد ملہار راؤ نے انتقال کیا۔ ملہار راؤ کی وفات کے بعد اہلیا بائی نے اپنے بیٹے مالے راؤ کو تخت نشین کیا۔ مگر وہ شروع سے پاگل اور اعصابی امراض میں مبتلا تھا نو مہینے حکومت کر کے راجہ مالے راؤ بھی بیکنٹھ باشی ہوگیا اور اہلیا بائی نے مجبوراً عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لی۔ گنگا دھر نے جو کھنڈے راؤ کا وزیر تھا اُس کی مخالفت کی اور ہلکر خاندان کے کسی دوسرے لڑکے کو متبنیٰ بنا کر تخت نشین کرنا چاہا۔ جب اہلیا بائی راضی نہ ہوئی تو گنگا دھر نے اس پر فوج کشی کی مگر اہلیا بائی نے پہلے ہی سندھیا، بھونسلہ اور پیشوا کو گنگا دھر کی اس بدمعاشی کی اطلاع دے دی تھی۔ اس لئے ان لوگوں نے گنگا دھر کو امداد دینے سے انکار کیا اور ۱۷۶۵ء میں اہلیا بائی نے عنانِ حکومت باضابطہ اپنے ہاتھ میں لے لی

اہلیا بائی نے ملک کا نظم و نسق بڑی عمدگی سے قائم کیا محصلات میں کمی، مالگزاری کی وصولی میں سختی کرنے کی ممانعت کی۔ گونڈ اور بھیل جو وہاں جرائم پیشہ کی حیثیت رکھتے تھے انہیں زمینیں دیں اور اُن کے لئے کام مہیا کیا۔ جس کی وجہ سے اس کا ملک گونڈوں اور بھیلوں کے ڈاکوں سے محفوظ ہوگیا۔ اُس نے مذہب و ملت کا امتیاز نہ کرتے ہوئے اپنی رعایا سے شفقت و محبت کا برتاؤ شروع کیا۔ صبح اُٹھ کر پوجا پاٹ کرتی اور پھر اپنے ہاتھ سے دان کرتی اور برہمنوں کو اپنے سامنے بھوجن کراتی اور پھر آپ کھاتی تھی۔ دن بھر میں دو دفعہ دربار کرتی تھی۔ صبح نو بجے سے گیارہ بجے تک اور پھر دو بجے سے شام کے چھ بجے تک۔ اس کے دربار میں ہر شخص کو حاضر ہونے کی عام اجازت تھی نہایت عادل، منصف مزاج اور سمجھدار رانی تھی۔ اس نے اپنے ملازم نہایت اچھے انتخاب کئے تھے۔ گوبند پنڈت گھنو اور کھنڈے راؤ اُس کے دو اہم مشیر تھے۔

اپنی رعایا سے اسے بڑی محبت تھی۔ گرمیوں میں ایک دفعہ پانی نہ برسنے کی وجہ سے تمام چشمے سوکھ گئے اور ملک کا ایک بڑا حصہ پانی کے لئے ترسنے لگا تو اُس نے اس خشک حصۂ ملک کو باہر سے پانی منگوا کر سیراب کیا اور رعایا کی ضروریات کے لئے پانی فراہم کرتی رہی۔

اپنے زمانۂ حکومت میں اُس نے ملک میں بیشمار مندر، دھرم سالے تالاب اور شفاخانے بنوائے، سڑکیں درست کیں۔ جگناتھ، گیا، بنارس کیدارناتھ، دوارکا اور ست بندھ کے تیرتھوں میں ایک ایک مندر اور دھرم سالہ بنوائی اور وہاں مستقل خیرات جاری کی۔ بنارس میں بشیشرناتھ کا جو مندر مرجع خلائق ہے وہ اسی رانی کی یادگار ہے۔

۱۷۶۷ء میں اہلیا بائی نے اپنی راجدھانی آباد کی اور اُس کا نام اندور رکھا جو اب تک موجود ہے۔ اُس کی زندگی کے آخری دن بہت تکلیف میں گذرے پہلے اُس کے اکلوتے بیٹے نے پاگل ہو کر انتقال کیا اور آخر میں اُس کی پیاری بیٹی نے جو اس کی زندگی کا سہارا تھی۔ اپنے شوہر کے ساتھ ستی ہونا چاہا۔ اس کمسن بیٹی ورتا کو سارے عزیز و اقارب اور ملک والوں نے ستی ہونے سے منع کیا مگر اُس نے رنڈاپے کی زندگی پر جل کر بھسم ہوجانے کو ترجیح دی اور اپنی ماں اہلیا بائی کی آنکھوں کے سامنے اپنے شوہر کی لاش کے ساتھ ہنسی خوشی جل گئی۔ جوان اکلوتی بیٹی کا ناوقت رانڈ ہونا اور پھر ماں کی آنکھوں کے سامنے جل کر اپنی جان دینا ایک قیامت خیز منظر تھا۔ اہلیا بائی کا دُکھی دل اسے برداشت نہ کرسکا۔ وہ اپنی بیٹی کو چتا میں دیکھ کر بیہوش ہوگئی۔ برہمنوں نے نربدا کے پوتر پانی سے اُسے نہلا نہلا کر تسلی دینی چاہی مگر ماں کی ممتا کو اس سے تسکین نہ ہوئی اور اہلیا بائی نے اسی غم میں ۱۷۹۵ء میں انتقال کیا۔

اہلیا بائی نے ۶۰ برس کی عمر پائی اور ۳۰ سال تک حکومت کی۔ نہایت سادہ مزاج تھی۔ سوائے ایک مالا کے کوئی زیور اس کے جسم پر نہیں رہتا تھا۔ حد درجہ انصاف پرست، پابند وقت، منتظم، سادگی پسند مستقل مزاج اور نیک طینت تھی، خوشامد سے اِسے سخت نفرت تھی اور باوجود غیر برہمن ہونے کے گوشت نہ کھاتی تھی۔

بادشاہ خاتون

سلطان قطب الدین محمد کی بیٹی نہایت خوبصورت، خوب سیرت انصاف پسند اور فاضلہ تھی۔ یہ نیک بخت خاتون اپنے ہاتھ سے

قرآن مجید لکھا کرتی تھی۔ ۶۹۱ھ میں سریر آرائے تختِ کرمان ہونے کے بعد کسی وجہ سے اُس نے اپنے بھائی کو قتل کرادیا جس کی وجہ سے سب رعایا بدظن اور دشمن ہوگئی اور آخرکار ۶۹۴ھ میں اس کو تخت سے اُتار کر مار ڈالا گیا۔

اس ملکہ کے دربار میں بڑے بڑے علماء، فضلاء اور شعراء جمع رہتے تھے یہ اُن کی سرپرستی کرتی تھی اور خود بھی شعر کہتی تھی۔ چنانچہ یہ رباعی اسی کے نام سے مشہور ہے۔

درون پردۂ عصمت کہ تکیہ گاہ منست مسافران ہوا را گذر بدشوار یست
نیم بادمزن سر نہ زیر مقنعۂ او ! کہ تار و پود وے از عصمت و نکوکاریست

بغداد خاتون

امیر الامراء امیر چوپان کی بیٹی، حضرت شیخ حسن کبیر کی بیوی نہایت خوبصورت اور شریف خاتون تھی۔ یہ اپنے حسن میں ثانی نہیں رکھتی تھی۔ اس کی خوبصورتی تمام شہر میں مشہور تھی۔ چنانچہ جب سلطان الوقت کو اس کے حسن و خوبصورتی کی خبر ہوئی تو سلطان اس پر غائبانہ عاشق ہوگیا اور سلطان کا یہ خیال شیخ صاحب کو بھی معلوم ہوگیا۔ شیخ صاحب یہ معلوم کرکے بہت رنجیدہ ہوئے اور اپنی عزیز بیوی کو طلاق دے کر خلیفہ کے حضور میں روانہ کردیا۔ اس زمانہ میں ملوک چنگیزیہ کا یہ دستور تھا کہ جب بادشاہِ وقت کسی منکوحہ پر عاشق ہوجاتا تو اس کے شوہر کا فرض تھا کہ وہ فوراً اپنی بیوی کو طلاق دے کر بادشاہ کی خدمت میں روانہ کرے۔

جب بغداد خاتون حرمِ شاہی میں داخل ہوئی تو سلطان اس کو اپنے تصور سے زیادہ حسین پاکر اُس کے عشق میں دنیا و مافیہا سے بےخبر ہوگیا اور یہ خاتون بادشاہ کی طبیعت سے اتنی واقف ہوگئی تھی کہ جو چاہتی کروالیتی۔

جب سلطان ابوسعید کا انتقال ہوگیا تو یہ خود حکومت کرنے لگی مگر ارپان خان نامی ایک درباری نے جو ملکہ کی حکومت سے متنفر تھا۔ ملکہ پر بادشاہ کے قتل کی تہمت لگائی اور اسی جرم میں اس نے چند اور درباریوں کو ہموار کرکے غریب ملکہ کو مروا ڈالا۔

یہ ملکہ خاص و عام میں "خنگار" کے نام سے مشہور ہوئی۔

بلقیس

شہر سبا کی ملکہ تھی اس کا باپ ہیلد بن سراحیل یمن کا بادشاہ تھا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس ملکہ کو خدا پرستی کی دعوت دی۔ بلقیس نے حضرت سلیمان کے پاس پہنچ کر ملاقات کی اور دعوئ نبوت کی تصدیق کرکے ایمان لاکر حضرت ہی کے عقد میں آئی۔ قرآن مجید و دیگر کتب سماوی میں اس ملکہ کا تذکرہ موجود ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بلقیس نے ۴۰ سال تک یمن اور ملکِ مغرب کی فرمانروائی کی ہے۔ حضرت سلیمان کے پاس بلقیس کے آنے اور آزمانے کے بہت سے قصے مشہور ہیں مگر ہم اُنھیں ترک کرتے ہیں۔

بیجابائی

سردار دیوان سرجی راؤ ایک مشہور مرہٹہ سردار کی بیٹی تھی۔ اس کی شادی بہت چھوٹی سی عمر میں پونا کے راجہ دولت راؤ سندھیا سے ہوئی تھی۔ یہ رانی نہایت شریف، اعلیٰ دماغ اور مردانہ مزاج کی عورت تھی۔ دولت راؤ اُس کا بہت ادب کرتا تھا اور امور سلطنت میں اس سے بغیر مشورہ کئے کوئی کام نہ کرتا تھا۔ ۱۸۲۷ء میں جب دولت راؤ لاولد بیکنٹھ باشی ہوا تو بیجابائی راج گدی پر رونق افروز ہوئی۔ وہ چاہتی تھی کہ اپنے خاندان کے کسی لڑکے کو متبنےٰ کرے مگر بعض وجوہ کی بناء پر اُس کو اپنے شوہر کے ایک عزیز مکٹ راؤ کو متبنےٰ کرنا پڑا۔ ۱۸۳۳ء میں مکٹ راؤ بالغ ہوا تو سرکار انگلشیہ کی مداخلت سے وہ گدی نشین ہوا اور رانی بیجابائی کو ایک معقول پنشن پر گدی سے دست بردار کردیا گیا۔

غدر ۱۸۵۷ء کے بعد رانی بیجابائی نے انتقال کیا۔

بہو بیگم

محمد شاہ بادشاہ کی بیٹی اور شجاع الدولہ والیِ اودھ کی بیگم، نہایت رعب داب اور متین خاتون تھیں۔ شجاع الدولہ ان کا حد درجہ احترام کرتے تھے۔ آصف الدولہ نے جب اپنی فضول خرچیوں سے ساری دولت اُڑادی اور پھر بہو بیگم سے مانگنا شروع کیا تو اُنھوں نے تین چار لاکھ روپیہ نقد اور ۳۶ لاکھ روپیہ کے زیورات اور جواہرات دیئے دس ہزار پیادے اور سوار ہزار ہا ہاتھی گھوڑے اور ایک لاکھ سے زیادہ متوسلین اُن کے پاس تھے۔ اپنے فرزند آصف الدولہ کے انتقال کے بعد فیض آباد کی حکومت بہو بیگم نے اپنے ہاتھ میں لے لی تھی اور دارابِ علی خاں کے ذریعہ خود انتظام مملکت کرتی تھیں۔ اُن

کی حکومت میں بفیض آباد گہوارہ عدل وعیش بنا رہا تھا۔ نہایت منتظم، دیانتدار، متین اور مذہب پرور تھیں۔ ہندوستان کے بیشتر شعراء اسی سرکار سے متوسل تھے چنانچہ شیخ امداد علی بحر مرحوم نے انہیں کے پاس عمر گذار دی۔

بہو بیگم نے انتقال کے بعد چونکہ اُن سے سوتیلے فرزند یمین الدولہ وارث مقرر ہونے والے تھے۔ اس لئے اُنہوں نے ایک وصیت نامہ کی رو سے تین لاکھ روپیہ اپنے مقبرہ کے لئے اور ایک لاکھ روپیہ مصارف عود و گل کے لئے اور دس ہزار سالانہ کی جائیداد ان لوگوں کی پرورش کے لئے جو فاتحہ خوانی وغیرہ کریں چھوڑی تھی۔

اُن کے انتقال کے بعد داراب علی خاں نے مقبرہ بنوانا شروع کیا مگر مکمل نہ ہو سکا۔

تُرکان خاتون

ترکان سلطان بن ابی بکر والی شیراز کی ملکہ اور محمد اتابک ولیعہد شیراز کی ماں تھی ۶۵۸ھ میں سعد بن ابی بکر نے انتقال کیا تو ملکہ ترکان نے عنانِ سلطنت اپنے ہاتھ میں لی۔ کیونکہ ولیعہد شیراز خورد سال تھا اس لئے ملکہ ترکان نے سریر آرائے سلطنت ہو کر ایک سفارت ہلاکو خاں کی خدمت میں اس غرض سے بھیجی کہ اس کے خورد سال فرزند کے لئے فرمانِ حکومت جاری کیا جائے۔ چنانچہ ہلاکو خاں نے ملکہ کے حسب خواہش سندِ حکومت بھجوائی مگر افسوس کہ اس کے دو ہی سال بعد خورد سال ولیعہد نے بالاخانہ سے گر کر انتقال کیا۔ اس کے انتقال کے بعد ملکہ ترکان نے اپنے داماد اتابک محمد شاہ کو بڑی دقتوں کے بعد والئی شیراز بنایا مگر یہ نامراد بلا کا عیاش اور شراب خور نکلا۔ اور اپنی ساس کی نصیحتوں کو پس پشت ڈال کر من مانی حکومت کرنے لگا۔ ناچار ملکہ مذکور نے آٹھ ماہ بعد اس نالائق کو تخت سے اتار کر اُس کے بھائی اتابک سلجوق کو بادشاہ بنایا مگر اتابک سلجوق اپنے بھائی سے بھی چار قدم آگے رہا۔ اس نمک حرام نے ایک غلام کے ذریعہ سے ملکہ ترکان کو خفیہ طور پر مروا ڈالا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ملک بھر پر ہلاکو خاں کا غضب نازل ہوا۔ اور ۶۶۲ھ میں وہ نامراد کیفر کردار کو پہنچا۔

تراکنہ خاتون

چغتائی خاں بن چنگیز خاں کی بیوی اور بڑی صاحب ہمت و تدبر تھی۔ ۶۳۸ھ میں چغتائی خاں نے انتقال کیا تو قبل اس کے کہ چغتائی قبائل اُس کی جانشینی کا تصفیہ کریں اُس نے تخت سلطنت پر قبضہ کر لیا اور تن تنہا حکومت کرنے لگی۔

چنگیز خاں کے چھوٹے بھائی یوتگین خاں نے اس پر حملہ کرنا چاہا اور ایک بڑی فوج لے کر چڑھائی کی اس وقت یہ ملکہ اکیلی تھی اس کا بیٹا کیک خان بھی اس کے پاس نہ تھا مگر اس نے نہایت جی داری کی اور یوتگین کو لکھا کہ آپ ناحق ادھر حملہ آور ہونے کی تکلیف کر رہے ہیں۔ کیک آپ کے استقبال کے لئے آرہا ہے۔ یوتگین کو یہ خیال ہوا کہ کیک قبائل کو فراہم کر کے زبردست لشکر کے ساتھ آرہا ہوگا۔ اس سے مقابلہ مشکل ہے اس لئے وہ واپس ہو گیا۔ اس طرح پالیسی کے ساتھ اُس نے یوتگین کو ٹالا۔ اُس کا بیٹا کیک پست ہمت تھا۔ مگر اُس نے اُس کی پیٹھ ٹھونک کر اُسے بادشاہ بنا دیا۔ ۶۴۳ھ میں تمام چغتائی قبائل کے سردار جمع ہوئے اور چغتائی خان کی جانشینی کا مسئلہ پیش کر کے اسے منظور کرا لیا اور اس شرط پر کیک نے جانشینی قبول کی کہ یہ سلطنت اسی کے خاندان میں ہمیشہ رہیگی۔

تراکنہ خاتون نے ۶۳۸ھ سے ۶۴۳ھ تک پانچ ایک سال نہایت بیدار مغزی سے حکومت کی دیار بکر، حران، رہا، ماردین پر چغتائی قبضہ اسی کے زمانہ میں ہوا۔

بیٹے کو تخت نشین کرنے کے بعد ۶۴۳ھ سے اُس نے گوشہ نشینی اختیار کی۔

تلسی بائی

اندور کے راجہ جسونت راؤ ہلکر کی رانی تھی۔ ۱۸۰۸ء میں جسونت راؤ فاترالعقل ہو گیا بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ تلسی بائی ہی نے اُس کا دماغ خراب کر دیا تھا بہرحال ۱۸۰۸ء سے تلسی بائی نے عنانِ حکومت اندور اپنے ہاتھ میں لے کر خود مختار حکومت شروع کی۔ صورت شکل اچھی مگر اخلاق بڑی مکروہ تھی۔ اس نے ایک زنانہ گارڈ تیار کیا تھا جو اُس کے جلو میں رہتا تھا۔ خود بھی بڑی شہسوار تھی اور تمام سپاہیانہ فنون سے واقف تھی مردانہ

میں ہتیار سے سج کر گھوڑے پر چڑھتی تھی۔

تقریباً دس سال تک داد عیش و عشرت دے کر ملک کے ہزارہا نوخیزوں کو برباد کر کے اُس نے اپنے وجود سے اندر کو پاک کیا۔

تندو

تندو حسین بن اویس ترکمان کی نہایت ہشیار اور مدبر بیٹی تھی۔ یہ اپنے چچا احمد بن اویس کے ساتھ مصر گئی تو مصر کے بادشاہ ملک طاہر نے اس سے نکاح کر لیا مگر چند سال بعد طلاق دے دی۔ طلاق کے بعد اس نے اپنے چچازاد بھائی شاہ ولد سے عقد ثانی کیا۔ جب دونوں میاں بیوی مصر سے بغداد واپس آئے تو شاہ ولد کو بغداد کا تخت ملا کیونکہ ان دونوں کے قیام مصر کے زمانے میں احمد بن اویس والی بغداد کا انتقال ہو گیا تھا شاہ ولد کے تخت نشین ہونے کے بعد تندو نے اُس کو کسی طرح سے مروا ڈالا اور خود تخت و تاج کی مالک ہو گئی۔ اس کے بعد محمد شاہ بن قرا یوسف نے بغداد پر چڑہائی کی اور ایک سال تک محاصرہ قائم رکھا مگر اس ہشیار ملکہ نے محمد شاہ کو کسی طرح اپنے ارادہ میں کامیاب ہونے نہیں دیا بلکہ دجلہ کی راہ سے واسط چلی گئی اور تستر پر قابض ہو گئی۔ اس کے بعد رعایا نے ملکہ کو شاہ ولد مرحوم کے بیٹے محمود کے ساتھ تخت پر بٹھایا جو کسی دوسری خاتون کے بطن سے تھا مگر ملکہ تندو کو کب گوارا ہو سکتا تھا کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ حکومت کرے اس لئے اُس کو بھی مروا ڈالا اور ۸۱۹ھ میں بلا شرکت غیرے راج کرنے لگی۔ مدت تک بصرہ کے عربوں سے لڑتی رہی اور جزیرہ واسط پر تلوار کے زور سے قابض ہو گئی اس کی تمام قلمرو میں اسی کے نام کا خطبہ اور سکہ جاری تھا۔ بالآخر ایک مدت تک حکومت کر کے ۸۲۲ھ میں انتقال کر گئی۔

جسومتی

یہ رانی راجہ دامودر والی جموں کی بیوی تھی۔ یہ راجہ (۳۱۲۱ء قبل مسیح لغایت ۳۰۳۶ء قبل مسیح) سری کرشن جی کے بھائی بلبھدر (بلرام) کے ہاتھ سے جمنا کے کنارے متھرا کی لڑائی میں مارا گیا تو جسومتی نے ریاست جموں کا کاروبار سنبھالا۔

راجہ دامودر کے مارے جانے کے وقت رانی جسومتی حاملہ تھی اور کچھ مدت کے بعد اس کے ایک لڑکا ہوا جس کا نام دیال گونند رکھا گیا اور یہی وارث تخت و تاج ہوا۔ دیال گونند کو چودہ برس کی عمر میں گونند دوم کے لقب سے تخت نشین کیا گیا۔ مؤرخین کشمیر راوی ہیں کہ اس کے زمانہ میں مہابھارت کی جنگ ہوئی۔

رانی جسومتی چودہ سال تک جموں پر حکومت کر کے اپنے بیٹے کے لئے دست بردار ہو گئی۔

جنگو

جنگو جاپان کے بادشاہ چوائی کی ملکہ تھی جو شاہ چوائی سے زیادہ بہادر اور ہمت والی تھی۔ اُسے کسی دیوی کی طرف سے کسی طرح یہ معلوم ہوا کہ جاپان کے مشرق کی طرف ایک ملک ہے جہاں لاتعداد خزائن ہیں۔ اُس نے اپنے شوہر کو ان خزائن کے حاصل کرنے کے لئے مجبور کیا مگر شاہ چوائی نے اپنی پست حوصلگی کی وجہ سے آمادگی ظاہر نہیں کی چونکہ جنگو کو دیبی نے ہدایت کی تھی اور چوائی نے اس ہدایت کو جھٹلایا تھا اس لئے چوائی پر دیبی کا غضب نازل ہوا۔ اور وہ ۲۰۰ء میں مر گیا۔ اس کے مرنے کے بعد ملکہ جنگو نے چین کے مشرق کی جانب یعنی کوریا پر فوج کشی کی تیاریاں شروع کیں اور ۲۰۲ء میں ایک بیڑہ لے کر کوریا پر حملہ کر دیا۔ کوریا میں تین بادشاہ حکمران تھے ملکہ جنگو نے یکے بعد دیگرے تینوں کو مطیع کر کے خراج حاصل کیا اور تین سال کے بعد اپنے پایۂ تخت کو واپس ہوئی جہاں اُس کے ہاں ایک لڑکا اوجن پیدا ہوا۔ ملکہ جنگو کے دو بیٹے سوتیلے بھی تھے مگر جنگو نے اپنے بیٹے اوجن کو ولیعہد مقرر کیا اور وہ دونوں لڑکے رو پیٹ کر بیٹھ رہے۔

ملکہ جنگو نے ۶۸ برس تک جاپان پر نہایت بیدار مغزی اور جفاکشی کے ساتھ حکومت کی اور ۲۶۹ء میں ملک جاپان کی حکومت اپنے بیٹے اوجن کے لئے چھوڑ کر مر گئی۔ ملکہ نے سو برس کی عمر پائی تھی۔

چاند بی بی

نادرۃ الزمان چاند سلطانہ، نظام شاہ والی احمد نگر کی بیٹی اور علی عادل شاہ والی بیجاپور کی ملکہ تھی۔ علی عادل شاہ کے بعد اُس نے بیجاپور کے تخت کو خود سنبھال لیا تھا۔ نہایت بیدار مغز، عدل پرور، جنگجو اور مردانہ دل گردہ کی خاتون تھی۔ مردانہ لباس میں گھوڑے پر سوار ہو کر نکلتی تھی۔ جب اکبر نے بیجاپور پر لشکر کشی کی تو اُس نے بہ نفس نفیس مقابلہ کیا اور مغل فوج

کے چھکے چھڑا دیئے۔ چاند بی بی کی زندگی تک مغلوں کو بیجاپور کی طرف رخ کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔

۱۵۹۹ء میں بعض نمک حراموں نے اس بیدار مغز ملکہ کے خلاف سازش کر کے یہ مشہور کر دیا کہ اُس نے مغلوں سے ساز باز کر لی ہے۔ اور اسی جرم میں اس کو شہید کر دیا۔ اس خون ناحق کا نتیجہ یہ نکلا۔ کہ تھوڑے ہی زمانے کے بعد بیجاپور کی اینٹ سے اینٹ بج گئی اور سلطنت تباہ و برباد ہو گئی۔

جنداں

جنداں مہاراجہ رنجیت سنگھ والئ پنجاب کی چھوٹی رانی اور دلیپ سنگھ کی ماں تھی۔ ۱۸۳۹ء میں جب رنجیت سنگھ نے انتقال کیا تو اُس وقت دلیپ سنگھ کی عمر ۵ سال کی تھی۔ پنجاب میں ایسی ابتری پھیلی کہ یکے بعد دیگرے دو دیوان مارے گئے اور خالصہ فوج نے مظالم کی انتہا کر دی۔ رانی جنداں سے ضبط نہ ہو سکا اُس نے اپنے ہاتھ میں سلطنت کی مہام لے کر حکومت شروع کی، باضابطہ دربار کرنے اور احکامات جاری کرنے لگی۔ اُس کی جدوجہد کے باوجود خالصہ فوج نے اطاعت اختیار نہیں کی تو رانی نے مجبور ہو کر خالصہ فوج کا حملہ انگریزی علاقہ پر کرا دیا۔ اس حملہ سے رانی کا مقصد یہ تھا کہ خالصہ فوج کا زور ٹوٹ جائے اور انگریزی فوج خالصہ فوج کی سرکوبی کر دے چنانچہ ایسا ہی ہوا مگر اُس کے بعد انگریزوں نے ملک پر قبضہ کر لیا۔ اور انتظامی اختیارات اپنے ریذیڈنٹ کو دے کر رانی جنداں کو ڈیڑھ لاکھ روپیہ پنشن اس شرط پر مقرر کر دی کہ وہ انتظامی معاملات میں دخل اندازنہ ہو۔ مگر رانی جنداں نے اُس کو پسند نہیں کیا اور گورنمنٹ سے اپنے اختیارات طلب کئے۔ گورنمنٹ نے اس خیال سے کہ رانی کو اُس کے دیوان لال سنگھ نے بہکایا ہے۔ لال سنگھ کو اس سے جدا کر دیا۔ رانی لال سنگھ کو بہت چاہتی تھی۔ چنانچہ لال سنگھ کی معزولی کے بعد رانی نے کشمیر اور کابل کے راجپوتوں کو جمع کر کے بغاوت کرنا چاہی مگر بدنصیبی سے عین وقت پر راز فاش ہو گیا اور رانی قید کر لی گئی۔ مگر جنداں ایسی جی دار عورت تھی کہ بنارس سے جہاں وہ قید میں رکھی گئی تھی فرار ہو کر نیپال پہنچ گئی۔ گورنمنٹ نے نیپال سے جنداں حاصل کرنا چاہا۔ مگر نیپال کے راجہ نے اُس کی حوالگی سے انکار کیا اور مدت تک جنداں نیپال میں رہ کر انتقال[1] کر گئی۔

[1] مہارانی جنداں کا انتقال لندن میں ۱۸۶۳ء میں ہوا جبکہ وہ اپنے بیٹے مہاراجہ دلیپ سنگھ کے پاس مقیم تھی۔ ایڈیٹر

درگا بائی

درگا بائی بڑی بہادر اور مدبر عورت تھی۔ ساونت واڑی کے راجہ پھوند ساونت دوم نے ۱۸۱۳ء میں انتقال کیا تو کھیم ساونت سوم گدی نشین کیا گیا جو بہت کم سن تھا۔ کھیم ساونت دوم کی دوسری بیوہ رانی درگا بائی تھی۔ جس نے عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لے کر بڑی بیدار مغزی سے حکومت کرنی شروع کی۔ انگریزوں نے اس کی حکومت کے دو قلعے راجہ کولہاپور کو دے دیئے تھے۔ حکومت برطانیہ نے رانی کو ڈرایا، دھمکایا اور

الٹیمیٹم دیا مگر رانی ٹس سے مس نہ ہوئی۔ مجبوراً حکومت برطانیہ نے حملہ کر دیا۔ مگر اس کا صدمہ رانی کو اس قدر پہنچا کہ اسی سال یعنی ۱۸۱۹ء میں انتقال کر گئی۔

درگاوتی

درگاوتی گڈھ کے راجہ کنک کی رانی تھی جس نے اپنے شوہر کے انتقال کے بعد گڈھ کی حکومت اپنے ہاتھ میں لی تھی۔ یہ رانی نہایت بہادر اور بڑی جی دار تھی۔ باز بہادر نے گڈھ پر چڑھائی کی تو درگاوتی نے گونڈوں کی جمعیت لے کر اس سختی کے ساتھ باز بہادر پر حملہ کر کے اُسے محصور کر لیا۔ کہ باز بہادر کو تمام لاؤ لشکر چھوڑ کر بھاگنا پڑا اور باز بہادر نے بیک بینی و دو گوش جو فرار پر قرار کیا تو سیدھے سارنگ پور پہنچ کر دم لیا۔ درگاوتی نے باز بہادر کی تقریباً ساری فوج کو تہ تیغ کیا اور اُس کا ساز و سامان لوٹ لیا۔ ۹۶۸ھ کا یہ واقعہ تاریخ ہند میں ہمیشہ جلی قلم سے لکھا ہوا نظر آئیگا۔

شہنشاہ اکبر نے آصف خاں ہروی کو گڈھ مانک پور بطور جاگیر عطا کیا تو آصف خاں نے گڈھ پر قبضہ کرنا چاہا جب آصف خاں نے فوج کشی کی اور چھ ہزار سوار اور پیادوں کا لشکر لے کر حملہ کیا تو درگاوتی نے اپنے آٹھ سو جانباز سپاہیوں اور چند ہاتھیوں کو لے کر نہایت جوانمردی سے آصف خاں کا مقابلہ کیا مگر بدنصیبی سے عین میدان جنگ میں ایک تیر رانی کی آنکھ میں لگ کر ترازو ہو گیا جس کی وجہ سے رانی کو یہ احساس پیدا ہوا کہ اب وہ جنگ میں کامیاب نہ ہو سکے گی۔ اس احساس کی شدت نے رانی کے حواس پر ایسا غلبہ پایا کہ اُس نے اپنے فیل بان سے خنجر مانگ کر اپنا کام تمام کر لیا۔ ۱۰۰۶ھ کا یہ واقعہ بھی ہمیشہ تاریخ ہند میں نمایاں نظر آئے گا۔

دیوی چودھرانی

دیوی چودھرانی بنگال کے گورنر جنرل وارن ہسٹنگز کے زمانہ میں ڈاکوؤں کی سردار تھی۔ اُس کا رعب بنگال پر ایسا چھایا ہوا تھا کہ دیسی رؤسا اس کے نام سے لرزہ جاتے تھے۔ بنگال کے نواب شجاع الدولہ میں اتنی قوت نہ تھی کہ وہ چودھرانی اور اُس کے زبردست گروہ کا استیصال کر سکے۔ ان دنوں انگریز صرف دولت جمع کرنے کی فکر میں کچھ ایسے منہمک تھے کہ اُن کو خبر تک نہ تھی کہ آج کل بنگال میں کیا ہو رہا ہے۔ اس موقعہ کو غنیمت سمجھ کر دیوی چودھرانی بنگال کی رانی ہو گئی۔ نواب صاحب بنگال اور انگریز اس بلائے ناگہانی سے سراسیمہ ہو کر منہ تکتے رہ گئے۔ ایک عرصہ کے بعد انگریز جب دولت کے نشہ سے چونکے تو چودھرانی کے مظالم سے بنگال کو نجات دلانے کی کوشش کی اور ایک فوج چودھرانی کی سرکوبی کے لئے روانہ کی۔ چودھرانی نے اپنے ڈاکوؤں کو ساتھ لے کر بڑی مردانگی سے مقابلہ کیا اور میدان جنگ میں شمشیر بکف جاں بحق ہوئی۔

رانی ترالی

رانی ترالی راجہ تیج سنگھ والی ٹیہری (واقع بندیلکھنڈ) کے متوفی بھائی کی بیوہ تھی۔ جب ۱۸۴۲ء میں راجہ تیج سنگھ لاولد مر گیا تو رانی ترالی اُس کی جانشین ہوئی۔ یہ رانی نہایت سمجھدار، روشن دماغ اور روشن خیال تھی۔ اُس نے ۱۸۴۷ء میں اپنے قلمرو سے رسم ستی کے وبال اور بے رحمانہ رواج کو بند کیا۔ ۲۰۰۰ ہزار مربع میل اُس کی ریاست کا علاقہ تھا اور دو لاکھ نفوس پر حکومت کرتی تھی۔ ۱۸۵۷ء میں چاروں طرف غدر ہوا۔ تو اُس نے انگریزوں کا ساتھ دیا اور بہت مدد کی جس کے صلہ میں انگریزوں نے اُس کے خراج کو بہت کم کر دیا۔

رضیہ بیگم

سلطان شمس الدین التمش کی بیٹی اور نہایت اولوالعزم اور بہادر ملکہ تھی۔ اپنے باپ کے بعد اُس نے لڑ کر تخت سلطنت حاصل کیا اور ۱۲۳۶ء میں خود مختار ملکہ بن گئی۔ یہ پہلی مسلمان ملکہ تھی جس نے ہندوستان پر حکومت کی۔ نہایت بہادر، پڑھی لکھی، سلیقہ شعار اور مدبر تھی۔ خدا نے حسن ظاہری اور باطنی دونوں سے سرفراز کیا تھا۔ چونکہ عنفوان شباب تھا اور خود مختار بادشاہت کا زعم بھی تھا۔ اس لئے ذرا شوق جو چرایا تو اپنے اصطبل کے داروغہ سے دلچسپی پیدا کر لی۔ ملک کافور حبشی امیر الامراء کے خطاب سے سرفراز ہوا۔ بھلا درباری اُمرا یہ کس طرح برداشت کر سکتے تھے بغاوت ہو گئی مگر پھر بھی ملکہ نے اپنی بہادری کے زعم میں باغیوں سے مقابلہ شروع کیا اور مردانہ وار لڑ کر ۱۲۳۹ء میں شہید ہوئی۔ تقریباً چار سال تک نہایت عدل و انصاف سے حکومت کی۔

---

۱ یہ دلچسپی کسی یورپین مورخ کی اختراع معلوم ہوتی ہے۔ ایڈیٹر

مؤرخین کا بیان ہے کہ رضیہ بیگم شعر بھی کہتی تھی چنانچہ بعض تذکروں
[میں] اُس کے یہ شعر ملتے ہیں۔ شیریں تخلص کرتی تھی۔

[...]میدان نورُخ خورشید ازیں چہ   بسمل شدۂ تیغ نگاہِ غضب ماست
[...]زماست کہ برماست چہ تقصیرِ دلِ زار   آں کشتۂ انداز غم بے سبب ماست

[...]کم ببرکتِ پا چرخ تخت سلطانی   دہم ببالِ ہما خدمت مگس رانی

سکندر بیگم

۱۲۳۳ھ میں پیدا ہوئیں۔ ۱۲۵۰ھ میں نواب جہانگیر محمد خاں سے شادی ہوئی اور ۱۲۵۳ھ میں تخت نشین اور نواب بھوپال ہوئیں مگر تمام کاروبار نواب جہانگیر محمد خاں ہی کے زیر اہتمام رہا۔ ۱۲۶۰ھ میں نواب جہانگیر محمد خاں نے انتقال کیا تو آپ نے اپنی صاحبزادی نواب شاہجہان بیگم کو تخت نشین کرا دیا مگر کاروبار سلطنت خود انجام دیتی رہیں ۱۲۶۴ھ میں گورنمنٹ نے یہی مناسب تصور کیا کہ سکندر بیگم ہی کو تخت نشین رکھا جائے اس لئے دوبارہ انہی کی باضابطہ تخت نشینی ہوئی اور حسب سابق انتظام سلطنت کرتی رہیں۔

۱۸۵۷ء کے غدر میں بیگم نے انگریزوں کی بڑی مدد کی اور ریاست بھوپال میں کوئی فتنہ پیدا ہونے نہیں دیا۔ اس صلے میں گورنمنٹ نے نہ صرف کامل اختیارات دیئے بلکہ ۱۸۶۰ء میں پرگنہ بیرسیا بھی ریاست بھوپال میں ملا دیا گیا۔

بیگم نے اپنے عہدِ حکومت میں فوجی قوت بڑھائی ملک کو زرخیز بنایا اور مالیہ کو نہایت عمدگی سے استحکام دیا۔ پورے ممالک محروسہ کے تین صوبے مقرر کرکے ہر ایک صوبے پر ایک ایک ناظم مقرر کرکے اور خود دورہ کرکے ساری ریاست کی اصلاح کی۔

(۲۳۶۱۸۴۱) روپیہ جو سلطنت کا قرضہ تھا ادا کیا گیا۔ جامع مسجد سہور کے کھنڈر جسے ملک مغیث نے ۸۳۲ھ میں بنانا شروع کیا تھا مگر غیر مکمل تھی اور اجاڑ ہوگئی تھی، کو از سرِ نو بنوایا اور ۱۲۸۱ء میں اس کی تکمیل کرادی، موتی مسجد بھی اسی نمونے پر بنوانی شروع کی مگر اُس کی تکمیل نہ ہوسکی۔ ایک باغ فرحت افزا نام سے نہایت عمدہ بنوایا، اور ۱۲ رجب ۱۲۸۵ھ مطابق ۳۰ اکتوبر ۱۸۶۸ء میں اسی باغ میں دفن ہوئیں۔

نہایت خدا ترس، عادل، منتظم، مدبر، اور علم دوست خاتون تھیں مذہبی توکل کا یہ حال تھا کہ مرتے وقت اپنی قبر پہ مقبرہ نہ بنوانے کی وصیت کی۔

سلطان جہاں بیگم

ہز ہائینس نواب سلطان جہاں بیگم صاحبہ تاج ہند (کراؤن آف انڈیا) جی۔ بی، ای، جی، سی، ایس، آئی، ملکۂ بھوپال ۲۷ ذیقعدہ ۱۲۷۵ھ م ۹ جولائی ۱۸۵۸ء کو تولد ہوئیں۔ اپنی والدہ نواب شاہجہاں بیگم کی نگرانی میں تعلیم و تربیت پائی۔

۲۴ ذالحجہ ۱۲۹۱ھ کو نواب احمد علی خاں سے شادی ہوئی۔ آپ کے بطن سے دو صاحبزادیاں اور تین صاحبزادے تولد ہوئے۔ نواب حمید اللہ خاں بہادر (موجودہ نواب صاحب بھوپال) آپ ہی کے بطن سے ۸ ربیع الاول ۱۳۱۲ھ م ۹ ستمبر ۱۸۹۴ء کو تولد ہوئے۔

۱۳۱۹ھ میں آپ تخت نشین ہوئیں۔ نہایت بیدار مغزی اور دلچسپی کے ساتھ ریاست کے انتظام کئے۔ تقریباً ہر شعبہ کی اصلاح کی۔ مسلم یونیورسٹی اور دار المصنفین وغیرہ کی بہت مالی امداد کی۔ انجمن ترقی اُردو کی ابتدا میں بڑی مدد کی۔ ہر تعلیمی اور قومی کام میں مدد دیتی تھیں۔ ترقی و تعلیم نسواں میں بہت کوشاں رہیں اور بھوپال میں تعلیم نسواں کی لہر دوڑا دی۔ بڑی اچھی مصنفہ تھیں۔ آپ کی ۱۸ کتابیں شائع ہوچکی ہیں جن کے مجموعی صفحات تقریباً پانچ ہزار ہوتے ہیں۔

۱۳۲۱ھ میں حج بیت اللہ کیا۔ ۱۹۱۱ء میں یورپ کا سفر کیا۔ ہندوستان کے بیشتر مقامات دہلی، اندور، آگرہ، شملہ، الہ آباد، بمبئی علی گڈھ، لاہور، لکھنؤ، نینی تال، گوالیار، حیدرآباد دکن وغیرہ بھی ملاحظہ کر چکی تھیں۔

نہایت فیاض، رحمدل، ذی خُلق، منتظم، مدبر خاتون تھیں۔ آج سے چند سال پیشتر نواب حمید اللہ خاں بہادر کو اپنا جانشین بنا کر انتقال فرمایا۔

سوگندا رانی

یہ راجہ شنکر ورما کی رانی، راجہ گوپال ورما اور راجہ سنگت ورما کی ماں تھی جو اپنے دونوں بیٹوں کے انتقال کے بعد کشمیر کے تخت پر براجمان ہوئی مگر دو ہی سال کے بعد رعایائے کشمیر نے اُس کو تخت سے اس وجہ سے

اتار دیا کیونکہ یہ اپنے وزیر اور خزانچی دونوں سے بدنام تھی۔ سوگندا رانی سنہ ۹۰۰ء کے پس و پیش کشمیر پر حکمران تھی۔

سیّدہ

فخرالدولہ دیلمی کی بیوی اور مجیدالدولہ کی ماں تھی ۳۸۷ھ میں فخرالدولہ نے انتقال کیا تو اس کا بیٹا مجیدالدولہ تخت نشین کیا گیا۔ چونکہ یہ خورد سال تھا اس لئے کاروبار سلطنت سیّدہ نے سنبھال لیا۔ یہ نہایت مدبرہ، سلیقہ مند اور سمجھدار خاتون تھی اس نے مجیدالدولہ کے بالغ ہونے تک نہایت بیدار مغزی سے حکومت کی اور اُس کے بعد تخت سلطنت بیٹے کے حوالے کر دیا۔

مجیدالدولہ نے ایک نالائق شخص کو وزیر بنا کر بہت ظلم و زیادتی شروع کر دی سیّدہ نے یہ حالت دیکھ کر لارستان کا رُخ کیا اور وہاں کے حاکم حسین بن بدر سے فوجی امداد لے کر شیراز پر چڑھائی کی۔ مجیدالدولہ نے مقابلہ کیا مگر بددل فوج نے ساتھ نہیں دیا۔ سیدہ نے مجیدالدولہ اور اُس کے وزیر ابوعلی کو گرفتار کر لیا اور عراق عجم پر خود مختارانہ حکومت کرنے لگی۔

سیّدہ پردہ میں بیٹھ کر دربار کرتی اور نہایت تدبر سے حکومت کرتی رہی مدت کے بعد محض اس خیال سے کہ اب مجیدالدولہ سنبھل گیا ہوگا۔ اُس نے مجیدالدولہ کو پھر تخت نشین کر دیا۔ اور خود بھی امور سلطنت میں دخیل رہی ۴۲۰ھ میں سیّدہ نے انتقال کیا اور مجیدالدولہ نے اپنی نالائقی سے رعایا کو برافروختہ کر دیا تو محمود غزنوی نے ملک پر قبضہ کر کے مجیدالدولہ کو بھی قید کر دیا۔ اس طرح عراق عجم کی وہ حکومت جسے فخرالدولہ دیلمی اور سیّدہ نے اپنے تدبر سے قائم رکھا تھا۔ نالائق مجیدالدولہ کی بدولت برباد ہوگئی۔

سیمیرامس

طوفانِ نوح سے تین سو سال بعد اور دو ہزار سال قبل مسیح اسیریا یعنی عراق عرب شاہ پالی نس کے قبضہ میں تھا۔ اس بادشاہ نے انتقال کیا تو اس کی ملکہ سیمیرامس نے تختِ سلطنت پر قدم رکھا۔ بابل کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اُسی نے تعمیر کرایا۔ یہ ایک اولوالعزم اور جنگجو ملکہ تھی۔ ابتداً اس نے اپنی حکومت لبیا سے حبش تک بڑھالی تھی۔ اور پھر ہندوستان کی زرخیزی کا حال سُن کر اس پر حملے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ بہت کم لوگ اس حقیقت سے واقف ہیں کہ ہندوستان پر شمال غربی حدود سے دارا، سکندر، قاسم، محمود غزنوی، تیمور، بابر، نادر شاہ سے بہت قبل ایک ملکہ نے بھی فوج کشی کی ہے وہ ملکہ یہی سیمیرامس تھی جس نے ایک عظیم الشان لشکر اور سینکڑوں جنگی جہاز لے کر ہندوستان پر حملہ کیا۔ اپنے گھوڑوں کو ہندوستان کے ہاتھیوں سے مانوس کرانے کے لئے اس ملکہ نے اپنے لشکر میں لکڑی کے ہاتھی بنوائے تھے جو اس کی فوج میں گھوڑوں کے ساتھ تھے اس طرح گھوڑوں کے دلوں سے ہاتھیوں کا خوف نکالا گیا تھا۔ چنانچہ ملکہ سیمیرامس نے ۳۰ لاکھ پیادے ۲۰ لاکھ سوار ایک لاکھ رتھ ایک لاکھ سانڈنیاں ۲ ہزار جہاز لے کر براہ باختر ہندوستان پر حملہ کیا۔ اس زمانہ میں شمال مغربی ہند پر ستابیت کا راج تھا۔ راجہ جی نے مقابلہ تو کیا مگر چھکے چھوٹ گئے اور فوج پسپا ہو کر بھاگ گئی۔ ملکہ نے تعاقب کیا اور دور تک پیچھا کرتی ہوئی چلی گئی۔ راجہ نے اپنی منتشر فوج کو بڑی دقت سے جمع کر کے پھر ایک بار قدم جمائے اور دوبارہ مقابلہ شروع کیا۔ ناچار ملکہ کو واپس ہونا پڑا اور راجہ اُسے دباتا ہوا چلا۔ اس طرح ملکہ کو شکست ہوئی مگر ملکہ نے اپنے آپ کو اس طرح بچایا کہ ایک پل جو دورانِ تعاقب میں ملکہ کے لشکر والوں نے تیار کیا تھا۔ اور ملکہ کے واپس ہونے کے بعد اس پر راجہ کی فوج چڑھی ہوئی تھی۔ کٹوا دیا اس طرح راجہ کے ہزارہا سپاہی کام آئے اور ملکہ نہایت اطمینان کے ساتھ اپنے دارالسلطنت کو واپس ہوگئی۔

شاہجہان بیگم

۶ر جمادی الاول ۱۲۵۴ھ م ۳۰ر جولائی ۱۸۳۸ء کو پیدا ہوئیں۔ اپنی والدہ نواب سکندر بیگم صاحبہ ہی کے دامنِ فیض میں تربیت پائی۔ ۱۲۶۳ھ ۱۸۴۴ء میں اپنے والد نواب جہانگیر محمد خاں بہادر کے انتقال پر گدی نشین ہوئیں مگر کاروبار ریاست اُن کی والدہ ماجدہ سکندر بیگم صاحبہ ہی کے تفویض میں رہے۔ ۱۲۷۱ھ میں نواب بخشی باقی محمد خاں نصرت جنگ سپہ سالار ریاست بھوپال سے شادی ہوئی۔ ۱۲۷۴ھ ۱۸۵۸ء میں آپ کے بطن سے نواب سلطان جہاں بیگم اور ۱۲۷۸ھ میں نواب سلیمان جہاں بیگم تولد ہوئیں ۱۲۸۲ھ میں سلیمان جہاں بیگم نے انتقال کیا اور ۱۲۸۴ھ میں نواب باقی محمد خاں نے انتقال کیا۔

۱۳ر رجب ۱۲۸۵ھ کو نواب سکندر بیگم صاحبہ نے انتقال کیا۔ تو غرۂ شعبان ۱۲۸۵ھ م ۱۶ر نومبر ۱۸۶۸ء کو آپ دوبارہ باضابطہ مسند آرائے

ریاست بھوپال ہوئیں۔ دو سال بیوگی میں گزارنے کے بعد پولٹیکل ایجنٹ اور گورنر جنرل وغیرہ کے اصرار پر آپ نے مولوی سید صدیق حسن خاں سے ۱۷ صفر ۱۲۸۸ھ م ۸ مئی ۱۸۷۱ء کو عقد ثانی کیا۔ نواب صدیق حسن خاں بڑے عالم فاضل بزرگ اور سید جلال بخاری مخدوم جہانیاں جہاں گشت کے خاندان سے اور نواب سید اولاد علی خاں بہادر انور جنگ جاگیردار حیدرآباد دکن کے پوتے تھے۔ انہیں گورنمنٹ نے نواب بھوپال تسلیم کیا اور والا جاہ امیر الملک خطاب اور (۱۷) توپوں کی سلامی مقرر کی۔ رجب ۱۳۰۷ھ م ۲۰ فروری ۱۸۹۰ء میں نواب صدیق حسن خاں نے انتقال کیا اور آپ چھبیس سال بعد دوبارہ بیوہ ہوگئیں۔

آپ نے ریاست بھوپال میں بڑی اصلاحات کیں۔ ریاست کی جدید تنظیم کی۔ دواخانہ جات قائم کئے۔ مدارس قائم ہوئے۔ یتیم خانے کھلوائے۔ سرکاری مطبع قائم کرایا۔ ریاست سے اخبار نکلوایا۔ سرائیں نہریں، ریلوے لائن، سڑکیں اور بیسیوں عمارات بنوائیں۔ ڈاک خانہ کا باضابطہ انتظام کیا۔ ریاست کے ٹکٹ جاری کئے۔ ۱۸۷۷ء ۱۸۹۶ء اور ۱۹۰۱ء میں یکے بعد دیگرے تین قحط ہوئے اور آپ نے بڑی دور اندیشی سے ریاست کے بجٹ کو برقرار رکھا۔

نہایت نیک دل، مخیر، انصاف پسند، علم دوست خاتون تھیں ۴۱ سال حکومت کرکے ۲۸ صفر ۱۳۱۹ھ م ۱۶ جون ۱۹۰۱ء کو انتقال کیا۔

شجرۃ الدرر

یہ خاتون یورپین نسل سے تھی جو سلاطین بنی ایوب کے پاس بحیثیت حرم پہنچی اور اس گھرانے کے آخری بادشاہ معظم کی ماں بنی۔ جب معظم قتل ہوگیا۔ تو یہ فرار ہوکر امرائے ممالیک سے جا ملی۔ جن کا ان دنوں بہت زور تھا۔ ممالیک نے اس کے ہاتھ پر بیعت کی اور "عصمت الدین ام خلیل" لقب دیا اور ۶۵۶ھ میں اُس نے تخت مصر پر جلوہ فرمایا۔ یہ نہایت پابند مذہب اور روشن خیال ملکہ تھی۔ محمل مصری جو ہر سال بیت اللہ کو بھیجا جاتا ہے اُسی کی اولیات سے ہے۔ سب سے پہلے محمل لے کر اسی خاتون نے حج کیا اور اس کے بعد سے ہر سال ایک خالی محمل میں بیش قیمت غلاف اور نذر رکھ کر بھیجتی رہی جس کا رواج اب تک ہے۔

شمرو بیگم

اس خاتون کے خاندان کا پتہ نہیں چلتا۔ کسی معمولی کشمیری قبیلہ میں پیدا ہوئی تھی۔ قدرت نے صورت، سیرت اور ذہانت تینوں بہترین عطا کی تھیں۔ ابتداً ایک رقاصہ کی حیثیت سے اس نے زندگی شروع کی اور اس پیشہ میں کمال پیدا کرکے بہت مالدار ہوگئی۔ انہیں دنوں جبکہ وہ ایک پیشہ ور مغنیہ اور رقاصہ تھی ایک فرنگو جرمن سے آنکھ لڑ گئی جو والٹیرین ہارٹ کے نام سے موسوم مگر شمرو مشہور تھا۔ اس زمانہ میں انگریز بنگال میں چھینا چھپٹی کر رہے تھے۔ شمرو ابتداً میر قاسم کے سپہ سالار گرگی خاں کی جمعیت میں ملازم تھا۔ اسی زمانہ (۱۷۶۳ء) میں بڑی بڑی لڑائیاں لڑیں۔ اور گرگی خاں کام آیا۔ تو نواب قاسم کے پاس شمرو نے مختار مطلق کی حیثیت حاصل کرلی مگر جب میر قاسم کو بھی رو بہ زوال دیکھا تو شاہ دہلی کا نوکر ہوگیا۔ اسی زمانہ میں جبکہ وہ شاہ دہلی کا نوکر تھا اُس نے بیگم شمرو سے عقد کیا۔

بادشاہ دہلی نے نگہداشت جمعیت کے لئے سردھنہ بطور جاگیر عنایت کیا۔ جسے اُس نے اپنے اثر اور اندوختہ روپے کے زور سے صوبہ بنا لیا۔ ۱۷۷۸ء میں شمرو مرنے لگا تو اُس نے ایک وصیت نامہ کی رُو سے جائیداد جاگیر وغیرہ بیگم شمرو کے نام لکھ دی اور اپنے بیٹے کو جو پہلی بیوی سے تھا محروم کر دیا۔ چونکہ سلطنت نے بھی بیگم شمرو کو جائز جانشین تسلیم کر لیا تھا اس لئے بیگم شمرو اپنے خاوند کے مقبوضات پر شاہانہ حکومت کرنے لگی۔ اُس کے پاس فوج کی بہت بڑی تعداد تھی۔ جو قواعد دان اور بہادر تھی۔

۱۸۰۳ء تک بیگم شمرو بادشاہ دہلی کی طرفدار رہی مگر جب اُس نے شاہ دہلی کی حالت مخدوش دیکھی تو انگریزوں کی اطاعت قبول کرلی۔

بیگم شمرو مسلمان گھرانے کی لڑکی تھی۔ اور شمرو کی زندگی بھر مسلمان اور پابند صوم و صلوٰۃ رہی مگر شمرو کے مرنے کے بعد سے اُس کے عقاید بدلنے لگے اور غالباً انگریزوں کے اثر سے اُس نے ۱۷۸۱ء میں رومن کیتھولک کلیسا میں اصطباغ لیا۔ اور اس کا عیسائی نام جنا رکھا گیا۔ مگر وہ بیگم شمرو ہی کہلاتی رہی۔

ابتدائی زمانہ بیگم شمرو کا آبرو باختگی میں بسر ہوا۔ مگر نکاح کے بعد سے شوہر کے مرنے تک وہ عصمت مآب بنی رہی۔ شوہر کے مرنے کے بعد اُس نے کھل کھیلنا شروع کیا اور اپنی ہی فوج کے سرداروں سے یورپین

تھے۔ ہوس پوری کرنے لگی۔ ایک خاص شخص لیو لیسو اس کا چہیتا تھا۔ جو یورپین کرنیل اور نہایت خوشرو جوان تھا۔ چونکہ لیو لیسو سے قبل بہت سے آفیسر اُس کے منظورِ نظر رہ چکے تھے اور اس شخص پر بیگم کے ریجھنے کی وجہ سے بیسیوں کا کام رک گیا تھا اس لئے سب چاہنے والوں نے مل کر شورش شروع کی اور بیگم شمرو نے اس آگ کو دبانے کے لئے اپنے ناجائز تعلقات کو عقد کی زنجیر میں کس لیا۔ مگر اس سے بجائے فائدہ کے نقصان ہوا کیونکہ ظفریاب خاں (الیاس ایلوئی سیس رین ہارٹ) جو اس کا سوتیلا بیٹا تھا آمادۂ فساد ہوگیا اور شورش پسندوں کو ملا کر بلوہ کرا دیا۔ بیگم شمرو لیولیسو کو ساتھ لے کر بھاگ کھڑی ہوئی اور بلوائیوں نے تعاقب کرکے گرفتار کر لیا۔ بیگم اور لیولیسو نے خودکشی کرنی چاہی۔ لیولیسو تو کامیاب ہوگیا مگر بیگم اقدام خودکشی میں کامیاب نہ ہوسکی اور زخمی ہوکر رہ گئی۔ بلوائیوں نے گرفتار کر لیا اور اُس کی تمام جائیداد ضبط کرکے قید کر دیا۔

کچھ دنوں بیگم کو قید میں رہنا پڑا۔ اس کے بعد اسی کے ایک پرانے جنرل جارج ٹامس نے اسے قید سے چھڑا لیا اور وہ پھر ایک مرتبہ فارغ البال ہو گئی اور ساتھ ہی ساتھ اُس کے سوتیلے بیٹے ظفریاب خاں نے بھی انتقال کیا۔

جارج ٹامس بیگم کا ہوا خواہ اور کارپرداز تھا۔ خود بیگم نہایت سمجھدار اور منتظم تھی اس نے سردہنہ کے اطراف میں پچاس میل کا علاقہ اپنے مقبوضات میں شامل کر لیا تھا اور اپنے صوبے کو وسیع بنا کر نہایت ہوشیاری، سلیقے اور دانشمندی سے حکومت کرتی رہی اس کے علاقہ میں نہایت امن وامان تھا۔ اُس نے زراعت کو بہت ترقی دی۔ بہت سی اصلاحیں کیں۔ بیگم بڑی مدبرہ جفاکش اور سخت مزاج تھی۔

اگرچہ وہ عیسائی ہوچکی تھی مگر لباس وہی ہندوستانی مسلمان عورتوں کا پہنتی اور فارسی اُردو ہی بولتی تھی۔ دربار میں برقعہ پہن کر نقاب پوش شریک ہوتی تھی۔ وہ کھانا میز پر کھاتی تھی مگر اُس کی خدمت کرنے والے خدمتگار مرد نہ تھے بلکہ عورتیں تھیں۔ دسمبر ۱۸۲۴ء میں اس کے متعلق بری خبریں مشہور ہوگئیں۔ اور بشپ ہیبر اس کی تحقیقات کے لئے آیا اور اُس نے جو کچھ دیکھا ایک رسالہ میں شائع کیا جس کا کچھ حصہ نقل کیا جاتا ہے۔

"اس کی سکونت جاگیر کے عین وسط میں بمقام سردہنہ ہے (جو میرٹھ سے بارہ میل کے فاصلہ پر ہے) وہ ایک عجیب وغریب بڑھیا ہے اُس کی آنکھیں چمکدار نہیں ہیں۔ مگر ان سے شرارت ٹپکتی ہے۔ حسن کے آثار اُس کے خدوخال میں موجود ہیں وہ نہایت ہوشیار، حاضر جواب عورت ہے مگر صرف ہندوستانی بولتی ہے۔

اس کی عقلمندی اور بہادری کی وجہ سے جو اُس نے مرہٹوں کی لڑائی میں دکھائی تھی رجن میں اس نے خود گھوڑے پر سوار ہوکر اپنی فوج کی کمان کی تھی، اس کے تمام سپاہی اور اُس کی رعایا اور قرب وجوار کے لوگ اس کا ادب اور احترام کرتے ہیں۔ مگر وہ نہایت بے رحم اور سخت ہے۔ چونکہ اُس کو اپنی مملکت میں لوگوں کی موت اور زندگی پر اختیار حاصل ہے اس لئے اُس کے مظالم کی بہت سی روائتیں سننے میں آتی ہیں"۔

ایڈوکیٹ آف انڈیا میں ایک صاحب نے اُس کے حالات شائع کرتے ہوئے لکھا ہے۔ کہ

"بیگم شمرو میدان جنگ میں ایک بہادر سردار تھی اور انتظام مملکت میں بڑی مدبر اور قابل حکمران۔ اُس کا زمانہ نہایت ترقی کا رہا ہے۔ اور امن وامان کے لئے ضرب المثل ہوگیا۔ اگرچہ سردہنہ کی یہ حالت ہے کہ وہ ایک معمولی گاؤں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ مگر اس وقت اس کے تحت ایک صوبے کا صوبہ تھا جس سے بہتر کسی اور صوبے کا انتظام نہ تھا۔"

حکومت نے بیگم کی خدمات کے مدنظر اُس کو زیب النسا کا خطاب دیا تھا۔ اُس نے روپے کا استعمال ہمیشہ بڑی عمدگی سے کیا۔ بڑھاپے میں وہ بالکل سیدھی سادی، نیک دل، حلیم الطبع، مہربان، مہمان نواز ہوگئی تھی۔ گرجاؤں، محتاج خانوں وغیرہ کی بہت امداد کرتی تھی۔ کئی ایک محتاج خانے خود اس نے قائم کئے تھے۔ ہندو مسلمانوں کے اداروں کی بھی بہت قدر کرتی تھی۔ مسجدوں، مندروں اور خانقاہوں کی امدادیں جاری تھیں۔ عیدین کے دربار کیا کرتی تھی۔ اُس کی فوج میں ہندو مسلمان افسر تھے جن سے یکساں بے تعصبی کا برتاؤ کرتی تھی۔ ۱۸۳۶ء میں اس بیگم نے انتقال کیا اور اب تک لوگ اُس کا نام عزت واحترام سے لیتے ہیں۔"

عائشہ خاتون

عائشہ خاتون اتابک زنگی کی محل خاص اور اتابک خاندان کی آخری ملکہ گذری ہے۔ تخمیناً ۶۵۹ھ میں سریر آرائے تخت شیراز ہوئی۔ عائشہ خاتون بہت نیک اور پاکدامن تھی۔ یہ علماء اور شعراء کی بڑی سرپرست تھی۔ اور

اُن کو اپنے دربار میں بلا کر ان کے مباحثوں کو بغور سنتی تھی۔

اتابک زنگی نے شیراز کو حتی الامکان تہذیب و تمدن اور صنعت و حرفت کی معراج تک پہنچانے کا بیڑا اُٹھایا تھا۔ مگر قضا نے اس کے تمام ارادوں پر پانی پھیر دیا۔ لیکن عائشہ خاتون نے کوشش کر کے اپنے شوہر کے ارادوں کی تکمیل کی اور بڑی حد تک اس میں کامیاب رہی۔ اس کا شوہر وہی اتابک زنگی ہے جو شیخ سعدیؒ کا ممدوح تھا۔

عصمت بیگم

نواب حیات محمد خاں کی بیگم تھیں۔ قدرت نے دل و دماغ، تدبر و سیاست کے ساتھ حسن و جمال بھی عطا کیا تھا۔ نواب حیات محمد خاں کی زندگی میں سارا کاروبار عصمت بیگم کرتی تھیں۔ اُن کے زمانے میں بھوپال کا دیوان ایک نومسلم چھوٹے خاں کا بیٹا امیر خاں تھا اُنھوں نے اسے علیحدہ کر کے اپنے خاندان کے ایک شخص سلطان محمد خاں کے پوتے مرید محمد خاں کو دیوانی دی۔ خود پس پردہ بیٹھ کر دادخواہوں کے معروضات سنتی اور احکام صادر کرتی تھیں۔ اُن کی نگرانی میں بھوپال کی رعایا نہایت امن و اطمینان سے زندگی بسر کرتی تھی۔

سنہ ۱۲۱۱ھ میں مرید محمد خاں نے دغا سے اس بیدار مغز بیگم کو شہید کردیا۔ بھوپال میں ماجی صاحبہ کے بعد انہیں بیگم کا نام لیا جاتا ہے۔

فاطمہ

ملک شام کی فرمانروا تھی۔ چونکہ کتب سماوی اور فنِ کہانت میں بہت دخل تھا۔ اس لئے اس نے یہ پتہ چلا لیا تھا کہ ایک نبی مکہ میں پیدا ہوگا۔ جو آخری اور برگزیدہ نبی ہوگا۔ اس خیال نے اُس کے دل میں یہ خواہش پیدا کی کہ نبیؐ آخرالزمان اُس کے بطن سے ظہور میں آئیں تو خوش قسمتی ہوگی۔ چنانچہ اس دُرِّ نبوت کو اپنے صدفِ بطن میں لینے کے لئے فاطمہ نے مکہ کا سفر کیا۔ مگر پروردگار عالم نے یہ سعادت حضرت آمنہؓ کے لئے مخصوص کر دی تھی۔ بالآخر فاطمہ کو بے نیل و مرام واپس ہونا پڑا۔

قطرالندیٰ

خلیفہ المعتضد باللہ کی حرم تھیں۔ معتضد کی وفات کے وقت چونکہ مقتدر باللہ کمسن تھا اس لئے قطرالندیٰ نے کاروبار سلطنت اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ یہ خاتون خود دربار کرتی تھی۔ سفیروں سے گفتگو کرتی اور محکمۃ المظالم میں بیٹھ کر خود فیصلہ کرتی تھی۔ باہر نکلتی تو امراء اور شرفاء کی بیویاں اسے گھیرے ہوئے ہوتیں اپنے محل میں علمی ادبی مجالس کرتی جن میں بڑے بڑے علماء جمع ہوتے تھے۔

علامہ جلال الدین سیوطی کا بیان ہے کہ "محکمۃ المظالم میں دربار کرتی ہر جمعہ کو لوگوں کی عرضیاں لیتی۔ اکثر دربار عام کرتی۔ قاضیوں اور رئیسوں کو حکما طلب کرتی۔ فرامینِ شاہی اپنے دستخط سے جاری کرتی تھی"۔

سنہ ۳۰۶ھ میں اس نے ایک شفاخانہ بھی بغداد میں قائم کیا تھا۔ جس میں مریض رہتے تھے اور اس کے مصارف سالانہ سات ہزار دینار ہوتے تھے۔ یہ خاتون احمد بن طولون کی بیٹی اور خمارویہ کے بطن سے تھی سنہ ۲۸۲ھ میں المعتضد باللہ سے عقد ہوا تھا اور یہ اپنے ساتھ دس صندوق جواہرات سے بھرے ہوئے جہیز میں لائی تھی۔ اس کا سنہ جلوس سنہ ۲۸۹ھ ہے۔

کاہنہ

یہ حبشی نژاد ملکہ عجیب و غریب دل گردہ کی خاتون تھی۔ موسیو لیبان نے اسے بہت سراہا ہے۔ ابتداً شمالی افریقہ میں اس کی ایک چھوٹی سی ریاست تھی۔ مگر اس نے اپنی تلوار کے زور سے کل شمالی افریقہ پر قبضہ کر لیا تھا، عربوں نے اس حصہ کو اس کے ہاتھ سے چھیننے کی بہت کوشش کی مگر اُس نے طرابلس سے طنجہ تک سارا ملک برباد کر دیا تاکہ عرب قابض نہ ہوسکیں عربوں کی طرح یونانیوں کو بھی اس نے بہت تنگ کیا اور ان دونوں قوموں پر

اپنی عظمت وجبروت کا سکہ بٹھا کر چھوڑا۔ افسوس ہے کہ ایک لڑائی میں کام آگئی۔ ورنہ معلوم نہیں اپنی فتوحات کو کس قدر وسعت دیتی۔

کلیوپٹرا

۶۹ سنہ ق،م، میں ملکہ کلیوپٹرا اپنے بھائی کے ساتھ تخت مصر پر جلوہ آرا ہوئی مگر ظالم بھائی نے تھوڑے ہی دنوں کے بعد اسے مصر سے نکال دیا۔ کلیوپٹرا یوسف بے کارواں بنی ہوئی جولیس سیزر کے پاس پہنچی۔ جولیس سیزر نے اس یوسف صفت ملکہ کو زلیخا بنا کر پھر تخت مصر پر بٹھا دیا۔

مصر پر حکومت تو اس نے خوب کی مگر خواہشات نفس نے اخلاق پہلو کمزور کر دیا۔ انطونی سے اس کی محبت کی داستان مشہور ہے۔ بالآخر انطونی کے ساتھ اس نے بھی خودکشی کی۔ اس زاہد فریب ملکہ نے مصر میں خوب دادعشرت دی ہے۔ نہایت ذہین، ذکی اور تیز تھی۔ اطراف کی شہنشاہیوں کے جو سفیر آتے یہ ان سے انہیں کی زبان میں گفتگو کرتی تھی۔ مصر میں اُس کے بنائے ہوئے مینار اب بھی باقی ہیں۔

گوہر بیگم

نواب غوث محمد خاں کی صاحبزادی تھیں۔ سنہ ۱۲۱۶ھ ۱۷۹۹ء میں پیدا ہوئیں۔ ۱۵ سال کی عمر میں نواب نظر محمد خاں سے عقد ہوا۔ میجر ہیوگ نے اپنی کتاب تاریخ بھوپال (مرتبہ ۱۸۸۱ء) میں لکھا ہے کہ "اُن کی تعلیم باقاعدہ ہوئی تھی اور دماغ نہایت اعلیٰ پایا تھا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں ریاست کا کام سنبھالنے اور تمام امور کو خود انجام دینے کے قابل ہوگئیں۔" شادی کے دوسرے ہی سال آپ کے ہاں ایک صاحبزادی تولد ہوئی۔ جس کا نام نواب سکندر بیگم رکھا گیا۔ سکندر بیگم کی ولادت کے دوسرے ہی سال گوہر بیگم بیوہ ہوگئیں اور کاروبار ریاست اُنہیں کو سنبھالنا پڑا۔ ابتدا نواب سکندر بیگم کی نسبت منیر محمد خاں سے ہوئی مگر شادی سے پہلے ہی منیر محمد خاں اور اُن کے والد نے اختیارات حاصل کرنے کی خاطر جنگ شروع کر دی اور گوہر بیگم نے نسبت فسخ کر کے منیر محمد خاں کو نکال باہر کیا۔ اس کے بعد منیر محمد خاں کے چھوٹے بھائی جہانگیر محمد خاں سے نسبت ہوئی۔ اور سنہ ۱۲۵۰ھ میں پولیٹکل ایجنٹ نے زبردستی شادی کرا دی۔ ۱۸۳۷ء تک گوہر بیگم ہی انتظام ریاست کرتی رہیں۔ اس کے بعد بڑی ردوکد اور جنگ وجدل کے بعد پولیٹکل ایجنٹ نے اختیارات جہانگیر محمد خاں کے سپرد کر دیئے۔

نواب گوہر بیگم صاحبہ نہایت جی دار، مدبر، رعایا پرور اور سیاسی دماغ رکھنے والی خاتون تھیں۔

لچھمی بائی

رانی لچھمی بائی جھانسی کے راجہ گنگادھر کی مہارانی تھی۔ راجہ گنگادھر نے انتقال کیا تو اس نے گورنمنٹ سے خواہش کی کہ راجہ کے متبنّی لڑکے کو تخت نشین کیا جائے۔ مگر لارڈ ڈلہوزی نے درخواست نامنظور کی۔ اور جھانسی کو گورنمنٹ نے اپنی سیادت میں لے کر لچھمی بائی کے نام پنشن جاری کر دی اور ریاست جھانسی جن قرضوں میں مبتلا تھی وہ قرضے رانی کی پنشن میں سے ادا کئے جانے لگے۔ حالانکہ قرضے ریاست کے تھے اور رانی کی پنشن ذاتی تھی۔ اس پر برافروختہ ہوکر رانی نے ۱۸۵۷ء میں جھانسی کی سرکاری فوج کو ہموار کر کے بغاوت کر دی۔ اور قلعہ کا محاصرہ کر کے اس میں جس قدر یورپین وغیرہ تھے۔ سب کو قتل کرا دیا۔ اور اپنی مطلق العنانی کا اعلان کر کے حکومت شروع کی۔ پرانی گڑی ہوئی توپیں نکلوا کر انہیں درست کرایا۔ اور بیس ہزار فوج سے ۱۸۵۸ء میں سرموروز کے مقابل ہوئی۔ سرموروز نے قلعہ فتح کر لیا۔ تو دو ہزار فوج لے کر رانی فرار ہوگئی۔ اور کالپی کے راستے میں ڈیرے ڈال کر ٹھیر گئی۔ پھر گوالیار ہوتے ہوئے آگے بڑھی۔ مگر راستہ میں بمقام مراد انگریزوں کی فوج نے گھیر لیا۔ اور اس جی دار رانی نے تلوار سونت کر مقابلہ کرتے ہوئے ۱۷ جون ۱۸۵۹ء کو اپنی جان آزادی کی دیوی کی نذر کی۔

ماجی

آپ کا اصلی نام ممولا تھا اور قدسیہ خطاب دربار مغلیہ سے سرفراز ہوا تھا۔ ریاست بھوپال کی رعایا آپ کی شفقت مادرانہ کی وجہ سے آپ کو ماجی کہتی تھی۔ آپ کسی شریف ہندو گھرانے سے تھیں اور نواب یار محمد خاں نے آپ سے نکاح کیا تھا۔ آپ کے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ مگر آپ نے اپنے سوتیلے بیٹے فیض محمد خاں کو گود میں لے کر پرورش کیا۔ چونکہ یار محمد خاں کے انتقال کے وقت فیض محمد خاں کمسن تھے۔ اس لئے یار محمد خاں نے انہیں تخت نشین کر کے ماجی ہی کو سارے کاروبار کا اختیار دیا تھا۔ ماجی نے نہایت دوراندیشی سے ریاست سنبھالی اور بھوپال کو یار محمد خاں کے

بھائی سلطان محمد خاں اور مرہٹوں کے شر سے بڑی عمدگی سے بچایا۔
پیشوا اور شاہ دہلی سے بھی آپ نے مصالحت کر لی تھی ۱۷۹۲ء میں فیض محمد خاں نے انتقال کیا تو ماجی نے حیات محمد خاں کو تخت نشین کیا اور خود بھی مشورہ دیتی رہیں۔ آپ نے ریاست بھوپال میں کئی ایک مسجدیں اور تالاب بنوائے۔ نہایت نیک دل، سخی اور دور اندیش خاتون تھیں۔ سرجان ملکم نے اپنی کتاب ممائرس آف سنٹرل انڈیا میں لکھا ہے کہ

"اس عالی دماغ رئیسہ کی تاریخ حیرت انگیز ہے اس نے اسی سال کی عمر میں وفات پائی اور نصف صدی سے زیادہ عرصہ تک بھوپال کی کونسل پر اپنا اثر قائم رکھا حالانکہ اسے پورا اختیار نہ تھا . . . . وہ جیسی رحمدل تھی ویسی ہی منصف مزاج بھی تھی اور لوگوں میں محبوب بھی. بھوپال کے تمام ہندو مسلمان ابھی تک اُسے یاد کرتے ہیں۔ اُس کا زمانہ ایک ایسا نمونہ تھا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ظلم و ابتری کے زمانے میں بھی نیکی اور ریاست بازی کو احساس اور جوش کے ساتھ معہ اُن اعلیٰ اوصاف کے وہ قائم رکھ سکی جو انسانی فطرت کے بہترین جوہر ہیں۔"

ماجی نے اسی سال کی عمر پا کر انتقال کیا۔

ماہِ تاباں

ابن بطوطہ ہندوستان سے ہوتا ہوا جزیرہ ہیتیان کے سامنے صوبہ "کوانسی" (ابن بطوطہ نے اُس کو طوالسی لکھا ہے) میں جا پہنچا۔ یہ صوبہ ٹانکن اور کانٹن کے درمیان واقع ہے۔ کوانسی میں خاوید خاں خانِ ترکستان کی بیٹی اُسے یارُوق (ماہ تاباں) حکومت کرتی تھی۔ اُس نے عہد کیا تھا کہ جو شہزادہ مجھے لڑائی میں مغلوب کرے گا اُس سے شادی کروں گی۔ ہزاروں شہزادے اس سے مقابلہ کرنے آئے مگر کوئی بھی مغلوب نہ کر سکا۔ جو شہزادہ اُس کو مغلوب نہ کر سکتا یا اس سے مغلوب ہو جاتا تھا اُس کو شہزادی گرفتار کر لیتی تھی اور سو گھوڑے عمدہ نسل کے لے کر چھوڑ دیتی تھی۔ اس طرح شاہزادی نے دس ہزار گھوڑے جمع کئے تھے۔ جب تک وہ زندہ رہی اسے کوئی مغلوب نہ کر سکا اور نہ اس نے شادی ہی کی۔ معلوم ہوتا ہے کہ ۱۳۳۱ء میں شہزادی ماہ تاباں کا عالم شباب تھا۔ ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامے میں لکھا ہے۔

"ملکہ نے اپنے سیّاح اور ناخدا کو بھیج کر مجھے بلوایا۔ وہ دربار میں بیٹھی ہوئی تھی اس کے سامنے عورتیں کھڑی تھیں جن کے ہاتھوں میں عرضیاں تھیں اور اکثر عورتیں ملکہ کے پاس بیٹھی ہوئی تھیں۔ اس کے تخت پر ریشم کا فرش تھا اور ریشم کے پردے بھی لٹک رہے تھے۔ تخت صندل کی لکڑی کا بنا ہوا تھا اور لکڑی پر سونے کے پترے لگے ہوتے تھے اور تخت کے اطراف میں سونے کے ظروف رکھے ہوئے تھے۔ جن میں شربت تھا۔ جب میں نے ملکہ کو سلام کیا تو اُس نے ترکی زبان میں مزاج پوچھ کر اپنے قریب بٹھا لیا۔ ملکہ عربی لکھنا اچھی طرح جانتی تھی دوات قلم منگوا کر ایک کاغذ پر بسم اللہ الرحمن الرحیم لکھ کر کہا یہ کیا ہے؟ میں نے کہا یہ خدا کا نام ہے پھر پوچھنے لگی کس ملک سے آ رہے ہو میں نے کہا ہندوستان سے۔ کہنے لگی کالی مرچوں کا ملک؟ میں نے کہا ہاں، پھر اس نے ہندوستان کا حال پوچھا اور کہنے لگی میں اُسے ضرور فتح کروں گی۔ پھر مجھے کپڑے۔ دو ہاتھی۔ چاول۔ دو جاموش اور دس بکریاں، چار رطل گلاب اور چار مرتبان ادرک، مرچ، لیمو، آم، کے آچار دیئے۔ ناخدا نے کہا ملکہ کے لشکر میں عورتیں ہیں جو مردوں کو ساتھ لے کر لڑتی ہیں۔ اور مردوں کا دندان شکن مقابلہ کرتی ہیں۔ ناخدا یہ بھی کہتا تھا کہ ملکہ تخت سلطنت پر بیٹھنے سے قبل ایک دفعہ کسی لشکر سے مقابلہ کے لئے گئی۔ دشمن نے ملکہ کے لشکر پر اس زور سے حملہ کیا۔ کہ ملکہ کا لشکر پیچھے ہٹنے لگا۔ ملکہ خود صفیں چیرتی ہوئی آگے بڑھی۔ اور مقابل کے بادشاہ پر اس زور سے نیزے کا وار کیا کہ وہ سنبھل نہ سکا۔ اس کا سر کاٹ کر اپنے نیزے کی انی پر رکھ کر لشکر میں واپس آ گئی۔ اسی بہادری کے صلے میں ملکہ کے باپ نے اس کو حاکم شہر کر دیا۔ اکثر شہزادے اس سے نکاح کرنا چاہتے ہیں مگر وہ اس سے نکاح کرنا چاہتی ہے جو اسے زیر کرے۔ لیکن کوئی شہزادہ اس کے مقابلہ کے لئے آگے نہیں آتا۔"

مہارانی سورنمی

مہارانی سورنمی راجہ کرشناناتھ کی رانی تھی اکتوبر ۱۸۴۴ء میں جب راجہ نے خودکشی کی تو گورنمنٹ نے راجہ کی وصیت کی بناء پر اُس کی راجدھانی پر قبضہ کر لیا۔ مگر رانی نے عدالت میں نالش کی اور عدالت العالیہ کی تحقیق سے یہ ثابت ہوگیا کہ راجہ وصیت کرتے وقت اپنے ہوش وحواس میں نہ تھا تمام جائداد رانی کے حوالے کر دی گئی۔ رانی جب پورے طور پر ریاست کی مالک ہوگئی تو اس نے سب سے پہلے یہ کام کیا کہ ریاست کا وہ قرضہ جو راجہ کے زمانہ میں ہوگیا تھا ادا کیا اور آہستہ آہستہ اپنی آمدنی کو بڑھا کر بڑی بڑی ریاستوں کے برابر کر لیا۔ یہ رانی بہت نیک دل اور فیاض تھی۔ اس کی فیاضی اور نیک دلی کی وجہ سے ۱۸۶۷ء میں سرکار انگلشیہ نے اسے مہارانی کے خطاب سے سرفراز کیا۔ ۱۸۷۷ء کے قحط میں اُس نے بہت عمدہ طریقہ سے قحط زدوں کی خدمات کیں۔ جس کی وجہ سے ۱۸۷۵ء میں اسے متبنّے لینے کی اجازت دی گئی اور ۱۸۸۵ء میں کراؤن آف انڈیا کے اعزاز سے سربلند ہوئی اور اس موقع پر کمشنر صاحب نے قاسم بازار میں سر دربار مہارانی سورنمی کی فیاضیوں کا اعتراف کرتے ہوئے فرمایا۔ کہ مہارانی نے ۱۸۶۷ء سے ۱۸۸۵ء تک رفاہ عام کے مختلف کاموں میں پانچ لاکھ روپیہ کا چندہ دیا ہے۔

ملکہ جہان

سلطان ہمایوں شاہ بہمنی کی بیگم سلطان نظام شاہ اور سلطان محمد شاہ ثانی کی ماں تھی۔ ۱۴۶۱ء میں ہمایوں کا انتقال ہوا تو اُس کا بیٹا سلطان نظام شاہ جس کی عمر آٹھ سال تھی۔ سریر آرائے تخت ہوا لیکن سلطنت کا کاروبار ملکہ جہاں اپنے دو معتبر وزیروں خواجہ محمود گاوان اور خواجہ جہان کے مشورے سے کرتی رہی۔ سلطان نظام شاہ کے تخت نشین ہوتے ہی اطراف واکناف کے راجاؤں نے دکن پر حملہ کیا مگر ملکہ جہاں کی حُسنِ سعی سے ہر ایک کو شکست ہوئی۔ جب ملکہ جہان کو ان لڑائیوں سے فراغت حاصل ہوئی تو ملکہ نے بڑے تزک واحتشام سے نظام شاہ کی شادی خاندان شاہی کی ایک لڑکی سے کی۔ مگر افسوس ہے کہ شب عروسی کو آدھی رات گئے محلسرا سے رونے اور واویلا کرنے کی آوازیں بلند ہوئیں اور دولہا بستر عروسی پر مردہ پایا گیا اور یہ معلوم نہ ہوسکا کہ نظام شاہ کی موت کس طرح واقع ہوئی۔

نظام شاہ کی ناگہانی موت کے بعد ملکہ جہاں نے نظام شاہ کے دوسرے بھائی سلطان محمد شاہ کو ۱۴۶۳ء میں تخت نشین کیا اور خود بدستور سابق ریاست کا کام کرتی رہی۔ اور چودہ برس کے سن میں محمد شاہ کی شادی ایک بہمنی خاندان کی لڑکی سے کرکے خود کاروبارِ سلطنت سے دست بردار ہوگئی۔

ملکہ جہان کا نام نرگس بی اور خطاب ملکہ جہاں تھا یہ ملکہ نہایت مدبر اور دور اندیش تھی۔ سلطنت کے کاروبار پردہ میں بیٹھ کر انجام دیتی تھی۔ اس کے زمانۂ حکومت میں رعایا اس قدر خوش تھی کہ سب لوگ اسے مخدومۂ جہاں پکارتے تھے۔

موتی بیگم

نواب یار محمد خاں کی صاحبزادی اور مجید محمد خاں کی بیوی تھیں۔ قدرت نے آغوشِ شوہر سے بہت جلد جدا کر دیا تھا۔ اس لئے بیوگی میں اپنی زندگی گزارتی تھیں ۱۲۱۱ھ میں عصمت بیگم کے شہید ہونے کے بعد مرید محمد خاں نے قلعہ اسلام نگر پر حملہ کیا۔ تو موتی بیگم نے قادر خاں قلعدار کو مقابلہ کا حکم دیا اور خود کھڑے ہوکر توپیں لگوادیں۔

سر جان ملکم نے لکھا ہے۔ کہ

"مرید محمد خاں نے اپنے معاونین کو اسلام نگر کا قلعہ دے دیا۔
لیکن جو کچھ وزیر نے خوف سے دیا تھا اسے ایک افغان بیوہ
موتی بیگم نے بچا لیا۔ مرہٹوں نے جس وقت دروازہ بند کرکے فیر
کرنا شروع کر دیا۔ تو اُس نے کہا میں نہیں جانتی کہ کس کے حکم
سے مرید محمد خاں نے بھوپال کا قلعہ دے دیا۔ میں ہرگز اپنی قیام کی جگہ
میں کسی اجنبی کو قدم رکھنے کی اجازت نہ دونگی۔ معلوم ہوتا ہے کہ
اس عالی دماغ عورت کے خیال پر تمام بھوپال کی فوج جھک پڑی
کیونکہ تمام مرہٹہ فوج مجبور ہوکر واپس ہوگئی۔"

افسوس ہے کہ اس دلیر خاتون کے اور حالات نہ مل سکے۔

نندو کنور بائی

آپ کو سی۔ آئی کا اعزاز حاصل تھا گونڈل کی مہارانی تھیں ایک طویل علالت کے بعد صحت یاب ہوئیں تو ڈاکٹروں نے سیاحت کا مشورہ دیا آپ

نے ۱۹۱۰ء کے اوائل میں قریب قریب سارے یورپ کا سفر کیا اور ایک نہایت دلچسپ سفرنامہ شائع کیا جو گجراتی زبان میں ہے۔ نہایت فاضل اور علم دوست خاتون تھیں۔

نورجہاں

یہ ستارہ اپنے والدین کے گھر اُس وقت طلوع ہوا۔ جب وہ صعوبتِ سفر کے ساتھ زحمتِ فاقہ کشی میں بھی مبتلا تھے۔ اس نومولود کو اُنھوں نے جنگل میں چھوڑ دیا۔ اور تقدیر نے بجائے کسی بھیڑیے کی غذا بنانے کے ایک قافلہ کے متمول سوداگر کی گود میں لا ڈالا اور پھر لطف یہ کہ اُس کی انّا وہی مقرر کی گئی جس نے اسے جنا تھا۔ مہرالنسا نام رکھا گیا اور سوداگر کی بیوی نے بیٹی کی طرح پرورش اور تربیت کی۔ اپنی آغوشی ماں کے ساتھ مہرالنسا محلات میں بھی جانے لگی۔ اور جہانگیر سے محبت ہو گئی۔ جب جہانگیر نے اکبر سے خواہش کی کہ مہرالنسا سے نکاح کر دیا جائے تو اکبر نے مہرالنسا کا نکاح شیر افگن سے کر دیا۔ اور شیر افگن خاں کو کانجری جاگیر دے کر دہلی سے چلتا کیا۔

جہانگیر کو اس کا بڑا صدمہ ہوا۔ اور اس نے ولیعہدی کے سارے زمانے میں یہ داغِ دل روشن رکھا۔ تختِ سلطنت پر متمکن ہوتے ہی اس نے شیر افگن سے خواہش کی کہ مہرالنسا کو طلاق دیدے۔ مگر شیر افگن نے منظور نہیں کیا۔ اس پر بھی جہانگیر نے صبر کیا مگر قسمت تو یہی چاہتی تھی۔ کہ شیر افگن کی مہرالنسا جہانگیری کرے۔ اسی لئے شیر افگن نے انتقال کیا اور نورجہاں بیوہ ہو کر حرمِ جہانگیری میں داخل ہوئی۔

جہانگیر نے ابتداً نورمحل اور پھر نورجہاں کا خطاب دیا اور خود جام و سبو سنبھال کر اس کے پہلو میں بیٹھ گیا۔ نورجہاں نے وہ جہانگیری کی کہ آج بھی جہانگیر کا عدل و انصاف اور انتظامِ مملکت مشہور ہے۔ یہ سارا کام نورجہاں کرتی تھی۔

نورجہاں گھوڑے پر سوار زنانہ گارڈ ساتھ لئے نکلتی۔ جھروکے سے فوج کا معائنہ کرتی اور سلامی لیتی۔ سلطنت کا بجٹ بناتی اور حکومت کا پورا کاروبار کرتی تھی۔ بڑی اچھی شہ سوار اور قادر انداز تھی۔ تیر سے شیر کا شکار کرتی تھی۔

بڑی رعایا نواز، انصاف پسند اور علم دوست تھی۔ نورجہاں نے ۱۶۴۶ء میں انتقال کیا اور لاہور میں دفن ہوئی۔

وجیا مکتمبا

رانی وجیا میہی کمتا بائی کے بعد تانجور کی رانی مقرر ہوئیں ۱۹۱۱ء میں تاجِ ہند کا اعزاز ملا۔ اس رانی نے تانجور میں سنسکرت کالج قائم کیا تھا جو اب مدراس یونیورسٹی سے ملحق ہو گیا ہے۔

ویدا رانی

راجہ کھیمہ گپت والئ سری نگر کی رانی راجہ لوہر کوٹ کی بیٹی اور راجہ ابھیمنیو کی ماں تھی۔ راجہ کھیمہ گپت کے انتقال کے وقت ابھیمنیو بہت کمسن تھا اس لئے اس کو وارث تخت و تاج ٹھیرا کر ویدا رانی حکومت کرتی رہی۔ اور ابھیمنیو کے بالغ ہونے کے بعد بھی اس کو کاروبارِ سلطنت میں دخل دینے نہ دیا۔ ابھیمنیو تیرہ سال دس ماہ برائے نام راجہ رہ کر مرگیا تو اُس کے بیٹے نندی گپت کو ۹۷۲ء میں تخت نشین کیا گیا مگر اصل حکمران رانی ہی رہی۔ کچھ عرصہ بعد نندی گپت نے کاروبارِ سلطنت میں مداخلت شروع کی۔ تو ویدا رانی کو بہت ناگوار گزرا۔ اور اپنے پوتے کو زہر دے کر ختم کر دیا۔ یہ بدنصیب راجہ صرف ایک سال ایک ماہ نوروز حکمران رہا اس کے بعد اس کا بھائی تریبھون گپت تخت نشین ہوا مگر اس کو بھی ڈائن ویدا رانی نے صرف دو سال کی حکومت کے بعد روانۂ ملکِ عدم کیا۔ اس کے بعد اس کے بیٹے بھیم گپت کو جو ابھی نابالغ تھا تخت نشین کیا گیا۔ مگر یہ بھی برائے نام راجہ رہا۔ اسی زمانہ میں سری نگر کا وزیر پھلگن مرگیا تو رانی نے اپنے ایک آشنا کلشن دیو کو وزیر بنایا اور پھلگن وزیر کے ساتھ دوسرے وزیر بنّی نامی کو زہر دے کر ہلاک کر دیا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد تونگ نامی ایک گوجر رانی کے نام خط لے کر پونچھ سے آیا اور رانی نے بجائے خط لینے کے خود نوجوان گوجر سے آنکھیں لڑائیں۔ اول اول اس سے خفیہ تعلق رکھا۔ مگر بعد کو اس سے شادی کر لی۔ جب بھیم گپت نے ہوش سنبھالا تو اُس کو اپنی دادی کی یہ حرکات اور نئے دادا کی اطاعت گراں گزرنے لگی۔ جب رانی کو اپنے پوتے کی ناراضگی کا حال معلوم ہوا تو رانی جی نے نہایت اطمینان سے اپنے پوتے کو اس کے اپنے باپ دادا کے پاس چلتا کر دیا۔ یہ پوتا صرف پانچ سال چار ماہ حکمران رہا۔

آخرکار ویدا رانی اپنے بیٹوں، پوتوں اور پرپوتوں کو حکومت اور

ہوس رانی کی خاطر زہر دے دے کر ہلاک کر کے ۹۹۸ء میں بلاشرکت غیرے تخت نشین ہوئی اور اٹھارہ سال چار ماہ آٹھ دن حکومت کر کے ۱۰۱۷ء میں اپنے وجود سے دنیا کو پاک کر گئی۔

ہُما

بہمن بن اسفندیار فرمانروائے ایران کی دختر تھی۔ بہمن کے انتقال کے بعد شہزادی ہُما سریر آرائے تخت ایران ہوئی اور ۳۰ برس تک بہت استقلال سے امن و امان کی حکومت کر کے اپنی مرضی سے تخت و تاج سے دست بردار ہو گئی۔ ملکہ ہُما کے عہد زریں کا ادبی کارنامہ ہزار افسانہ ہے۔ یہ وہی افسانہ ہے جس کی تقلید میں الف لیلے لکھی گئی۔

حوالے

بیگمات بھوپال — داستان ترکتازان ہند دولت یار جنگ
بتانِ حرم — محمد الدین فوق رسالۂ زمانہ کانپور۔ مئی و جون ۱۹۰۹ء
تاریخ اسلام۔ امیر علی — رسالۂ دلکش لاہور۔ دسمبر ۱۹۱۰ء
تاریخ فرشتہ۔ فرشتہ — سلطنت خداداد۔ محمود مارسٹن
تاریخ روما۔ ایچ الیف پیلہم — سفرنامہ۔ ابن بطوطہ
تاریخ سلطنت روما۔ جے بیوری — صحیفۂ زریں۔ پراگ نرائن
تاریخ الخلفاء۔ جلال الدین سیوطی — کارنامۂ حیدری۔
تاریخ ہند۔ ہاشمی — میموائرس آف سنٹرل انڈیا۔ جان ملکم
تاریخ ہند قدیم۔ اے سمتھ مترجمہ خلیل الرحمٰن۔ مشرقی تمدن کا آخری نمونہ۔ شرر
تاریخ دکن۔ اختر یار جنگ وفصاحت جنگ۔ مشاہیر نسواں۔ محمد عباس
تاریخ دکن۔ ابوالاعلا احمد عارف — مخدرات تیموریہ۔ ظہور الحسن۔
تاریخ اودھ۔ کمال الدین حیدر — نگارستان کشمیر۔ قاضی ظہور الحسن ناظم
تاریخ بھوپال۔ میجر ہیوگ — واقعات مملکت بیجاپور۔ بشیر الدین احمد
حیدر علی۔ محمود مارسٹن — ہندوستان کی شہزادیاں۔ عبدالرحمٰن شوق
حیات صلاح الدین۔ سراج الدین احمد — ہندوستانیاں۔ وکیل ٹریڈنگ کمپنی

تسکین عابدی

غزل

پھول سونگھے، جانے کیا یاد آگیا!!
دل عجب انداز سے لہرا گیا!
اُس سے پوچھے کوئی چاہت کے مزے
جس نے چاہا اور جو چاہا گیا
ایک لمحہ بن کے عیش جاوداں
میری ساری زندگی پر چھا گیا
غنچۂ دل ہائے کیسا غنچہ تھا
جو کھلا اور کھلتے ہی مرجھا گیا
رو رہا ہوں موسم گُل دیکھ کر
میں سمجھتا تھا مجھے صبر آ گیا
یہ ہَوا، یہ برگِ گُل کا اہتزار
آج مَیں رازِ مسرّت پا گیا
اختر اب برسات رخصت ہوگئی
اب ہمارا رات کا رونا گیا

اختر انصاری دہلوی

ب

غزل

وہ رنگ دے تابِ عاشقی میں جو حُسن کو لاجواب کر دے
مری نظر میں وہ برق بھر دے جو تجھ کو بھی بے حجاب کر دے

کہاں ہے وہ لطفِ نازِ تیرا وہ عشوۂ جاں طرازِ تیرا
نگاہ تیری، جو میرے ہر لفظِ آرزو کو کتاب کر دے

مری نظر کو تلاش تیری مری نظر تجھ کو ڈھونڈھتی ہے
مری حقیقت کے خواب رنگیں مجھے بھی نیرنگِ خواب کر دے

کہاں ہے لے مست ہوش ساقی سرورِ لرزاں خمارِ رقصاں
مجھے بھی سرجوشِ بے خودی دے مجھے بھی موجِ شراب کر دے

غمِ جدائی سے خاک ہوں میں، وہ نالہ زا، اے محبت
وہ کاسۂ چشمِ تر جو گردوں کو بھی طلسمِ حباب کر دے

خرد کی دنیا عذاب میں ہے جنوں مرا پیچ و تاب میں ہے
سکوں بھی اب اضطراب میں ہے سکوں کو بھی اضطراب کر دے

غمِ محبت بلائے جاں ہے ستم ہے یا رب ستم ہے یا رب!
مجھے جنوں کا شباب کر دے مری وفا کو خراب کر دے

کہاں کا ذکرِ بقائے ہستی! ہے کس کو فکرِ دوامِ مستی؟
جہان بھر کی ہوس پرستی مرے لئے انتخاب کر دے

کہاں کا جبر اختیار کیسا نہ عقل میری نہ عشق میرا،
مرے گناہوں پہ عفو ہی کر مری خطا کو ثواب کر دے

محال ہے ضبطِ شوق تائب میں مضطرب اس نگاہ کا ہوں
جو میرے آئینۂ محبت کے حسن کو آب آب کر دے

مراتب علی تائب

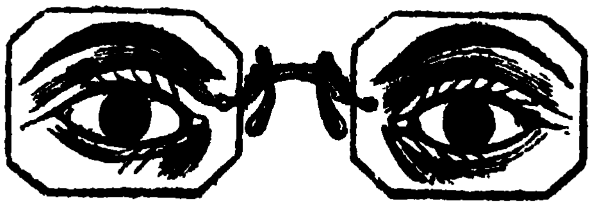
اثرستان

آج کچھ مہرباں ہے صیّاد — کیا نشیمن بھی ہوگیا برباد؟
دہر اک جلوۂ خود آرائی — اللہ اللہ شوخئ ایجاد!
چمنِ عشق میں بہار آئی — گُل تیشہ ہے اور سرِ فرہاد
میں ہوں بدنام، حسرتیں بدنام — دلِ ناکام! اب ہے کیا ارشاد؟
کوئی ترکِ ستم پہ مائل ہے — ہاں دلِ دردمند! ہاں فریاد!!
آرزو تھی کہ وہ اِدھر دیکھیں — ہوش رخصت ہوئے مبارکباد!
اب ہے یہ رنگِ یاس و محرومی — دل سے پھرتی ہے دُور تیری یاد۔
غمِ طاقت گداز، دشمنِ صبر — نفَسِ گرم، رہزنِ فریاد
ایک طوفانِ اشک آنکھوں میں — اور ہر اشک "آبلہ بنیاد"
کوئی ہندو کوئی مسلماں ہے — عشق ہے اپنا مشربِ آزاد!

دل سے کیوں مطمئن ہیں آپ اثرؔ!
پھر یہ حرماں سرا نہ ہو آباد!

جعفر علی خاں اثرؔ بی اے





دنیائے ادب

معزز الفاظ کی توہین اردو زبان میں

قوموں کی ترقی اور تنزل اور عروج و زوال کے اسباب و محرکات پر غور کرنے والے اور ملکوں کی معاشرتی اور تمدنی تاریخ کے ماہر اس امر سے بخوبی واقف ہیں کہ جب کوئی قوم بام عروج سے پستی کی طرف گرنی شروع ہوتی ہے تو اس کی ہر حرکت اور اس کے ہر قول میں عام طور پر دناءت کمینگی اور سفلہ پن پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کے اخلاق خراب ہو جاتے ہیں۔ اس کی مالی حالت بدتر ہو جاتی ہے۔ اس کی جسمانی حالت کمزور ہو جاتی ہے۔ اس کی اولوالعزمی اور ہمت جاتی رہتی ہے۔ علم کا شوق اس میں باقی نہیں رہتا۔ زمانہ بھر کی بدکاریاں بدتمیزیاں اور بے ہودگیاں اس میں آہستہ آہستہ پیدا ہو جاتی ہیں۔ اور سب سے زیادہ بول چال اور زبان اس قدر خراب ہو جاتی ہے جس کی انتہا نہیں۔ بات بات پر مردوں کا گالیاں بکنا اور عورتوں کا کوسنے دینا اس قوم کا روزمرہ معمول ہو جاتا ہے اور پھر گالیاں بھی اتنی فحش اور گندی کہ ایک سنجیدہ آدمی تو ان کو سن کر لرز اٹھے۔ یہ دیوانگی یہاں تک بڑھتی ہے کہ آدمیوں کو چھوڑ کر اس قسم کے وحشی انسان جانوروں یہاں تک کہ بے جان چیزوں کو بھی ایسی ایسی مقفیٰ گالیاں دیتے ہیں کہ آدمی سن کر حیران ہو جائے۔ مبالغہ نہیں واقعہ ہے کہ میں نے بوڑھے بوڑھے مہذب انسانوں کو اپنے لڑکوں اور دوسرے کے بچوں کو نہایت پیار میں "بدمعاش" کہتے سنا ہے اور سچ پوچھو تو یہ بھی بہت ہی معمولی لفظ ہے۔ سامعین میں سے سینکڑوں اصحاب نے لوگوں کو محض پیار میں اپنے شیرخوار بچوں اور گود میں کھیلنے والے لڑکوں کو بہت بڑی بڑی گالیاں دیتے دیکھا اور سنا ہوگا۔ اس واقعہ کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ ہماری گالیاں کھاتے کھاتے اور سنتے سنتے ہمارا معصوم لخت جگر خود بھی اپنے ہمجولیوں کو گالیاں دینے لگتا ہے۔ اب چونکہ ہمارا بویا ہوا درخت پھل لانے لگتا ہے۔ لہذا ہماری خوشی کی کوئی حد نہیں رہتی۔ بہت سی مائیں اس بات کی آرزو کیا کرتی ہیں کہ ہمارا ننھا کب بڑا ہو اور کب وہ باہر سے کسی بچے کو گالیاں دے کر آئے اور ہمارا دل ٹھنڈا ہو۔ اور درحقیقت وہ دن ان کے لئے عید کا دن ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں اکثر دیکھا گیا ہے کہ والد بزرگوار بڑے شوق سے بیٹے کو سکھا رہے ہیں کہ "ہاں بیٹا! اپنی اماں کو یہ گالی دو"۔ اور جب بچہ اپنی توتلی زبان میں باپ کے حکم کی تعمیل کرتا ہے تو سارا گھر مارے ہنسی کے لوٹن کبوتر بن جاتا ہے۔ بچے کی خوب پیٹھ ٹھونکی جاتی ہے اور اس سے بار بار وہی گالی ماں کو دلوائی جاتی ہے۔ انصاف اور غور کیجئے کہ اس سے زیادہ اخلاق کو تباہ کرنے والی اور کیا چیز ہو سکتی ہے!

معاملہ صرف اسی حد تک نہیں رہتا بلکہ ہم نے ایک قدم آگے بڑھایا ہے اور زبان کے وہ الفاظ جو نہایت مقدس و متبرک یا بے حد معزز اور محترم تھے۔ آج کل ہم نے اُن کو ایک نیا لباس پہنایا ہے۔ جس کے بعد ان لفظوں کی شکل بالکل مسخ اور برعکس ہو گئی ہے اور ہمارے اخلاق کی خرابی اور مذاق سلیم کی بدذوقی کی وجہ سے جو لفظ جتنا زیادہ مقدس تھا وہ اب اتنا ہی بدترین سمجھا جاتا ہے اور جو لفظ جس قدر زیادہ معزز تھا آج کل وہ اتنے ہی ذلیل معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ مثلاً چند الفاظ عرض کرتا ہوں:۔

(۱) "حضرت"۔ اس سلسلے میں سب سے زیادہ جس مقدس لفظ کی توہین اور بے عزتی کی جا رہی ہے وہ لفظ "حضرت" ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ لفظ خدا تعالیٰ کے پاک نبیوں، اولیاء اور مقدسین مذاہب کے نام کے ساتھ تعظیماً استعمال کرنے کے لئے وضع کیا گیا تھا مگر اردو زبان کی بدقسمتی اور ہماری کور ذوقی دیکھئے کہ آج کل یہی مقدس ترین لفظ بدترین شریر، نہایت اوباش اور چھٹے ہوئے بدمعاش بے حد چالاک، عیار اور مکار انسان کے لئے بولا جاتا ہے۔ افسوس صد افسوس۔

(۲) "خلیفہ" یہ لفظ مذہب اسلام کی نہایت مقدس اصطلاح ہے۔ اللہ تعالیٰ یا انبیائے کرام کے نائبین کو اس معزز لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ جیسے خلیفۃ اللہ یا خلیفۃ الرسول۔ خود اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں فرمایا۔ انی جاعلٌ فی الارض خلیفہ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جانشینوں کو خلفائے راشدین کہتے ہیں لیکن آہ کس قدر افسوس ہے کہ اس قدر متبرک لفظ ہماری زبان میں آ کر اپنی تمام عزت و وقعت کھو بیٹھا اور آج کل نائی، درجی یا پہلوان کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

(۳) "صلواۃ" اس لفظ کو دیکھئے اور ہماری اخلاقی حالت پر روئیے۔ کون نہیں جانتا کہ اس کے حقیقی اور واقعی معنی نماز، دعا، درود، بخشش اور خدا کی رحمت و سلامتی کے ہیں مگر دیکھئے تو رونا آتا ہے جب ہم کسی سے یہ فقرہ سنتے ہیں "خواہ مخواہ اُس نے مجھے ہزاروں صلواتیں سنائیں" مطلب یہ ہے کہ بہت سی گالیاں دیں۔ اب بتلائیے نماز و دعا اور گالی اور دشنام میں کتنا فرق ہے؟ مگر ہم روزمرہ یہ لفظ بولتے ہیں اور کبھی قطعاً ہمیں خیال نہیں آتا کہ کس قدر پاک اور متبرک لفظ کو کتنی بُری اور بے ہودہ جگہ استعمال کر رہے ہیں۔

(۴) "علامہ یا علامۂ دہر" فاضل یگانہ اور عالم بے مثل اس لفظ کے معنی ہیں۔ جو ظاہر ہے کہ بہت بڑا لقب ہے مگر ہماری قدر دانی دیکھئے کہ آج کل یہ لفظ بڑی حرافہ نہایت چالاک، بڑی عیارہ اور نہایت دھوکا باز عورت کے لئے بولا جاتا ہے۔

(۵) "مُلا" اس لفظ کا بھی حشر اردو میں آ کر علامہ جیسا ہوا۔ اس کے معنی بھی بہت بڑے عالم اور فاضل ادیب کے ہیں۔ اس سے زیادہ اس لفظ کی بدقسمتی اور کیا ہو گی کہ ایک زمانہ تھا جب کہ یہ لفظ فیضی، ابوالفضل، اور جامی جیسے فضلائے یگانہ کے ناموں کا جز تھا اور آج کل جاہل، بے وقوف، کودن اور احمق کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ نیز ان فقیر نما انسانوں کے لئے جو مسجدوں کے حجروں میں رہتے اور محلہ کے گھروں کی روٹیوں پر جو بطور خیرات وہ دونوں وقت مانگ کر لے آتے اور گزر کرتے ہیں۔

(۶) "مولوی یا مولانا" اس لفظ کے معنی ہیں وہ شخص جو خدا کا ہو رہے۔ یا صاحب علم۔ مگر اس لفظ کی آج کل وہ مٹی پلید ہوئی ہے کہ خدا کی پناہ۔ مسلمانوں میں ہر وہ شخص جو تحریک خلافت، تحریک ہجرت اور ترک موالات میں شامل تھا یا جس نے ذرا سی داڑھی رکھ لی بس وہ مولوی ہے۔ خواہ کندۂ ناتراش اور جاہل محض ہی ہو۔ یہ لفظ جہلا کے لئے اب اس قدر کثرت سے استعمال کیا جانے لگا ہے کہ اصلی اور حقیقی عالم اپنے آپ کو مولوی کہلاتے ہوئے شرمانے لگے ہیں۔

(۷) "قبلہ" مسلمانوں کے سب سے زیادہ مقدس مقام کعبہ کو قبلہ کہتے ہیں یعنی جدھر منہ کر کے سب مسلمان پانچ وقت نماز ادا کرتے ہیں۔ مگر آج کل اخلاق اس قدر خراب ہو گئے ہیں کہ ہر اچھے لفظ کو قصداً نہایت بُرے معنوں میں ڈھال لیا گیا ہے۔ چنانچہ قبلہ آج کل نہایت عیار، مکار اور چالاک آدمی کے متعلق بولتے ہیں۔

(۸) "اللہ" اب بھلا بتائیے کہ خدا تعالیٰ سے زیادہ مقدس ہستی ایک مسلمان کے لئے اور کون سی ہو سکتی ہے۔ مگر افسوس ہے کہ اس قادر و قیوم ذات کو بھی ہم نے خالی نہ چھوڑا۔ وہ ذات پاک جو آسمانوں اور زمینوں کی مالک اور ان کی خالق ہے، وہ شہنشاہ جو دونوں جہانوں کا مالک اور آقا ہے ہم نے اس کے متعلق جو فقرے اور محاورے ایجاد کر رکھے ہیں۔ وہ انتہائی غریبی اور مفلسی کو ظاہر کرتے ہیں۔ چنانچہ جب ہم کہیں گے کہ "گھر میں اللہ ہی اللہ ہے" یا "اللہ کا نام ہے" تو ہمیشہ اس کے یہی معنی ہوتے ہیں کہ گھر میں نہایت مفلسی، غریبی اور محتاجی ہے، اور اس وقت محتاج یا سائل کو دینے کے لئے کچھ بھی نہیں۔ کتنے افسوس کا مقام ہے کہ اس مطلب کو ظاہر کرنے کے لئے ہم نے نام بھی چھانٹا تو اس ذات اقدس کا جس کے قبضۂ قدرت میں تمام جہان کے خزانے ہیں اور بڑے بڑے باجبروت شہنشاہوں کو دم کے دم میں خاک میں ملا سکتا ہے۔ کیا ہمیں دنیا جہان میں کوئی اور لفظ اللہ کے سوا اس مطلب کو ظاہر کرنے کے لئے نہیں مل سکتا تھا؟

(۹) "انشاء اللہ" قرآن کریم میں خدا تعالیٰ کا تاکیدی حکم ہے کہ جب تم کسی کام کا وعدہ کرو تو ساتھ ہی یہ بھی کہہ لیا کرو کہ "اگر خدا نے چاہا"۔ اگلے زمانے میں مسلمانوں کا وعدہ پتھر کی لکیر ہوتا تھا۔ اور مخاطب "انشاء اللہ" کا لفظ سنتے ہی پورے طور پر اپنے کام کی طرف سے مطمئن ہو جاتا تھا اور وعدہ کرنے والے شخص پر بھی انشاء اللہ کہنے کے بعد (یعنی خدا کو اپنے وعدے پر گواہ کر لینے کے بعد) اس وعدے کا پورا کرنا بے حد ضروری ہو جاتا تھا۔ مگر یہ سب کچھ پہلے زمانے کی باتیں ہیں جو قصے کہانیوں سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں آج کل کے مہذب اور روشن زمانے میں جب انشاء اللہ کا لفظ کسی کے منہ سے نکلتا ہے تو مخاطب کو فوراً اس بات کا یقین ہو جاتا ہے کہ یہ سب ٹالنے کی باتیں ہیں اور یہ شخص ہرگز ہرگز میرا کام نہیں کرے گا۔ میں نے اکثر لوگوں کو انشاء اللہ کے جواب میں یہ کہتے سنا ہے کہ "انشاء اللہ نہیں، پکا وعدہ کرو" مطلب

یہ ہے کہ انشاءاللہ کہنا وعدہ خلافی اور کام نہ کرنے کا آج کل یقینی ثبوت سمجھا جاتا ہے۔ افسوس![1]

(۱۰) "اُستاد"۔ ماں باپ کے بعد تعظیم و تکریم کے لحاظ سے اُستاد کا درجہ اخلاق کی قدیم کتابوں میں تسلیم کیا گیا ہے۔ مگر ہماری بول چال میں آکر اس لفظ کے معنی نہایت چالاک، فریبی اور دغاباز کے ہو گئے۔ زمانے کا انقلاب ہے۔

(۱۱) "گرو"۔ اس لفظ کی قسمت بھی بالکل لفظ استاد کے ساتھ بندھی ہوئی ہے۔

(۱۲) "مرشد" اس لفظ کے معنی عربی میں ہادی، رہنمائے مذہبی، ہدایت کرنے والا، راہ بتانے والا۔ اور پیرِ طریقت کے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اپنے حقیقی معنوں کے لحاظ سے یہ لفظ کس قدر مقدس اور محترم ہے۔ مگر اردو کے سانچے میں ڈھلا اور بازاری آدمیوں کی زبان پر چڑھا تو اس کے معنی بڑے چلتے پرزے اور عیار، مکار اور چالاک انسان کے ہو گئے۔ نہ معلوم تمام اقسام کے بدترین اور بے ہودہ مطالب کو ظاہر کرنے کے لئے مقدس ترین الفاظ کے خزانے پر کیوں ڈاکہ ڈالا گیا۔ میں نہایت ممنون ہوں گا اگر کوئی صاحب اس کی معقول اور مدلل وجہ بتائیں گے۔

(۱۳) "ولی" اس لفظ کے معنی ہیں خدا کا خاص مقرب بندہ اور اس کے عشق میں سرشار۔ مگر ہمارے ہاں آ کر یہ لفظ مرشد سے بھی زیادہ بدترین معنوں میں استعمال ہونے لگا۔ آپ نے مشہور مصرعہ سنا ہوگا۔

ہم تو مرشد تھے تم ولی نکلے۔

(۱۴) حافظ جی۔ کیسا سیدھا سادا اور عام فہم لفظ ہے۔ اس کے معنی ہیں وہ شخص جس نے قرآن پاک حفظ کر لیا ہو۔ مگر یار لوگوں نے اس کے معنی اندھے کے بنا لئے یا پیر مسجد کے ملا کے چاہے وہ دونوں الحمد بھی پڑھے ہوئے نہ ہوں۔

(۱۵) "جہاد" یہ ایک مقدس مذہبی اصطلاح ہے جس کے معنی ہیں اللہ تعالیٰ کے دین کی اشاعت اور خداوند کریم کی رضا کی خواہش میں اپنی جان لڑا دینا لیکن وائے بدقسمتی کہ آج کل یہی مقدس لفظ ہر بغاوت، ہر سرکشی اور ہر فتنہ و فساد کی آگ کو بھڑکانے کے وقت بہت فخریہ طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ ہندوستان کے موجودہ دور میں کون ہے جس نے "جہادِ آزادی" اور "جہادِ حریت" کے لفظ نہیں سنے۔؟[2] ( )

(۱۶) "معجزہ" ہندوستان میں آکر جس قدر اس مقدس لفظ کی بے عزتی ہوئی ہے۔ شاید ہی کسی کی ہوئی ہو۔ یہ خالص مذہبی اصطلاح ہے جس کے معنی ہیں وہ عظیم الشان غیر معمولی نشان جو سوائے نبی اور رسول کے دنیا میں کوئی اور شخص نہ دکھا سکے۔ مذہبی اصطلاح میں یہ لفظ صرف نبی کے لئے بولا جاتا ہے کسی اور کے لئے ہرگز نہیں یعنی اگر کسی ولی یا قطب یا غوث یا ابدال سے کوئی نشان ظہور میں آئے تو اُسے بھی معجزہ نہیں کہیں گے۔ مگر یہ مقدس مذہبی اصطلاح آج کل بہت ہی معمولی معمولی کاموں کے لئے استعمال ہونے لگی ہے۔ امراض خبیثہ اور شرمناک بیماریوں کے اشتہارات جو ہر اخبار میں بیسیوں ہوتے ہیں۔ آپ اکثر لفظ "معجزہ" موٹے موٹے حروف میں لکھا ہوا پائیں گے۔ للہ مجھے کوئی شخص بتائے کہ کیا یہ حرکت اس مقدس لفظ کی صریح توہین نہیں؟

(۱۷) "مومن"۔ اس لفظ کے معنی ہیں نہایت سچا اور پکا مسلمان اور نیک مرد۔ لیکن اس سے زیادہ ستم ظریفی اور کیا ہو گی کہ آج کل اس لفظ سے نہایت احمق اور بے وقوف مراد لی جاتی ہے اور جلاہے جو بدقسمتی سے بے وقوفی میں ضرب المثل ہو چکے ہیں، اس نام سے پکارے جاتے ہیں۔

(۱۸) "بہشتی" یہ بھی مومن کے ٹائپ کا لفظ ہے۔ لفظی معنی ہیں بہشت میں رہنے والا یا جنت میں جانے والا۔ لیکن ہماری زبان میں سقے اور ماشکی کو کہتے ہیں اور اس کی ایک نہایت بے وقوفانہ تاویل یہ بنا رکھی ہے کہ چونکہ سقا پانی بھرتا ہے۔ اور پانی پلانا چونکہ ثواب کا کام ہے۔ اور ثواب کا کام کرنے کا نتیجہ جنت ہے لہٰذا اس مناسبت سے سقہ کو بہشتی کہا جاتا ہے۔ چاہے وہ صرف ایک ڈول مشک میں ڈال کر پھونک سے ہی ساری مشک پھلا لے مگر کہلائے گا بہشتی ہی۔ ع

بریں عقل و دانش بباید گریست

(۱۹) "قلندر"۔ آج کل کے زمانے میں کون یقین کر سکتا ہے کہ اس لفظ کے معنی تارک الدنیا اور باخدا انسان کے ہیں جب کہ یہ لفظ موجودہ عہد میں بے غیرت اور بے حیا آدمی کے لئے بولا جاتا ہو اور ریچھ اور بندر نچانے والے قلندر پکارے جاتے ہوں۔ اگر مشہور بزرگ حضرت بو علی شاہ قلندر رحمۃ اللہ علیہ پانی پتی کو پتہ ہوتا کہ میرے بعد اس معزز لفظ کی یہ گت بنے گی تو ہرگز اپنے آپ کو قلندر نہ کہلواتے۔

(۲۰) "مجذوب" یہ لفظ بھی قلندر کا بھائی ہے۔ اس کے معنی ہیں خدا کی محبت اور اس کے عشق میں ڈوبا ہوا۔ لیکن آج کل اردو لغت کی کتابیں کھول کر دیکھ لو صاف لکھا ہوا پاؤ گے کہ مجذوب۔ سڑی۔ پاگل۔ بے وقوف اور احمق آدمی کو کہتے ہیں۔

---

[1] انشاء اللہ کی تخریب کے متعلق سرسید علیہ الرحمۃ کا مضمون "انشاءاللہ" ملاحظہ فرمائیے۔ (ادبی دنیا) [2] اس سے ہمیں اختلاف ہے۔ (ادبی دنیا)

(۲۱) "مصلّی": عربی لفظ ہے جس کے معنی ہیں نماز پڑھنے والا اور اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے والا۔ لیکن نہ معلوم لوگوں پر کیا مصیبت پڑی کہ انہوں نے ہر اُس چوہڑے اور خاک روب کو مصلّی کہنا شروع کر دیا ہے جو اسلام قبول کر لے۔ کیا دنیا بھر میں نو مسلم چوہڑوں کے تعارف کے لئے لوگوں کو کوئی اور لفظ نہیں ملتا تھا؟ مسجد کے ملّاؤں پر بھی یہ لفظ کثرت استعمال کیا جاتا ہے جیسے "آج ہیں نے بیس مصلّیوں کی دعوت کی"۔

(۲۲) "شہید": یہ بھی ایک مقدس مذہبی اصطلاح ہے اور اس شخص کو شہید کہا جاتا ہے۔ جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں اس کی رضا اور خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اپنی جان فدا کر دیتا ہے نیز یہ اللہ تعالیٰ کا ایک نام بھی ہے مگر اپنے ہم مشرب اور ہم معنی دوسرے الفاظ کے ساتھ اس مقدس لفظ کی بھی آج کل کے زمانے میں بڑی بے توقیری ہو رہی ہے۔ پچھلے دنوں قطب جنوبی کی تحقیقات کرتا ہوا سیاحوں کا ایک گروہ برف میں دب کر ہلاک ہو گیا تو ایک بہت بڑے مشہور مولوی صاحب نے اپنے بہت مشہور اخبار میں "شہدائے راہ کشف و سیاحت" کے فصیحانہ عنوان سے اس واقعہ کا تذکرہ کیا تھا۔ اور مطلق اس امر کا خیال نہیں کیا کہ شہید ایک خالص اسلامی اصطلاح ہے۔ اور اس کو بے محل استعمال کرنا کسی طرح موزوں نہیں۔ اس کے علاوہ ویسے بھی اس لفظ کی بڑی مٹی پلید ہوئی ہے۔ مقدس بانیان مذاہب کو جو ناپاک انسان اپنی ہر تحریر اور تقریر میں عمر بھر گندی سے گندی گالیاں دیتے رہے۔ آج بڑے فخر کے ساتھ "شہید" کے نام سے پکارے جاتے ہیں۔ وہ شریر انسان جو مذہبی پیشواؤں کی نہایت گندی توہین کے جرم میں باغیرت مگر کم عقل لوگوں کے ہاتھوں دوسرے جہان میں پہنچا دیئے گئے فوراً "شہید" کے اعزاز سے معزز کر دیئے گئے۔ یہی نہیں بلکہ جو مفسدہ پرداز اور باغی انسان حکام پر بم کے گولے پھینک کر پھانسی پر چڑھے فوراً "شہید" بن گئے۔ اب بتلایئے اس ذہنیت کا کیا علاج ہے۔

(۲۳) "غازی": یہ معصوم اور مظلوم لفظ بھی بہت ہمدردی کا مستحق ہے۔ اس کے معنی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی راہ میں کافروں سے جنگ کرنے والا جس شخص نے خدا کی راہ میں اپنے سر کی بازی لگا دی ہو یقیناً نہایت تعظیم کا مستحق ہے۔ مگر بوالعجبی دیکھئے کہ لغت تک میں اس کے معنی بازی گر اور نٹ کے لکھے ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ ہر وہ شخص جو ہر قسم کی بداعمالیاں اور بدکاریاں کرتے رہنے کے باوجود ترک موالات کی تحریک میں والنٹیر رہ چکا ہے۔ یا احرار کا سپاہی ہے "غازی" بنا پھرتا ہے۔

(۲۴) "ذات شریف" اس لفظ کے لفظی معنی ہیں نہایت شریف، نیک اور اچھا آدمی۔ لیکن ہم اس پر تلے بیٹھے ہیں کہ ہر اچھے لفظ کا حلیہ ضرور بگاڑنا ہے۔ چنانچہ حسب معمول اس لفظ کے ساتھ بھی ہم نے یہی سلوک کیا اور آج کل ذات شریف نہایت چالاک، ہوشیار اور چالباز انسان کو کہتے ہیں، جس سے شریفوں کو بہت بچ کر رہنا چاہئے۔

(۲۵) "دہقان" اس لفظ کے معنی ہیں، گاؤں کا مالک، سردار اور حاکم۔ دہقان خلد جنت کے داروغہ یعنی رضوان کا نام ہے۔ مگر آپ میں سے ہر شخص جانتا ہے کہ آج کل اس بدقسمت لفظ کے معنی جاہل گنوار، وحشی اور اکھڑ آدمی کے ہیں۔

(۲۶) "مہتر" اس سے زیادہ بدسلوکی شاید ہی اردو زبان میں کسی اور لفظ کے ساتھ کی گئی ہو کسی زمانے میں یہ لفظ جس قدر زیادہ معزز، محترم اور مکرم سمجھا جاتا تھا۔ آج اُسی قدر ذلیل حقیر اور بے عزت خیال کیا جاتا ہے اس کے معنی ہیں بڑا بزرگ۔ قوم کا سردار، لشکر کا امیر، نواب، شہزادہ، رئیس اعظم۔ اسی مناسبت سے والیٔ چترال کو "مہتر چترال" کہتے ہیں لیکن مہتر چترال کو کسی قدر شرم و غیرت آئے اگر وہ یہ سنیں کہ اردو دنیا میں یہ لفظ بھنگی، خاک روب اور فضلہ اٹھانے والے ادنیٰ ترین انسان کے لئے بولا جاتا ہے۔ یہ لفظ ان معنوں میں اس قدر کثرت کے ساتھ استعمال ہوتا ہے کہ اب عوام کے وہم میں بھی یہ بات نہیں گذر سکتی کہ یہ لفظ کس قدر معزز اور مکرم ہے اور اگر ان کو یہ بات بتائی جائے تو اُن کی حیرانی کی کوئی حد نہ رہے۔

(۲۷) "سُسرا" ہماری زبان کی حالت آج کل واقعی بڑی قابل رحم ہے جس میں خسر جیسا معزز اور قابلِ عزت لفظ کھلی ہوئی گالی کے طور پر استعمال کیا جاتا ہو۔ افسوس۔

(۲۸) "سالا" یہ لفظ بھی سسرے کی قسم کا ہے اور نہایت محبت اور پیار کے رشتہ کو ظاہر کرتا ہے۔ مگر آج کل کسی شخص کو ذرا کہہ کر تو دیکھو جوشیلا ہو گا۔ تو فوراً تھپڑ کھینچ مارے گا سنجیدہ ہو گا تو آپ سے بولنا چھوڑ دے گا۔

(۲۹) "چچا" نہایت مکرم و معظم لفظ ہے۔ سعادت مند لوگ چچا کی تعظیم و تکریم باپ کے برابر کرتے ہیں۔ مگر آج کل جن معنوں میں یہ لفظ استعمال ہوتا ہے اس سے ہر شخص واقف ہے کون ہے جس نے یہ محاورہ نہ سنا ہو گا کہ "چچا ہی بنا کے نہ چھوڑا تو کہنا"۔ چچا بے چارے کے

متعلق یہ شعر بھی آپ نے بارہا پڑھا ہوگا۔

چچا کے چچا ہم تو مشہور تھے
بھتیجا ہمارا چچا ہو گیا

دیکھا آپ نے! یہ صرف چند الفاظ ہیں جو معمولی اور سرسری طور پر جمع کر دیئے گئے ہیں اگر اس قسم کے الفاظ کی مکمل فہرست مرتب کی جائے تو غالباً سینکڑوں تک پہنچ جائے گی۔ مگر کیا ان محترم اور معزز الفاظ کے اتنے برے اور بے ہودہ معنی کرنے کسی بھی زبان کے لٹریچر میں مفید اضافہ کا باعث ہو سکتے ہیں؟ ظاہر ہے کہ ہرگز نہیں۔ گالیاں دینے اور مذاق اڑانے کے لئے جن پرانے الفاظ کو ہم نے سانچے میں ڈھالا ہے۔ بلاشبہ وہ انسانیت اور اخلاق کا گلا کاٹنے کے لئے ایک تیز تلوار کی حیثیت رکھتے ہیں اس لئے ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنے مقدس الفاظ کی قدر کریں اور ان کو ہمیشہ انہی معنوں میں استعمال کریں جن کے لئے وہ ابتدا میں وضع کئے گئے تھے۔ جب زبان ہی ٹھیک نہ ہوگی تو ہمارے اخلاق و عادات کس طرح مہذب اور شایستہ اور متین و سنجیدہ بن سکتے ہیں۔ پس آؤ اور آج کے دن سے عہد کر لو کہ عمدہ الفاظ کو برے معنوں میں کبھی استعمال نہیں کرو گے۔ اگر تم ایسا کرنے پر قادر ہو سکے تو تم یقیناً محسوس کرو گے کہ زبان کی درستگی کا اثر تمہاری دوسری عادات و اخلاق پر بھی بہت گہرا پڑا ہے۔ کیونکہ دوسرے اخلاق و عادات عموماً زبان کے ساتھ چکر لگاتے رہتے ہیں۔ زبان اگر اچھی رہی تو سب چیزیں اچھی رہتی ہیں۔ زبان بگڑی تو سب کچھ ملیا میٹ ہو جاتا ہے۔ کاش ہماری سمجھ میں یہ بات آجائے اور ہم اپنی زبان میں سے اس قسم کے الفاظ قطعاً خارج کر دیں۔

"اردو"

محمد اسمٰعیل

نقد و نظر

طلسمِ خیال

(مصنفہ کرشن چندر ایم اے۔ دیباچہ از سید فیاض محمود ایم اے۔ لکھائی چھپائی خاصی۔ کاغذ بہت اچھا۔ حجم اڑھائی سو صفحات۔ سائز درمی۔ مجلد۔ قیمت ایک روپیہ چار آنے۔ ناشرین۔ مکتبۂ اردو لاہور)

ناظرین ادبی دنیا میں سے کون ہے جو کرشن چندر کی سحر نگاری سے آشنا نہیں اور ہم میں سے کس کے دل کے تاروں میں اس نوجوان افسانہ نویس کے مضراب فن نے لرزش پیدا نہیں کی۔ طلسمِ خیال (طلسم ہوش ربا نہیں! کرشن چندر صاحب معاف فرمائیں یہ نام ہمیں بالکل پسند نہیں) کرشن چندر کے بارہ افسانوں کا مجموعہ ہے۔ یہ ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ اُن کے بہترین افسانے ہیں، کیونکہ بعض نہایت اچھے افسانے اس مجموعے میں شامل نہیں، مثلاً "منگلیک" اور "آنسوؤں والی"۔ مگر اس میں بھی شک نہیں کہ جو چیزیں طلسمِ خیال میں شامل ہیں وہ ایک آدھ کے سوا ہر لحاظ سے اچھی ہیں اور "زرقان" اور "لاہور سے بہرام گلہ تک" تو مصنف کے شاہکار ہیں جو علی الترتیب ادبی دنیا اور ہمایوں میں شائع ہو چکے ہیں۔

کرشن چندر (عمر کے لحاظ سے اگرچہ نوجوان ہیں لیکن اپنی طرزِ تحریر اور اندازِ خیال کے لحاظ سے پختہ کار ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ انہوں نے اپنے لئے ایک نہایت شگفتہ سٹائل مخصوص کر لیا ہے اور جو کچھ وہ لکھتے ہیں ان کے امتیازی رنگ سے رنگین ہوتا ہے۔ ایک اوسط درجے کے پڑھنے والے کی رائے میں اُن کی تحریر کی پانچ خوبیاں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اوّل اُن کی شاداب اور رنگین تشبیہیں! ایسی تشبیہیں جن میں حقیقت کے ساتھ زندگی اور دل آویزی پائی جاتی ہے۔ ایسی تشبیہیں جو پڑھنے والے کو اپنے سیلِ رواں میں بے اختیار بہا لے جاتی ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے۔

"اُن آنکھوں میں ایک ہلکی سی چمک پیدا بھی ہوئی، مگر پھر فوراً ہی گم ہوگئی جیسے کوئی حسین سنگریزہ سمندر کے گہرے نیلے پانیوں میں کھو جائے"

"اس کا داہنا بازو اوپر اٹھا بھی اور پھر نیچے گر گیا۔ چوڑیوں کی جھنکار پیدا بھی ہوئی اور ایک لمحہ میں لرزتی ہوئی کہیں غائب ہوگئی۔ جیسے آسمان سے کوئی تارا ٹوٹے اور فضا میں گھل جائے۔" (جہلم میں ناؤ پر)

"آسمان کے نیلے چشمے پر چاند اور ستارے پھولوں کی طرح کھلے ہوئے تھے۔" (اندھا چھترپتی)

"اُس کی (رزس کی) آواز نازک اور باریک تھی۔ جیسے دوا پینے کے بلوریں گلاس کے ساتھ ایک نقرئی چمچہ ٹکرا جائے۔"
(مجھے کتے نے کاٹا)

"شاید یہ میرا ہی افلاس تھا جو اس طرح دونوں ہاتھ پھیلائے ہوئے مجھ سے بھیک مانگ رہا تھا۔" (ایضاً)

"ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُن کی چوٹیوں پر بادلوں کے محل بنے ہیں...... اُس نے پھر نگاہ اٹھا کر دور آسمان میں تیرتے ہوئے بادلوں کو دیکھا، سپید برّاق، چمکتے ہوئے لاکھوں تاج محل تھے اور چاروں طرف جمنا کا نیلا پانی پھیلا ہوا تھا۔ اُس نے سوچا، ان مرمریں محلوں کو کس شاہجہاں نے بنایا ہے، اور کس محبوب کی یاد میں؟"

"اُس کی سانس میں شہد کی سی مٹھاس تھی۔" (آگہی)

"ہنگلی کا پانی شعاعوں کے انعکاس سے سُرخ تھا۔ سروش (مایوس اور بیکار نوجوان) کو احساس ہوا جیسے کسی نے آسمان کے مغربی کونے میں سورج کو قتل کر دیا ہے اور اب اس کا لہو بہہ بہہ کر ہنگلی میں آ رہا ہے۔" (صرف ایک آنہ)

"(آبشار کے) پانی کے ان لاکھوں کروڑوں بلبلوں میں بشریت کی مکمل تاریخ موجود تھی اور قدرت کی ابدیت کے ساتھ ساتھ انسانی زندگی کی کم مائگی اور بے چارگی کا بھی اعتراف تھا" (لاہور سے بہرام گلہ تک)

"ہاں . . . . . ہم دونوں کو دیکھتی جاتی تھیں، ان کی آنکھیں پُرنم تھیں۔ آنسوؤں سے اُن دو سمندروں میں خوشیوں کی جل پریاں ناچ رہی تھیں"۔ (رمانشا)

میں نے پگ ڈنڈی پر نیچے اترتی ہوئی لڑکی کی طرف اشارہ کرکے کہا، وہ دیکھو، ایک منی کی (ٹھلیا) اٹھائے دوشیزہ، اور ٹخنوں پر بجتی ہوئی جھانجیں، یہی ہندوستانی رقص کی ابتدا،، "انتہا ہے" (نالاب کہیسم) اس کے بال بہت خوب صورت ہیں سونے کے باریک تار۔ دل کی طرح نرم، نازک اور آپس میں اس طرح الجھے ہوئے کہ گمان ہوتا ہے ڈوبتے ہوئے سورج کی کرنیں ان گیسوؤں میں آکر بند ہو گئی ہیں"۔ (رعو کی بحث)

"اور ــــ کلی ــــ کوہستانی گلاب کی ایک کلی ہے جیاسے سمٹی ہوئی، اور پتوں میں چھپی ہوئی نرم و نازک، مگر وہ کھل رہی ہے آہستہ آہستہ، ہر روز ایک دو نئی پتیاں کھل جاتی ہیں، اور اپنی بھنی بھنی خوشبو سے دل کو مسرور کرتی ہیں۔ ایک دن یہ کلی پھول کی طرح کھل جائے گی شگفتہ اور ہنستا ہوا پھول، پھر میں شاید اس کی تصویر بنا سکوں، ابھی نہیں"۔ (رایننٹ)

"وہ نگاہیں جنہوں نے میرے سینے میں امنگوں کا طوفان برپا کر دیا تھا، جنہوں نے محبت کی سوئی ہوئی ندی کو اپنے نازک تپواروں سے متلاطم کر دیا تھا۔ مگر آج وہ حقیقت محض ایک خواب ہے شفق کی طرح رنگین، قوس قزح کی طرح دور . . . . . "۔ (ریرقان)

آپ نے دیکھا! ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان تشبیہات میں خود زندگی رقص کر رہی ہے۔ پریم چند مرحوم تشبیہہ و تمثیل کے بادشاہ تھے مگر ان کی تشبیہات میں سوز اور درد نمایاں ہوتا تھا اور ایک ایسا روحانی کیف کہ بعض اوقات بے اختیار آنکھوں سے آنسو چھلک پڑتے تھے۔ کرشن چندر کی تشبیہوں میں جو کیف ہے وہ اشک آور نہیں نشاط انگیز ہے۔

کرشن چندر کی دوسری ممتاز خصوصیت ان کے افسانوں کی کھلی فضا، کوہستانی پس منظر، اور دل کش سیٹنگ ہے۔ جیسا کہ ہم نے اس سے پہلے بھی کہا ہے۔ وہ اپنے رومانوں کی مصوری کے لئے عموماً کشمیر کی بہاریں وادی کو منتخب کرتے ہیں، اور پھر جب وہ انسانی جذبات کا اتار چڑھاؤ دکھاتے دکھاتے یکایک انہیں قدرت کے ساز سے ہم آہنگ کرتے ہیں تو یقیناً ایک ہی جست میں بہت سی فنی منزلیں طے کرتے ہوئے ایک سچے آرٹسٹ کے مقامِ بلند پر جا پہنچتے ہیں۔ کرشن چندر فطرت کے عاشق ہیں۔ ان کا کوئی افسانہ، کوئی مطالعہ ایسا نہیں جس کی فضا کو انہوں نے نیچر کے بوقلموں مناظر سے روشن نہ کیا ہو اور جس کے کرداروں کو فطرت کی رنگین عکاسی سے نہ رنگا ہو۔ وہ دوشیزۂ فطرت سے اس کی شوخیاں اور رعنائیاں اور انسانی دل سے اس کی بے قراریاں اور کمزوریاں مستعار لے کر دونوں کے تانے بانے سے ایک ایسا دلفریب اور زرنگار افسانوی ملبوس تیار کر لیتے ہیں جس پر نگاہ نہیں ٹھہرتی۔

ذرا دیکھئے:۔

"مغرب میں سورج غروب ہو رہا تھا، دریا کی خاموش سطح پر ایک عجیب نازک نرالی، سحر طراز روشنی پھیل گئی تھی میں نے سمجھا یہ غروبِ آفتاب نہیں نمودِ سحر ہے۔ مغرب نہیں مشرق ہے۔ روشنی کا منبعِ اعظم ہے۔ ہم غیر فانی انسان ہیں جو اس کبھی نہ غرق ہونے والی "کشتی" پر سوار ہو کر اپنے محبوب سے ملنے جا رہے ہیں۔ اپنے ابدی محبوب سے "میں تاں ماہی نوں منا دن چلیاں" چپ . . . . شپ . . . . چپ . . . . شپ۔ کشتی بھاگی جا رہی تھی"۔

(جہلم میں ناؤ پر)

"آسمان پر بھاگتے ہوئے سفید بادلوں کو دیکھ کر اس کا دل کسی نا معلوم مسرت سے کانپنے لگتا۔ جنگل کے جھرنوں کی آوازمیں اس نے ابدی زندگی کے ترانے اور سحر طراز گیت سنے اور پھر خود اس کی اپنی زندگی کے تار اُن پُر مسرت نغموں کی لے سے جھنجھنا اُٹھے"۔

(اندھا چھتر پتی)

"منو کی شاخوں میں چاند اٹک گیا ہے اور اس اُداس نغمے کو سُن رہا ہے جو نوجوان کسان اور اُن کی مائیں اور بہنیں اور بیویاں گا رہی ہیں، پھر وہ یکایک چپ ہو جاتے ہیں، خاموشی سے مکّی کے دانوں کو الگ کر رہے ہیں . . . ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے آتے ہیں اور منو کا سارا درخت سانس لیتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ کوئی آگ تاپتا ہوا بوڑھا کسان آہستہ سے کہہ اٹھتا ہے اور گاؤ، بیٹو، اور گاؤ، پھر وہ خود ہی کوئی پرانا گیت شروع کر دیتا ہے، اُسے اپنی ختم ہوتی ہوئی زندگی کی بہار یاد آ رہی ہے، زرد زرد شعلوں کی چمک اُس کی آنسوؤں سے بھری ہوئی آنکھوں میں لرزلرز جاتی ہے۔ گاتے گاتے گیت کے الفاظ (اس کی زبان پر) لڑکھڑا

جانتے ہیں . . . . پھر کوئی بیجر کا نغمہ فضاؤں میں گونج اٹھتا ہے۔ نوجوان چرواہیوں کی پتلی پتلی آوازیں بھی اس میں شامل ہو جاتی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ (یہ لوگ) کسی بڑے معبد میں بیٹھے ہوئے اپنے معبود کی حمد و ثنا کر رہے ہیں، یہ مکی کے دانے کسی تسبیح کے بے شمار دانے ہیں وہ بوڑھا کسان ایک بوڑھا پجاری ہے، اس آگ میں عنبر اور لوبان جل رہا ہے جس کا دھواں اُمڈ اُمڈ کر سارے معبد کو معطر کر رہا ہے۔ یہ نیک نفس روحیں ہیں، یہاں ابدی سکون ہے اور خدا کا رحم"۔ (آنگی)

"اس کے دل پر ایک عجیب اداسی چھا جاتی ہے اور وہ سوچتا ہے کہ شاید کسی نیلے جھرنے پر ریوڑ کو پانی پلاتے ہوئے ایک غریب لڑکی اس کا انتظار کر رہی ہے، اس کے پاؤں ننگے ہیں، اس کی نگاہیں اداس ہیں، اس کے بالوں میں سیب کے پھولوں کا ایک گچھا ہے"۔ آنگی۔

"یہاں ہوا میں جاں بخش خنکی تھی اور ایک عجیب سی خوشبو، کچھ کچھ اوزون سے ملتی جلتی ہوئی، اور گو ہم آبشار سے ڈیڑھ دو سو گز کے فاصلے پہ تھے۔ پھر بھی آبشار کی ہلکی ہلکی پھوار ہم پر پڑ رہی تھی، پانی کی چھوٹی چھوٹی بوندیں لاکھوں، کروڑوں، ان گنت شبنم کے حسین قطروں کی طرح درختوں کے پتوں پر، جھاڑیوں کی جھکی ہوئی شاخوں پر، بنفشہ کے شرمائے ہوئے پھولوں پر پڑ رہی تھیں، آبشار کے قریب ہی جہاں یہ نیچے چٹان میں غائب ہو رہا تھا، ایک خوشگوار ہلکا سا دھواں اٹھ رہا تھا اور اس کے بیچ میں ایک دلکش قوس قزح تنی تھی۔ مدہم اور رنگین، یہ قوس قزح ہر لمحہ ٹوٹ جاتی اور ہر لحظہ ٹوٹ کر نئی بن جاتی تھی۔ . . . . وہ چٹان بالکل آبشار کے نزدیک، اس چٹان پر پتھر کی دو کرسیاں بنی ہوئی تھیں، ان پر جہانگیر اور نور جہاں دوپہر کے بعد بیٹھا کرتے تھے . . . . پتہ نہیں رہبر کیا کہہ رہا تھا۔ لیکن میری آنکھوں سے صدیوں کا پردہ ہٹ گیا تھا، میں اپنے سامنے ان دو کرسیوں پر بیٹھے ہوئے جوڑے کو دیکھ رہا تھا، ایک تھا جہانگیر بادشاہ، شہزادہ سلیمؒ انارکلی کا عاشق، اور دوسری ہندوستان کی ملکہ تھی نور جہاں . . . . وہ ایک جامِ ارغوانی ہاتھ میں لئے ملکہ کے قریب جھک کر کیا کہہ رہا تھا؟ اور ملکہ مسکرا کر اسے کیا جواب دے رہی تھی؟ کیا اسی جانفزا پھوار کے قطرے اس ارغوانی جام میں ٹپک رہے تھے اور کیا ملکہ کی بل کھاتی ہوئی زلفیں اسی پھوار کے موتیوں سے گندھی ہوئی تھیں"۔ (لاہور سے بہرام گلہ تک)

کرشن چندر کی تیسری خصوصیت اُن کی آدرشی ہیروئن ہے۔ یہ ہیروئن اُن کے تقریباً ہر افسانے میں اپنے حسنِ صبیح، سادہ فطرت معصوم جذبات، بھولی اداؤں اور غزالیں آنکھوں کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ ان کی کوہستانی محبوبہ ایک خودرو پھول ہے جو نسیم شمال کے ہلکے ہلکے جھونکوں میں کھلتا اور اپنی روح افزا خوشبو سے دامن کوہ کی کسی حسین بستی کی فضا کو معطر کر دیتا ہے۔ اسے اس فریب کار دنیا کی ہوا تک نہیں لگی۔ وہ عموماً ایک پردیسی سے محبت کرتی ہے۔ شاید اس لئے کہ وہ اس کی سادہ محدود اور پرسکون دنیا میں یکایک نمودار ہو کر اپنی نمایاں اور دلکش شخصیت سے ایک انقلاب، ایک تلاطم پیدا کر دیتا ہے۔ وہ پردیسی کو چاہتی ہے اور ایک معصوم اور بے لاگ جذبے کی پوری شدت سے چاہتی ہے لیکن پردیسی آخر پردیسی ہے اور اس وارفتگی کا نتیجہ وہی ہوتا ہے جو ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے یعنی ٹریجڈی۔ زیر نظر افسانوں میں پکھنی۔ آنگی۔ رُکمن۔ اور بگی ایک ہی کردار کی چار الگ الگ صورتیں ہیں۔ شاما ان سے کچھ زیادہ مختلف نہیں اور ناؤ والی دوشیزہ، تالاب کی حسینہ اور گوماں کی تخلیق بھی اسی لطیف مادے سے کی گئی ہے جو پہلی چاروں کی بناوٹ میں صرف ہوا۔ وہی حسنِ صبیح، وہی چشمِ غزالیں، وہی فطرتِ معصوم، تصنع سے مبرا، تکلف سے پاک، تمدن سے دور۔

ہمیں بارہا یہ خیال آیا ہے کہ یہ نوجوان افسانہ نگار جس کی عمر کا بیشتر حصہ شہر کے ہنگاموں اور جلوہ زاروں میں بسر ہوا، اپنی ہیروئن کی تلاش میں آخر کوہ و صحرا کا رخ کیوں کرتا ہے۔ کیا وہ دلفریب تیتریاں جن کے رنگ و بو سے ہماری سوسائٹی کی فضا معمور ہے اس کی نگاہِ شوق کو دعوت نظارہ نہیں دیتیں۔ کیا وہ حسنِ برق پاش جس کی ضیا افروزیوں سے شہر کے تنگ و تاریک مکان روشن ہیں، کسی جھلملاتی ہوئی چلمن سے نکل کر اس کے خرمنِ دل کو آتش اندوز نہیں کرتا۔ مگر نہیں نہیں، کرشن چندر ایک فن کار ہے۔ وہ جس پھول کو خود سونگھ نہیں سکتا، اس کی خوشبو سے ہمارے مشامِ جان کو کیونکر معطر کر سکتا ہے۔ ہماری شہری معاشرت ایک بے جان تمثیل ہے جس میں عورت کا وجود ایک ہیولے کی طرح ہے، ایک پُراسرار اور گریزاں سائے کی طرح پھر ایک آرٹسٹ

کے لئے کیوں کر ممکن ہے کہ وہ اسے حقیقت کا لباس پہنا کر ہمارے سامنے لے آئے وہ اس کی فطرت کی پہنائیوں اُس کے جذبات کی گہرائیوں اور اس کی ہستی کی بوقلموں کیفیتوں سے کس طرح آشنائی حاصل کرے۔ پھر کیا تعجب ہے کہ کرشن چندر اپنی ہیروئن اُس دختر فطرت کو بنانے میں جس کی بڑی بڑی رسیلی آنکھوں میں وہ خود جھانک کر اس کے اضطراب دل کی کیفیتیں دیکھ سکیں، جس کی شہد جیسی میٹھی سانس کو وہ آپ محسوس کر سکیں اور جس کی مسرتیں اور غم اس کے نقرئی قہقہوں اور نم دار آنکھوں سے بے اختیار ٹپک پڑیں۔ ہماری ناچیز رائے میں افسانہ نگار کا یہ حسن انتخاب اس کے افسانوں کے رومانی پہلو کو ایک مستقل زندگی عطا کرتا ہے۔

کرشن چندر کی چوتھی خصوصیت اُن کی لطیف حسِ مزاح ہے جس کا ایک ہلکا سا اشارہ افسانے کی فضا میں ایک ایسا نرم و نازک تموّج پیدا کر دیتا ہے جیسا کبھی ایک ساکن سطح آب پر ایک چھوٹے سے کنکر کے گرنے سے دیکھنے میں آتا ہے۔ اپنے افسانوں میں وہ بعض دفعہ ایک مشکل صورت حالات یا ایک نازک لمحے کو اسی مزاح کی ایک خفیف سی نمود سے ایسی خوبصورتی سے حل کر دیتے ہیں کہ انسان حیران رہ جاتا ہے۔ امجد ایک نوجوان کا قصہ سنا رہا ہے جسے کتے نے کاٹ کھایا تھا بظاہر یہ کہانی مبالغہ آمیز ہے لیکن دیکھئے وہ اس کا کس طرح یقین دلاتا ہے۔

"دس پندرہ روز یوں ہی جلدی جلدی پیاز لگاتا رہا، پندرھویں روز اُسے یکایک بخار اور ہذیان ہو گیا۔ خدا کی قسم بستر میں پڑا پڑا چھت تک اچھل اچھل کر جاتا، میرے اللہ کتنا موذی مرض ہے، آدمی ہوا کا ایک جھونکا تک نہیں سہہ سکتا، سارا بدن کانپتا ہے، اور پانی! . . . پانی تو مطلق نہیں پی سکتا . . . . . دوسرے دن بیچارا اس دنیا سے کوچ کر گیا۔ یہ کہہ کر امجد نے اپنی آنکھیں اوپر چڑھا لیں اور چھت کی طرف دیکھنے لگا۔"

(مجھے کتے نے کاٹا)

"ڈاکٹر کے پیچھے پیچھے ایک نرس داخل ہوئی، میں نے ٹوپی اٹھا کر اس طرح سلام کیا کہ دونوں خوش ہو جائیں۔ دونوں خوش ہو گئے . . . . . "ہاں"، ڈاکٹر نے کہا زخم گو اتنا گہرا نہیں، پھر بھی ٹیکے تو آپ کو پورے چودہ روز لگوانے پڑیں گے" "صرف چودہ روز" میں نے نرس کے سرخ اور چمکیلے لبوں کی طرف دیکھ کر کہا۔ نرس مسکرا دی"۔ (ایضاً)

"یہ لڑکی گونگی ہے! یہ تو بہت ہی اچھا ہے، کیا کسی نے چغتائی کی تصویر کو بولتے دیکھا ہے، اگر تصویر، خاموش تصویر بول اٹھے تو اس کی آدھی شعریت، رنگینی اور سحر پروری فنا ہو جائے، کاش دنیا کی تمام حسین عورتیں گونگی ہوتیں"۔ (تالاب کی حسینہ)

"اب میں تار ملتے ہی یہ سوچ رہا تھا کہ مجھے گوربخش کی شادی پر جانا چاہیئے یا نہیں، آخر گوربخش دوست ہے اور دوست کی شادی باصورت ہر روز نہیں ہوا کرتی، اسی شش و پنج کا نتیجہ یہ ہوا کہ مجھے ناچار "جفت یا طاق" کے عملیہ کو کام میں لانا پڑا۔ ایک پیسہ چہرۂ شاہی کو اونچا ہوا میں پھینک کر اور چہرۂ شاہی کو شادی کا مبارک عنوان سمجھ کر میں خاموش ہو رہا۔ دوسرے لمحہ میں پیسہ زمین پر تھا اور چہرۂ شاہی میری طرف (دیکھ) دیکھ کر مسکرا رہا تھا"

(لاہور سے بہرام گلّہ تک)

"مگر جو عورت میرے بالکل مقابل بیٹھی تھی اور جو اپنی گود میں ایک چھوٹے سے بچے کو لئے تھی۔ وہ باقی عورتوں سے کہیں زیادہ بدصورت تھی وہ کبھی کبھی گھونگھٹ کی آڑ سے مجھے دیکھ لیتی تھی۔ اس دنیا میں ہر کوئی حسین کی تلاش میں ہے یہ تو میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ میں اس کی آنکھوں میں بچ گیا۔ بہر حال اس میں کوئی شک نہیں کہ میں بھی ایک حسین کی تلاش میں تھا۔ میں نے ٹائی کی گرہ ٹھیک کی اور لاری کے اندر چاروں طرف نگاہ دوڑائی، مگر آہ، اس مسافروں سے بھری ہوئی لاری میں جو اپنی زندگی کی شاہراہ پر بے تحاشا بھاگی جا رہی تھی۔ مجھے کہیں بھی رومان نظر نہ آیا، دل برداشتہ چہرے تھے اور حقے یا پھر تھانیدار صاحب کا مور چھل۔ میں نے ایک لمحہ کے لئے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور دل ہی دل میں کہا کہ اس لاری میں سب کچھ ہے مگر حسن ناپید ہے، دوسرے لمحہ میں جب میں نے آنکھیں کھولیں تو دیکھا کہ کم عمر بدصورت عورت اپنے چھوٹے بچے پر جھکی ہوئی اُسے نہایت مدھم آواز میں میری گود میں چلے جانے کو کہہ رہی تھی"۔

(جہلم میں ناؤ پر)

"سچ کہنا، کیا تم نے کانن سے زیادہ خوبصورت اور باحیا لڑکی کہیں دیکھی ہے، خصوصاً جس دن وہ سپید ساری اور نقرئی کنارے

حُسن اور اوڈین



یہ دونوں لازم وملزوم ہیں۔ جہاں ایک جاتا ہے دوسرا ضرور ساتھ جاتا ہے۔

اوڈین کریم اور سنو کے متواتر استعمال سے صحت مند جلد سے پیدا ہونے والے حُسن میں وہ دلفریبی پیدا ہوتی ہے جو بچپن سے لے کر آخر عمر تک برقرار رہتی ہے۔

اوڈین کریم ہر شب جلد پر مالش کئے جانے سے مسامات کو صاف کرتی ہے۔ کھُردرے پن کو دور کرتی ہے اور نیچے کی دوسری جلد کے مسامات میں داخل ہو کر ان کو نئی زندگی بخشتی ہے اور خون کی گردش تیز کرتی ہے جس سے جلد میں خوشنمائی اور قوت پیدا ہوتی ہے۔

اوڈین سنو اگر دن کے وقت استعمال کی جائے تو وہ جلد کو گرمی۔ سردی۔ ہوا اور مٹی کے اثرات سے بچاتی اور محفوظ رکھتی ہے۔

اوڈین کریم اور اوڈین سنو

ہر شب مالش کے لئے ، — دن بھر حفاظت کے لئے

یہی دو چیزیں ہیں جن کی آپ کو حسن کی حفاظت کے لئے ضرورت ہے

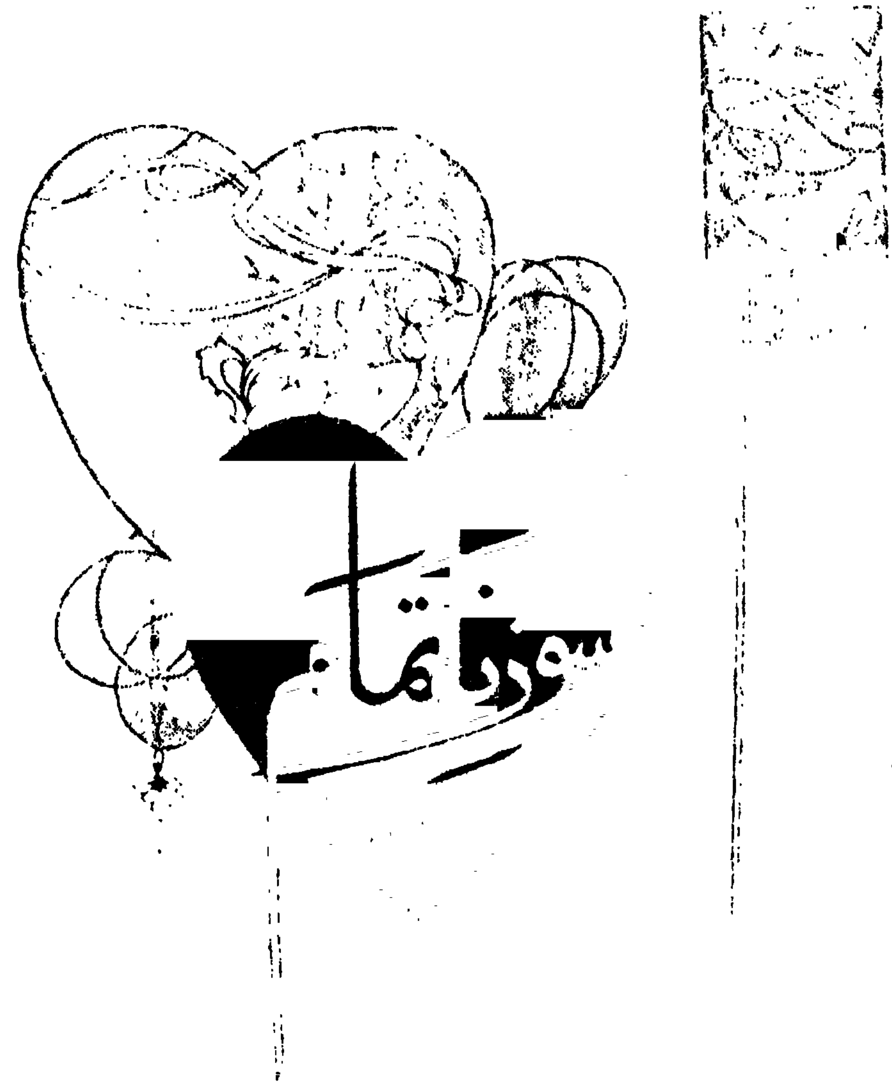
اگر آپ اوڈین کی تیار کردہ حُسن افزا اشیا کی خصوصیات سے ناآشنا ہیں۔ تو نیچے دیئے گئے کوپن کو کاٹ کر چھ آنے کے ٹکٹوں کے ساتھ بھیجئے

کوپن:۔ براہ مہربانی مجھے اوڈین کریم۔ سنو۔ صابن۔ پاوڈر بیس کے نمونے ایک پورے سائز کا شیمپو پوڈر اور اوڈین بیوٹی بک ارسال کیجئے۔ ان کے واسطے چھ آنے کا ٹکٹ بھیجتا ہوں۔(L . A . D)

نام ....

پتہ ....

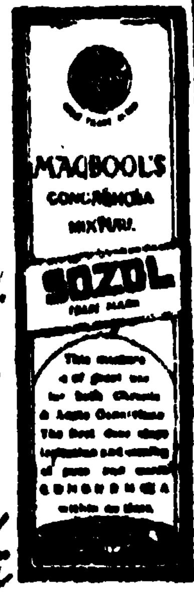
دی اوڈین کمپنی نمبر ۱۷ پرنسپ سٹریٹ کلکتہ L . A . D


سوزِ تمنا

ادبی دنیا مئی ۱۹۳۹ء



پیشاب کی تمام
خطرناک
بیماریوں کا تیر
بہدف علاج



سوزول

پہلی ہی خوراک کے استعمال سے پیپ جلن اور ٹیس بند ہو کر مرض بہت جلد نیست و نابود ہو جاتا ہے مرد و عورت دونوں کے لئے یکساں مفید ہے۔ بڑے بڑے میڈیکل افسران کی تصدیق کر چکے ہیں بالکل اطمینانی دوا ہے۔

قیمت فی بوتل ایک روپیہ چار آنہ محصول ڈاک آٹھ آنہ

سول ایجنٹ:۔ دی مقبول ایجنسی ۵۸ محمد علی روڈ بمبئی نمبر ۳

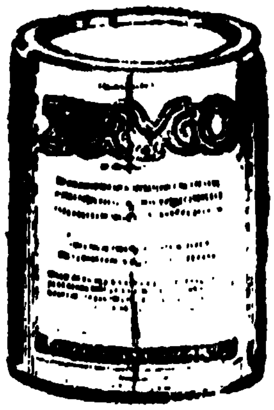
ہندوستان سنو

HINDOSTAN SNW



اگر آپ ہمیشہ ہندوستان سنو استعمال کریں گے تو یقیناً آپ کے چہرے کی جلد کبھی خراب نہ ہوگی بلکہ تازہ نرم اور گلاب جیسی ملائم رہے گی۔ ہندوستان سنو کے استعمال سے جلد کی کوئی مرض نزدیک نہیں آتی۔ گرمی کے موسم میں چہرے پر لگانے سے ٹھنڈک محسوس ہوتی ہے مچھر کے کاٹنے کے بعد ہندوستان سنو لگانے سے جلن دور ہو جاتی ہے گھر سے باہر نکلنے سے پہلے استعمال کیا کریں۔ سورج کی تپش اثر نہ کرے گی غرض ہندوستان سنو گالوں کو ملائم کرنے چہرے سے مہاسے اور جھریاں دور کرنے کے لئے بہترین سنو ہے ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں ایجنٹ درکار ہیں۔ مندرجہ ذیل پتہ پر خط و کتابت کریں۔

یونیورسل پرفیومری ورکس نمبر ۹۵ کابیکر سٹریٹ بمبئی نمبر ۳



ڈرائیکو

شیر خوار بچوں کے لئے شدید بیماری کے مریضوں کے لئے اور بیماری سے اٹھنے والے کمزوروں کے لئے

بہترین طاقت بخش غذا ہے

ڈرائیکو اعلیٰ درجے کے دودھ سے تیار کیا جاتا ہے اور اسے زود ہضم بنانے کے لئے چکنائی کی کچھ مقدار خارج کر دی جاتی ہے۔ الٹراوائلٹ شعاع کی مدد سے وٹامن ڈی بہتات کے ساتھ پیدا کئے جاتے ہیں۔

سول ایجنٹ

ایم اے نوبل نمبر ۱۱ پارسی بازار سٹریٹ فورٹ بمبئی



طاقت اور
تندرستی کے لئے
بچوں کو
ڈونگرے کا

بال امرت

پلانا چاہئے

اس کے استعمال سے بچوں کی کھانسی بخار رفع ہوتے ہیں۔

فہرست مضامین ادبی دنیا لاہور

بابت ماہ مئی سنہ ۱۹۳۹ء

جلد ۱۷ — نمبر ۵

تصاویر: ۱۔ چار مینار ۲۔ ساحل کی موج ۳۔ حیا ۴۔ نقش بہ دیوار

سالانہ چندہ مع محصول ڈاک و وی پی پانچ روپے ممالک غیر سے دس شلنگ

(گیلانی الیکٹرک پریس ہسپتال روڈ لاہور میں باہتمام صلاح الدین احمد پرنٹر و پبلشر چھپ کر دفتر ادبی دنیا مال روڈ لاہور سے شائع ہوا)

دُنیائے کاروبار

فلپس کی کتاب

اولاد ہی پر کسی خاندان کے بقا کا انحصار ہوتا ہے۔ لیکن ہندوستان میں اولاد کی صحیح تربیت نہیں کی جاتی۔ فلپس کی کتاب اس کمی کو پورا کرنے اور ماؤں کو صحیح معلومات بہم پہنچانے کی غرض سے شائع کی گئی ہے۔

اس کتاب میں وہ تمام احتیاط صاف اور سلیس زبان میں بیان کی گئی ہے۔ جو حمل کے دوران میں مختلف تکلیفوں کے لئے اگر کی جائیں۔ تو نہ صرف ماں مختلف امراض سے بچ سکتی ہیں۔ بلکہ پیدا ہونے والے بچے کی آئندہ صحت بھی قبیحہ جسمانی امراض سے محفوظ رہ سکتی ہے۔ از بسکہ بچہ حمل کے دوران میں اپنے دانتوں ہڈیوں اور شریانوں کی بناوٹ کے لئے تمام خوراک ماں ہی کے جسمانی نظام سے حاصل کرتا ہے۔ اس لئے ماں کی خوراک اور اس کی جسمانی صحت کا خاص خیال رکھا جانا چاہیئے۔ جی متلانا بھی اس حالت میں تکلیف دہ ثابت ہوتا ہے۔ اس قسم کی بہت سی مختلف تکلیفات کی وجہ تیزابیت ہوتی ہے۔ جس کی طرف بہت کم توجہ کی جاتی ہے اور جو مہلک اثرات پیدا کرتی ہے۔ غرضکہ دورانِ حمل میں حفظانِ صحت کے وہ تمام اصول پیشِ نظر رکھنے چاہئیں۔ جن کا تعلق نیند۔ پانی۔ صفائی۔ دانتوں کی حفاظت۔ اسقاطِ حمل۔ دفعیۂ قبض۔ بچے کے پیدا ہونے۔ پرورش اولاد۔ خوراک میں سبزیوں کا استعمال بھینس کے دودھ کا استعمال۔ بچوں کی خوراک کے متعلق معلومات اور احتیاط۔ بچے کی جسمانی ترقی کی علامات۔ انتڑیوں کو درست رکھنے کے طریقے بچے کے دانت وغیرہ وغیرہ سے ہے۔ ان تمام نقائص کو فلپس ملک آف میگنیشیا کس طرح دور کرتا ہے۔ اس کی تفصیل فلپس کی کتاب میں ملاحظہ فرمائیں۔ اور اپنی اولاد کی بنیاد اس بہترین اور عمدہ صحت پر رکھیں جس پر انسان کی اپنی اور اس قوم کی زندگی کا دارومدار ہے۔ اس کتاب میں ان لوگوں کے خطوط بھی ہیں۔ جو ملک آف مگنیشیا استعمال کر چکے ہیں۔ یہ چھوٹی سی خوبصورت کتاب آپ ایک خط لکھ کر میسرز نارٹن اینڈ میرس لمیٹڈ مرکنٹائل بلڈنگس۔ لال بازار کلکتہ سے بالکل مفت منگائیں۔

کیسے اُڑا؟ ایسے اُڑا!

بہت کم لوگوں کو یہ معلوم ہے کہ جہانگیر اور نورجہاں کی شہرۂ آفاق داستان حسن وعشق کی بنیاد اِن چار الفاظ پر ہے۔

اس افسانۂ رنگین کی تفصیل کے لئے منروا فلم کمپنی کی تازہ ترین فلم "پکار" ضرور دیکھئے جس میں شہنشاہ جہانگیر کی زندگی کے اس تاریخی افسانے کو پردہ سیمیں پر پیش کیا گیا ہے۔ اس فلم میں منروا کے دوسرے باکمال اداکاروں چندر موہن شیلا۔ سردار اختر۔ صادق علی وغیرہ وغیرہ کے ساتھ ساتھ نسیم کے رُوح پرور گانے بھی شامل ہیں۔ ڈائرکشن کے باکمال ہونے کی گارنٹی کے لئے سہراب مودی کا نام ہی کافی ہے۔

نیپچون انشورنس کمپنی لمیٹڈ۔ بمبئی

ہندوستان کی ان بیمہ کمپنیوں میں سے ہے جنہیں اپنے کام کی پائیداری اور اعزاز کی بنا پر خاص مرتبہ حاصل ہے۔ اس کمپنی نے ایسی شاندار ترقی کی ہے کہ حال ہی میں کمپنی نے اپنی بلڈنگ بنائی ہے۔ اور اس کا افتتاح کیا ہے۔ اس موقع پر بڑے بڑے ماہرین تجارت کے علاوہ صوبجاتی وزرا بھی موجود تھے۔ اور چند وزرا کی طرف سے تہنیت کے پیغامات وصول ہوئے۔ یہ بلڈنگ فن تعمیر کا ایک قابل تعریف نمونہ ہے۔ مسٹر جمن لال سیتلواڈ کے۔ ٹی نے اپنے ہاتھوں سے اس بلڈنگ کو کھولا۔ اور ایک مختصر سی تقریر میں اس کمپنی کے قابلِ تعریف کام کی ستائش کی۔ سیٹھ وٹھل داس ڈی گوردھن جو اس کمپنی کے چیئرمین ہیں، نے ڈائرکٹروں کا اور مہمانوں کی تشریف آوری کا شکریہ ادا کیا۔

اورینٹل گورنمنٹ سیکورٹی لائف انشورنس کمپنی لمیٹڈ

تمام ہندوستانی بیمہ کمپنیوں میں امتیازی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ امر باعث مسرت ہے کہ سال گذشتہ ۱۹۳۸ء میں اس کمپنی نے کل ۵۲۲۸۸ پالیسیاں حاصل کیں جن میں کل رقم بیمہ ۹۷۶۸۵۳۸۵ روپے ہے۔

صرف تین ہی ہفتہ میں آپ پر ثابت ہو جائے گا کہ



اوکاسا

آپ کو ایک نیا طاقتور آدمی بنا سکتا ہے

اوکاسا جرمنی کے ڈاکٹروں کی ایسی حیرت انگیز ایجاد کردہ دوا ہے کہ جس کے مقابلہ کی یا اس کے برابر اثر رکھنے والی دوسری دوا اب تک تیار نہیں ہو سکی۔ دنیا کے ہر ملک میں لاکھوں مرد و عورت اوکاسا کے استعمال سے اپنی تندرستی۔ زندگی۔ طاقت اور پوری جوانی دوبارہ حاصل کر چکے ہیں۔ ہر سال لاکھوں کی تعداد میں لوگ اوکاسا کا استعمال کر رہے ہیں اوکاسا کے اثرات کا راز اس میں ہے کہ اس کے استعمال سے جسم کے ہر حصہ کو فائدہ پہنچتی ہے۔ خصوصاً ان غدود یعنی گلینڈز جن پر تمام زندگی اور صحت کا دارومدار ہے یہ بات تصویر میں اچھی طرح ظاہر کی گئی ہے صرف تین ہفتہ کے استعمال سے معلوم ہو جائے گا کہ اوکاسا دراصل آپ کو ایک نیا طاقتور آدمی بنا دے گا۔ آپ کی طاقت۔ آپ کی صحت اور جوانی از سر نو واپس آ جائے گی۔ آپ کے چہرے پر رونق اور تازگی پیدا ہوگی۔ اور آپ کے جسم کی رگیں اور پٹھے اور تمام اعضا خصوصی طاقتور بن جائیں گے۔

اوکاسا اشتعال انگیز اور گرمی پیدا کرنیوالی دوا نہیں ہے

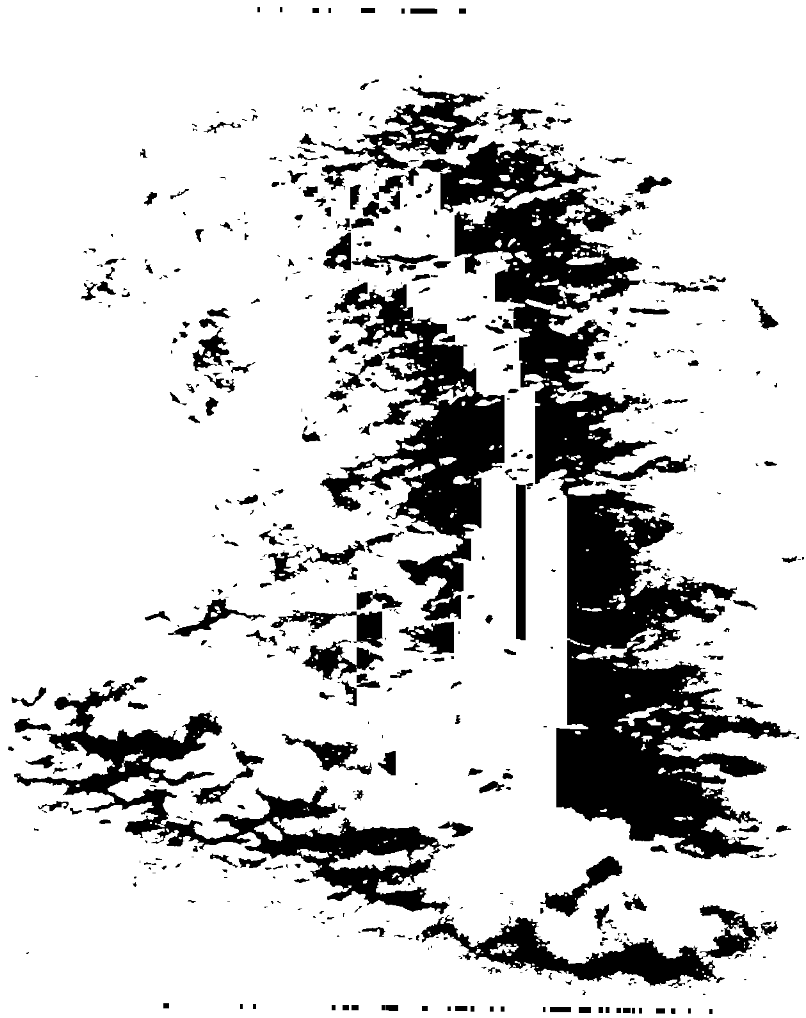
بر خلاف اور تمام طاقت کی دواؤں کے جن میں کشتہ جات۔ کچلہ۔ دھاتیں پڑی ہوئی ہوتی ہیں اوکاسا بالکل بے ضرر اور قطعی اشتعال انگیز یا گرمی کرنیوالی دوا نہیں ہے۔ کیونکہ اوکاسا میں کسی قسم کا کشتہ یا دھات یا کچلہ وغیرہ شامل نہیں ہے اوکاسا ان اجزا سے بنی ہوئی ہے۔ جن کو انگریزی میں گلینڈز کہتے ہیں۔ گلینڈز یا غدود۔ جیسا کہ تصویر میں دکھایا گیا ہے۔ آدمی کے جسم کا اہم ترین جزو ہیں اس لئے اوکاسا آپ کے گلینڈز کو طاقتور بناتا ہے۔ گرمی پیدا کرنے والی اور اشتعال انگیز نہیں ہے ہر حالت اور ہر موسم میں اوکاسا استعمال کر سکتے ہیں۔ اوکاسا کے متعلق مفصل کتاب آپ **مفت** طلب کیجئے

پتہ:۔ اوکاسا کمپنی برلن (انڈیا) لمیٹڈ پوسٹ بکس نمبر ۱۴۹۶ بمبئی

اوکاسا آج ہی استعمال کرنا شروع کر دیجئے



چار مینار



ساحل کی موج



نقش بہ دیوار



"حیا"

بزمِ ادب

مئی کا ادبی دنیا معمول سے بہت پہلے شائع ہو رہا ہے۔ دسمبر کے آخر میں سالنامے کی اشاعت کے بعد ماہوار پرچے ایک ایک ماہ کے وقفے سے شائع ہوتے رہے لیکن ہم نے ہر مہینے میں چند دن بچانے کی کوشش کی تاکہ عام نمبر مہینے کے آخر کی بجائے آغاز میں شائع ہو جائیں۔ خدا کا شکر ہے کہ ہماری کوششیں بار ور ہوئیں اور ماہِ رواں کا پرچہ اس وقت کہ مہینے کا آغاز ہے۔ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

زیرِ نظر نمبر کے دونوں علمی و ادبی مضامین ادارہ کی طرف سے پیش کئے جا رہے ہیں۔ "طلاق کی نفسیاتی اہمیت" ہندوستان کی مشہور سیاسی اور سوشل کارکن اور مفکر کملا دیوی چٹوپادھیائے کا ایک معرکتہ الآرا انگریزی مضمون ہے جسے ایڈیٹر نے اردو کا لباس پہنایا ہے۔ اس تحریر کی خیال انگیزی شاید بعض ناظرین کے لئے ذہنی بے چینی کا سامان مہیا کرے لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض ایسے سماجی مسلمات جو ہم پر پیرِ تسمہ پا کی طرح مسلط ہو رہے ہیں۔ ان کا جادو کچھ اسی قسم کی جرأت آموز اور فکر انگیز نشتروں سے ٹوٹے تو ٹوٹے۔ امید ہے کہ یہ مضمون غور اور دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔

رفیق میرا جی نے دو رنگ کے سلسلے میں اس بار یونان قدیم کی شاعرہ سیفو کو ناظرین سے روشناس کرایا ہے۔ سیفو کا کلام کمیاب بلکہ نایاب ہے۔ منصور احمد مرحوم نے اس کے چند منتشر اشعار کا پاکیزہ ترجمہ ۱۹۳۶ء کے سالنامے میں شائع کیا تھا جو بے حد مقبول ہوا تھا۔ مرحوم سیفو کے متعلق ایک بسیط مضمون لکھنا چاہتے تھے لیکن دستِ اجل نے انہیں مہلت نہ دی۔ آج جبکہ انہیں دنیا سے سدھارے پورے دو سال ہوتے ہیں۔ میرا جی نے ان کی یاد میں یہ مضمون لکھ کر ہمارے چھلکتے ہوئے آنسوؤں کو تھام لیا ہے۔

چونکہ دونوں مضامین ادارہ کی جانب سے ہیں اس لئے اس دفعہ کے بہترین مضمون کا انعام افسانوں کی طرف منتقل کر دیا گیا ہے اور دو بہترین افسانوں کے لئے دس دس روپے کے دو انعامات دئیے جا رہے ہیں۔ اپندر ناتھ اشک کا افسانہ "یہ مرد" اور انور اعجاز صاحب کی کہانی "منزل" دونوں اپنی اپنی جگہ بہت کامیاب ہیں اور اس نمبر کے بہترین افسانے قرار دئے گئے ہیں۔ اس سلسلے میں ہمیں یہ کہتے ہوئے افسوس ہوتا ہے کہ ہمارے اہلِ قلم حضرات سنجیدہ اور اعلیٰ پایہ کے علمی و ادبی مضامین کی طرف بہت کم متوجہ ہوتے ہیں۔ حالانکہ زبان و ادب کی سب سے بڑی خدمت یہی ہے کہ اہلِ علم اور اہلِ ذوق اپنے مطالعہ اور تحقیقات کے نتائج کو آسان اور عام فہم زبان میں ناظرین تک پہنچائیں۔ امید ہے کہ ہمارے قلمی معاونین نظموں اور افسانوں کی بہ نسبت ادب کی اس صنف کی طرف پہلے سے زیادہ توجہ فرمائیں گے۔

موجودہ اشاعت سے "شام کی باتیں" کے عنوان سے ایک نئے اور دلچسپ سلسلے کا آغاز ہوتا ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ اس عنوان کے ماتحت فن کار جو باتیں کہہ سکتا ہے اور کہہ جاتا ہے وہ نہ افسانے میں کھپ سکتی ہیں اور نہ مقالے میں۔ اس سلسلے کی پہلی کڑی عشق اور ایک کارِ نمایاں نوجوان فن کار کرشن چندر کی صناعی کا ایک لطیف نمونہ ہے۔ اگلی کڑی ہمارے مکرم دوست شیخ عباد اللہ ڈھال رہے ہیں۔

حصۂ نظم میں اب کے دو خاص رُت کی چیزیں ہیں یعنی موسمِ بہار پر دو شگفتہ نظمیں جو حضراتِ شاد عارفی اور سحر رام پوری نے لکھی ہیں۔ یہ دونوں چیزیں آمنے سامنے چھپی ہیں۔ حسنِ تقابل سے لطف اٹھانا اب آپ کا کام ہے۔

صلاح الدین احمد

آئینۂ عالم

جاپان کی تعلیمی ترقی

ڈاکٹر ٹوبے کا قول ہے:۔

"جاپان سکولوں کی سرزمین ہے بلکہ وہ خود ایک بہت بڑا سکول ہے۔ دورِ حاضر کا یونان۔ جاپانی جو قدیم یونانیوں کی طرح فطرتاً تیز اور چاق و چوبند ہیں، اور جن کی خاموش اور رسا کن طبیعت ہر نئی اور عجیب بات کو سیکھنے کے لئے ہر وقت تیار رہتی ہے، دریائے علم میں اس طرح کودپڑتے ہیں جس طرح بطخیں پانی میں"۔

دنیا کے کسی اور ملک میں پرانے تمدن کی جگہہ نئی تہذیب کی آمد کا نظارہ اس قدر گوناگوں اور رنگین کیفیتوں سے معمور نہیں جس قدر کہ جاپان میں اور یہ انقلاب خواہ آپ اسے محض ظاہری کہیں۔ بڑی تیزی اور شدت سے کارفرما ہے۔ نئی طرز کی فلک نما عمارتیں جو بڑے بڑے شہروں میں نہایت سرعت سے بنتی چلی جارہی ہیں نئے نئے نمونوں کی بے شمار موٹر گاڑیاں، نیم زلفوں والی شوخ وطرار لڑکیاں، ناچ گھر، سرود خانے اور اس قسم کی اور خصوصیات جاپانی شہروں کو نہایت تیزی سے تبدیل کر رہی ہیں اور ثابت کر رہی ہیں کہ جاپانی اپنے آپ کو کیسی آسانی سے نئے سانچوں میں ڈھال لیتے ہیں۔

کئی صدیاں گذریں کہ چینی تہذیب و تمدن نے اسی طرح جاپان پر حملہ کیا تھا۔ یہاں آکر اگرچہ اس میں بہت سی تبدیلیاں ہو گئیں لیکن اس کے باقیات آج بھی جاپان میں موجود ہیں۔ عہد میجی (۱۸۶۸ء سے ۱۹۱۲ء تک) سے قبل کے نظامِ تعلیم میں چینی عنصر کافی حد تک پایا جاتا تھا لیکن اس کے بعد مغرب سے تعلیم کے جدید طریقے اخذ کئے جانے لگے اور آج تک یہ سلسلہ نہایت استقلال سے جاری ہے۔

"نکلتے ہوئے سورج کی سرزمین" میں مغربی تہذیب و تمدن کا داخلہ اس کی تاریخ کا ایک اہم ترین باب ہے۔ یہ عمل ایسے حالات میں اور ایسے عظیم الشان پیمانہ پر ہوا کہ یہ باب درحقیقت ایک نئے عہد کا آغاز بن گیا۔ لیکن ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ جاپان ایک قدیم ملک ہے اور جب مغربی تہذیب نے پہلے پہل اس میں قدم رکھا تو یہ پورے طور پر خوش آمدید کہنے اور اپنانے کے لئے تیار تھا۔

چینی رسم الخط اور کنفیوشسی کتابیں چین میں پہلے پہل تیسری صدی میں وارد ہوئیں۔ کتابوں کے ساتھ معلم بھی آئے خصوصاً کوریا کا رہنے والا ایک عالم "وانی" اور ایک چینی علامہ اچیکی۔ شہزادوں کے اتالیق بنا دئیے گئے اور ان کے بعد مدتوں تک ان کی اولاد درباری واقعہ نگاری کی خدمات انجام دیتی رہی۔ بدھ مذہب اس کے تین صدیوں بعد جاپان پہنچا اور بہت جلد تمام ملک میں پھیل گیا اور اس نے اہلِ ملک کے روحانی زاویۂ نگاہ پر نہایت گہرا اثر ڈالا۔

اس زمانے میں پڑھنا پڑھانا شہزادوں اور نواب زادوں تک محدود تھا۔ یہ حالت آٹھویں صدی تک جاری رہی جب کہ عام تعلیم کا ایک نظام قائم کیا گیا۔ اور ضابطہ "تیہو" کے ذریعہ اس کا وسیع پیمانے پر اجراء عمل میں لایا گیا۔ اس ضابطے میں ایک مرکزی کالج "دیگاکو" اور بہت سے صوبجاتی مدارس "کوکوگاکو" کے قیام کی دفعات شامل تھیں۔ جن کی بنا پر یہ تعلیم گاہیں چینی نظامِ تعلیم کے نمونوں کے مطابق جاری کی گئیں۔ بعد میں متعدد نوابی خاندانوں اور بدھ مبلغوں نے مختلف اضلاع میں پرائیویٹ کالج اور درسگاہیں بھی قائم کیں۔ لیکن ان میں صرف اعلیٰ

تعلیم الاٰین کے نونہال داخل کئے جاتے تھے اور یہ طالب علم صرف چینی کلاسیکی علوم کی تحصیل کرتے تھے۔

اس کے بعد آشی کاگا کا دورِ تعصب آیا۔ جب کہ وولداروں ——— کانا کاوا لائبریری اور آشی کاگا سکول ——— کے سوا باقی تمام تعلیمی اداروں کی حالت خراب ہو گئی۔

اب کنفیوشس[1] ازم جاپان تک عالم رہبرانِ دین سے مختص تھی میلان میں آئی۔ اس نے ایک نئی بنیاد پر اپنے قدم جمائے۔ اور چینی علوم اور تمدن کی نشر و اشاعت کے لئے اعلیٰ پایہ کے متعدد معلم اور ماہر پیدا ہو گئے۔

یہ عہد توکاگاوا کا واقعہ ہے۔ اس عہد کے اختتام تک ٹوکیو میں جو اس وقت ایڈو کہلاتا تھا تحصیل علوم کا ایک معقول نظام قائم ہو گیا اور اس کے فوراً بعد مختلف قبائل نے اپنے بچوں کی تعلیم کے لئے مختلف قبائلی مدارس جاری کر دیئے۔ یہ مدارس جن میں فوجی اور مدنی دونوں قسم کی تعلیم دی جاتی تھی۔ دو سو ستر کی تعداد تک جا پہنچے۔ تب سے عوام کی تعلیم کو "تیراکویا" مدارس کے ذریعے سے فروغ ہونے لگا۔ ان مدارس میں گرد و نواح کے بچوں کو روزمرہ کی عام باتوں اور ابتدائی اخلاقیات کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اور یہی مدارس ۱۸۶۷ء تک ابتدائی تعلیم پھیلانے کا واحد ذریعہ تھے

۱۴ مارچ ۱۸۶۸ء کو شہنشاہ میجی نے خرم کے سامنے "پانچ اصولوں کے شاہی فرمان" کی قسم کھائی۔ پانچویں اصول کا مفاد یہ ہے کہ "علم و حکمت کو دنیا کے ہر گوشے میں تلاش کرو[2]۔ تاکہ سلطنت کی بنیادیں مضبوطی سے قائم ہو جائیں" یہ عقیدہ نئی سلطنت کی قومی بنیاد بن گیا۔

عہدِ تجدید کے آغاز ہی سے نئی حکومت نے تعلیم عامہ کے فروغ کے لئے ایک سرگرم مہم جاری کر دی۔ سینکڑوں تعمیر شدہ مدرسوں میں درس و تدریس کو نئی زندگی ملی اور دار السلطنت ٹوکیو میں ایک امپیریل یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا۔ ۱۸۷۱ء تک اداراتِ حکومت میں محکمۂ تعلیم کا اضافہ ہو چکا تھا اور ۱۸۷۲ء میں اس محکمہ نے ایک مکمل تعلیمی نظام کا نفاذ کیا جو آج تک تعلیماتِ جدیدہ کی اساس کا درجہ رکھتا ہے۔

۱۸۹۰ء میں شہنشاہ نے اپنا وہ مشہور و معروف فرمان جاری کیا جس کی رو سے قطعی طور پر ملک کی اخلاقی تعلیم و تربیت کی بنیاد رکھی گئی اور جو آج ہر جاپانی بچے کے سینے میں محفوظ ہے کیونکہ وہ اسے ہر اہم موقعہ اور تقریب پر سنتا ہے۔ اس فرمان کا ترجمہ حسب ذیل ہے: "اے ہماری رعایا۔ تمہیں جاننا چاہئے کہ ہمارے شاہی اسلاف نے ہماری سلطنت کو ایک نہایت وسیع اور ہمیشہ باقی رہنے والی بنیاد پر قائم کیا اور نیکی اور اچھے اخلاق سے اس کی تعمیر کی۔ اور ہماری وفادار رعایا کے لوگ نسلاً بعد نسلٍ آپس کی محبت کے ذریعے سے متحد ہو کر ان زریں اصولوں کی خوبی کا ثبوت دیتے رہے۔ ہماری سلطنت کی بنیادی خصوصیات کی عظمت کا راز اسی محبت میں پنہاں ہے اور ہماری تعلیم کا سرچشمہ بھی یہی محبت ہے۔ پس اے ہماری وفادار رعایا تم لوگ اپنے والدین اور اپنے بہن بھائیوں سے پُرخلوص محبت رکھو اور شوہر اپنی بیویوں سے اور بیویاں اپنے شوہروں سے نہایت رواداری اور سازگاری کا برتاؤ کریں۔ اور دوست دوستوں کے وفادار رہیں۔ اے لوگو اعتدال اور حیا کا دامن ہاتھ سے کبھی نہ چھوڑو اور اپنی مہربانیوں کا دائرہ اتنا وسیع کرو کہ سب لوگ اس میں آ جائیں۔ علم و فن کی تحصیل میں جی لگاؤ اور ان سے اپنی ذہنی اور اخلاقی قوتوں کو ترقی دے کر اوجِ کمال پر پہنچاؤ عوام کی بہتری اور سب کے مشترکہ فائدے کے لئے کوشش کرو۔ ملک کے آئین و قوانین کا احترام کرو اور جب کبھی ضرورت پڑے اپنے آپ کو حکومت کی خدمت کے لئے پیش کر دو اور اس طرح ہمارے اورنگِ شاہی کی جو زمین اور آسمان کے ساتھ پیدا کیا گیا تھا۔ عظمت و شوکت کے قیام اور فروغ میں حصہ لو۔ ایسے چلن سے تم نہ صرف ہماری رعایا کے نیک اور وفادار افراد بن سکو گے بلکہ اپنے آباؤ اجداد کی شاندار روایات کو بھی قائم رکھ سکو گے۔

یہ طریقے جو یہاں بتلائے گئے ہیں۔ ہمارے عظمت مآب اسلاف نے نافذ فرمائے تھے تاکہ ان پر اُن کے جانشین اور اُن کی آنے والی رعایا یکساں کاربند ہو۔ یہ شرع ہر زمانے اور ہر مقام کے لئے درست اور ہر خطا سے بالاتر ہے۔ ہماری آرزو ہے کہ ہم خود اور ہماری رعایا نہایت احترام سے اسے اپنے دلوں میں جگہ دے۔ تاکہ ہم سب خیر و خوبی کے اعلیٰ مدارج حاصل کر سکیں"۔

جاپانی نظامِ تعلیم کی بنیاد یکسر اس منشورِ شاہی پر رکھی گئی ہے اس لئے بچوں کی تعلیم میں خالص درسی چیزوں کی بہ نسبت اخلاقی امور پر بہت زیادہ توجہ دی جاتی ہے۔

۱۸۹۰ء کے بعد جاپان میں ترقی تعلیم کی رفتار بہت

---

[1] کنفیوشس کی تعلیم مذہبی [2] "اطلبوا العلم ولو کان فی الصین"۔ حدیث قدسی۔ ایڈیٹر

ب وہاں ایک ایسا تعلیمی نظامِ تعلیم قائم ہے جو کسی اعلیٰ درجہ کے مہذب مغربی ملک کے نظام سے کسی صورت میں کم نہیں۔ موجودہ نظام کی سب سے نمایاں خوبی یہ ہے کہ اس میں مشرقی اور مغربی دونوں تمدن اپنی خوبیوں کے ساتھ جلوہ گر ہیں اور اس کی بنیاد جاپان کے قومی اداروں کی خوبصورتی پر قائم ہے۔ اس میں ایک طرف تو فرانس اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے نظامِ تعلیم کی خصوصیات پائی جاتی ہیں اور دوسری جانب کنفیوشس کی تعلیمات کے نمایاں پہلو بھی برقرار رکھے گئے ہیں۔ یہ مخلوط نظام نئے دورِ حکومت کے آغاز سے چار سال بعد اسی سال میں نافذ کیا گیا جس سال جبری فوجی خدمت کا نفاذ ہوا۔ اس سے ایک ہی سال پہلے نظامِ جاگیرداری کا خاتمہ کیا گیا تھا۔ آج کل تعلیم کا سارا نظم ونسق حکومت کے ماتحت ہے جس نے بعض شعبے مقامی اداروں یعنی میونسپلٹیوں وغیرہ کے سپرد کر رکھے ہیں جس سے مقصود یہ ہے کہ مقامی ضروریات کا ہر جگہ لحاظ رکھا جا سکے۔ چند شرائط کے ماتحت غیر سرکاری اداروں اور افراد کو بھی مدرسے اور تعلیم گاہیں جاری کرنے کی اجازت دی جاتی ہے۔ ملک بھر میں مختلف مدارج کے پینتالیس ہزار سکول ہیں جن میں ایک کروڑ پچیس لاکھ سے زاید طالب علم تعلیم پاتے ہیں۔

ابتدائی تعلیم اس ملک میں اس قدر ترقی کر چکی ہے کہ اس لحاظ سے امریکہ اور یورپ کے بہت کم ممالک جاپان کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ ابتدائی تعلیم کے مقاصد کے متعلق جاپان کا نقطۂ نظر مندرجۂ ذیل الفاظ میں بہت اچھی طرح ظاہر کیا گیا ہے۔ "پرائمری تعلیم کا منشا یہ ہے کہ بچے کی معمولی نشوونما اور قومی اخلاق و ضروریات کا پورا لحاظ رکھ کر بچے کو ایسی علمی اور فنی تربیت دی جائے جو اُسے زندگی میں اپنی جگہ لینے کے قابل بنا دے"۔ جاپان میں پرائمری مدارس کی تعداد پچیس ہزار اور طالب علموں کی تعداد ایک کروڑ بارہ لاکھ کے قریب ہے۔ ۱۸۷۲ء کے قانون کے مطابق ہر جاپانی بچے کے لئے چاہے وہ لڑکا ہو یا لڑکی امیر ہو یا غریب چار سال تک کسی مدرسے میں تعلیم حاصل کرنا ضروری قرار پایا تھا۔ بعد میں یہ مدت چھ سال تک بڑھا دی گئی۔ اس قانون کے ماتحت ہر چھ سال کا بچہ مدرسے جانے پر مجبور ہے۔

تقریباً تمام ابتدائی مدارس میں ہر مضمون ملکی زبان میں پڑھایا جاتا ہے اور ابتدائی تعلیم کے عام ہونے سے لوگوں کے ذہنی اور اخلاقی نشوونما پر حیرت انگیز اثر ہوا ہے۔ ان پڑھ لوگوں کی تعداد اب صفر کے قریب پہنچ چکی ہے۔ اور جاپان ابتدائی تعلیم کے اس نظام پر جتنا فخر کرے کم ہے۔

اُن بیس لاکھ لڑکے لڑکیوں میں سے جو ہر سال پرائمری مدارس کا آخری امتحان پاس کر لیتے ہیں قریباً دس فی صدی لڑکے اور چھ فی صدی لڑکیاں ثانوی مدارس میں داخل ہوتی ہیں۔ یہ امر یاد رکھنا چاہئے کہ ثانوی مدارس اور کالجوں میں لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے علیحدہ علیحدہ انتظام ہے ثانوی مدارس کی تعداد دس ہزار چھ سو کے قریب ہے جن میں اکثریت مڈل سکولوں کی ہے اور نئے سکولوں کا کورس پانچ سال کا ہے اور ان میں جو مضامین رائج ہیں وہ یہ ہیں:- تاریخ - اخلاقیات - جاپانی زبان اور ادب قدیم چینی ادب - ریاضی - طبیعیات علم الاشیا کیمیا - قانون - معاشیات - صنعتی علوم ڈرائنگ - موسیقی اور جمناسٹک۔

لڑکیوں کے ثانوی مدارس میں جو لڑکوں کے مڈل سکولوں کے متقابل ہیں۔ چار اور پانچ سال کے کورس رائج ہیں۔ ان مدارس کی طالبات کی تعداد لڑکوں سے بھی زیادہ ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ لڑکوں کی ثانوی تعلیم پر کم توجہ دی جاتی ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ لڑکے معمولی مدارس کے علاوہ خاص پیشہ ورانہ درسگاہوں میں بھی تعلیم پاتے ہیں۔ لڑکیوں کے ان مدارس کی ایک دل آویز خصوصیت معاشرتی آداب وانداز کا کورس ہے۔ جس کے ضمن میں چائے تیار کرنے اور پلانے اور گھروں میں پھول سجانے کے مضامین بھی شامل ہیں۔ اس مقصد کے لئے ہر گرل سکول میں جاپانی طرز کے چند خاص کمرے ہوتے ہیں جنہیں آداب و انداز کی لیبارٹری یا تجربہ گاہ کہنا چاہئے۔

ثانوی مدرسہ میں تیرہ سال گذرنے کے بعد طالب علم یونیورسٹی میں داخل ہوتا ہے جہاں سے وہ تین یا چار سال کے بعد فارغ التحصیل ہو جاتا ہے اور اگر امتحانات پاس کرنے کے علاوہ کوئی طالب علم کسی خاص مضمون میں طویل اور دقیق مطالعہ کے ذریعے سے کوئی قابلِ قدر تحقیقات کرتا ہے تو اسے ڈاکٹری کی سند سے سرفراز کیا جاتا ہے۔ اور ایسے طالب علموں کو فارغ التحصیل طلبہ کی یونیورسٹی میں مزید مطالعہ کا موقع بھی دیا جاتا ہے بیشتر یونیورسٹیوں کے تحقیقاتی شعبے نہایت درجہ اہم ہیں اور جاپان کی ملکی اور علمی ترقیاں زیادہ تر انہی تحقیقاتی شعبوں کے مفید کام پر مبنی ہیں۔

جاپان میں چھ شاہی یونیورسٹیاں ہیں۔ ٹوکیو۔ کیوٹو۔ اوساکا۔ فوکاکا۔ سنڈائی اور سپوروو۔ جن میں سے ہر ایک میں کئی علمی اور فنی شعبے ہیں۔ ان کے علاوہ اس چھوٹے سے ملک میں ۱۳ سرکاری۔ ۲ پبلک۔ اور ۲۴ پرائیویٹ یونیورسٹیاں ہیں۔ اور یہ سب مل کر جاپان کے تعلیمی نظام کی آخری تکمیل میں حصہ لیتی ہیں۔

سائنس کی تعلیم پر جاپان میں خاص توجہ کی جاتی ہے۔ اور ابتدائی مدارس میں تعلیم کی اساس کتاب یا اُستاد کے بتائے ہوئے تجربوں کی بجائے طالب علموں کے کئے ہوئے تجربوں پر رکھی جاتی ہے۔ ادنیٰ مدرسوں اور طالب علموں کو عام اس سے کہ وہ شہری مدارس سے تعلق رکھتے ہوں۔ یا دیہاتی مدارس سے علمی تحقیقات پر آمادہ کرنے کے لئے اُن کی مختلف طریقوں سے حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ اس کا اثر یہ ہے کہ جاپان میں سائنس بہت تیز تیز قدم اٹھا رہی ہے اور بہت اچھے نتائج برآمد ہو رہے ہیں۔

بہت سے ممالک میں ریڈیو نے علم اور تہذیب کی روشنی پھیلانے میں بہت مدد دی ہے۔ اور جمہور کی تعلیم کے سلسلہ میں یہ ایک نہایت مؤثر اور کارگر ذریعہ ثابت ہوا ہے۔ جاپان میں براڈکاسٹنگ شرقی اور مغربی تہذیبوں کے ایک نہایت خوشنما اتصال کی مثال ہے۔

حال ہی میں جاپانی وزیر تعلیم نے اپنی ایک تقریر میں کہا تھا کہ جاپان کی براڈکاسٹنگ کارپوریشن ریڈیو کے تعلیمی پہلو پر بہت زیادہ توجہ دیتی ہے اور اس کے پروگرام عوام کی تعلیمی ترقی میں بے حد مفید ثابت ہو رہے ہیں۔ پہلے پہل ریڈیو کو صرف تفریح کا ایک ذریعہ سمجھا جاتا تھا لیکن اب وہ ہمارے قومی اخلاق کے فروغ اور جمہوری تعلیم کے نشوونما کے لئے ایک ناگزیر عنصر ہو گیا ہے اور پبلک عملی طور پر اس حقیقت کو تسلیم کر رہی ہے۔

(مترجمہ صلاح الدین احمد)

مسعود صوفی

شعر

دھوم ہے پھر بہار آنے کی
کچھ کرو فکر مجھ دِوانے کی

میر تقی

رباعیات

(۱)

کشتوں کو مٹا گئی محبت تیری
کشتوں کو جِلا گئی محبت تیری
نقشے ہیں ابھی آنکھوں میں عجب ڈھب کے
افسانہ بنا گئی محبت تیری

(۲)

ارماں ناتمام رو دھو گئی محبت تیری
بدنام تو کر گئی محبت تیری
کہتے ہیں جو لوگ ہم سمجھے بھی نہیں
اب جان سے گزرنے لگی محبت تیری

فراق گورکھپوری

تضمین

میرے لئے للہ بلا کیجئے اُس سے
جو کچھ وہ کہے مجھ کو سنا کیجئے اُس سے
اچھا کہ بُرا ہو کر مرا کیجئے اُس سے
یارو مرا شکوہ ہی بھلا کیجئے اُس سے
مذکور کسی طرح سے جا کیجئے اُس سے

خاموشی سے جان اور بھی گھبراتی ہے جی میں
تسکین کسی طرح نہیں پاتی ہے جی میں
چُپ اُس کی تو اور آگ لگا جاتی ہے جی میں
جوں جوں وہ رکے ہے تو یہی آتی ہے جی میں
پھر چھیڑیئے اور باتیں سنا کیجئے اُس سے

رُوٹھے ہوئے ہر چند ہم اُس بزم سے آئے
پھر دیکھ رہے ہیں کہ کوئی آکے بلالے
کیا کیجئے افسوس کہ مجبور ہیں جی سے
سو مرتبہ یوں ٹھیر چکی اب سے نہ ملئے
یوں بھی تو نہیں بنتی ہے کیا کیجئے اس سے

تم چارہ گر عاشق بیمار ہو صاحب!
تم مرہم زخم دلِ افگار ہو صاحب!
صورت سے مری کس لئے بیزار ہو صاحب!
بیزار اگر مجھ سے ہو مختار ہو صاحب۔
دل جس سے ملے اپنا بلا کیجئے اس سے

اے حضرت امجد نہ چلیں آپ کی گھاتیں
اس بازی الفت میں ہوئیں سینکڑوں باتیں
اب آپ ہیں اور آپ کی تنہائی کی راتیں
ہم کہتے نہ تھے دردِ میاں چھوڑ یہ باتیں
پائی نہ سزا؟ اور وفا کیجئے اس سے!

امجد حیدرآبادی

طلاق کی نفسیاتی اہمیت

مرکزی مجلس آئین ساز کے سامنے ہندو سوسائٹی میں طلاق کے جواز کے متعلق جو مسودۂ قانون آج کل پیش ہے اُس کے باعث اہل ملک کی توجہ اس مسئلہ پر مرکوز ہو گئی ہے۔ اگرچہ ہندوؤں کے لئے طلاق ایک بالکل نئی چیز نہیں ہے (کیونکہ ان کے بعض فرقوں میں اس کا رواج پایا جاتا ہے) تاہم ان کی روزمرہ کی زندگی میں اسے ابھی تک کوئی حیثیت حاصل نہیں ہے۔ اور کتابی آئین کے لحاظ سے تو اس کا کوئی وجود ہی نہیں۔ ہندوستانی عام طور پر طلاق سے ایک شدید قسم کی بیگانگی اور جھجک محسوس کرتے ہیں اور سوسائٹی میں اس بدعت کے رواج کے خلاف اپنی آواز بلند کر رہے ہیں۔ درمیانے طبقے کے ہندو بھی طلاق سے قطعی طور پر نا آشنا نہیں ہیں کیونکہ ان میں سے جو لوگ سول میرج ایکٹ کے مطابق شادی کرتے ہیں وہ چند شرائط کے ماتحت شادی فسخ کرانے کا حق بھی رکھتے ہیں لیکن ایسی مثالیں بہت کم یاب اور شاذ ہیں۔

بہت کم ایسے مسائل ہیں جن پر دنیا کے مختلف حصوں میں قانون اور رواج کا اس قدر اختلاف پایا جاتا ہو جس قدر طلاق کے بارے میں موجود ہے۔ ممالک متحدہ امریکہ ہی کو لیجئے۔ اس ملک کی مختلف ریاستوں میں طلاق کا قانون ایک میں کچھ ہے تو دوسری میں اس سے بالکل مختلف مثلاً جنوبی کیرولینا میں طلاق کا وجود ہی سرے سے غائب ہے اور اس کے مقابل نیواڈا میں طلاق فریقین کی باہمی رضامندی سے فوراً حاصل ہو جاتی ہے۔ اسی طرح یورپ کے مختلف ممالک میں بھی طلاق کا قانون بے حد مختلف ہے۔ اگر ایک طرف کیتھولک عقیدے کے پیرو ممالک میں طلاق کو بہت برا سمجھا جاتا ہے تو دوسری جانب سیکنڈنیویا میں باہمی رضامندی اس مسئلہ کو فوراً حل کر کے رکھ دیتی ہے۔ انگلستان میں طلاق اگر ایک مشین کے سے عمل کا نام ہے تو سویٹ روس میں اس مسئلہ کے حل کرنے میں فہم و خرد سے کام لیا گیا ہے۔

اس سے ظاہر ہے کہ ابھی ہم نے اپنی مجلسی زندگی کو سائنٹفک طریق سے بسر کرنا نہیں سیکھا اور نہ ہمیں اب اپنے قدیم آباؤ اجداد کے قدرتی طور طریقے ہی یاد ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ شادی بیاہ کا معاملہ دھندلے جذبات۔ مبہم مذہبیت اور غیر حقیقی روحانیت کا ایک گورکھ دھندا سا ہو کر رہ گیا ہے جس سے چھٹکارا پا کر شادی کے ایک صحیح اور معقول تصور تک پہنچنے کے لئے بہت سے ناقابل فہم تعصبات اور بیکار اُلجھنوں کے خارزار سے گذرنا پڑے گا۔

بنیادی مشکل یہ ہے کہ ہم نے ابھی تک شادی کا کوئی سائنٹفک اور معقول تصور قائم نہیں کیا۔ شادی کا پرانا تصور بھی اسے مذہبی طور پر مقدس تسلیم کرنے کے عقیدے عورت کی جسمانی اور اقتصادی کمتری اور بچوں کو خاندان کی واحد ذمہ داری سمجھنے پر قائم ہے۔ یہ خصوصیات کم و بیش قبیلے داری کی زندگی سے متعلق ہیں۔ لیکن ان تصورات کی جگہ نئے تصورات نے لے لی ہے اور پرانی معاشرتی صورتیں تیزی سے بدل رہی ہیں۔ جدید اقتصادی اور تعلیمی تصورات نے ہماری سوشل زندگی پر اپنا مخصوص اثر ڈالنا شروع کر دیا ہے اور ضرورت پیدا ہو گئی ہے کہ ہم اپنی زندگی کو جدید تر اور حقیقت سے قریب تر راہوں پہ چلائیں۔

شادی کا اولین مقصد خاندانی زندگی کی تہذیب و تنظیم ہے۔ جو آگے چل کر بچوں کی تولید اور ان کی تربیت کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ شادی کی یہی خصوصیت ہے جس کے باعث وہ انسان کی نظروں میں ایسی عدیم النظیر معاشرتی قدر و قیمت رکھتی ہے اس کی اہمیت اس کے جنسی پہلو سے پیدا نہیں ہوتی، ایسا ہو تو اس کے یہ معنی ہیں کہ ایک فریق کو دوسرے فریق پر واحد جنسی تفوق حاصل ہو جائے۔ شادی کا آئین اپنے پائے سے گر جائے اور حفاظت اور شخصی حقوق

نفاذ کا ایک گھمبیر سا نظام بن کر رہ جائے جو یقیناً شادی کا مقصد نہیں۔ بعض زناکاری کو طلاق کی وجہ جواز قرار دینے کا رواج جو انگلستان جیسے ممالک میں پایا جاتا ہے۔ اسی قسم کے تصور کا نتیجہ ہے اور اسی تصور سے شادی کا اصل مقصد فوت ہو جاتا ہے اور اس کی بنا پر ان ممالک میں اور بلکہ اس کی بہ نسبت طلاق کے بہت زیادہ جعلی مقدمات تیار کئے لئے جاتے ہیں بعض اوقات دونوں فریق مل کر ایک ایسا خفیہ افسانہ گھڑ لیتے ہیں جس سے فریقین میں سے ایک پر زناکاری کا الزام ثابت ہو جائے اور طلاق حاصل ہو سکے۔ اگر یہ قانون نابود کر دیا جائے تو ایسے بہت کم جوڑے نکلیں گے جو جنسی بے وفائی کے عذر پر طلاق حاصل کرنا چاہیں گے۔ اور جہاں کہیں طلاق کے لئے یہی وجہ پیش کی جاتی ہے۔ وہاں اکثر اوقات اس عذر لنگ کے پس پشت اور وجوہ ہوتی ہیں جو فریقین کے لئے متاہل زندگی کو ناقابل بسر بنا چکی ہوتی ہیں۔

وحدتِ ازدواج محض اس لئے مقبول نہیں کہ بیشتر اقوام کے نزدیک اسے قانونی درجہ حاصل ہے بلکہ دراصل عام انسانوں کے لئے یہ ایک قدرتی آسان اور سازگار طریق زندگی ہے۔ ایسے مطمئن اور مسرور گھرانوں میں بھی بعض اوقات خصوصاً لمبی جدائیوں کے دوران میں ایک یا دوسرے فریق سے اتفاقیہ طور پر جنسی بے راہ روی خارج از امکان نہیں۔ مگر اس سے شادی کی زنجیر کا یکسر توڑ دینا کیونکر لازم آتا ہے؟ انسانی جذبات بے حد عجیب ہیں اور اُن کے ہنگامی تاثرات بے حد مختلف لیکن ان کی وجہ سے کسی زوج یا حد کو اس حد تک قابلِ تعزیر سمجھنا کہ ایک جیتے جاگتے خاندان کو تباہ کر دیا جائے۔ ایک غلط اور غیر قدرتی اقدام ہے۔ اس طرح شادی فقط ایک جنسی تعلق ہو کر رہ جاتی ہے۔ اور قبضہ و اقتدار کے ایک خام اور عامیانہ خیال کو قانونی تقویت مل جاتی ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وسیع تر معاشرتی فرائض اور ذمہ داریاں ایک اندھے جذبے پر قربان کر دی جاتی ہیں۔ ہمارے سوشل نظام میں یہ ایک ایسا عنصر ہے جس کی حوصلہ افزائی سوسائٹی کو ہرگز نہیں کرنی چاہیئے۔

بیشتر حالات میں جہاں بچوں کا معاملہ درمیان ہو وہاں شادی کو ایک وسیع تر معاشرتی اہمیت حاصل ہو جاتی ہے بچوں کا مفاد [illegible] کا آئندہ تو لازمی طور پر ساری سوسائٹی کے لئے ایک اہم اور قابلِ توجہ امر ہے۔ یہ کسی ایک خاندان کا خانگی معاملہ نہیں اس لئے حکومت کے لئے جو سوسائٹی کے عملی اور تنظیمی بازو کی حیثیت رکھتی ہے یہ لازم ہے کہ وہ دخل انداز ہو کر بچوں کی حفاظت کا سامان کرے۔ کیونکہ بچوں ہی کے باعث فسخِ مناکحت ایک سماجی اور سیاسی مسئلہ بن جاتا ہے۔ ورنہ نہیں۔

سوسائٹی عام حالات میں جن جسمانی اور طبیعی امور کی بنا پر طلاق کو جائز قرار دیتی ہے وہ چند ناقابلِ علاج امراض مثلاً جذام اور دیوانہ پن اور عادی طور پر شراب خوری یا ارتکاب جرائم جیسی حرکات ہیں۔ کوئی صاحبِ فہم شخص جسے عام معاشرتی بہبود کا خیال ہوگا۔ مذکورہ بالا امور کی بنا پر طلاق کو بُرا نہیں سمجھے گا۔ ان میں دو اور ایسے امور کا اضافہ کیا جا سکتا ہے جن کی بہت سی عورتیں شکار ہو جاتی ہیں یعنی خاوند کا بیوی سے علیحدگی اختیار کر لینا اور اس کی کفالت سے ہاتھ کھینچ لینا۔ لیکن آج ہماری سماجی بیداری ہمارے روبرو ایسے اور عناصر بھی پیش کرتی ہے جو مذکورہ بالا وجوہات سے کسی طرح کم اہم نہیں ہیں بلکہ جو بیشتر حالات میں زندگی سے زیادہ گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ انسان محض گوشت پوست کا ایک چلتا پھرتا مجسمہ نہیں ہے بلکہ وہ سوچنے اور محسوس کرنے والے دل و دماغ بھی رکھتا ہے۔ دورِ حاضر کی زندگی پہلے سے بہت زیادہ گوناگوں اور پیچیدہ ہو گئی ہے۔ انسانی طبیعت کے بھی نئے نئے پہلو نکل آئے ہیں۔ اور ہمارے جذبات و احساسات روز بروز نازک تر اور ذکی تر صورتیں اختیار کر رہے ہیں۔

نہ صرف انسانی نظامِ جسمانی و ذہنی بلکہ نظامِ حکومت بھی ترقی پا کر پیچیدہ تر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ پرانے ضابطے اور آئین اور پرانی روایات موجودہ ضروریات کی کفیل نہیں ہو سکتیں کئی بار ایسا ہوتا ہے کہ دو افراد اپنے آپ کو ایک ایسے بندھن میں گرفتار پاتے ہیں جو اُن کے لئے روز بروز ناقابل برداشت ذلتوں کا موجب بنتا جاتا ہے۔ اب نہ جانے وہ کسی کے بہکائے سے اس میں گرفتار ہوئے تھے کوئی غلط جذبہ۔ کوئی نظر فریب نقش۔ کوئی فلک پرواز تخیل یا پھر نا عاقبت اندیش والدین یا بے درد رشتہ داروں کی سنہری روپہلی مصلحتیں ان کے ربط بے آہنگ کا باعث بنی تھیں۔ بہر حال سبب کچھ ہو نتیجہ بے حد افسوسناک ہوتا ہے۔

پھر ایک ایسا مرحلہ آتا ہے کہ وہ تقدس جو کبھی مناکحت کا خاصہ

جزو ہوتا ہے، خاک میں مل جاتا ہے۔ قدیم روایات سے شدید وابستگی کسی کے کام نہیں آتی۔ جس طرح بچوں کی خاطر عام طور پر طلاق سے احتراز مناسب ہے۔ اسی طرح بعض اوقات انہیں کی خاطر طلاق ازبس ضروری بھی ہو جاتی ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے رہبرانِ اخلاق طلاق کو گناہ کی پاداش سمجھنے میں اس درجہ منہمک ہیں کہ وہ اسے بچوں کے مفاد کے لئے ایک ضروری چیز سمجھنے سے قاصر ہیں۔

اس بات سے کون انکار کر سکتا ہے کہ جہاں بچے ہوں وہاں طلاق ایک مصیبتِ عظمیٰ کا درجہ رکھتی ہے۔ جدید علم النفس بچے کے لئے ماں اور باپ دونوں کے اثرات کا وجود بے حد ضروری قرار دیتا ہے۔ پس طلاق بچے کو زندگی کے ایک بنیادی اور حیات افروز عنصر سے محروم کر دیتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس کے یہ معنی ہیں کہ بچے کی فطرت میں شروع ہی سے خم پیدا ہو جائے۔ شاید اسی لئے بعض میاں بیوی ایک دوسرے سے ناخوش ہونے کے باوجود کنبے کو صحیح سلامت رکھنے کے لئے بہادرانہ کوشش سے کام لیتے ہیں اور اپنے آپ کو بچوں پر قربان کر دیتے ہیں۔ ہمارا فرض ہے اُن پر۔ مگر ایسا ہونا اُسی وقت ممکن ہے جب فریقین میں اپنی ذمہ داری کا ایک نہایت گہرا اور مشترکہ احساس ہو لیکن یہ احساس کئی جگہ مفقود ہوتا ہے اور زندگی باہمی الزام دہی اور چھوٹی چھوٹی لڑائیوں کے ایک ختم نہ ہونے والے سلسلے کا حکم رکھتی ہے۔ اور جب فریقین میں سے ایک فریق دوسرے پر اقتدار رکھتا ہے۔ تو ان خصوصیات کے علاوہ انتہائی ظلم و ستم اور زندگی کے ہر خوبصورت بلند اور خوش آیند پہلو کی تباہی یقینی ہے۔ کسی بچے کو ایسے ماحول میں زندگی بسر کرنے پر مجبور کرنا بھی انتہائی ظلم ہے۔ اور اسے اس سے بچانا ایک بڑے معاشرتی فرض کی بجا آوری ہے۔

ہاں جہاں بچے موجود نہ ہوں وہاں طلاق مذکورہ مشکلات کا ایک بالکل صاف اور آسان حل ہے۔ لیکن جہاں بچے موجود ہوں وہاں حکومت کا فرض ہے کہ ان کے مستقبل کی پوری نگہداشت کرے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ طلاق کو جیسا کہ آج کل دستور ہے، ایک مقدمے کی صورت میں منظرِ عام پر لایا جائے۔ یہ طریق انسانی جذبات اور ذہنی کیفیتوں کی سراسر توہین ہے۔ اُن افراد کے لئے جنہوں نے بہت سے شیریں لمحے تاریک ترین کیفیتوں میں بسر کئے ہوں۔ یہ کس قدر ہیبت ناک ہے کہ وہ عدالت کے کٹہرے میں کھڑے ہو کر ایک دوسرے پر محض اس لئے بیہودہ الزامات لگائیں کہ وہ آپس میں جدائی چاہتے ہیں۔ ایک ناگوار صورتِ حالات سے نجات حاصل کرنے کے لئے اتنی بڑی قیمت ادا کرنا یقیناً سراسر ظلم اور منشائے قدرت کے خلاف ہے۔ طلاق کی کئی مثالیں ایسی بھی ملتی ہیں جہاں لڑائی جھگڑے اور باہمی تلخی مطلق موجود نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس فریقین میں ایک صورتِ حالات کی ایک خاموش اور پروقار مفاہمت پائی جاتی ہے۔ بلکہ بعض جوڑے تو اُس زنجیر سے رہائی پا کر جو اتحاد کا رشتہ نہیں رہتی۔ ایک دوسرے کے بہتر دوست بن جاتے ہیں۔ مگر ہمارے قانون ساز ان تمام باتوں کو فراموش کئے بیٹھے ہیں۔ اُن کا اندازِ تفکر اور رویہ اس بارے میں نہایت غیر قدرتی اور مشین کے عمل سے مشابہت رکھتا ہے۔ وہ انسانی فطرت کو بھی ایک مشین سمجھتے ہیں جو ایک مقررہ فارمولے کے مطابق کام کرتی ہے۔

ہر فسخِ نکاح کی تہ میں ایک جذباتی تلاطم ضرور برپا ہوتا ہے۔ یہ احساس بعض اوقات جدائی کے ایک زبردست جھٹکے اور بعض دفعہ ایک شدید ذہنی انتشار کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ ایسے حالات میں ضروری ہے کہ نہایت احتیاط اور ملائمت سے کام لیا جائے۔ اور جہاں کہیں باہمی رضامندی سے طلاق طے پائے وہاں اسے مشتہر کرنے اور ہر قسم کی تکلیف دہ کارروائیوں سے گذارنے کی بجائے نہایت سکون اور خاموشی سے انجام پانے دینا چاہئے۔ باہمی رضامندی کی طلاق کو سوسائٹی کی رضامندی حاصل ہونی چاہئے مخالفت نہیں۔ شاید بعض لوگ یہ خیال کریں کہ ایسی روش سے فسخِ نکاح کی حوصلہ افزائی ہوگی۔ لیکن ہماری عام فہم و فراست اور اعداد و شمار اس مفروضہ کے خلاف ہیں۔ اس لئے کہ شادی محض جسمانی اختلاط اور عارضی جنسی کیف سے بہت بلند مرتبہ رکھتی ہے۔ وہ دو مختلف مزاجوں اور فطرتوں کا ملاپ ہے۔ ایک جال ہے جو قریب ترین صحبتوں اور ناقابلِ فراموش یادوں کے تار و پود سے بُنا جاتا ہے اسی لئے اس کا تصور دائمی رفاقت اور ہمدمی کے ایک خوشگوار مستقبل سے وابستہ ہے، اسی لئے یہ رشتہ بہت سے غیر معمولی صدمات کا کامیابی سے مقابلہ کر لیتا ہے اور اسی لئے آج ہماری سوسائٹی میں طلاق ایک قاعدہ نہیں بلکہ ایک استثنےٰ ہے۔

ہمارے سماجی نظام میں طلاق کی غیر موجودگی ایک ظالمانہ جنسی تعصب اور حقیقت ناشناسی کا اظہار کرتی ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ سوسائٹی اب تک غیر معقول پابندیوں سے بلند نہیں ہو سکی۔ اور یہ امر قدرتاً جنسیات کے متعلق سوسائٹی کے عام اندازِ نظر کو خراب کرتا ہے۔ اسی لئے جنسی طرزِ عمل کو سازگار ترین ماحول میں ایک مقصد کے حصول کا ذریعہ سمجھنے کی بجائے سماج مختلف جنسی کیفیتوں کی یک طرفہ اور من مانی قدریں مقرر کر دیتی ہے۔ وہیں سے اخلاقیات کے دوہرے معیار کی ابتدا ہوتی ہے اور مرد چونکہ یک طرفہ فیصلہ دینے کا مجاز ہے قرار دیتا ہے کہ اس کی جنسی زندگی کا کوئی اخلاقی پہلو نہیں ہے۔ لیکن عورت کی جنسی زندگی اخلاقیات سے سراسر وابستہ ہے۔ ہندو سماج اس اندازِ خیال کی ایک روشن مثال ہے کہ اس میں عورت اسی نقطۂ نظر کے ماتحت ہر قسم کی روایتی اور قانونی مضرات کی شکار ہے۔ پس ہماری صحیح سماجی ترقی کے لئے اس ملک میں طلاق کے ایک معقول قانون کے نفاذ کی اشد ضرورت ہے۔

(صلاح الدین احمد)

کملا دیوی چٹوپادھیائے

مراجعت

اڑ گئی بن کے تری جنتِ خیال کی وہ موج
ضبط جسے نہ کر سکا گل کا ضمیرِ آتشیں
آئی ہے لوٹ کے مگر جانبِ گل وہ بار بار
لوٹ کے تو کب آئے گا اے مرے خوابِ مرمریں!

سعید احمد اعجاز

غزل

رہروِ راہِ محبت کے لئے منزل نہیں
زندگی کا عشق حاصل، عشق کا حاصل نہیں

چشمِ ساحل آشنا، تجھ سا کوئی غافل نہیں
دیکھ طوفانِ اجل کی موج ہے ساحل نہیں

ابتدا میں ہر مصیبت پر لرز جاتا تھا دل
اب کوئی غم امتحانِ عشق کے قابل نہیں

قلزمِ ہستی ہے اصلی امتحاں گاہِ کمال
بحر کے طوفان کی ہر موج دریا دل نہیں

شعر کے پردے میں رازِ زندگانی فاش ہو
صرف لفظی شاعری کا وجد میں قائل نہیں

روتے روتے آنکھ میں آنسو کی بوند
گوہرِ نایاب بن کر رہ گئی
اس نظر سے تم نے کیوں دیکھا مجھے
ہر تمنا خواب بن کر رہ گئی

سکندر علی وجد

ابوالہول

بچھا ہے صحرا اور اس میں ایک ایستادہ صورت بتا رہی ہے ـــ ـــ نے مجھے یہ محسوس ہو رہا ہے۔
پرانی عظمت کی یادگار آج بھی ہے باقی! ابھی وہ آجائیں گے سپاہی،
وہ تند فوجیں
نہ اب وہ محفل، نہ اب وہ ساقی دلوں میں احکام بادشاہوں کے لے کے آجائیں گی افق سے
مگر انہی محفلوں کا اک پاسباں کھڑا ہے!
فضائے ماضی میں کھو چکی داستانِ فردا، ہوائے صحرا نے چند ذرّے کئے پریشاں
مگر یہ افسانہ خواں کھڑا ہے! ہے یا وہ فوجوں کی آمد آمد؟

زمانہ ایوان ہے خیال ہے، یہ فقط مرا اک خیال ہے، میں
یہ اس میں سُنا رہا ہے خیال سے دل میں ڈر گیا ہوں،
پرانے نغمے! مگر یہ ماضی کا پاسباں پُرسکون دل سے،
میں ایک ناچیز و ہیچ ہستی، زمیں پہ اک بے نیاز انداز میں ہے قائم!
فضائے صحرا کے گرم و ساکن، خموش لمحے،

میراجی

شام کی باتیں

عشق ــــ اور ایک کار

کل رات تعلیم یافتہ بے کاروں کے کلب میں اُپندر نے محبت کے موضوع پر ایک جذباتی تقریر کر ڈالی، محبت ایک جذبۂ الٰہی ہے۔ خدا اور سورج کی طرح محبت بھی نسل، قوم، ملک اور رنگت کی تمیز سے بالا تر ہے اور امیر اور غریب کو یکساں مسرت بہم پہنچاتی ہے، آہ، اُپندر نے آنکھیں اوپر چڑھا کر ایک تیز حسیاتی لہجے میں کہا "محبت تو فرشتوں کا جذبہ ہے۔ کل کائنات پر محبت کی حکمرانی ہے۔ محبت خدا کا بہترین عطیہ ہے۔ جو اپنی مخلوق کو بخشا گیا ہے۔ کل کائنات کا نظام محبت پر قائم ہے آہ! محبت!" یہ کہہ کر اپندر نے آنکھیں بند کرلیں اور چُپ ہو گیا، اُس نے سمجھ لیا کہ اُس کی تقریر کے بعد کلب کے کسی دوسرے ممبر کو تنقید و تبصرہ کرنے کی جراُت نہ ہوگی، کم از کم اس کی جراُت آمیز خاموشی یہی کہے دیتی تھی۔

یہ خاموشی چند ثانیوں تک طاری رہی، پھر راجندر نے دھیمے لہجے میں کہا "تمہیں کیا ہو گیا ہے اُپندر! کیا کرنا نے کوئی نیا تحفہ بھیجا ہے! کل تمہارے ہاں لکھنے کے ٹیبل پر میں نے ایک خوبصورت منقش میز پوش دیکھا تھا، کیوں!" اس پر اُپندر کا چہرہ کانوں تک سُرخ ہو گیا۔ سب لوگ ہنس پڑے۔ "اُف۔" اوپندر نے حقارت آمیز لہجہ میں جواب دیا، "تم لوگ بشریت کے بہترین جذبات کو پاؤں تلے کی مٹی میں ملا رہے ہو، اور اُن حقیقی چیزوں کو جن کی اساس روح پر قایم ہے۔ مادی چیزوں سے ملوث کر رہے ہو۔ آج . . . ."

لیکن بشیر سے نہ رہا گیا۔ وہ اُپندر کا چیلنج منظور کرتے ہوئے بولا، "تو اور کیا، محبت تو کیا دنیا کی ہر چیز مادیت سے منسلک ہے تم اس حقیقت کو محض ایک جذباتی تقریر سے نہیں جھٹلا سکتے، جذبات و حسیات کی دنیا مادے سے الگ نہیں بلکہ اسی کی مخلوق ہے، جو چیز گندے گوبر میں کیچڑ پیدا کرتی ہے وہی چیز مناسب ماحول پا کر تمہارے دماغ کی سلوٹوں میں محبت بن جاتی ہے۔ انگلز کی کتاب "اینٹی ڈیہرنگ" میں لینن نے بھی یہی لکھا ہے۔"

بشیر جیسا کہ بہت کم لوگ جانتے ہیں بحیرۂ ہند سے اس پار تیسرا صحیح الدماغ اشتراکی ہے۔ اور اس وقت ہندوستان میں پانچویں انٹرنیشنل (مزدوروں کی بین الاقوامی جماعت) کی بنیاد رکھنے میں مصروف ہے، اس لئے جب کبھی وہ کلب میں کسی موضوع پر اپنی رائے کا اظہار کرتا ہے۔ تو سوائے چند ایک سرپھرے ممبروں کے باقی سب اس کے ہم خیال بن جاتے ہیں اور اُپندر ان سرپھرے اراکین میں سے ایک ہے۔

"کیا واہیات بات ہے!" ہری نے کہا "محبت یقیناً کوئی ارضی چیز نہیں، بلکہ ایک آسمانی جذبہ ہے، ہاں، محبت ایک جذبہ ہے اور بس، اس کا مادے کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ بشیر نے اپنے حسی نقطۂ نگاہ سے جو نتائج برآمد کئے ہیں، وہ بالکل غلط ہیں، مثال کے طور پر اُپندر اور کرنا کے تعلقات کو ہی لے لو، یقیناً اُپندر اس بات کا برا نہ مانے گا اگر میں تشریح کے لئے اس کی مثال لے لوں۔ تو اب دیکھئے کہ کرنا اُپندر سے محبت کرتی ہے، والہانہ محبت! مجھے اس کا اچھی طرح پتہ ہے۔ لیکن یہ محبت ایک روحانی چیز ہے، ایک روحانی کشش ہے جو ان دو دلوں کو ایک دوسرے کے قریب کھینچ لائی ہے۔ کرنا کی محبت میں مادیت کی گنجائش نہیں، وہ ایک امیر لڑکی ہے، میرا مطلب ہے۔ کم از کم اُس کا باپ تو دولتمند ہے، اور اب دیکھئے کہ اس جماعتی تفریق کے باوجود وہ اس سے محبت کرتی ہے۔ اُسے اُپندر سے عشق ہے۔ اُسے اُپندر کے مضامین سے عشق ہے، یہ عشق یقیناً ایک لافانی کشش ہے۔"

"ج۔ س" نے اپنے حافظے پر زور ڈالتے ہوئے کہا۔ "لکھنے والوں

افسانوں کے مضامین کا ذکر کرتے ہو! میں اس بات میں ہری سے متفق ہوں، محبت ایک روحانی شے ہے، عورتیں مردوں سے اس لئے محبت نہیں کرتیں کہ وہ حسین یا امیر و کبیر ہوتے ہیں"۔

"کیا ہندوستان میں عورتیں واقعی محبت کرتی ہیں؟" کلب کے ایک زردرو ممبر نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ لیکن چونکہ سوال غیر متعلق تھا۔ اس لئے کسی نے اس کی بات کی طرف توجہ ہی نہ کی۔

"میں کہہ رہا تھا" ج۔س نے سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ (ج۔س آج کل اپنا زیادہ تر وقت نفسیاتی کتابوں کے مطالعے میں صرف کرتا ہے) "ہاں میں کہہ رہا تھا، میں کیا کہہ رہا تھا، ہاں ٹھیک، میں کہہ رہا تھا کہ عورتیں مردوں سے اس لئے محبت نہیں کرتیں کہ وہ حسین یا دولتمند ہوتے ہیں۔ ان کی سعی ناتمام یقیناً ایک روحانی جذبے کی تکمیل کے لئے ہوتی ہے، ذرا خیال فرمائیے کہ صالح عورتوں نے محبت کے مسئلہ میں ڈاکٹروں، انجنیئروں، ڈپٹی کمشنروں اور سرمایہ داروں اور دوسرے امیر طبقوں کے افراد کے مقابلے میں غریب ادیبوں، فوج کے سپاہیوں، مطبخ کے نوکروں اور فٹ بال اور کرکٹ کے کھلاڑیوں کو ترجیح دی ہے، عورتیں عشق کے معاملے میں اس مرد کا انتخاب کرتی ہیں جس میں کوئی غیر معمولی خصوصیات ہوں اور درحقیقت عورت کی محبت کو حاصل کرنے کا صحیح طریقہ بھی یہی ہے۔ کہ آدمی اپنی محبوب کی نظروں میں جگہ پانے کے لئے کوئی غیر معمولی بات کرے ادیب ہے تو ایک کروڑ الفاظ کا ایک بسیط مقالہ لکھے، کھلاڑی ہو تو ہاتھ پاؤں بندھا کر ایک تالاب میں زیادہ سے زیادہ عرصہ تک تیرنے کی کوشش کرے سپاہی ہو تو ــــ"

مجیب نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا "تو گھٹنوں کے بل بازار میں چلنے کی کوشش کرے"۔

ج۔س نے سنجیدہ لہجے میں کہا "میرا مطلب ہے کہ مرد کوئی ایسی بات ضرور کرے جس سے وہ اپنے محبوب کی نظروں میں غیر معمولی اور فوق الفطرت معلوم ہو، جیسے اس کے سر کے اردگرد کوئی روحانی ہالہ سا چمک رہا ہو، اب ڈیوک آف ونڈسر کی مثال لیجئے۔ ڈیوک . . ."

"لیکن ہم ایک ڈیوک آف ونڈسر بالکل نا کی بات نہیں کر رہے"۔

شیام نے بات کاٹتے ہوئے کہا، "ایک ڈیوک آف ونڈسر والی اور ایک گرتا یہاں کوئی خاص فرق نہیں پیدا کرتے۔ اگرچہ میرا اعتقاد ہے کہ اگر ہم محبت کا علمی تجزیہ کریں، تو اس تجزیے کے نتائج ان دو غیر معمولی مثالوں پر بھی اسی طرح منطبق ہوں گے جیسے دوسرے لوگوں کی محبت پر، بات یہ ہے کہ محبت کو آخر کیوں غور و فکر کی نگاہ سے نہ پرکھا جائے۔ اور یہ محبت کا ایک روحانی جذبہ ہونا تو محض ایک طفل تسلی ہے۔ عشق کو مادے کے ماحول میں رکھ کر اسی آسانی سے پرکھا جا سکتا ہے جیسے نیوٹن کے قانون حرکت کو یا انسانی جلد پر پسینہ پیدا ہونے کے عملیہ کو اور سچی بات تو یہ ہے کہ مرد ہمیشہ عورتوں میں ایک حسین چہرہ اور دلکش آداب کے جویا رہتے ہیں۔ اور اگر وہ ہندوستانی ہوں، تو ایک گراں قدر جہیز بھی چاہتے ہیں، اور عورتیں! عورتوں کو بھی عشق و محبت کے سلسلے میں جن خصوصیات کی تلاش ہوتی ہے ان کو روحانیت سے کم لگاؤ ہوتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ آپ ایک آرام دہ گھر، معقول آمدنی اور "حضور" "شوہر" کو "روحانی چیزیں" کہہ دیں۔ پس عشق کے صحیح نظریے میں روحانیت کے لئے کوئی جگہ نہیں، عشق کی اساس بھی انسانی زندگی کے دیگر محرکات کی طرح مادے پر قائم ہے۔ اور اسی طرح پرکھی بھی جا سکتی ہے، انسان کے مادی ماحول میں تغیر و تبدل ہونے پر محبت کے نظریے میں بھی مناسب تبدیلی پیدا ہوتی رہتی ہے۔ نہ صرف محبت میں بلکہ انسانی زندگی کے تمام سماجی تعلقات اسی ناگزیر تغیر کی وجہ سے تبدیل ہوتے، بنتے، بگڑتے اور سنورتے رہتے ہیں، قرون وسطیٰ کے مادی ماحول میں مجنوں کو عشق جتانے کے لئے صرف ایک اونٹ کی ضرورت تھی، وہ اپنے محبوب کو محمل میں بٹھا کر اونٹ کی نکیل اپنے ہاتھ میں لئے بادیہ پیمائی پر تل جاتا تھا اور اپنے محبوب سے پوچھتا تھا۔

محمل سجا ہوا ہے عزم سفر ہے آج!
اے جان قیس تیرا ارادہ کدھر ہے آج؟

لیکن آج کل کے مجنوں کے لئے اونٹ کی ضرورت نہیں، اسے تو ایک کار چاہئے۔ اونٹ سے لے کر کار تک محبت کے نظریے میں جو جو تبدیلیاں پیدا ہوئی ہیں، وہ نہ صرف انسانی تاریخ کی مختلف منزلوں اور اس کی سماجی اور اقتصادی کیفیتوں کی آئینہ دار ہیں، بلکہ یہ بھی اچھی طرح ظاہر کرتی ہیں کہ محبت کا عملی نظریہ قرون وسطیٰ کے مادی ماحول سے تبدیل ہوتا ہوا اب خالصتاً سرمایہ دارانہ بن کر رہ گیا ہے، اور محبت کے موجودہ اصول انہی اندرونی تضاد، اور جماعتی تفریق کے زیر اثر ہیں جو موجودہ سرمایہ دارانہ نظام میں برسر پیکار ہے۔ آج عشق سرمایہ دارانہ اور بورژوا ہے، میں یہ نہیں کہتا کہ عشق ایک جذبہ نہیں، میں صرف یہ کہتا ہوں کہ محبت آج کل کے مادی ماحول کے زیر اثر ایک محض بورژوا جذبہ ہے، جذبہ ترحم کی طرح"۔

شیام نے اپنی تقریر ختم کرتے ہوئے دائیں ہاتھ سے ایک چٹکی بجائی جیسے اُس نے ایک چٹکی سے اپنے مخالفین کے تمام دلائل کو باطل ثابت کر دیا ہو۔

اب ہر ایک کی نظر سکھو پر پڑی تھی۔ سکھو جو افسانہ نویس تھا۔ وہ کیا کہنا چاہتا تھا۔ محبت کے بارے میں اُس کے کیا خیالات تھے؟ کلب کے سارے ممبر یہ جاننے کے لیے بے تاب ہو اُٹھے۔ سکھو آج اس تمام بحث کے دوران میں منہ پھلائے ہوئے ایک طرف بیٹھا رہا تھا۔ اب سب کی آنکھیں اپنے چہرے پر لگی دیکھ کر وہ اپنی کرسی پر ایک عجیب بے چینی سے انداز میں ہلا۔ کسمسایا۔ اور پھر کہنے لگا میں تمہیں ایک کہانی سنانا چاہتا ہوں ——— یہ کہانی ——— آپ بیتی ہے۔"

"ایک دفعہ کا ذکر ہے" سکھو نے کہنا شروع کیا "مجھے ایک لڑکی سے پہلی نگاہ ہی میں محبت ہو گئی۔ میں نے اُس سے خوبتر نسوانی حسن کا نمونہ آج تک نہیں دیکھا۔ بس وہ بالکل ریفیائیل کی اس تصویر کی طرح تھی جسے ہم لوگوں نے پچھلے سال رائل آرٹ کی نمائش میں دیکھا تھا تو مجھے اُس سے والہانہ محبت ہو گئی۔ پہلی نگاہ میں، اور جوں جوں میں اس کی طرف دیکھتا جاتا تھا میری محبت بڑھتی جاتی تھی، اور اگرچہ اس میں کوئی شک نہیں کہ میں پلازا تھیئٹر کے تیسرے درجے میں بیٹھا تھا اور وہ فرسٹ کلاس میں تھی۔ لیکن پھر بھی میری محبت کا یہ عالم تھا کہ جب کبھی سینما کے دروازوں میں روشنی بڑھ جاتی تو میں مڑ کر اُس کی طرف دیکھنے سے باز نہ رہ سکتا تھا۔ اور کھیل کے ختم ہونے تک تو مجھے یہ یقین ہو گیا کہ ربِ عظیم نے مجھے ایک جاودانی جذبے سے نوازا ہے، چنانچہ اسی جذبۂ سرمدی سے سرشار ہو کر میں نے کھیل ختم ہونے کے بعد لڑکی کی کار کی طرف مخمور نگاہوں سے دیکھا اور پھر احتیاط سے اُس کا نمبر اپنی ڈائری میں محفوظ کر لیا . . . .

"یہ ہماری محبت کی ابتدا تھی۔ میں یہ بیان کرنا نہیں چاہتا کہ اس کے بعد ہم کہاں ملے اور کیسے، اور میری محبت کو کن نازک ترین مراحل سے گذرنا پڑا، میں یہ سب باتیں ج۔س ماہرِ نفسیات کے تحلیلی تجربات کے لئے الگ رکھے رہتا ہوں۔ ہاں، صرف اتنا کہنا کافی ہے کہ ہم دونوں بہت جلد دوست بن گئے۔ محض دوست، اُس نے کبھی بھی میرے ماں باپ، گھر بار یا میری سماجی حالت کے متعلق استفسارات نہیں کئے، وہ مجھے یقیناً پسند کرتی تھی۔ اور پھر ایک دن میں نے لال باغ میں اُسے چند غنڈوں کی چھیڑ چھاڑ سے بچا لیا، اگرچہ اس میں شک نہیں کہ وہ غنڈے میں نے ہی کرائے پر مہیا کئے تھے اور میں ہی انہیں لال باغ لے گیا تھا۔ غرضکہ میں نے افضل بک ڈپو کے ناولوں کا ہیرو بننے کی پوری پوری سعی کی، وہ اُس دن سے مجھے اور بھی پسندیدہ نظروں سے دیکھنے لگی اور میں تو اُس کے قدموں کی مٹی کو پوجتا تھا، ہم بہت جلد ایک دوسرے سے گھل مل گئے۔ وہ مجھے اپنے سفر کی حکایتیں سنایا کرتی۔ جب وہ اپنے ماں باپ کے ہمراہ بلادِ مغرب میں گئی تھی اور میں علم الریاضی میں اپنی اُن جدید تحقیقی و تدقیقی کاوشوں کا ذکر کیا کرتا۔ جن سے آئن سٹائن کے نظریۂ اضافت کی تکذیب ہوتی تھی"۔

"بہت خوب" ج۔س نے مزاحاً کہا۔

سکھو چند ثانیوں کے لئے خاموش ہو گیا۔ وہ حزن و ملال کی زندہ تصویر بنا ہوا تھا۔ آخر کچھ وقفے کے بعد آہستہ سے بولا۔ "کہانی سننا چاہتے ہو یا نہیں۔؟"

ج س نے معذرت پیش کرتے ہوئے کہا "سوری، اولڈ مین"۔

سکھو بولا، "ہاں تو اب کہانی میں کیا رکھا ہے، میں یقیناً خوش تھا۔ اور یقیناً ایک لمبے عرصے کے لئے خوش رہتا، اگر اُپندر نے اپنے "نسبت کے جبلتی نظریے" سے میری عقل کو مسلوب نہ کر دیا ہوتا۔ پوچھو لو، اُپندر نے مجھ سے کہا تھا کہ اپنی محبوبہ سے شادی کی درخواست کرو؟ کمبخت یہیں سامنے تو بیٹھا ہے"!

"پھر کیا ہوا؟" ہم سب نے ایک دم چلا کر کہا۔

"کچھ نہیں" سکھو نے سکون آمیز لہجہ میں جواب دیا، "اور سچ بات تو یہ ہے کہ جب میں اُس کے مطالعے کے کمرے میں نمودار ہوا، تو وہ مجھ سے نہایت ملاطفت سے پیش آئی۔ وہ اُس وقت ایک آرام کرسی پر بیٹھی بلند آواز میں ٹینی سن کا کلام پڑھ رہی تھی، اور اپنی شیریں، نازک اور نقرئی آواز سے خود ہی محظوظ ہو رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی کہنے لگی۔

"ہلو، بدھو! (دوانی زدہ مجھے اسی طرح پکارا کرتی ہے)

"ہیلو ——— کی" میں نے کہا۔ اور میں اُسے اسی طرح بلایا کرتا ہوں۔

"ہیلو ——— تو اُس نے پھر حیرانی سے کہا "یہ کیا! تم آج ایک نئی ٹائی لگائے ہوئے ہو، خیر تو ہے!"

میں نے اپنے چہرے پر ایک حزنیہ مسکراہٹ پیدا کر لی اور پھر کرسی گھسیٹ کر اُس کے قریب بیٹھ گیا۔ اور آہستہ سے کہنے لگا۔ "پڑھے جاؤ، کر ——— کی، پڑھے جاؤ۔ میں تمہاری شیریں آواز سننا چاہتا ہوں یہاں تک کہ یہ نغمہ کیٹس کی بلبل کے نغمے کی طرح مجھے اپنے آپ میں تحلیل

کرلے، آہ — تمہاری آواز کس قدر شیریں ہے"۔ اُس نے بلند آواز میں پڑھنا شروع کردیا، لیکن اب وہ چیخ رہی تھی، اور تیکھے لہجہ میں میری نقلیں اتار رہی تھی۔

"کل میں نے وائی۔ ایم۔ سی۔ اے میں پنگ پانگ چیمپین شپ جیت لیا" میں نے اپنے سر کے گرد ایک روحانی ہالہ بناتے ہوئے کہا۔

"بہت خوب" کرتی نے جواب دیا "کیا تم ایک دیوا۔ کے مقابلے میں کھیل رہے تھے بدھوا ڈوانی"۔ "مذاق کی حد ہوچکی" میں نے جذبات سے گلوگیر لہجے میں کہا۔ "میں تم سے پیار کرتا ہوں، مذاق کی حد ہوچکی، کرتی میری بات سنو، مجھے تم سے محبت ہے۔ بے اندازہ محبت، کرتی کیا تم مجھ سے شادی کروگی؟"

وہ چند ثانئے خاموش رہی، پھر اُس نے سنجیدہ رُو ہو کر پوچھا "تمہارا باپ کیا کام کرتا ہے"؟

"سچی محبت" میں نے جواب دیا "مذہب، نسل اور باپ کی تمیز سے بالاتر ہے۔ یہ ایک روحانی، سرمدی . . . ."

کرتی نے قطع کلام کرتے ہوئے پوچھا، "تم ایک مہینے میں کتنا کما لیتے ہو"؟

میں نے احتجاجاً کہا "میں — اشتراکی ہوں"

"کیا تمہارے پاس ایک کار ہے"؟

"کار تو نہیں، لیکن ایک بائیسکل ضرور ہے جو مجھے رنجیت سینما کی ایک دیوار کے ساتھ لگا ہوا مل گیا تھا" میں نے تشریحاً کہہ دیا۔

کرتی نے جھٹ گھنٹی بجائی، اور اُس کا ملازم داؤد کمرے کے دروازے میں نمودار ہوا۔

"داؤد!" کرتی نے بلند آواز میں کہا، اُس کی آواز میں غصہ کے ساتھ عصمت و عفت کے نسائی جذبات کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے تھے۔ "داؤد — اس بدمعاش کو کمرے سے باہر نکال دو"

سکھو نے داستان ختم کردی اور اپنے خیالوں کی دنیا میں گم ہوگیا، کلب میں ایک سناٹا سا چھایا ہوا تھا، ج۔ س اور اپندا اپنی کرسیوں پر اس طرح سہمے ہوئے بیٹھے تھے جیسے کسی اُستاد کی جھڑکی سے بچے دبک کے بیٹھ جائیں، آتشدان میں جلتی ہوئی لکڑیوں پر تیز تیز شعلے چمک جاتے تھے، یکایک کلب کے سب سے پرانے ممبر نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھایا اور سکھو کے حزیں چہرے کی طرف دیکھ کر کہا "بیٹا سکھو، غم کھانے سے کیا ہوتا ہے! انقلاب کے لئے کام کرو، اور خدا کا شکر کرو کہ اپنی روحانی محبت کے باوجود تم زندہ ہو، ورنہ اگر تم کسی بورژوا ناول کے ہیرو ہوتے تو اس واقعے کے بعد یقیناً خودکشی کر لیتے —"

کرشن چندر

غزل

اس فکر میں کہ دل کو کسی طرح کل پڑے
کیا کیا نہ اضطراب کے پہلو نکل پڑے

ہم پر کسی کی وہ نگہہِ لطف کیا پڑی
سینے میں سوز و درد کے چشمے اُبل پڑے

احساس اپنی بے پروبالی کا جب ہُوا
بے اختیار آنکھ سے آنسو نکل پڑے

پھرتے ہے قدم قدم پہ مرے دل کا امتحاں
ایسا نہ ہو کہ پھر کوئی افسانہ چل پڑے

مایوسیوں میں یوں نظر آئی ہمیں اُمید
تاریکیوں میں جیسے کوئی شمع جل پڑے

ہے بات جب کہ سر پہ قیامت ہی کیوں نہ ہو
لیکن نہ اُس کی یاد میں کوئی خلل پڑے

حیرت عبث ہے شکوہ جورِ عدو کہ ہم
آغازِ کار ہی سے غلط راہ چل پڑے

عبدالمجید حیرت

دیارِ حبیب سے رخصت ہوتے ہوئے

آرزو و شوق لایا۔ یاس و حرماں لے چلا — کیا بتاؤں آہ! کیا کیا دل میں ارماں لے چلا
کل جن آنکھوں میں مہکتے تھے تری خلوت کے خواب — آج اُن آنکھوں میں اشکِ خوں کے طوفاں لے چلا
کل جو دل فرطِ مسرّت سے نشاط آباد تھا — آج اُس دل کو وفورِ غم سے ویراں لے چلا
کل جو دامن تھا امیدِ لطف سے رشکِ بہشت — آج اُس دامن میں برقِ شعلہ ساماں لے چلا
کل شمیمِ زلف سے جو ذہن تھا مہکا ہُوا — آج اُس میں سینکڑوں خوابِ پریشاں لے چلا
کل بہار آرا تھا جس دل میں بہشتوں کا سماں — آج اُس میں حسرتوں کے خار و پیکاں لے چلا
کر رہا تھا کل تبسّم آہ! جن ہونٹوں پہ رقص — آج اُن ہونٹوں کو صرفِ آہِ سوزاں لے چلا
تم نے اتنا بھی نہ پوچھا کس لئے آئے ہو تم؟ — جذبۂ بے تاب پر دل کو پشیماں لے چلا
ہجر کی راتوں میں جو لکھے تھے اشعارِ حسیں — بے سنائے اُن کو اپنے دل میں پنہاں لے چلا

"پھر نہ آؤں گا۔ نہ آؤں گا دیارِ پاکِ یار!"
بس یہی لب پر شہیدِ سوختہ جاں لے چلا۔

شہید ابنِ علی (مرحوم)

مغرب کی سب سے بڑی شاعرہ

سیفو

"لوگ کہتے ہیں کہ سروشِ غیبی تعداد میں نو ہیں لیکن وہ بھولتے ہیں۔ کیونکہ دیکھو! لیسبوس کی سیفو بھی تو ہے جو دسواں سروش ہے"
"افلاطون"

۱۹۳۷ء کے سالنامے میں منصور احمد (مرحوم) نے یونانی شاعرہ سیفو کے کلام سے چند منظوم ٹکڑے شائع کئے تھے۔ اُن کا ارادہ تھا کہ سیفو کے متعلق کبھی کوئی مفصل مضمون بھی لکھیں گے لیکن اس ماہ انہیں یہاں سے گئے دو سال ہوتے ہیں اور اُن کی یاد کو تازہ کرنے کے لئے میں یہ مضمون پیش کرتے ہوئے ایک تسکین اور مسرت محسوس کرتا ہوں۔ میراجی

علامہ اقبال فرماتے ہیں:۔

مکالماتِ فلاطوں نہ لکھ سکی لیکن
اسی کے شعلے سے ٹوٹا شرارِ افلاطوں

یہ شعر عورت کے متعلق علامہ کی بلند خیالی کا ثبوت ہے۔ اس جگہ اس غلط خیال سے بحث مطلوب نہیں کہ عورت اور مرد میں کون برتر ہے بلکہ محض اس عورت کے تصور کو تازہ کرنا ہے جس نے ذہنی طور پر اپنی برتری کا ثبوت دیا۔ سیفو ایک ایسی عورت تھی جس کی بلند خیالی کے وہ مرد بھی قائل ہیں جن کی ذہانت انسانی تخیئل کی بنیاد ہے۔ سقراط اُسے "حسین سیفو" کہہ کر پکارتا ہے۔ ارسطو لکھتا ہے کہ "اگرچہ وہ عورت تھی لیکن مٹی لین کے رہنے والوں نے اُس کی قدر افزائی کی"۔

کیٹولس اور ہوریس نے اس کے کلام سے استفادہ کیا اور قدماء جس طرح ہومر کا ذکر کرتے ہوئے اُسے صرف "شاعر" کے لفظ سے پکارنا کافی سمجھتے تھے اُسی طرح وہ سیفو کو صرف شاعرہ کے لفظ سے ہی یاد کرنا کافی سمجھتے تھے۔ یونان کی قدیم سماج میں عورتوں کا درجہ مردوں کے برابر نہ سمجھا جاتا تھا اگرچہ انہیں بہت حد تک آزادی حاصل تھی پھر بھی ذہنی طور پر سیفو ہی سی عورتیں تھیں جو اُس زمانے کے مردوں سے اپنی برتری کا لوہا منواتی تھیں۔ چونکہ یونان کی سیاسی اور سماجی زندگی میں مرد کو برتری حاصل تھی بلکہ عورتوں کو کوئی درجہ حاصل ہی نہ تھا۔ اس لئے دنیائے ادب میں بھی گنتی کی چند شاعرات ہیں جن کا کلام ہم تک پہنچ سکا ہے۔ لیکن عورتوں کی یہ کمتری یونان کے دارالسلطنت ایتھنز تک ہی محدود تھی۔ دوسرے حصّوں کا حال مختلف تھا۔ مثلاً اسپارٹا میں عورتوں کو مردوں ہی کی طرح تعلیم و تربیت دی جاتی تھی۔ اور مردوں ہی کی طرح وہ ہر قسم کے کام کاج کو اختیار کر سکتی تھیں اور اگرچہ سپارٹا نے علم ادب میں کبھی کچھ نہ کیا لیکن زندگی کے دوسرے پہلوؤں میں سپارٹا کے خیالات کا اثر یونان پر نمایاں حد تک ہوا۔ چنانچہ جب ہم یونانی دیومالا کو دیکھتے ہیں تو صاف طور پر ظاہر ہو جاتا ہے کہ یونانی دیو استھان میں (جو یونان کی انسانی ذہانت کی پیداوار تھا) صرف دیوتاؤں کو ہی امتیاز حاصل نہیں ہے بلکہ ان آسمانی کارروائیوں میں دیویاں بھی برابر کی شریک ہیں۔ اگر علم ادب کا دیوتا اپالو صیغۂ تذکیر سے نسبت رکھتا ہے تو ہندوستانی سرسوتی دیوی کے مطابق میں نیموسین کی نو بیٹیاں بھی سروشِ غیبی کا درجہ رکھتی ہیں اور اُن کی حیثیت اپالو دیوتا سے کسی طرح کم نہیں ہے اور اگر یونانی شاعری کی تاریخ کو بہ حیثیت مجموعی دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ یونانی ادب کے چار مشہور زمانوں میں سو

دو بلکہ تین دور ایسے ہیں جن میں عورتوں کا سفینہ کسی طرح بھی ناقابلِ ذکر نہیں ہے۔ اور ان عورتوں میں سے بھی اگر کسی نے شعر و ادب میں حصہ نہ لیا ہوتا تو سیفو ہی ایک ایسی شاعرہ تھی جس کا کلام شعر و ادب میں عورت کی برتری کو ہمیشہ کے لئے ثابت کر سکتا ہے۔ سیفو نہ صرف اپنے زمانے میں یونان کی سب سے بڑی شاعرہ گذری ہے بلکہ خالص تغزل کے لحاظ سے وہ آج تک دنیا کی سب سے بڑی شاعرہ تصور کی جاتی ہے اور اس کی شاعری میں دو باتوں نے ایک خاص دلچسپی پیدا کر دی ہے۔ پہلی بات یہ کہ اس کا کلام کم یاب بلکہ نادر ہے۔ اب تک صرف ساٹھ کے قریب ٹکڑے اس کی شاعری کے مل سکے ہیں اور ان میں بھی صرف ایک نظم مکمل ہے اور دو تین اور بڑے ٹکڑے ہیں۔ باقی سب دو دو تین تین سطروں کے جواہر پارے ہیں بلکہ بعض ٹکڑے تو صرف چند الفاظ پر مشتمل ہیں لیکن یہ ادھورے ٹکڑے بھی چمکتے ہوئے ہیرے ہیں اور بھڑکتے ہوئے شعلے۔

دوسری بات اس کے رنگین سوانح حیات ہیں۔

شاید سیفو کو اپنے گیتوں کے لافانی ہونے کا احساس تھا۔

ایک جگہ اس نے لکھا ہے ؎

پیشین گوئی

ہماری زندگی کے بعد شاید
کوئی فصلِ بہار آئے گی ایسی،
اُٹھے گی اک صدائے بازگشت اور
ہمارے گیت اِک دنیا سُنے گی

اور اگر اس ٹکڑے کو سیفو کی فن کارانہ خود اعتمادی پر محمول کیا جائے تو اس کے لئے دوسرے علمائے یونان و روما کی آرا بھی دلیل کے طور پر مل سکتی ہیں۔ دنیائے قدیم کا دیوِ دانش افلاطون کہتا ہے:

"لوگ کہتے ہیں کہ سروشِ غیبی تعداد میں نو ہیں، لیکن وہ بھولتے ہیں، کیونکہ دیکھو! — لیسبوس کی سیفو بھی تو ہے، جو دسواں سروش ہے!"

سیفو کے متعلق یہ اُس انسان کی رائے ہے جس کی مجوزہ دنیا میں روایت کے مطابق شعرا کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔

یونانی شعرا کے موضوعاتِ شعری کی بنیاد اُن احساسات و جذبات پر ہے جو طبعِ انسانی میں ازلی اور ابدی طور پر موجود ہیں۔ علم ادب اور دوسرے علوم میں ہر ملک اور قوم متقدمین سے استفادہ کرتی آئی ہے لیکن اہلِ یونان کو اس لحاظ سے ایک امتیاز حاصل ہے۔ ان کے شعرا نے اپنے سے کسی پہلے ادب سے استفادہ نہیں کیا۔ انہیں غیر ملکی زبانوں میں کوئی دلچسپی نہ تھی اور غیر ملکی تہذیب و تمدن بھی ان کے لئے بہت کم اپیل رکھتا تھا۔ وہ اپنے علوم و فنون میں صرف اپنے ہی دیس کی روایات سے زور پیدا کرتے تھے۔ اور اپنے قوانین اور معیاروں سے وفاداری ان کا شعار رہی۔ شاعری کے متعلق یہ بات اور بھی زیادہ حقیقت کا رنگ لئے ہوئے ہے۔ یونانی شاعری کی ابتدا ایک ایسے ماضی میں دھندلاتی ہوئی کھو گئی ہے جسے نمایاں نہیں کیا جا سکتا لیکن اس سلسلے میں تاریخ آٹھویں صدی (قبل مسیح) سے ہماری رہنمائی کرتی ہے۔ اور اس وقت سے لے کر یونانی شاعری عیسائی تمدن کے غلبے تک ترقی کرتی رہی۔

اُس زمانے میں جب یونان کی شاعری بامِ عروج پر پہنچی ہوئی تھی، یونانی شعرا کا کلام پڑھنے کے لئے نہیں بلکہ سننے کے لئے کہا جاتا تھا اور جب تک کتابیں ایجاد نہ ہوئیں یونانی شعرا گائے جانے یا پڑھ کر سنائے جانے کے لئے ہی شعر کہتے رہے جب کوئی یونانی شاعر فکرِ سخن کرتا تو اُس کے ذہن میں کسی مطالعہ کرنے والے تنہا انسان کا تصور نہ ہوتا تھا۔ بلکہ اُس کے مدِنظر کسی میلے یا مجمعِ عام میں گانے والے افراد ہوتے تھے یا اُس کے اپنے دوستوں کا وہ حلقہ ہوتا تھا جس میں اسے خود کلامِ موزوں پڑھ کر اپنے اور دوسروں کے ذوقِ سلیم کی تشنگی مٹانا ہوتا۔ اس طریقے کا یونانی شاعری پر ایک خاص اثر ہوا۔ کیونکہ سامع اور قاری دونوں کا براہِ راست گہرا تعلق ہونے کی وجہ سے شعر محض اقلیت ہی کے لئے دلچسپی کا باعث نہ رہا۔ شاعر کو ہر وقت اپنی پشت پر دوستوں کے حلقے اور عوام کے مجمع کا احساس رہتا اور اُن کی داد و تحسین اُسے ہر طرح سے مطمئن رکھتی، اور اُن کی داد و تحسین حاصل کرنے کے لئے ہی ایسی باتیں اس کا موضوعِ سخن بن سکیں۔ جن میں عوام کو دلچسپی تھی اور جو انسان کے بنیادی رجحانات سے متعلق تھیں۔ اس طرح قدیم یونان میں شاعری ایک مخصوص اقلیت میں محدود ہونے سے بچ گئی اور اسی لئے صحیح معنوں میں اپنے وقت اور ماحول کی ترجمان بھی رہی۔

شروع سے یونانی شعرا کے زیرِ مشق دو اصنافِ سخن رہیں،

؎ ترجمہ از منصور احمد مرحوم

ایک رزمیہ نظم اور دوسرے اوڈ (ایک طرح کا قصیدہ جس میں تغزل بھی ہو)۔ رزمیہ نظم بیانیہ شاعری کی ذیل میں آتی ہے اور اس لئے اس میں کسی طرح کا شخصی یا ذاتی عنصر نہیں ہوتا تھا۔ یونان کے رزمیہ شاعر ہومر کا کلام اس صنف کا واضح ترین نمونہ ہے۔ دوسری صنف یعنی اوڈ (یا قصیدہ) اپنی فنی خصوصیات کی بنا پر آگے چل کر مختلف قسم کی نظموں کی تخلیق کا باعث بنی۔ اوڈ (قصیدہ) سماجی اور مذہبی موقعوں پر رقص اور ساز کے ساتھ گائے جانے کے لئے لکھی جاتی تھی۔ اس لئے ان قصیدوں میں یونانی شعراء اُن جذبات کا اظہار کرتے تھے جو وہ ایک دوسرے کے متعلق رکھتے تھے۔ یا اُن خیالات کو نظم میں لاتے تھے جو دیوتاؤں کے متعلق اُن کے ذہنوں میں پیدا ہوتے تھے۔

رزمیہ نظم اور قصیدے کی بنیادی اصناف سخن کے ساتھ ہی ایک اور صنف بھی تھی۔ یہ ایک قسم کے گیت تھے۔ اور آج کل کی نظموں سے ان کی مشابہت اس خصوصیت میں تھی کہ یہ گیت شاعر صرف اپنی ذات اور اپنے لطف کے لئے لکھتا تھا۔ ان کے گائے یا سنائے جانے کے لئے کسی طرح کے مجمعے کی ضرورت نہ تھی۔ چونکہ یہ گیت ایک شخصی اور ذاتی نوعیت رکھتے تھے اس لئے ان میں موضوع اور بحروں کا اچھا خاصا تنوع رفتہ رفتہ پیدا ہوتا گیا اور یہ صنف قلبی احساسات کے اظہار کا مقبول ترین ذریعہ بن گئی لیکن اس کی ترجمانی کا حلقہ دوست احباب کا محدود حلقہ ہی رہا۔

یونانی شاعری کے ابتدائی ایام میں یونان کے مختلف حصوں میں شعر و شاعری کا چرچا رہا۔ لیکن پانچویں صدی میں یونانی تہذیب و تمدن اور شعر و ادب کا مرکز ایتھنز بن گیا۔ ۴۰۴ء قبل مسیح میں ایتھنز پر سپارٹا کا قبضہ ہو گیا اور یوں ایتھنز کی قدیم سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔ لیکن یہ انقلاب صرف سیاسی انقلاب ہی نہ تھا زندگی کے دوسرے پہلوؤں پر بھی اس سیاسی تبدیلی کا اثر ہوا چوتھی صدی قبل مسیح میں پانچویں صدی کا اعتماد اور دل جمعی مفقود تھی۔ یہ غربت، بے اطمینانی اور اندیشوں کا زمانہ تھا۔ اس لئے اس زمانے کی شاعری بھی اپنے میں کسی طرح کا زور نہیں رکھتی۔ اس کے بعد شاعری کا عروج دور سکندری کے نئے حالات میں ہوا۔ اس زمانے میں فن کاروں نے اپنی تخلیقات میں احساس شخصیت سے قوت اور زور پیدا کیا۔ قدیم روایات کی کمی اور پہلی لبریز حیات شہری حکومت سے دوری نے فن کاروں کو مجبور کر دیا کہ وہ اجتماعی زندگی کی بجائے اپنی انفرادی زندگی سے ہی تخلیقی مواد حاصل کریں۔

آج کل ہر ترقی یافتہ ملک کی شاعری کے بے شمار رنگ ہیں ان میں سے کئی رنگ ایسے ہیں جن کا خیال بھی یونانی شعراء کو نہ آسکتا تھا۔ مثال کے طور پر تصوف کی شاعری کا اُن میں فقدان تھا۔ اس کے علاوہ خالص نیچرل شاعری بھی اُن میں نہ تھی۔

یونانیوں کے خیال کے مطابق ایک شاعر کا کام اظہار حقیقت تھا اگر کوئی شاعر کسی بات کو اخلاص اور عمدگی کے ساتھ کہہ سکتا ہو تو وہ کہے خواہ وہ بات اس سے پہلے بھی کئی لوگوں نے کہی ہو۔ یونان ایک بہت چھوٹا سا ملک ہے۔ اس لئے یونانیوں کی دنیا ایک محدود دنیا تھی یونان کے اکثر شعراء کی زندگی محدود اضلاع میں بسر ہوتی تھی اور اُن کے آس پاس کے شہروں کو سمندر یا پہاڑ اُن سے علیحدہ کر دیتے تھے۔ اُن کے پاس بہت کم کتابیں تھیں اور اُن کا تمدن ایک معین دائرے میں محدود تھا۔ لیکن انہی وجوہات کی بنا پر وہ جس چیز کو دیکھتے نہایت واضح طور پر دیکھتے تھے۔ علوم و فنون کا بے پناہ انبار اُن کی نظر کو دھندلا نہ سکتا تھا اگر ان کے ہاں تنوع نہ تھا تو اس سے انہیں یہ فائدہ تھا کہ اُن کے احساسات ذہنی ایک مرکز پر منجمد اور مرکوز رہتے تھے۔ مختلف تہذیبوں اور ماضی کے بارِ گراں سے انہیں آزادی حاصل تھی۔ اس لئے اُن کے شعراء جو دیکھتے وہ دکھاتے اور جو سنتے وہی سناتے تھے۔ چنانچہ سیفو کی شاعری کا بھی یہی حال ہے لیکن اُس کی شاعری کے متعلق کوئی بات کرنے سے پہلے اُس کے حالات جاننا اس لئے ضروری ہے کہ اُس کی ادبی تخلیق اُس کی ذات کا ہی ایک حصہ تھی۔

سیفو کی زندگی کا افسانہ ساتویں صدی قبل مسیح کے آخر میں شروع ہوتا ہے۔ یہ زمانہ قدیم تاریخ میں ایک اہمیت رکھتا ہے۔ اس زمانے میں پرانی تہذیبوں کو زوال آ رہا تھا اور نئی طاقتیں قیام حاصل کر رہی تھیں اور مغرب کے گوری رنگت والے انسان مشرق کے سانولے لوگوں سے قوت آزمائی کرنے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ اور نوع انسانی کی تمدنی کار فرمائیوں کا مرکز یونان سے مغرب کی طرف سرک رہا تھا۔

سیفو کی شاعری کی نزاکت، لطافت اور نفاست اور اُس کی سماجی آزادروی اُسے ہمارے اپنے زمانے سے قریب تر لاتی ہوئی محسوس ہوتی ہے لیکن اس کے ہمعصروں کے نام لیتے ہی ہمارے ذہنوں میں اس کی دُوری کا احساس واضح ہو جاتا ہے۔

جب ہندوستان میں مہاتما بدھ کی اہنسا پرمو دھرمۃ کا رائج ہونے کو تھا اور جب بنی اسرائیل میں پیغمبر جرمیہ اور عزقائیل اپنی آتشیں گفتار کا جادو پھیلا رہے تھے اُس وقت یونان کے جزیرہ لیسبوس میں سیفو اپنی عشقیہ نظمیں لکھ رہی تھی۔ سیفو ۶۱۲ قبل مسیح میں پیدا ہوئی۔ یہ وہ عورت تھی جو دنیا کی سب سے بڑی شاعرہ مانی گئی ہے، جسے افلاطون "سرِشِ غیبی" کہتا ہے اور جسے سقراط "حسن مجسم" پکارتا ہے۔ اور جس کے کلام کو عیسائیت کے ابتدائی تنگ نظر اور تنگ خیال حامیوں نے مخرب اخلاق سمجھ کر ضائع کر دیا۔

اندازے سے فیصلہ کیا گیا ہے کہ سیفو ۵۵۸ قبل مسیح تک زندہ تھی۔ محققین نے اُس کی عمر کے مختلف زمانوں کے سن مقرر کئے ہیں۔ اس اندازے کے لحاظ سے سیفو ۶۱۲ ق۔م۔ میں پیدا ہوئی۔ سترہ سال کی عمر میں سنجیدگی کے ساتھ اُس نے ۵۹۵ ق۔م۔ میں فکرِ سخن شروع کر دی۔ اکتیس سال کی تھی جب ۵۸۱ ق۔م۔ کو اُسے جلاوطن کر دیا گیا اور پچپن سال کی تھی کہ ۵۵۸ ق۔م۔ میں اُس نے خودکشی کر لی۔

ایریسوس کا مقام سیفو کی جنم بھومی تھا۔ اُس کی ماں کا نام کلیس تھا لیکن باپ کے متعلق شک کیا جاتا ہے کہ وہ جوانی ہی میں مر گیا تھا۔ محققین نے اُس کے آٹھ مختلف نام معلوم کئے ہیں۔ اب یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ ان آٹھوں میں سے اس کا اصلی نام کون سا تھا۔ سیفو کے ماں باپ کے حالات یکسر تاریکی میں ہیں۔ صرف اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ لیسبوس کے اونچے طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ بھی اندازہ ہی ہے کہ اس کی پیدایش والدین کی جوانی ہی میں ہوئی۔ اُس کے بعد تین لڑکے اور پیدا ہوئے۔ لیکن ابھی سب سے چھوٹا لڑکا ماں کی گود میں تھا اور سیفو چھ ہی سال کی تھی کہ ۶۰۶ ق۔م۔ میں لیسبوس کی پُرامن زندگی میں ایک ایسا ہنگامہ برپا ہوا جو دس سال تک لیسبوس کے پانچ شہروں کے لئے ایک مستقل پریشانی کا باعث بنا رہا۔ ممکن ہے کہ اس متواتر جنگ کی ابتدا ہی میں کسی مقام پر سیفو کا باپ کام آیا ہو۔ باپ کے مرنے کے بعد سیفو کی ماں نے اپنی اور بچوں کی حفاظت کے لئے یہی بہتر سمجھا کہ وہ جزیرے کے دوسرے کنارے پر مٹی لین کے مقام پر جا کر رہنا سہنا شروع کر دے۔ باپ کی موت اور اس نقل مکانی کے زمانے میں سیفو ابھی اپنے لڑکپن ہی میں تھی۔

ایریسوس سے مٹی لین تک چھتیس میل کا سفر ہے۔ اور راستے میں صنوبر کے جنگل پڑتے ہیں زمانۂ جنگ میں ان جنگلوں سے ہوتے ہوئے سیفو کی ماں اپنے بچوں کو لئے مٹی لین پہنچی۔ یہ بہت ممکن ہے کہ شروع شروع میں مٹی لین میں یہ لوگ اپنے کسی رشتہ دار کے ہاں ٹھہرے ہوں۔ بہرحال بچپن کا زمانہ جنگ کے جھمیلوں میں گذر گیا اور جب احساس و شعور پختہ ہوئے تو سیفو نے اپنے کو مٹی لین کے خوش منظر مقام پر پایا۔

ہمیں یہ بات معلوم نہیں ہے کہ اس زمانے میں لڑکیاں کس عمر میں شادی کے قابل سمجھی جاتی تھیں لیکن اندازہ یہی کہتا ہے کہ بیس سال کی عمر تک وہ کنوارپنے کی آزاد زندگی بسر کرتی تھیں لیکن اس سلسلے میں سیفو کو کوئی ایسی جلدی نہ تھی اور حالات بھی کچھ ایسے ہی تھے کہ ملک کے نوجوان جنگ میں مصروف تھے اور جنگ کے بعد بھی کافی عرصے تک ملک کی حفاظت ہی ان کا اولین مقصد تھا۔ اس لئے شادی بیاہ اور گھر والے کی بہم رسانی کچھ آسان نہ تھی۔ نیز سیفو صورت شکل کی بھی کچھ ایسی نہ تھی کہ عام دیکھنے والا کوئی نوجوان اُسے دیکھتے ہی جلد سے جلد بیوی بنانے پر راغب ہو جائے۔ بلکہ ایک روایت تو یہ کہتی ہے کہ وہ نہ صرف خوبصورت نہ تھی بلکہ بدصورت تھی۔ اُس وقت کے یونانی معیارِ حُسن کے لحاظ سے اس کی آنکھیں اور اس کے بال زیادہ سیاہ تھے جسمانی لحاظ سے بھی وہ ایک دبلی پتلی منحنی سی لڑکی اور بال بچوں کے بکھیڑے سے عہدہ برآ ہونے کے ناقابل تھی۔ بلکہ اس کی سانولی رنگت کے باعث ایک مصنف لکھتا ہے کہ وہ ایک ایسی بلبل کی طرح تھی جس کے ننھے منے جسم کو بدنما پَر و بال ڈھانپے ہوئے ہوں لیکن اُس کی ذہانت اِن نسائی خامیوں کی پردہ پوش تھی۔ وہ ایک ایسی شاعرہ تھی جسے مولوی عظمت اللہ کے الفاظ میں کہا جاسکتا ہے کہ

"کالی کوئل تھی تُو
گیت سریلا تیرا!"

اور اس ذہانت کے علاوہ بھی اُس میں اپنی انفرادی خوبیاں تھیں۔ اس کی بدنمائی بھی ایک ایسی بدنمائی تھی جس میں دیکھنے والے کے لئے ایک خاص قسم کا حسن موجود ہوتا ہے۔ اور یہ بات ہے بھی درست کہ جب قدرت کسی شخص میں جسمانی طور پر کسی طرح کی کوئی خوبی نہیں

رہنے دیتی تو وہ اپنی اس بے جسم دستی کی تلافی کسی نہ کسی صورت میں کر دیتی ہے۔ اور نعم البدل اپنے انفرادی اچھوتے پن کی وجہ سے حسن سے کہیں بڑھ کر دلکش ثابت ہوتا ہے۔ سیفو کے متعلق مشہور ہے کہ اس کی میٹھی مسکراہٹ میں ایک ایسی من موہن ادا تھی جو دیکھنے والے کے دل کو جھٹ اپنا لیتی تھی۔ اس کے علاوہ اس کے بالوں کی سیاہی میں ایک ہلکی سی نیلاہٹ تھی اور ان سب سے بڑھ کر اس کا رکھ رکھاؤ، اس کی نفاست طبعی اور اس کی وضعداری تھی۔ اور ان باتوں کے ساتھ جب ایک ایسی فطرت کا امتزاج ہو جائے جو گہرے، سلگتے ہوئے جذبوں کی مالک ہو، اور ان جذبوں کا اظہار اس کی آنکھوں کی چمک سے ہو رہا ہو، اور ان شعروں سے ہو رہا ہو۔ جن کے متعلق پلوٹارک کہتا ہے کہ "اس کا کلام شعلوں میں لپٹا ہوا تھا"—— تو حسن کی روایتی خصوصیات کی ضرورت ہی کیا ہے۔ خصوصاً جبکہ متی لین میں اونچے گھرانے کا ایک نوجوان ایسا تھا۔ جسے حسن اتفاق سے یہ حقیقت سجھائی دی کہ سیفو کی رنگ لاتی ہوئی جوانی ایک مرد کے دل کو لبھا سکتی ہے۔ یہ نوجوان الکئے اس تھا جو بعد میں جا کر ایک شاعر کی حیثیت سے مشہور ہوا۔

سسرو کے مطابق الکیاس ایک خوش طبع عشق باز نوجوان تھا۔ یہاں تک کہ ایک بار جب وہ ایک جنگ میں گیا تو وہاں بھی کسی رزمیہ نظم کی بجائے محبت کے گیت ہی پڑھتا ہوا گیا۔ اس کے علاوہ وہ شراب کا بھی بے طرح عادی تھا اور نتیجے کے طور پر اس کی شاعری میں بھی شراب کا موضوع جا بجا نظر آتا ہے اس کی شاعری کے صرف "تین موضوع تھے۔ سیاسیات اور حب الوطنی، اور شراب اور محبت۔ چونکہ اس کی اپنی طبیعت لوگوں سے مختلف تھی۔ اس لئے سیفو کی غیر معمولی شخصیت میں بھی اسے ایک زبردست دلکشی محسوس ہوئی اور تیز طرار طبیعت والے شاعر نے ایک روز سیفو کو ذیل کا منظوم خط لکھ ڈالا۔

بنفشی مسکراہٹ اور بنفشے کے پھولوں ایسے بالوں والی معصوم سیفو! میرا دل تم سے کچھ کہنے کو چاہتا ہے لیکن شرم مجھے روکتی ہے"!

سیفو شاید اس کی تلون مزاجی کی بہت سی داستانیں سن چکی تھی۔ اس نے ذیل کا منظوم جواب اسے لکھا:۔

"جو کچھ تم کہنا چاہتے ہو اگر وہ کوئی اچھی بات ہوتی، اور تمہاری زبان کسی برائی کا زہر اگلنا نہ چاہتی تو شرم تمہیں نہ روکتی اور تم جو کہنا چاہتے تھے، کہہ دیتے"!

لیکن الکیاس اس سے بے ہمت نہ ہوا۔ بلکہ سیفو کے سامنے منظوم اظہار محبت کرتا ہی رہا اور ہر مجمعے میں سیفو کی تعریفی نظمیں اور محبت کے گیت لوگوں کو سناتا رہا۔ اس وقت الکیاس کی شہرت بڑھ رہی تھی اور ان نظموں سے اس کے سامعین کی توجہ سیفو کی طرف ہو رہی تھی۔ اس لئے سیفو ایک ہونہار شاعر کی محبوبہ ہونے کے لحاظ سے ہی شہر کی ایک خاص شخصیت بن گئی۔ سترہ سال کی عمر میں ہی جب اس نے خود بھی شاعری شروع کر دی تھی، وہ شہر کے باذوق حلقوں میں ایک نمایاں دلچسپی کا باعث بن گئی اور چونکہ اس زمانے میں لیسبوس کی عورتوں کو ویسی ہی آزادی حاصل تھی جیسی کہ موجودہ مغربی سماج میں ہے۔ اس لئے سیفو اور اس کی معترف سہیلیاں سوسائٹی کے ہر شعبے میں حصہ لے کر نام پیدا کر سکتی تھیں۔

لیکن الکیاس کی فریفتگی کے باوجود سیفو کو ابھی تک مردوں میں کسی طرح کی دلچسپی محسوس نہ ہوتی تھی۔ ممکن ہے کہ جنگ کے حالات کی وجہ سے وہ اپنی سہیلیوں کی سنگت کی اس قدر عادی ہو چکی ہو کہ اسے نوجوانوں کی صحبت میں کوئی لطف محسوس نہ ہوتا ہو۔ نیز اس کی نفاست پسند طبیعت اس وقت کے جنگجو نوجوانوں کے سپاہیانہ طور طریقوں سے مانوس نہ ہو سکتی تھی کہ وہ مردوں کو ناپسند نہ کرتی تھی کیونکہ انجام کار اس نے ایک مرد ہی کی محبت میں جان دی تھی۔ جس زمانے میں سب جسمانی اور نفسیاتی لحاظ سے بالغ ہو رہی تھی۔ اگر اس وقت لیسبوس میں جنگ نہ چھڑی ہوئی ہوتی، تو ممکن ہے کہ اسے یہ نشوونما کا عرصہ اپنی ہم جنس ساتھنوں میں نہ بسر کرنا پڑتا اور یوں اس کی احساساتی زندگی میں وہ رجحانات نہ ہوتے جن کی بنا پر اس کی نظموں کو بعد ازاں جلا دینے کے قابل سمجھا گیا۔

لامحالہ ابتدا میں سیفو کی شاعری پر الکیاس کی نظموں کا بہت کچھ اثر ہوا ہوگا۔ اور چونکہ الکیاس کی شاعری تغزل کی صنف سے تھی اس لئے سیفو کے آیندہ تغزل پر اس کا اثر لازمی معلوم ہوتا ہے۔

لیکن یہی ایک ایسا شاعر نہ تھا جس کی ادبی تخلیقات نے سیفو کے کلام پر براہ راست یا بالواسطہ اثر اندازی کی۔ بلکہ چند اور متقدمین بھی تھے جن کا مطالعہ، قیاس غالب ہے کہ سیفو نے کیا ہوگا۔ ایک ایر

تھا۔ اسی کے تکمیل والے گیتوں سے یونانی ڈرامے کی نشوونما ہوئی۔ لیکن اس کی شاعری صرف شراب کی شاعری تھی اور اُس میں بھی سنجیدگی کا جزو غالب تھا۔ الکیاس اظہار نفسی کا زیادہ پابند تھا۔ اور اظہار نفسی ابھی شاعری میں ایک بالکل معمولی بات تھی اور چونکہ سیفو کو بھی آگے چل کر اپنے ہی دل کی باتوں کو شعر کے پردے میں بیان کرنا تھا۔ اس لئے ایسا شاعر ہی اُس کے لئے زیادہ دلکش ہو سکتا تھا۔

ایک اور شاعر لیسبوس کا بھاٹ ترپاندر تھا۔ یہ سپارٹا میں شاعری اور موسیقی کا استاد تھا۔ اور پہلا یونانی شاعر تھا جس نے سنجیدگی کے ساتھ مے نوشی کے نغمے لکھے۔

الکمن بھی ایک غزلیہ شاعر تھا جس کا کلام سیفو کے مطالعے میں ضرور آیا ہوگا۔ یہ بھی ایک جذباتی شاعر تھا اور نغمات محبت کو فن کارانہ اہمیت دینے کی پہل کا سہرا اسی کے سر ہے۔ لیکن اس کی شاعرانہ بے باکی کی وجہ ہی سے اس کے کلام کو بھی انجام کار عیسائیوں نے جلا ڈالا۔ یہ شاعر بھی اپنی ہی زندگی اور احساسات کو اپنے کلام کی بنیاد بناتا تھا۔ اور اس کا اثر بھی سیفو پر لازمی ہے۔

سمرنا کا شاعر ممنرموس ایک عجیب و غریب شخصیت کا مالک تھا۔ ناکام محبت اس کے کلام میں اثر کا باعث بنی۔ یہ پہلا شاعر تھا جس نے نوحہ کو اظہار محبت کا وسیلہ بنایا۔ یعنی نوحے اور مرثیئے کی مقررہ بحروں میں محبت کے گیت لکھے۔ سیفو کا ابھی بچپن ہی تھا جب یہ شاعر اپنی شہرت کی بلندی حاصل کر چکا تھا۔

سسلی میں ہمیرا کا شاعر سٹیسی کورس پہلا شخص تھا جس نے لمبی رومانی بیانیہ نظمیں لکھیں اور یوں وہ ناول نگاروں کے لئے رہنمائی کا موجب ہوا۔

یہ سب شعراء سیفو کے زمانے کے شاعر تھے یا اس سے تھوڑا عرصہ پہلے ہو چکے تھے اور ان کے کلام نے سیفو کی شاعرانہ نشوونما پر ضرور اثر اندازی کی ہوگی۔ لیکن یونانی شاعری اگرچہ سیفو کے زمانے میں کوئی پرانی چیز نہیں تھی۔ پھر بھی چند قدیم شاعر ایسے ہیں، جن کے مجموعے کلام سیفو کے زیر مطالعہ آئے ہوں گے۔ مثلاً ہومر اور ہسیاد لیکن ان کا کلام رزمیہ صنف سخن کی ذیل میں آتا ہے۔ اس لئے وہ سیفو کی بجائے مردوں کے لئے زیادہ دلکشی کا موجب ہو سکتا ہے لیکن کورنتھ کے یومیلوس اور فریجیا کے اولمپوس کا کلام غزلیہ ہونے کی وجہ سے سیفو کے لئے پسندیدہ ہو سکتا تھا کیونکہ تغزل (لرک) ہی ایک ایسی صنف تھی جس میں یونانی شعراء شخصی اور ذاتی انداز نظر قائم کر سکتے تھے۔ اور شخصی اور ذاتی باتیں ہی یونان کی اس شاعرہ کی خصوصیت بھی تھیں۔ اس کے علاوہ اندازہ ہے کہ اُس نے چند اور قدیم شعرا کا کلام بھی ضرور دیکھا ہوگا اور ان میں آرچیلوکوس ایک خصوصیت رکھتا ہے۔ یہ سیفو سے ایک صدی پیشتر کا شاعر ہے۔ اس شاعر نے پہلے ایک لڑکی کی چاہت میں اور پھر اُسی سے متنفر ہو کر اُسی کے خلاف بے حد تلخی آمیز نظمیں لکھیں اور ان نظموں میں وہ اپنے دل کی گہرائی کو عریاں کرنے میں اتنا بڑھ جاتا ہے کہ اُن یونانی شعراء میں اُس کا پہلا درجہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ جن کی شخصیت کا آئینہ دار اُن کا اپنا کلام ہو۔ اسی شاعر کی تلخ نظموں نے چلتے چلتے طنزیہ نظموں (یا ہجو) کی مستقل حیثیت اختیار کر لی۔

ایک شاعر اور بھی ہے۔ سائمونائیڈیز آرچیلوکوس سے چند ہی سال بعد ہوا ہے۔ یہ بھی ذاتی اور ہجویہ نظمیں لکھتا تھا اور اس کی بہترین نظم وہ ہے جس میں اُس نے عورت کی ہجو کی ہے اور اس میں کینہ ور عورت کو بلی، باتونی عورت کو بھونکتے ہوئے کتے، مکار عورت کو لومڑ اور گندی عورت کو سؤر سے تشبیہہ دی ہے۔

اِن شعراء کے علاوہ چند اور ایسے شعراء کے نام بھی ملتے ہیں۔ جن کا کلام قیاساً سیفو کے مطالعہ میں آیا ہوگا لیکن یہاں اس بات کو نہیں بھولنا چاہئے کہ خود سیفو بھی یونان کے شعرائے متقدمین ہی میں سے ہے اور اس کی حیرت ناک ذہانت کو شعر و ادب میں اپنے سے پہلے بہت کم رہنما مل سکے۔ وہ مشہور شعراء اور ڈرامہ نگار جن سے یونان کے ادب کو دنیا میں اہمیت حاصل ہوئی سیفو کے بعد معرض وجود میں آئے۔ ایسکیلوس (المیہ کا حقیقی موجد) پنڈار (غزل گو) سوفوکلز اور یوری پائیڈز (مشہور ڈرامہ نگار) ارسطفین (ARISTOPHANES) ان سب کا زمانہ بعد کا ہے۔ سیفو غزل گو شعراء کی صف میں سب سے پہلے ہی دکھائی دے جاتی ہے۔ اس کی ناقابل تقلید شعری تخلیقات کا سرچشمہ اُس کا اپنا جذبات سے لبریز دل تھا۔ اس کے اپنے نفیس احساسات تھے، اور اُس کی اپنی طبع سلیم تھی۔ اور ماضی کے خزانوں سے اُس نے بہت ہی غیر اہم استفادہ کیا تھا۔

اُس کے اشعار میں تکلف یا بہانہ سازی نام کو بھی نہیں ہے۔ اور اس کی وجہ اُس کی ہر طرح کے سماجی معیاروں سے بے پروائی

ہے۔ اس کے اشعار میں ایک سادگی ہے۔ ایک بے ساختگی ہے، اچھوتی چیزوں ایسا ایک جادو ہے، جیسے صبح کا پہلا دھندلکا ہو یا جیسے نوجوانی کے میٹھے دن، ایسی ہی اس کی شاعری ہے۔ اس کے شعروں میں ایک ایسی پہلو بچاتی ہوئی دل کشی ہے، جس کی وجہ معلوم کرنے سے ہمارا ذہن قاصر ہے، اور جس کی مثال ہمیں ماضی اور حال میں کہیں اور مہیا نہیں ہو سکتی۔

جے۔ ڈبلیو میکائیل ایک جگہ لکھتے ہیں "ہم چند ایسے سیدھے سادے لفظوں کو پڑھتے ہیں جنہیں بہت سیدھے سادے طریقے پر یکجا کر دیا گیا ہے۔ انہیں پڑھ کر ہم اُن کی ستائش کرتے ہیں اور پھر ہمارا ذہن چلتا ہوا آگے بڑھ جاتا ہے، لیکن اچانک ہم محسوس کرتے ہیں کہ جو شعر ہم نے پڑھا اس میں کوئی ایسا جادو تھا جو ہمیں لوٹنے پر مجبور کر رہا ہے۔ ہم لوٹتے ہیں، پھر چل دیتے ہیں، لیکن وہ جادو ہمیں ایک بار پھر وہیں لے آتا ہے تاکہ ہم معلوم کر سکیں کہ اس بے پناہ سحر کی نوعیت کیا ہے"۔

قدیم یونانی نقادانِ ادب سیفو کو انسانی شعرا میں شمار نہیں کرتے تھے وہ اُسے افروڈائٹ (رتی) اور ایروس (کام دیو) کی بیٹی کہتے تھے، دسواں سروش غیبی سمجھتے تھے۔ دیویوں کی پروردہ جانتے تھے اور اپالو دیوتا کی ہم جلیس خیال کرتے تھے لیکن ہم آج بھی ان چند ادھورے ٹکڑوں ہی سے اندازہ کر سکتے ہیں کہ ان قدیم نقادوں کی رائے کچھ بے جا نہ تھی۔

جب ایتھنز والوں سے لیسبوس کی جنگ ختم ہوئی تو سپہ سالار پٹاکوس کو لیسبوس میں ایک قسم کے ڈکٹیٹر کی حیثیت سے اقتدار حاصل ہوا لیکن وہ کسی اونچے گھرانے سے تعلق نہ رکھتا تھا جس طرح آج کل یورپ میں ڈکٹیٹروں کا راج ہے۔ اسی طرح سیفو کے زمانے میں یونانی علاقوں کی حالت تھی۔ اور اگرچہ یہ ڈکٹیٹر حکومت کے کام کاج اکثر احسن طریق پر انجام دے سکتے تھے پھر بھی اُن سے امرا کا طبقہ مطمئن نہ تھا۔ کیونکہ یہ عموماً اپنی قوت بازو ہی سے حاکم کے درجے تک پہنچتے تھے ان کی اپنی لیاقت ہی انہیں اس اونچے درجے تک لے جاتی تھی۔

پٹاکوس الکیاس شاعر کے بڑے بھائیوں کی مدد سے تخت پر بیٹھا لیکن اس سلسلے میں شاعر نے اس کی کوئی مدد نہ کی کیونکہ وہ پٹاکوس سے پہلے ڈکٹیٹر کو بھی قابلِ عزت اور حکومت کے لائق سمجھتا تھا نتیجے کے طور پر پٹاکوس الکیاس کو اپنا دشمن خیال کرنے لگا لیکن ابھی الکیاس کی توجہ سیاسیات کی بہ نسبت شعر و شاعری اور سیفو کی محبت کی طرف زیادہ تھی۔

اسی عرصے میں ایک باغی سردار نے ڈکٹیٹر کا رتبہ اختیار کر لیا۔ پٹاکوس نے اس کی مدد بھی کی۔ لیکن خود بظاہر علیحدہ بھی رہا۔ بہر حال یوں رفتہ رفتہ سنہ ۵۹۴ ق۔م کے قریب حکومت کے خلاف ایک سازش کا قیام عمل میں آیا۔ اس سازش کے روح و رواں الکیاس شاعر اور اس کے بھائی تھے۔ لیکن انہوں نے اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کو بھی اس کام میں شامل کر لیا۔ یہ سازشی گروہ دونوں جنسوں پر مشتمل تھا۔ اور کسی نہ کسی طرح سیفو بھی اس سیاسی معاملے میں آ پھنسی لیکن اس سازش کا راز آشکارا ہو گیا اور الکیاس، اُس کے بھائی، سیفو اور باقی تمام کرتا دھرتا پِرّا کے مقام پر جلاوطن کر دیئے گئے۔ یہ جلاوطنی ایک سال تک رہی۔ کیونکہ جب باغی ڈکٹیٹر کی حکومت ناقابلِ برداشت ہو گئی تو پٹاکوس ہی کے ایما سے اس کو قتل کر دیا گیا۔ پٹاکوس ایک بہت چالاک انسان تھا۔ اُس نے ڈکٹیٹر بنتے ہی ان تمام جلاوطنوں کو واپس بلوا لیا۔

گویا سنہ ۵۸۱ ق۔م۔ میں سیفو وطن کو لوٹی۔ اس وقت اس کی عمر بیس سال کی تھی۔ اور ابھی اُس کا بیاہ نہ ہوا تھا۔ لیکن ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اب بھی وہ پہلے ہی کی طرح ایک معصوم لڑکی تھی۔ کیونکہ ان سیاسی سازش کرنے والوں کے جوشیلے، جوان اور جنون پرور گروہ میں رہ کر یہ لازمی تھا کہ وہ ان تمام باتوں سے شناسا ہو جائے جن کو اُسے اپنی آئندہ زندگی میں اپنا موضوعِ سخن بنانا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی تصویر کا دوسرا رُخ بھی نگاہوں سے دور نہ ہونے دینا چاہیئے کہ سیفو کی کیفیت چھوئی موئی کے پودے کی سی تھی اور ممکن ہے کہ اُس نے اس سازشی ہنگامے میں بھی اپنی نفاست پسندی اور عالی دماغی سے کام لے کر اپنے کو شبانہ عشرتوں سے علیحدہ ہی رکھا ہو۔

اس کی غیر معمولی شخصیت اس بات کا تقاضا کر رہی ہے کہ ہم یہ سمجھیں کہ جلاوطنی اور اس کے بعد کے زمانے میں وہ اپنے مخصوص سیاسی حلقے کی جان ہو گی اور الکیاس اور وہ دونوں ہی اس گروہ کے روح و رواں ہوں گے۔ یہ مانا کہ سیفو کی شاعری میں ایک نقطہ بھی کسی طرح کے سیاسی رجحانات کی چغلی نہیں کھاتا۔ لیکن اسی بات سے اس کی سیاسی کارکردگی کا اظہار ہوتا ہے کہ اپنے چند دوسرے ساتھیوں کے ساتھ

اُسے بھی پٹاکوس نے جلاوطنی کے لئے منتخب کر لیا تھا۔ اگر وہ سیاسی لحاظ سے خطرناک نہ سمجھی جاتی تو اس کی جلاوطنی کی نوبت نہ آتی۔

جلاوطنی کے بعد بھی الکیس پٹاکوس کے خلاف نظمیں لکھ لکھ کر لوگوں کو بھڑکاتے رہے سے باز نہ آیا۔ اس لئے آخر اس کی گرفتاری کے وارنٹ جاری کر دیتے گئے لیکن وہ بھاگ نکلا اور سات کے علاقے سے اپنے دوستوں کی مدد سے دوبارہ جمع کر کے بغاوت پیدا کرنے لوٹا لیکن اس کی تجویزیں کامیاب نہ ہوئیں اور اُسے گرفتار کر لیا گیا۔ اس پر بھی پٹاکوس نے اپنی چالاکی یا فیاضی کا ثبوت دیتے ہوئے اُس کو معاف کر دیا۔ لیکن سازشیوں کی سرگرمیاں بس نہ ہوئیں اور پٹاکوس کو تنگ آ کر ان تمام کو ایک بار پھر لیسبوس سے جلاوطن کرنا پڑا۔

سیفو کے لئے یہ دوسری جلاوطنی لازماً ایک زبردست صدمہ ثابت ہوئی ہوگی۔ کیونکہ ابھی وہ صرف بیس سال ہی کی تھی اور اُس نے اُس سے پہلے لیسبوس کے ساحلوں کو خیرباد نہ کہی تھی۔ نیز اُسے اپنے وطن سے بے حد وابستگی تھی۔ اُس کے بہت سے دوستوں نے اس مصیبت کے وقت میں اُس کا ساتھ نہ دیا۔ اسی بے وفائی کا ذکر اُس نے اپنے ذیل کے مصرعے میں کیا ہے:۔

"جن سے میں نے بھلائی کی، وہی مجھے دُکھ دے رہے ہیں"

شاید انہی بے وفاؤں سے مخاطب ہو کر اُس نے یہ بھی لکھا ہو:۔

"لیکن اس کے باوجود مجھے کلام کے فرشتوں سے سچی خوشی حاصل ہوئی ہے اور جب میں مر گئی تو لوگ مجھے بھول نہ سکیں گے"

دوسری بار جلاوطن ہو کر سیفو خواہ اپنی مرضی سے خواہ پٹاکوس کے حکم سے سسلی کے جزیرے میں گئی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہاں یونانی نوآبادیات قائم تھیں۔ جہاں تک موجودہ محققین کی معلومات کا تعلق ہے سیفو نے اپنی اس سزا کے متعلق کسی طرح کا احتجاج نہیں کیا اور چپ چاپ سسلی کو روانہ ہو گئی۔

بظاہر اس بات کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ دوبارہ جلاوطنی کا زمانہ بسر کرنے کے لئے سیفو نے سسلی کے دور دراز جزیرے کو کس بنا پر منتخب کیا۔ کیونکہ یہ بات اُسے ضرور معلوم ہو گی کہ وہاں جا کر اُسے وہ آزادی میسر نہ ہو سکے گی جو لیسبوس میں عورتوں کا سماجی حق تھی۔ ہاں، ایک بات سمجھ میں آتی ہے کہ سسلی کے رہنے والے اپنی عشرت پرستانہ طرزِ زندگی کے لئے بھی مشہور تھے۔ اُن کے شبانہ جلسے، اُن کا شوقِ خورد و نوش اور اُن کے بے باک گیت اور اُن کی مے نوشی ضرب المثل کی حیثیت رکھتی تھی بلکہ افلاطون کی زبان میں کہا جا سکتا ہے کہ ضبطِ نفس اور پاکیزگی کا وہاں کسی کو کبھی خیال تک بھی نہ آتا تھا اور اس طرح کا طرزِ حیات ایک فن کار، اور خصوصاً ایک شاعرہ کے لئے ایک سرا پا دلکشی رکھتا ہے اور اس لئے ممکن ہے کہ سیفو وہاں اسی دلکشی کی وجہ سے گئی ہو، اگرچہ پیشہ ور عورتوں کے علاوہ دوسری عورتوں کو پابند زندگی گذارنی ہوتی تھی خصوصاً سیفو ہی کے زمانے میں کورنتھ کے شہر میں پیریانڈر اور ایتھنز میں سولون عورتوں کی آزادی کو محدود کرنے میں بہت سرگرمی سے کام لے رہے تھے۔

ان حالات کے مدِنظر سسلی کو جاتے ہوئے اگر سیفو کا مقصود وہاں کی عشرت انگیز زندگی بھی ہو تو اس سلسلے میں بھی اس کی توقعات ایک حد کے اندر ہی ہوں گی اور یہ بھی ممکن ہے کہ اسی زمانے میں سیفو کو خیال آیا ہو کہ محافظت کے لحاظ سے اگر وہ اپنے کو مناکحت کی زنجیروں میں لے آئے تو کچھ بے جا نہ ہو گا۔ ایک محقق کے مطابق اُس نے ایک بہت امیر تاجر "کیرکلاس" سے شادی کر لی۔ اور اس تاجر سے اس کی ملاقات غالباً سسلی کے سفر کے دوران میں ہی ہوئی ہوگی۔ لیکن اس کی شادی کی تاریخ مقرر کرنے میں ماہرین ناکام رہے ہیں۔ اس لئے یہ بات محض اندازوں پر ہی اپنا دارومدار رکھتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اُسے مناکحت کی زندگی کسی حد تک مسرت آمیز معلوم ہوئی کیونکہ وہ بیوگی کے زمانے میں ایک جگہ یہ کہتی ہے کہ اگر وہ اب بھی اس قابل ہوتی تو دوبارہ شادی کر لینے میں کسی طرح کی جھجک محسوس نہ کرتی بلکہ ایک اور مقام پر وہ سہاگ رات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتی ہے کہ وہ ایک ایسی مسرت کی رات تھی جو بہت جلد بیت گئی۔ ان حوالوں کے باوجود ایک دو جگہ اُس کے کلام میں اس انداز کے مخالف اشارے بھی پائے جاتے ہیں۔ مثلاً ـــــ

"کیا یہ ممکن ہے کہ میں اب بھی دوشیزگی کی تمنا ہی دل میں لئے بیٹھی ہوں؟"

اور ایک جگہ اور ـــــ

"میں ہمیشہ کنواری ہی رہوں گی"

ان اشاروں سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ شادی کی زندگی گذار لینے کے بعد بھی اُس کے انفرادی احساس تنہائی میں کسی قسم کا فرق نہ پیدا ہوا تھا اور یہ ایک ایسی ذہنی اور نفسی کیفیت ہے جس کا اظہار کسی دلہن کے آنسوؤں کی صورت میں ہوتا ہے اور اکثر دولہاؤں کو ایک اچنبے میں ڈال دیتا ہے۔

بہر حال مناکحت سے اُسے ایک فائدہ ضرور ہوا کہ جس طرح وہ بے روک زندگی بسر کرنا چاہتی تھی، اُس میں اُسے پہلے سے کہیں زیادہ آزادی حاصل ہو گئی۔ نیز اس کی تازہ دولت بھی خوش منظر سسلی سے لطف اندوز ہونے میں اُس کی معاون ثابت ہوئی اور سسلی ہی میں وہ ایک لڑکی کی ماں بھی بنی۔ اس کا نام اس نے اپنی ماں کی یاد میں کلیس رکھا سیفو کے کلام میں دو جگہہ ایسے فقرے آتے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُسے اپنی اس اکلوتی بچی سے بہت محبت تھی۔

سسلی کے زمانۂ قیام میں اُس کے احباب کا حلقہ کن افراد پر مشتمل تھا، یہ ہم نہیں جانتے۔ البتہ یہ پتہ چلتا ہے کہ اسی زمانے میں اس کی ماں کا انتقال ہوا۔ نیز اس کا خاوند کیر کلاس بھی مر گیا۔

روایتی نقطۂ نظر سے سیفو کسی طرح کے اخلاقی اصولوں کی پابند نہ تھی۔ لیکن اس بات سے ہم انکار نہیں کر سکتے کہ دل کی صفائی اور پاکیزگی اُس کا مطمحِ نظر تھا۔ کسی مرد کے ہاتھوں اپنے روح و جسم کو یکسر سونپ دینا اس کے لئے کوئی خوشگوار عمل نہ تھا۔ مثلاً وہ ایک جگہہ اپنے کو "ابدی دوشیزہ" لکھتی ہے۔ اس کے کلام کے جو ٹکڑے زمانے کی دست برد سے بچ رہے ہیں ان میں کئی مقاموں پر وہ اُن لڑکیوں کے لئے تعریفی کلمے کہتی ہے۔ جو ابھی دوشیزہ تھیں اور اُن سے صاف ظاہر ہے کہ اچھوتی رومیں اور اچھوتے جسم اس کے لئے کس قدر دلکش اور دل پسند تھے۔

"نرم آواز والی دوشیزائیں" "میٹھی آواز والی دوشیزائیں" "نازک شکنوں والی دوشیزائیں" "مٹی لین کی دوشیزائیں" "گلاب کی کلیوں ایسی دوشیزائیں" "محبت کے گیت گاتی ہوئی دوشیزائیں" "بے مثال دوشیزائیں" "اور ایسی دوشیزائیں جن کی تمنا کی جائے"۔ یہ سب کلمے اس کے دل کی اس دلبستگی کو ظاہر کرتے ہیں جو اُسے دوشیزگی سے تھی۔ ایک جگہہ وہ دلہن کی زبان سے یہ سوال نکلواتی ہے:۔

"دوشیزگی! اے دوشیزگی! تو مجھے چھوڑ کر کہاں چلی گئی!—
کہاں چلی گئی اے مقتول!؟"

اور دوشیزگی جواب دیتی ہے:۔

"جہاں سے میں کبھی نہ لوٹوں گی، تیرے پاس کبھی نہ آؤں گی"

اس سوال اور اس کے جواب سے یہ بات محسوس ہوتی ہے کہ گویا خود سیفو کو کوئی ایسا نقصان ہوا ہے جسے بیان میں نہیں لایا جا سکتا۔

سیفو کے سسلی میں قیام کی مدت بھی غیر یقینی سی ہے لیکن ایک بات واضح ہے کہ جتنا عرصہ بھی وہ وہاں رہی اُسے وہاں کے علمی ادبی اور سماجی حلقوں میں ایک نمایاں امتیاز حاصل رہا۔ یہی زمانہ تھا جب اُس کے اشعار کو پہلی بار شاہکار تسلیم کیا گیا۔ لیکن جلاوطنی کے آخری زمانے تک اُس کی دلکش شخصیت کو بھی بے مثال مان لیا گیا اور اس زمانے میں اس کی دولت، ذہانت اور نفاست طبعی کی شہرت دُور دُور تک جا پہنچی۔ لیکن جب وہ سسلی سے لیسبوس کو لوٹی تو عمر کے لحاظ سے جوان ہی تھی یعنی اُس کی عمر چھبیس سال کی تھی کہ پٹاکوس نے اُس کی جلاوطنی کو منسوخ کرنے کے احکام جاری کر دیئے۔

سیفو اور دوسرے جلاوطن امرا کی واپسی کی وجہ یہ تھی کہ پٹاکوس کا اقتدار ایک ڈکٹیٹر کی حیثیت سے پختہ ہو چکا تھا اور اُس نے اپنی بہتر حکومت سے لوگوں کی ہمدردی پوری طرح سے حاصل کر لی تھی۔ اس لئے اُسے جلاوطن اُمرا کی واپسی سے کسی طرح کی تازہ بغاوت کا خطرہ نہ ہو سکتا تھا۔ اُس نے سیفو کے سب سے چھوٹے بھائی لیری کوس کو ایک معزز عہدے پر فائز کر دیا تھا۔ سیفو نے بھی اس وقت سے بہت پہلے ہی اپنی شخصیت اور شاعری کی بنا پر اپنے لئے ایک امتیاز پیدا کر لیا تھا اور اُس کے بھائی کی ترقی بھی ایک طرح سے اُسی کی تحسین کا اظہار تھی۔ نیز وہ خود اپنے خاوند سے حاصل شدہ دولت کی بنا پر ایک امیر عورت تھی اور اُسے بسر اوقات کے لئے کسی طرح کی فکر اور اندیشے کی ضرورت نہ تھی۔ چنانچہ اُس نے ان خوشگوار حالات میں کسی قسم کے ارادے یا باقاعدہ تجویز کے بغیر اپنے ارد گرد چند ہم رتبہ نوجوان عورتوں کو اکٹھا کر لیا۔ اور اُنہیں نہایت توجہ سے وہ فنون سکھانے شروع کئے جن کی وہ خود ماہر تھی۔ مثلاً شعر و شاعری، موسیقی اور رقص۔ اُس کی یہ تمام ہمہدم ساتھنیں نوجوان تھیں۔ اور وہ بذات خود بھی ابھی نوجوان ہی تھی۔ البتہ جلاوطنی سے لوٹنے پر اُس کی امارت، ذہانت اور نفاست طبعی کی کچھ ایسی دھوم مچ چکی تھی کہ مٹی لین کی خواتین کے فیشن ایبل حلقے میں اُسے ایک

نمایاں امتیاز کا مالک جان لیا گیا۔

سیفو اپنی ان نوجوان عورتوں کے حلقے کو "ہیٹیرے" کے لفظ سے بیان کرتی ہے۔ یہ بات کچھ کھٹکتی ہے کیونکہ اسی لفظ سے بعد میں جا کر اُن تربیت یافتہ طوائفوں کو پکارا جانے لگا جو یونانی امراء کا دل بہلاتی تھیں۔ لیکن سیفو کے زمانے میں اس لفظ کے ساتھ کوئی ایسا ناگوار تلازم خیال نہ تھا۔ نہ اس لفظ کے ترجمے کے لئے زنانی یا دوگانا کی اصطلاحات سے مدد لینا چاہیئے۔ کیونکہ اُس وقت اس کا مفہوم بعینہٖ وہی تھا جو آج ہماری سماج میں "سہیلی" یا "دوپٹہ بدل بہن" کے کلمے سے لیا جاتا ہے "ہیٹیرے" ایک بے تکلف سنگت تھی۔ ہمدم و ہمراز نوجوان عورتوں کا ایک جھرمٹ تھا اور زیادہ امکان اسی بات کا ہے کہ ان سے سیفو کا تعلق یکسر انفرادی تھا۔ کسی قسم کی سماجی یا تعلیمی روایات کو اس سنگت کی بنیاد سمجھنا ایک غلطی ہے۔ سیفو کو اس بات میں ایک لطف آتا تھا کہ اُس کے آس پاس ایسی نوجوان لڑکیوں کا ایک جمگھٹا رہے جو اس کے گھر میں آزادانہ رہیں سہیں، گھر کے باغوں میں پھریں، اُس کے لئے ذرا ذرا سی باتیں کرنے کو ہر وقت تیار رہیں، اور ایک مثالی عورت کی طرح اس کی پرستش کریں، اور ساتھ ہی ساتھ اُس سے ایک ایسے دوست کی حیثیت میں جو اُن سے کہیں بڑھ کر تجربہ کار ہو، لیسبوس کے تہذیب و تمدن کی اُن خصوصیات کو حاصل کریں جن میں اب سیفو مسلی کی نفاست پرستی کو بھی ملا سکتی تھی۔

یہ نوجوان لڑکیاں جو سیفو کے اس مہذب علمی اور ادبی جھرمٹ میں شامل ہوئیں خود بھی دلچسپ اور دلکش انفرادیت کی مالک تھیں۔

ان میں سے ایک اناکٹوریہ تھی اور سیفو ہی کے زمانے کی ایک شاعرہ ایرینہ بھی تھی۔ جو شاعرہ ہونے کے علاوہ ایک حسین اور نازک اندام لڑکی تھی۔ اس نے ایک لمبی رزمیہ نظم لکھی تھی جس کی اب صرف چند سطریں ہی دستیاب ہو سکتی ہیں، اسی شاعرہ کے متعلق سیفو ایک جگہ لکھتی ہے کہ "میں خیال نہیں کرتی کہ اس فن میں دنیا کی کوئی دوشیزہ تمہارا مقابلہ کر سکتی ہو"۔ اس سے سیفو کو بہت دلبستگی ہو گئی۔ یہاں تک کہ یہ دلبستگی رفتہ رفتہ ایک رومانی جذبے میں تبدیل ہو گئی۔ لیکن افسوس کہ بہت جلد یہ نوجوان شاعرہ انتقال کر گئی۔ اس کے علاوہ ایک اور شاعرہ دیمو فیلہ تھی، یہ محبت کے گیت لکھتی تھی۔ اس کا اپنا میلانِ طبعی بھی سیفو ہی کی طرح ہم جنس افراد کی طرف تھا۔ اس نے بعد ازاں اپنا ایک علیحدہ جھرمٹ بنا لیا۔ اس کے علاوہ چار اور لڑکیوں کے ناموں کا بھی پتہ چلتا ہے۔ جن میں سے ایک کے متعلق سیفو کا ایک ادھورا ٹکڑا موجود ہے:۔

"بہتے ہوئے قدموں والی ننھی دوشیزہ"

یہ تمام لڑکیاں ایسی تھیں جو سیفو کی شہرت سے متاثر ہو کر بیرونی علاقوں سے مٹی لین پہنچی تھیں۔ باقی لیسبوس ہی کی رہنے والی تھیں۔ ایک اتھیس تھی۔ اس کے حالات کے متعلق محققین کو بہت حد تک واقفیت ہے۔ اسی کے متعلق سیفو لکھتی ہے۔

ایک زمانہ

میں نے بھی ایک زمانے میں تم سے الفت کی ہے
ایک زمانے میں جس کو اب مدت ہی گذری ہے۔

چار اور لڑکیاں لیسبوس کی تھیں۔ اتھیس کے ساتھ ہی ان سب کے لئے سیفو کے دل میں عموماً جذباتی احساسات تھے لیکن سب سے بڑھ کر اس کی والہانہ رومانی شیفتگی اتھیس کے لئے تھی۔

اتھیس اور سیفو کی المناک محبت کا واقعہ ایک ایسا سانحہ ہے۔ جس میں دو چار بہت سخت مقام آتے ہیں۔ کیونکہ اس واقعے سے جہاں برساتی ندی کی سی طوفانی اور اندھی محبت کا غم اندوز شیریں اظہار ہوتا ہے وہیں یہ اندیشہ بھی لاحق ہو جاتا ہے کہ تنگ خیالی کہیں اپنے شکوک سے اس پھول کے ساتھ کانٹوں کی موجودگی نہ ثابت کر دے۔ ایک عام انسان کی نگاہوں میں ہمدردی پیدا کرنے کے لئے ہمارے پاس اس محبت کے حق میں کوئی دلیل نہیں ہے۔ البتہ اپنے دائرہ نظر کو ذرا وسعت دے کر ہم اس واقعے کو ہمدردانہ نگاہوں سے دیکھ سکتے ہیں۔

جب یہ معاملہ شروع ہوا تو اتھیس ایک نوجوان لڑکی تھی اور سیفو کی عمر پچیس سے تجاوز کر چکی تھی۔ ان دونوں میں ایک ایسا جذباتی بندھن پیدا ہو گیا جس کو دیکھتے ہوئے لوگوں نے انگلیاں اٹھائیں اور ممکن ہے کہ اس بہتان یا رسوائی کی بنا پر ہی بعد میں سیفو کا کلام نذرِ آتش کر دیا گیا ہو۔ کیونکہ اُس کی بیشتر نظموں کی مخاطب اتھیس ہی تھی۔ لیکن اب جبکہ ان نظموں کے ادھورے ٹکڑے ہمیں دستیاب ہو چکے ہیں اور ہم انہیں غیر جانبدارانہ نگاہوں سے جانچ سکتے ہیں تو کون کہہ سکتا ہے کہ ان جواہر ریزوں کو ضائع کر دینے سے دنیا کو فائدہ ہوا بلکہ ہم تو یہی کہیں گے کہ تنگ خیال حضرات نے چند نہایت نادر اور

حسین تخلیقاتِ شعری سے آنے والی نسلوں کو محروم رکھا۔ کیونکہ حسن کی تخلیق کے لئے کسی قسم کے ہنگامی کلیئے قاعدے کی حاجت نہیں ہوتی۔ اس کا باعث ہمیشہ استثناء ہوتی ہے۔ اخلاقی قوانین اور معیار تو ہر روز بدلتے رہتے ہیں۔ آئے دن پیدا ہوتے رہتے ہیں لیکن تخلیقِ حُسن روزمرّہ کی بات نہیں ہے۔ سیفو اور اتھیس کی ملاقات کے وقت اتھیس ایک ناتجربہ کار نوجوان لڑکی تھی اس کا ثبوت سیفو کے ان شعروں سے ملتا ہے، جو اُس نے اتھیس کے نام" کے عنوان سے لکھے ہ۔

اتھیس کے نام

میں نے بھی ایک زمانے میں تم سے الفت کی ہے،
ایک زمانے میں جس کو اب مدّت ہی گذر ی ہے،
جبکہ مرا بالاپن بھی تھا پیارے پھولوں ایسا،
اور تمہیں دنیا کہتی تھی ناداں ہے، ننھی ہے!

لیکن جوں جوں وقت گذرتا گیا اتھیس ایک جوان اور حسین عورت بنتی گئی۔ اور اس شعر و ادب کے دلدادہ جھرمٹ میں سب سے ہونہار معلوم ہونے لگی۔ لیکن اس کی جوانی کے ساتھ ہی سیفو کا جذبہ بھی پختگی اختیار کرتا گیا۔ اتھیس کا اندازِ نظر سیفو کے متعلق کیا تھا، اس کا اظہار ایک خط سے ہوتا ہے۔ سیفو اپنی بیٹی کلیس اور اتھیس اور چند اور لڑکیوں کے ساتھ ایک بار گرمیوں کا موسم گذارنے کے لئے پہاڑی علاقے میں گئی۔ لیکن موسم ختم ہونے پر بھی سیفو وہاں سے ہلنے کا نام نہ لیتی تھی۔ اگرچہ اُس کی نوجوان ساتھنیں وہاں سے متی لین کو لوٹنا چاہتی تھیں کیونکہ اس جگہ سے اُن کا جی بھر چکا تھا۔ آخر سیفو نے ایک روز اُن سے وعدہ کر لیا کہ کل لوٹ چلیں گے۔ لیکن دوسرے روز صبح دیر تک وہ بستر ہی میں محوِ استراحت رہی۔ اتھیس نے سیفو کو ایک رقعہ لکھا اور نوکرانی کے ہاتھ بھجوا دیا تاکہ وہ جلد جانے کے لئے تیار ہو۔ اس میں لکھا ہے:۔

"سیفو! میں قسم کھاتی ہوں کہ اب تمہیں نہ چاہوں گی۔ ہمارے لئے ہی اُٹھو اور اپنے بیٹھے بوجھ کو بستر سے دُور کر دو اور ایک بے داغ کنول کے پھول کی طرح جھیل کے کنارے اپنا شب خوابی کا لباس اُتار پھینکو اور جھیل کے پانی میں نہا لو اور کلیس صندوقوں سے نکال کر تمہارے لئے ایک زعفرانی زیر جامہ، ایک گلابی پیرہن اور ایک عبا لے آئے گی اور پھر ہم تمہارے سر پر پھولوں کا تاج پہنا دیں گے۔ اور پھر تم پر ایک ایسا روپ نکھر آئے گا جو مجھے دیوانہ بنا دیتا ہے اور پھر پکتھی، نودا اور میں مل کر سب کے لئے صبح کا کھانا تیار کر لیں گے۔ کیونکہ آج ہم پر دیوتا مہربان ہیں۔ آج سیفو جو عورتوں میں سب سے پیاری ہے، ہم سب کو اپنے بچّوں کی طرح ساتھ لے کر متی لین کے شہر کو لوٹ چلے گی، وہ شہر جو سب شہروں سے پیارا ہے"

شہر پہنچنے پر بہت سے نوجوانوں کو اتھیس کی طرف رغبت ہوئی اور اس سے سیفو کے دل میں حسد کے شعلے بھڑک اٹھے۔ کیونکہ اب اُس کے دل کا جذبہ ایک طوفان کی صورت اختیار کر چکا تھا۔ اسی زمانے میں اُس نے اپنا مشہور گیت لکھا۔ جسے ذیل میں درج کیا جاتا ہے:۔

دیوتاؤں کی طرح مجھ کو نظر آتا ہے؛
سامنے بیٹھ کے جو دیکھتا ہی جاتا ہے
تری صورت کو۔ تری میٹھی صدا سنتا ہے،
قہقہے کی ترے مستانہ ادا سنتا ہے!
میرے سینے میں مرا دل بھی لرز اٹھتا ہے،
آہ! اک جذبۂ بسمل بھی لرز اُٹھتا ہے!
گھُٹ کے رہ جاتی ہے سینے ہی میں آواز مری،
دیکھ لیتی ہوں جو اک لمحہ بھی صورت تیری!
گویا منہ ہی میں نہ تھی ایسے زباں ہوتی ہے،
آگ سی جسم میں اک میرے تپاں ہوتی ہے،
میری آنکھوں کو نظر آتی نہیں کوئی شئے،
اور کانوں میں بھی اک شور چلا آتا ہے!
لیکن افسوس کہ قسمت میں "نہیں" لکھا ہے،
دکھ ہی سہتی رہوں میں میٹھی نہیں، لکھا ہے۔
زندگی دُکھ سے رہائی نہیں دیتی مجھ کو،
موت بھی دُور دکھائی نہیں دیتی مجھ کو!

ایک نقاد لکھتا ہے کہ اس نظم میں سیفو نے احساسات کا ایک حیرت ناک اجتماع پیدا کر دیا ہے جسم و روح، سماعت، گفتار، بصارت، نفسی احساس، ان سب مختلف باتوں کو ایک کوزے میں

لے پہلے شعر کا ترجمہ منصور احمد مرحوم کا ہے۔ م۔

بند کر دیا ہے۔ اس کے ہوش تو قایم ہیں لیکن وہ مجنون بھی ہے، اس کے دل میں آگ لگ رہی ہے، لیکن ایک موت کی برفانی خنکی کا بھی اسے احساس ہے۔

اسی زمانے میں جب اتھیس سیفو کے جھرمٹ کی رونق بنی ہوئی تھی، مٹی لین میں موسیقی اور شاعری کا ایک سکول بھی قایم تھا اور وہاں کی معلمہ کا نام اینڈرومیڈا تھا۔ اس معلمہ نے اتھیس کو ترغیب دی کہ وہ سیفو کے جھرمٹ کو ترک کر کے اس کے سکول میں شامل ہو جائے سیفو کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو اس نے اتھیس کے نام چند اشعار لکھے جن میں سے یہ ٹکڑا ملتا ہے۔

"گنواروں کا لباس پہننے والی یہ کون گنوار عورت ہے جس نے تم پر جادو کر دیا ہے؟ اسے تو اپنی ٹانگوں کے گرد لباس کو لپیٹنے کا سلیقہ بھی نہیں ہے"۔

لیکن اتھیس ترغیب کے جال میں آ چکی تھی اور سیفو کو چھوڑ کر جانے کو تھی کہ سیفو نے لکھا:

"پیاری اتھیس! تو کیا تم وہ سب باتیں بھلا دو گی جو بیتے دنوں میں ہم تم میں ہوئیں؟"

اور ایک اور جگہ:-

"جب میں تمہیں دیکھتی ہوں تو مجھے یوں معلوم ہوتا ہے کہ ہرمیون، ہیلن کی بیٹی، کبھی بھی تم ایسی نہ تھی۔ اور کسی فانی عورت کی بجائے تمہیں ہیلن سے تشبیہہ دینا ہی صحیح ہے اور میں تم سے کہتی ہوں کہ میں تمہارے حسن کو اپنے تمام خیالات کی بھینٹ کرتی ہوں، تمہیں اپنے تمام احساسات سے پوجتی ہوں"۔

سیفو کے ان واسطوں سے کچھ عرصے کے لئے اتھیس پھر اس کے پاس آ گئی۔

"تم آ گئی ہو اور اب کسی بات کا کھٹکا نہیں ہے، اور اب تم نے میرے دل میں محبت کے شعلوں کو بھڑکا دیا ہے"۔

ایک اور جگہ ایک شعر ہے:-

"ابھی! تم سے میں جدا کر دی گئی تھی، تمہیں سے میں پھر مل گئی"

گویا ؎

ہر کسے کو دور ماند از اصل خویش
باز جوید روزگارِ وصل خویش

لیکن اتھیس کو اب سیفو سے محبت نہ رہی تھی اور ممکن ہے کہ اس کے والدین اور والی وارث اب اسے سیفو سے علیحدہ کر لینا چاہتے ہوں۔ سیفو اپنے غم کا اظہار ذیل کے اشعار میں کرتی ہے:

بندِ عشق[۱]

اب مجھ کو گرفتار محبت نے کیا ہے،
سر تا بہ قدم خوف سے میں کانپ گئی ہوں!
تلخی ہے تو شیریں ہے، ستم ہے تو مروت،
اس راحتِ جانسوز کو میں بھانپ گئی ہوں،
لیکن مری اتھیس مجھے چھوڑ چکی ہے،
اک غیر سے وہ رشتۂ دل جوڑ چکی ہے!

اینڈرومیڈا کے خلاف سیفو کے دل میں ایک زبردست غصے کا جذبہ پیدا ہو گیا۔ جس کا اظہار ایک ٹکڑے سے ہوتا ہے۔

"جب تو مر جائے گی تو تجھے کوئی یاد تک نہ کرے گا، کیونکہ تو نے گلاب کے پھول کھلانے میں کبھی کوئی حصہ نہ لیا۔ تو موت کے مکان میں بھولے ہوئے مردوں کی طرح بے نام و نشان گھومتی پھرے گی"۔

لیکن اس آہ و زاری کا کیا فائدہ! انجام کار اتھیس اپنی یا دوسروں کی مرضی سے سیفو کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ کر چلی گئی۔ شاعرہ کی فریاد ایک فقرے میں محفوظ ہے،

"اب میں اتھیس کو پھر کبھی نہ دیکھ سکوں گی، میں تو اب مر ہی جاؤں تو اچھا ہو!"

لیکن آسمانی فرشتوں نے شعراء کو ایک ایسا تحفہ دے رکھا ہے جس سے وہ اپنے غموں کو ہلکا کر سکتے ہیں۔ شاعری ان کے ذاتی احساسات کو عوام کی نظروں میں لا کر ان کی پوشیدہ اذیت کو کم کر دیتی ہے۔ سیفو کو اپنی اس ناکام اور قابلِ رحم محبت سے معلوم ہو گیا کہ یہ جذبہ ایک "راحتِ جاں سوز" کا باعث ہوتا ہے بلکہ وہ محبت اور ایک طوفان میں مماثلت پاتی ہے۔

طوفان[۲]

جب عشق کے آثار نظر آتے ہیں
اس طرح یہ جسم و روح گھبراتے ہیں
طوفان میں جس طرح ہوا کے اندر
اشجار کہستان کے تھراتے ہیں

۱؎ پہلے دو شعر منصور احمد کا ترجمہ ہیں م۔ ۲؎ شعر و شاعری ترجمہ از منصور احمد۔ م۔

اب سیفو تیس سال کی عمر کو پہنچ چکی تھی۔ پٹاکوس بہت عمدگی کے ساتھ اپنے فرائض بجالا کر حکومت سے دست بردار ہو چکا تھا۔ اور الکیاس نے بھی اب اپنے باغیانہ احساسات کو دھیما کر کے شراب و شعر سے دل بہلانا شروع کر دیا تھا سیفو کے جو مشاغل تھے اُن میں اس کی عمر گذرتی رہی۔

آخر ۵۸۵ ق۔م میں جب سیفو کی عمر پچپن سال کی تھی، ہم اس کا تصور ایک ایسی ننھی منی سانولی عورت کی شکل میں کر سکتے ہیں جس کے چہرے پر عمر کے آثار ایک باریک بین تو شاید ہی کو نظر آ سکتے ہوں کیونکہ ایک عام انسان کی نظر کو غازے اور بناؤ سنگار کا پردہ دھوکے میں ڈال سکتا تھا لیکن اس کی مسکراہٹ میں اب بھی وہی دلکشی تھی اور اُس کی آنکھوں میں اس کے دل کی آگ کی وہی کبھی نہ مٹنے والی چمک تھی۔ بعض عورتیں ایسی ہوتی ہیں کہ بڑی عمر میں جا کر ان کی شکل و صورت ایک ایسا حسن اختیار کر لیتی ہے جو کئی جوان عورتوں کو بھی میسر نہیں ہوتا و پچپن سال کی عمر کو پہنچنے پر سیفو کی شکل و صورت میں بھی ایک ایسا ہی حسن نمایاں تھا۔

جوانی کے زمانے میں سیفو کے خیالات سماجی حفظ مراتب کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔ لیکن اب عمر کی پختگی کے ساتھ ساتھ اس کی نظر میں ایک وسعت پیدا ہو گئی تھی۔ ایک زمانہ تھا کہ وہ پٹاکوس کے معمولی خاندان سے متعلق ہونے کو ناپسندیدہ نگاہوں سے دیکھتی تھی۔ اینڈرومیڈا کو گنوار عورت کہہ کر اس کا مضحکہ اڑاتی تھی لیکن اب نظر کی وسعت کے ساتھ اس کی زندگی میں ایسا وقت آیا کہ وہ ایک معمولی ماہی گیر کی محبت کے جال میں گرفتار ہو گئی۔ اس ماہی گیر کا نام ہپلاگون تھا۔ لیکن اس نوجوان ماہی گیر کو قبل از وقت جوانی ہی میں موت سے دوچار ہونا پڑا۔

اس زمانے میں مٹی لین میں ایک نوجوان ملاح فاؤن رہتا تھا۔ اس کے حسن کا شہرہ تمام شہر میں پھیلا ہوا تھا۔ اور بہت سی عورتیں اس سے محبت کرتی تھیں۔ سیفو کو اسے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ اور وہ بھی اس کی رعنائی کی تاب نہ لا سکی۔ معلوم ہوتا ہے کہ فاؤن واقعی غضب کا جوان رعنا تھا۔ کیونکہ بعد میں جا کر اس کے متعلق کئی طرح کی مافوق العادت روایتیں مشہور ہو گئی تھیں۔ ہمیں تاریخ سے یہ بات معلوم نہیں ہوتی کہ اول اول سیفو کی فاؤن سے کیونکر ملاقات ہوئی۔ ممکن ہے کہ سیفو نے فاؤن کا بجرا سیر کے لئے کرائے پر لیا ہو اور جب چاندنی سے چمکتی ہوئی سطح آب پر بجرا ستاروں کے سائبان کے تلے بہتا جا رہا ہوگا تو پتوار کے پاس کھڑے ہوئے فاؤن کے حسن و رعنائی کے مجسمے کے قریب یہ جذباتی شاعرہ پہنچی ہوگی۔ اور اپنے اظہارِ محبت سے اس افسانۂ جنونِ عشق کا آغاز کر دیا ہوگا۔ فاؤن کے متعلق بھی سیفو نے کئی گیت لکھے۔ لیکن اس کے بچے کھچے کلام میں کوئی ایسا ٹکڑا موجود نہیں ہے جسے ہم اس نوجوان ملاح سے نسبت دے سکیں۔ البتہ ہم اندازاً کہہ سکتے ہیں کہ ذیل کا ٹکڑا فاؤن ہی کے متعلق محسوس کئے ہوئے جذبات کی چغلی کھا رہا ہے۔

دوست![1]

اے دوست! نگاہ اٹھاؤ،
آنکھوں میں آنکھیں ڈالو،
اس راہ سے دل میں اُترو،
تن من کو حسیں بنا دو!

معلوم ہوتا ہے کہ شروع شروع میں سیفو کے عشق کی شدت نے نوجوان ملاح کو شاعرہ کی طرف مائل کر لیا۔ شاید اُس کی خود پرستی کو اپنے زمانے کی مشہور ترین عورت کی محبت ایک تسکین دیتی ہوئی محسوس ہوتی ہو۔

مٹی لین کی پچھلی طرف کے ایک پہاڑی غار میں راتوں کے اندھیرے میں لپٹی ہوئی سیفو چھپ کر اپنے نوجوان ملاح سے ملنے کو جایا کرتی تھی۔ شاعرہ کو ملاح دل پسند تھا۔ اور ملاح کو شاعرہ کے نغمے۔ اور سیفو کی زبان سے اس والہانہ محبت میں جو بھی لفظ نکلتا ایک نغمہ ہی تو تھا۔ کیونکہ ایک بار پھر وہی محبت جو ایک "راحتِ جانسوز" ہوتی ہے اس کے روح و جسم پر غلبہ پا چکی تھی۔ لیکن یہ خواب گوں کیفیت بہت عرصے تک قائم رہی۔ فاؤن کا جی بھر گیا یا شاید اس نے یہ خیال کیا ہو کہ وہ اس آتشیں نفس شاعرہ کے بوسوں کی تاب نہیں لا سکتا۔ چنانچہ فاؤن چپ چاپ سسلی کی طرف جانے والے ایک جہاز پر سوار ہو کر مٹی لین سے نکل بھاگا۔ کہا جاتا ہے کہ جب سیفو کو اس کی خبر ہوئی تو وہ جہاں تھی وہیں کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ رنگ زرد ہو گیا اور زبان گنگ ہو گئی۔ اُسے یقین نہ آتا تھا کہ اس کا خواب یوں پریشان ہو گیا ہے۔ لیکن جب اُس کے ہوش ذرا قائم ہوئے تو اُسے حقیقت کی تلخی کا پورا احساس ہوا اور وہ ضبط سے بے اختیار ہو کر زار و قطار رونے

[1] ترجمہ منصور احمد۔

اُس نے اپنے بال نوچ لئے اور سینہ پیٹ لیا۔ جب اُس کے بھائیوں اور دوسرے رشتہ داروں کو یہ بات معلوم ہوئی تو انہوں نے اُسے لعنت ملامت کی اور یوں اس کی مصیبت میں اور اضافہ ہوا۔

فاؤن کے چلے جانے کے بعد اُسے سوتے جاگتے اسی کا خیال ستانے لگا۔ آخر جب اُس کی اذیت برداشت کی حد سے باہر ہو گئی تو اُس نے فاؤن کا پیچھا کرنے کی ٹھان لی۔ اور مٹی لین میں اب اس کے لئے کوئی دلچسپی بھی کب تھی۔ اُس کی ہمدم لڑکیوں کا جھرمٹ ٹوٹ چکا تھا۔ اپنے بھائی سے اُسے نفرت تھی۔ اُس کی بیٹی کو اس سے کوئی ہمدردی نہ تھی، اور اُس کے دوست اُسے ناپسند کرنے لگے تھے۔ اور یوں اُسے آئندہ زندگی میں تنہائی اور بڑھاپے کے سوا اور کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ مٹی لین سے وہ کورنتھ کی طرف روانہ ہوئی۔ یہاں سے ہو کر اُس کا ارادہ تھا کہ وہ جنوبی اطالیہ سے ہوتی ہوئی سسلی جا پہنچے گی اُس کے اس سفر کے متعلق کوئی تفصیل معلوم نہیں لیکن ہم اس کے فکر و تردد اور اندیشوں کا اندازہ بخوبی کر سکتے ہیں۔

اپنے اس لمبے سفر کے دوران میں ممکن ہے کہ اُسے محسوس ہوا ہو کہ فاؤن کا تعاقب بے سود ہے۔ سسلی کے قریب پہنچ کر اُس نے سوچا ہو گا کہ اب اُس کے اس تعلق کے از سر نو پیدا ہونے کا کوئی موقعہ ہے یا نہیں۔ کیا فاؤن اُس سے ملنا پسند کرے گا۔ وہ عمر میں اس نوجوان ملاح سے کہیں زیادہ تھی۔ اور فاؤن کی بے وفائی کے صدمے نے اس کی شکل و صورت میں تباہ کن تبدیلی پیدا کر دی ہوگی۔ اور اب جبکہ اسے اپنے اچانک صدمے سے کسی حد تک فراغت حاصل ہو گئی ہوگی۔ تو اُس کا ذہن صاف طور پر سوچنے کے قابل ہو گیا ہوگا۔ اور وہ جان گئی ہوگی کہ اب اُس کے لئے مسرت کا کوئی امکان باقی نہیں رہا۔ اس ناامیدی اور یاس کی تاریکی میں اس نے یک دم مرنے کی ٹھان لی۔ ایک چٹان پر سیر کرتے ہوئے اس نے دوڑ کر چھلانگ لگا دی اور نیچے گہرائی میں موج زن سمندر کی موجوں نے اس کے جسم کو اپنے آغوش میں لے لیا۔ الکیاس شاعر کی ایک نامتمام نظم سے سیفو کی موت کے متعلق چند اشارے ملتے ہیں۔

"۔۔۔۔ بدنصیبی ۔۔۔۔ میں ایک بدنصیب عورت ۔۔۔۔ جس کے لئے دکھ ہی دکھ ہیں ۔۔۔۔ گھربار ۔۔۔۔ دکھوں سے بھری ہوئی تقدیر ۔۔۔۔ رسوائی ۔۔۔۔ زندگی کا ناقابل علاج زوال آنے کو ہے ۔۔۔۔ ڈرے ہوئے سینے میں ایک خوف جاگ اُٹھا ۔۔۔۔ جنون ۔۔۔۔ تباہی ۔۔۔۔ سمندر کی سو جہر لہریں۔"

انجام کار سیفو کا شکستہ جسم سمندر سے برآمد کر لیا گیا۔ اور جلانے کے بعد اُس کی راکھ کو مٹی لین میں دفن کرنے کے لئے روانہ کر دیا گیا کیونکہ اس بات کے حوالے ملتے ہیں کہ اُس کی قبر لیسبوس میں تھی۔

سیفو کے جوہر خداداد سے نہ پرانے نقادوں کو انکار تھا نہ جدید نقادوں کو ہے۔ اور اس جوہر خداداد کا اندازہ ہم ترجموں کے آواگون کے باوجود لگا سکتے ہیں۔ اس کے بعض فقروں میں تو جادو ہے۔ مثلاً

"میں تمہارے حسن کو اپنے خیالوں کی بھینٹ چڑھاتی
ہوں اور تمہیں اپنے تمام احساسات کے ساتھ
پوجتی ہوں"

یا وہ ایک جگہ کسی دوشیزہ کو ایک ایسے میٹھے سیب سے تشبیہ دیتی ہے۔

"جو جھاڑی کی ایک ایسی شاخ پر لگا ہوا ہو جو پھل توڑنے والوں کی نظروں سے اوجھل رہی ہو، نہیں اوجھل نہ رہی ہو بلکہ وہاں تک ان کی دسترس ہی نہ ہو سکی ہو"

سیفو خود کہتی ہے کہ محبت ایک گنوار کو بھی شاعر بنا دیتی ہے اور سیفو تو ایک بہت ہی مہذب اور تعلیم یافتہ عورت تھی، وہ تو یقیناً محبت میں شعریت کو انتہا پر پہنچا سکتی تھی۔ فاؤن کی محبت اور ان کی ملاقاتوں کا رومانی ماحول اس سے ذیل کا نغمہ کہلواتا ہے [1]

جب سطح آبی پر کشتی فاؤن کی بہتی آتی ہے،
مغرب کی سمت سے بہتی ہوئی مستانہ ہوائیں لاتی ہے،
میں تھامے ہوئے بربط اپنا نغمات محبت گاتی ہوں،
اور عشق کے گیتوں سے اُس دم معمور فضا ہو جاتی ہے
اُس شوخ ستمگر پر لیکن کچھ اس کا اثر ہوتا ہی نہیں،
اے دردِ محبت رہنے دے، ناشاد نہ کر برباد نہ کر
جب اُس پہ اثر ہوتا ہی نہیں تو آہ نہ بھر، فریاد نہ کر
اک رنج و الم کی دنیا میں کھوئی ہوئی سی رہتی ہوں،
اور روتے روتے ہواؤں سے ہی پریم کہانی کہتی ہوں
اس شوخ ستمگر پر لیکن کچھ اس کا اثر ہوتا ہی نہیں۔

[1] ترجمہ از اعجاز اسلام آبادی، ہ م۔

اختر شیرانی کہتا ہے ؎

یہ کس کو دیکھ کر دیکھا ہے میں نے بزم ہستی کو
کہ جو شئے ہے نگاہوں میں بھلی معلوم ہوتی ہے

یہ محبت ہے جو ہر شئے کو حسین بنا دیتی ہے۔ سیفو محبت ہی کی متوالی نہیں، حسن فطرت کی بھی شیفتہ ہے۔ اُسے گلاب کے پھولوں سے ایک عشق ہے۔ وہ کسی دوشیزہ کے حسن کو گلاب کے پھول سے تشبیہ دیتی ہے۔ اُن کے بازوؤں میں اُسے گلاب کی پھولوں کی پتیوں کی میٹھی خوشبو اور ملائمت اور نفاست کا احساس ہوتا ہے۔ میواڑ کی میرابائی حسن فطرت سے مگن ہو کر پکار اٹھتی ہے "

دھرتی روپ نؤ نؤ دھر گئی کانت ملن کے کاج!

اور سیفو لکھتی ہے :-

دھرتی رنگ رنگ کی مالاؤں سے سجی بیٹھی ہے"

اور بلبل کو بہار کا اشتیاق آمیز آواز والا ہرکارہ" سمجھتی ہے۔

آشیانے کے قریب پہنچی ہوئی فاختاؤں کے بارے میں :-

اُن کا مقصد پورا ہونے کو ہے" اور وہ اپنے پروں کو ڈھیلا چھوڑ دیتی ہیں"

ایک جگہ شام کے منظر کو ایک سحر آمیز اختصار کے ساتھ بیان کرتی ہے ؎

شام[1]

بچے ماؤں کی گودوں میں بھیڑیں اپنے گلّوں میں
بکری بکری والے کے پاس لال شفق میں پرند اداس
حور سحر نے بکھیری ہے زریں ہاتھوں سے جو جو شئے
تو اس پر چھائی ہے اے شام
جادو ہے تیرا کتنا عام

اور ایک جگہ رات کا منظر :-

جب چاند کی اُجلی کرنوں سے سب دنیا جگمگ کر اُٹھی،
تب چاند کے ساتھی تاروں کی سب جوت ہوئی پھیکی پھیکی!

ایک اور نظم :-

جل پریوں کا باغ

سیبوں کی جھاڑیوں سے پانی بہتا جاتا [illegible]
نرمی سے ناچتے جاتے ہیں دھرتی پر پھیلے ہوئے پتے
یہ نرم ہواؤں پہ چلتے ہیں اک نیند کے مستانہ جھونکے،
اور اپنے بس میں کئے جاتا ہے جادو سے دل کو میرے!

لیکن سیفو کی فطرت پرستی بھی جذبات کی شدت کو اپنے جلو میں لئے ہوئے ہے مثال کے طور پر

رات

چاند بھی اب چل دیا،
اور ستارے بھی گئے،
رات آدھی چل بسی !
رفتہ رفتہ چلتا ہے
وقت، لیکن مجھ کو کیا؟
میں تو ہوں لیٹی ہوئی؛
چُپ، تن تنہا، اُداس!

وہ غیر مرئی اشیاء کو بھی مرئی لباس میں دیکھتی ہے

نیند[1]

کالی کالی آنکھوں والی
نیند رات کی بیٹی

اور ایک جگہ دیہاتی رنگ بھی جھلک رہا ہے۔ یہ [illegible] غالباً سیفو کے اُن نغموں سے ہے جو اُسے آئے دن لوگوں کے شادی بیاہ کے موقعوں کے لئے لکھنا پڑتے تھے :-

مری امّاں میں کیسے اکیلا اب چرخہ چلاؤں گی؟
نہیں اٹھتے ہیں میرے ہاتھ، انہیں کیسے اٹھاؤں گی؟
مدن کے تیر نے گھائل کیا دل کو، میں ہوں مجنوں،
میں اپنے نوجواں محبوب کی چاہت میں کھوئی ہوں!

سیفو کو قدماء نے جہاں بہترین نغمہ خواں قرار دیا ہے وہاں دانائی میں بھی اس کا رتبہ کچھ کم نہ تھا۔ اس کے دانائی سے لبریز اقوال کو لافانی سمجھا جاتا تھا۔ سقراط اس کا شمار داناؤں میں کرتا ہے۔ لیکن اُن تنگ خیال مذہب پرستوں نے اس کی دانشمندی کی کوئی پروا نہ کی۔ جن کی چندھیائی ہوئی آنکھوں کو اس کے گیتوں کے نقوش دکھائی نہ دیتے تھے۔ اس مضمون کے آخر میں "خوبی" کے متعلق جو دو شعر درج ہیں۔ وہی اس کی دانائی کے اظہار کو کافی ہیں، لیکن ایک اور قول کا دہرانا بھی بے جا نہ ہوگا۔ بھر تری ہری نے لکھا ہے ؎

[1] ترجمہ منصور احمد [2] ترجمہ از علامہ اقبال - م۔

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مرد ناداں پر کلام نرم و نازک بے اثر

یہی بات سیفو نے مسیح کے زمانے میں یوں کہی ہے ۔
"اڑے دماغ کو جھنا یا نہیں جا سکتا"۔ اس طرح کے کئی فقرے اس کی دانشمندی کی یادگار ہیں "بوڑھے پرندے جال میں نہیں پھنستے"۔ "جب دل میں غصہ ہو تو زبان پر قابو رکھو"۔ اور "اس دنیا میں تکمیل کہاں!"

لیکن یہ مقولے صرف اس کی دانشمندی ہی کا ثبوت ہیں ۔ اس کے ذہن کی سچی بلندی اس کے عشقیہ گیتوں ہی سے ظاہر ہوتی ہے اور اس کے احساسات کی نزاکت ہی ہمیں اس کا متوالا بناتی ہے ۔

میرا بائی سوچتی ہے کہ پیا کی سیج گگن منڈل پہ ہے "کس بدھ ملنا ہوئے" اور سیفو کہتی ہے "میں اپنے ان دونوں بازوؤں سے آسمان کو کیسے چھولوں؟"

ایک گیت سنئے :-

جب رات کی گھڑیاں بیت چکیں آنے کو اجالا صبح کا ہو
جب کبھی نیند ہو آنکھوں میں اک دیوتا سپنے لاتا ہو
یہ بات کٹھن ہے کیسے سہے میرا دل دکھ اور بپتا کو،
میں کیسے ادھورا رہنے دوں اس اپنے دل کی آشا کو؟
من میں ہے امنگ مرے ایسی میں دکھ کو آنے نہ دوں دل میں،
آکاش سے سکھ جو آن ملے ایسے سکھ کو تو بھروں دل میں،
جس وقت میں ننھی نادان تھی اماں نے کھلونے مجھ کو دیئے،
پھیلا کر ہاتھ لئے میں نے ، ایسا نہ ہوا میں نے نہ لئے !
آکاش سے اب سکھ ملتا ہے ، وہ جس کی من میں آشا تھی،
پروان چڑھی ہے بھینٹ مرے ناچوں اور میٹھے گیتوں کی !

اس گیت سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ کوئی بے چین روح جو راتوں کو فرقت کے زمانے میں بستر پر کروٹیں بدلتی رہی ہے ۔ ایک خواب آلود دھندلکے میں محسوس کر رہی ہے کہ اس کی مصیبت اب کٹنے کو ہے اور وہ اس نئی مسرت کے حاصل ہونے میں کسی بات کو رکاوٹ نہیں بننے دے سکتی ۔

سیفو نے ایک جگہ خوبی کا ایک معیار قائم کیا ہے ۔

خوبی

خوب ہے جو حسیں ہوا بُت ہوا، نازنیں ہوا،
جو نہ حسیں ہوا، مگر خوب ہوا، حسیں ہوا

اور اس کی اپنی ذات بھی اس معیار پر پوری اترتی ہے ۔

میراجی

موسم بہار

ل۔ اُن سے بھی خلش پانے کا موسم آگیا — اک نئی دنیا میں کھو جانے کا موسم آگیا
ـرنے یاد آجانے کا موسم آگیا — زندگی میں زندگی پانے کا موسم آگیا
ں دم گلتے ہوئے سے آبشاروں کی قسم — صبح دم گھر سے نکل جانے کا موسم آگیا
ہلکی بدلیوں میں بکھری چاندنی — داستانِ حُسن دُہرانے کا موسم آگیا
ں عجب انداز سے کھلتی ہوئی کلیوں کا رس — بے پیئے مدہوش ہو جانے کا موسم آگیا
لو کا سلسلہ موہوم امیدوں کے ساتھ — پھر کسی شئے کی کمی پانے کا موسم آگیا
ن راتوں میں کچھ بیتی ہوئی راتوں کی یاد — کروٹوں میں رات کٹ جانے کا موسم آگیا
سے آتی ہوئی معصوم نغموں کی صدا — قلب کی چوٹیں اُبھر آنے کا موسم آگیا
ـ وہ بھی ہیں زمانے میں کہ جن کے واسطے — قہقہوں کے پھول برسانے کا موسم آگیا
ـِ ہر احساس کیسا کیف ہر منظر کہاں — الغرض مجبور کہلانے کا موسم آگیا
ط۔ ـے پے بہ پے ناکامیابی با احتیاط! — احتیاطوں سے گذر جانے کا موسم آگیا

میں سمجھتا تھا سحرؔ رونے سے فرصت مل گئی
میں سمجھتا تھا سکوں پانے کا موسم آگیا

سحرؔ رامپوری

موسم بہار

گلستاں پر ستیاں چھانے کا موسم آگیا
ہائے اہلِ دل کے گھبرانے کا موسم آگیا

آم کی شاخوں میں "بور" آنے کا موسم آگیا
ولولوں کے زندگی پانے کا موسم آگیا

حسنِ فطرت کے ستم ڈھانے کا موسم آگیا
بجلیاں پودوں میں چمکانے کا موسم آگیا

بے تکلف۔ بے محابا۔ بے نیاز و بے خبر
سینکڑوں جلوے نظر آنے کا موسم آگیا

سامنے آتے ہوئے دلچسپ "مصرعے" پے بہ پے
چلتے چلتے شعر لکھ لانے کا موسم آگیا

سرو پر بیٹھی ہوئی دو فاختائیں پاس پاس
"ربطِ باہم" یاد آجانے کا موسم آگیا

شامہ چھوتا ہوا لیموں کے پھولوں کی مہک
پاؤں رکنے دل کے لہرانے کا موسم آگیا

"ناسپاتی" کے درختوں پر بہار آئی ہوئی
باصرہ کو ہار پہنانے کا موسم آگیا

بے طلب کوزے دیئے جاتا ہے ہر شیریں دہن
ذائقہ کے ہونٹ سل جانے کا موسم آگیا

انگلیاں ترتیبِ گلدستہ میں غرقِ آب و رنگ
لامسہ میں رنگ دوڑانے کا موسم آگیا

زمزمہ کانوں کے پردوں پر ترنم آفریں
سامعہ گیتوں سے بھر جانے کا موسم آگیا

کشمشی۔ آبی۔ سیہ برقعوں کی رت پھر آگئی
بدلیوں سے نور برسانے کا موسم آگیا

الغرض تصریح پر مائل ہے ہر خلوت نشیں
الغرض بچھڑوں کے مل جانے کا موسم آگیا

شاد اُن سے بات ہو جانے کا موقع آئے گا
بات کرتے رات کٹ جانے کا موسم آگیا

شاد عارفی

منزل

شملہ کی مال روڈ اور رال روڈ کے "سکینڈل پوائنٹ" کا نام کس نے نہ سنا ہوگا۔ یہی وہ جگہ تھی جہاں اصغر نے اُسے اپنی زندگی میں پہلی بار دیکھا۔

شام کا وقت تھا اور مال روڈ اپنی گوناگوں دلچسپیوں اور رنگینیوں سمیت بیک وقت دکھ سکھ کا منظر بنی ہوئی تھی۔ کیونکہ جہاں حرمان ارضی کی کمی نہ تھی۔ وہاں وہ لوگ بھی کثیر تعداد میں تھے جو اپنے آپ کو ان تمام رنگینیوں سے محروم پاکر حسرت و یاس سے لبریز نگاہوں سے انہیں دور ہی سے دیکھتے تھے۔ اصغر سکینڈل پوائنٹ سے ذرا پرے رِج والی جانب ایک چوبی جنگلے کے قریب کھڑا ہوا اپنے بڑے بھائی کا انتظار کر رہا تھا۔ کھڑے کھڑے آدھ گھنٹے سے زیادہ وقت گذر گیا، وہ اپنے سر کو موڑ کر بے چینی سے بار بار اس سمت نظر دوڑانے لگا۔ جدھر سے اس کے بھائی کو آنا تھا۔ اسی اثنا میں چند لڑکیاں اس کے قریب سے گذریں اور ایک عجیب خوشبو، جنگلی پھولوں کی سی، جو کبھی کبھی رات کے وقت کسی شب گرد کے دماغ میں اچانک بس جایا کرتی ہے، فضا میں بکھیر گئیں وہ انہیں میں سے ایک تھی۔ اصغر نے اُسے دیکھا اور ہکا بکا رہ گیا۔ اُسے ایسا محسوس ہوا کہ اس کے دل کی حرکت اس لمحہ بند ہو گئی ہے۔ وہ کسی نئی دنیا میں پہنچ گیا ہے۔ جہاں خوبصورتی اور جنگلی پھولوں کے سوا اور کچھ نہیں۔

اصغر اس وقت میٹرک میں پڑھ رہا تھا۔ اسے معلوم نہ تھا کہ اس کا دل کس قدر حساس واقع ہوا ہے اور کسی خوبصورت چیز کو دیکھ کر اس کی کیا کیفیت ہوتی ہے۔ وہ ہر شام سیر کی غرض سے مال روڈ پر آتا اور جس وقت سکینڈل پوائنٹ کے قریب پہنچتا تو غیر ارادی طور پر اس کے قدم اس جگہ رُک جاتے اور وہ وہیں کھڑا ہو جاتا۔ بعض اوقات گھنٹہ گھنٹہ بھر وہیں کھڑا رہتا۔

لیکن اصغر اُسے دوبارہ نہ دیکھ سکا اور آخر ایک روز اُسے شملہ سے اپنے والدین اور بھائی بہنوں کے ساتھ واپس جانا پڑا۔ مگر ایک خلش سی اس کے دل میں چھپی رہ گئی۔

دو سال کے بعد اس نے گجرات کالج سے انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کیا۔ اور لاہور آکر ایک کالج میں داخل ہو گیا۔

اصغر لاہور میں بالکل نووارد تھا۔ کالج میں آکر اُسے اپنی اجنبیت کا گہرا احساس ہوا۔ کیونکہ اُسے اپنا کوئی ہم وطن نہ دکھائی دیا۔ پہلے روز جب وہ احاطۂ کالج میں لڑکوں کے ہجوم سے پرے ایک درخت کے سائے میں کھڑا ہوا گھنٹی بجنے کا انتظار کر رہا تھا تو اس نے دیکھا کہ ایک اور طالب علم بھی ذرا فاصلے پر ایک دوسرے درخت کے قریب اکیلا کھڑا ہے۔ اصغر کو خیال ہوا کہ غالباً وہ بھی اس کی طرح ہی انتظار میں ہے جب گھنٹی بجی تو اصغر نے اس کی طرف اور اس نے اصغر کی طرف دیکھا۔

اصغر نے کہا۔

"کیا آپ بھی تھرڈ ایر میں داخل ہوئے ہیں؟"

"جی ہاں"

"کسی باہر کے کالج سے یا ۔ ۔ ۔ ؟"

"جی نہیں۔ میں نے تو فرسٹ اور سیکنڈ ایر بھی یہیں کئے ہیں"۔

یہ کہتے ہوئے وہ لڑکا اصغر کے قریب آگیا۔

"اب انگلش کا پیریڈ ہے" اصغر نے کہا۔ "غالباً کمرے کا نمبر ٹائم ٹیبل میں چودہ ہی تھا؟"

"جی ہاں۔ میرے ساتھ آئیے"۔

اس طرح اصغر اور کیلاش کی دوستی کی ابتدا ہوئی۔

انگلش کے کمرے میں دونوں کو سب سے اگلی قطار کے ایک بنچ پر جگہ ملی۔ جب گھنٹہ ختم ہوا اور سب طلبا۔ اپنی نشستیں چھوڑ کر باہر نکلنے لگے تو اصغر نے کیلاش کے بازو پر ہاتھ رکھا۔

"ذرا توقف کیجئے۔ مجھے ہجوم سے گھبراہٹ ہوتی ہے۔ یہ سب [illegible]

جائیں تو ہم اطمینان سے چلیں گے۔"

جس وقت اصغر کیلاش سے یہ بات کہہ رہا تھا، تین لڑکیاں اُن کے سامنے گذریں۔ دو لڑکوں نے جو کچھ فاصلے پر ان کے عقب میں تھے، اُن سے آگے نکلنا چاہا۔ چونکہ بنچوں کی قطاروں کے درمیان جگہ ذرا تنگ تھی۔ لڑکوں میں سے ایک کی کہنی دائیں ہاتھ والی لڑکی کی کتابوں سے ٹکرائی اور کتابیں لڑکی کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر جا گریں۔

"معاف کیجئے۔ جلدی میں یوں ہو گیا،" اس لڑکے نے لڑکی سے مخاطب ہو کر انگریزی میں کہا۔

مگر پیشتر اس کے کہ وہ گری ہوئی کتابیں اٹھاتا۔ اصغر نے آگے بڑھ کر انہیں اٹھا لیا تھا اور اب وہ انہیں اس لڑکی کو پیش کر رہا تھا۔ اس وقت تک اصغر نے اس لڑکی کو محض ایک سرسری نظر سے دیکھا تھا اور کتابیں پیش کرتے وقت بھی اُس نے اپنی نگاہیں اُس کے چہرے پر نہ ڈالیں اور غالباً نہ ڈالتا اگر وہ آہستہ سے اس کا شکریہ نہ ادا کرتی۔ جب شکریے کے الفاظ اس کی زبان سے نکلے تو اصغر نے اس کی طرف دیکھا اور دیکھتے ہی بے خود ہو کر رہ گیا۔ لڑکیاں تو آگے نکل گئیں مگر اصغر وہیں بت بنا کھڑا رہا۔

اس لڑکے نے جس کی کہنی کی زد سے کتابیں گری تھیں اصغر کو بنظرِ غائر دیکھا۔ ایک حقارت آمیز تبسم اس کی آنکھوں میں نمودار ہوا اور وہ آخری مرتبہ اصغر پر سر سے پاؤں تک نظر دوڑا کر اپنے ساتھی کو بازو سے کھینچ کر آگے چل دیا۔ مگر اصغر ایسی محویت کے عالم میں تھا کہ اُسے اس بات کی مطلق خبر نہ ہوئی۔ کیلاش نے اُسے چھوا تو وہ کانپ گیا۔

"چلو چلیں۔ یہ تم پر سکتہ کی سی حالت کیوں طاری ہو گئی؟"

اصغر نے اس وقت تو کچھ جواب نہ دیا مگر جب وہ کمرے سے باہر نکل کر کچھ دور نکل گئے تو اُس نے یکایک کہا:۔

"میں اس لڑکی کو جانتا ہوں۔"

"کون لڑکی؟" کیلاش نے بے نیازی سے پوچھا۔ گھنٹی بجنے پر دوسری جماعتوں کے طلبا بھی کالج کے کمپاؤنڈ میں سے گذر کر اپنی اپنی کلاسوں کی طرف جا رہے تھے۔ کیلاش اپنے دائیں بائیں انہیں کو دیکھ رہا تھا اور اس لمحہ گذشتہ چند ایک منٹ کے واقعات اس کے ذہن سے اُتر چکے تھے۔ جب دماغ نے ذرا کام کرنا شروع کیا تو اس نے فوراً ہی کہا۔ "اچھا۔ وہی جس کی کتابیں گری تھیں۔ خوب! ایک سے جانتے ہو؟"

"نہیں۔ میرا یہ مطلب تھا کہ میں اُسے پہچانتا ہوں۔ میں نے اُسے پہلے بھی دیکھا ہے۔ اُس وقت میں میٹرک میں تھا۔ گرمیوں کی چھٹیاں تھیں اور یہ ایک روز چار پانچ لڑکیوں کے ہمراہ شام کے وقت شملہ کی مال سے گذری تھی۔"

کیلاش اب غور سے سن رہا تھا۔

"اور تم اُسے اب تک نہیں بھولے۔ یادداشت ایسی ہی ہونی چاہئے۔"

"نہیں۔ یہ بات نہیں،" اصغر نے زمین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "بعض صورتیں ہی ایسی ہوتی ہیں کہ جنہیں اگر ایک بار دیکھ لیا جائے تو انسان تمام عمر نہیں بھول سکتا۔ اس کا نام کیا ہے؟"

"پرامیلا دیوی"

"پرا — میلا — دیوی" اصغر نے دبی آواز میں رُکتے ہوئے دہرایا۔

"یہ نام اس طرح دُہرانے کا مطلب؟"

"یوں ہی! اچھا نام ہے!" اصغر نے بدستور زمین کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

"یوں کیوں نہیں کہتے کہ آپ —— مگر خیر، چلئے۔ اب ہسٹری کی کلاس میں آپ اس اچھے نام کی مالکہ کو جی بھر کے دیکھ سکیں گے ہسٹری لی ہے نا آپ نے؟"

اصغر نے جواب دیئے بغیر کیلاش کے چہرے کی طرف ایک لمحے کے لئے دیکھا اور پھر سر جھکا کر اس کے ساتھ ہو لیا۔ مگر کیلاش کے لئے اصغر کا یوں سر اٹھا کر دیکھ لینا ہی ایک انکشاف سے کم نہ تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک اضطراب تھا۔ ایک تمنا تھی۔ وہی اضطراب اور تمنا جو کبھی کبھی ایک پجاری یا شاعر کی آنکھوں میں بھی پائی جاتی ہے۔ کیلاش کو ایک گونہ خوشی ہوئی کہ اس نے اپنا پہلا فقرہ نامکمل رہنے دیا۔ اگر وہ کہہ جاتا کہ "یوں کیوں نہیں کہتے کہ آپ ان کی زلف کے اسیر ہو گئے" تو ایسی سبک گفتاری سے اصغر کے دل کو نہ معلوم کتنی اذیت پہنچتی۔

....

سہ ماہی امتحان ختم ہونے پر جب نتیجہ نکلا تو اصغر انگریزی میں اول رہا۔ مگر اس کے بعد اس کی طبیعت میں کچھ ایسا تغیر آیا کہ اس نے تعلیم

...سے غفلت برتنی شروع کر دی حتیٰ کہ وہ اپنی قسمت اور کتابوں سے بے نیاز ہو گیا۔ کالج میں نام پیدا کرنے کا خیال اس کے دل سے محو ہو گیا۔ وہ ایک خوابوں کی دنیا میں رہنے لگا ایک ایسی دنیا میں جہاں جنگلی پھولوں کی مہک تھی۔ چاندنی راتیں تھیں اور ایک روشن چہرہ۔ جب ششماہی امتحان ہوا تو اصغر کا نام انگریزی میں پانچویں نمبر پر تھا۔ کیلاش کو سخت مایوسی ہوئی اور وہ اسے ظاہر کئے بغیر نہ رہ سکا۔

"خدا کے لئے۔ اصغر اس کے خیال کو چھوڑ دو۔ مجھے ڈر ہے کہ تم اپنا مستقبل تباہ کر لو گے"۔

اصغر مسکرایا۔ "ڈرو نہیں۔ کیلاش"۔ اس نے کہا۔ "میرا مستقبل تو در اصل اب بننا شروع ہوا ہے۔ اس سے پہلے تو گویا کچھ تھا ہی نہیں۔ بلکہ اس سے پہلے مجھے ان باتوں کا ہوش ہی کہاں تھا۔ تم کیا جانو کہ میرا مستقبل کتنا شاندار ہو گا!" اصغر کا چہرہ تمتما اٹھا مگر فوراً ہی اس نے اپنا سر جھکا لیا۔ کیلاش نے دیکھا کہ اس کے لبوں پر اب مسکراہٹ نام کو بھی نہ تھی بلکہ اس کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔ اور اس کے ہونٹ لرز رہے تھے۔

"اپنے آپ پر ظلم نہ کرو۔ اصغر۔ اور پھر کام کرنا شروع کر دو"۔

"کس لئے؟"

"تو آخر تم کالج میں داخل کیوں ہوئے تھے۔؟"

"علم حاصل کرنے کے لئے۔ دنیا کے نشیب و فراز سے واقف ہونے کے لئے۔ کتابیں چاٹنے کے لئے نہیں"۔

"گویا تم اب علم حاصل کر رہے ہو؟"

"بے شک۔ ایک ایسا علم جس کے لئے میں اپنا سب کچھ بھی کھو دوں تو مجھے غم نہ ہو گا۔ کیونکہ جو کچھ مجھے حاصل ہو گا اس کے حصول کے لئے کوئی بھی قربانی بڑی نہیں ہے"۔

"کیا حاصل ہو گا سوائے ایک مبہم درد کے؟"

"تو کیا تمہارے نزدیک یہ کوئی چیز نہیں؟"

کیلاش حیران ہو کر اس کا منہ تکنے لگا۔

"مگر اس سے تو تمہارا مستقبل شاندار نہ ہو سکے گا!" اس نے کہا

اصغر نے اپنا سر اوپر اٹھایا اور ایک لمحہ کیلاش کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتا رہا پھر چہرہ دوسری جانب پھیر لیا اور کہنے لگا۔

"مایوسی اور ناکامی بعض اوقات ایک الہامی قوت کا کام دیتی ہے جس کی بدولت عجیب و غریب باتیں ظاہر ہوتی ہیں۔ تم خیال کرتے ہو گے کہ میں معمولی باتیں کر رہا ہوں۔ مگر اس وقت میں اس سے زیادہ کچھ کہہ بھی نہیں سکتا۔ شاید وہ وقت آئے جب یہ تم تمہارے لئے حقیقت رہے گا۔ اس وقت تم اپنے دل سے پوچھنا کہ میرا مستقبل شاندار ہوا یا نہیں؟"

. . . .

اصغر روز بروز نڈھال ہوتا جا رہا تھا۔ کیلاش دیکھتا تھا مگر نہ جانتا تھا کہ وہ کیا کرے۔ وہ خود ایک عجیب کشمکش میں مبتلا تھا۔ وہ ایک ایسے راز سے واقف تھا۔ جس کو اصغر پر ظاہر کر دینا بحیثیت اصغر کا دوست ہونے کے اس کا فرض تھا۔ مگر وہ کئی روز سے اُسے چھپانے ہوئے تھا۔ محض اس لئے کہ اُسے یقین تھا کہ اُسے معلوم کر کے اصغر کو ایک روحانی صدمہ پہنچے گا۔ جس کی شاید وہ تاب نہ لا سکے۔ اور ایسی حالت میں نہ جانے وہ کیا کر بیٹھے۔

کالج کا وقت ختم ہو جانے کے بعد اصغر اُسے قریباً روزانہ اس پلاٹ کی طرف لے جاتا جدھر سے وہ گذرا کرتی تھی۔ اس کے آنے سے پیشتر اصغر کا وقت نہایت بے چینی سے کٹتا۔ وہ اسی سمت آنکھیں لگائے رکھتا اور اس دوران میں کیلاش سے بات تک نہ کرتا۔ کیلاش بھی مصلحتاً خاموش رہتا۔ جب وہ گذرتی تو اس کو دیکھ کر اصغر کا دم رک جاتا اور حلق خشک ہو جاتا۔ اس کے نظر سے اوجھل ہو جانے کے بعد وہ چند لمحے ساکت و معطل سا رہتا۔ پھر کیلاش کا ہاتھ پکڑ کر اُسے باہر لے آتا۔ کیلاش اس سے تین چار مرتبہ کہہ چکا تھا: "آخر کب تک اُسے یونہی دور دور سے دیکھا کرو گے؟ دیوانے ہو جاؤ گے"۔ دو تین مرتبہ تو اصغر خاموش رہا مگر ایک بار اس نے جواب میں کہا۔ "یہی تو میں دل سے چاہتا ہوں۔ مگر یہ بھی تو نہیں ہوتا"۔

ایک روز جب وہ معمول کے مطابق اسی گھاس کے پلاٹ کی طرف آئے تو کیلاش نے دل میں تہیہ کر لیا کہ آج سب کچھ کہہ دوں گا۔ اب زیادہ دیر چھپانا کچھ ٹھیک نہیں معلوم ہوتا۔ وہ آئی اور گذر گئی۔ اصغر کے منہ سے ایک آہ نکلی۔ کیلاش نے یہی موقعہ غنیمت سمجھا اور کہا:۔

"اصغر میں تم سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ کئی دنوں سے اس کا بوجھ اپنے دل پر لئے پھرتا ہوں۔ محض تمہاری وجہ سے اب تک کچھ نہ کہہ سکا۔ مگر اب کہنا ہی پڑا۔ تمہاری اس یوجانے مجھے مجبور کر دیا ہے"۔

اصغر کچھ حیران سا ہو کر کیلاش کے چہرے کو بغور دیکھ رہا تھا۔

کیلاش نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "تم اس کا خیال ترک کر دو۔ اس کی طرف سے کوئی جواب نہ ملے گا۔ جہاں تک مجھے معلوم

ہے۔ اس کی اُسی لڑکے سے نسبت ہونے والی ہے جس کی کہنی کی زد سے اُس روز کمرے میں اس کی کتابیں گری تھیں۔ یاد ہے؟ اُس دن جب تم نے کتابیں اٹھا کر اُسے دے دی تھیں؟ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ غالباً پرامیلا بھی اس کی طرف مائل ہے ــــ اور پھر تم نے یہ بھی سوچا کہ پرامیلا ہندو ہے؟

اصغر کئی لمحے خاموش رہا۔ کیلاش نے اس کے بشرے سے اندازہ لگایا کہ وہ کسی گہری سوچ میں مستغرق ہے۔ شاید اُس کے جذبات کی شدّت اس وقت مذہب کے خلاف اُس کے دل ہی دل میں بغاوت کر رہی تھی اور وہ اس متضاد حقیقت کے بارے میں کچھ سوچ رہا تھا کہ تمام مذاہب میل ملاپ کی تعلیم دیتے ہوئے بھی لوگوں کو میل ملاپ سے بہت بُری طرح روکتے رہتے ہیں۔

اچھا کیا کہ تم نے مجھے بتا دیا۔ کیلاش" بالآخر اس نے کہا۔ اُس کی آواز دھیمی اور غمگین تھی "مگر اس سے کیا ہوتا ہے؟ میرا دل تو نہیں بدل سکتا۔ البتہ اب جب میں اُسے دیکھوں گا تو دیکھتے ہی مجھے خیال آئے گا کہ وہ کسی اور کی ہوگی۔ اس وقت ایک اندرونی آواز مجھ سے کہے گی۔ "ان لمحات کو غنیمت جان۔ دیکھ اور جی بھر کے دیکھ۔ نہ معلوم کب تجھے اس سے بھی محروم کر دیا جائے۔ اور میں دیکھوں گا۔ مگر جی بھر کے کبھی نہ دیکھ سکوں گا۔ ہر بار دل میں آرزو باقی رہ جائے گی اور یہ آرزو کبھی پوری نہیں ہوگی"

کیلاش خاموشی سے سنتا رہا۔ ممکن ہے کہ اُس کے دل میں بھی سماجی اور مذہبی بندھنوں کی تلخی ایک دوست نواز بغاوت کو بیدار کر رہی ہو لیکن اس قسم کے دلائل کے سامنے خاموشی کے سوا اور چارہ بھی کیا تھا!

. . . .

چند روز کے بعد اصغر کالج کی ایک دیوار کے سہارے کھڑا ہوا تھا۔ اس کی نگاہ درختوں کی چوٹیوں سے پرے دور کسی موہوم چیز کو دیکھ رہی تھی کہ یکایک اُسے پرامیلا کی موجودگی کا احساس ہوا۔ اس نے نگاہیں نیچی کیں تو اس کو دس گز کے فاصلے پر جاتے ہوئے دیکھا۔ وہ چلی جا رہی تھی اور اصغر کی آنکھیں اس کے ہر قدم کا ساتھ دے رہی تھیں۔ نہ معلوم اس پر کیا کیفیت طاری ہوئی کہ وہ یکایک اپنی جگہ چھوڑ کر تیزی سے اُسی سمت روانہ ہو گیا اور پیشتر اس کے کہ پرامیلا ایک کمرے میں داخل ہو جاتی وہ اس کا راستہ روکے کھڑا تھا۔ اس طرح ایک لڑکے کو راستے میں حائل دیکھ کر وہ رُکی اور اس کی طرف سر اٹھا کر دیکھا۔

"معاف کیجیے۔" پیشتر اس کے کہ وہ کچھ کہتی اصغر کے منہ سے جلدی میں یہ الفاظ نکلے۔ "معاف کیجیے۔ مجھے . . . . . مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔"

"کہیے۔"

"میں ــــ میں ــــ"

مگر اس کے بعد اصغر کچھ نہ کہہ سکا۔ وہ اپنے آپ کو بھول چکا تھا۔ اس وقت وہ ان سحر کار آنکھوں اور اس دلکش چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا جو اس کے خوابوں کی دنیا کی رونق تھے۔ وہی آنکھیں اور وہی چہرہ جن کو وہ دور سے دیکھا کرتا تھا۔ اب اس کے کس قدر قریب تھے! دیکھتے دیکھتے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اُسے یاد ہی نہ رہا کہ اُسے بات کرنے کی اجازت مل چکی تھی۔ اس وارفتگی کے عالم میں وہ وہیں دوزانو ہو گیا اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس کی ساری کے بائیں شانے سے لٹکتے ہوئے پلّو کو اپنے لبوں کے قریب لے آیا اور اپنا سر اس پر جھکا دیا۔

کالج کے بہت سے طلبا کمپاؤنڈ میں موجود تھے۔ انہوں نے یہ واقعہ اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اور چند ہی منٹوں میں یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی اور ہر طرف چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ دو ایک پروفیسروں کو بھی معلوم ہو گیا۔ پرنسپل کے پاس بھی شکایت پہنچی۔ سب اصغر کی بے باکی پر متعجب تھے۔ کالج کا وقت ختم ہونے سے پہلے اصغر کا نام رجسٹر سے خارج کر دیا گیا۔ ساتھ ہی اُسے دو سال کے لئے کالج سے بھی نکال دیا گیا۔ مگر اصغر ایسی سزاؤں سے بے نیاز ہو چکا تھا۔ وہ مدہوش تھا۔ ایک ایسی خوشی کے نشے سے جو اُسے پہلے کبھی نصیب نہ ہوئی تھی۔ اُس نے محسوس کیا کہ باوجود اپنی تمام مجبوریوں کے پرامیلا بھی اس کے جذبۂ پرستش سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی تھی اور اُس کی آنکھوں نے اس حقیقت کی گواہی دی تھی۔ یہی اس کے لئے کافی تھا۔ یہی سراب اس سے صحرا نوردی تک کرا سکتا تھا۔ اسی مدہوشی کے عالم میں وہ ایک گم کردہ راہ کی طرح کسی نامعلوم منزل کی طرف چل دیا اور گھر کبھی نہ پہنچا۔ اس کے خویش و اقارب نے اسے بہتیرا تلاش کیا مگر بے سود۔ وہ ایک مدت تک لاپتہ رہا اور جب اس کا پتہ چلا تو حالات ایسے متغیر ہو چکے تھے کہ وہ اُسے مجبور نہ کر سکے۔

. . . .

تختہ گھاٹ کلکتہ پر شام کے وقت مرد عورتیں اور بچے موٹر

لانچ کی آمد کا شوق سے انتظار کر رہے تھے۔ اصغر بھی ایک طرف اکیلا کھڑا ہوا اس دلفریب منظر کی داد خاموشی سے دے رہا تھا۔ جو ہر شام ہگلی کے کنارے دکھائی دیا کرتا ہے۔ کئی روز سے وہ اس طرف نہ آیا تھا۔ آج اس نے راج گنج تک کی سیر کا ارادہ کر کے وہاں کا ٹکٹ بھی خرید لیا کچھ عرصے کے بعد موٹر لانچ آئی۔ سب لوگ دیکھتے دیکھتے اس پر پہنچ گئے۔ اصغر نے بیٹھنا پسند نہ کیا بلکہ وہ فرسٹ کلاس کے جنگلے کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا اور سر باہر نکال کر ہگلی کی سرد ہوا سے لطف اندوز ہونے لگا۔ چاروں طرف چھوٹے چھوٹے جہازوں اور کشتیوں سے روشنی کی شعاعیں پیدا ہو رہی تھیں اور آنکھوں کے سامنے ایک عجیب سماں پیش کر رہی تھیں۔ لاتعداد دور سے آنے والی شعاعیں دریا کے مرتعش پانی کے سینے میں جذب ہوتی ہوئی دکھائی دیتیں مگر انسانی نظریہ معلوم نہ کر سکتی کہ اس کے بعد وہ کہاں جا کر ختم ہوتیں کبھی اصغر کی نگاہیں آسمان کی طرف اُٹھ جاتیں تو اُسے ایک مسکراتا ہوا چاند ساتھ ساتھ چلتا ہوا دکھائی دیتا گویا وہ بھی تفریحاً ان سب کے ہمراہ تھا۔ ایک سکون کا عالم تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تیز رو کشتی آگے نہیں بڑھ رہی بلکہ پانی کی سطح پر جم کر رہ گئی ہے۔ یکایک ماضی کے تمام واقعات اصغر کی آنکھوں کے سامنے ایک ایک کر کے پھر گئے۔

بارہ سال ہوئے کہ وہ لاہور چھوڑ کر ایک جذبات سے بے تاب دل کو لئے کلکتے چلا آیا تھا۔ اس خیال سے کہ شاید اسی طرح وہ سب کچھ بھلا سکے۔ کس قدر طویل عرصہ تھا اور اس دوران میں وہ کیا سے کیا بن گیا تھا! ہندوستان میں وہ اب ایک مشہور مصوّر کہلاتا تھا۔ اس کی تصاویر بڑی بڑی نمائشوں میں خراجِ تحسین حاصل کرتی تھیں۔ راجاؤں اور مہاراجوں کے محلات کی زینت بنتی تھیں۔ خود بڑے بڑے امراء اس سے ملاقات کے لئے آتے اور اس کے سامنے اس کی تعریفوں کے پُل باندھ دیتے۔ یہ سب کچھ تھا مگر کیا اس سے اس کے دل کی خلش جاتی رہی؟ اصغر کو ایسا محسوس ہوا کہ وہ ابھی کل ہی کالج سے نکالا گیا ہے اس نے اپنے آپ کو ایک دیوانگی کے عالم میں کلکتہ جانے والی ٹرین پر سوار ہوتے ہوئے دیکھا اور کلکتے پہنچنے پر اس بڑے شہر میں کوئی یار و مددگار نہ پایا۔ کالی گھاٹ کی طرف ایک نہایت دقیانوسی سے کرے میں اس نے رہائش اختیار کر لی۔ ایک ہی ہفتے بعد امرت بازار پتریکا کا مطالعہ کرتے ہوئے دوسرے صفحے پر جو نظر پڑی تو وہیں جمی رہ گئی۔ وہی دل میں

اتر جانے والی آنکھیں اور وہی روشن چہرہ جس کے سامنے چند روز پیشتر سر بسجود ہونے کی سزا میں وہ کالج سے نکال دیا گیا تھا صفحۂ قرطاس پر موجود تھا اور اس کے ساتھ اُسی لڑکے کی تصویر تھی جس کے متعلق کیا اُس کا قیاس کتنا صحیح تھا! یہ ایک ایسا صدمہ تھا جس کی تاب لانے کی اصغر میں اس وقت ہمت نہ تھی۔ زندگی سے بیزار، وہ کئی روز کلکتے میں پاگلوں کی طرح اِدھر اُدھر مارا مارا پھرتا رہا۔ پھر ایک روز نہایت قلیل سرمائے سے اس نے وہ کام شروع کیا جس میں اب وہ نام پیدا کر چکا تھا۔ مگر اس شہرت سے اُسے کیا حاصل ہوا!

وہ درد جسے چھپانے اور کچلنے کے لئے اُس نے یہ سب کچھ کیا تو وہ تو بدستور اُس کے دل میں موجود تھا۔ دن، مہینے اور سال اُسے مٹا دینے میں ناکام رہے۔ ہوا کا ایک سرد جھونکا آیا اور سانس کے دباؤ کے ساتھ اصغر کے لبوں سے بے اختیار دو لفظ نکل گئے۔ "پرامیلا! پرامیلا!" اور فضا میں منتشر ہو گئے۔ مگا اصغر نے مڑ کر اپنے دائیں بائیں نظر دوڑائی کہ کسی نے اس کو کچھ کہتے ہوئے تو نہیں سُنا مگر لوگ خوش گپیوں میں مشغول تھے۔ بلکہ اُن میں سے اصغر کو کوئی پہچاننے والا نہیں تھا۔

اصغر کو خیال آیا "خدا جانے اب زندگی میں دوبارہ اس کی شکل دیکھنا بھی نصیب ہوگی یا نہیں" مگر ایک اور خیال آنے سے اسے یک گونہ تسکین بھی ہوئی۔ اس کی مصوری کا وہ شاہکار جس کو اس کی آنکھوں کے سوا اور کسی نے اب تک نہ دیکھا تھا۔ وہ تو اس کے پاس ہر وقت موجود رہتا تھا۔ وہ اُسے فرصت کے وقت گھنٹوں دیکھا کرتا تھا اور جب دیکھ چکتا تو ایک آہ بھر کے اُس سے الگ ہو جاتا۔ اب بھی اس کی چشم تصوّر کے سامنے وہی تصویر تھی۔ پھر یکایک اُسے اپنا گھر یاد آ گیا۔ ماں باپ۔ بھائی بہن نہ معلوم اس وقت وہ کیا کر رہے ہوں گے اور کہاں ہوں گے۔ اُسے وہ دن بھی یاد آیا جس دن اس کے والدین اس کا کھوج نکالتے نکالتے، اس کی شکل دیکھنے کے لئے بے تاب، مگر قریباً مایوس ہو کر کلکتے میں آ کر اُس سے ملے تھے۔ ماں نے اس کو اپنے ساتھ واپس لے جانے کے لئے اس کی کتنی منت سماجت کی تھی باپ نے کتنا سمجھایا تھا۔ مگر اس کا صرف ایک ہی جواب تھا۔ "مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ جو کام میں نے شروع کیا ہے اس میں مخل نہ ہو۔" ان کے لبوں سے شکایت کا ایک لفظ نہ نکلا تھا۔ اُن کے لئے وہ کالج سے نکالے

جانے کے بعد بھی بالکل ویسا ہی تھا جیسا کہ پہلے۔ اصغر کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس تنگدستی کے زمانے میں انہی کی مدد سے اس کی گذران ہو سکی تھی۔ ان کی طرف سے کبھی انکار نہ تھا۔ مگر ——— اُس نے اُن کے ساتھ جانے تک سے انکار کر دیا تھا اور شاید اب کبھی بھی وہ اُن سے نہ ملے گا۔ اُن سے اور اپنے بڑے بھائی اور چھوٹی بہن سے۔ اس وقت ایک بجلی کی سی صدا نے فضا کی خاموشی کو توڑا اور اصغر جان گیا کہ وہ سب اسٹیشن پہنچ چکے تھے۔

. . . .

سورج ڈوب رہا تھا۔ اصغر اپنے عالیشان سہ منزلہ مکان کی سب سے اوپر کی منزل میں اپنے نگار خانے کی ایک قدآدم کھڑکی کے قریب کھڑا ہوا اُس کی طرف ٹکٹکی لگائے دیکھ رہا تھا۔ مگر اس کے خیالات کہیں اور تھے۔ اُسے اپنے وہ لفظ یاد آ رہے تھے جو ایک روز اس نے کالج میں کیلاش سے کہے تھے "مایوسی اور ناکامی بعض اوقات ایک الہامی قوت کا کام دیتی ہیں جس کی بدولت عجیب و غریب باتیں ظاہر ہوتی ہیں"۔ کاش اس وقت کیلاش اس کے سامنے موجود ہوتا تو وہ پوچھتا "کہو کیلاش میں نے کچھ جھوٹ کہا تھا کہ میرا مستقبل شاندار ہوگا؟ دیکھو اب میں ایک کامیاب مصور ہوں!" اس خیال کے آتے ہی اس کے لبوں پر ایک عجیب سی مسکراہٹ نمودار ہوئی "شاندار مستقبل!" اس کے دل نے طنزاً کہا۔ اپنے آپ کو بھی دھوکا دینا چاہتے ہو۔ دنیا کی نظروں میں تمہارا مرتبہ کتنا ہی بلند ہو تمہاری کتنی ہی قدر کی جائے تم کتنے ہی کامیاب مصور کیے مگر تمہاری واحد آرزو تو پوری نہ ہو سکی اور نہ تمہاری حیات میں پوری ہونے کی امید ہے!" سورج غروب ہو گیا اور اب شفق کی رنگینی ہی اس کی آنکھوں کے سامنے خونابہ فشانی کر رہی تھی۔

"خدا جانے" اصغر نے سوچا۔ جیسا کہ وہ صدہا مرتبہ ان سالوں میں سوچ چکا تھا "خدا جانے کیلاش نے میرے متعلق کیا خیال کیا ہوگا! مجھے اس سے ملے بغیر کبھی نہ چلا آنا چاہئے تھا۔ اس کے دل کو ضرور ٹھیس لگی ہوگی"۔ اس نے ایک لمبی سانس کھینچی اور نگار خانے سے نکل کر اپنے اس خاص کمرے میں جا پہنچا۔ جہاں اس کے اپنے ہاتھ کی بنی ہوئی جوانی کے اندوہناک افسانے کی یادگار تصویر آویزاں تھی۔ وہ ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اور اس تصویر کو دیکھنے لگا۔

"حضور!"

اصغر اس قدر انہماک میں تھا کہ وہ اس اچانک آواز سے کانپ گیا۔ مڑ کر دیکھا تو اس کے ملازم نے ایک طشتری جس میں ایک ملاقاتی کارڈ رکھا تھا آگے بڑھا دی۔

"حضور۔ وہ نیچے کے کمرے میں انتظار کر رہی ہیں"۔

"کون؟ کوئی عورت ہے!" اصغر نے کارڈ اٹھاتے ہوئے کہا۔ "اس وقت کیا ———" مگر اس کے آگے اس کے لب سے ایک حرف نہ نکل سکا۔ اس کی قوت گویائی سلب ہو گئی۔ اس کی آنکھوں نے کارڈ پر چھپے ہوئے الفاظ دیکھ لئے تھے۔ صرف دو لفظ مگر اس کے قلب میں ہیجان اور زندگی میں انقلاب پیدا کرنے کے لئے کافی "پرامیلا دیوی!" اُس کی آنکھیں کارڈ پر جم گئیں اور اس کی تمام روح اس کی آنکھوں میں کھچ آئی۔ "پرامیلا" ایک اندرونی آواز نے پکارا۔ یکایک اس کے دل میں مسرت کی ایک لہر اٹھی۔ ایک ایسی لہر جس نے اس کے جسم پر رعشہ طاری کر دیا۔ اس نے چاہا کہ اٹھ کر دوسرے کمرے میں استقبال کے لئے پہنچے۔ لیکن ایک اچانک شدتِ احساس نے اُسے گویا وہیں جکڑ لیا اور بیٹھے بیٹھے اس نے آہستہ سے کہا "انہیں یہیں لے آؤ"۔

. . . .

نوکر اطلاع کرنے گیا اور پرامیلا نے کمرے میں ٹہلنا شروع کیا۔ اس کی نگاہیں خاموشی سے دیواروں پر آویزاں تصویروں کا مطالعہ کر رہی تھیں۔ اُن میں سے بعض ایسی بھی تھیں جنہیں وہ ایک دو نمائشوں میں پہلے بھی دیکھ چکی تھی۔ وہ تصاویر اُسے پہلی نظر میں ہی اتنی پسند آئی تھیں کہ وہ انہیں وہیں خریدنے کے لئے تیار ہو گئی تھی۔ مگر ان پر "فروخت کے لئے نہیں"۔ کا لیبل پڑھ کر اسے اس قدر مایوسی ہوئی تھی کہ وہ فوراً نمایش گاہ سے واپس چلی گئی تھی۔ پرامیلا کی آنکھیں تصویروں پر تھیں مگر اس کا دل شدت سے دھڑک رہا تھا۔ کیا آیندہ چند منٹوں میں وہ اسی لڑکے سے ملنے والی تھی جس نے کئی سال پیشتر سب کے سامنے ایک ایسے جذبۂ پرستش کا کہ جس نے اس کے جسم پر کپکپی طاری کر دی تھی اظہار کیا تھا۔ اور جس کی پاداش میں اس کو کالج سے نکال دیا گیا تھا؟ اُس کو یہاں کس بات نے آنے پر مجبور کیا تھا! وہ کیوں اس طرح یہاں چلی آئی تھی؟ کیوں! کیوں! وہ ایک قدآدم آئینے کے سامنے کھڑی ہو گئی اور اپنی شکل دیکھنے لگی۔ اس کے بالوں میں اب وہ چمک نہ تھی۔ اس کے رخساروں کی رنگت اب گلاب کے شاداب پھولوں کی سی نہ رہی تھی۔ اس کی

آنکھیں تھکی تھکی معلوم ہوتی تھیں جیسے اس کی راتیں نیم بیداری میں کٹی ہوں کیا وہ اُسے اس حالت میں پہچان لے گا! کیا اُسے دیکھ کر اس کے دل کو صدمہ تو نہ پہنچے گا! مگر وہ خود! وہ بھی تو ظالم وقت کے نشانات سے محفوظ نہ رہ سکا ہوگا! یکایک اُسے احساس ہوا کہ وہ ابھی تک کمرے میں تنہا ہی ہے۔ اتنے میں ملازم نے آکر کہا "تشریف لے چلئے"!

پرامیلا اس کے ساتھ ساتھ گئی اور ملازم کمرے کے دروازے پر اُسے چھوڑ کر چلا گیا۔

پرامیلا ایک لمحہ ساکت کھڑی رہی۔ پھر دل پر ہاتھ رکھے ہوئے آگے بڑھی اور آہستہ سے دروازہ کھول کر اندر چلی گئی۔ پہلے تو اسے کچھ دکھائی نہ دیا کیونکہ یہ کمرہ نسبتاً تاریک تھا۔ چند لمحے بعد اس نے دیکھا کہ وہ ایک مختصر سے کمرے میں تھی۔ اس کے سامنے دیوار پر ایک بہت بڑی تصویر آویزاں تھی اور اس تصویر کے سامنے ایک آرام کرسی میں اصغر خاموش بیٹھا تھا۔ وہ صرف اُس کے سر کا پچھلا حصہ دیکھ سکی کیونکہ کرسی کی پشت اُس کی طرف تھی۔ صرف یہ کرسی اور وہ تصویر اس کمرے کی زینت تھی۔

وہ خاموشی سے آگے بڑھی اور کرسی سے دو قدم کے فاصلے پر جا کر رک گئی۔ اُس نے اس وقت یہ محسوس نہ کیا کہ اصغر نے اب تک کوئی حرکت نہ کی تھی کیونکہ اس کی حیرت زدہ نگاہوں کے سامنے اس کی اپنی ہی تصویر تھی، مصوری کا ایک نادر نمونہ جس کو پیدا کرنے کے لئے مصور نے صرف جنبش قلم سے ہی کام نہ لیا ہوگا۔ بلکہ اپنی روح کی تمام قوتیں بھی اُس پر صرف کی ہوں گی۔ کیا وہ واقعی کبھی اس تصویر کے مشابہ تھی یا یہ محض ایک شاعرانہ تصور کی بے مثل تخلیق تھی؟ اس کا دل تڑپ اٹھا اور وہ بے اختیار ہو کر اصغر کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

اصغر کے جسم نے ذرہ بھر بھی جنبش نہ کی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور اس کا چہرہ انگارے کی طرح دمک رہا تھا ایک ہلکی سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر موجود تھی گویا وہ آنے والے کو خوش آمدید کہہ رہے ہوں۔ مگر وہ آنکھیں اور وہ لب ہمیشہ کے لئے پیوست ہو چکے تھے انتہائی مسرت نے اُسے اس منزل پر پہنچا دیا تھا جہاں جنگلی پھول ہمیشہ ہمیشہ کھلے رہتے ہیں۔ جہاں شباب کو زوال نہیں اور جہاں حسن پر وقت کی سفاکی کوئی اثر نہیں کر سکتی۔

پرامیلا کے دل کی گہرائیوں سے ایک آہ اٹھی۔ وہ وہیں دو زانو ہو گئی اور اپنا چہرہ اس کی گود میں چھپا دیا۔

...... انور اعجاز قیصر

غزل

میں اب آزاد ہوں ہر موج کا دامن کنارا ہے
محبّت نے ڈبویا تھا، محبت نے اُبھارا ہے

محبّت میں نوازش کا تصور بھی گوارا ہے
دلِ مایوس کو لیکن جفاؤں کا سہارا ہے

ذرا دریا کی تہ تک تو پہنچ جانے کی ہمّت کر
کہ پھر اے ڈوبنے والے! کنارا ہی کنارا ہے

اُسے کونین کی کوئی خوشی راس آ نہیں سکتی
جسے تیری نوازش ہائے بے پایاں نے مارا ہے

خدا ہی کو خبر ہے کس جگہہ ڈوبے، کہاں نکلے
مرے دل کا سفینہ ہے تمنّاؤں کا دھارا ہے

غموں کے ہاتھ، ہوتی جا رہی ہے منتشر ماہرؔ
وہ بزمِ دل، جسے اُن کے تصوّر نے سنوارا ہے

ماہر القادری

جوار بھاٹا

بیوی۔ اجی اٹھئے نا۔ اتنا دن ہونے کو آیا اور آپ ہیں کہ ابھی تک سو رہے ہیں۔

میاں۔ (کروٹ بدلتے ہوئے) ہوں۔ اُوں!

بیوی۔ نہ جانے ان لوگوں پہ اتنی نحوست کیوں چھائی رہتی ہے۔ نہ نماز۔۔ نہ ۔۔۔۔

میاں۔ اچھا تو چپ رہو۔ سونے دو۔

بیوی۔ بس نماز کے نام سے تو بیخ پا ہو جاتے ہیں۔ نہ دین کی فکر نہ دنیا کی۔ نیند ہے اور یہ ہیں۔ کیا ابھی تک نیند پوری نہیں ہوئی۔

میاں۔ نہیں ہوئی!

بیوی۔ معلوم ہے! آٹھ بج چکے ہیں!

میاں۔ گھڑیاں بند ہو گئی ہیں کیا؟

بیوی۔ نہیں ——— مگر اس کا مطلب؟

میاں۔ نو بھی بج سکتے ہیں!

بیوی۔ جی ہاں! تو گویا نو بجے تک سونے کا ارادہ ہے! اور آج چائے نہیں پیئں گے کیا!

میاں۔ چائے نو بجے بھی پی جا سکتی ہے!

بیوی۔ گویا دن بھر میں چائے ہی بناتی رہوں اور بھلا کچھ کام ہے۔ چائے بنی رکھی ہے تو بلا سے۔ ٹھنڈی ہو رہی ہے تو بلا سے بس ان کو یہی کام ہے کہ سوتے رہیں اور کوئی جگائے نہیں۔ دن بھر کام کرتے کرتے تھک جاتی ہوں۔ مگر مجھے تو اتنی نیند نصیب نہیں ہوتی۔

میاں۔ تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟ تم بھی سو رہو۔ اگر جگا جاؤں تو کہنا۔

بیوی۔ جگا جاؤں تو کہنا۔ مگر سونے بھی کب دیتے ہیں، آدھی آدھی رات تک ——— کھانا لئے بیٹھی رہتی ہوں۔ مگر آپ ہیں کہ کبھی تاش کھیلتے کھیلتے دیر ہو جاتی ہے۔ کبھی اُس مردود مرغوب کے ہاں ریڈیو سنو رہتے ہیں۔ بس روز یہی بہانے، یہی چکمے ہیں تو اس زندگی سے تنگ آ گئی ہوں کبھی یہ بھی کیا کہ آج گھر چل کے بیٹھیں! آخر گھر میں بھی تو انسان بستے ہیں۔

میاں۔ شاید!

بیوی۔ تو کیا میں انسان نہیں ہوں۔

میاں۔ نہیں!

بیوی۔ وہ کیوں۔

میاں۔ چونکہ تم میری بیوی ہو! اور بیوی کا فرض ہے کہ شوہر کا حکم مانے اور انسانیت تقاضا کرتی ہے کہ کسی کے آرام میں مخل نہ ہو۔ اس لئے مجھے سونے دو۔

بیوی۔ بس جی بس۔ آپ حد سے بڑھ گئے۔ اب میں برداشت نہیں کر سکتی۔

میاں۔ مجھے معلوم ہے۔

بیوی۔ کیا معلوم ہے؟

میاں۔ کہ تم برداشت نہیں کر سکتی ہو۔ انسانیت تقاضا کرتی ہے کہ برداشت کرو۔ اور بیوی کو بہت کچھ برداشت کرنا ہوتا ہے۔

بیوی۔ میں نے بہت کچھ برداشت کیا۔ اب اس سے زیادہ میری طاقت سے باہر ہے۔

میاں۔ تو پھر!

بیوی۔ بس اب جی چاہتا ہے کہ اس گھر کو چھوڑ کے کہیں بھاگ جاؤں۔

میاں۔ کہاں جاؤ گی؟ مجھے بتا کے جانا!

بیوی۔ اپنے میکے جاؤں گی جہاں مجھے انسان سمجھا جاتا ہے۔ جہاں میری عزت کی جاتی ہے اور میری ہر خواہش پوری کی جاتی ہے۔

میاں۔ مگر وہ تو میں بھی کرنے کو تیار ہوں۔

بیوی۔ یہاں تو میری کتوں کی سی حالت ہوتی ہے۔

میاں۔ مگر میں تو کتوں سے بھی بہت محبت کرتا ہوں۔

بیوی۔ بس کتوں سے محبت کیجئے

میاں۔ مگر میں انسانوں سے بھی کرتا ہوں۔

بیوی۔ تو کیا میں انسان نہیں ہوں۔

میاں۔ نہیں۔ تم میری بیوی ہو۔

بیوی۔ کیا لوگ بیویوں سے محبت نہیں کرتے۔

میاں۔ نہیں۔

بیوی۔ پھر اور کس سے کرتے ہیں۔

میاں۔ عورتوں سے۔

بیوی۔ یعنی میں عورت بھی نہیں ہوں۔

میاں۔ غالباً۔!

بیوی۔ وہ کیسے؟

میاں۔ عورتیں جنگ نہیں کرتیں۔

بیوی۔ تو پھر میں ہوں کیا!

میاں۔ معلوم نہیں۔

بیوی۔ بس جی بس۔ زبان کو لگام دیجئے۔ آپ سے شرافت نہیں برتی جا سکتی۔

میاں۔ مجھے بھی یہی رونا ہے۔

بیوی۔ وہ کیسے؟

میاں۔ کہ مجھے شرافت سے سونے دو!

بیوی۔ سونے دو۔ سونے دو۔ کیا ابھی تک آپ سو نہیں چکے؟

میاں۔ کیا کہا!

بیوی۔ کیا آپ ابھی جاگے نہیں؟

میاں۔ ہیں! میں تو بالکل جاگ رہا ہوں۔ معلوم ہوتا ہے کہ میں کوئی خواب دیکھ رہا تھا۔

بیوی۔ شکر ہے خدا کا! آپ جاگے تو!

میاں۔ ہیں۔ یہ شکر کا ہے کا۔ لاحول پڑھو۔

بیوی۔ وہ کیوں

میاں۔ اس لئے کہ میں خواب میں تمہارے ساتھ تکرار کر رہا تھا۔ توبہ توبہ

بیوی۔ تو کیا اب آپ جاگ رہے ہیں؟

میاں۔ بالکل۔ . . . . دیکھو۔ چٹکی لو۔

بیوی۔ (زور سے چٹکی لیتے ہوئے) ہوں۔

میاں۔ اُف میں تو جاگ رہا ہوں۔

بیوی۔ شکر ہے!

میاں۔ پھر وہی!!

بیوی۔ شکر ہے کہ آپ جاگے تو سہی۔

میاں۔ تو کوئی نذر بانٹو۔ ہم بھی کھائیں گے۔

بیوی۔ پہلے چائے تو پی لو۔

میاں۔ کیا چائے تیار ہے؟

بیوی۔ آدھ گھنٹہ سے تو لئے بیٹھی ہوں۔

میاں۔ تو بتایا کیوں نہیں؟

بیوی۔ مگر آپ اُٹھتے بھی!

میاں۔ تو جگایا کیوں نہیں؟

بیوی۔ جاگتوں کو کون جگائے۔

میاں۔ میں نہیں سمجھا۔

بیوی۔ پھر سمجھ لینا۔ پہلے چائے پی لیجئے۔ ٹھنڈی ہو رہی ہے۔

میاں۔ کیا چینی ملا دی۔

بیوی۔ جی ہاں۔

میاں۔ کتنے چمچے؟

بیوی۔ یاد نہیں۔ بس یہی دو تین۔

میاں۔ پھر میں تو چائے پینے سے رہا!

بیوی۔ کیوں!

میاں۔ بس چپ رہو۔

بیوی۔ مگر اب غصہ سے کیوں کھولنے لگ گئے صبح صبح لوگ اللہ کا نام لیتے ہیں اور آپ اُٹھتے ہی جھگڑتے ہیں۔ لیکن جھگڑے کی کوئی وجہ بھی تو ہو!

میاں۔ کیا یہ کم ہے کہ تمہیں سال بھر میں چائے بنانی بھی نہ آئی۔

بیوی۔ مگر چائے تو بنا رکھی ہے۔

میاں۔ میرے اللہ! کس مصیبت میں پھنس گیا!

بیوی۔ مصیبت کا ہے کی؟

میاں۔ یہی کہ تمہیں سمجھ نہ آئے گی اور میری تمام عمر یوں ہی گذر جائے گی۔

بیوی۔ آخر میں سمجھی کیا نہیں؟

میاں۔ یہی کہ چائے بنانی بھی نہیں آتی۔

بیوی۔ مگر چائے تو بنا رکھی ہے۔

میاں۔ پھر وہی۔ میرا مطلب ہے کہ چائے میں کتنی چینی ڈالنی چاہئے۔ کتنا دودھ وغیرہ وغیرہ۔

بیوی۔ تو کتنی چینی ڈالنی چاہئے۔!

میاں۔ بالکل نہیں۔

بیوی۔ وہ کیوں۔ مگر آپ تو چینی ڈالتے ہیں۔

میاں۔ بس میں خود ملا لیا کروں گا تمہیں تکلیف کی ضرورت نہیں۔

بیوی۔ شکر ہے۔ کچھ تو آپ کیا کریں گے۔

میاں۔ بس وہ دن قریب ہے جب مجھے سب کچھ خود کرنا ہوگا۔

بیوی۔ وہ تو بہت خوشی کا دن ہوگا۔!

میاں۔ تم دیکھو گی!

بیوی۔ کیا دیکھوں گی! ہمارے ساتھ باتیں صاف صاف کیا کیجئے۔ یہ آپ کی پہیلیاں ہماری سمجھ میں نہیں آتیں۔

میاں۔ خدا نے عقل بھی تو نہیں دے رکھی۔

بیوی۔ عقل کا اس بات سے کیا واسطہ۔ بس دنیا بھر کی عقل آپ ہی میں ہے۔

میاں۔ یقیناً۔

بیوی۔ کیا میں بے وقوف ہوں۔

میاں۔ مجھے شک ہے۔

بیوی۔ مجھے فوراً اس کا جواب دیجئے۔ اگر میں بے وقوف ہوں تو اس گھر میں ایک منٹ بھی نہ ٹھہروں گی۔ آپ چپ کیوں ہیں۔ بولتے کیوں نہیں۔ میرے سوال کا جواب دیجئے میں نے تہیّہ کر لیا ہے کہ آج اس بات کا فیصلہ کر کے رہوں گی۔ یہاں میری زندگی حرام ہو چکی ہے۔ ساری ساری رات انتظار میں جاگتے رہنا، دن ہوتے ہی کسی نہ کسی بات پہ جھگڑا۔ بس ہماری آپ سے بسر نہیں ہو سکتی۔

میاں۔ مگر ہماری تو بڑے مزے سے گذرتی ہے۔

بیوی۔ آپ کی مزے سے گذرتی ہوگی۔ ہمیں کیا! میری تو جان پہ بن آئی۔ دن بھر جھگڑا۔ ہر روز لڑائی۔

میاں۔ اچھی چہل پہل رہتی ہے۔

بیوی۔ میں تو آپ پر حیران ہوں۔ کیا لڑائی جھگڑے سے ہی چہل پہل ہوتی ہے!

میاں۔ آخر ہم لڑیں بھی تو کس سے، گھر میں اور ہے کون! نوکروں کو روز ڈانٹ ڈپٹ کرنا اچھا نہیں ہوتا

بیوی۔ تو کیا یہ ڈانٹ ڈپٹ میری ہی قسمت میں لکھی ہے۔ میں تو اسے پسند نہیں کرتی۔ میں ایسی زندگی بسر نہیں کرسکتی۔

میاں۔ پھر وہی۔ آخر تمہیں تکلیف کا ہے کی ہے؟ مجھے بتاؤ۔ میں فوراً اس کو رفع کرتا ہوں۔

بیوی۔ کبھی لڑائی جھگڑے کے علاوہ اور بھی کوئی بات کی۔ روز یہی کہ تم بے وقوف ہو۔ کم عقل ہو۔ انسان بھی نہیں۔ عورت بھی نہیں۔ آخر ہوں تو کیا ہوں۔ مجھے معلوم ہونا چاہئے۔

میاں۔ تم میری بیوی ہو۔ بہت سگھڑ۔ بہت سلیقے والی۔ بہت عقلمند اور.....

بیوی۔ اجی چھوڑو بھی ان باتوں کو۔ ہر وقت ایسی ہی سوجھتی ہے۔ کبھی تو چین لینے دو۔

میاں۔ کتنی بھلی معلوم دیتی ہو۔ تمہاری آنکھیں، تمہارے بال....

بیوی۔ اجی دیکھو کوئی کیا کہے گا۔

میاں۔ کہنے دو! ——

عبدالرّب تخاّل

غزل

لا وہ شراب، حُسنِ فروزاں کہیں جسے
وہ جام دے کہ عارضِ جاناں کہیں جسے

اے حُسنِ دِل نواز مرے دل کو بخش دے
وہ اضطراب زلفِ پریشاں کہیں جسے

پائے جنوں کو ایسی ہو آوارگی نصیب
حُسنِ خرام و سیرِ گلستاں کہیں جسے

ہونٹوں سے موج موج فضا میں بلند ہو
وہ نیم آہ، بادِ بہاراں کہیں جسے

پیدا ہو آنسوؤں کے تقاطر سے وہ سرود
موجِ نشاط و نغمۂ باراں کہیں جسے

قامت پہ بے نوائیاں موزوں کریں وہ شے
رعنائی ہائے پیکرِ عریاں کہیں جسے

اُس جذبۂ شدید میں خوابِ شباب ہو
گہوارۂ تلاطم و طوفاں کہیں جسے

مجھ کو گرائے لغزشِ مستانہ اُس جگہ
بے اختیار، چاہِ زنخداں کہیں جسے

سعید احمد اعجاز

یہ مرد—!

کسی قسم کے احساس کے بغیر، چپ چاپ، گوبند نے لکشمی کی چارپائی کے ارد گرد پردے لگا دیے، پردے — جو لکڑی کے فریم میں سفید کپڑا لگا کر بنائے گئے تھے۔ اور حسبِ خواہش کھولے یا بند کئے جاسکتے تھے۔ تب نرس سلطانہ اور نیبی تیز تیز چلتی آئیں اور ان کے بعد ڈاکٹر ایک متین اور سنجیدہ صورت انسان، اپنے بھاری قدم آہستہ آہستہ اٹھاتا ہوا، ان پردوں کے اندر چلا گیا۔

کچھ لحہ تک کمرے میں خاموشی چھائی رہی۔ صرف چھت پر لگے ہوئے سفید پروں والے پنکھے اپنی پوری رفتار سے چلتے رہے اور جون کی تپتی دوپہر اپنی نیم وا آنکھوں سے غنودگی کی حالت میں چپ چاپ پڑی رہی۔

یکایک پردے کے پیچھے سے کچھ اکھڑی اکھڑی سانسوں کی آواز آئی، پھر لکشمی کے اکھڑے اکھڑے الفاظ اور پھر سلطانہ کی لمبی سانس! ڈاکٹر نے کہا — سٹریچر لے آؤ! اور یہ کہہ کر، پردے کے پیچھے سے نکل کر، وہ جیسے آئے تھے، ویسے ہی چلے گئے۔ ان کے پیچھے رومال سے آنکھیں پونچھتی ہوئی سلطانہ نکلی۔ دوسری بیمار عورتیں تجسس بھری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھیں، اس کے نکلتے ہی رشیدہ نے پوچھا — کیوں؟

"ختم ہو گئی" بھرے گلے سے سلطانہ نے جواب دیا۔

"آخری وقت کیا کہتی تھی؟" ... سُرتی بولی۔

"صرف ایک بار لکھنہ صاحب کو یاد کیا اور بس"! اور یہ کہہ کر آنسو پونچھتی ہوئی سلطانہ جلد جلد سٹریچر لانے کے لئے چلی گئی۔

. . . .

لکشمی اپنے خاوند کو لکھنہ صاحب، کہہ کر پکارتی تھی۔ وہ لاہور ہی میں ملازم تھے اور قاعدے کے مطابق ہر ساتویں دن لکشمی کو دیکھنے آتے تھے۔ کوئی ایسے خوش شکل تو نہ تھے، مگر ایسے بھی نہیں کہ بدصورت کہے جاسکیں آنکھوں میں تو کچھ ایسی بات تھی کہ آدمی بے ساختہ ان کی طرف کھنچ جاتا

تھا اور پھر اتنی باتیں کرتے تھے، اتنے قہقہے لگاتے تھے کہ جب وہ آجاتے تو ہسپتال کی اس خاموش اور ساکن فضا میں زندگی سی آجاتی۔ فقط لکشمی ہی ان کے آنے کا انتظار نہیں کرتی تھی۔ اُس گھٹے اور کشادہ کمرے میں لوہے کی سخت، بے درد چارپائیوں پر لیٹی ہوئی اور بجا راحت، دوا پرہیز کی باتیں سن سن کر عاجز آئی ہوئی دوسری بیمار عورتیں بھی ان کے آنے کی راہ دیکھا کرتی تھیں اور لکشمی۔ وہ تو جانے یہ سات دن کیسے کاٹتی تھی! ہنستی تھی، دوسروں کو ہنساتی تھی، لیکن اس تمام ہنسی ٹھٹھے میں اپنے خاوند کا انتظار اُس کے دل کے کسی نا معلوم گوشے میں چھپا پڑا رہتا تھا اور کون جانتا ہے کہ یہ ہنسی قہقہے، ہسپتال میں بسر ہونے والے لمبے لمبے دنوں کو کاٹنے کا محض بہانہ ہی نہ تھے۔ یہ بات نہیں کہ اسے اپنے خاوند سے اتنی شدید محبت اس مہلک بیماری کے دنوں ہی میں ہوئی تھی۔ بلکہ اسی دن جب شادی کے بعد ایک مہینہ گذار کر وہ اپنے میکے واپس آئی تھی تو اس کی سہیلیوں نے جان لیا تھا کہ بستی کی آزاد فضا میں دن رات کھیلنے والی، گلی محلے کو اپنے قہقہوں سے گونجا دینے والی لکشمی اب محبت کی زنجیروں میں جکڑی گئی ہے۔

سہیلیاں...... جب اُسے چاروں طرف سے گھیر کر بیٹھ گئی تھیں تو اُس نے ایک ادائے ناز سے کہا تھا: "ان کی بات پوچھتی ہو؟ وہ تو مجھے پل بھر کے لئے بھی اپنی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دیتے۔ کتنی، کتنی دیر میری طرف دیکھتے ہی رہتے ہیں اور کہتے ہیں . . ."

شرم سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ پھر سہیلیوں کے اصرار پر اپنے گلابی سے چہرے کو ہاتھوں سے چھپا کر بولی "کہتے ہیں تم تو سورگ کی دیوی ہو، میں تمہاری پوجا کرتا ہوں"۔

شیلا کی رشک سے معمور آنکھوں نے تب دیکھا۔ کہ اس کی یہ بات فقط ایک ہندوستانی بیوی کے اپنے شوہر کے متعلق عام انداز خیال ہی کے مطابق نہیں تھی بلکہ حقیقت پر مبنی تھی جس کی تائید اس کا روال روال کر رہا تھا تب اپنے خاوند کی بے التفاتی کا دھیان آنے پر ایک سرد آہ اُس

دل کی گہرائیوں سے نکل گئی۔

ساوتری نے اپنے رشک کا اظہار ایک دوسرے ہی طریق پر کیا۔ کھسیانی سی ہنسی ہنستے ہوئے وہ بولی ــــ "ہاں بہن، انہیں محبت کیوں نہ ہوگی، ایک بار تم سے کہنے لگے کہ آدمی کسی چیز کی قدر کرنا سیکھتا ہے"۔

اس فقرے میں جو طنز پنہاں تھی اس کی طرف دھیان کئے بغیر سادہ لوح لکشمی نے اپنی مسرت کی رو میں سہیلیوں کو اپنی اس ایک ہفتے کی ازدواجی زندگی کی بیسیوں کہانیاں سنا ڈالی تھیں۔ کس طرح اس کا شوہر اس پہ جان چھڑکتا ہے۔ اسے آنکھوں سے اوجھل کرنا پسند نہیں کرتا۔ دفتر میں نہ جانے کیسے وقت گذرتا ہے! "پہلی بیوی" ــــ وہ کہتے ہیں "وہ تو گنوار اور بے وقوف تھی تمہیں پا کر تو میں نے جیتے جی سورگ کا مزہ چکھ لیا ہے"۔

تارا نے تب ہنستے ہوئے کہا ــــ "ساس کو یہ سب کچھ کیسے بھاتا ہوگا!"

"ان کے دل کی تو میں کیا جانوں بہن،" لکشمی نے مسرت بھرے لہجے میں جواب دیا۔ "لیکن میٹھی تو وہ ایسی ہیں جیسے مصری۔ بولتی ہیں تو رس گھول دیتی ہیں۔ میری تو عادت تم جانتی ہو۔ سوتے سوتے دن نکل آتا ہے۔ مگر انہوں نے اس کا کبھی برا نہیں مانا۔ وہ خود علی الصبح چار بجے اٹھ کر، نہا دھو، پوجا پاٹھ کر، گھر کا سب کام ختم کر دیتی ہیں۔ میں کچھ کرنے کی کوشش بھی کروں تو کہتی ہیں۔ تمہیں ہی تو کرنا ہے بہو، میں کب تک بیٹھی رہوں گی"۔

اور اس دن بستی میں لکشمی کی رحم دل اور فرض شناس ساس اور محبت کرنے والے ہنس مکھ خاوند کی کہانی گھر گھر پھیل گئی اور شادی شدہ لڑکیوں نے دعا کی کہ ان کے خاوند اور ساسیں بھی ایسی ہی بن جائیں اور کنواری لڑکیوں نے دل ہی دل میں کہا ــــ "بھگوان ہمیں بھی ایسا ہی گھر در دینا۔"

. . . .

ربڑ کے پہیوں والا سٹریچر کسی آواز کے بغیر مشرقی دروازے سے داخل ہوا۔ گوبندا سے دھکیل رہا تھا اور مس سلطانہ چپ چاپ اس کے ساتھ چلی آ رہی تھی۔ اس کا ہمیشہ ہنسنے والا چہرہ اترا ہوا تھا۔ جیسے اسی کے کسی قریبی رشتہ دار کی موت ہو گئی ہو۔ موتیں ہسپتال میں ہمیشہ ہی ہوا کرتی ہیں اور ہسپتال کے ملازم ان سے خوگر ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنے سب کام کسی قسم کی بے چینی کے بغیر کئے جاتے ہیں لیکن لکشمی سے سلطانہ کو محبت سی ہو گئی تھی۔ سلطانہ پر ہی کیا موقوف ہے سب کو اس سے انس ہو گیا تھا۔ اس نے اپنی ازدواجی زندگی کے کتنے ہی واقعات ایک عجیب سادگی سے بیان کئے تھے۔ اپنی ساس کے متعلق اس نے جو بلند خیالات اپنے دل میں جما رکھے تھے۔ انہیں ہوا ہوتے دیر نہیں لگی۔ وہی زبان جو پہلے رس کی دھاریں بہاتی تھی۔ آہستہ آہستہ زہر بھی اگلنے لگی۔ کھنہ صاحب تب ملازم نہیں ہوئے تھے مگر گھر کی سیاسیات میں وہ ماہر تھے۔ اپنا کام چالاکی سے نکالنا جانتے تھے۔ ماں کے سامنے چپ رہتے لیکن تنہائی میں کہتے ــــ "لکشمی ان سب قصوروں کے لئے میں تم سے معافی مانگتا ہوں"۔ اور تب اسے ساس کی جھڑکیاں، طعنے، گالیاں بالکل بھول جاتیں اور خاوند سے اس کی عقیدت اور محبت کئی گنا بڑھ جاتی ــــ وہ ساتھ ہیں تو پھر سارا جہان خلاف ہو جائے، وہ سب کی مخالفت خوشی خوشی جھیل لے گی۔ اس کا جی نہیں چاہتا تھا لیکن ساس کو خوش کرنے کے لئے اس نے بھگوتی درگا کی پوجا بھی سیکھی اور اپنی سہل انگاری کو چھوڑ کر محنت سے کام کرنے کی عادت ڈالی۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود ساس کے تیور نہ بدلے۔ اس کی جھڑکیاں۔ طعنے۔ کوسنے بدستور جاری رہے مگر لکشمی نے سب کچھ ہنس ہنس کر سہنا سیکھ لیا تھا۔ ہاں ایک بار جب جلتا ہوا گھی گر جانے سے اس کے ہاتھ جل گئے تھے اور ابھی آرام بھی نہ آنے پایا تھا کہ اس کی ساس نے کپڑوں کی بھری گٹھڑی اس کے سامنے رکھ دی تو اس کی ہمیشہ مسکرانے والی آنکھیں بھر آئی تھیں۔ کپڑے دھوتے دھوتے اس کے چھالے پھوٹ گئے تھے۔ کپڑے دھونے کے بعد اندر کمرے میں جا کر وہ خوب جی بھر کر روئی تھی اور جب کھنہ صاحب آئے تھے تو اس نے کہا تھا۔ "مجھے اس نرک سے چھٹکارا دلاؤ۔ ماں اگر دھن والی ہے تو کیا اسی لئے یہ نرک کی اذیتیں برداشت کی جائیں۔ تمہارے ساتھ تو مجھے سوکھی روٹی بھاتی ہے۔ مگر یہ ظلم تو اب نہیں سہا جاتا"۔

کھنہ صاحب نے اسے تسلی دی تھی اور مستقبل کی خوشیوں کا ٹھنڈا پھاہا اس کے جلتے ہوئے دل پر رکھ دیا تھا۔ انہوں نے کیا کیا کچھ کہا تھا۔ جب وہ ملازم ہو جائیں گے تو اسے اپنے ساتھ لاہور لے جائیں گے۔ ہاں تو لڑاں شہر ہی میں رہے گی اور وہاں لاہور میں ــــ انار کلی، مال، لارنس باغ، سینما، تماشے، نمائشیں۔ اور انہی مسرت بخش تصورات میں گم

ہوکر وہ اپنے چھالوں کی ٹیس، اپنے دل کا درد سب کچھ بھول گئی تھی۔ لیکن اس کی بدقسمتی کہ جب وہ دن آیا اور کھنہ صاحب لاہور ہی میں سول سیکرٹریٹ میں ملازم ہو گئے تو وہ دِق جیسی مہلک بیماری میں مبتلا ہو گئی۔

. . . .

آہستہ آہستہ چلتا ہوا اسٹریچر پردے کے پیچھے پہنچا اور کچھ لمحے بعد سفید چادر میں لپٹا ہوا ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ لے کر دونوں طرف بچھی ہوئی چارپائیوں میں سے ہوتا ہوا مغربی دروازے سے باہر چلا گیا۔ ڈاکٹر صاحب برآمدے ہی میں کھڑے تھے۔ وہیں سے انہوں نے کہا۔ مردہ خانے میں لے جا کر رکھو۔ تب تک کھنہ صاحب آ جائیں گے۔ لہنا سنگھ تو کب سے چلا گیا ہے۔

لمحہ بھر کے لئے بیمار عورتوں کے دل دھک دھک کرنے لگے۔ لکشمی کا نحیف و ناتواں دق سے مرجھایا ہوا۔ موت کی اس سفید چادر میں لپٹا ہوا جسم سب کی آنکھوں کے سامنے سے گذر گیا۔ تپِ دق کی ان سب مریضاؤں کا بھی آخر یہی انجام ہونا ہے۔ اپنے ہی جیسی بیماری سے کسی کو مرتے دیکھنا اور خود گھُل گھُل کر مرنے کا تصور موت سے بڑھ کر اندوہ ناک ہے۔ بہتوں کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا اور بعض کے آنسو بہنے لگے۔

پردے کے پیچھے سے نکل کر مس بیٹی غسلخانے میں ہاتھ صاف کرنے چلی گئی اور رحمدل سلطانہ نے اس غمناک ماحول کو کچھ بدلنے کی کوشش کی۔ ہمیشہ ہی ایسا ہوتا تھا۔ ہمیشہ۔ جب کوئی مریضہ اس بھیانک بیماری کے ہاتھوں سے نجات پاتی تھی اور کمرے میں موت کی اُداس خاموشی چھا جاتی تھی، مس سلطانہ اپنے میٹھے تسلی آمیز لہجہ میں۔ اپنی دلچسپ باتوں، اپنے حیرت انگیز قصوں سے اس موت کی خاموشی کو دور کرنے کی کوشش کیا کرتی تھی۔ برس ڈیڑھ برس سے لکشمی بھی اس کام میں اس کا ہاتھ بٹاتی آئی تھی۔ لیکن آج وہ خود ہی اس گہری خاموشی میں سما گئی تھی۔

گھڑی نے ٹن ٹن دو بجائے۔ ٹمپریچر لینے کا وقت ہو گیا تھا۔ دل میں اُٹھتے ہوئے آنسوؤں کے طوفان کو زبردستی روک کر، دواہیں پڑے ہوئے تھرمامیٹر کو ہاتھ میں لئے اور مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے وہ رشیدہ کی چارپائی کے پاس پہنچی۔ لیکن آج سعیٔ بسیار کے باوجود وہ لکشمی کی موت کی یاد کو ہنسی کے پردے میں نہ چھپا سکی۔

رشیدہ نے کہا۔ مس صاحب لکشمی بھی چلی گئی۔

تھرمامیٹر کو رشیدہ کی زبان کے نیچے رکھ کر سلطانہ نے ایک لمبی سانس لی۔ اور نبض کی رفتار دیکھنے کے لئے اس کی کلائی ہاتھ میں تھام لی۔

سُرتی نے تحسین آمیز لہجہ میں کہا۔ "آخری وقت تک اپنے خاوند کا نام اُس کی زبان پر رہا۔ کیوں مس صاحب کھنہ صاحب بھی اس سے اتنا ہی پیار کرتے ہوں گے؟"

"ہوں گے کیا۔ کرتے ہیں"، سلطانہ نے رشیدہ کی کلائی کو چھوڑ کر کہا۔ لکشمی کو مرنا بھی اسی لئے سہل ہو گیا۔ میں تو سوچتی ہوں کہ محبت کرنے والا خاوند جس خوش قسمت کے پاس ہے۔ موت اسے کچھ بھی تکلیف نہیں پہنچا سکتی۔ بے ہوش ہونے سے کچھ دیر پہلے جب اسے معلوم ہو گیا کہ اس کا آخری وقت اب نزدیک ہے تو مجھ سے اس نے کہا تھا ـــــ مس صاحب جانے وہ کیوں نہیں آئے۔ اس بار تو انہیں آئے پندرہ دن ہو گئے اس وقت جی چاہتا ہے کہ وہ میرے پاس ہوتے۔ پھر خود ہی ہنس کر بولی۔ مس صاحب میں بھی کتنی بے وقوف ہوں۔ دل میں تو میرے ہر وقت انہیں کی تصویر رہتی ہے۔ اور میں بھی ان سے کتنی دور ہوں! کئی بار تو انہوں نے کہا ہے۔ لکشمی تم تو ہر وقت میرے پاس رہتی ہو۔ کئی بار کام کرتے کرتے تمہارا خیال آ جانے سے لکھنے میں غلطی ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔ مرتے وقت بھی جب کچھ لمحوں کے لئے اس کی بیہوشی ٹوٹی تو اپنے خاوند کا نام ہی اس کی زبان پر تھا۔"

یہ کہتے ہوئے بھیگی آنکھوں کو پونچھ، گھڑی دیکھ کر سلطانہ نے تھرمامیٹر رشیدہ کے منہ سے نکال لیا۔ اور حرارت دیکھ کر نوٹ کرنے کے لئے چارٹ اُٹھایا۔

سرتی نے پوچھا۔ "لیکن مس صاحب یہ گہنوں کی بات کیا تھی۔ جب بھی کھنہ صاحب آتے تھے۔ اِن کا ذکر ضرور چھیڑتا تھا۔ جب سے گہنے لے گئے۔ بس ایک بار ہی تو پھر آئے ہیں۔"

تھرمامیٹر کو دوا میں ڈال اور دوسرا اُٹھا کر سُرتی کو دیتے ہوئے اُسنے کہا ـــ "میں نے پوچھا نہیں، لیکن جب لکشمی آئی تھی تو سب گہنے ساتھ ہی لے آئی تھی۔ اُس کی ساس نہیں چاہتی تھی کہ وہ ایک بھی گہنا ساتھ لے جائے۔ آخر ہسپتال میں اتنے گہنوں کا کام بھی کیا ہے۔ بازوبند، چوڑیاں، مالا، لاکٹ، کوئی ایک گہنا ہو تو کہوں۔ جانے کیوں اسے گہنوں سے اتنی

نجست تھی۔ساس تو مرتے دم تک نہ بے جانے دیتی لیکن کھنہ صاحب اپنی ماں کو سمجھا بجھا کر لے آئے تھے۔یہاں مریضوں کو گہنے پہننے کی اجازت نہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے سمجھایا کہ انہیں ساتھ نہیں لانا چاہئے تھا۔اب بھی بہتر ہے کہ انہیں کھنہ صاحب کے حوالے کر دو لیکن وہ گہنے اپنے پاس ہی رکھنا چاہتی تھی ۔آخر ڈاکٹر صاحب نے گہنے ایک لوہے کے صندوقچے میں بند کر کے چابی اسے دے دی اور صندوقچے کو ہسپتال کے سیف میں رکھ دیا۔ اس چابی کو وہ لحظہ بھر کے لئے بھی جدا نہ کرتی تھی۔لیکن جب بیماری بڑھ گئی اور تن بدن کا بھی ہوش اسے بھولنے لگا۔اور جب ایک دن کھنہ صاحب کے کہنے پر میں نے اسے سمجھایا کہ گہنے تمہارے ہی نام بنک میں جمع کرائے جا سکتے ہیں تو اس نے چابی دے دی۔یہی ایک بات گہنوں کی محبت لکشمی میں مجھے عجیب نظر آئی۔لیکن شاید انہی کے ذریعے وہ اپنے آپ کو زندہ سمجھتی تھی ۔اسی رات اس نے مجھے پاس بلا کر کہا تھا——

مس صاحب اب میں بہت دیر تک زندہ نہیں رہوں گی۔"

سُرتی کی زبان تھرمامیٹر کی وجہ سے دُکھنے لگی تھی۔آخر اس نے خود ہی اسے نکال کر مس سلطانہ کو دے دیا۔چونکہ مس سلطانہ نے تھرمامیٹر لے لیا اور ٹمپریچر دیکھنے لگی۔

سرتی نے کہا "یہ تو ٹھیک ہے مس صاحب لیکن گہنے لینے کے بعد کھنہ صاحب نے ہر ہفتہ آنا کیوں چھوڑ دیا۔دو ہفتے گذر گئے انہیں آئے ہوئے"۔

رشیدہ بولی "بیمار نہ ہو گئے ہوں،نہیں تو گرمی،سردی،بارش دھوپ انہوں نے کسی بات کا کبھی خیال نہیں کیا۔باقاعدہ ہر ہفتے آتے رہے۔اور میں تو سوچتی ہوں مس صاحب لکشمی کی موت کی خبر سن کر اُن کے دل پر کیسی گذرے گی۔اپنی بیوی سے کس کو ایسی محبت ہوگی"۔

تب شاید سٹریچر مُردہ خانے میں پہنچا کر گوبند واپس آیا اور اس کے پیچھے پیچھے ڈاکٹر صاحب بھی آئے۔پردے کے پاس پہنچ کر گوبند نے پوچھا۔ "کپڑوں کو لپیٹ دُوں۔ڈاکٹر صاحب"۔ڈاکٹر صاحب اس کے پاس جا کر کھڑے ہو گئے۔ "نہیں" انہوں نے کہا۔"ہسپتال کی چادروں کو ڈس انفکٹر میں ڈال دو اور باقی کا سب سامان پڑا رہنے دو۔ابھی شاید کھنہ صاحب یا اُن کا آدمی آجائے۔ہاں گدے کو باہر دھوپ میں ڈال دو"۔

اُسی لحظے برآمدے کے پاس سیڑھیوں پر سائیکل پھینک کر ہانپتا ہوا اور پسینے سے تر لہنا سنگھ اندر آیا۔ڈاکٹر صاحب نے آگے بڑھ کر پوچھا۔

"کیوں ! کھنہ صاحب؟۔بیمار تو نہیں !"

لہنا سنگھ نے سر ہلایا۔اُس کی سانس پھول رہی تھی۔جواب نہ بن پڑتا تھا۔

ذرا تلخی سے ڈاکٹر صاحب نے پوچھا "ملے یا نہیں ! کہا نہیں تم نے کہ لاش کو آج شام سے پہلے لے جائیں"۔

ایک گہرا سانس لے کر لہنا سنگھ نے کہا۔ "وہ تو شادی کرنے اپنے گھر چلے گئے ہیں"۔

اور پھر کھٹ سے ٹمپریچر چارٹ کا فریم مس سلطانہ کے ہاتھ سے فرش پر گر پڑا۔ اور رشیدہ نے جیسے گھبرا کر چیختے ہوئے کہا——

"مس صاحب ! مس صاحب !"

اُپندر ناتھ اشک ۔

غزل

ں خوگرِ غم اور لبِ فریاد ہے خاموش
اے وائے ستم اب ستم ایجاد ہے خاموش

ں منہ سے ہو محرومیٔ قسمت کی شکایت
اک آہ تھی وہ بھی دمِ فریاد ہے خاموش

الِ محبت ہوں نہ سمجھے گا زمانہ
جوں صورتِ شبنم مری اُفتاد ہے خاموش

یا نالۂ غم میں ہے ترے مرغِ گرفتار
کیوں شکوۂ بیداد پہ صیّاد ہے خاموش

رِ دمِ تماشا ہیں کھلی ہیں اگر آنکھیں
محشرگہہ حسرتِ دل برباد ہے خاموش

ہی تھی نظر جس کی رخِ لالہ و گل پر
گوشے میں قفس کے وہ چمن زاد ہے خاموش

کرتا تھا نظرؔ سوزِ جگر سے جو چراغاں
عرصہ ہوا وہ بندۂ بے داد ہے خاموش

قیّوم نظرؔ

وہ؟

میرے دوست! تمہارا کہنا ہے کہ تم مجھے کسی امکانی طریقہ سے نہ سمجھ سکے۔ اور میں یقین کرتا ہوں۔ تمہارا خیال ہے کہ میری دماغی حالت بد سے بد تر ہوتی جا رہی ہے؟ شاید ایسا ہی ہو۔ مگر وجوہات وہ نہیں جن کو تم نے قرینِ قیاس سمجھ رکھا ہے۔

یہ تو تمہیں معلوم ہی ہو گا کہ عنقریب میری شادی ہونے والی ہے۔ مجھے ایسا کرنے پر کس بات نے مجبور کیا۔ یہ میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں۔

میں نے اپنے خیالات اور عقیدوں سے ابھی تک تجاوز نہیں کیا۔ میں عورت اور مرد کی زندگی کو جب وہ خاوند اور بیوی کی حیثیت سے رہنے لگتے ہیں۔ انتہائی قسم کی بے وقوفی سمجھتا ہوں۔ میں کیا کہہ رہا ہوں اور کیا کہنا چاہتا ہوں، اس کو تم سمجھ گئے ہو گے۔ میری تو یہ خواہش تھی کہ جیسا ہوں ایسا ہی رہوں مگر ——

اور پھر بھی میری شادی ہونے والی ہے!

اپنی ہونے والی شریکِ حیات کے متعلق میں بہت کم جانتا ہوں۔ بجز اس کے کہ میں نے انہیں چار یا پانچ بار دیکھا ہے اور کوئی ناگوار بات نہیں پائی —— وہ خوبصورت اور تندرست ہیں —— مجھے اور کسی بات سے واقفیت نہیں۔

وہ کسی متمول خاندان کی رکن نہ سہی مگر کھاتے پیتے والدین کی لڑکی ہے۔ اس میں نہ وہ خامیاں ہیں جو کسی شخص کو متنفر کر دیں اور نہ کوئی زبردست خصوصیات مختصر یہ کہ وہ ان لڑکیوں میں سے ہے جو ہونے کو تو بڑی اچھی بیویاں بن جاتی ہیں۔ مگر ایک وقت ایسا آتا ہے جب ہم تمام عورتوں کو اس سے بہتر تصور کرتے ہیں جس کو ہم نے اپنا شریکِ حیات منتخب کیا۔

"کیوں" تم مجھ سے پوچھو گے نہیں "کونسی بات شادی کرنے پر مجبور کرتی ہے؟"

میں یقینی طور پر اس عجیب اور غیر ممکن وجہ کو ظاہر نہیں کرنا چاہتا جس نے مجھے یہ لعیدازعقل کام انجام دینے پر مجبور کیا۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ میں تنہا زندگی بسر کرنے سے خوف زدہ سا رہنے لگا ہوں۔

میں نہیں جانتا کہ کن الفاظ میں تم سے کہوں اور کس طرح تمہارے ذہن نشین کروں کہ تم سمجھ لو۔ بہر حال میری حالت قابلِ رحم بن گئی ہے۔

میں راتوں کو اکیلا نہیں رہنا چاہتا۔ میری خواہش ہے کہ میرے نزدیک کوئی ایسا ہم جنس ہو جس کو میں محسوس کر سکوں جو مجھ سے باتیں کرے۔ اور کسی موضوع پر چاہے وہ کچھ ہی کیوں نہ ہو میں اس سے گفتگو کر سکوں۔

میری خواہش ہے کہ میں اپنے پاس سونے والے کو بیدار کر دوں اور اگر چاہوں تو ایسے ہی کوئی غیر متوقع طور پر سوال کر بیٹھوں تاکہ میں انسانی آواز سنوں اور محسوس کروں کہ کوئی بیدار روح اور دھڑکتا ہوا دل میرے قریب ہے —— ایک ایسا ہمراز جس کی دماغی قوتیں یکجا ہیں۔ تاکہ جب میں لیمپ جلاؤں تو کسی انسانی چہرے کو دیکھ سکوں —— کیونکہ —— میں اقرار کرنے سے شرماتا ہوں —— کیونکہ میں تنہا رہنے سے خوفزدہ ہوں۔

آہ! تم اب بھی مجھے نہ سمجھ سکے۔

میں کسی خطرے سے نہیں ڈرتا۔ اگر کوئی شخص میرے کمرے میں گھس آئے تو بغیر کسی قسم کے خوف کے میں اس کو مار ڈالوں۔ میں بھوتوں سے بھی نہیں ڈرتا اور نہ ان پر یقین رکھتا ہوں۔ میں مرے ہوئے انسانوں سے نہیں ڈرتا کیونکہ میں اس چیز کو ہمیشہ کے لئے فنا سمجھتا ہوں جو صفحۂ زندگی سے مٹ جائے۔

خیر —— ہاں۔ خیر مجھے بتانا ہی پڑے گا۔ میں اپنے آپ سے متوحش ہوں —— ایک نامحدود خوف سے لرزتا ہوں۔

تم اس پر قہقہہ بلند کرو یا میرا مذاق اڑاؤ مگر یہ بہت ہی دہشت انگیز ہے اور میں اس پر قابو نہیں پا سکتا۔ میں دیوار۔ فرنیچر اور تمام ان اشیاء سے جن سے مجھے اچھی طرح واقفیت ہے ڈرتا ہوں اور اس کے علاوہ میں اپنے وحشت انگیز خیالات اور دماغی سکون سے جو نہ معلوم کب وحشت کی شکل اختیار کر لے —— ڈرتا ہوں اور یہ تمام باتیں مجھے اس شاہراہ پر لئے جا رہی ہیں جس کی منزل بجز تکلیف و تردد کی آماجگاہ ہونے کے اور کچھ نہیں۔

پہلے پہل ایک نامعلوم اضطراری کیفیت میرے دماغ میں پیدا ہوتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ میں کانپنے لگتا ہوں میں مڑکر دیکھتا ہوں۔ اور یقیناً کچھ نہیں پاتا۔ میں چاہتا ہوں کہ وہاں کوئی چیز ہوتی۔ چاہے کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن اس حد تک کہ میں اسے دیکھ سکتا۔ میرے اوپر خوف و ہراس کا عالم طاری ہو جاتا ہے اور وہ صرف اس وجہ سے کہ میں اپنے خوف کی نوعیت کو نہیں سمجھتا۔

اگر میں بات چیت کرتا ہوں تو مجھے اپنی آواز سے ڈر معلوم ہوتا ہے اگر میں چلتا ہوں تو نہ معلوم کس بات سے مجھے وحشت ہوتی ہے۔ گویا کوئی چیز پردوں کی آڑ میں پوشیدہ ہے یا دروازہ اور الماری کے پیچھے چھپی ہوئی ہے! لیکن اس کے ساتھ ساتھ مجھے اس کا بھی یقین ہے کہ وہاں کوئی نہیں اور اس خیال کے ہوتے ہوئے میں اچانک پیچھے مڑکر دیکھتا ہوں کیونکہ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے گویا کوئی میرے تعقب میں ہے درآنحالیکہ کوئی موجود نہیں اور یہ میں خوب جانتا ہوں۔

میں پریشان ہو جاتا ہوں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرا خوف لمحہ بہ لمحہ زیادہ ہوتا جا رہا ہے میں اپنے کو کمرے میں بند کر لیتا ہوں اور بستر پر دراز ہو کر چادر میں چہرہ چھپا کر اپنی آنکھیں انتہائی رنج و افسوس کی حالت میں بند کر لیتا ہوں اور یہ جانتے ہوئے کہ لیمپ سرہانے روشن ہے اور مجھے اس کو بجھا دینا چاہیئے۔ ایک دفعہ کے لئے پڑا رہتا ہوں اور پھر بھی ——— میں اس کو نہیں بجھا سکتا۔

یہ حالت بہت ہی تکلیف دہ ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے؟

اس سے قبل مجھے ان باتوں کا ذرا بھی احساس نہ ہوتا تھا۔ میں کمروں میں آتا جاتا رہتا اور کوئی چیز بھی میرے سکون و انبساط میں دخل انداز نہ ہوتی۔ اگر کوئی مجھ سے کہتا کہ تم ایسے مرض کے شکار ہونے والے ہو—— میں اس کو مرض کے علاوہ کہہ ہی کیا سکتا ہوں؟ —— اور ایک نامعلوم خوف تمہیں ہر لمحہ لرزہ براندام رکھے گا تو میں اس کے ان طفلانہ خیالات کو سن کر ہنس دیتا۔ اور اس کی بے وقوفی کی خوب داد دیتا میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ مجھے اندھیری راتوں میں دروازہ کھولتے ہوئے کبھی خوف نہیں معلوم ہوا۔ میں بہت خاموشی سے بغیر اس کو بند کئے اپنے بستر پر لیٹ جایا کرتا تھا اور پھر نصف شب گذرنے کے بعد یہ دیکھنے بھی نہ اٹھتا کہ ہر چیز اپنی اپنی جگہ پر حفاظت سے رکھی ہوئی ہے یا نہیں۔

یہ حالت موسم سرما کی ایک بھیگی ہوئی رات میں عجیب و غریب طریقے سے پیدا ہوئی۔ کھانا کھلانے کے بعد جب میرا ملازم چلا گیا تو میں سوچنے لگا کہ اب کیا کروں۔ کمرے میں تھوڑی دیر ٹہلا کیا۔ کوئی وجہ نہ ہوتے ہوئے بھی مجھے تھکن معلوم ہو رہی تھی اور مجھ میں اتنی قوت بھی نہ تھی کہ کسی کتاب کا مطالعہ کرنے بیٹھ جاتا۔ موٹی موٹی بوندیں فرش پر پڑکر ایک شور پیدا کر رہی تھیں اور میں سوگوار تھا۔ ہماری زندگی میں ایسے موقعے آتے ہیں جب رونے یا کسی سے باتیں کرنے کو دل چاہا کرتا ہے تاکہ ہم اسی طریقہ سے اپنے غم آلودہ خیالات کو دل سے نکال دیں۔

میں نے تنہائی محسوس کی۔ آج میرا کمرہ اور دنوں سے زیادہ سنسان معلوم ہوتا تھا اور میں اپنی تنہائی کے خیال میں ڈوبا ہوا تھا۔ مجھے کیا کرنا چاہئے! میں بیٹھ گیا۔ مگر پھر مجھے کسی کیفیت نے گھبرا دیا اور میں ٹہلنے لگا مجھے حرارت سی معلوم ہو رہی تھی۔ میرے دونوں ہاتھ جل رہے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد ایسا محسوس ہوا جیسے سرد ہوا میرے بدن میں سرایت کر رہی ہے۔ میں نے سوچا کہ وہ باد سرد کا جھونکا ہوگا چنانچہ اس سال پہلی مرتبہ میں نے آتشدان میں آگ جلائی اور شعلوں کو بیٹھ کر تکنے لگا۔ مگر تھوڑی دیر کے بعد مجھے اس بات کا احساس ہونے لگا کہ میں خاموش نہیں بیٹھ سکتا میں اٹھا اور باہر چل دیا تاکہ اپنی کھوئی ہوئی قوتوں کو ایک بار پھر مجتمع کر لوں اور کسی ایسے دوست کو تلاش کر دوں جس سے تھوڑی دیر کے لئے گفتگو کا شغل رہے۔

باہر کسی کو نہ پاکر میں ہوٹل کی طرف اس امید میں چل دیا کہ وہاں ضرور کسی جان پہچان والے سے ملاقات ہو جائے گی۔

میں ہر جگہ پریشان تھا۔ ہوٹل کی بھیگی ہوئی سیڑھیاں گیس کی روشنی میں چمک رہی تھیں اور بارش کا کہرا راستوں اور گلیوں پر اس قدر محیط تھا کہ کونے پر لگے ہوئے لیمپ سے مدھم روشنی چھن چھن کر نکل رہی تھی۔

میں آہستہ آہستہ چلتے ہوئے سوچ رہا تھا "میں باتیں کرنے کے لئے کسی کو بھی نہ پاؤں گا"

میں تمام ہوٹلوں سے باری باری گذرتا گیا اور دیکھا کہ ہر آدمی میری طرح غمگین اور اداس بیٹھا ہے۔

بہت دیر تک میں بغیر کسی خاص وجہ کے گھومتا رہا اور آدھی رات کے قریب اپنے مکان کی جانب روانہ ہو گیا۔ جب میں کہیں باہر جاتا تھا تو عموماً دروازہ مقفل کر دیتا۔ مگر آج میں نے اسے صرف بھڑا ہوا دیکھا اور یہ تعجب خیز امر تھا۔ پھر میں نے سوچا کہ خطوط شام کے وقت لائے گئے ہوں گے اور

ملازم نے کھونٹے کو اپنی چابی دے دی ہوگی۔

میں اندر داخل ہوا اور آگ جلتی ہوئی پائی جس کی وجہ سے کمرے میں ہلکی ہلکی روشنی تھی میں نے دیکھا کہ کوئی شخص میری آرام کرسی پر بیٹھا ہے۔ اس کے دونوں پاؤں آتشدان کے نزدیک ہیں اور گردن میری طرف۔

میں قطعاً خوفزدہ نہ ہوا۔ میں نے سوچا کہ کوئی دوست مجھ سے ملاقات کی خاطر آیا ہوگا اور میرا انتظار کرتے کرتے سوگیا ہوگا۔ یقیناً ملازم نے جس کو جاتے وقت میں نے فارغ کردی تھی اپنی چابی اس کے حوالے کردی ہوگی۔ مگر معاً مجھے یاد آیا کہ کس طرح سے گلی کا دروازہ کھلا رہ گیا تھا اور میرے دروازے کی بھی چٹخنی لگی ہوئی تھی وہ مقفل نہ تھا۔

میرا دوست بتھا سر انتظار کرتے کرتے سوگیا تھا۔ چنانچہ میں اس کے پاس گیا تاکہ اس کو بیدار کروں۔ میں اس کو بہت نمایاں طور سے دیکھ سکتا تھا۔ اس کا داہنا ہاتھ نیچے کی طرف لٹکا تھا۔ اس کے پیر دہرے تھے اور اس کا سر آرام کرسی کے بائیں جانب تھا اور یہ تمام باتیں اس کا پتہ دیتی تھیں کہ وہ سو رہا ہے۔ "وہ کون ہوسکتا ہے!" میں نے خیال کیا۔ چونکہ کمرہ میں روشنی کم تھی۔ اس وجہ سے میں اس کو اچھی طرح نہ دیکھ سکتا تھا۔ میں نے اپنا ہاتھ اس کو چھونے کے لئے بڑھایا اور وہ آرام کرسی کی پشت سے جا لگا۔ وہاں کوئی نہ تھا۔ کرسی خالی پڑی ہوئی تھی۔

میں سناٹے میں آگیا۔ ایسا معلوم ہوا گویا اتفاقاً کوئی خطرہ میری راہ میں حائل ہوگیا ہے۔ میں پیچھے ہٹ گیا۔ مگر اس اشتیاق میں کہ حقیقت کو معلوم کروں۔ مڑا اور سیدھا کھڑا رہا۔ میرے دل کی حرکت تیز ہوگئی تھی۔ میں اپنے خیالات کو مجتمع نہ کرسکتا تھا۔ اور ایسا محسوس کر رہا تھا کہ تھوڑی دیر میں بے ہوش ہوکر زمین پر گر پڑوں گا۔

لیکن میں نے سوچا کہ اس کو ایک خیال اور وہم سے زیادہ کوئی اہمیت نہ دینی چاہئے اور اس واقعہ پر غور کرنے لگا۔ میں حقیقتاً اس کو خیال سے تعبیر کر رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ ہونہ ہو یہ میری آنکھوں نے مجھے دھوکا دیا ہے۔ ہم لوگوں کو اکثر مرتبہ ایسے حادثات پیش آتے ہیں کہ جس چیز کا خیال دماغ میں پناہ گزیں ہوتا ہے وہ آنکھوں کے سامنے آتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ حالانکہ اس شے کا وہاں گمان بھی نہیں ہوتا اور یہ کہہ کر میں نے اپنے دل کو تسکین دے لی کہ چونکہ میری آنکھیں خمار آلودہ ہیں۔ اس بنا پر یہ حادثہ پیش آیا ورنہ ایسا ہرگز نہ ہوتا۔

میں نے لمپ روشن کیا اور جب آتشدان میں آگ جلانے کے لئے جھکا تو دیکھا کہ میں بری طرح کانپ رہا ہوں۔ میں اچھل پڑا کیونکہ مجھے ایسا معلوم ہوا گویا کسی نے میری پیٹھ چھوئی ہے۔

مگر مجھے اب بھی یقین نہ آتا تھا۔

میں تھوڑی دیر ٹہلا کیا۔ نیچے سروں میں گنگناتا رہا اور پھر دروازے کو اندر سے مقفل کرکے چٹخنی چڑھا دی۔ غرضکہ ہر طرح سے مطمئن ہوکر بیٹھ گیا کہ اب کوئی نہیں آسکتا۔

میں دوبارہ بیٹھ کر اس حادثے پر غور کر رہا تھا اور پھر تھوڑی دیر کے بعد روشنی بھی گل کردی اور بستر پر لیٹ گیا۔

آتشدان میں آگ آخری سسکیاں لے رہی تھی۔ اور تھوڑے عرصہ کے بعد بجھا چاہتی تھی۔ چند انگارے اب بھی سربلندی کر رہے تھے۔ اور ان کی ہلکی ہلکی روشنی کرسی کے قریب فرش پر پڑ رہی تھی۔ جہاں میں نے پھر اس شخص کو بیٹھے ہوئے دیکھا۔

میں نے دیا سلائی جلائی مگر آہ! مجھے دھوکا ہوا وہاں تو کوئی بھی نہ تھا۔ احتیاطاً میں اٹھا اور کرسی چارپائی کے نیچے چھپا دی اور سونے کی کوشش کرنے لگا کیونکہ کافی رات گذر چکی تھی۔ پانچ منٹ گذرے ہوں گے، میری آنکھ ہی لگی تھی کہ میں نے اس تمام منظر گذشتہ کو اس خوبی سے دیکھا گویا وہ سب حقیقت ہے۔ میں ایک چیخ کے ساتھ اٹھ بیٹھا اور اس کے بعد یہ خیال بھی نہ آیا کہ مجھے سونا ہے۔

دو مرتبہ مجھ پر نیند نے غلبہ پایا اور میں سونے پر مجبور ہوگیا مگر دونوں مرتبہ ہوبہو وہ تمام منظر آنکھوں کے سامنے پھر گیا اور اب میں نے محسوس کیا کہ میں پاگل ہوا جا رہا ہوں۔ جب دن نمودار ہوا تو میں دوپہر تک ایک پرسکون نیند میں سویا اور مجھے اب ایسا پتہ چلتا تھا کہ میرا مرض جاتا رہا۔

سب کچھ ختم ہوچکا تھا۔ مجھے اس بھیانک خواب کی وجہ سے حرارت ہوگئی تھی اور میں نہ جانتا تھا کہ وہ خواب کیسا ہے! بیمار ہوتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ کس قدر زبردست قسم کی بے وقوفی مجھ سے سرزد ہوئی ہے۔

وہ شام بڑی اچھی طرح گذری۔ میں نے رسٹوران میں جاکر کھانا کھایا اور رات کو ٹھہر گیا اور پھر گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔ مگر جیسے ہی مکان کے نزدیک پہنچا۔ میرے اندر ایک بے چینی سی پیدا ہوگئی۔ میں اس کو دوبارہ دیکھنے سے ڈرتا تھا۔ میں اس سے خوفزدہ نہ تھا اور نہ اس کی موجودگی سے جس کا مجھے یقین بھی نہ تھا۔ مگر مجھے ڈر تھا کہ پھر دھوکا نہ کھا جاؤں اور پھر اسی وہم

کا شکار نہ ہو جاؤں جس سے مجھے وحشت ہوتی تھی۔

ایک گھنٹہ سے زیادہ میں سیڑھیوں پر چڑھتا رہا مگر میں نے سوچا کہ میں بھی کس قدر بے وقوف ہوں اور یہ سوچ کر گھر کے اندر چلا گیا۔ میرا سانس تیزی سے چل رہا تھا ـــــ اتنی تیزی سے کہ میں زینے پر نہ چڑھ سکتا تھا اور جب اوپر پہنچ گیا تو دس منٹ متواتر دروازے کے باہر کھڑا کھڑا سوچتا رہا کہ اندر جاؤں یا نہیں۔ میں نے ہمت کی اور کنجی تالے میں ڈال کر دروازہ کھولا اور ہاتھ میں موم بتی لئے اندر داخل ہوا۔ سونے کے کمرے کا دروازہ کھول کر میں نے آتشدان پر ایک دوڑتی ہوئی نظر ڈالی۔ وہاں کوئی نہ تھا۔ آ ـــــ ہ!

کیسا اطمینان اور کیسی مسرت! کس قدر سکون! میں ادھر ادھر پھرتا رہا مگر اب بھی مجھے دھوکا ہوتا تھا اور بار بار میں مڑ کر دیکھتا کہ کوئی میرے پیچھے تو نہیں۔ کونوں اور دیواروں پر پڑتی ہوئی پرچھائیاں مجھے ڈرانے کے لئے کافی تھیں۔

مجھے بڑی بڑی نیند آئی اور میں بار بار کسی خیالی شور سے اٹھ بیٹھتا تھا مگر میں نے اسے نہ دیکھا ـــــ سب کچھ ختم ہو چکا تھا!

اس زمانے سے میں راتوں کو اکیلا سوتے ہوئے ایک ڈر سا محسوس کرنے لگا ہوں۔ میں سوچتا ہوں کہ کوئی روح میرے پاس ہے ـــــ مجھ سے بہت نزدیک، مگر وہ دوبارہ ظاہر نہ ہوئی اور یہ مان بھی لیا جائے کہ وہ ہوتی تو مجھے کیا ڈر! مجھے تو اس پر اعتقاد ہی نہیں اور جانتا ہوں کہ اس کی حقیقت کچھ بھی نہیں ہے۔

لیکن اس کا خیال مجھے ہر وقت پریشان رکھتا ہے۔ میں ہمیشہ اس کے متعلق سوچتا رہتا ہوں۔ اس کا داہنا ہاتھ لٹکا ہوا ہے اور سر بائیں طرف کرسی پر رکھا ہے۔ جیسے کوئی شخص سو رہا ہو ـــــ خدا کے واسطے بس اتنا کافی ہے! میں اس کے بارے میں مزید سوچنا نہیں چاہتا!

آخر کیوں مجھ پر اس خیال کا اتنا گہرا اثر ہے! اس کے پیر تو آگ کے بالکل نزدیک تھے!

وہ مجھے متوحش رکھتا ہے۔ یہ خام خیالی سہی مگر واقعہ ہے۔

وہ کیا ہے اور کون ہے!

میں جانتا ہوں کہ اس کا وجود میرے بزدلانہ خیالات ہیں اور میرے خوف اور تکلیف کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے! لیکن اتنا ہی کافی ہے۔

ہاں یہ میرے لئے ممکن ہے کہ میں اپنے سے سوالات کروں اپنے بزدلانہ خیالات کو یکسر موقوف کر دوں۔ مگر میں گھر پر تنہا نہیں رہ سکتا کیونکہ مجھے اس سے واقفیت ہے کہ وہ وہاں ہے میں جانتا ہوں کہ اب اسے کبھی نہ دیکھوں گا۔ وہ اب اپنے کو ظاہر نہ کرے گا۔ وہ پرانی باتیں سب ختم ہو گئیں۔ لیکن وہ میرے خیالات میں تو ہمیشہ بسا رہتا ہے وہ آنکھوں سے غائب رہتا ہے مگر یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ وہ وہاں موجود ہی نہیں ہے۔ وہ دروازوں کی آڑ میں ہے۔ الماری کے پیچھے وارڈروب کے نزدیک۔ چارپائی کے نیچے۔ غرضکہ ہر اندھیرے کونے میں وہ موجود ہے۔ اگر میں دروازہ یا الماری کھولتا ہوں۔ اگر میں موم بتی ہاتھ میں لئے اسے چارپائی کے نیچے تلاش کرتا ہوں یا اندھیرے کونوں میں روشنی ڈالتا ہوں تو وہ وہاں نہیں ملتا لیکن پھر بھی میں محسوس کرتا ہوں کہ وہ میرے پیچھے ہی ہے۔ میں مڑتا ہوں۔ اور اس یقین کے ساتھ ـــــ کہ میں اسے نہ دیکھ سکوں گا۔ اور کبھی نہ دیکھ سکوں گا ـــــ مگر کچھ بھی ہو وہ ہے ـــــ اور میرے نزدیک ہی۔

یہ احمق پن سہی۔ وحشت سہی۔ مگر آخر میں کر کیا سکتا ہوں! میرے پاس اس کا کوئی علاج بھی تو نہیں۔

لیکن اگر ہم دو ہوں تو مجھے اس کا اچھی طرح یقین ہے کہ وہ یہاں کبھی بھی نہ آئے گا۔ کیونکہ وہ اسی لئے یہاں موجود ہے کہ میں تنہا ہوں ـــــ یقیناً وہ اسی وجہ سے موجود ہے۔

(موپاساں)

منیب الرحمن



گرمیاں

گئے پرکیف جاڑے، اور ظالم گرمیاں آئیں
روپہلی دھوپ میں، پگھلی ہوئی پھر بجلیاں آئیں
مناظر نے خوشی سے توڑ کر اپنے حسیں گہنے
لباس حسرت افزا سردیوں کے سوگ میں پہنے
کہاں کا کیف، منظر سے نری آتش برستی ہے
نگاہِ شاعرِ رنگیں طبیعت بھی ترستی ہے

نگوں سر ہیں شباب و شعر کی سرمستیاں ساری
فضائے دہر میں خاموش ہیں موسیقیاں ساری
شعاعِ آتشیں پرسوز کے شانے ہلاتی ہے
طلائی انگلیوں سے ساز کا جھولا جھلاتی ہے
رگِ احساس ہے مجروح، کیسی آفتیں آئیں
تخیل کا گلا کٹتا ہے قاتل ساعتیں آئیں

اداسی موت کی پھیلی ہوئی ہے آسمانوں میں
حیاتِ شعر بھی مرجھا گئی کوئل کی تانوں میں
بہ پیہم کروٹیں سیّال آتش کی ہواؤں پر
پگھل کر پیکرِ خورشید بہتا ہے فضاؤں پر
نظر آتی ہیں مضطر بجلیاں مجھ کو بگولوں میں
مزا ملتا ہے شاید ان کو صحرا کے ہبولوں میں

شعاعوں کی جنونِ وصل میں بے چین رفتاریں
فضا کے جلوۂ معصوم پر چلتی ہیں تلواریں
جہنم گھل رہا ہے ساغرِ خورشیدِ انور میں
چھڑکتی ہیں شعاعیں آتشِ محلول منظر میں
غضب ہیں مہر کی اس وقت غیظ افروزیاں یکسر
اٹھا دو مخملیں بستر جلا دو ریشمیں چادر

پڑا رہنے دو کنجِ عافیت میں اب یونہی مجھ کو
اجازت باہر آنے کی تپش دیتی نہیں مجھ کو
ستائے کیوں مجھے تابِ نظر خود ہو کے آوارہ
یہ مہرِ پیہم سوز اور اس کا اس موسم میں نظارہ

محمد عبدالعزیز غوثی

لکشمی

آپ کی خدمت اور حفاظت کی ضامن ہے

یکم مئی [illegible] تا ۳۱ دسمبر [illegible] تک (صرف آٹھ ماہ) کا مکمل شدہ بزنس

زائد از ایک کروڑ روپیہ

بونس
اِنڈومنٹ پالیسی
۱۶ روپیہ فی ہزار فی سال

لکشمی انشورنس کمپنی لمیٹڈ

بونس
ہول لائف پالیسی
۲۰ روپیہ فی ہزار فی سال

ہیڈ آفس لکشمی بلڈنگس - لاہور

ہرنیا

ہزارہا لوگ بیرونی استعمال سے

بہت جلد شفایاب ہو چکے ہیں

آپ کیوں ہرنیا میں مبتلا ہیں۔ ہمارے پاس تشریف لائیں۔ ہم آپ کا علاج ٹھیک کریں گے اور آپ کو تندرست کریں گے۔ اگر آپ ہمارے پاس نہ آسکتے ہوں تو

سندات اور ہدایات

مفت طلب کریں اور گھر بیٹھے ہوئے بھی بہت جلد شفایاب ہو جائیں گے

DR. H. C. ROY

118, Upper Circular Road

CALCUTTA

صوبہ کے تمام تعلیمی رسالوں سے اولین اور اُردو کا بہترین تعلیمی رسالہ

رہنمائے تعلیم لاہور

جو چونتیس ۳۴ سال سے متواتر اور باقاعدہ لاہور سے جاری ہے
مدرسین کی مشکلات کو مؤثر اور پُرزور الفاظ میں افسروں تک پہنچانا اور ان کے حل کی تدابیر پیش کرنا خاص اس کا فریضہ ہے۔

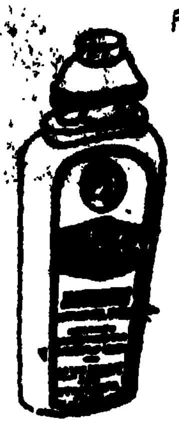
اس رسالہ میں ہر قسم کے علمی۔ ادبی۔ اخلاقی۔ طبی۔ تاریخی مضامین شائع ہوتے ہیں۔

قیمت سالانہ صرف پانچ روپے (پیشگی) لی جاتی ہے
نمونہ آٹھ آنے کے ٹکٹ آنے پر بھیجا جاتا ہے۔

المشتہر
سردار صاحب ماسٹر جگت سنگھ پروپرائٹر رسالہ
رہنمائے تعلیم لاہور

OPTREX

For the Eyes



آپٹریکس

تمام دن کام کرنے کے بعد جب آپ کی آنکھیں تھک کر ماند پڑ جائیں تو ان کو اپنی حالت پر چھوڑ دینا خطرے سے خالی نہیں۔ آپٹریکس سلیوشن کا استعمال انہیں فوراً تروتازہ کر دے گا۔ اور بُرے نتائج سے بچائے گا۔

سول ایجنٹ

ایم اے جے نوبل نمبر ۹۔ اپارسی سٹریٹ
فورٹ بمبئی

دنیائے ادب

اُردو شاعری میں گناہ کا تصوّر

اُردو کے ایک نوجوان مگر آتش نفس شاعر مجاز نے کیا خوب کہا ہے

؎ زندگی کیا ہے گناہِ آدم
زندگی ہے تو گنہگار ہوں میں

اور یہ واقعہ ہے کہ انسان اور گناہ میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ بلکہ ایک قدیم روایت کے مطابق انسان کی تخلیق کا باعث ہی گناہ ہے۔ مذہبی روایات کی چھان بین کی جائے تو گناہ کی پہلی مثال حضرت آدمؑ کی کہانی میں ملیگی جبکہ شیطان نے انہیں سجدہ کرنے سے انکار کیا۔ اور راندۂ درگاہِ الٰہی ہو کر جنت سے نکالا گیا۔ اُس نے آدم سے بدلہ لینا چاہا۔ ادھر آدم اور حوا باغ ارم میں چین کی بنسی بجاتے تھے اور مزے سے زندگی بسر کر رہے تھے۔ خداوند تعالےٰ نے انہیں ہر قسم کی آسائشوں اور راحتوں سے لطف اندوز ہونے کی اجازت دے رکھی تھی۔ لیکن یہ حکم الٰہی تھا کہ گیہوں کے پودے کے پاس تک نہ پھٹکنا۔ کہتے ہیں کہ شیطان کسی ترکیب سے پھر جنت میں آن گھسا۔ اور آدم کو ایسا ورغلایا۔ کہ گیہوں کھانے پر آمادہ سے ہو گئے۔ رہی سہی کسر حوا کی اعانت اور اصرار نے پوری کر دی۔ پودے کو ہاتھ لگانا تھا کہ جنت کی لامتناہی فضاؤں میں قہرِ الٰہی کی بجلیاں کوندنے لگیں۔ اور وہی آدم کہ جن کے سامنے فرشتے سربسجود تھے۔ اب گنہگار ٹھیرائے گئے۔ اور آنکھ جھپکتے میں بہشت کے پُر فضا مرغزاروں سے انہیں اس دنیا میں پھینک دیا گیا۔ یہ ہے پہلے گناہ کی روایت۔

کہنے کو تو یہ بیہودہ فرسودہ کہانی ہے۔ لیکن اس حکایت کے پردے میں بہت سے نفسیاتی نکتے پوشیدہ ہیں۔ کہ جن سے گناہ کی ماہیت پر کچھ روشنی پڑتی ہے۔ سب سے پہلے تو یہی غور کیجئے۔ کہ آدم کے گناہ کی نوعیت کیا تھی۔ صرف گیہوں کو ہاتھ لگانا یا اُسے چکھنے کی کوشش کرنا۔ عہدِ الست میں تو گیہوں کے سایہ تک سے پرہیز کا حکم تھا۔ یا اب زمانہ کی روِش دیکھئے۔ کہ گیہوں کے بغیر جینا مشکل ہو گیا ہے۔ یعنی جو چیز پہلے گناہ تھی۔ اب انسان کی ضروریاتِ زندگی میں اہم ترین شے بن گئی ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے۔ کہ زمانے کی روِش اور خیالات کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ گناہ اور ثواب کا معیار بھی بدلتا رہتا ہے۔ جو چیز ایک زمانہ میں گناہ تھی۔ تہذیب و تمدن کا انقلاب اُسے چند سال بعد ایک مستحسن فعل اور عمدہ کام بنا سکتا ہے۔

دوسرے لفظوں میں کسی کا یہ نظریہ کہ کوئی فعل بذاتِ خود اچھا یا بُرا نہیں ہوتا۔ بلکہ ہماری اپنی قوتِ تخیل اُسے اچھائی یا بُرائی کا لبادہ پہنا دیتی ہے گناہ پر بھی بالکل صادق آتا ہے۔ یعنی گناہ کا معیار لوگوں کے احساس پر منحصر ہے۔ جسے جمہور کی رائے ایک خاص وقت میں گناہ تصور کرلے وہ گناہ ہے اور جس فعل کو جمہور مستحسن تصور کرے۔ وہ ثواب ہے۔ صرف گیہوں پہ ہی کیا منحصر ہے۔ ہماری اپنی تاریخ میں اس قسم کی بیسیوں دلچسپ مثالیں مل سکتی ہیں۔ سُنا ہے۔ کہ رومن حکومت میں کسی کو اپنے چراغ سے دوسرا چراغ روشن نہ کرنے دینا ایک بہت بڑا گناہ تھا جس کی سزا موت تجویز کی جاتی تھی۔ اب یہ صرف کج اخلاقی کی حد میں شامل ہے۔ پہلے زمانے میں دیوتاؤں کے سامنے انسانی قربانی پیش کرنا عظیم ترین ثواب سمجھا جاتا تھا۔ اب یہ مذہب اور قانون دونوں کی نگاہ میں گناہ ہے۔

حضرت عیسیٰ کے متعلق ایک روایت بیان کی جاتی ہے۔ کہ ایک دفعہ کسی عورت پر شدید ترین گناہ کا الزام لگا کر ایک گروہ حضرت عیسےٰؑ کے سامنے انصاف طلب ہوا۔ حضرت عیسےٰؑ نے فیصلہ کیا کہ بیشک یہ عورت سنگین گناہ کی مرتکب ہوئی ہے۔ اور اُس کی سزا موت ہے۔ اسے یہودیوں کے قانون کے مطابق زمین میں آدھا گاڑ کر سنگسار کر دیا جائے۔ لیکن ایک شرط ہے۔ کہ اس عورت پر پہلا پتھر وہ مارے۔ کہ جس نے آج تک کبھی گناہ نہ کیا ہو۔ روایت کے مطابق اس غیظ و غضب سے بھرے ہوئے مجمع کا ہر فرد اس عورت کے جرم پر نفرت و حقارت کا اظہار بہت شدومد سے کر رہا تھا لیکن ان میں سے کسی کو اتنی جرأت نہ ہوئی کہ حضرت عیسےٰ کے فیصلہ کے بعد اپنی بے گناہی کے ثبوت میں اس عورت پر پتھر اُٹھاتا۔

اس عورت کا کیا حشر ہوا۔ اور اس مجمع نے اپنی خفت اور شرم کو کس طرح چھپایا۔ یہ ایسی باتیں ہیں کہ جن سے اس وقت ہمیں بحث کوئی تعلق نہیں ہے۔ لیکن حضرت عیسےٰ کی روایتوں کا یہ کمال ہے کہ انسان دنیا کے اندر بہت کچھ سبق سیکھ سکتا ہے۔ چنانچہ اس حکایت سے گناہ کا ایک اور پہلو سمجھ میں آتا ہے۔ یعنی دنیا میں کوئی ایسا شخص نہ ہوگا۔ کہ جس نے کبھی گناہ نہ کیا ہو۔ خواہ وہ گناہ معمولی ہو یا بہت سنگین۔ لیکن یہاں تک گناہ کا تعلق ہے۔ اس کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ جس میں سب افراد انسانی شامل ہیں۔ لیکن یہ انسانی فطرت ہے۔ کہ اپنے گریبان میں کوئی منہ ڈال کر نہیں دیکھتا بلکہ دوسرے کی آنکھ کا تنکا شہتیر نظر آتا ہے۔

بعض لوگ گناہ کرتے ہیں اور نہیں جانتے۔ بعض جانتے ہیں اور گناہ کرتے ہیں۔ بلکہ اس کے اعادہ میں انکو ایک خاص قسم کا لطف اور لذت حاصل ہوتی ہے۔ لیکن وہ فرقہ جو نہیں جانتا اور گناہ کرتا ہے۔ سماج کی نفرت وحقارت کا نہیں بلکہ ہمدردی کا مستحق ہے۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ گرنا کوئی بُری بات نہیں ہے کہ سب گرتے ہیں۔ لیکن گر کر پڑے رہنا بہت بُری بات ہے۔ کہ اس سے انسان کی پست ہمتی ظاہر ہوتی ہے۔ کسی دوسرے فلسفی کا قول ہے کہ ہمیں مجرم سے نفرت نہیں کرنی چاہیئے۔ بیشک جرم سے نفرت کرنا بجا اور درست ہے۔ لیکن مجرم نفرت سے زیادہ ہماری ہمدردی اور اعانت کا مستحق ہے۔

اس موقع پر۔ مجھے حضرت عیسیٰؑ کی زندگی کا ایک اور واقعہ یاد آگیا۔ کہتے ہیں کہ انہیں جب صلیب پر چڑھایا گیا۔ تو حضرت عیسےٰ نے اپنے دشمنوں کے ظلم اور تشدد پر کسی قسم کی نفرت یا غضب کا اظہار نہیں کیا۔ یا ان کے متعلق کسی قسم کے نفرت آمیز کلمے نہیں کہے۔ جو ایسے موقع پر انسانی فطرت کا تقاضا ہے بلکہ اپنی روحانیت کا ثبوت اس طرح دیا۔ کہ "اے خدا انہیں معاف کر دے۔ کیونکہ انہیں خود علم نہیں ہے کہ یہ کیا کر رہے ہیں"۔ گناہ اور جُرم کے متعلق اس سے زیادہ تسلی بخش الفاظ غالباً دنیا کی تاریخ میں آج تک کسی نے نہیں کہے اور یہی گناہ کا معصومیت بخش رُخ ہے۔ جو گنہگاروں کے لئے تسکین کا باعث ہو سکتا ہے۔ اگرچہ قانون کی لوہے جیسی سخت نظروں میں لاعلمی کوئی قابلِ سماعت عذر نہیں سمجھا جا سکتا۔ لیکن اس سنگین قانون میں غالباً انسانیت کا وہ روحانی عنصر شامل نہیں ہے جو اپنی دریادلی سے سخت سے سخت گناہ اور بدترین مجرم کو بھی معاف کر سکتا ہے اور جس کی تعلیم غالب نے ان سیدھے سادے لفظوں میں دی ہے

نہ سُنو گر بُرا کہے کوئی — نہ کہو گر بُرا کرے کوئی
روک لو گر غلط چلے کوئی — بخش دو گر خطا کرے کوئی

نامۂ خسرواں میں ایک ایرانی شاہزادے کے متعلق حکایت لکھی ہے۔ کہ ایک شب اُس نے خواب میں دیکھا کہ میں نے بادشاہ کو قتل کر دیا ہے اور خود تخت پر بیٹھ گیا ہوں۔ صبح اُٹھ کر اُس نے اپنے آپکو صرف اس گناہ کی پاداش میں ہلاک کر دیا۔ کہ میرے نفس نے بادشاہ کے متعلق خواب میں بھی اس قسم کا گمان کیوں کیا۔ یہ انسانی خلوص اور نیک نیتی کی بلند ترین مثال ہے۔ اور ہماری اس گناہ کی بحث میں خاصی اہم ہے۔ موجودہ دَور کے ماہرین نفسیات کا خیال ہے کہ ہر فعل سے پہلے ہمارے دماغی اعصاب اس کا تصوّر کرتے رہتے ہیں۔ اور ہم اس فعل کے امکان کو اپنے تخیل کے آئینے میں اکثر بہت صاف طور پر دیکھ بھی لیتے ہیں۔ اس لئے گوتم بُدھ اور زرتشت نے افعال نیک کے ساتھ ساتھ نیک خیالات کی بھی تلقین کی ہے۔ کیونکہ جو کچھ ہم سوچتے ہیں۔ وہی ہمارے افعال کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ کوئی شخص اخلاقی اعتبار سے بدترین جرائم اور گناہوں کے خیالات دل میں رکھے۔ اور اُس کے افعال ہمیشہ نیک اور عمدہ ہوں۔ شیخ شیراز فرما گئے ہیں ؎

هر آنکه تخم بدی کشت و چشم نیکی داشت
دماغ بیہودہ پخت و خیال باطل بست

نفسیات کے اس نظریہ کو مَیں ایک اور مثال سے واضح کرنا چاہتا ہوں۔ جو غالباً آپ کی دلچسپی کا باعث ہوگی۔

ایک لڑکا ایک سوداگر کی دوکان پر کام کرتا ہے۔ اس کا کیرکٹر اب تک ہر بدنما داغ اور دھبّے سے پاک ہے۔ آج تک اُس نے کوئی بددیانتی نہیں کی۔ اچانک اُس پر جُرم لگایا جاتا ہے۔ کہ اُس نے اپنے آقا کے ہاں چوری کر لی۔ سب حیران ہو جاتے ہیں۔ کہ کیسے ممکن ہے ایسا نیک اور سیدھا بچہ ایسا خطرناک اور مذموم کام کر گذرا۔ اس معمہ کا نفسیاتی حل یہ ہے۔ کہ لڑکا اس تدبیر پر غور و فکر کر رہا تھا۔ کہ کسی طرح چوری آسانی سے عمل میں لانی چاہیئے۔ بار بار اُس نے اپنے ذہن کی آنکھوں سے اس موقع کو دیکھا ہوگا۔ کہ اس طرح بکس میں ہاتھ ڈالوں گا۔ اور رقم نکالوں گا۔ ہر تصوّر اپنے بعد ایک نقش چھوڑ گیا۔ اور آنے والے خیال کے لئے راستہ ہموار اور آسان کر دیا گیا آخرکار یہ ذہنی ناہموار سڑک خیالات کی آمد و رفت سے اس قدر ہموار اور سہل بن گئی۔ اور چوری کے خیال نے ذہن پر اس قدر قبضہ کر لیا کہ یہ مکروہ فعل ہو کر ہی رہا۔ بکس میں ہاتھ ڈالا گیا۔ رقم چُرائی گئی اور ایک اچھا کیرکٹر خراب ہو گیا۔ جس طرح کہ ایک بدکردار پلک جھپکنے میں نیک اور متقی نہیں بن سکتا۔ اُسی طرح ایک نیک شخص آن کی آن میں بداطوار نہیں ہو سکتا۔ نفسیات کی اس مثال سے یہ امر واضح ہو گیا

کہ گناہ کا تعلق صرف اس کے عمل پر ہی منحصر نہیں۔ بلکہ اس کا خیال تک اخلاقیات کی رُو سے گناہ ہے۔

علمائے اسلام نے ایک اور دلچسپ قول بیان کیا ہے۔ الاعمالُ بالنیات یعنی ہمارے عمل کی اچھائی یا بُرائی ہماری نیت پر منحصر ہے۔ قانون نے بھی اس کو تسلیم کیا ہے اور سزا دیتے وقت ہمیشہ مجرم کی نیت کو خوب اچھی طرح جانچا جاتا ہے۔ یہی حال گناہ کا ہے کہ اگر اس کے ارتکاب میں ہمارا ارادہ بھی شامل تھا تو یقیناً وہ گناہ ہے۔ ورنہ انسان سے بہت سے افعال ایسے سرزد ہو جاتے ہیں کہ جن کے ارتکاب کا اسے گمان تک نہیں ہوتا۔ اور یہ غیر شعوری طور پر اُن کا مرتکب ہو جاتا ہے۔ میرے نزدیک ایسے گناہوں کا گناہ کہنا خود بہت بڑا گناہ ہے۔

آپ نے عربی کا یہ مشہور مقولہ تو ضرور سنا ہوگا کہ کُلُّ جَدِیدٍ لَذِیذٌ یعنی ہر نئی چیز لذیذ معلوم ہوتی ہے اور اُسے بار بار دیکھنے سے آنکھوں کی وہ لذت اور خوبصورتی باقی نہیں رہتی کہ جسے ہم نے پہلی بار محسوس کیا تھا بالکل یہی حال گناہ کا ہے۔ جب ہم پہلی مرتبہ کوئی گناہ کرتے ہیں۔ تو ہمارے ضمیر کو اس کا بہت زیادہ احساس ہوتا ہے۔ لیکن اس فعل یا گناہ کے بار بار اعادہ سے اس کا احساس گھٹتے گھٹتے بالکل معدوم ہو جاتا ہے۔ بغیر لیمپ کے سائیکل چلانے کا خوشگوار قانونی گناہ کس بھلے آدمی نے نہیں کیا ہوگا۔ لیکن مجھے خوب یاد ہے کہ پہلی مرتبہ جب میں رات کو بغیر روشنی کے سائیکل چلانے پر مجبور ہوا۔ تو یقین جانئے کہ سڑک کا ہر سایہ مجھے سپاہی کی شکل میں نظر آتا تھا۔ اور مجھے اپنے جرم کا اس قدر احساس تھا۔ کہ چند مرتبہ سائیکل پر چڑھنے اور اُترنے کے بعد آخر کار میں نے فیصلہ کیا کہ اس سے کہیں بہتر ہے کہ میں پیدل ہی چلوں۔ لیکن اس گناہ کے بار بار اعادے کے بعد میں اس قدر عادی ہو گیا۔ کہ کبھی اس کا خیال بھی نہیں آیا۔ یہی مثال عادی مجرموں کی ہے کہ انہیں اپنے بڑے سے بڑے گناہ کا احساس تک نہیں ہوتا۔

گناہ کے متعلق اس قدر تمہید کے بعد اگر میں اپنی بات چیت کے دوسرے پہلو کی طرف رجوع نہ کروں تو مجھے خطرہ ہے کہ میں یہ مضمون پڑھنے والوں اور سننے والوں دونوں کا گنہگار بننے والا ہوں۔ کیونکہ میرا موضوع صرف گناہ ہی نہیں ہے بلکہ اُردو شاعری میں گناہ کا تصور ہے۔ ہمارے شاعروں نے گناہ کے مضمون کو مختلف پہلوؤں سے خوب باندھا ہے۔ اور حق تو یہ ہے کہ اس پیش پا اُفتادہ اور بظاہر چھپے ہوئے نوالوں میں سے اکثر نے خوب لطیف مضمون نکالے ہیں۔ مثلاً یہ خیال بکہ گناہوں کا بوجھ انسان کو دبائے رکھتا ہے۔ بہت پرانا [illegible] ہے استاد ذوق فرماتے ہیں ؎

اے آشنا نہ پوچھ گراں باری گناہ — [illegible]

غالب نے اس نکتہ کو خوب پہچانا ہے کہ فعل کا انحصار اُس کی نیت پر ہے

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد — یا رب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

غالب ہر کام میں افراط و تفریط کے قائل ہیں۔ چنانچہ گناہوں کے معاملے میں بھی اُن کی طبیعت معمولی گناہوں سے سیر نہیں ہوتی ؎

بقدرِ حسرتِ دل چاہیئے ذوقِ معاصی بھی
بھروں یک گوشۂ دامن گر آبِ ہفت دریا ہو

پھر اُن کا یہ بھی دعوے ہے کہ گناہ چاہے ختم ہو جائیں لیکن ان کا ذوقِ معاصی تشنہ ہی رہتا ہے ؎

دریائے معاصی تُنک آبی سے ہوا خشک
میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

سُنا ہے کہ قیامت کے دن خداوند تعالےٰ انسان کے اعمال کا حساب لے گا۔ غالب نے اس بازپرس سے بچنے کا عمدہ حیلہ تراشا ہے ؎

آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد!
مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

غالب نے مسلمانوں کے عقیدے کے مطابق "کافر" اور "گنہگار" میں جو فرق ہے اُسے ظاہر کیا ہے ؎

حد چاہیئے سزا میں عقوبت کے واسطے — آخر گناہ گار ہوں کافر نہیں ہوں میں

سودا کے نزدیک گناہ کرنا خود اُس کے عفو کی دلیل ہے ؎

جُرم کے عفو کی تدبیر بہت اچھی ہے
بے گنہ رہنے سے تقصیر بہت اچھی ہے

ذوق نے اس نفسیاتی نکتہ کو بیان کیا ہے۔ کہ گناہ کے ارتکاب سے روح پر ضرور اثر باقی رہتا ہے ؎

ہر داغِ معاصی مرا اس دامن تر سے — جوں حرفِ سرِ کاغذِ نم اُٹھ نہیں سکتا

قدرتی طور پر ایسے ملزم سے سب کو ہمدردی ہوتی ہے کہ جو ناکردہ گناہ مصیبت میں پھنس جائے اور اُسے خود اپنے جُرم کا علم نہ ہو۔ چکبست نے کہا ہے

گنہگاروں میں شامل ہیں، گناہوں سے نہیں واقف
سزا کو جانتے ہیں ہم خدا جانے گنہ کیا ہے؟

عاشق کا سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ اُس نے عشق کیوں کیا۔ لیکن میر دُہائی دے رہے ہیں کہ خدارا کوئی محبوب سے بھی پوچھے کہ وہ اتنا حسین کیوں ہوا۔

پیار کرنے کا جو خوباں ہم پہ رکھتے ہیں گناہ!
اُن سے بھی تو پوچھئے تم اتنے کیوں پیارے ہوئے

دُنیا کا دستور ہے کہ ہزارہا سال کی محنت پر ایک قصور پانی پھیر دیتا ہے۔ ذوقؔ نے اسی کا اشارہ کیا ہے ؎

گیا شیطان مارا ایک سجدے کے نہ کرنے سے
اگر لاکھوں برس سجدے میں سر مارا تو کیا مارا

گناہ کا ارتکاب اکثر دوسروں کے ورغلانے سے ہوتا ہے۔ اکبرؔ کہتے ہیں ؎

مل کے یاروں سے ہوا شوقِ گناہ   آدمی کا آدمی شیطان ہے

اس مضمون کو ذرا اور وضاحت سے اکبرؔ الہ آبادی نے باندھا ہے۔

جب سے گناہ چھوڑ دیئے، سب کھسک گئے
اب میرا کوئی دوست نہیں، ہم نشیں نہیں

اکبرؔ نے محسوس کیا کہ اس دَور میں لوگ گناہوں اور جہنّم سے اس قدر نہیں ڈرتے جتنا پلیگ سے ڈرتے ہیں ؎

گناہوں سے نہ باز آئیگی اور بستی سے بھاگے گی
جہنّم سے سوا طاعون سے یہ قوم ڈرتی ہے!

بعض اوقات انسان گناہ پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ لیکن زمانہ اس کا سازگار نہیں ہوتا۔ اکبرؔ فرماتے ہیں ؎

آمادگی مجھے تو رہی ہر گناہ پر!   فضلِ خدا سے بُت ہی نہیں آئے راہ پر

شاعر کے نزدیک شباب اور گناہ دو مترادف الفاظ ہیں۔ اس مضمون کو اکبرؔ حیدری نے خوب ادا کیا ہے ؎

اب ضمیرِ پاک طینت لطف فرمانے لگا
اب میں اپنی لغزشوں پر آپ پچھتانے لگا
ہو چکا اکبرؔ یقیناً ہو چکا عہدِ شباب
اب گناہوں میں گنہگاری کا رنگ آنے لگا

یہ سب جانتے ہیں کہ عادتیں راسخ ہو کر طبیعت ثانیہ بن جاتی ہیں۔ اور اُن کو درست کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ یہی حال نیک اعمال کی طرف رغبت کا ہے بظاہر ہم پرہیز و اتقا کی نمائش کرتے ہیں۔ اور اپنے افعال سے اس کا اشتہار کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن دلوں کا خدا ہی حافظ ہے۔ اقبالؔ نے اس مضمون کو نئے رنگ میں ادا کیا ہے ؎

مسجد تو بنا لی شب بھر میں ایماں کی حرارت والوں نے
دل اپنا پرانا پاپی تھا برسوں میں نمازی بن نہ سکا!

"ساقی" ۱۹۳۸ء

آغا محمد اشرف

نقد و نظر

نئی کتابیں

ہندوستان کی اکثریت اس وقت سوراج کی خواہاں ہے۔ لیکن اس اکثریت میں سے بیشتر لوگ سوراج کا خواب دیکھتے ہوئے اس بات کو نظر انداز کر جاتے ہیں کہ اس کی تعبیر دو طرح کی الجھنیں پیدا کر سکتی ہے۔ پہلی وہ الجھنیں جنہیں اندرونی کہا جا سکتا ہے۔ ان کو دُور کرنا اپنے بس کی بات ہے اور ہمیں روشن پہلو کو دیکھتے ہوئے توقع کرنا چاہیئے کہ بہی خواہانِ وطن اِن اُلجھنوں کو یقیناً دور کر لیں گے۔ لیکن دوسری قسم کی الجھنیں دوسرے ممالک کے ساتھ اپنے ملک کے سیاسی تعلقات کے سلسلے میں پیدا ہوں گی۔ ان کے دور کرنے کے لئے بعض ایسی رکاوٹیں راہ میں آ سکتی ہیں جن کی مدافعت کے طور پر ہندوستان کے ہر بچے کو دوسرے ممالک کے جغرافیائی، معاشرتی اور سب سے بڑھ کر سیاسی حالات کا مطالعہ ازبس ضروری ہے۔ مغربی دنیا اور خصوصاً یورپ میں اس وقت دو آدمیوں نے جیسے حالات پیدا کر رکھے ہیں وہ مشرق کے لئے ایک زبردست سبق ہیں۔ مسولینی اور ہٹلر کی قوتِ ارادی نے نہ صرف اُن کے ہم وطنوں کو اُن کے آہنیں پنجوں میں جکڑا ہوا ہے بلکہ تمام برّاعظم کو بے بس بنا رکھا ہے۔ ہٹلر کی قوت ارادی کا مطالعہ کرنے کے لئے اُس کی خود نوشتہ سوانح عمری "میری جدوجہد" ایک مفید کتاب ثابت ہو سکتی ہے۔ اس کتاب کے دو ترجمے بیک وقت اردو میں شائع ہوئے ہیں۔ اس وقت ہمارے سامنے لاہور کے مشہور ناشر نرائن دت سہگل اینڈ سنز کا شائع کیا ہوا ترجمہ ہے۔ اس کتاب کو اخبار "بندے ماترم" کے سابق مدیر لالہ شانتی نرائن جی نے اردو کا جامہ پہنایا ہے۔ شانتی نارائن جی پنجاب کے ہندو اخبار نویسوں میں صحافت کا اچھا تجربہ رکھتے ہیں اور اس کا ثبوت "میری جدوجہد" کے صاف اور رواں ترجمے میں ملتا ہے۔ البتہ ترجمے میں کہیں کہیں زبان کی ایسی خامیاں موجود ہیں جن سے عہدہ برائی ہو سکتی تھی۔ لیکن غالباً اس کی وجہ وہ تعجیل ہے جو کتاب کے شائع کرنے میں کی گئی ہے۔ اور اسی سبب سے لکھائی چھپائی میں بھی پوری احتیاط نہیں برتی گئی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ اس کتاب کے مطالعے سے بڑے بوڑھے اپنے میں ایک ان تھک ہمت پائیں گے اور نوجوان اپنے ملک کے لئے صحیح راستے پر چلنا سیکھیں گے۔

حجم ۴۳۶ صفحات۔ قیمت (مجلد) دو روپے آٹھ آنے۔

ملنے کا پتہ:۔ نرائن دت سہگل اینڈ سنز تاجران کتب لوہاری دروازہ لاہور

خواجہ باقر حسن قادری نے کہاوتوں کی ایک بڑی کتاب بدرالامثال کے نام سے لکھی تھی۔ طالب علموں اور بچوں کے لئے اسی کتاب کا اختصار "قصص الامثال" کے نام سے جامع مسجد دہلی کی رائل ایجوکیشنل بک ڈپو نے شائع کیا ہے۔ کہانیوں کے ذریعے سے بچے سوکھی اور بے مزہ باتیں بھی سن لیتے ہیں۔ زبان دانی، روزمرہ اور محاورہ کے جاننے میں کہاوتیں بہت حد تک مددگار ثابت ہو سکتی ہیں۔ اور چونکہ کہاوتوں کا ایک لازمی پہلو کہانیاں بھی ہوتی ہیں اس لئے طلباء اور بچوں کے لئے یہ طریقۂ تعلیم بہت مفید ثابت ہوتا ہے۔ خواجہ باقر حسن صاحب نے اس مجموعے میں نہ صرف ڈھائی سو کہاوتوں اور ان کی کہانیوں کو عام فہم زبان میں طلباء کی سہولت کے لئے یکجا کر دیا ہے بلکہ چند اور باتوں کا بھی لحاظ رکھا ہے جن کا اظہار انہوں نے دیباچے میں کیا ہے۔

۱۔ ہر ضرب المثل کا محل و موقع استعمال یا مفہوم و مطلب واضح کر دیا گیا ہے۔

۲۔ مترادف المعنی ضرب الامثال ایک جگہ لکھ دی گئی ہیں۔

۳۔ اگر کسی شعر یا دوہے میں استعمال کی ہوئی کہاوت مہیا

ہو گئی ہے۔ تو اُسے بھی ساتھ لکھ دیا گیا ہے۔

۴۔ اردو کے علاوہ اور زبانوں کی کہاوتیں بھی جن کی ہم معنی کہاوتیں اردو میں موجود ہیں، مقابلے کے طور پر درج کی گئی ہیں۔

۵۔ جو محاورات کثرت استعمال سے کہاوتوں کا درجہ حاصل کر چکے ہیں انہیں بھی شامل کر لیا گیا ہے۔

۶۔ غیر مانوس الفاظ کی وضاحت اور معنی درج کئے گئے ہیں۔

۷۔ ایک ہی کہاوت کی مختلف مستعمل صورتوں کو بھی درج کر دیا گیا ہے۔

یہ تمام کہاوتیں حروف تہجی کے مطابق درج کی گئی ہیں۔

ہمیں امید ہے کہ سکول کے طلباء اور معلم صاحبان اس مفید کتاب سے فائدہ اٹھائیں گے۔ طلباء کے علاوہ معلموں کے لئے بھی یہ کتاب ایک آسان حوالے کی کتاب کا کام دے سکتی ہے۔

حجم تین سو صفحات کاغذ معمولی لیکن اچھا، لکھائی چھپائی صاف قیمت ایک روپیہ پانچ آنے۔ ملنے کا پتہ:۔ رائل ایجوکیشنل بک ڈپو اردو بازار، جامع مسجد دہلی۔

ماتاھری

(خلیل احمد، ناشر:۔ اردو لٹریچر سوسائٹی ۹۶۔ ٹمپل روڈ۔ لاہور قیمت ایک روپیہ

جب کسی کنبے، ادارے یا ملک میں کوئی زبردست انقلاب یا ہنگامہ رُونما ہوتا ہے تو بعض بڑی شخصیتیں گمنام ہو کر رہ جاتی ہیں اور کئی معمولی انسانوں کو امتیاز حاصل ہو جاتا ہے۔ جنگ عظیم میں ماتا ہری کی شہرت اس کی ایک اچھی مثال ہے۔ ماتا ہری ہالینڈ کی باشندہ اور پیرس کی ایک پیشہ ور عورت تھی ایک مشہور رقاصہ ہونے کی بنا پر اُس کا تعلق بہت سے فوجی افسروں سے ہوا۔ اور وہ اُن کی داشتہ رہی۔ جنگ عظیم میں اُس کے بعض فوجی عشاق محکمۂ جاسوسی کے اخراجات سے ماتا ہری کی خوشنودیٔ طبع حاصل کرتے رہے۔ اور اس وجہ سے اُسے کورٹ مارشل میں جاسوسہ ثابت کیا جا سکا۔ اگرچہ طبقۂ اناث کا جاسوسی سے تعلق بہت پرانا ہے کیونکہ دنیا کی سب سے پہلی جاسوسہ وہ فاختہ تھی۔ جسے حضرت نوح نے کشتی کے ارارات سے جا لگنے پر خشکی کی تلاش میں روانہ کیا تھا، لیکن ماتا ہری کا تعلق جاسوسی سے اتفاقی اور بہت معمولی تھا۔ انگریزی میں میجر ٹامس کولسن کی کتاب ماتا ہری اس مشہور رقاصہ کی مستند سوانح عمری ہے۔ خلیل صاحب نے ان حالات کو اُردو کا جامہ پہنایا ہے۔ کتاب کے شروع میں مولانا عبدالمجید صاحب سالک کے قلم سے بارہ صفحوں کا ایک مقدمہ ہے۔ جس میں وہ فرماتے ہیں "خلیل صاحب نے یہ کتاب لکھ کر اُردو پڑھنے والوں کو دورِ حاضر کی ایک نامور ہستی سے رُوشناس کرا دیا ہے۔ اگرچہ لوگ اس سے پہلے ماتا ہری کے کچھ حالات اخباروں میں پڑھ چکے ہیں۔ اور ایک فلم بھی دکھائی جا چکی ہے۔ لیکن یہ کتاب کسی جانبدارانہ پروپیگنڈا سے پاک ہے اور ماتا ہری کی شخصیت کو اصلی رنگ میں پیش کرتی ہے۔ خلیل صاحب کا اسلوب بیان بہت دلنشین اور مرغوب ہے۔" ہمیں سالک صاحب سے صرف ایک بات میں اختلاف ہے۔ اور وہ بات کتاب کے غیر جانبدارانہ ہونے کے بارے میں ہے۔ شروع سے آخر تک مؤلف کا لہجہ کچھ اس قسم کا ہے۔ جس سے یہ اثر لیا جا سکتا ہے۔ کہ وہ ماتا ہری کو کسی طرح کی قابلِ ستائش اور بلند ہستی سمجھتے ہیں۔ خصوصاً آخری فقروں میں لکھا ہے: "وہ فرانس جس نے جون آف آرک جیسی عورت کو ہلاک کر دیا تھا۔ ماتا ہری کا سینہ گولیوں سے چھلنی کرنا اُس سے کچھ دُور نہ تھا"——

یہاں ہم سمجھتے ہیں کہ ماتا ہری کو جون آف آرک سے جا ملانا مضحکہ انگیز ہے جون آف آرک حُب الوطنی کا ایک مجسمہ تھی۔ ماتا ہری بھی ایک مجسمہ تو تھی لیکن "وطن" کے ساتھ اُس کو کوئی تعلق نہ تھا۔ "حُب" کے ساتھ ضرور تھا!

نئے رسالے

ہندوستان کو ایک بٹا دو سوراج مل گیا۔ یعنی صوبجاتی خود مختاری حاصل ہو گئی۔ پہلے لوگ سلطنتِ انگلشیہ کی برکتوں کے گُن گاتے تھے۔ اب اپنوں کی خوبیوں کے سراہنے کا وقت آ گیا ہے: تاڑی اور شراب ممنوع قرار دے دی گئیں، صوبجاتی خود مختاری زندہ باد! ضبط شدہ کتابوں سے پابندی اٹھا لی گئی، —— لیکن اس پر ہم اس گرم جوشی سے صاد نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ ہر قسم کی مطبوعات سے پابندی اُٹھا لینا دانشمندی کا شیوہ نہیں ہے۔ بہر حال لکھنؤ سے ایک ماہ نامہ "ریڈ" عرف باغی" یشپال صاحب کے زیر ادارت اشاعت پذیر ہوا ہے۔ ہر ماہ صاف ستھرے چھپے ہوئے بہتر صفحات کا مجموعہ چندہ سالانہ چار روپے آٹھ آنے۔ فی پرچہ چھ آنے۔ مجموعے کی نوعیت ذیل کے عنوانات سے ظاہر ہو سکتی ہے:۔ ریاستوں کی لڑائی ہمارا پہلا محاذ ہے ۲۔ ہندوستان کا قدیم سوشلزم ۳ مزدورن (افسانہ) ۴

اسپین پر ایک نظرہ۔ کانگرسی حکومتیں اور مسلمان ۶۔ مزدور انقلاب کا رہنما ۷۔ سوسائٹی میں عورت کی جگہ۔ یہ اپریل کے شمارے کے چیدہ چیدہ مضامین ہیں۔ مارچ میں ۱۔ کسانوں کے سامنے دو راستے ۲۔ سوشلزم میں خدا کو جگہ نہیں ۳۔ ہندوستان کی غلامی کے وجوہات ۴۔ روس میں بچوں کی پرورش اور تعلیم کا انتظام۔ ۵۔ کیا کانگرس ہندو جماعت ہے؟ ـــــ وغیرہ وغیرہ

نثر کے مضامین کے علاوہ نظمیں بھی ہوتی ہیں۔ اور اُن کی نوعیت بھی سیاسی اور انقلابی ہوتی ہے۔

ماہنامہ "ویلو عرف باغی" اُن لوگوں کی تحریک اور رجحانات ذہنی کا مظہر ہے جو ہر قسم کے بیرونی سیاسی اثرات کو اپنے وطن اور سماج پر بھی طاری کرنا چاہتے ہیں اور یہ لوگ ملکی خدمت کے لحاظ سے ابھی ذآموز ہیں۔ ان کے منفعت بخش یا مضر رساں پہلوؤں کے متعلق ابھی اندازہ ہی لگایا جا سکتا ہے۔ ہاں ان کے مقابلے پر ایسے خادمانِ ملک و قوم بھی ہیں جو کئی سالوں سے اپنے جنونِ قومی کے زیر اثر ارتقائی دور میں چلے جا رہے ہیں اردو صحافت کی تاریخ میں بجنور کے سہ روزہ اخبار مدینہ کا نام ہمیشہ ایک نمایاں امتیاز کا مالک رہے گا۔ پچیس سال سے یہ اخبار ہندوستان کی عموماً اور اہل اسلام کی خصوصاً خدمت کر رہا ہے۔ حال ہی میں اس نے اپنی نقرئی جوبلی مناتے ہوئے ایک خاص نمبر شائع کیا ہے۔ یہ نمبر اچھے اور مفید مضامین کا ایک قابل قدر مجموعہ ہے۔ اور اس کی ایک خصوصیت اردو ہندی ہندوستانی کے تنازعے کے متعلق فیصلہ کن مضامین کی اشاعت ہے۔ اس مجموعے میں آپ کو ہر قسم کے مضامین نظر آئیں گے۔ ادبی، لسانی، سماجی، سیاسی، انقلابی اور اسلامی۔ اس کے علاوہ اس میں جگہ جگہ تصاویر بھی آپ کو دکھائی دیں گی۔ یہ تصاویر مصر، عرب اور ہندوستان کے ایسے مقامات سے متعلق ہیں جو اہل اسلام کے لئے دلچسپی کا باعث ہیں اردو زبان کی خدمت کے سلسلے میں مدینہ کے جوبلی نمبر نے جو مضامین اردو ہندی ہندوستانی کے موضوع پر شائع کئے ہیں اُن کے لئے ہم انہیں داد دیتے ہوئے ان کی نقرئی جوبلی کے موقعے پر مبارک باد کہتے ہیں۔ یہ خاص اشاعت ۷۶ صفحات پر حاوی ہے۔

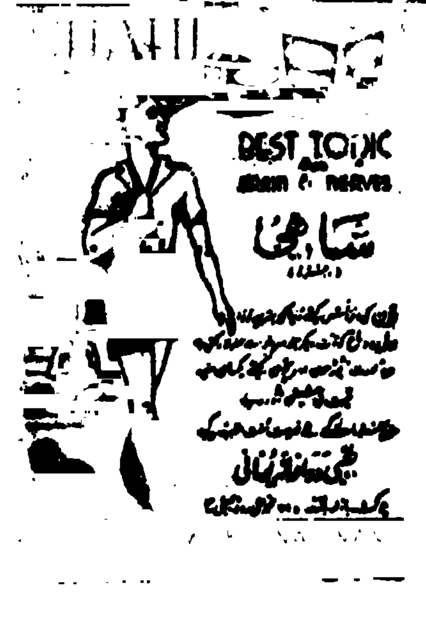
جب سے اہل وطن کو گھر کی رونق کے بڑھانے کے لئے قومی زبان کا ہنگامہ آیا ہے، ہم اس بات کی اشد ضرورت محسوس کر رہے تھے کہ اس پروپیگنڈا اداے زمانے میں اردو کی تبلیغ و اشاعت اور اس چشمہ آفتاب کی اہمیت شپرہ چشموں پر واضح کرنے کے لئے کسی خاص اخبار کی اشاعت جلد سے جلد ہونا چاہیے۔ تا حال پنجاب سے ہمایوں ادبی دنیا اور دکن سے "اردو" اس سلسلے میں تخصیص کے ساتھ کوشش کر رہے تھے۔ اب دہلی سے انجمن ترقی اردو نے ایک پندرہ روزہ اخبار "ہماری زبان" شائع کرنا شروع کیا ہے۔ اس کا کم سے کم حجم سولہ صفحے ہوگا۔ سالانہ چندہ ایک روپیہ فی پرچہ تین پیسے "ہماری زبان" ہر مہینے کی پہلی اور سولھویں تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔ اس اخبار سے آپ کو اردو کی ہمہ گیر خوبیوں کا علم ہوتا رہے گا۔ نیز آپ وقت کے ساتھ ساتھ یہ بھی جانتے رہیں گے کہ اس وقت اردو کے خلاف اور اس کے حق میں کون کون سی کارروائیاں عمل میں لائی جا رہی ہیں۔

اس اخبار کا چندہ خصوصاً کم رکھا گیا ہے اور اگرچہ یہ اخبار بذات خود بھی مفید مضامین کا حامل ہے۔ اس کے باوجود کسی قسم کے نعم البدل کی توقع کے بغیر اس کی خریداری کو حب الوطنی اور زبان کی خدمت کے لحاظ سے ایک فرض شمار کرنا چاہیے۔

پتہ۔ "ہماری زبان" نئی دہلی۔

" م "





میٹرکولیشن کا نتیجہ

۱۹۳۹ء کے لئے وظیفہ حاصل کرنے والے

سن لائٹ آف انڈیا انشورنس کمپنی لمیٹڈ لاہور کی میٹرک کے بعد کی پڑھائی کے لئے وظیفے دینے کی سکیم کے ماتحت ایک سو روپیہ ماہوار کی مجموعی رقم کے سات وظائف مندرجہ ذیل امیدواروں کو اُن کے نمبروں کے لحاظ سے جو اُنھوں نے امتحان میں حاصل کئے عطا کئے گئے ہیں۔

پہلا وظیفہ

-/۲۵ روپے ماہوار کا مسٹر اعجاز حسین طالب علم خالصہ ہائی سکول پشاور کو دیا گیا ہے اس امیدوار نے ۶۵۵ نمبر حاصل کئے

دوسرا وظیفہ

-/۲۰ روپے ماہوار کا مسٹر اوم پرکاش نرولا طالب علم ڈی اے ایس ہائی سکول لائل پور کو دیا گیا ہے۔ حاصل کردہ نمبر ۶۲۵

تیسرا وظیفہ

-/۱۵ روپے ماہوار کا مسٹر نیتانند طالب علم ڈی اے ایس ہائی سکول لائل پور کو دیا گیا ہے نمبر ۶۰۶

ان کے بعد چار وظیفے دس۱۰ دس۱۰ روپے کے مندرجہ ذیل اُمیدواروں کو دیئے گئے۔

مسٹر راجندر لال طالب علم ڈی اے وی ہائی سکول نمبر ۶۰۳

مسٹر کرشن دیو طالب علم اے۔ ڈی۔ اے۔ ایس ہائی سکول ایبٹ آباد نمبر ۵۸۶

مس للتا کماری لامبا طالب علم مہلا مہا ودیالہ۔ لاہور نمبر ۵۴۸

مسٹر جتندر لال طالب علم ایس ڈی ہائی سکول لاہور۔ نمبر ۴۶۹

یہ وظائف پورے چار سال تک جاری رہیں گے۔

وہ سکیم جن کے ماتحت یہ وظیفے دیئے جا رہے ہیں۔ درحقیقت بے نظیر اور لاثانی ہے۔ اس سے سن لائٹ آف انڈیا کے پالیسی ہولڈروں پر کسی قسم کا بوجھ نہیں پڑتا بلکہ اس سے ان کے بچوں کو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے میں امداد ملتی ہے۔ سن لائٹ آف انڈیا کی پالیسی کے ساتھ یہ مفت کا فائدہ ہے جو پالیسی کی قدر و قیمت میں نمایاں اضافہ کرتا ہے۔

ہم ان اصحاب سے جو بیمہ زندگی کی پالیسی لینے والے ہوں بزور سفارش کرتے ہیں کہ وہ کہیں اور بیمہ کرانے سے پہلے ہماری اس سکیم کا ضرور مطالعہ کریں۔

سن لائٹ آف انڈیا انشورنس کمپنی لمیٹڈ میٹرک کے بعد کی تعلیم کے لئے وظائف کی سکیم کے مفصل حالات ایک کارڈ آنے پر نہایت مسرت سے ارسال کر دے گی۔

نیشنل لیبارٹریز لاہور

کی شہرت

اب پنجاب سے نکل کر ہندوستان کے کونے کونے میں پھیل گئی ہے کیونکہ اس کی بنائی ہوئی تمام چیزیں اپنی عمدگی اور قیمت کی کفایت کے لحاظ سے ولایتی اشیا کو مات کرتی ہیں۔

نیشنل لیبارٹریز

کے اور ینج اور لیمن سکویش، عرقیات عطر سینٹ تیل، کریم سنو اور اینٹی سپٹال سب اپنے مقابلے کی ولایتی مصنوعات سے ہزار درجہ بہتر اور قیمت میں باکفایت ہیں

یہی وجہ ہے

کہ تمام معقول دکان دار اس کا سٹاک رکھتے اور اپنے گاہکوں کی ضروریات کو پورا کرتے ہیں۔

سول ایجنٹ:- **بیلی رام اینڈ برادرز۔ سوداگران ادویات۔ انارکلی۔ لاہور**

امتحان کے بعد بجلی کا کام سیکھئے

کیونکہ اس کام کے جاننے والوں کی ضرورت پنجاب۔ یو۔پی اور صوبہ سرحد میں دن بدن بڑھتی جا رہی ہے اور بہترین درس گاہ

سکول فار الیکٹریشنز لدھیانہ

ہے

جو گورنمنٹ رجسٹرڈ بھی ہے اور ایڈڈ بھی۔ ہر مذہب و ملت کے تقریباً ایک صد طلبا اس منظور شدہ درس گاہ میں تعلیم پا رہے ہیں

فیس ماہواری لی جاتی ہے پراسپکٹس مفت ملتے ہیں۔

مینیجر

GLYCO THYMOLENE



گلائیکو تھائیمولین

گلائیکو تھائیمولین کے استعمال کو اپنا روزمرہ کا

اصول بنا لو۔ یہ چالیس سالہ پرانا الکائین سلوشن ہے جو ناک اور گلے کی سوزش کو یقینی اور فوری آرام دیتا ہے

ہر معزز دوا فروش سے مل سکتا ہے

تیار کردہ:۔ کرالس اینڈ اودن کمپنی نیویارک۔ امریکہ

ہندوستان کے باضابطہ اور مختار ایجنٹ:۔ برائے ہندوستان و برما و سیلون

ایم۔ اے۔ جے نوبل نمبر ۱۰۹ پارسی سٹریٹ فورٹ بمبئی

(اس اشاعت کے تمام مضامین کے جملہ حقوق محفوظ ہیں)

فہرستِ مضامین ادبی دنیا لاہور

بابت ماہِ جون ۱۹۳۹ء

جلد ۱۷ — نمبر ۶

تصاویر: ۱۔ من کی جانچ ۲۔ چین کا مکتی داتا اور اس کی شریکِ زندگی

سالانہ چندہ مع محصول ڈاک اور وی پی پانچ روپے۔ ممالکِ غیر سے دس شلنگ

گیلانی الیکٹرک پریس ہسپتال روڈ لاہور میں باہتمام صلاح الدین احمد پرنٹر پبلشر چھپ کر دفتر ادبی دنیا ... سے شائع ہوا

دُنیائے کاروبار

اورئینٹل لائف انشورنس کمپنی لمیٹڈ

تازہ ترین رپوٹ پرسرسری نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کی یہ سب سے بڑی بیمہ کمپنی بدستور راہ ترقی پر گام زن ہے۔ یہ رپورٹ کمپنی کے حصہ داروں کے چونسٹھویں سالانہ اجلاس میں جو بمقام بمبئی ۲۶ اپریل ۱۹۳۹ء کو منعقد ہوا پیش کی گئی تھی۔ اس میں سال مختتمہ ۳۱ دسمبر ۱۹۳۸ء کے اعداد و شمار درج ہیں۔ اور اس کی رُو سے جن دلچسپ حقائق کا اظہار ہوتا ہے۔ اُن میں سے چند مختصراً حسب ذیل ہیں:-

رپورٹ کے سال میں بیمہ کی ۷۶۱۴۰ نئی تجاویز پیش ہوئیں جن میں سے ۵۳۳۳۸ تجاویز منظور کی گئیں اور ان کی رُو سے ۹۷۶۸۵۳۸۵ روپے کی مجموعی مالیت کا نیا بیمہ کیا گیا جس کی سالانہ اقساط کی آمدنی ۵۱۶۵۶۷۹ روپے ہے۔ ان نئی تجاویز میں سے سب سے بڑی تجویز کی رقم ایک لاکھ تیس ہزار روپے تھی۔

کمپنی کے جاری پالیسیوں کی مجموعی تعداد ۳۸۸۵۹۷ ہے جن کی رُو سے ۷۷۵۶۹۰۲۷۴ روپے کی رقم بیمہ شدہ ہے

سال زیر تبصرہ میں ۱۳۹۸۱۸۹۱ روپے کے مطالبات ادا کئے گئے جن میں ۶۵۱۱۸۱۸ روپے کے مطالبات موت کے باعث اور ۷۸۲۷۸۸۷ روپے کے مطالبات پالیسی کی مدت پوری ہو جانے کے باعث ادا ہوئے جن مطالبات کا باعث موت تھی۔ اُن کا تجزیہ کرنے پر معلوم ہوا کہ سب سے زیادہ اموات امراض سینہ سے واقع ہوئیں۔ سینہ کی امراض کے بعد علی الترتیب گروہ کے امراض، تپ دق، مختلف بخار۔ دِل کے امراض۔ حادثات۔ دماغی اور اعصابی امراض، ذیابیطس اور ذیابیطیسی پھوڑے۔ ہیضہ۔ تپ محرقہ اور بڑھاپے کی کمزوری کا نمبر ہے۔

رپورٹ کے سال کی مجموعی آمدنی ۴۴۷۸۲۰۵۸ روپے اور خرچ ۲۲۸۵۶۳۱۰ روپے اور بچت تقریباً دو کروڑ روپے ہے اور پریمیم کی آمدنی سے اخراجات کی نسبت ۲۲ فیصدی ہے۔ کمپنی کے اثاثہ کی مالیت ۲۳۲۲۴۸۶۱۹ روپے ہے۔ اس سال کا ایک دلچسپ واقعہ کمپنی کے چیف اکاؤنٹنٹ مسٹر ایم جے ایس خواس کی ملازمت سے سبکدوشی ہے جو مسلسل پچاس برس تک کام کرتے رہے اور اس طویل عرصے میں اُنہوں نے ایک دن بھی چھٹی نہیں لی۔ غالباً پابندی فرائض کی یہ مثال دنیا میں بینظیر ہے۔

سن لائٹ انشورنس کمپنی اور تعلیمی وظائف

ہمارے سامنے اس وقت ایک نہایت خوبصورت پمفلٹ ہے جس میں تعلیمی وظائف کی اُس سکیم کی تفصیلات درج ہیں جسے سن لائٹ آف انڈیا انشورنس کمپنی لمیٹڈ لاہور اپنے پالیسی ہولڈروں کے فائدے کے لئے جاری کیا ہے۔

سن لائٹ اُن ہندوستانی بیمہ کمپنیوں میں سے ہے جنہوں نے آغاز کار ہی میں ترقی کی منازل نہایت تیزی سے طے کی ہیں۔ سن لائٹ کے منتظمین اپنے پالیسی ہولڈروں کے فائدے کے لئے نت نئی تجاویز کو عملی جامہ پہناتے رہتے ہیں۔ ان تجاویز میں سے ایک تعلیمی وظائف کی سکیم ہے۔ اس کی رُو سے اُن پالیسی ہولڈروں کو جن کی پالیسی کی عمر پانچ سال یا اس سے زائد ہو گئی ہو یہ اختیار دیا جاتا ہے کہ وہ ایک ایسے طالب علم کی نامزدگی کر دیں جس نے انٹرنس کا امتحان دیا ہو۔ ہر سال نامزد طلبا کی ایک فہرست تیار کی جاتی ہے۔ اور اُن میں سے سات بہترین طلباء اپنے نمبروں کے لحاظ سے منتخب کئے جاتے ہیں۔

ان طلبا کو کمپنی درجے کے لحاظ سے پچیس۔ بیس۔ پندرہ اور دس دس روپے کے تعلیمی وظائف دیتی ہے۔ جو متواتر چار سال تک جاری رہتے ہیں۔ اس طرح یہ کمپنی چار سو روپیہ ماہوار اپنے پالیسی ہولڈروں کے بچوں یا عزیزوں کے تعلیمی مفاد کے لئے خرچ کر رہی ہے اور لطف یہ ہے کہ اس زائد خرچ کا کوئی اثر کسی پالیسی ہولڈر پر نہیں پڑتا۔ یعنی وظیفہ حاصل کرنے والے طالب علم کے والد یا والی کو پریمیم کے سوا کسی زائد رقم ادا نہیں کرنی پڑتی۔

جس خوبصورت پمفلٹ کا ہم نے اُوپر ذکر کیا ہے۔ اُس میں تعلیمی وظائف کی اس سکیم کے مفصل حالات اور شرائط درج ہیں۔ آپ ادبی دنیا کا حوالہ دے کر کمپنی کو ذیل کے پتہ پر ایک کارڈ لکھ دیں۔ سکیم آپ کو فوراً ارسال کر دی جائے گی۔ پتہ: مینیجر سن لائٹ آف انڈیا انشورنس کمپنی لمیٹڈ ٹمپل روڈ لاہور

بزم ادب

ادبی حلقوں میں یہ خبر رنج و افسوس سے سنی جائے گی کہ گذشتہ ماہ مولانا حامد علی خاں صاحب مدیر ہمایوں کی والدہ محترمہ انتقال فرما گئیں۔ مرحومہ نہایت پاک نفس اور نیک سیرت خاتون تھیں۔ انہیں جوانی ہی میں بیوگی کا صدمہ اٹھانا پڑا تھا اس عالم میں انہوں نے تربیت اولاد کے فرائض ایسی خوبی سے انجام دیئے کہ ان کے سب بچے خدا کے فضل سے کامیاب اور فائز المرام ہیں اور یہ اُن کے حُسن سیرت اور تدبیر منزل کا روشن ثبوت ہے۔

ہمیں اس صدمہ جانکاہ میں مولانا حامد علی خاں صاحب، پروفیسر محمد احمد خاں صاحب، پروفیسر حمید احمد خاں صاحب اور مرحومہ کی صاحبزادیوں سے دلی ہمدردی ہے۔

ابھی مندرجہ بالا سطور کی سیاہی بھی خشک نہ ہونے پائی تھی کہ اطلاع ملی کہ منصور احمد مرحوم ایڈیٹر ادبی دنیا کے والد محترم منشی محمد حسین صاحب صادق بھی اس جہان فانی سے رحلت فرما گئے۔ مرحوم حامد علی خاں صاحب کی والدہ مرحومہ کے سگے بھائی تھے اور اُن کی وفات پر اُن کے گاؤں کرم آباد تشریف لے گئے تھے۔ بہن کی وفات کا انہیں اس قدر صدمہ ہوا کہ اُسی شام انہیں فالج کا دورہ پڑا اور ایک ہفتہ حیات و موت کی کشمکش میں مبتلا رہ کر ۱۲ مئی کی صبح کو انتقال فرما گئے۔ مرحوم ایک بے نظیر شخصیت کے مالک تھے۔ راقم الحروف نے اپنی زندگی میں ایسا مخلص اور صادق انسان کہیں نہیں دیکھا۔ میرے حال پر خاص شفقت فرمایا کرتے تھے اور مجھے اپنے بچوں کے برابر عزیز رکھتے تھے۔ اللہ تعالیٰ انہیں فردوس بریں کے اعلیٰ ترین مقامات عطا فرمائے۔ اس سانحۂ عظیم میں منصور احمد مرحوم کے چھوٹے بھائیوں مولوی مظفر احمد و محمود احمد سے عالمگیر ہمدردی کا اظہار کیا جا رہا ہے۔

ماہ رواں کے پرچہ سے "دنیائے ادب" میں ایک نئی چیز کا اضافہ ہوتا ہے۔ اردو کی رفتار ترقی کا صحیح ترین اندازہ ادبیات حاضرہ کے اُن نمونوں سے لگایا جا سکتا ہے۔ جو اردو کے اچھے رسائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ہم نے یہ انتظام کیا ہے کہ اس صنف ادب کے بہترین منتخبات کا ذکر ہر ماہ ادبی دنیا کے بہرۂ "دنیائے ادب" میں کر دیا جائے تاکہ ناظرین بیک نظر ادبیات حاضرہ کے رجحانات سے آشنا ہو سکیں۔ اس اقدام سے کئی اور فائدے بھی مرتب ہوں گے جن کا مجمل سا ذکر "دنیائے ادب" کے آغاز میں کر دیا گیا ہے۔

اس اشاعت کے علمی و ادبی مضامین میں سے بہترین مضمون "جنگ عظیم کا آغاز" از چارلس پطراش قرار پایا ہے۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ صاحبِ مضمون نے یہ مضمون ان شخصیتوں اور مقامات سے ذاتی طور پر آشنا ہونے کے بعد لکھا ہے جن کا اس میں ذکر ہے اور جو دنیا کی سب سے بڑی جنگ سے خوفناک حد تک متعلق تھے۔

افسانوں میں سے بہترین افسانہ "بڑیرے" ہے جو مرزا عظیم بیگ صاحب چغتائی نے لکھا ہے۔ افسانے کی فضا عہدِ رفتہ کی بہادری اور وضعداری کے حرارت آفرین تاثرات سے لبریز ہے اور شہری زندگی کے مروجہ افسانوں سے بہت مختلف۔ امید ہے کہ اسے نہایت شوق اور دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔

حصۂ نظم میں دو چیزیں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اول مرزا غالب کا ایک نادر قطعہ اور اس کا جواب کہ نوادر ادب میں سے ہے اور مرزائے مرحوم کے مطبوعہ اور مروجہ دیوان میں موجود نہیں۔ ہمارے مکرم دوست مسٹر مالک رام ایم اے غالبیات سے خاص شغف رکھتے ہیں اور یہ قطعہ ہمیں انہیں کے توسل سے ملا ہے۔

دوسری چیز جنابِ مسعود شاہد اور روشن دین تنویر کی ایک زمین میں دو غزلیں ہیں جو ایک دوسرے کے مقابل چھپی ہیں حسن تقابل نے ان غزلوں کے لطف کو دوبالا کر دیا ہے۔

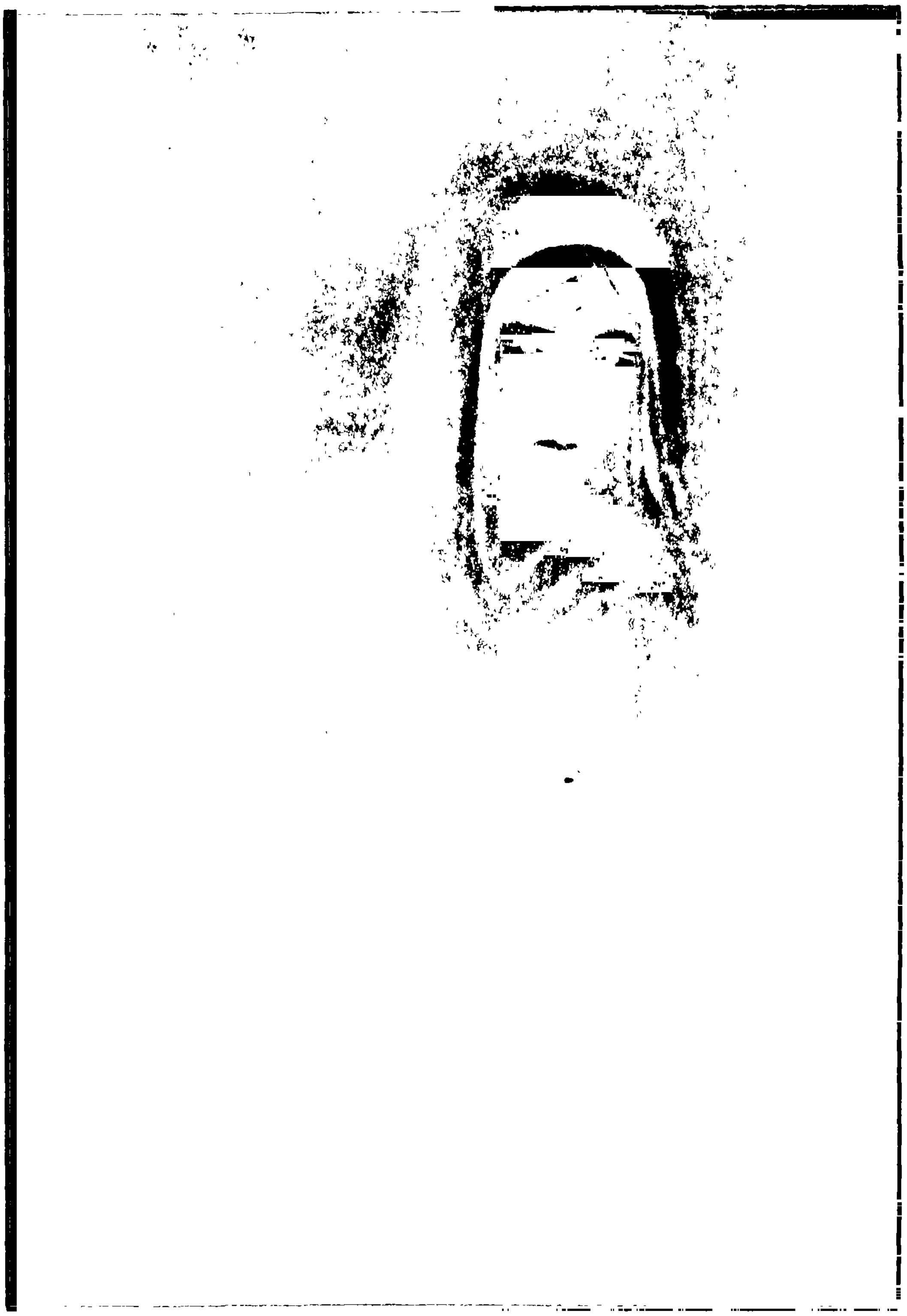
ناظرین دیکھ رہے ہوں گے کہ سالنامے سے لے کر اب تک متعدد مضامین مصور شائع ہوئے ہیں اور اکثر اصحاب نے ہماری اس روش کو بہت پسند کیا ہے۔ اشاعت حاضرہ میں بھی بسنت سہائے صاحب کا چین کا مکتی داتا با تصویر ہے۔

تصاویر کے سلسلے میں بہت سے ناظرین نے خطوط کے ذریعے سے ہمیں حسن انتخاب کی داد دی ہے۔ ادارہ اس قدر افزائی کے لئے اُن کا ممنون ہے۔

صلاح الدین احمد



چین کا مکتی داتا
اور
اُس کی شریکِ زندگی



من کی جانچ

عمل :- ایشور سنگھ

آئینۂ عالم

چین کا مُکتی داتا

چیانگ کائی شیک

وہ لوگ جو اپنی قوّتِ بازو سے بامِ عروج پر جا پہنچتے ہیں، دنیا کی حکایت سازی کے لئے ایک اچھا موضوع ہوتے ہیں۔ یہ رواتییں واقعیت سے خواہ دور ہوں مگر اُن کی زندگی اور شخصیّت کو دلچسپ اور دلکش ضرور بنا دیتی ہیں۔ چین کے مشہورِ عالم سپہ سالار، مارشل چیانگ کائی شیک کی ہستی بھی اس نظریّے سے مستثنےٰ نہیں ہے۔ گذشتہ چند ہی سالوں میں چیانگ کائی شیک کی شہرت چین کے علاوہ کرۂ ارض کے دوسرے حصّوں میں پہنچی ہے۔ اس چینی سپہ سالار کی زندگی اور سیرت کئی لحاظ سے مطالعے کے قابل ہے۔ چیانگ کائی شیک کے ایک پرانے معلّم نے اس کے سوانحِ حیات مرتب کئے ہیں۔ اس میں وہ ایک جگہہ لکھتا ہے۔ کہ زمانۂ تعلیم میں چیانگ ...... صبح بہت جلد بستر سے اُٹھ کھڑا ہوتا اور ضروریات سے فارغ ہونے کے بعد اس کی عادت تھی کہ وہ اپنے سونے والے کمرے کے برآمدے میں آدھ گھنٹے تک سیدھا کھڑا رہتا۔ اس استادہ حالت کے دوران میں اُس کے ہونٹ بھینچے ہوئے ہوتے، اس کے چہرے سے ایک راسخ ارادے کا اظہار ہو رہا ہوتا اور اُس نے اپنے دونوں بازووں کو سینے پر باندھ رکھا ہوتا۔ ہم یقینی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتے کہ ایسے لمحوں میں اُس کے دل پر کیا کچھ گذر رہی ہوتی، یا اس کے ذہن میں کون سے خیالات جاگزین ہوتے۔ لیکن یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے مستقبل کے متعلق ان پُرسکون لمحوں میں ضرور خیال آرائی کرتا ہوگا۔ بلکہ اُس کے روزنامچے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اِنہی ایام میں وہ جاپان سے فوجی تعلیم حاصل کرنے کے متعلق تجاویز پر غور و خوض کر رہا تھا۔ دوسری نمایاں خصوصیت اس کا وہ اشتیاق تھا۔ جس سے وہ شنگھائی سے آنے والے اخبارات کے مطالعے میں اپنے آپ کو غرق کر دیتا تھا۔ طلبائ کے لئے مطالعے کا ایک چھوٹا سا کمرہ بنا ہوا تھا۔ اس میں چیانگ اخبار بینی کرتا۔ اُن دنوں ہمارے علاقے تک بہت کم اخبارات کی پہنچ تھی اور اس لئے جو بھی بُرے بھلے تھوڑے سے اخبار ہم تک آتے اُن کی بہت قدر کی جاتی۔ لیکن جہاں تک میری یادداشت کام کرتی ہے بیرونی دنیا کے حالات جاننے کے لئے چیانگ سے بڑھ کر اور کوئی مشتاق نہ تھا۔ آج بھی مارشل چیانگ ایک زبردست اخبار بین ہے اور وہ چین اور دنیا کے دوسرے ممالک کی روزانہ ارتقائی کیفیت سے آگاہ رہنا اپنا فرضِ اول سمجھتا ہے۔

چیانگ کائی شیک ایک دیہاتی سوداگر کا بیٹا ہے، چین کا سب سے بڑا جرنیل اور سیاسی رہنما ہے اور اس کے ساتھ ہی نفسیاتی لحاظ سے ایک معمہ بھی ہے۔ وہ فوجی قواعد و ضوابط کی پابندی کا بے حد قائل ہے لیکن اس کے باوجود اُس نے اپنے بہت سے دشمنوں کو معاف کیا ہے۔ اور بہتوں کو ملازمتیں دی ہیں۔ اُس نے چین کو جاپان کی مدد سے متحد کر دیا ہے اور ہمیں چین کی تاریخ میں اُس سے بڑھ کر چین کو متحد کرنے والا اور کوئی شخص نہیں مِل سکتا۔ لیکن اِس کے ساتھ ہی وہ دس سال تک اپنی ہی قوم کی خانہ جنگیوں میں عملی طور پر حصّہ لیتا رہا ہے۔ جس طرح روس کا محبوب رہنما سٹالن ہے اور اطالیہ کا مسولینی، اُسی طرح چین کا مقبول ترین سپہ سالار چیانگ کائی شیک ہے۔

وہ ایک پکّا چینی قوم پرست ہے لیکن اُس نے اپنی تعلیم کا زیادہ

ترجمہ جاپان میں بسر کیا تھا۔ وہ سر تا پا ایک چینی ہے لیکن اُسے عیسائیت سے عقیدت اور وائی ایم سی اے میں دلچسپی ہے۔

جسمانی لحاظ سے وہ ایک ہلکا پھلکا، مضبوط اور نرم نقوش والا انسان ہے۔ لیکن اس کے سبھاؤ اور رکھ رکھاؤ میں ایک عجیب لچک اور دلکشی ہے۔ اُس کا قد پانچ فٹ دس انچ ہے۔ لیکن اُس کی ٹانگیں اوپر کے دھڑ کی بہ نسبت چھوٹی ہیں اور اسی لئے وہ عموماً بیٹھ کر تصویر کھچوانا پسند کرتا ہے یا پھر اس حالت میں کہ اُس نے اپنا محبوب لباس زیب تن کر رکھا ہو، جو ایک کشادہ اور سیاہ رنگ کا لبادہ ہے۔ اُس کا وزن ایک سو اکتالیس پاؤنڈ ہے اُس کی آنکھیں ایک امتیاز کی حامل ہیں۔ ان کا رنگ سیاہی مائل بھورا ہے اور ان گہری شفاف آنکھوں سے نہایت تیز نگاہیں ہر چیز پر پڑتی ہیں اور یہ نگاہیں کبھی ساکن نہیں رہ سکتیں۔ ان سے ایک اضطراب ہویدا ہے۔

چیانگ صبح سویرے منہ اندھیرے اُٹھتا ہے اور رات تک لگاتار کام کئے جاتا ہے۔ صبح کاذب اور صبح صادق کے درمیانی وقفے کو وہ دن رات کا بہترین حصہ سمجھتا ہے۔ لیٹے رہنا اُسے بھاتا نہیں اور کام کا زیادہ حصہ وہ صوفے پر دراز ہو کر تکمیل کو پہنچاتا ہے۔ دوپہر کے کھانے کے بعد وہ تھوڑی دیر کے لئے قیلولہ کرتا ہے۔ دوپہر کو سونے سے پہلے وہ ایک پرانے گراموفون پر ریکارڈ چلا دیتا ہے۔ اُسے مغرب کے نغمہ ساز شوبرٹ کا ایک ریکارڈ سب سے زیادہ پسند ہے۔ ساتھ کے کمرے میں اگر اُس کے کوئی دوست وغیرہ موجود ہوں تو دوپہر کے ریکارڈ کے ختم ہو جانے سے وہ سمجھ لیتے ہیں کہ مارشل اب سو رہا ہے۔ تیسرے پہر کو آدھ گھنٹہ وہ گیان دھیان میں صرف کرتا ہے کیونکہ وہ ایک پرہیزگار اور وضعدار انسان ہے۔ نہ کبھی شراب پیتا ہے نہ تمباکو۔ بلکہ اُس کو چائے اور کافی سے بھی احتراز ہے۔ اس کی پابندی وضع کا اظہار اُس کے روزنامچے سے بھی ہوتا ہے جو وہ کئی سال تک متواتر لکھتا رہا۔ اسی روزنامچے نے ایک بار چیانگ کی جان بھی بچائی۔ دسمبر ۱۹۳۶ء میں سیان کے ایک باغی گروہ نے مارشل موصوف کو اغوا کر لیا۔ لیکن اپنا روزنامچہ اور بیوی کے نام جو خطوط مارشل کے ہمراہ تھے اُن کی وجہ سے باغیوں کا رویہ بدل گیا۔

چیانگ کائی شیک کو دنیا میں تین چیزیں سب سے زیادہ مرغوب خاطر ہیں، شاعری، ہیئت اور اپنی بیوی۔ پہاڑی علاقہ ہو۔ دھوپ کھلی ہوئی ہو۔ اور مارشل اس کوہستانی زمین پر پیدل گھوم رہا ہو: یہ اُس کے نزدیک خوش وقتی کا بہترین تصور ہے یا اگر یہ بات نہ ہو تو آبادی سے دور دیہی یا جنگلاتی ماحول میں کھانے پینے کی اشیاء لے کر پک نک منانا اُس کے لئے لطف و مسرت کا ذریعہ ہے۔ جب وہ چلتا ہے تو شعر پڑھتا جاتا ہے۔ اُس کی گھریلو زندگی مسرت سے پُر ہے۔ اور میڈم چیانگ اُس کی لازمی اور دل پسند اور محبوب رفیقہ ہے۔ لیکن اس کے باوجود چیانگ بنیادی طور پر ایک عزلت پسند انسان ہے۔ آسٹریلیا کا ایک اخبار نویس اور امریکہ کا ایک مبلغ یہ دونوں اُس کے پردیسی لیکن بہت گہرے دوست ہیں۔

چیانگ ایک حساس بلکہ بعض اوقات کم آمیز انسان ہے۔ معاشری طور پر لوگوں سے اُس کا ملنا جُلنا بہت ہی کم ہے۔ جب کبھی وہ صوبہ جات کا دورہ کرتا ہے تو سوائے ایک سرکاری دعوت طعام کے وہ وہاں کے افسروں وغیرہ سے ملنے جُلنے کی کوئی کوشش نہیں کرتا جہاں وہ ٹھہرا ہوا ہو۔ ۱۹۳۹ء میں جب فتح پر اظہار مسرت کے لئے ہزاروں بشاش چینی اُس کے گھر کے سامنے جمع ہو گئے تو وہ اُن سے مخاطب ہوئے بغیر ہی انہیں لوٹا دینا چاہتا تھا۔ لیکن اُس کے مشیروں نے اُسے ایسا کرنے سے باز رکھا۔ حقیقتاً اُسے مجموعی یا انفرادی کسی طور پر بھی عوام کی طرف رغبت نہیں ہے۔

لیکن جب مارشل اور میڈم چیانگ کسی غیر ملکی ملاقاتی سے ملتے ہیں تو بہت خلق سے پیش آتے ہیں۔ میڈم چیانگ ترجمان بنتی ہے کیونکہ مارشل غیر زبانوں سے صرف جاپانی جانتا ہے۔ مارشل اور میڈم میں اس قدر ذہنی ہم آہنگی ہے کہ گفتگو کی ترجمانی میں کسی طرح کی رکاوٹ نہیں پیدا ہونے پاتی۔ مارشل وقت کی بہت قدر کرتا ہے۔ اور اخبار نویسوں سے شاذ ہی ملا کرتا ہے۔

خاص خاص موقعوں پر مارشل کی بہت حفاظت کی جاتی ہے۔ مثلاً اُس کی موٹر کی دیواریں گولیوں کو گذرنے نہیں دے سکتیں اور اس کی کھڑکیوں کے شیشوں کا دل ایک انچ ہے۔ لیکن بعض اوقات وہ عوام سے آزادانہ میل جول رکھتا ہے۔ مثلاً ایک بار وہ ہنکاؤ کے بندر پر بظاہر تن تنہا چل پھر رہا تھا۔ ہجوم میں وہ اس قدر غیر نمایاں نظر آتا ہے کہ اُسے کسی نے دیکھا ہی نہیں۔ اُس کے ذاتی محافظ (باڈی گارڈ) اُس کے ساتھ ہی تھے لیکن اُس سے دو سو فٹ کے فاصلے پر

موجود تھے۔

مارشل چیانگ کا کوئی مشغلہ نہیں، کام کا بار ہلکا کرنے کے لئے وہ تفریح کے طور پر مطالعے کے علاوہ اور کسی بات کی طرف رجوع نہیں ہوتا مطالعے کے لئے اُسے قدیم چینی کتب بہت مرغوب ہیں۔ کنفیوشس کی تصنیفات سے ذیل کا حصّہ اُسے سب سے زیادہ پسند ہے:۔

"ملک پر حکومت کرنے کے لئے لازمی ہے کہ انسان اپنے کنبے پر حکومت کرے،

"کنبے پر حکومت کرنے کے لئے لازمی ہے کہ انسان اپنے جسم کو اخلاقی تربیت کے ذریعے سے باقاعدہ بنائے۔

"جسم کو باقاعدہ بنانے کے لئے لازمی ہے کہ انسان سب سے پہلے اپنے ذہن کو باقاعدہ بنائے۔

"ذہن کو باقاعدہ بنانے کے لئے لازمی ہے کہ انسان اپنے ارادوں میں مخلص ہو،

"ارادوں میں اخلاص پیدا کرنے لئے لازمی ہے کہ انسان اپنے علم کو بڑھائے"!

چیانگ کائی شیک ۱۸۸۷ء میں چکیانگ صوبے کے ساحلی ضلعے فینگھوآ کے ایک گاؤں چکاؤ میں پیدا ہوا تھا۔ اُس کا خاندان کچھ امیر نہ تھا، لیکن کچھ ایسا غریب بھی نہ تھا۔ گھر والے جبر کر کے اُس کی تعلیم کو جاری رکھتے رہے۔ لیکن چیانگ نے وہاں کوئی نمایاں درجہ نہ حاصل کیا۔ بہر حال وہ ایک فرمانبردار لڑکا تھا۔ پہلے وہ پیکن کے قریب کی ایک فوجی اکیڈمی میں پڑھتا رہا۔ پھر جاپان کے ملٹری سٹاف کالج میں داخل ہو گیا۔ اس کے بعد وہ کئی سالوں تک جاپانی فوج میں ملازم بھی رہا۔

جاپان میں چیانگ کی ملاقات انقلاب چین کے بانی مبانی ڈاکٹر سن یٹ سین سے ہوئی۔ اور نوجوان چیانگ کے دل میں چین کے جذبۂ قومی کی آگ بھڑک اٹھی، دو سال تک وہ اَور جاپان میں ٹھہرا، لیکن اسی اثناء میں وہ ایک ایسی خفیہ انجمن کا ممبر بن گیا جس کے ارکان چینی مفاد کے لئے کوشاں تھے۔

جب ۱۹۱۱ء میں مانچو حکومت کا تختہ اُلٹ دیا گیا اور چینی جمہوریت کی تخلیق ہوئی تو چیانگ ایک دم چینی انقلاب میں شامل ہونے کے لئے جاپان سے چلا آیا۔ اگرچہ جاپانی فوج کی ملازمت کو یوں چھوڑ کر چلے آنا آئین کے خلاف تھا۔ لیکن چین پہنچ لینے پر چیانگ نے اپنی وردی اور تلوار باقاعدگی کے ساتھ بذریعۂ ڈاک جاپان روانہ کر دی۔

۱۹۱۱ء سے ۱۹۱۶ء تک پانچ سال کا عرصہ چیانگ اُن خانہ جنگیوں میں حصّہ لیتا رہا۔ جو انقلاب چین کی وجہ سے جاری ہو گئی تھیں۔ ڈاکٹر سن یٹ سین کے بہترین ماتحتوں میں سے ایک چیانگ بھی تھا۔ لیکن ۱۹۱۶ء میں اُس نے اچانک فوج سے علیحدہ ہو کر تجارت کو اپنا پیشہ بنا لیا۔ کیونکہ اُس نے اس بات کو اچھی طرح جان لیا کہ اپنے سیاسی کاموں کو کامیاب بنانے کے لئے لازمی ہے کہ اُس کے پاس بہت سا روپیہ موجود ہو۔ چنانچہ اُس نے اس روپے کے حصول کے لئے جستجو شروع کر دی۔ پہلے پہل وہ کچھ عرصے تک ایک دلال کے پاس کلرک کا کام کرتا رہا۔ چیانگ کی قسمت بہت اچھی تھی کیونکہ دو بہت امیر اور رسوخ والے آدمیوں نے اُسے اپنا متبنّٰی بنا لیا، اور ان میں سے ہر ایک نے اس کی کامیابی کے لئے ہر طرح سے کوشش کی۔

۱۹۲۱ء میں چیانگ نے پھر سے فوجی اور سیاسی معاملات میں دخل دینا شروع کر دیا یعنی وہ عملی طور پر ایک انقلابی بن گیا۔ ۱۹۲۳ء میں ڈاکٹر سن یٹ سین نے اُسے ایک فوجی افسر کی حیثیت میں ماسکو بھیج دیا۔ یہاں وہ چھ ماہ تک مقیم رہا۔ ماسکو میں چیانگ کی ملاقات جہاں اور مشاہیر سے ہوئی وہاں اُسے ٹرانسکی سے بھی ملنے کا موقعہ ملا۔ ۱۹۲۵ء تک چیانگ "کواومن ٹانگ" کی کمیٹی کا صدر بن گیا، اور جب ڈاکٹر سن یٹ سین کا انتقال ہوا تو اُس نے چین کی قومی فوج کے سپہ سالارِ اعظم کے عہدے کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں لے لی۔

۱۹۲۶ء میں چیانگ کے سب سے زیادہ حیران کن کارنامے کی ابتداء ہوئی۔ اُس نے فوجی فتح کے ذریعے سے چین کو متحد کرنے کا زبردست کام شروع کر دیا۔ یہ وہ زمانہ تھا۔ جب ابھی اِن چینی قوم پرستوں کو سر پھرے روسی خیالات والے لوگ ہی سمجھا جاتا تھا۔ اور صرف جنوبی حصّوں میں ہی انہیں اقتدار حاصل تھا۔ اس وقت چین کے جو اندرونی حالات تھے۔ انہوں نے چیانگ کی بہت مدد کی۔ چین کے بہت سے بڑے بڑے سپہ سالار آپس میں خون خرابہ کر رہے تھے، اور ایک دوسرے کو نیچا دکھا رہے تھے۔ اس لئے چیانگ کو اپنے مدمقابل ہی کم یا کمزور ملے۔ لیکن اس کے باوجود چیانگ

نے جو کچھ کام کیا وہ ایک امتیازی شان رکھتا ہے۔ اس نے کامیابی کے لئے ہتھیاروں سے بھی لڑائی کی اور روپے سے بھی۔ چین پہلے ایک برِ اعظم کی مانند تھا۔ لیکن چیانگ نے اسے ایسا ملایا کہ ایک ملک بنا دیا — لیکن متواتر دس سال تک اِن خانہ جنگیوں کی وجوہات کیا تھیں؟ ان وجوہ کو جاننے کے لئے ہمیں ذرا فضائے بعید میں جانا پڑے گا۔

۱۹۲۱ء میں ڈاکٹر سن یٹ سین نے اپنے ان تین اصولوں کا اعلان کیا جو اب تک کم از کم نظری طور پر چینی قوم پرستی کے بنیادی مقاصد ہیں۔ ۱۔ قوم پرستی ۔۲۔ جمہوریت اور ۳۔ عوام کی وجۂ معاش۔ اِن اصولوں سے ڈاکٹر سن یٹ سین کا مطلب یہ تھا کہ چین اُن مراعات کو رد کرکے جو غیر ممالک کو یہاں حاصل تھیں، اپنے میں ایک باقاعدہ اتحاد پیدا کرلے۔ اور جمہوری آئین کے ذریعے سے ملک کو خودمختار حکومت کے قابل بنا دیا جائے اور قومی حکومت میں آزادانہ انتخاب ہوا کرے۔ نیز سماجی اصلاح، اقتصادی بلندی اور دولت کی از سرِ نو تقسیم سے لاکھوں بھوکوں کی روزی مہیا کی جائے۔ چین میں ایک ایسا نظام قائم کرنے کے سلسلے میں جو مشکلات حائل تھیں ان کا اندازہ اس بات سے بھی کیا جاسکتا ہے کہ ڈاکٹر موصوف کے اعلان سے پہلے چینی زبان میں "جمہوریت" کے لئے کوئی لفظ ہی موجود نہ تھا۔

۱۹۲۱ء میں ڈاکٹر سن یٹ سین کو مدد کی بہت بری طرح ضرورت تھی۔ مغربی طاقتیں اس ہاتھ پیر مارتے ہوئے انقلاب میں اُس کی معاون نہیں بننا چاہتی تھیں کیونکہ انہیں اپنی مراعات کے چھن جانے کا خدشہ تھا۔ انہیں یہ منظور نہ تھا کہ چین انفرادی اور اجتماعی طاقت پکڑلے۔ متحدہ چین اُن کے لئے نقصان کا باعث تھا۔ اس لئے مجبوراً ڈاکٹر موصوف کو اپنی مدد کے لئے سوویٹ روس کی طرف رجوع ہونا پڑا۔ اس نے چیانگ کو ماسکو بھیجا۔ چنانچہ روس کے سیاسی صلاح کار چین میں آتے اور "کومن تانگ" (عوام کی قومی جماعت) میں روسی اثرات پھیل گئے۔ لیکن عوام کی یہ قومی جماعت کسی طرح کی اشتراکی جمعیت نہ تھی۔ جب چیانگ نے ۱۹۲۷ء میں ہنکاؤ کو فتح کرلیا تو وہاں روسی طرز کی ایک حکومت قائم ہوگئی لیکن اس حکومت کو بھی سراسر اشتراکی حکومت نہیں کہا جاسکتا۔ عوام کی قومی جماعت کا بایاں بازو یعنی ترقی پسند ارکان کا گروہ ایک طرح کی چینی اشتراکیت کو رائج کرنا چاہتا تھا۔ ان کے پروگرام میں زیادہ تر زرعی اصلاحات شامل تھیں اور اِن کی باتوں سے اُن تمام کسانوں میں ایک نئی زندگی کی لہر دوڑ گئی جن کے پاس نہ ہل چلانے کو زمین تھی نہ رہنے کو مکان۔ لیکن دائیں اور بائیں دو گروہوں کے بن جانے سے یہ لازمی تھا کہ یہ قومی جماعت ٹوٹ جاتی۔ دائیں بازو والے پہلے اصول یعنی قوم پرستی کو سب سے زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ رفتہ رفتہ یہ اختلاف بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ اس نظری اختلاف نے عملی طور پر خانہ جنگی کی صورت اختیار کرلی اور ۱۹۲۷ء میں ہنکاؤ کی جدید حکومت کا تختہ اُلٹ دیا گیا۔ اس تختے کو اُلٹنے والے کا نام چیانگ کائی شیک تھا!

چیانگ کے آیندہ رویّے سے اُس کے دوست حیرت زدہ ہوکر رہ گئے۔ بظاہر اُس کا عمل انقلابی پروگرام کے منافی تھا۔ وہ اپنے عہد سے پھرتا ہوا نظر آرہا تھا۔ اپنے دوستوں سے مُنہ موڑتا ہُوا۔ اور ڈاکٹر سن یٹ سین کی یاد سے بے وفائی کرتا ہُوا۔ وہ چیانگ جو انقلابی کہلاتا تھا۔ اب انقلابیوں ہی کا مخالف بنا بیٹھا تھا۔ اُس کے پہلے ساتھی اور ساتھ لڑنے والے جو بائیں بازو میں شامل ہوگئے تھے، اُس نے انہیں چُن چُن کر ڈھونڈھ نکالا اور زیر کرنا شروع کردیا۔ چین میں ایک ایسی زبردستی اور یک طرفہ کارروائی کا جال پھیل گیا جس کی مثال ماضی میں موجود نہ تھی۔

چیانگ انقلابی تو تھا۔ لیکن وہ ایک انتہا پسند انقلابی کبھی بھی نہ تھا اور اُسے اِس کا احساس تھا کہ اگر انقلاب چین کو دنیا کی نظروں میں پُر اثر بنانا ہے تو ضروری ہے کہ اُسے ایک نئی صورت دے دی جائے۔ محض تبدیلی ہی سے کام نہیں چلے گا۔ چین کے لئے تبادلے کی بھی ضرورت ہوگی۔ اور شنگھائی اور ینگ سی کی وادی میں جو غیر ملکی مفاد مرکوز ہیں ان کی مدد بھی حاصل کرنا ہوگی۔

وہ شنگھائی گیا اور وہاں پہنچ کر اُس نے اُن بینکروں اور بین الاقوامی مراعات کے نمایندوں سے یارانہ گانٹھا جن کو تباہ و برباد کرلینے کا اُس نے پیشتر عہد کیا تھا۔ اشتراکیت کی مخالفت سے اُسے چین کے اُن بہت سے صوبوں میں اپنی قومی فوج کے قیام کا بہانہ مل گیا۔ جہاں وہ اس کے بغیر اپنے آدمیوں کو جمع نہ کرسکتا تھا۔ اس کے علاوہ اشتراکیت کی صورت میں اُسے ایک ایسا مدِمقابل مل رہا تھا جس کا مقابلہ وہ لگاتار کرسکتا تھا اور ایک قوم پرست ڈکٹیٹر کے لئے یہ بات

بہت مفید تھی۔ لیکن چیانگ اشتراکیت کو دور کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ دس سال کی متواتر محنت اُس کی معاون نہ ہو سکی۔ اشتراکیوں نے کبھی ہمت نہ ہاری اور نہ ہار مانی۔ یہاں تک کہ آخر سیان میں انہوں نے چیانگ کو اغوا کر لیا۔ وہ انسان جس نے اشتراکیوں کے سیکڑوں آدمیوں کو مروا ڈالا تھا اب ان کے اپنے رحم و کرم پر تھا۔ لیکن اس بات نے تمام دنیا کو حیران کر دیا کہ اُسی شخص کو انہوں نے آزاد کر دیا۔ بلکہ چیانگ نے اپنے اِن "دشمنوں" کو ساتھ ملا کر ایک متحدہ محاذ قایم کیا اور بہت سے التوا اور ردّ و بدل کے بعد چین کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا۔

مارشل چیانگ کی امتیازی سیرت کی نمایاں خصوصیات سختی، پختگی اور استحکام ہیں۔ یہ نرم و نازک نقوش والا سپاہی ایک چٹان کی مانند ہے۔ وہ کسی قسم کی چالبازی سے آگاہ نہیں ہے۔ اُس کے طریقے سیدھے سادے ہیں۔ جب سیان میں اُسے اغوا کر لیا گیا تو وہ اپنے گرفتار کرنے والوں کو خدا کا واسطہ دیتا رہا کہ وہ اسے جان سے مار ڈالیں۔ نیز اس کے روزنامچے سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنی اس گرفتاری کے زمانے میں وہ اپنے صحیح خیالات کو چھپانے کی بجائے پورے اعتماد کے ساتھ اپنے گرفتار کرنے والوں سے ہر قسم کی گفتگو کرتا رہا۔

اس کی سیرت میں بے رحمی بھی ہے، اور اس کا اظہار اشتراکیوں کی مخالفت میں بسا اوقات ہو چکا ہے۔ اُس نے ہزاروں انسانوں کو صرف اس پاداش کی بنا پر موت کے گھاٹ اُتروا ڈالا کہ وہ اُس کے ہم خیال نہ تھے۔ وہ ایک چالاک، شکّی، سوچ سمجھ کر چلنے والا انسان ہے۔ اور اکثر اسے غیر مستحسن ذرائع اختیار کرنے میں بھی عار نہیں ہوتی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس کی اخلاقی اور جسمانی جرأت اور دلیری سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ ایک سے زیادہ بار وہ اپنے رویّے سے ثابت کر چکا ہے کہ اس کے دل میں موت کا ڈر موجود نہیں ہے۔

اُسے اپنے آپ پر اس قدر اعتماد ہے کہ وہ ہمیشہ منتظر رہتا ہے کہ اُس کے مخالف اپنی غلطی کو جان لیں، اس کی بات کو صحیح مان لیں اور نادم ہو کر اس کی طرف رجوع کریں۔ اس طرح اُس نے خانہ جنگی کے زمانے کے بہت سے سرداروں کو اپنا مفید ساتھی بنا لیا۔

ایک اور خصوصیت اُس کا بے پایاں صبر ہے۔ پانچ سال پیشتر وہ جاپانیوں کے آگے جھکتا ہی جا رہا تھا۔ چنانچہ اس نے منچوریا بھی ہاتھ سے دے دیا۔ جیہول بھی اور اندرونی منگولیا کی حالت بھی اُسے مخدوش ہی معلوم ہوتی تھی۔ لیکن کئی سال تک اُس نے ذرّہ بھر مخالفت نہ کی۔ جاپانیوں کے خلاف کچھ بھی نہ کہا۔ بلکہ اُس نے اُن چینیوں کو سزا بھی دی جو بظاہر جاپانیوں کے مخالف ہوئے۔ اُس کے بہت سے اچھے اچھے فوجی افسر خانہ جنگی کے دوران میں اُس کی اس کمزور روش پر آتش زیر پا بھی ہوئے۔ لیکن چیانگ نے پھر بھی کوئی قدم نہ اٹھایا اور اس کے بعد ۱۹۳۷ء کی وہ جنگ شروع ہوئی جو اب بھی جاری ہے۔

۱۹۳۴ء میں بھی وہ خفیہ طور پر اسی بات کو اپنے ماتحت افسروں کے ذہن نشین کراتا رہا کہ آخرکار انہیں جاپان سے جنگ آزما ہونا ہی پڑے گا۔ اور وہ اس آنے والی یقینی جنگ کی تیاریوں کے لئے اُن کی منتیں کرتا رہا۔ ۱۹۳۰ء میں چیانگ کو اس بات کا احساس تھا کہ چینی جاپانیوں کا کامیاب مقابلہ نہیں کر سکتے اس لئے تیار ہونے کے لئے جس طرح بھی ملے وقت حاصل کرنا چاہئے اور پھر شاید وہ جیت سکیں۔

چیانگ روپے سے بہت ہوشیاری کے ساتھ کام لیتا ہے۔ جنگ کے آغاز ہی میں اُس نے گھاؤ دان یعنی زخموں کے انعام کا ایک ایسا سسٹم ایجاد کیا جس کی مثال دنیا کی فوجی تاریخ میں آج تک نہیں ملتی۔ ہر سپاہی کو قومی حکومت کی طرف سے میدانِ جنگ میں لگے ہوئے ہر زخم پر ایک مقررہ رقم دس چینی ڈالر ادا کی جانی قرار پائی۔ چینی ذہن حقیقت پرست ہے اور اس کے لئے تمغوں کی بہ نسبت زرِ نقد خدمت کا بہتر معاوضہ ہے۔ یہ معاوضہ عام سپاہی کو دس، افسروں کو بیس سے پچاس اور جرنیلوں کو سو چینی ڈالر ملتا ہے۔ یہ طریقہ بہت کامیاب ثابت ہوا۔

مارشل چیانگ کی تنخواہ ایک ہزار چینی ڈالر ماہوار ہے یعنی تقریباً ساڑھے چھ سو روپے۔ اس کی ذاتی جائیداد کچھ زیادہ نہیں ہے۔ اگرچہ کہا جاتا ہے کہ اُس نے شنگھائی کے اوّلین ایام میں کافی روپیہ کمایا تھا۔ سُونگ خاندان میں اس نے شادی کی، لیکن اس خاندان کی دولت ایک علیحدہ چیز ہے۔ سُونگ خاندان کے لوگ چین کے امیر ترین افراد میں سے ہیں اور خاندانی اجتماعی قوت کے لحاظ سے یہ خاندان دُنیا کی ایک امتیازی مثال ہے۔ کیونکہ اس خاندان کا ہر فرد ملک میں ایک نمایاں حیثیت کا مالک ہے۔ اس خاندان کی تین لڑکیوں میں سے سب سے بڑی لڑکی چین کے وزیرِ اعظم ڈاکٹر ایچ ایچ کونگ کی بیوی ہے

دوسری لڑکی ڈاکٹر سن یت سین کی بیوہ ہے اور تیسری جس کا نام مے آئی لنگ ہے، مارشل چیانگ کائی شیک کی بیوی ہے۔ ان تینوں بہنوں کی تعلیم و تربیت اور ابتدائی نشوونما امریکی ماحول میں ہوئی۔ تینوں ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں تعلیم کی تکمیل سے پہلے مشنری سکولوں میں بھیجی گئیں اور سب سے اہم یہ کہ تینوں کا تعلق بچپن ہی سے انقلابِ چین کے ساتھ رہا کیونکہ ان کا باپ ڈاکٹر سن یت سین کا سب سے معتبر دوست تھا۔

میڈم چیانگ سب سے چھوٹی بہن ہے لیکن سب سے امتیازی شان رکھتی ہے۔ ہمت اور طاقت کے لحاظ سے اُسے اندازاً چین میں ثانوی حیثیت حاصل ہے۔ یہ مانا کہ چیانگ کائی شیک ہر بات کا فیصلہ بذاتِ خود کرتا ہے لیکن ان فیصلوں میں میڈم چیانگ کے مشوروں کو بہت حد تک دخل ہوتا ہے۔ وہ نہ صرف مارشل کی نقیبۂ حیات اور مشیرِ کار ہے بلکہ غیر ملکی باشندوں سے میل جول اور غیر ملکوں کی رائے زنی سے مارشل کو آگاہ رکھنے میں بھی چیانگ کی معاون ہے۔

پندرہ سال کی عمر میں چیانگ نے فینگھوا میں اپنے ایک ہمسائے کی بیٹی سے شادی کر لی۔ یہ شادی خاندانی طور پر ہوئی تھی لیکن ۱۹۲۱ء میں چیانگ نے طلاق کے ذریعے سے آزادی حاصل کر لی۔ چیانگ کی اس بیوی کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اُس کا رہن سہن قدیم چینیوں کی طرح تھا۔ پرانے رواج کے مطابق ہی اُس کے پاؤں چھوٹے رکھے گئے تھے۔ مارشل اب اُس سے کبھی نہیں ملتا لیکن دنیوی لحاظ سے اُس کی مدد کیے جاتا ہے اور اس کی گذر اوقات کا بار اُس نے طلاق کے باوجود اپنے ذمے لے رکھا ہے۔ پہلی بیوی سے ایک بیٹا بھی پیدا ہوا جس کی عمر اب تیس سال کی ہے۔ لیکن بعد ازاں مارشل نے ایک اور بیٹے کو بھی بنا لیا۔ طلاق کے بعد مارشل چیانگ کی ملاقات مے آئی لنگ سونگ سے کینٹن میں ہوئی۔

میڈم چیانگ غیر معمولی طور پر حسین، دلکش اور جاذبِ نظر ہے۔ میڈم چیانگ پر اپنی بہنوں کی نسبت امریکہ کے ماحول کا زیادہ اثر ہوا۔ چستی، صاف ستھرا پن، خوش گفتاری اور مستعدی، قابلیت، اور لیاقت یہ سب میڈم چیانگ کی خصوصیات ہیں۔ چین اور مارشل چیانگ سے اُسے جو والہانہ عقیدت ہے اُس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ وہ سماجی اور سیاسی زندگی میں پوری طرح حصہ لیتی ہے۔

جب کبھی جاپانی ہوائی حملہ کرتے ہیں تو میڈم چیانگ ایک دم موقعۂ واردات پر جا پہنچتی ہے اور زخمیوں کی دیکھ بھال میں مصروف ہو جاتی ہے۔ دیہاتی علاقوں کو از سرِ نو آباد کرنے، زبان کو آسان بنانے کی نشوونما اور تحریکِ حیاتِ نو (شخصی امداد اور بہتری کی تحریک) کی تخلیق و تنظیم میں میڈم نے بہت حصہ لیا ہے۔

جب مارشل کو سیان کے باغیوں نے گرفتار کر لیا تو میڈم نے اپنے بھائی کے ذریعے سے ایک پیغام مارشل کو بھیجا، جس سے اُس کی سیرت پر روشنی پڑتی ہے۔ "اگر تین دن تک میرا بھائی نہ لوٹا تو میں خود آپ کے پاس جینے اور مرنے کے لئے شانسی پہنچ جاؤں گی ——"

جب چیانگ نے اس پیغام کو پڑھا تو اُس کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں لیکن میڈم چیانگ تین کا انتظار کئے بغیر دوسرے ہی دن شانسی جا پہنچی اور اُس نے یہ ثابت کر دیا کہ اُس کے خاوند کی زندگی اُس کی اپنی زندگی ہے اور اُس کے خاوند کے مقاصدِ حیات بھی اُس کے اپنے ہی ہیں۔

۲۳ راکتوبر ۱۹۳۰ء کو چیانگ کائی شیک کو بپتسمہ دیا گیا۔ اور اُس نے عیسائی مذہب اختیار کر لیا۔ مارشل کی بیوی کے خاندان کے تمام افراد پکے عیسائی تھے۔ اور جب مارشل نے میڈم چیانگ کی طرف شادی کے ارادے سے توجہ کی تو شروع شروع میں اُس کے اس رجحان کو اس بنا پر رد کر دیا گیا کہ وہ عیسائی نہیں ہے اور یہ ظاہر کیا گیا کہ اگر وہ عیسائی ہو جائے تو شادی ہو سکتی ہے لیکن مارشل ایک راسخ الارادہ انسان تھا۔ اُس نے کہا کہ یوں کرنے سے اُس کی اپنی نظروں میں اُس کی عزّت کم ہو جائے گی کہ محض شادی کے لئے اُس نے دوسرا مذہب اختیار کیا۔ اس سے لڑکی اور لڑکی والوں پر اثر تو ہوا لیکن اور کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ چیانگ نے یہ بھی کہا کہ اگر شادی ہو جائے تو وہ وعدہ کرتا ہے کہ عیسائیت کا باقاعدہ مطالعہ کرے گا اور اگر اُس کا اعتقاد پیدا ہوا تو اس مذہب کو اختیار بھی کرے گا۔ اس پر بھی بات نہ بنی۔ لیکن چیانگ نے ہمت نہ ہاری اور وہ اصرار کرتا ہی رہا۔ اسی دوران میں اُس نے انقلابِ چین کی مخالفت کی، وہ ترقی کی تمام منزلیں طے کر لیں۔ آخر ۱۹۲۷ء میں میڈم چیانگ کی بڑی بہن نے اخبارات کے نمائندوں کو شادی کی خبر سے آگاہ کیا۔ اور یکم دسمبر کو شادی ہو گئی۔ شادی کی رسم کے تین بعد چیانگ نے کہا کہ اب انقلاب کا کام زیادہ ترقی کرے گا کیونکہ اب میں اپنی زبردست ذمّہ داریوں سے مطمئن دل کے ساتھ عہدہ برآ ہو سکوں گا۔

انجام کار چیانگ نے عیسائیت کو اختیار کر لیا اور اب وہ ایک راسخ العقیدہ عیسائی ہے۔ ۱۹۳۸ء میں ایک تقریر نشر کرتے ہوئے اُس نے اِس موضوع پر خیال آرائی کی کہ ہم یسوع مسیح پر کیوں اعتقاد رکھتے ہیں۔ چیانگ کے دل میں اپنی بیوی کی جو محبت ہے وہ شادی کو دس سال کا عرصہ گذر جانے کے باوجود کسی طرح کم نہیں ہوئی۔ اگرچہ سیان کی گرفتاری کے وقت اُس نے اپنا جو آخری پیغام بیوی کے نام روانہ کیا تھا۔ وہ ذاتی نہیں ہے "چونکہ میں نے ارادہ کر لیا ہے کہ ضرورت پڑنے پر اپنے وطن کے لئے قربان ہو جاؤں، اس لئے میرے متعلق مہربانی سے کسی قسم کی فکر نہ کرنا۔ میں کبھی کوئی ایسی بات نہیں کروں گا، جس سے میری بیوی اپنے دل میں شرمسار ہو اور میں ہمیشہ اپنے کو ڈاکٹر سن یٹ سین کا ایک پکا پیرو ثابت کرنے کی کوشش کروں گا۔ چونکہ میں انقلاب ہی کے لئے پیدا ہوا تھا۔ اس لئے نہایت خوشی سے انقلاب ہی کے لئے مروں گا۔"

خواہ مارشل چیانگ کا عملہ کسی بھی جگہ مقیم ہو، ہر سوموار کے روز ایک امتیازی اور اہم رسم عمل میں آتی ہے۔ چھ سو سپاہی چیانگ کی دارالاقامت کے قریب ایک ہال میں جمع ہوتے ہیں۔ فوجی بینڈ باجہ پر خرامی نغمہ بجایا جاتا ہے اور سب لوگ سیدھے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ پھر ہر شخص باری باری ڈاکٹر سن یٹ سین کی ایک بڑی تصویر سے پردہ ہٹا کر تین بار سرِ تسلیم خم کرتا ہے۔ یہ رسم باقاعدگی کے ساتھ انجام کو پہنچائی جاتی ہے۔ پھر مارشل چیانگ ڈاکٹر سین کا عہد نامہ بہ آواز بلند پڑھتا ہے اور ہر فقرے کے بعد وقفہ دیا جاتا ہے تاکہ حاضرین اُسے دہراتے جائیں۔ یہ تمام رسم پُوجا پاٹ کی طرح ہوتی ہے۔

اس کے بعد تین منٹ تک مارشل اور دوسرے حاضرین خاموش رہتے ہیں۔ اور پھر چیانگ ایک آدھ گھنٹہ تک لکچر دیتا ہے اس لیکچر میں وہ فوجی معاملات پر خیال آرائی اور رائے زنی کرتا ہے۔ اُن کو پہلے سے زیادہ مستعدی کے لئے اُکساتا ہے۔ نکموں کو زبانی سرزنش کرتا ہے۔ حکومت کے بُرے پہلوؤں کی طرف دھیان دلاتا ہے۔ اس لکچر کے دوران میں حکومت کا ہر چھوٹا بڑا اہم افسر وہاں موجود ہوتا ہے اور تمام لوگ کھڑے رہتے ہیں۔ لکچر ہو چکنے پر مارشل "شکریہ" یا "الوداع" کی قسم سے کچھ نہیں کہتا بلکہ صرف اِتنا پکارتا ہے "ختم ہُوا۔"

تیس سال کی انقلابی کیفیات اور خانہ جنگیوں کے بعد چیانگ کائی شیک اتحادِ چین کا ایک استعارہ بن گیا ہے۔ جاپان کے خلاف چین کی مدافعت کا ایک مجسّمہ۔ جاپانیوں کو اس بات کا پورا احساس ہے۔ بلکہ انہوں نے اعلان بھی کر رکھا ہے کہ گرفتاری پر وہ اس کا سر تن سے جدا کر دیں گے۔

تیسری صدی قبل مسیح سے اب تک چیانگ کی ایسی انفرادی قوّت والا کوئی شخص چین میں پیدا نہیں ہُوا۔ اسی صدی میں دیوارِ چین بھی بنائی گئی تھی۔ اُس کے دوستوں کا بیان ہے کہ آج کل چیانگ کو وہ جس قدر مطمئن اور اعتماد سے لبریز دیکھتے ہیں۔ اس سے پہلے انہوں نے کبھی نہ دیکھا تھا۔ اور اس اطمینان اور اعتماد کی وجہ معلوم کرنا کچھ مشکل نہیں۔ وہ ایک ایسی دیوارِ چین تیار کر رہا ہے جو جاپانیوں کو ہمیشہ کے لئے چین سے دُور رکھنے کا ذریعہ ثابت ہو گی۔ اس مدافعت کی دیوار سے چین کی قومی زندگی کی نشو و نما مکمل ہو جائے گی اور چین کی سرزمین صرف چینیوں ہی کے لئے وقف رہے گی۔ اب چیانگ ایک غیر ملکی حملہ آور سے لڑ رہا ہے کسی خانہ جنگی میں حصہ نہیں لے رہا۔ اسی لئے اسے اطمینان ہے۔ اسی لئے اُسے اپنے پہلے سے زیادہ اعتماد ہے!

بسنت سہائے

شعر

میرے رونے کا جس میں قصّہ ہے
عمر کا بہترین حصّہ ہے

جوشؔ

نوادرِ ادبی

ذیل کے چار قطعات ہیں ایک قلمی نسخے سے ملے ہیں جو نواب ضیاء الدین احمد خاں کے چھوٹے صاحبزادے میرزا سعید الدین خاں عرف احمد سعید طالب دہلوی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے

ان قطعات کے لئے ہم جناب مالک رام صاحب ایم۔ اے کے ممنون ہیں۔

قطعات کے متعلق کسی تمہید یا تعارف کی ضرورت نہیں کیونکہ وہ آپ اپنی شرح کر رہے ہیں۔

ادارہ

از جانب مرزا غالب بنام نواب علاؤالدین احمد خاں صاحب رئیس لوہارو

خوشی تو ہے آنے کی برسات کے ۔۔۔ پئیں بادۂ ناب اور آم کھائیں
سر آغازِ موسم میں اندھے ہیں ہم ۔۔۔ کہ دلّی کو چھوڑیں لوہارو کو جائیں
سوا ناج کے جو ہے مقلوبِ جاں ۔۔۔ نہ واں آم پائیں نہ انگور پائیں
ہوا حکم باورچیوں کو کہ ہاں ۔۔۔ ابھی جا کے پوچھو کہ کل کیا پکائیں
وہ کھٹے کہاں پائیں املی کے پھول ۔۔۔ وہ کڑوے کریلے کہاں سے منگائیں
فقط گوشت سو بھیڑ کا ریشہ دار ۔۔۔ کہو اس کو کیا کھا کے ہم حظ اٹھائیں

خوانی بہ سوئے خویش و ندانی کہ مُردہ ام ۔۔۔ دانی کہ مردہ را رہ و رسم خرام نیست
نے شیخ سعدوام نہ الٰہ بخش، مرگِ من ۔۔۔ از عالم جنابت و مرگِ حرام نیست

جوابِ نواب علاؤالدین احمد خاں صاحب بہ مرزا غالب

خوشی ہے ہمیں آنے کی آپ کے — کہ باہم پئیں پان اور آم کھائیں
سرِ آغاز موسم میں کیا خوب ہو — کہ دِلّی سے حضرت لوہارو کو آئیں
عجب لطف ہے یاں کی برسات میں — کہ کیچڑ کہیں نام کو بھی نہ پائیں
سرولی کے وہ ڈاک پر سبز آم — وہ دلّی کے انگور ہر شام آئیں
کریں حکم باورچیوں کو کہ ہاں — ابھی جا کے ہر چیز جلدی پکائیں
وہ لیں باغ سے جا کے املی کے پھول — وہ جنگل سے کڑوے کریلے منگائیں
وہ بے ریشہ بکری کا لحمِ طری — کہ کیا کیا اسے کھا کے ہم حظ اٹھائیں
کہیں اُن کو بے مہر و کاہل، اگر — لوہارو جو اس بات پر بھی نہ آئیں

خوانمت سوئے خویش و گرچند مُردهٔ — دانم کہ بہر چوں توئی منعِ خرام نیست
پندارمش چو حسنِ تجلیٔ لال بیگ — مرگش چو شیخ سدّو ز راهِ حرام نیست

جنگِ عظیم کا آغاز

ایک زندۂ جاوید داستان کے چند ناخواندہ ورق

۲۸ جون ۱۹۱۴ء کی صبح کو گیارہ بجے بوسینیا کے ایک چھوٹے سے گمنام قصبے سراجیوو کی خاموش فضا پستول کے تین فائروں کی آواز سے گونج اٹھی۔ ایک سلاوی طالب علم گاوریلو پرنسپ نے فرانسس جوزف شہنشاہ آسٹریا کے ولیعہد اور آسٹریا ہنگری کی سطوت شاہانہ کے نمائندے آرچ ڈیوک فرانسس فرڈیننڈ اور اس کی بیوی کو پستول کا نشانہ بنا دیا تھا اور اس قتل سے اس کا مقصد اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ سلاوی جمہور کو دبانے والے ایک جابر حکمران کا خاتمہ کر دیا جائے۔

جب اس شاہی قاتل نے جو بظاہر اس دنیا میں تقدیر کا آلہ بن کر آیا تھا اپنے پستول کی لبلبی دبائی ہوگی تو وہ اپنی بے پروایانہ سادگی میں یہی سمجھتا ہوگا کہ وہ دو "عالی جاہ" ہستیوں کو فنا کر رہا ہے۔ اُسے کیا معلوم تھا کہ وہ درحقیقت ایک کروڑ انسانی جانوں کو موت کے گھاٹ اتار رہا ہے۔

یہ کہنا بے فائدہ ہے کہ سراجیوو کے سانحۂ قتل کے بغیر بھی جنگ کا ہونا اور دنیا کا قتل و غارت کے اس طوفان میں غرق ہو جانا لازمی تھا جب تک زندگی باقی ہے تب تک امید بھی قائم ہے اور کون کہہ سکتا ہے کہ جنگِ عظیم اُس نوجوان انقلاب پسند کے پستول کی نالی سے وجود میں نہیں آئی۔

یوگوسلافیہ کے پسماندہ ملک سے مجھے ایک خاص اُنس ہے اور گذشتہ سال میں کئی ماہ تک اس کے مختلف حصوں میں سفر کرتا رہا، کہ اس کے باشندوں اور مناظر سے زیادہ آشنائی پیدا کر سکوں۔ ایک روز جب کہ دن نہایت خاموش اور شام بے حد حسین تھی، میں جھٹپٹا ہوتے ایک چھوٹے سے گاؤں میں پہنچا۔ میں پہاڑیوں کا ایک لمبا سلسلہ جو میلوں تک پھیلا ہوا تھا، قطع کر کے اور گھنے کوہستانی جنگلوں میں سے نکل کر اُس ہموار میدان میں داخل ہوا تھا جو سراجیوو تک پھیلا ہوا ہے۔ سراجیوو، جو یورپ کا مکہ ہے اور جہاں تمام یورپ کے مسلمان زیارت کے لئے جاتے ہیں۔

میں نے اس گاؤں کا نام معلوم کرنے کی کوئی کوشش نہ کی۔ نقشے میں یہ صرف ایک سبز نقطہ تھا جو ایک نیلی لکیر کے کنارے واقع تھا۔ نیلی لکیر وہ چھوٹی سی ندی تھی جس کے کنارے پر میں اب کھڑا تھا اور جو میرے دائیں طرف ایک آبشار بنا کر گرتی اور گاؤں کی پن چکی کو چلاتی ہوئی گنگناتی چلی جاتی تھی۔ ڈھوروں کے گلے چراگاہوں سے واپس آرہے تھے اور کسانوں کے گھروں سے جہاں وہ شام کا کھانا پکانے اور کھانے میں مصروف تھے۔ نیلے نیلے دھوئیں کے ہلکے ہلکے مرغولے اٹھ رہے تھے۔ میں اپنی موٹر کو درست کرنے میں مصروف تھا اور تھوڑی دیر سے ایک جوان آدمی مجھے اجنبی سمجھ کر میری طرف غور سے دیکھ رہا تھا۔ آخر وہ گلی کو عبور کر کے میرے پاس آکھڑا ہوا اور بولا "آپ آج رات یہیں کیوں نہیں ٹھہر جاتے۔ شام ہو گئی ہے اور چراغ جلنے سے پہلے آپ سراجیوو نہیں پہنچ سکتے اور ..... (یہاں وہ مسکرا دیا) میرا گھر آپ ہی کا منتظر ہے۔"

"آپ کی بے حد نوازش"۔

اور دوسری صبح جب میں ایک چھوٹے سے کمرے میں بیدار ہوا تو دیوار پر لگے ہوئے چوکھٹوں میں سے چند عمر رسیدہ لوگ میری طرف

مسکرا مسکرا کر دیکھ رہے تھے اور میرا میزبان دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا۔

تھوڑی سی گفتگو کے بعد میں نے سرسری طور پر اُس سے دریافت کیا کہ اس گاؤں کا کیا نام ہے۔

"ماجیش۔ اور میرا نام ہے میلان شکوتا۔ لیکن یہ نسبتاً کم اہمیت رکھتا ہے۔ اگرچہ شاید آپ یہ معلوم کرنا چاہیں کہ گذشتہ رات آپ نے کس کے کمرے میں بسر کی۔ کئی سال گذرے یہ کمرہ گاوریلو پرنسپ کے پاس تھا۔ آپ کو یہ نام یاد ہے؟ وہ اس گاؤں میں اپنے بھائیوں جو وآدر نکولس کے ساتھ رہتا تھا۔" اور پھر جب میں اس اچانک اور حیرت انگیز خبر سے مبہوت ہو کر بے حس و حرکت بیٹھا رہا تو اُس نے میرے جواب کا انتظار کئے بغیر آہستہ سے کہا "وہ میرا بہترین دوست تھا۔ ہاں! اس بات کو اب بہت عرصہ گذرا۔ ہم نے تب سے یہ کمرہ استعمال نہیں کیا۔"

میں اب اپنی حیرانی پر غالب آ چکا تھا "تو آپ بھی دہشت پسندوں کے گروہ سے تعلق رکھتے تھے؟"

"نہیں۔ میں اُن میں سے تو نہیں تھا لیکن اُس واقعہ کی لپیٹ میں ضرور آ گیا تھا۔ کیونکہ گاوریلو اُن دنوں اسی کمرے میں مقیم تھا۔"

میلان شکوتا نے سماوار سے ترکی قہوہ کی پیالیاں بھرنی شروع کیں اور قہوے کے دور میں اُس نے مجھے وہ کہانی سنائی جو اُس دن تک کسی کو نہیں سنائی گئی تھی اور جس نے لاکھوں انسانوں کی تقدیروں کو بنا اور بگاڑ دیا تھا۔

میلان شکوتا کی کہانی

میلان شکوتا ایک سادہ اور تنومند انسان ہے اور جس طرح وہ جسمانی طور پر ایک مستول کی طرح سیدھا اور مضبوط ہے۔ اسی طرح اخلاقی طور پر بھی اُس میں کوئی کجی اور کمزوری نہیں۔ اگر اُس نے اب تک اپنی زبان نہیں کھولی تھی تو اس لئے نہیں کہ وہ زبان بندی کے کسی سخت حکم کی پابندی کر رہا تھا بلکہ محض اس لئے کہ کسی نے اُس سے اب تک یہ بات پوچھی نہیں تھی۔ اُس نے قتل کی واردات میں خود کوئی نمایاں حصہ نہیں لیا تھا۔ اُسے گرفتار نہیں کیا گیا حالانکہ ۱۹۱۴ء میں اس سلسلے میں ہزاروں سربی پکڑے گئے تھے۔ اس کے بعد جس طرح قانون کے علم بردار اُسے نظرانداز کر گئے۔ اسی طرح وہ اخبار نویسوں کی نظروں سے بھی بچ گیا۔ میلان نے اپنے راز کو اپنے دل ہی میں آرام سے پڑا رہنے دیا۔ مگر مجھے یہ محسوس ہوا کہ اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر کے اُسے یک گونہ مسرت ہوئی ہے۔ میں نے بعد میں اُس کی بتائی ہوئی تمام باتوں کو اچھی طرح پرکھا۔ کیونکہ حدیثِ راہ کی نسبت مسافر کو ذرا زیادہ احتیاط سے کام لینا پڑتا ہے۔ معلوم شدہ حقائق سے اس کی کہانی کی جزئیات کی پوری مطابقت کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ تاریخ کے محتاط سے محتاط طالب علم کو بھی شکوتا کے اقرار کو بلا تامل اپنی تحقیقاتی بیاض میں شامل کر لینا چاہئے۔ اُس نے بیان کیا:- "میں گاوریلو کو بچپن سے جانتا تھا۔ ہم پرائمری سکول میں ہم جماعت تھے اور میں اپنے دل میں اس کے لئے ہمیشہ محبت اور عزت کے جذبات پاتا تھا۔ ابتدائی مدرسے سے نکل کر مجھے دنیا کے دھندوں میں پھنس جانا پڑا۔ لیکن وہ پڑھتا رہا۔ جب وہ سراجیوو کے ہائی سکول سے گاؤں واپس آتا تو راستے میں ریلوے کے کارخانے سے مجھے بھی اپنے ساتھ لے لیتا جب کوئی شخص دن بھر کارخانے میں ہتھوڑا چلاتا اور زنبور سے زور آزمائی کرتا رہے تو شام کو وہ یقیناً ایک ایسے پڑھے لکھے اور شائستہ رفیق کی صحبت کو پسند کرے گا جو اُسے بھی محبت کی نگاہوں سے دیکھتا ہو۔

ایک شام اُس نے مجھ سے کہا۔ "میلان! میں کل سے مدرسے نہیں جاؤں گا۔"

"کیوں؟"

"پرنسپل مجھے ایک ایسی بات کے لئے سزا دینا چاہتا تھا جو مجھ سے سرزد نہیں ہوئی تھی۔ میں نے غصے میں آ کر اُس پر حملہ کر دیا جس کی پاداش میں مجھے سکول سے نکال دیا گیا ہے۔"

یہ سب کچھ ٹھیک تھا صاحب۔ گاوریلو بعض اوقات ایسی باتیں کیا کرتا جو ہمارے فہم سے بالاتر ہوتیں۔ لیکن وہ جھوٹ کبھی نہ بولتا۔ چند روز کے بعد وہ بلغراد چلا گیا اور پھر کچھ عرصہ کے لئے بالکل غائب ہو گیا۔ لیکن آخر ۱۹۱۳ء کی بہار میں وہ اپنے اسی گاؤں ماجیش کو لوٹ آیا۔ اُس روز انتخابات ہو رہے تھے اور حکومت کے کارکن ہمیں سرکار پرست امیدواروں کے حق میں ووٹ دینے کو کہہ رہے تھے۔ یکایک گاوریلو زور سے چیخا "یہ بے حد شرمناک ہے۔ دوستو! ان کی بات بالکل نہ سنو۔ اپنا ووٹ حقیقی سربیوں کو دو۔ شہنشاہ کے کمینے جاسوسوں کو مت دو۔" پولیس نے ہجوم پر ہلہ بول دیا اور گاوریلو کو راہِ فرار اختیار کرنی پڑی۔ پولیس والوں نے اُس کا پیچھا کیا مگر خوش قسمتی سے وہ بچ نکلا اور دوسرے دن واپس سربیا چلا گیا۔

اُس کی شورِیدہ سری تو عیاں تھی۔ اور اسی لئے وہ مجھے اس قدر چھا بھی لگتا تھا اگرچہ مجھ میں کبھی اس جیسا حوصلہ پیدا نہ ہُوا۔ مجھے معلوم ہیں تھا کہ وہ کسی انقلاب پسند جماعت میں شامل ہو گیا ہے یقیناً مجھے س کی خبر نہ تھی۔ ایسی باتوں سے میں ذرا دُور دُور ہی رہتا ہوں۔ میں وئی ہیرو تو ہوں نہیں۔ اور اگر مجھے گاوریلو کی ان کارروائیوں کا پتہ چل جاتا تو شاید میں ایسی گرم جوشی سے اس وقت اس کا استقبال نہ کرتا جب وہ اپنا سوٹ کیس لئے میرے ہاں آیا اور پھر غالب یہ سب کچھ پیش نہ آتا جو اُس کے بعد پیش آیا۔ کیونکہ جنگِ عظیم کا آغاز اُسی سوٹ کیس ں پوشیدہ تھا جو وہ ایک شام میرے ہاں امانتاً رکھ گیا تھا۔

۱۹۱۳ء میں ایک روز تین نوجوان بلغراد سے پیادہ پا روانہ ہوئے نہوں نے اپنے کندھوں پر ایک چھوٹا سا سیاہ بکس جیسے کسی بچے کا ابوت ہو، اُٹھا رکھا تھا۔ مگر اُس میں کسی بچے کی نعش نہیں تھی۔ ان تینوں کے نام تاؤش گرابش اور گاوریلو تھے۔ اور برنہ سنج کے قصبہ تک وہ دریائے ساوا کے کنارے کنارے چلتے رہے اور سپاہیوں اور جاسوسوں کے عیبوں سے بچتے ہوئے انہوں نے دریائے درینا کو ایک کشتی کے ذریعے عبور کیا اور سرحد پار ہو گئے۔ جب وہ آسٹریا میں داخل ہوئے تو نہوں نے بکس کو ایک کسان کے چھکڑے پر لاد دیا اور اُسے بھوسے سے بالکل ڈھک دیا۔ یہ بات بہت کارآمد ثابت ہوئی۔ کیونکہ تھوڑی ہی مسافت طے کرنے کے بعد اُنہیں ایک پولیس والے نے ٹوکا اور اُن سے بہت سے سوالات کئے۔ مگر وہ بدمستی کا بہانہ کرکے جھومتے اور گاتے رہے اور اس طرح اُس سے خلاصی حاصل کی۔ آخر بکس تلزا کے قصبے میں پہنچ گیا جہاں وہ مشکو کی تحویل میں دے دیا گیا۔ مشکو اسے تلزا سے لے کر دوبوئی پہنچا اور دوبوئی سے دنیلو نے اسے سراجیوو پہنچایا۔

گاوریلو ۳ جون کو سراجیوو کے ریلوے اسٹیشن پر اُترا۔ میں اس کے لئے پلیٹ فارم پر منتظر تھا اور میرا دل مسرت سے رقص کر رہا تھا۔ میں نے اُس سے کہا۔ "گاوریلو تمہاری بھابی کے ہاں ابھی ابھی لڑکا پیدا ہُوا ہے بھلا سوچو تو انہوں نے اس کا کیا نام رکھا ہوگا؟"

"مجھے کیا خبر؟"

"شلوبدا۔ (آزادی) کیسا نیک شگون ہے؟"

"شلوبدا! شلوبدا! شاید ہمیں سچ مچ کی آزادی بھی اب ملنے ہی والی ہے۔"

میں نے اس کے الفاظ کی طرف چنداں توجہ نہ دی۔ سوٹ کیس اب دنیلو کے ہاں نہیں رکھا جا سکتا تھا کیونکہ پولیس تمام مشکوک لوگوں کی خانہ تلاشی لے رہی تھی۔ جلد جلد مشورے کئے گئے۔ گاوریلو کہنے لگا۔ ہُوا، تڑپ کر بولا۔ "اسے میرے حوالے کیجئے۔ میرا ایک عزیز ترین دوست ہے جس پر کوئی شک نہیں کر سکتا۔ میں یہ متاعِ عزیز اُس کے ہاں لے جاؤں گا۔"

اور یہی وجہ تھی کہ جون کے پہلے ہفتے میں ایک شام میرا عزیز دوست میرا دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا اور اُس کے کاندھے سے ایک وزنی سیاہ بکس لٹک رہا تھا۔

"شام بخیر! حضرت! یہ بکس آپ کے ہاں رہے گا اور شاید یہ اتنا بڑا نہیں ہے کہ اس کے باعث آپ مکان میں نہ رہیں۔" "بہت اچھا بھائی جان! مگر اس میں ہے کیا؟" "فقط کتابیں" اور پھر باورچی خانے میں آکر اُس نے بکس کو ایک بنچ کے نیچے دھکیل دیا۔

دن گذرتے چلے گئے اور مجھے کسی قسم کا گمان تک نہ ہُوا۔ ۲۷ جون کو گاوریلو ہمارے ہاں آیا اور آتے ہی اُس نے میری بیوی سے باورچی خانے کی چابی طلب کی اور جب وہ اپنی پیٹھ پھیر چکی تو اُس نے بکس سے کچھ نکالا اور کچھ کہے سُنے بغیر واپس چلا گیا۔ جب شام کو میں گھر آیا تو میری بیوی بڑبڑا رہی تھی کہ میرا دوست باورچی خانے کی چابی بھی اپنے ساتھ لے گیا ہے "میں کمبخت کھانا تک نہیں تیار کر سکی۔ وہ تمہارے دوست صاحب باورچی خانہ قبضے میں کر کے چل دیئے ہیں۔"

میں نے ابھی معاملہ پر غور کرنا شروع ہی کیا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ "اوہو۔ گاوریلو تم ہو! بھائی یہ باورچی خانہ کیوں بند کر گئے تھے؟" وہ مسکرا دیا اور مجھے ہاتھ سے پکڑ کر ایک طرف لے گیا۔ "خفا کیوں ہوتے ہو میلان۔ آؤ تمہیں کچھ دکھائیں۔" یہ کہہ کر اُس نے بکس کا ڈھکنا اُٹھایا اور میری حیرت زدہ آنکھوں نے دیکھا کہ اس میں پانچ سات خوفناک بم۔ زہر کی چند شیشیاں اور ایک چھوٹا سا پستول پڑا تھا۔ "میرے پاس ایسی اور چیزیں بھی تھیں۔ مگر اب سب رفیقوں میں بٹ گئیں۔" اُس نے پستول اُٹھا لیا اور اُسے کارتوسوں سے بھر کر جیب میں ڈال لیا۔ "ارے اسے کیا کرو گے گاوریلو۔" اُس نے میرے کندھے پر آہستہ سے تھپکی دی اور اپنا مُنہ میرے کان کے پاس لا کر کہنے لگا "کل اس پستول سے میں آرچ ڈیوک کی زندگی کا خاتمہ کر دوں گا۔ فرڈیننڈ ہم سلاویوں کا سب سے بڑا دشمن

ہے اور جس وقت تک ہیپسبرگ کا خاندان ہم پر مسلّط ہے ہم کبھی آزاد نہیں ہو سکیں گے۔ پس میں اس ملعون خاندان کے ایک رکن، ایک بہت بڑے رکن کا خاتمہ کرنے والا ہوں اور یہ ایک اچھا آغاز ہوگا۔" اور اُس نے ایک بم اُٹھا کر میری طرف بڑھایا۔ "دیکھو۔ موت کتنی آسان ہے۔ اس پن کو کھینچا اور یوں پھینک دیا۔ بس!" "لیکن۔ گراوریلو۔۔۔۔" اُس نے ہنستے ہوئے اپنا اٹھا ہوا ہاتھ نیچا کر لیا اور میری جان میں جان آگئی اور پھر وہ مسکراتا ہوا شب بخیر کہہ کر وہاں سے چل دیا۔ اس شب اُس کی رفتار میں آہوئے صحرا کی سی سبک خرامی تھی اور اس کا چہرہ کسی نامعلوم مسرت سے دمک رہا تھا۔

میں اس سلسلے میں اپنی بیوی سے کسی قسم کا ذکر کرتے ہوئے ڈرتا تھا کہ مبادا وہ اپنے ہوش و حواس کھو کر کوئی سخت بے وقوفی کر بیٹھے۔ میں کسی طرح اپنے دوستوں سے بے وفائی نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن میں سراجیوو میں رہ کر گرفتار ہونے۔ ایذائیں اُٹھانے اور آخر میں پھانسی پانے کے جوکھوں میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔ اس لئے جب دوسری صبح میں اپنا کھانا رومال میں باندھ کر گھر سے نکلا تو ریل کے کارخانے کی بجائے میں نے ریل کے اسٹیشن کا رُخ کر لیا: تاکہ پہلی ٹرین میں سوار ہو کر سربیا چلا جاؤں۔ راستے میں مجھے گاوریلو ملا۔ وہ سرتاپا ایک تبسّم رقصاں تھا۔ "صبح بخیر۔ میلان! کام پہ جا رہے ہو؟" "نہیں سربیا کو۔ بیوی سے تو ذکر نہیں کیا؟" "دیوانے ہوئے ہو!" اور اتنے میں اسٹیشن جانے والی بس آگئی اور میں لپک کر اس پہ سوار ہو گیا۔ گاوریلو اب نگاہوں سے اوجھل لیکن دماغ پہ مسلّط تھا۔ راستے میں دیکھا۔ بازار چوتھی کی دلہن کی طرح سجائے گئے تھے۔ ولیعہدِ سلطنت کی آمد آمد تھی اور میرے یا مین چار اُن اشخاص کے سوا جو اپنی جیبوں میں بم بھرے اِدھر اُدھر ٹہل رہے تھے۔ کسے خبر تھی کہ اُسے یہیں کسی بازار کے موڑ پر آج موت سے ملاقات کا وعدہ پورا کرنا ہے!

ساڑھے گیارہ بجے میری گاڑی بیجچے کے اسٹیشن پر رُکی۔ اسٹیشن کی چھت سے ایک بہت بڑا سیاہ جھنڈا لٹک رہا تھا اور چاروں طرف پولیس اور فوج کے سپاہی پھر رہے تھے۔ "کیا ہوا کیا ہوا؟" "آرچ ڈیوک اور ڈچس کو قتل کر دیا گیا ہے۔" میں نے اپنے چہرے پر ایک نہایت غمگین کیفیت طاری کر لی۔ سرحد کے اسٹیشن ولیش گراڈ پر ہم سب کو روک کر ہمارے اسباب کی تلاشی لی گئی۔ مگر چونکہ میرے کاغذات بالکل ٹھیک تھے۔ اس لئے مجھ سے کچھ تعرّض نہیں کیا گیا۔

شاہی پولیس کو خفیہ خبر مل چکی تھی کہ سراجیوو میں آرچ ڈیوک کی جان لینے کی سازش کی جا رہی ہے۔ لیکن ان اطلاعات کو بے بنیاد سمجھ کر طاقِ نسیان پر رکھ دیا گیا تھا۔

انقلاب پسند ناؤش ریلوے سٹیشن اور ٹاؤن ہال کے درمیان جلوس کا منتظر تھا۔ اس نے شاہی گاڑی میں بم پھینکا۔ لیکن وہ پھٹا نہیں اور آرچ ڈیوک نے نہایت سکون سے جھک کر اُسے اٹھا لیا۔ اور بازار میں پھینک دیا۔ جیسے یہ بھی اُن پھولوں میں سے ایک پھول تھا۔ جو اُس پر پھینکے گئے تھے۔ بم سڑک پر گر کے پھٹا اور چند تماشائی زخمی ہوئے لیکن جلوس کسی قسم کی رکاوٹ کے بغیر جاری رہا۔ ٹاؤن ہال میں رئیسِ شہر نے شہزادہ ولیعہد اور شہزادی کی خدمت میں خیر مقدم کا ایڈریس پیش کیا۔ مگر فرانسس فرڈیننڈ نے اس کا جواب نہایت غضب ناک لہجہ میں دیا۔ "میں آپ کا اُس نازک احساس کے لئے شکریہ ادا کرتا ہوں جس کا اظہار آپ نے میرے خیر مقدم بذریعہ بم سے کیا ہے"!

گاوریلو فرینز جوزف سٹریٹ کے کونے پر دریائے ملی آشکے کے بند کے نیچے چھپا کھڑا تھا۔ ولیعہد کے شوفر کو ہدایت کی گئی تھی کہ وہ ٹاؤن ہال سے سیدھا محل کو چلا جائے۔ اور دیگر سرکاری گاڑیوں کے ساتھ جو فرینز جوزف سٹریٹ کے راستے سے جلوس کی شکل میں واپس جا رہی تھیں ہرگز نہ جائے۔ اگر وہ ان ہدایات پر عمل کرتا تو آرچ ڈیوک کی جان بچ جاتی اور ایسی صورت میں جیسا کہ آپ کا خیال ہے ۱۹۱۴ء کی جنگِ عظیم برپا نہ ہوتی۔ لیکن اُس نازک ساعت میں شوفر اپنی ہدایت کو بھول گیا اور اس نے اپنی گاڑی جلوس کی پیشرو گاڑی کے پیچھے لگا لی۔ اور پھر اُس خونی کونے پر سے اِس طرح مڑا کہ گاڑی اُس پتھر سے جا ٹکرائی جس پر گاوریلو کھڑا تھا۔ اب ایک ہی جست میں گاوریلو موٹر کے پائدان پر تھا۔ اُس نے اپنے ریوالور سے آرچ ڈیوک کے سینے کا نشانہ باندھا۔ لیکن ڈچس اپنے شوہر کی حفاظت کے لئے آگے کو جھک گئی۔ ایک خوفناک دھماکہ ہوا اور ڈچس اوندھے منہ گر پڑی۔ گاوریلو نے دوسرا فائر کیا۔ آرچ ڈیوک بھی گاڑی کے فرش پر گرا۔ اور کھیل ختم ہو گیا۔

اور اب وہ گاوریلو اور اس کے ساتھیوں اور تمام سربی انقلاب پسندوں کو گرفتار کر کے پھانسی پر چڑھاتے یا آگ پر بھونتے۔ تقدیر کا لکھا پورا ہو چکا تھا اور ۱۹۱۴ء کی جنگِ عظیم کا بپا ہونا ایسا ہی ضروری تھا جیسا اُس دن کے سورج کا غروب ہونا۔ نوشتہ تقدیر مٹ نہیں سکتا۔

میلان شکوتا ورجون کو اپنی منتظر اور مضطرب بیوی کے پاس واپس آ گیا۔ وہ کسی قسم کا شک پیدا کئے بغیر اپنے گھر پہنچ گیا تھا اور یہاں آکر اُس نے پہلا کام یہ کیا کہ باورچی خانے میں جا کر وہ صندوق جس میں یورپ کا امن دفن ہو چکا تھا آگ کی نذر کر دیا۔

اور یہاں میلان شکوتا کی کہانی جو اُس نے اُسی سادہ انداز میں سنائی تھی جیسی سادہ اس کی طبیعت تھی ختم ہوئی۔

میں نے ایک لمبا سانس لیا اور پوچھا تو کیا گاوریلو پرنسپ کے کنبے کے لوگوں میں سے کوئی زندہ بھی ہے؟ "ہاں اُس کے دونوں بھائی اور اُس کی ماں۔ وہ آج کل یہیں جاحیش میں اپنے بڑے بیٹے جُود کے ہاں مقیم ہے۔ جُود آج کل ہماری پارلیمینٹ کا رکن ہے"

اور پھر ہم اسی صبح جُود پرنسپ کے مکان پہ گاوریلو پرنسپ کے عزیزوں سے ملنے کے لئے گئے۔

جب ہم گھر میں داخل ہوئے تو دیہاتی کمرے میں پرنسپ بھائیوں کی ماں اپنے چھوٹے لڑکے ڈاکٹر نکولس پرنسپ کے ساتھ بیٹھی تھی۔ وہ بڑے بھائی جُود کا جو خاندان کا سربراہ تھا انتظار کر رہے تھے۔

مانکا پرنسپ، کہ یہ گاوریلو کی ماں کا نام ہے، ایک بوڑھی عورت ہے جس کے پروقار چہرے پر عمر اور صدمات نے بہت سے نشانات ثبت کر دئیے ہیں۔ لیکن اُس کی آنکھوں کی گہرائی اور روشنی حیرت انگیز ہے۔ کہتے ہیں کہ گاوریلو کی آنکھوں میں بھی ایک ایسی دلکشی تھی۔ جو اپنی شدت سے مدِمقابل کو مسحور کر دیتی تھی۔ بڑھیا کا چہرہ اس صحت مند کیفیت کا آئینہ دار ہے جو دیہات کی زندگی ہی پیدا کر سکتی ہے۔ وہ ایک سفید لبادے میں ملبوس تھی جب میں قہوے کی تین چار پیالیاں ختم کر چکا تو میں نے اُس سے التجا کی کہ وہ مجھے گاوریلو کی کچھ باتیں سنائے۔

"گاوریلو! میرا گاوریلو" اور یہ نام لیتے لیتے اس کے چہرے پر اس نوجوان ماں کے چہرے کی کیفیت طاری ہو گئی جو اپنے ننھے کی باتیں کر رہی ہو۔ "ہاں وہ اس سانحے کے وقت صرف اُنیس برس کا تھا۔ وہ ایک بہت اچھا لڑکا تھا۔ بیک وقت بے حد نرم اور بے حد گرم" یہ کہہ کر اُس نے اپنی آنکھیں کمرے کے ایک تاریک گوشے کی طرف اُٹھائیں اور میں نے دیکھا کہ وہاں ایک بڑے فریم میں گاوریلو کی تصویر آویزاں تھی۔ وہ بیٹھا ہوا تھا اور اُس کے ہاتھ میں ایک کتاب تھی۔ اُس کے نقوش میں کچی عمر کی تخیل پرستی صاف جھلک رہی تھی۔ اگرچہ اُن سے کسی خاص شخصیّت کے آثار ناپید تھے۔ مجھے اس کا چہرہ اُس ہیرو کے لئے بعید موزوں معلوم ہوا جو محض ایک عمل۔ ایک عظیم الشان خیال کی تکمیل کے لئے عوام کے گروہ سے نکلتا ہے اور اپنے پُراسرار فرض کی انجام دہی کے بعد فوراً تاریکی میں چلا جاتا ہے۔ لیکن کیا میں ٹھیک سمجھ رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں سے تو کسی طرح کی بے رحمی عیاں نہ تھی۔ بلکہ ان میں ایک عجیب ملائمت تھی اور ایک ایسا الم جھلک رہا تھا جو شاید اُس کی جوان مرگی کی غمّازی کر رہا تھا۔

ہم قاتلوں کی نسبت عجیب عجیب تاثرات رکھتے ہیں لیکن شاید یہ ہم نے کبھی نہیں سوچا کہ کوئی قاتل نرم دل۔ نیک اور تخیل پرست بھی ہو سکتا ہے۔ ہمیں یہ بات بھولنی نہیں چاہئے کہ ایک خاص قسم کے بے رحم دھیمے پن اور ملائمت سے ایک ایسا یقین پیدا ہو جاتا ہے جو روح کے گرد اسی طرح لپٹ جاتا ہے جیسے ایک نرم ہاتھ ایک سیب کے گرد، اور اس یقین سے دنیا کے شدید ترین عمل کی پیدائش ممکن ہے

"گاوریلو!" مانکا پرنسپ نے پھر کہا "تم مجھ سے اُس کی نسبت کیا سننا چاہتے ہو۔ ایک عرصے سے وہ میرا اور صرف میرا نہیں رہا تھا۔ اب تو بے شمار لوگ اُس کے دعوے دار ہیں اور بہت سے تو اُسے اس طرح اٹھائے پھرتے ہیں جیسے ایک قومی نشان کو۔ اس کی زندگی ہی میں کتابوں اور رفیقوں نے اُسے مجھ سے چھین لیا تھا۔ پھر قید خانے نے اور اب قوم نے اُسے لے لیا ہے۔ اے کاش اس کی روح کو آرام اور چین نصیب ہو"۔ اور اس نے اپنے ہاتھ ایک دیہاتی عورت کی طرح اپنے پیٹ پر رکھ لئے۔ وہ ہاتھ جن کی رگیں اب رسیوں کی طرح اُبھر رہی تھیں اور پھر یکایک مجھے خیال آیا کہ اگر یہ ہاتھ ننھے گاوریلو کو اس کے پالنے میں نہ تھپکتے اگر یہ عورت اپنے پیٹ میں وہ بچہ نہ لئے پھرتی جو بعد میں گاوریلو پرنسپ بنا اور اگر وہ اپنے پہلے دو لڑکے جن کر بانجھ ہو جاتی تو شاید جنگِ عظیم کے قبرستانوں میں ایک کروڑ قبروں پر چوبی صلیبیں نہ گاڑی جاتیں۔

میں جانتا ہوں کہ یہ سب "اگر" بے معنی ہیں اور مانکا پرنسپ بھی ان پر اُس وقت سے پہلے بہت غور کر چکی ہو گی۔ جب اُس نے مجھ سے کہا "لیکن یہ میرا قصور نہیں تھا"۔ یہ فقرہ اس چھوٹی سی میز پر جو میرے اور اُس کے چھوٹے لڑکے ڈاکٹر پرنسپ اور شکوتا کے درمیان تھی ایک پتھر کی طرح پڑا۔ "اور ہاں ڈاکٹر پرنسپ" میں نے کہا "آپ اپنے بھائی کی

نسبت مجھے کچھ نہیں بتائیں گے"۔

"نہیں، میں کچھ نہیں بتا سکتا۔ مجھے بتانے کا کوئی حق نہیں میرا بھائی جو تو یہاں نہیں ہے اور یہ حق صرف اُسی کو پہنچتا ہے"۔

"میں اُن سے کب مل سکتا ہوں؟"

"میں بھی اُن کا انتظار کر رہا ہوں اور نہیں جانتا کہ وہ کب آئیں گے"۔

"کیا اُن سے کسی اور مقام پر ملاقات کی جا سکتی ہے؟"

"نہیں۔ وہ ہمیشہ سفر میں رہتے ہیں"۔

میں اُٹھ کھڑا ہوا اور اُن سے رخصت چاہی۔ مائکا پرنسپ ابھی تک اپنے ہاتھ گود میں رکھے کھوئی کھوئی سی نگاہوں سے اپنے سامنے کی طرف دیکھ رہی تھی۔

میں گادریلو کے گھر والوں سے مل چکا تھا اور شکوتا سے بھی جو دنیا کے عظیم ترین المیہ کے پس منظر سے زندہ انسانوں میں سب سے بڑھ کر آشنا تھا، اچھی طرح باتیں کر چکا تھا۔ شکوتا گادریلو کا گہرا دوست تھا اور اس نے سب کچھ جانتے ہوئے آج تک اپنی زبان نہیں کھولی تھی۔ میں نے اُن سات انقلاب پسندوں کی قبروں کی زیارت بھی کی جو قتل کی سازش میں گادریلو کے شریک تھے اور میں نے عین اُس موقعہ پر زندگی کی بے پروا آمد و رفت بھی دیکھی جہاں فرانسس فرڈی نینڈ گرا تھا اور اپنے ساتھ سارے یورپ کو لے گرا تھا۔

ان یادگاروں اور کہانیوں سے معمور تصورات کے ساتھ مجھے یوں محسوس ہوا کہ وقت کا پردہ پلٹ کر چوبیس سال پہلے کا منظر پیش کر رہا ہے۔ جون ۱۹۱۴ء کی اس تاریخی صبح کو قسمت کا پانسہ تین مرتبہ امن کے خلاف اور جنگ کے حق میں پڑا اور پولیس اور سازشیوں کی تین مسلسل غلط فہمیاں اور غلطیاں آرچ ڈیوک کو گادریلو پرنسپ کے پستول کی زد میں لے آئیں۔ پانسہ نہ صرف امن بلکہ عالمِ انسانیت کے خلاف پڑا تھا اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک غیبی اور اٹل طاقت جو دنیا کی تمام وزارتوں اور سلطنتوں سے بالاتر تھی، ایک عظیم الشان طاقت جسے ہم خدا کہتے ہوئے ہچکچاتے اور محض "اتفاق" کہنے سے انکار کرتے ہیں، فرڈی نینڈ کی موت کی خواہش مند اور جنگ کی طالب تھی۔

میں میلان شکوتا۔ مائکا پرنسپ اور حاجیش سے رخصت ہوتا ہوں۔ حاجیش اس چھوٹے سے گاؤں سے جو ایک شاہراہ پر واقع ہے اور جس کی پتھریلی گلیوں میں کبھی گادریلو گھٹنیوں چلتا تھا اور اس نازک سی آبشار سے جس کا سرود گادریلو کے بچپن میں اُس کے اولین جذبات سے ہم آہنگ تھا اور جو ابد تک یوں ہی گنگنائے جائے گی۔

چارلس لطراش

مترجمہ — صلاح الدین احمد

رباعی

چھیڑا زلفوں وہ مست رات سے جھپک اٹھی
یوں کب تیرے مردہ کی نبض دھڑک اٹھی
جب سامنے آتا ہے ہوا اے جانِ نظر
پیہم تیرے تبسم سے مری روح مہک اٹھی

باقی صدیقی

حوصلہ

(خدا اور انسان)

تودۂ خاک تھی یکسر تری دنیائے حیات !
خونِ دل سے، اِسے گلزار بنایا میں نے
اپنے افکارِ جمالی سے بسایا میں نے
روشِ خُلد کا محرم نہ تھا صحرائے حیات
ذوقِ تزئین سے بیگانہ تھی لیلائے حیات
نکہت و رنگ کا انداز بتایا میں نے
نغمۂ وحُسن کا اعجاز سکھایا میں نے
رشکِ صد طور و ارم بن گیا سینائے حیات!

تیری دنیا تھی محبّت سے سراسر محرُوم!
میں نے یہ دردِ حسیں، آکے سکھایا اس کو
کیفِ صہبائے غمِ روح بتایا اس کو
ورنہ یہ خاک تھی لذّت سے سراسر محروم!
آخری پردہ بھی اک روز اُٹھا ہی دوں گا!
تیری صورت بھی زمانے کو دِکھا ہی دوں گا!

اختر شیرانی

غزل

کون سمجھتا رازِ محبت صرف مقابل آنے سے
بات کھُلی شرما کر منہ پر آنچل کو سرکانے سے

کیفِ محبت حاصل ہو تو مے نوشی کی حاجت کیا
جن کو تو نے دیکھ لیا وہ دُور رہے میخانے سے

کیسے وہ بے تاب ہوئے تھے آج تلک حیرانی ہے
افسردہ رخساروں پر دو اشکوں کے بہہ جانے سے

میرے بے خود کرنے کو دو جام چھلکتے رہتے ہیں
آنکھیں ہیں یا ملا ہُوا ہے پیمانہ پیمانے سے

بے تابانہ جوشِ جنوں میں شعلے پر سر دے مارا
شمع نے آخر خلوت میں کیا بات کہی پروانے سے

بیٹھا ہوں پھر راہ گذر پر ہائے بُرا ہو چاہت کا
قسمیں کھا کر توبہ کی تھی اُس کی گلی میں آنے سے

دونوں دل سرشارِ محبت وصل کی فکریں کون کرے
سب کچھ حاصل ہو جاتا ہے آنکھوں کے مل جانے سے

قصّۂ مجنوں سُن کر دل پر چوٹ لگی، کیا یاد آیا
یہ افسانہ ملتا ہے کچھ سیفی کے افسانے سے

سیفی نوگانوی

بڑیرے

(آباؤ اجداد)

سو برس سے زیادہ عرصہ گذرا جب کا ذکر ہے

حکومت پالی[1] کا پروانہ دربار میں گذرا کہ "دیوڑوں[2]" کا لشکر نتھو خاں کی سرکردگی میں گھس پڑا لوٹ مار کی اور خاصہ کے ایک ہزار اونٹ مع ہزار بارہ سو دیگر مویشی کے سروہی کی طرف ہانکے لئے جاتے ہیں۔ مقامی حکام روکنے سے قاصر ہیں۔ تدارک فرمائیں۔

دربار ہوا کھانے جاتے تھے سخت جیں بجبیں ہوئے غضب یہ نہیں کہ "دیوڑوں" کی اور یہ ہمت کہ پالی تک دھاوا۔ یہی نتھو خاں اس سے پیشتر پانچ دفعہ مار کر نکل گیا۔ بہت ہی ناگوار خاطر گذرا۔ بائیں کو نظر اٹھی بھور سنگھ میڑتیا[3] کھڑا تھا۔ کوئی تیس برس کی عمر۔ چھریرا فولادی بدن۔ طاقت اور ہمت میں شیر۔ پھرتی میں چھلاوہ۔ کانوں تک ڈاڑھی چڑھائے راٹھوری پیچ کی وہ بانکی پگڑی۔ ایسا جوان کہ دیکھا کیجئے۔ گندمی رنگ کھڑی ستواں ناک بڑی بڑی چکیلی آنکھیں۔

دربار نے فرمایا "بھور یا"

"جو حکم" کہہ کر ہاتھ جوڑ کر آگے بڑھا۔ جھک کر سیدھا کھڑا ہو گیا۔ حکم کا منتظر۔

دربار نے کہا "سنا تو نے ..... یہ دیوڑے اونٹ لے گئے ....."

بھور سنگھ نے کہا "اَن داتا حکم ہو تو ماروں"

دربار نے کہا "جا۔ جلدی جا اور دیکھ جس کا نگر[4] ہیں بالا مارے وہی گاؤں تیرا۔"

"کھماں گھڑ[5] ین" جھک کر ڈنڈوت کرتے ہوئے بھور سنگھ نے کہا کر کنہیا بھیجڑا مٹک کر آگے بڑھا اور بولا کہ اَن داتا اس بھڑوے کو مارنے میں بھی جاؤں گی ..... بھور یا کو اکیلے ڈر لگا تو؟

دربار کو ہنسی آئی اور فرمایا "بھور یا۔ دیکھ اسے بھی لے جا اور جھگڑے[6] میں آگے ڈال دیجیو۔ کہ پہلے ہیجڑوں پر دیوڑوں کی تلوار یں گرم نے نہ پائے۔"

"جو حکم باپ جی۔ چل کنہیا ..... چل"۔

دربار تو چل دئیے اور بھور سنگھ نے سچ مچ کنہیا کو پکڑ لیا کہ لے جاؤں گا۔ وہ مچلا جو بھی تو نکالی بھور سنگھ نے تلوار اور سر کاٹنے کی دھمکی دی۔ قصہ مختصر اسی شام کو کنہیا سمیت سو آدمی لے کر تیز رو اونٹوں اور گھوڑوں پر روانہ ہو گیا۔

(۲)

تیسرے دن بھور سنگھ نے دیوڑوں کو جا لیا۔

دیوڑوں نے دوپہر کو ایک باغ میں کھانا کھایا اور ذرا آرام کیا نتھو خاں نے دو تین میل پیچھے اپنے شتر سوار تعینات کر دئے تھے۔ ایک شتر سوار نے ہوا کی طرح پہنچ کر بھور سنگھ کے آنے کی بہت موقعہ سے خبر دی۔

چشم زدن میں سب کے سب تیار ہو کر بھور سنگھ کی آمد سے قبل ہی نکل گئے۔ گرفتہ اونٹوں کو پانی پلا کر پہلے ہی آگے بڑھا دیا تھا۔ بھور سنگھ اور اس کے آدمی باغ میں جو پہنچے تو میدان صاف تھا مگر جلدی میں دیوڑے اپنی جاجم چھوڑ گئے تھے۔ جاجم پر جانماز تھی اور اس پر ایک تسبیح دشمن کی جاجم ہاتھ آنا بہترین شگون تھا۔ ایسے موقعہ پر اس سے بہتر شگون ناممکن اور پھر ویسے ہی بہترین مال غنیمت۔

دیوڑے دور نکل گئے تھے کہ پتہ چلا "جاجم" رہ گئی۔ ارے! اب

---

[1] ریاست جودھ پور کا ایک ضلع [2] سروہی ریاست والے دیوڑے راجپوت ہیں جو راجپوتوں کی ایک اعلیٰ ذات ہے۔ [3] راٹھوروں کی ایک شاخ ہے یہی میڑتیے کسی زمانے میں مغلوں کی فوج کا خوفناک حربہ تھے۔ [4] میدان [5] وہ تعظیمی سلام جو صرف راجہ کو کیا جاتا ہے [6] جنگ

کیا ہو۔ نتھو خاں نے کہا کہ اونٹ رہیں چاہے جائیں۔ جاجم نہ جائے اس سے زیادہ منحوس بات کوئی نہیں کہ میری جاجم جاتی رہے۔ ایسا کبھی نہیں ہوا۔ لہذا اونٹ تو چلتے کئے اور نصف جمعیت لے کر ٹوٹ پڑے۔ ادھر سے بہور سنگھ آگ بگولہ بنا آرہا تھا۔

دونوں لشکر ایک دوسرے کے سامنے آئے ہیں کہ نتھو خاں نے دیکھ لیا کہ اب ٹکراتے ہیں۔ نتھو خاں کو اپنی قوت پر ایسا بھروسہ تھا کہ وہ چن کر افسر کو تنہا جنگ میں مار کر قصہ ختم کرتا تھا۔ لہذا نتھو خاں نے اپنے لشکر کو تو روکا اور خود صف سے نکل کر گھوڑا چمکا کر آگے بڑھا۔ اور ہاتھ اٹھا کر بہور سنگھ کے لشکر کو ٹکرانے سے روکا ہاتھ سے اس نے کہا۔ "ٹھہرو ٹھہرو"۔

بہور سنگھ نے دیکھا اور اپنے آدمیوں کو روکا اور خود دریافت حال کو آگے بڑھا۔ آہستہ آہستہ دونوں ایک دوسرے کے قریب آئے اور بہور سنگھ نے اب نتھو خاں کو دیکھا۔ کوئی چالیس بیالیس برس کی عمر۔ مگر بہت طاقتور اور دوہرے بدن کا آدمی۔ کسا ہوا لوہے کا سا بدن۔ سینہ جیسے چکی کا پاٹ۔ ایک عجیب شان سے داڑھی چڑھائے اور مونچھیں جیسے بچھو کا ڈنک۔ گوندسے اس طرح کھڑی کہ معلوم دے برچھی۔ ایک گہرے زخم کا نشان پیشانی پر جس کو اچھی طرح ظاہر کرنے کے لئے پگڑی کا ایک پیچ قصداً دوسرے پر چڑھا ہوا تھا اور زخم کے ارد گرد اس کے حدود کو دور سے واضح کرنے کے لئے اُس میں سُرمے کی تحریر۔ اسی طرح ایک زخم کا نشان ناک پر اور ایک داہنی طرف رخسار پر تھا۔ جس کی پوری وسعت ظاہر کرنے کے لئے داڑھی کے بالوں کو گوندسے چپکایا گیا تھا تاکہ نشان واضح رہے۔ دراصل مردوں کا زیور یہی زخم کے نشان تھے۔ ترچھی بانکی پگڑی۔ پھنسا ہوا تنزیب کا انگرکھا اور چوڑی دار پائجامہ گندمی رنگ اور کھڑا نقشہ ہاتھ میں برچھی لئے۔ چاروں طرف چیتے کی طرح دیکھتا ہوا۔ اس شان کے نتھو خاں تھے۔

نتھو خاں نے سو اونٹ کے بدلے جاجم واپس مانگی۔ بہور سنگھ نے مشکوک نظروں سے دیکھتے ہوئے تیور بدل کر کہا کہ اونٹ ہمارے سب واپس کر دو۔ اور جاجم لے لو اور چلے جاؤ ورنہ ہم نے ویسے ہی تم کو آلیا ہے۔

نتھو خاں نے بتایا کہ آدھی جمعیت ابھی اور ہے جو اونٹوں کے پاس ہے اور اونٹ ایسی جگہ گئے کہ دیکھنے کو بھی نہیں مل سکتے۔ اس کا جواب بہور سنگھ نے یہ دیا کہ ہماری تین ٹکڑیاں ابھی اور آرہی ہیں بلکہ ایک ٹکڑی نے شاید آگے بڑھ کر راستہ کاٹ بھی لیا ہو اور اونٹ ڈھونڈھ لیں گے۔

نتھو خاں کے مخبر ہر چہار طرف لگے رہتے تھے۔ لہذا اس کو معلوم تھا کہ یہ خالی دھمکی ہے۔ لیکن جاجم وہ کسی طرح چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔

اونٹ کوئی چیز نہیں۔ جاجم جاتی رہی تو ہم چشموں میں الگ ذلت ہوگی اور سرکار میں بدنامی علیحدہ۔ گر سب اونٹ دینا قیامت۔ آدھے اونٹ کا سودا کیا کہ اتنے میں کیا دیکھتے ہیں کہ کنبیا ہیجڑا۔ جاجم اوڑھے ناچ رہا ہے۔ اور ایک دم سے جاجم بچھا کر اُس پر بیٹھ گیا۔ دو چار جوتے اُٹھا کر جاجم پر رکھ تالیاں بجاتا کھڑا ہو کر مٹک مٹک کر گانے لگا ؎

دارو بھرپوڑے سیسا رے۔
(شراب) (بھرے ہوئے) (شیشے)
جاجم ماتے دہرپو.. ڑے....ے...
(پر) (دہرے ہوئے)

اور جوتوں کو شراب کا شیشہ قرار دے کر لگا سپاہیوں کو جھوٹ موٹ پلانے۔ یعنی دوڑ دوڑ کر مارنے۔

نتھو خاں نے یہ دیکھا تو اُن کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ غضب ہے نہیں کہ اُن کی جاجم پر اور ہیجڑا بیٹھے اور یہ حرکتیں کرے۔ مگر خیال مالِ غنیمت کا تھا ورنہ چشم زدن میں لڑائی شروع کر دیتے۔ نتیجہ یہ کہ نتھو خاں نے بھی سوچا کہ دشمن نے ویسے ہی آلیا۔ جنگ میں ہار ہو نہ ہو اونٹ اور مویشی لے کر نکل جانا ناممکن۔ سودا بُرا نہیں ہے۔ ہزار اونٹ خاصہ کے دے کر جاجم لے لو اور باقی جو ہزار بارہ سو مویشی ہیں وہی مالِ غنیمت کافی ہے۔

اِدھر بہور سنگھ نے دیکھا کہ اونٹوں کا پتہ سراغ نہیں۔ نہ معلوم کدھر اور کہاں ہیں۔ ویسے ملیں یا نہ ملیں لہذا مویشی نہیں تو نہ سہی سودا خوب ہے لہذا راضی ہو گیا۔

(۳)

نتھو خاں نے اونٹ منگوا کر حوالے کر دیئے اور رودادھر

روانہ ہوئے اور یہ ادھر۔

جانے کو تو دونوں چلے گئے لیکن ذرا دور جاکر سوچنے لگے نتھو خاں اور ان کے ساتھیوں کو مفت مال اونٹ جانے کی کسک۔ ایک نے کہا کہ بہتر ہوتا اگر ہم لڑتے اور لڑ کر جان دے دیتے۔ دوسرے نے کہا ایسے کا ہوتا۔ تیسرا بولا جاتم تو ہاتھ آئی پر ہیجڑے کو سزا نہ دی۔ ایک نے کہا ہیجڑا قتل ہونا تھا۔ ایک اور بولا ہیجڑے کو قتل کون کرے ناک کاٹنا تھی۔ ایک اور صاحب کا خیال تھا کہ ناک تو غالباً اب بھی کاٹی جانا زیادہ دشوار نہ تھی۔ نتھو خاں بھی دانت پیس رہے تھے کہ واقعی ہیجڑا صاف نکل گیا اور اس وقت خیال ہی نہ رہا۔

اب دوسری طرف کی سنیئے۔

کنہیا ہیجڑے نے بہور سنگھ سے کہا "رانڈ اجب تو لڑنے سے ڈرتی تھی تو آئی کیوں تھی؟ چل تو سہی سوت نہ تیری ناک چوٹی کٹوائی ہو تو میرا ذمہ۔"

بہور سنگھ نے ہنس کر کہا "بدمعاش ماروں گا تجھے۔ چپ رہ۔"

کنہیا چیخ کر بولا "تو بنا دُسکھی تم نے پٹھان کو جاتم کیوں دے دی۔ اے گوری تمہیں ڈر لگا تو مجھ سے کہا ہوتا نگوڑے کو مار جوتیاں چھین لیتی۔"

لوگوں نے ہیجڑے کی باتوں کو غور سے سنا۔ بہور سنگھ نے بھی غور کیا کہ ہیجڑا پھر بولا۔

"رانڈ سوچتی کیا ہے۔ چل تو سہی دربار میں کیسی جوتیاں پڑتی ہیں۔ تجھے بنیوں کا سودا کرنے بھیجا تھا کہ لڑنے مارنے؟ ارے کوئی بنیا نہیں تھا جو تجھے بھیجا؟"

اب بہور سنگھ نے غور کیا۔ یہ واقعہ تھا کہ بنیوں کی طرح مول تول کر کے اونٹوں کا سودا کر لیا تھا۔ ہیجڑا بولا "یہ سودا تو میں بھی کر لیتی بلکہ پٹھان کی داڑھی موچھ ملاتی گھماتے میں تو نے راجپوت کے گھر کیوں جنم لیا؟"

اس کے بعد ہیجڑے نے کہا کہ جودھپور چل کر تجھے گودلوں گی۔ بہور سنگھ کا خون کھولنے لگا۔ بہور سنگھ اور اس کے ساتھی اب واقعہ کی اہمیت پر غور کر رہے تھے۔ یہ واقعہ تھا کہ کسی کی نکسیر بھی نہیں پھوٹی۔ چوروں کو بغیر مارے کیوں چھوڑا؟ اگر یہ سوال دربار میں کیا گیا تو کیا جواب دوں گا۔ مگر ہیجڑا تو سوچنے بھی نہیں دیتا تھا۔ اس نے دم کے دم میں بہور سنگھ کا نام سیٹھ بہور مال رکھ دیا۔ اور لگا کھانڈا تلوار مانگنے کہ ہٹا دان چیزوں کو۔

بہور سنگھ نے جل کر سر پیٹ کر کہا "کمبخت تو اس وقت کہاں مر گیا تھا۔"

ہیجڑا بولا "بھابی تم پٹھان سے ڈر کیوں گئیں؟"

بہور سنگھ نے کہا "اب تجھے ماروں گا۔۔۔"

ہیجڑا بولا "کیا عورتیں سب مر گئیں۔۔۔؟"

بہور سنگھ مارے غصے کے سر دھن رہا تھا۔ وہ ہیجڑے کو قطعی مارتا اگر ہیجڑا حق بجانب نہ ہوتا۔ ہیجڑا بالکل سچ کہتا تھا۔ سوال یہ تھا کہ اب کیا کریں۔

ہیجڑا بولا کہ "ترکیب میں بتاؤں؟"

بہور سنگھ نے کہا "وہ کیا؟"

کہنے لگا "آؤ سب مل کے ناچیں۔"

بہور سنگھ بگڑا تو کہنے لگا کہ آؤ ہم تم دونوں نتھو خاں سے بیاہ کر لیں۔

اور بہور سنگھ نے غصہ میں حکم دیا کہ اس کی چوٹی پکڑ کر گھسیٹ لے جاؤ۔ بہور سنگھ کے لئے یہ ناممکن تھا کہ وعدہ خلافی کر کے دیوڑوں سے پھر جا لڑے۔ یہ ناممکن! دوسری صورت یہی تھی کہ لوٹ کر دیوڑوں کو جنگ پر راضی کریں اور جنگ کی کوئی جائز صورت نکالیں۔ اس کو امید تھی کہ نتھو خاں کا بانکپن کام دے جائے گا۔ چنانچہ اونٹوں کو آگے بڑھنے کا حکم دے کر اپنی پوری جمعیت کے ساتھ لوٹ پڑا۔ اب کنہیا بہت گھبرایا۔ اس کو خیال بھی نہ تھا کہ واقعی ایسا ہوگا اور بہور سنگھ نے کہا کہ تجھے تو چھوڑوں گا نہیں۔ "جھگڑے میں تیرے چونڈ لال کرانا ہیں۔ کیسے چھوڑ دوں؟" اور ہیجڑا الیسر گیا۔ رونے لگا تو بہور سنگھ نے کہا کہ اس کی چوٹی پکڑ کر مار جوتیاں اور زدوکوب کر کے اسے اونٹ پر ڈال کر لے چلے۔ چارونا چار چلا کوستا پیٹتا۔

(۴)

پہلے تو نتھو خاں سمجھے کوئی اور دستہ آتا ہے لیکن جب بہور سنگھ معہ چند ساتھیوں کے صف سے نکل کر بڑھا تو اطمینان ہوا۔ نتھو خاں بھی چند ہمراہیوں کے ساتھ بڑھے۔ بہور سنگھ نتھو خاں کو دیکھ کر مسکرایا۔

"ٹھاکر ان ا۔۔۔" نتھو خاں نے ہاتھ سے سوال کا اشارہ کیا۔ "کیا حکم ہے؟"

بہور سنگھ نے مسکراتے ہوئے گردن کھجاتے ہوئے کہا۔

"خان جی تم نے جاجم لے لی اور اس کے بدلے اونٹ دے دیئے۔
دے دیئے"

"یہ سودا تو کچھ نہیوں کا سا ہو گیا۔"

نتھو خاں فوراً تاڑ گیا کہ لڑائی مانگتا ہے اور اپنے قول صلح سے پھرنے کی ترکیب میں ہے۔ نتھو خاں کو گو خود بھیڑے کی ضرورت تھی مگر اُس نے بے پروائی سے کہا۔

"ہو تو گیا۔"

بھور سنگھ نے بے پروائی سے کہا۔ "ایک چیز لیتے نہ تم اچھے لگو نہ ہم۔ جاجم اور اونٹ دونوں چیزیں ہم دونوں میں سے کوئی ایک بھی لے جاتا تو اچھا تھا۔"

نتھو خاں نے کہا۔ "ہاں چاہئے تو یہی تھا مگر خیر۔"

بھور سنگھ نے کہا۔ "خیر کیا لے جاؤ اونٹ بھی۔"

نتھو خاں نے مسکرا کر کہا۔ "ہماری طرف چارہ کی ویسے بھی کمی ہے ہم نے سوچا کہ چلو رہنے دو جلدی کیا ہے۔ ذرا مہینہ دو ایک چر لیں اچھا ہے...... لے جائیں گے ہم آپ اطمینان رکھیں پھر کبھی جھینٹ لے جائیں گے۔"

بھور سنگھ نے کہا۔ "خان جی دیوڑے اور راٹھور ٹکرائیں اور یوں بنیوں کی طرح سودا کر کے چلے جائیں۔ کسی کی نکسیر بھی نہ پھوٹے!"

نتھو خاں نے سنجیدگی سے کہا۔ "دیکھو جی۔ ہم تو یہاں مُنصدی بن کر آتے ہیں۔ اہلکار ہیں ہم تو۔"

"کیسے اہلکار؟"

"اہلکار ایسے کہ ہم تو دیوڑوں کی لاگ باگ (بمعنی خراج یا ٹیکس) لینے آتے ہیں۔ بہادری دکھانے نہیں آتے۔ اپنے لیا اور چل دیئے۔"

لاگ باگ کا نام سنتے ہی بھور سنگھ کا راٹھوری خون کھول گیا اور اُس نے چیخ کر کہا۔

"لاگ باگ.. کیسی لاگ!... ہم سے! ارے ہم سے اور دیوڑے لاگ لیں۔"

نتھو خاں نے قہقہہ لگا کر کہا۔

"لاگ نہیں تو اور کیا ہے؟"

"چوری ہے چوری" چیخ کر بھور سنگھ نے کہا۔ "چوری..... ہم تم سے جاجم بھی لیں گے..... مویشی بھی...."

نتھو خاں نے کہا۔ "اور اپنے صلح کے قول سے پھر جاؤ گے؟"

"ہرگز نہیں۔ ہرگز نہیں۔"

"پھر کیوں جھگڑتے ہو۔ جاؤ۔ ہم تم سے نہیں لڑتے۔ ہم ہزاروں اونٹ مویشی لے کر جاتے ہیں۔ جیت ہماری ہے۔ ہم نہیں لڑتے۔"

"لڑنا تو پڑے گا" بھور سنگھ نے سر ہلا کر کہا۔

"ہم ہرگز نہیں لڑیں گے۔ تم اپنا قول توڑ دو۔ نکالو کھانڈا ......
...... شروع کر دو لڑائی...... مگر یاد رکھنا ٹھاکران میرے ساتھ اگنی کے بچے دیوڑے ہیں بھیل بانبی نہیں ہیں۔ گاجر مولی کی طرح کاٹ کر رکھ دوں گا۔"

"اور میرے ساتھ بھی میڑتیے ہیں......"

کنہیا بھیجڑا سنتا ہی تھا اور بڑا خوش ہوا کہ لڑائی نہیں ہو گی اور اُس نے چاہا کہ مذاق میں بات اُڑا دوں۔ لہٰذا جیسے ہی بھور سنگھ نے اکڑ کر کہا۔

"میرے ساتھ بھی میڑتیے ہیں......"

تو بھیجڑا بات کاٹ کر تالی بجا کر چیخ کر اپنے سینے پر ہاتھ ٹھونک کر مٹک کر بولا۔

"میڑتیے ہیں ہم...... خان جی دیکھ لو ہمیں۔ بھول میں نہ رہنا..."

نتھو خاں نے ایک قہقہہ لگایا اور بھور سنگھ خفیف ہو گیا اور اُس نے جل بھن کر بھیجڑے کی طرف دیکھا۔ نتھو خاں نے بھی دیکھا کہ بھور سنگھ کو بھیجڑے نے کیسا خفیف کیا۔ ایسا کہ گفتگو کی گرمی معہ جنگ کے امکان کے غائب۔ بات رنگ پہ آئی تھی کہ ہنسی میں اُڑ گئی۔ بھیجڑے نے بھی بھور سنگھ کے تیور دیکھے اور اپنی غلطی محسوس کی۔ مگر غلطی کیا۔ اس کی تو کوشش تھی کہ جنگ نہ ہو۔ اِدھر نتھو خاں نے واپسی کی ٹھانی اور اجازت چاہی تو بھور سنگھ پھر اڑ گیا۔ کہنے لگا۔

"خان جی جاجم تو دیتے جاؤ۔"

نتھو خاں نے کہا۔ "ٹھاکر ان تم لڑائی مانگتے ہو!"

"ہاں"

"سنو کان کھول کر" نتھو خاں نے کہا۔ "پہلی بات تو یہ کہ آج جاجم کے سبب ہمارا شگون خراب اور تمہارا شگون اچھا ہے۔ دوسرے یہ جو میرے ساتھی ہیں ان کی جان سرکار نے میرے ہاتھ میں سونپی ہے یہ دیوڑے ہیں۔ اگنی کے بچے۔ ایک اشارے پر ابھی کٹ مریں

سلہ چار

ان کو مفت میں کیسے مروا دوں تیسرے یہ کہ ہمیں سرکار سے حکم ہے کہ کسی سے لڑو مت بلکہ مال لے کر نکل آؤ۔ کوئی روکے تو مار کر نکل آؤ ورنہ خود مت لڑو۔ ہم تو خالی میدان میں آ گئے اور اپنے مویشی لے کے چلے گئے۔"

"یہ بھی کوئی مردانگی ہے"

نتھو خاں نے کہا۔ "پھر وہی بات! سن! کان کھول کر پانچ سپاہی مریں اور ہم تمہارے مار ڈالیں پچاس سپاہی تو ہماری تعریف نہیں ہوگی بلکہ جواب طلب ہوگا کہ اپنے آدمی کیوں مرے۔ ہم مویشی لینے آتے ہیں۔ جو بل[1] اور ہٹ[1] اور مردانگی دیکھنا ہو تو آجاؤ۔ کبھی سروہی۔"

بہور سنگھ نے ایک آخری اپیل کی اور کہا۔ "خان جی بل اور ہٹ تو ہمیں دیکھیں گے ورنہ ہمارے ساتھ ہیجڑا ہے۔ جاؤ تم ہم اس سے تالی پٹوائیں گے۔"

ہیجڑا تو قریب ہی تھا اپنا نام سنتے ہی مٹک کر تالی بجا کر نتھو خاں سے بولا۔

"گوری جاجم دے دو۔ اے ہے گوری . . . گوری جاجم دے دو۔"

نتھو خاں کا یہ حال کہ گویا تو وہ بارود میں آگ دے دی۔ ویسے ہی کباب ہو رہے تھے کہ اس نے یہ حرکت کی۔ اس پر لگا قہقہہ۔

نتھو خاں نے بہور سنگھ سے ایک اور تجویز کی۔ وہ یہ کہ اب شام ہو رہی ہے۔ کل پر رکھو اور منگواؤ اونٹ۔ مگر شرط یہ ہے کہ ہم تم تنہا نپٹ لیں کیوں سپاہیوں کا خون ہو اور ہیجڑا اس کے عوض ہمیں دو۔

بہور سنگھ نے کہا "تم کیا کرو گے۔ ہیجڑے کا؟"

"ہم اس کی ناک کاٹیں گے۔ یہ ہماری جاجم اوڑھ کر ناچا"

سر ہلا کر بہور سنگھ نے کہا۔ "ناک نہیں مل سکتی۔ ہیجڑا سرکاری ہے۔ مگر ہاں چوٹڑ کاٹ سکتے ہو۔"

"وہ کیسے؟"

"مرنے نہ پائے زخمی کر دو۔ مگر ہڈی بھی نہ کٹے۔ دربار نے کہہ دیا تھا"

"منظور ہے" نتھو خاں نے کہا۔ "لاؤ اسے۔"

بہور سنگھ نے کہا۔ "امانت . . .!"

"امانت۔ امانت" نتھو خاں نے جواب دیا۔

[1] دیوڑوں کو اپنے بل اور ہٹ پر ناز ہے۔

بہور سنگھ نے مسکرا کر کہا "چار آدمی جھپٹ کے لے لو۔ ہم لوگ جھوٹی تلوار چلائیں گے۔"

جب یہ طے ہو گیا تو ادھر بہور سنگھ نے اپنے آدمیوں کو سکھا دیا۔ ادھر سے چار چھ آدمی ایک دم سے ہیجڑے پر ٹوٹ پڑے۔ اور برچھیوں کی ڈنڈیوں سے مار پیٹ کر گھسیٹ لے گئے۔ خوب مصنوعی لڑائی ہوئی۔ "نا۔ نا پکڑنا" کے سوا کچھ نہ ہوا اور ہیجڑے کو دیوڑے گھسیٹ لے گئے۔

طے یہ ہوا کہ سامنے گاؤں کے قریب پہاڑی کے دامن میں ایک باغ ہے وہاں رات گذاریں گے اور صبح مقابلہ ہوگا۔

(۵)

رات کو دیوڑوں نے ہیجڑے کو خوب تو چیتیا یا اور حقیقت بتائی کہ استاد تمہارے چوتڑ کاٹے جائیں گے۔ خود تمہارے دربار کا حکم ہے۔ ہیجڑے نے جو حقیقت سنی تو بے حد خوفزدہ ہوا۔ خوب رویا پیٹا گڑگڑایا۔

صبح ہوئی۔ نتھو خاں کو فتح کی سولہ آنے امید تھی۔ بلکہ رنج تھا۔ کہ ایسا بانکا جوان قتل کرنا پڑے گا اور واقعہ ہے کہ نتھو خاں کا اور بہور سنگھ کا مقابلہ بھی کیا۔ نتھو خاں کے مویشی اب محفوظ تھے۔ اور اتنے آگے پہنچ چکے تھے کہ کسی طرح ان کا تعاقب ممکن نہ تھا

نر یقین نے تلوار کے قبضے پر ہاتھ رکھ کر قول و قرار کیا۔ اونٹ ابھی آئے نہیں تھے مگر آ رہے تھے اور اسی کا انتظار تھا۔

نتھو خاں نے بہور سنگھ کو سمجھایا کہ دیکھو جوان مت مرو۔ میں نے تیرے ایسے کتنے جوان کاٹ کے ڈال دیئے۔"

بہور سنگھ نے کہا۔ "خان جی کاٹے ہوں گے۔"

"کاٹے ہوں گے"! نتھو خاں نے کہا۔ "تم اپنے آدمی گنو۔ دھو لجی تمہارا۔ کیسا جوان تھا۔ فولادی خود پہنے تھا مگر میں نے کھانڈے سے ٹھوڑی تک چیر دیا اور وہ رنجی۔ سروہی چمکا تارہ گیا۔ مارا جو ہاتھ جنہو کا تو گھوڑے سے دو ہو کے آدھا ادھر آدھا ادھر گرا . . . اور وہ تمہارا ہمنام چانپاوت[2] . . . وہ برچھی والا . . . چندری اڑھا کر چوڑا پہنا کر چھوڑ دیا . . ."

"مجھے بھی پہنا دو نا . . ."

"آؤ . . . ابھی لو"

---

[2] راٹھوروں کی ایک گوت ہے چانپا جی کی اولاد۔

"خان جی ابھی اونٹ نہیں آئے ہیں"۔

"اوّل تو برچھی سے تم مجھے مارنے نہیں دیتے ہو اور اونٹ نہ بھی آئیں تو کیا ہے۔ آتے ہیں"۔

دونوں نے اپنے اپنے گھوڑے طلب کئے اور دونوں برچھیاں لے کر تیار ہو گئے۔

"خان جی چندری کہاں ہے؟"

نتھو خاں نے کہا۔ "تمہارے سر پر آ جائے گی۔ تمہیں کیا مطلب"؟

اور بہت کچھ بہور سنگھ نے دیکھا پر کہیں چندری یا چوڑا نظر نہ پڑا اور نہ نتھو خاں نے بتایا کہ کیسے پہنا دے گا۔

دونوں نے اپنے اپنے گھوڑے فاصلے سے ایک دوسرے کی سیدھ میں سرپٹ چھوڑ دیئے اور برچھیاں اور ڈھالیں موقعہ سے تیار۔ مگر عین موقعہ پر جبکہ سوار ٹکراتے نتھو خاں اپنا گھوڑا بجلی کی طرح چمکا کر بائیں کو بچا لے گیا اور کاوا دے کر دشمن کا تعاقب کیا۔ بہور سنگھ نے بھی گھوڑا موڑا اور دونوں پھر اسی طرح آئے مگر بجائے گھوڑے ملانے کے برچھیاں گھماتے فاصلے ہی سے نکلے چلے گئے کہ بہور سنگھ نے اپنا بالوترا نکالا اور چمکا کر باز کی طرح جھپٹ کر اس تندی سے نتھو خاں پر گرا کہ اس دفعہ بہور سنگھ کی برچھی سے بچنا نتھو خاں ہی کا کام تھا۔ نتھو خاں نے سچے دل سے تعریف کی۔ "واہ ٹھاکران کیا کہنے ہیں۔ دوسرا جنم لیا ہے میں نے۔ واہ واہ کیا کہنا۔ تقدیر سے بچا ہوں"۔

اور سب ہی نے تعریف کی۔ کیا دوست کیا دشمن کمال کے سب ہی قدر دان تھے۔ ہیجڑا اس فکر میں تھا کہ نتھو خاں کی خوشامد کرے لہذا وہ تالی پیٹ پیٹ کر بہور سنگھ پر چوٹیں کر رہا تھا۔

ایک دفعہ پوری رفتار سے دونوں گھوڑے جو سرپٹ آئے ہیں تو سواروں نے اپنے برچھے تولے اور جھک کر جو گھوڑے ملائے ہیں تو ایک دم سے سب نے دیکھا کہ نتھو خاں کا گھوڑا بائیں کو چک کر عین موقعہ پر اس خوبصورتی سے اڑا ہے کہ بہور سنگھ اپنی تیزی میں خالی نکلا چلا گیا۔ لیکن عین موقعہ پر نتھو خاں اور بہور سنگھ کے برچھوں کی رسنانیں لڑ چکی تھیں اور لڑنے کا کھنکا سب نے سنا اور اسی کھٹکے کے ساتھ ایک پھڑپھڑاہٹ کے ساتھ رنگ برنگی چندری نیزے کی جھڑپ سے نکل کر گیند کی طرح بہور سنگھ کے منہ پر پہنچی ہے کہ ہوا سے پھیل کر سر پر ڈھک گئی۔ ایسے کہ بہور سنگھ جو نیزہ بلند کئے نکلا ہے تو چندری اوڑھے!

ایک غلغلہ دیوڑوں کے لشکر سے بلند ہوا۔ جوانوں کی حلق پھاڑ آواز اور ڈھال پر تلوار مار کر ایک نعرہ مارا سب نے۔

"ادھ پتیان[1] سر چوندری ..... چوندری!

ادھ پتیان سر چوندری ....."

اور ہیجڑا بھی بہور سنگھ کے گھوڑے کی طرف تالی بجاتا مٹکتا تھرکتا دوڑا چلاتا ہوا۔

"گوری گھونگٹ کھولو ...... گوری گھونگٹ کھولو ....."

اور بہور سنگھ نے خفیف ہو کر جو منہ پر سے چندری کو الگ پھینکا ہے تو ایک تو دیوڑوں کا "ادھ پتی" کا طعنہ اور دوسری طرف خود اپنے ہیجڑے کی تالی اور ستم پہ ستم کہ برچھی والے ہاتھ کی کلائی میں ایک چوڑا بھی اٹکا ہوا تھا جو اتنا ڈھیلا تھا کہ برچھی کی ڈانڈ پر سے ہو کر کلائی میں آ پھنسا جھنجلا کر اس نے چوڑا الگ پھینکا۔ نتھو خاں کے کمال کا قائل ہو گیا اور واقعی ایک شعبدہ سا تھا کہ چوڑے کو اپنی برچھی سے دشمن کی برچھی میں پہنا دیا اور ساتھ ہی چندری کی گیند سی منہ پر اسی برچھی والے ہاتھ سے ایسے ماری کہ پھیل کر سر پر پڑ گئی۔

بہور سنگھ کا رہا تھوڑی خون کھول گیا اور سب سے زیادہ غصہ اسے ہیجڑے پر آیا۔ اس نے گھوڑا بڑھا کر ہیجڑے کو نیزے کی ڈانڈ سے مارا کہ وہ منہ کے بل چیخ کر گرا۔

نتھو خان بھی جلے ہی بیٹھے تھے۔ انہوں نے بھی اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ "کاٹ لو چوہڑ" یہ کہنا تھا کہ دو چار آدمی جھپٹ پڑے اور تلواریں سونت کر مارنا جو شروع کیا ہے تو سچ مچ ہیجڑے کو کاٹ کر ہی ڈال دیا۔ اس چپقلش میں ہیجڑے کی ایک انگل بھی کٹ گئی اور چوہڑ تو بالکل ہی قیمہ ہو گئے۔ بہور سنگھ کے آدمی ادھر اٹھا کر چلے ہیں کہ ادھر بہور سنگھ نے تن کر رکابوں پر کھڑے ہو کر کہا۔ "مجھے ادھ پتی کون کہتا تھا۔ ذرا پھر تو کہنا"!

نتھو خاں نے اپنا برچھا ملازم کو دے دیا تھا اور دوسرا منگایا تھا اس لئے کہ یہ نیزہ خاص چندری کے شعبدہ کا تھا۔

نتھو خاں نے تیور پر بل ڈال کر کہا۔ "جھگڑا مجھ سے ہے لہذا میں نے کہا سمجھو ....."!

[1] ادھ پتی۔ آدھا پتی، نصف شوہر یعنی نامرد یا بزدل۔

"ذرا پھر تو کہو" بہور سنگھ نے کہا۔

تھو خاں نے اشارہ کیا کہ ایک جوان نے ذرا آگے بڑھ کر بھڑک کر اپنی ڈھال پر زور سے تلوار مار کر کہا۔

"آہشٹے پتیاں سر چوہندری سے راٹھوڑاں۔"

"سر چوہندری ..... آ میڑ تیا سر چوہندری"۔

اور "آ میڑ تیا" اس نے بہور سنگھ کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

بہور سنگھ کے لئے برداشت ناممکن تھی۔ آگ بگولہ ہو گیا اور انتہائی غیظ و غضب کے ساتھ اس نے اپنے گھوڑے کو بجلی چھوا دی اور تڑپ کر چلا اس گستاخ جوان پر ایک نعرہ کے ساتھ۔

"زنٹر بنکا میڑ تیا!"

ادھر تھو خاں بھی تیار ہی تھا۔

"بل ہٹ ..... بل ہٹ بنکا دیوڑا!"

کا نعرہ مار کر تلوار ہاتھ میں اُس نے جھپٹ کر بہور سنگھ کا راستہ کاٹا۔ بہور سنگھ سپاہی کو چھوڑ کر سیدھا تھو خاں پر جھک پڑا۔ تھو خاں کے پاس برچھی نہیں تھی۔ لہٰذا بڑی صفائی سے گھوڑے کو ہٹا کر وار خالی دیا۔ بہور سنگھ غیظ و غضب میں آگ ہو رہا تھا اس نے بھی اپنا برچھا پھینک دیا اور تلوار سونت کر وہ پھر تھو خاں پر گرا۔ تھو خاں نے اپنا گھوڑا پھرا کر بچایا اور زور سے چیخا "میرا گھوڑا کٹ جائے گا ..... " یہ کہتا ہوا وہ گھوڑے سے کود پڑا۔ بہور سنگھ بھی گھوڑے سے کود پڑا اور دونوں پینترا بدل کر سامنے آئے۔

تھو خاں نے کہا "میں اپنے اس گھوڑے پر تلوار سے نہیں لڑتا۔ یہ خاص نیزے کی لڑائی کا گھوڑا ہے۔"

بہور سنگھ نے کہا "خان جی زندہ بچے تو نیزے سے جی بھر کے لڑ لینا!"

اور یہ کہہ کر ایک ایسا وار کیا کہ دوست دشمن سب کے منہ سے تعریف نکلی۔ مگر خان نے بھی خوب بچایا۔ گو تلوار شانہ چاٹتی چلی گئی اور تھو خاں کو معلوم ہو گیا کہ یہ چھریرے بدن کا راجپوت معمولی سپاہی نہیں ہے۔ بہور سنگھ بجلی تھا اور اس کی تلوار بھی بجلی کی طرح چمکتی تھی۔

تھوڑی دیر تک لڑائی ہوتی رہی۔ تھو خاں نے کئی وار کئے مگر بہور سنگھ نے یا تو ڈھال پر روک لئے یا خالی دیئے۔ کوئی جوابی وار تھو خاں کی طرف سے نہیں ہوا تھا کہ تھو خاں نے اپنی تلوار پھینک کر کھانڈا سنبھالا اور اپنے زبردست شانوں کو جنبش دے کر کہا۔

"بہور جی یہ وہی کھانڈا ہے جس سے میں نے دھولجی کو گھوڑے سمیت چیر دیا"۔

بہور سنگھ نے تمسخر آمیز قہقہہ لگایا اور کہا "خان جی پرانی باتیں چھوڑو، لاؤ جو کچھ پاس ہے"۔

اور تھو خاں نے اپنے طاقتور ہاتھوں سے اپنا زبردست کھانڈا تولا اور آگے سرکنا شروع کیا۔

"بل ہٹ ..... بل ہٹ ....." کا نعرہ زبان پر اور آہستہ آہستہ کھانڈے کا پینترا بدلتا تھو خاں بڑھا اور بہور سنگھ اس تاک میں کہ کھانڈے کا وار خالی جائے تو سر ہی چکا جاؤں۔

اسی طرح گھاتیں ہوتی رہیں تھو خاں بھلا ایسا اوچھا وار ہی کیوں کرتا کہ کھانڈا زمین پر آئے۔ وہ جانتا تھا کہ اگر ایسا ہوا تو میڑ تیا چوٹ کر دے گا۔ لہٰذا وہ ایسا سچا وار کرنا چاہتا تھا کہ کم از کم ڈھال پر تو پڑے۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اگر ذرا بھی اوچھا وار کیا تو اس کا مقابل بجلی کی طرح کوند کر نکل جائے گا۔

تھو خاں نے بل ہٹ ..... بل ہٹ ..... کا وظیفہ پڑھتے پڑھتے ایک دم سے ورک کر "بل ہٹ بنکا دیوڑا" کے نعرے کے ساتھ مارا جو ہے دو ہتڑ کھانڈے کا تو بہور سنگھ نے ڈھال پر روکا۔ کس زور سے کھانڈا ڈھال پر گرا ہے کہ ڈھال کو بینگن کی طرح کاٹ کر کڑا توڑ کر خود کی کناری کاٹ کر پیشانی پر ضرب دے گیا۔ ایسا کہ ضرب کے دھکے سے بہور سنگھ کی آنکھوں تلے اندھیرا آ گیا اور ڈھال کھانڈے میں پھنسی ہوئی چلی گئی۔ "بل ہٹ بنکا دیوڑا" گرج کر تھو خاں نے کہا اور دو ہتڑ تان کر آگے سرکنے لگا۔ ڈھال اسی طرح کھانڈے میں پھنسی ہوئی، جوں کی توں! تھو خاں نے دوسرے وار کی تیاری کی ہے کہ بہور سنگھ کو پیچھے ہٹنا پڑا۔ مگر اس کے ساتھی نے دوسری ڈھال فوراً دے دی۔

ملہ بزدوں کے سر پر چوہندری اور راٹھوروں کے سر پر چوہدری اور اس بیٹے کے سر پر چوہدری۔ ملہ راٹھوروں کے پرچم کی تحریر ہے۔ راٹھوروں کا جنگی نعرہ زنٹر بنکا راٹھوڑ یعنی راٹھوروں کا بانکا ہے۔ ملہ دیوڑوں کے پرچم کی تحریر یعنی۔ طاقت اور ضد میں دیوڑا بانکا ہے۔ تھو خاں دیوڑوں کے نوکر تھے اس لئے دستور کے مطابق انہی کا نعرہ مارتے تھے۔

نتھو خاں نے کھانڈا تول کر کہا۔ "ٹھاکران دو کٹے دیتا ہوں۔ چھوڑ دے سروہی..... ڈال دے سروہی ..."

بہور سنگھ کے ایک تازیانہ لگا اور اس نے سنبھل کر جو چھوٹ کے ہاتھ شروع کئے ہیں تو خان جی کو کھانڈے سے اٹکی ہوئی ڈھال چھڑانا دوبھر ہو گئی اور پسپا ہونا پڑا۔

اسی طرح تھوڑی دیر لڑائی رہی کہ نتھو خاں نے لڑائی سے ہاتھ روکتے ہوئے کہا۔ "ٹھاکران اب بس کرو"۔ "کیوں؟"

"گھنٹہ بھر سے کھڑا ہوں تم کچھ بھی نہ بگاڑ سکے۔ ایسے ہی لڑتے جاؤ گے برسوں۔ مجھے تو فرصت نہیں ہے"۔

"تو لڑے کیسے چکے؟ مارو یا مرو۔ ہارو یا جیتو۔ نہیں لڑتے تو جاجم دے جاؤ۔ اور نہیں کیسے رہو گے؟ قول ہار چکے ہو۔ بھیجڑے کے چوڑ کاٹ لئے"

نتھو خاں نے کہا۔ "ٹھاکران میں تو اپنی طرف سے لڑ چکا۔ اب بھی کھڑا ہوں۔ لو مارو۔ کوئی سال بھر تو لڑتا نہیں رہوں گا۔ اب تم اونٹ لے کے جاؤ اپنے۔ اور نہیں تو ہم جاتے ہیں روک لو ہمیں"۔

"روک تو لیں گے اور ماریں گے تم کو"۔

نتھو خاں نے کہا "مار تو"۔ اور یہ کہہ کر اپنا گھوڑا لیا۔ ادھر بہور سنگھ اپنے گھوڑے سے پرے آیا اور خان جی کا راستہ کاٹتے بڑھا اور اپنے آدمیوں سے کہا کہ "لینا"۔ اور ادھر نتھو خاں کے آدمیوں نے تلواریں نیام سے کھینچیں اور قریب ہی تھا کہ دونوں لشکر مل جائیں کہ پھر نتھو خاں نے چیخ کر کہا کہ "ٹھہرو ٹھہرو..... آؤ میں لڑتا ہوں..... ارے بیر تنئے تیری جوانی پر رحم آتا ہے۔ میں برچھی کا مرد ہوں۔ میری برچھی سے کوئی نہیں بچا ہے۔ کیوں اپنی جان دیتا ہے"؟

بہور سنگھ نے کہا۔ "خان جی دہی کے دھوکے میں کپاس مت کھا لینا برچھی ہی سے شاید تمہاری موت بھی لکھی ہے۔ ذرا ہوش کی باتیں کرو۔ لو آؤ....."

نتھو خاں نے کہا۔ "اب تیری موت آئی ہے۔ لے آ۔ دو دفعہ تو حملہ کر لے۔ تیسرے میں تجھے برچھی میں چھید لوں گا"۔ "پہلے تو چُندری اوڑھ۔ لے آ....."

اور دونوں نے اپنے گھوڑے کا داؤ دے کر نکالے۔ ادھر بہور سنگھ نے آگاہ کر دیا کہ اب کے چندری اڑھائی تو خیریت نہیں ہے۔ اُس کو پورا یقین تھا کہ وہ ہرگز یہ شعبدہ نہیں کرنے دے گا۔ ادھر اُدھر دوڑ کر بہت جلد گھوڑے آن ملے۔ بہور سنگھ نے نشانہ باندھ کر نتھو خاں کے سینے میں بھالا مارا تھا۔ مگر پھر پہلے کی طرح گھوڑا جیسے مین موقعہ پر جگہہ سے اُڑ کر بائیں کو پہنچا۔ نیزوں کی ڈانڈیں کھڑکھڑائیں کہ دیہڑوں کے نعرے سے زمین ہل گئی۔

"اُڑھ چتیان سر چُندری!!"

اور یہ واقعہ تھا کہ بہور سنگھ پھر پیشتر کی طرح چوڑا پہنے اور سر پہ چُندری چلے جا رہے ہیں اُلٹے ہوئے۔

خفیف ہو کر بہور سنگھ لوٹا اور اب نتھو خاں نے کہا۔ "ارے بیر تیا دیکھ اب بھی خیریت ہے۔ کیوں مرتا ہے"۔

بہور سنگھ نے کہا۔ "خان جی۔ بس اب کی جو تم اور چُندری اُڑھا دو تو میں تمہارا چیلا ہو جاؤں گا..."

"قول ہارتا ہے؟" نتھو خاں نے کہا۔ "بگڑے جاؤں گا۔ ڈاڑھی مونڈھ کے اپنے ساتھ..."

"عمر بھر تمہاری چاکری کروں گا"۔ بہور سنگھ نے وعدہ کیا۔

"اچھا آجاؤ" نتھو خاں نے کہا۔

اور دونوں بہادر پھر اپنے گھوڑوں کو گھما کر لائے۔ بہور سنگھ کو بڑا ناپ تول کر حملہ کرنا تھا اور تین چار دفعہ وہ گھوڑا بچا کر نکال لے گیا کہ ایک دفعہ موقعہ سے اُس نے سیدھ باندھ کر اور نیزہ تول کر پوری رفتار سے حملہ کیا۔

نتھو خاں تیار ہی تھا لیکن جیسے ہی گھوڑے چلے ہیں نتھو خاں کے گھوڑے کا پچھلا پیر ایک سوراخ میں ایسا پھنسا کہ گھوڑے نے سکندری کھائی اور وہیں کا وہیں رہ گیا۔ بہور سنگھ کا برچھا نتھو خاں کے سینے کے بیچوں بیچ میں لگا اور پشت کو توڑ کر نیزے کی پوری باہر نکل گئی۔ نتھو خاں گھوڑے سے زخمی ہو کر نیچے گرا۔ سینے میں دشمن کی برچھی پیوست اور ایک ٹکڑا ٹوٹ گیا۔ قریب تھا کہ فریقین میں تلوار چل جائے کہ سمجھدار لوگوں نے روک دیا۔ بہور سنگھ گھوڑے سے کود کر نتھو خاں کے پاس آیا۔

نتھو خاں نے فوراً اپنے آدمیوں سے کہا کہ بہور سنگھ کو جاجم دے دی جائے۔

"ہرگز نہیں، ہرگز نہیں" بہور سنگھ نے کہا۔ "خان جی تم نہیں ہارے"۔

نتھو خاں نے خون تھوکتے ہوئے کہا۔ "ٹھاکران تو جیت گیا۔ جاجم تیری ہے۔"

"ہرگز نہیں۔ ہرگز نہیں" بھیرو سنگھ نے کہا "خان جی تمہارے گھوڑے کا پیر پھنس گیا بھلا اس میں میری کیا جیت۔"

نتھو خاں نے دیکھا کہ جلد مرتا ہوں تو کچھ وصیت کی اور پھر اپنی قبر کے بارے میں پریشانی ظاہر کی۔ بھیرو سنگھ نے چھاتی ٹھونک کر کہا کہ یہ گاؤں اب دربار سے مجھے ملے گا۔ اور یہیں تم کو رکھوں گا اور مرتے ہوئے پٹھان نے اپنے شاہ زور، مگر سرد دست کمزور ہاتھ سے اپنی پگڑی اتار کر کہا کر۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "بھائی ۔ ۔ ۔ ۔"

اور بھیرو سنگھ نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔ ۔ ۔ "بھائی ۔ ۔ ۔ "بھائی" اور اپنی پگڑی اتار کر مرتے ہوئے خان کے سر پر رکھ دی اور خان کی پگڑی اپنے سر پر رکھ لی۔ بہادر بھیڑیے کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ جب اس نے مرتے پٹھان کے گلے میں باہیں ڈال کر سینے سے لگایا۔ علیحدہ جو کیا ہے تو پگڑی بدل[1] بھائی کی روح پرواز کر چکی تھی۔

(۶)

اور قریب ہی کے گاؤں میں آج بھی دیکھ لو۔

دیکھ لو کہ پہاڑی پر چھوٹی سی گڑھی ہے اور نیچے مختصر بستی۔ اور بستی میں ایک پختہ مزار ہے۔ جس پر شام کو جاگیردار کے خرچ سے چراغ روشن ہوتا ہے۔ ارجن فقیر کے پردادا کو قرآن خوانی کے لئے جاگیر کی طرف سے پچاس بیگھے معافی ملی تھی جو اب بھی اس کے قبضے میں ہے مگر قرآن پڑھنا ارجن جانتے نہیں لہٰذا اب صرف خدمات چراغ بتی رہ گئی ہیں۔ اور حقوق میں نادیل جو کوئی سہاگن چڑھائے یا دستور کے چڑھاوے جو قلعہ سے آئیں۔

اور جاگیردار جب ادھر سے نکلتا ہے تو دونوں ہاتھ جوڑ کر جھک کر مزار کو تعظیم دے کر جاتا ہے اور کوئی پردیسی ادھر سے گذرتا ہے اور پوچھتا ہے کہ یہ قبر کس کی ہے تو لوگ کہتے ہیں کہ یہ قبر ٹھاکر صاحب کے "بڑوں" کی ہے۔ ارے مسلمان! ہاں پہلے ایسا بھی ہوتا تھا۔

عظیم بیگ چغتائی

[1] راجپوتوں میں پگڑی بدل بھائی سگے بھائی کی طرح ہوتا تھا۔

غزل

سُونی سُونی محفل ہے گلرخوں کے جانے سے
چار پھول لے آؤں اُن کے آستانے سے

اس لئے ستاروں کو دردِ دل سناتا ہوں
دو جہاں پہ چھا جاؤ تم کسی بہانے سے

اب بدل گئی دنیا اب نیا زمانہ ہے
حُسن اب سبق لے گا عشق کے فسانے سے

اب کہاں چھپو گے تم اب تو چند دیوانے
ڈھونڈنے چلے تم کو موت کے بہانے سے

میں تو ہر بُنِ مُو کو چیر کر دکھا دوں گا
آپ خود نہ تھک جائیں میرے آزمانے سے

"عشق" بن کے آئے تھے تیرے آستانے پر
"حُسن" بن کے جاتے ہیں تیرے آستانے سے

زندگی کا رونا کیا زندگی تو دھوکا ہے
اے ندیم بچ نکلو اس قمار خانے سے

احمد ندیم قاسمی

قطعات

محبت

شورشِ محفل سے کیوں رہتا ہوں دور؟ لطف آتا ہے خود آرائی میں کیوں؟
کوئی بتلاؤ خدا کے واسطے، مسکراتا ہوں میں "تنہائی میں کیوں؟

جادو نوائی

آپ اپنے سے چھنا جاتا ہوں میں کس قدر بے خود ہوا جاتا ہوں میں
ہائے اس جادو نوائی کے نثار! زمزموں کے ساتھ اُڑا جاتا ہوں میں

یادِ ایام

ایک یہ دن ہیں کہ ساری ساری رات جاگتا رہتا ہوں، نیند آتی نہیں
اور اک وہ وقت تھا، یادش بخیر! جب مری بیداریاں بھی خواب تھیں

محبت اور آنسو

محبت! اے کہ تو دیوی ہے غم کی، روئے جا اگر سفینہ ہو نازک تو یوں ہی کھیتے ہیں
اِن آنسوؤں ہی سے زینت ہے تیرے عارض کی یہ اشکِ خوں ترے رُخ پر بہار دیتے ہیں

برسات کی راتیں

دلِ حسرت زدہ میں ایک شعلہ سا بھڑکتا ہے محبت آہیں بھرتی ہے، تمنائیں ترستی ہیں
کوئی دیکھے بھری برسات کی راتوں میں میرا حال گھٹا چھائی ہوئی ہوتی ہے اور آنکھیں برستی ہیں

برسات

فضا اودی ہوئی ہے اک چھلکتے جام کی مانند ہوا مخمور ہے، بادل غریقِ رنگ و مستی ہیں
مرا سرشار دل مجھ سے یہ کہتا ہے کہ اے اختر یہ بوندیں پڑ رہی ہیں یا تمنائیں برستی ہیں

اختر انصاری دہلوی

بچوں کی شرارتیں

اب سے کچھ سال پہلے تک لوگ نفسیات کا مطالعہ محض ایک علم کی حیثیت سے کرتے تھے۔ اس کا کوئی عملی مقصد یا فائدہ نہ تھا جس طرح ادب، شعر، تاریخ و فلسفہ کا مطالعہ تفریح یا دماغی قوتوں کی ترقی کے خیال سے کیا جاتا تھا، اسی طرح نفسیات کا مطالعہ بھی ایک نظری علم کی حیثیت سے ہوتا تھا۔ لیکن اب عموماً لوگ اس کی قدر اس کی افادی حیثیت کے لحاظ سے کرتے ہیں۔ عام زندگی میں عموماً اور تعلیم میں خصوصاً نفسیات کے مختلف پہلوؤں سے جو مدد لی گئی ہے اس کا اندازہ اور تصور بے حد مشکل ہے۔ بچوں کی تعلیم کو اُن کے لئے کس طرح زیادہ سے زیادہ دلچسپ اور مفید بنایا جاسکتا ہے؟ کس طرح تعلیم سے اُن کی ذاتی اور انفرادی قوتوں اور صلاحیتوں کو ترقی دی جاسکتی ہے؟ کس طرح اُنہیں آنے والی زندگی کے لئے زیادہ سے زیادہ مستعد اور تیار کیا جاسکتا ہے! کس طرح انہیں زندگی کے اُن راستوں پر لگایا جاسکتا ہے، جو اُن کے لئے فطری طور پر سب سے زیادہ مناسب اور موزوں ہیں! اس قسم کے تمام مسائل کا حل نفسیات نے پیش کر دیا ہے۔ لیکن اس کے علاوہ عام زندگی کی بھی بعض چیزیں ایسی ہیں، جن میں نفسیات کے اصول ہماری بے حد قابلِ قدر رہنمائی کرتے ہیں۔

بچوں کے متعلق عام خیال ہے کہ ان کی شرارتیں یا اُن کی اکثر اخلاقی کمزوریاں، اُن کی فطرت کا جزو ہیں۔ اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ بچوں کو اُن کے اخلاقی معائب اپنے والدین سے ترکہ میں ملتے ہیں اور وہ اچھی یا بُری فطرت لے کر ہی اس دُنیا میں آتے ہیں۔ خارجی اثرات کا اس میں بہت کم ہاتھ ہوتا ہے۔ ایسے لوگوں کے خیال کی تردید میں ایک دوسرا گروہ کہتا ہے کہ بچے اچھے اخلاق لے کر پیدا ہوتے ہیں۔ ماحول اُن پر بُرے اثرات ڈالتا ہے۔ حالانکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو ان دونوں گروہوں کا خیال صحیح نہیں، حقیقت میں بچہ نہ اچھی فطرت لے کر پیدا ہوتا ہے۔ نہ بُری اُس کی فطرت تو ایک سادہ تختی ہے۔ جس پر ماحول اپنے نقوش بناتا رہتا ہے اور ایک خاص وقت تک یہ نقوش کافی نمایاں طور پر نظر آنے لگتے ہیں۔

ماہرین نفسیات نے ماحول کے خارجی اثرات کا اندازہ کرنے کی کوشش کی ہے اور برٹ نے بچوں کی شرارتوں اور اُن کی اخلاقی کمزوریوں کی ۱۷۰ وجہیں لکھی ہیں۔ اس جگہ اُن سب کا ذکر کرنا غیر ممکن سا ہے۔ اس لئے ان میں سے چند ایک کا ذکر کیا جائے گا لیکن اِن اصلی وجوہ کا ذکر کرنے سے پہلے مختصر طور پر ان وجوہات کا بیان کر دینا بھی ضروری ہے، جو عام طور پر لوگ پیش کرتے ہیں۔

اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ اخلاقی کمزوریاں اُن بچوں میں زیادہ ہوتی ہیں، جن کے دماغوں میں فطرتاً کوئی خرابی ہو۔ اس خیال کی تردید میں وہ ہزاروں تجربات پیش کئے جاسکتے ہیں، جن سے پتہ چلتا ہے کہ دماغ کی خرابی اور اخلاقی کمزوری میں کوئی تعلق نہیں۔ بلکہ اکثر مثالیں موجود ہیں۔ جن میں ایسے بچے جن کے دماغ کچھ خراب تھے، اخلاقی نقطۂ نظر سے عام بچوں سے کہیں اچھے تھے۔ اس طرح کے تجربات کی بہت سی مثالیں سِرل برٹ کے مشاہدات میں موجود ہیں۔

اخلاقی خرابیوں کی ایک اور خاص وجہ سینما کو بتایا جاتا ہے اور لوگوں کا خیال ہے کہ سینما دیکھنے ہی کے لئے بچے چوری کرتے ہیں۔ جھوٹ بولتے ہیں اور اس طرح کی بعض دوسری اخلاقی خرابیوں میں مبتلا ہوتے ہیں۔ حالانکہ اس سلسلے میں بھی جو تجربات ہوئے ہیں وہ اس خیال کی تردید کرتے ہیں۔ اس لئے کہ انگلستان وغیرہ میں جہاں اتوار کے دن سینما نہیں ہوتے، اتوار کو اس طرح کی اخلاقی خرابیوں کی مثالیں زیادہ نظر آتی ہیں۔ اس لئے یہ کہنا غلط ہے کہ ان اخلاقی خرابیوں کی وجہ سینما ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ سینما بچوں کو بعض دوسری اخلاقی خرابیوں سے

بچاتا ہے۔ بہرحال یہ اور اس طرح کے بہت سے اسباب بیان کئے جاسکتے ہیں۔ لیکن حقیقت میں جو باتیں اور خارجی اثرات بچوں کی اخلاقی خرابیوں کے ذمہ دار ہیں۔ ان میں سب سے پہلا درجہ مفلسی کا ہے۔

عام طور پر مختلف قسم کی اخلاقی خرابیاں غریبوں کے بچوں میں زیادہ ہوتی ہیں۔ غریبوں اور امیروں کے بچے اپنی فطرتوں کے لحاظ سے یکساں ہوتے ہیں لیکن غریبوں کو اُن کی مجبوریاں ایسی باتیں کرنے پر مجبور کرتی ہیں، جن سے امیروں کے بچے محفوظ رہتے ہیں۔ اس لئے کہ انہیں مختلف طریقوں سے اپنی قدرتی ضروریات کے پورا کرنے کی آسانیاں حاصل ہیں۔ غریبوں کو اُن کی فطرت کچھ کرنے پر مجبور کرتی ہے تو اُن کی مفلسی سدّراہ بن جاتی ہے۔ اس لئے یہ بچے اپنی فطری ضرورت کو پورا کرنے کے لئے کسی اخلاقی جرم کے مرتکب ہوتے ہیں۔ چوری کرتے ہیں اور اس کا لازمی نتیجہ جھوٹ بولنا ہے۔

غریبی ہی سے تعلق رکھنے والی ایک دوسری وجہ یہ ہے کہ جس گھر میں آدمی زیادہ ہوتے ہیں اور رہنے سہنے کی جگہ کم وہاں کے بچوں میں بھی بہت سی اخلاقی خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔

ایک اور خاص وجہ، جو غالباً دوسری وجہوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ اہم ہے، یہ ہے کہ جن گھروں میں لوگوں کے باہمی تعلقات اچھے نہیں ہوتے۔ اُن میں بچوں کے اخلاق بہت خراب ہو جاتے ہیں اور اس میں امیر غریب کسی کی قید نہیں۔ اگر ماں باپ میں ہمیشہ لڑائی جھگڑا رہے تو بچوں پر اس کا اثر لازمی طور پر بُرا ہوگا۔ اکثر اوقات گھر میں سوتیلی ماں یا سوتیلے باپ کے ہونے کا بھی بچوں پر بہت بُرا اثر پڑتا ہے۔ اس طرح کے اکثر بچے ملیں گے جو محض محبت اور شفقت سے محروم ہو جانے کی وجہ سے اخلاقی جرائم کے مرتکب ہوتے ہیں۔ اس طرح کی مثالیں ہر شخص کو آسانی سے مل جائیں گی۔ جہاں بچوں کی اخلاقی کمزوری کا سبب اس کے سوا اور کچھ نہیں۔

اور دوسری چیز جو ہندوستانی گھروں میں بہت عام ہے یہ ہے کہ بچوں کو کافی تنبیہ نہیں کی جاتی۔ اُنہیں انتہائی لاڈ پیار سے پالا جاتا ہے۔ بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جن پر کسی مجبوری کی وجہ سے تنبیہ نہیں ہو سکی۔ مثال میں اس لڑکے کو پیش کیا جاسکتا ہے جو چوری کرنے کا بہت عادی تھا۔ آخر اس نے ایک دن جب ایک سائیکل چرائی تو وہ نفسیاتی ملاحظے کے لئے لایا گیا۔ اس کے گھر کے حالات کا پتہ لگایا گیا تو معلوم ہوا کہ اس کا باپ اُس کے بچپن میں ہی مرگیا تھا اور اس کی ماں ایک کمزور بوڑھی عورت تھی، جو کسی طرح بچے پر قابو نہ پاسکی اور اس لئے اس کی انتہائی آزادی نے اُسے خراب کر دیا۔

جس طرح تنبیہ کی کمی بچوں کے لئے خطرناک ہے، اسی طرح اس کی زیادتی بھی بے حد مہلک چیز ہے۔ اس طرح کے سینکڑوں بچوں کی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں جن کی اخلاقی خرابیوں کی ذمہ داری صرف اس وجہ پر تھی کہ ہر موقع پر اُن کے خوف کے جذبے کو بیدار کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ ایک نو برس کے بچے کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ رات کو اس طرح کے ڈراونے خواب دیکھتا تھا، جن میں ہمیشہ زہریلے سانپ اسے اپنے بدن پر لپٹے ہوئے نظر آتے تھے۔ جانچ پڑتال کے بعد معلوم ہوا کہ اس کا سوتیلا باپ اس کے ساتھ بہت سختی سے پیش آتا تھا اور یہ سانپ اُسی کی زہریلی شکل کا عکس تھے۔

جن گھروں میں بچوں سے بہت سختی کا برتاؤ کیا جاتا ہے وہاں عموماً بچے گھر سے بھاگنے کے لئے چوری کرتے ہیں۔ اس طرح کی ایک مثال پیش کی جاسکتی ہے۔ ایک مرتبہ ایک پندرہ سال کے لڑکے کو نفسیاتی معائنے کے لئے پیش کیا گیا۔ اس کا یہ جرم تھا کہ اس نے ایک نوٹ چرایا تھا اور یہ شاید اس کا پہلا جرم تھا۔ واقعات کا پتہ چلانے سے معلوم ہوا کہ وہ لڑکا جس گھر میں رہتا تھا اُس کا یہ طریقہ تھا خواہ وہ بچہ کوئی قصور کرے یا نہ کرے۔ سوتے وقت اُسے ہنٹر سے پیٹا جاتا تھا اور اس حرکت کو بجا ثابت کرنے کے لئے کہا جاتا تھا کہ اگر لڑکے نے کوئی شرارت نہیں کی ہے تو ممکن ہے کہ آیندہ اس کے دل میں کبھی شرارت کرنے کا خیال آجائے اس لئے اُسے احتیاطاً پہلے سے سزا دے دینی بہتر ہے۔ ان سختیوں سے عاجز آکر اس لڑکے نے نوٹ چرایا کہ گھر سے بھاگ کر کہیں اور پناہ لے۔

تنبیہ کی حد سے زیادہ سختی کا ایک لازمی جزو یہ بھی ہے کہ بچے کو اتنی تفریح نہ ملے جس کی اُسے فطرتاً ضرورت ہے۔ مثال کے لئے ایک سولہ برس کے لڑکے کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ اس بچے کے والدین بہت غریب، سادہ مزاج اور معمولی آدمی تھے۔ یہ لڑکا بھی محنت مزدوری کرتا تھا۔ اس کے والدین اس سے اس کی کمائی کی پائی پائی لے لیتے تھے۔ اس لڑکے کی عمر کا تقاضا یہ تھا کہ اس کی جیب میں ہر وقت کچھ پیسے کھنکتے

رہیں۔ کبھی وہ سینما جاسکے۔ کبھی سگریٹ خرید کر پی سکے۔ لیکن جب اس کی یہ خواہشات پوری نہیں ہوئیں تو اس نے چوری شروع کی۔ اور یونہی کام چلاتا رہا۔

ایک اور وجہ بیکاری بھی ہو سکتی ہے یا ایسی ملازمت جو طبیعت کے منافی ہو۔ مثلاً ایک لڑکے کا ذکر ہے کہ اس کی ماں نے عاجز آکر اُسے طعنہ دیا کہ وہ کچھ کام نہیں کرتا اور مفت کی روٹیاں توڑتا ہے۔ لڑکے نے نوکری کی تلاش کی۔ جب نہیں ملی تو کہیں سے کچھ روپے چوری کر لایا۔ اور ماں کو لاکر دئیے کہ یہ میری پہلے ہفتے کی مزدوری ہے۔

اسی طرح ایک سترہ برس کی لڑکی کا واقعہ ہے کہ جب وہ مدرسے سے نکلی تو اس نے کہا کہ کسی گھر میں ملازمہ کا کام کروں گی۔ گھر والوں نے اس کام کو ذلیل سمجھ کر اُسے ایک کارخانے میں نوکر رکھوا دیا۔ کارخانے کی نوکری اسے بالکل پسند نہیں تھی۔ اس لئے اس نے ایک دن اُسے چھوڑ دیا۔ لیکن وہ یہ بات گھر میں نہیں بتانا چاہتی تھی اس لئے اس نے چوری کرنی شروع کی تاکہ گھر والوں کو نوکری چھوڑنے کا حال نہ معلوم ہونے پائے۔

بچوں کی اخلاقی کمزوریوں کی جو خارجی وجہیں بیان کی گئیں ان کے علاوہ بھی بہت سی وجہیں ہو سکتی ہیں۔ لیکن یہ بہت خاص خاص ہیں اور قریب قریب سب ایسی ہیں جنہیں آسانی سے دور کیا جاسکتا ہے۔ لیکن ان خارجی وجوہ کے علاوہ، کچھ داخلی اسباب بھی ہیں، جن کا اس جگہ ذکر کردینا ضروری ہے۔ صرف داخلی وجوہ کسی کی اخلاقی کمزوریوں کے ذمہ دار نہیں ہو سکتے۔ انسان کا ماحول، اور اس کے بُرے اثرات اُسے اُسی صورت میں زیادہ متاثر کریں گے۔ جب اس میں خود کمزوریاں موجود ہوں۔ مضبوط انسان ماحول کے اثرات کا مقابلہ کرسکتا ہے حقیقت میں انسان ماحول کو بدلتا ہے۔ نہ کہ انسان کو ماحول۔ ماحول انسان کا پیدا کیا ہوا ہے، اور اس لئے اسے اس پر قادر ہونا چاہئے۔ اگر کسی صورت میں ماحول غالب آجاتا ہے تو یہ انسان کی کمزوری کی دلیل ہے۔ اس سلسلے میں ایک دلچسپ واقعہ بیان کردینا بے محل نہ ہوگا ـــــ

ایک چھوٹی لڑکی نے اپنے بھائی کی ناک دانتوں سے کاٹ کھائی۔ اس کی ماں اس پر بہت خفا ہوئی اور کہا کہ شاید تیرے پیٹ میں شیطان گھسا ہوا تھا جس نے تجھ سے ایسی حرکت کرائی۔ لڑکی بولی "نہیں، ممکن ہے کہ شیطان نے میرے غصے کو ابھارا ہو لیکن بھائی کی ناک کاٹنے کا خیال بالکل میرا ہی ہے"۔

اس لئے کسی بچے کی کسی شرارت یا اخلاقی کمزوری کی صحیح وجہ جاننے کے لئے، اُس کی دماغی کیفیتوں کا مفصل مطالعہ بھی ضروری ہے خصوصاً اس کی ذہانت کی صحیح مقدار کا معلوم ہونا بے حد ضروری ہے اس لئے کہ اول تو اس قسم کی حرکتوں پر کُند ذہن ہونے کا بھی اثر پڑتا ہے۔ اور عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ اس طرح کے جتنے بچے نفسیاتی معائنے کے لئے لائے گئے، وہ کند ذہن، ضرور تھے۔

کُند ذہن ہونے سے زیادہ، جو چیز اس قسم کی حرکتوں پر اثر ڈال سکتی ہے، وہ کسی خاص جبلّت کی انتہائی قوت ہے۔ خاص طور پر جنسی جذبہ کی قوت کی زیادتی بہت سی اخلاقی بدعنوانیوں کی ذمہ دار ہوتی ہے ایسے موقعوں پر سختی سے کام لینا کوئی اچھا علاج نہیں۔ کوشش یہ کرنی چاہئے کہ فطری جبلّت کے لئے نئی اور اچھی راہیں پیدا کی جائیں۔ اس کے اظہار کے راستے میں رکاوٹ پیدا کرنا اور بھی مضر ہے۔

کبھی صرف ایک جبلّت کی قوت نہیں، بلکہ مجموعی حیثیت سے سب جبلّتوں کی قوت مل کر بہت زیادہ تیز ہوتی ہے۔ مثلاً ایک سولہ برس کی لڑکی ہر قسم کی اخلاقی بدعنوانی جس کا تصور ہو سکتا ہے اور جو تصور میں بھی نہیں آسکتی۔ کر چکی تھی۔ چوری، لڑائی جھگڑا، فحاشی، غرض ہر قسم کے عیب اس میں شدت کے ساتھ موجود تھے۔ اس قسم کی مثالیں کم ہوتی ہیں، اور ان کی اصلاح بھی قریب قریب ناممکن ہوتی ہے۔

اس سلسلے میں، بچوں کی غلط بیانیوں اور جھوٹ بولنے کی عادت کا ذکر کردینا بھی بے محل نہ ہوگا۔ اس لئے کہ ممکن ہے کہ لوگ جھوٹ کو ہمیشہ کسی نہ کسی نفسیاتی اصول کے تحت میں لانے کی کوشش کریں۔ بچوں کے جھوٹ کو ہمیشہ زیادہ شبہ یا خطرہ کی نظر سے دیکھنے کی ضرورت نہیں، اس لئے کہ بچوں کے اکثر جھوٹ صرف تخیل کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ چونکہ بچے حقیقت کی دنیا کا مقابلہ کامیابی اور اعتماد کے ساتھ نہیں کرسکتے۔ اس لئے وہ اس کمی کو اپنے جھوٹ سے پورا کرتے ہیں۔ اُن کے جھوٹ میں اور افسانوں میں کوئی فرق نہیں۔ دونوں چیزیں کسی بُری نیت سے نہیں کی جاتیں۔

بچے عموماً ایسے موقعوں پر بھی جھوٹ بول دیتے ہیں، جب ان سے سوال کرنے والا سختی کا لہجہ اختیار کرتا ہے۔ خوف کی وجہ سے غیر ارادی طور پر بھی جھوٹ منہ سے نکل جاتا ہے۔ اس قسم کے جھوٹ بھی

قابلِ ستائش نہیں کہے جا سکتے۔ لیکن ان کی ذمہ داری اکثر استاد یا والدین پر ہوتی ہے۔ اس لئے کسی بچے پر اس وقت تک کوئی الزام نہیں لگانا چاہئے۔ جب تک اس کا پورا ثبوت نہ موجود ہو اگر بچے سے کچھ پوچھا گیا اور اس نے اس کا غلط جواب دے دیا اور سننے والا اس کی مناسب تردید نہ کر سکا تو اس سے بچے پر بُرا اثر پڑے گا اور وہ آیندہ بھی جھوٹ کو اپنے بچاؤ کا ایک یقینی ذریعہ سمجھے گا۔

ایک دوسری قسم کا جھوٹ جس کے بچے بہت عادی ہوتے ہیں، وہ ہے، جس کے ذریعے سے اپنے کسی ساتھی کا عیب چھپانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس سے جھوٹ بولنے والے کو تو کوئی نقصان نہیں پہنچتا لیکن استاد اور شاگرد کے رشتے میں فرق آجاتا ہے اس لئے ایسے جھوٹ کو بھی جہاں تک ممکن ہو کم کرنا چاہئے اور اس کا طریقہ یہی ہے کہ استاد یا والدین بچے سے شفیقانہ تعلق رکھیں۔

ان جھوٹوں کے علاوہ، بچے واقعی اس طرح کے جھوٹ بولنے کے بھی عادی ہوتے ہیں، جن کا مقصد دھوکا دینا یا کوئی خاص فائدہ اٹھانا ہوتا ہے۔ ایسے جھوٹ بے حد خطرناک ہیں اور بچے کو ان کا عادی نہیں ہونے دینا چاہیئے۔ لیکن اس موقع پر بھی سختی سے کام نہیں لیا جا سکتا۔ اس لئے ضرورت ہے کہ جو والدین یا استاد بچوں کو واقعی سچ بولنے کا عادی بنانا چاہتے ہیں، وہ اول تو انہیں کبھی دھوکا نہ دیں اُنکے سامنے جھوٹ کبھی مذاق میں بھی نہ بولیں۔ اور دوسرے یہ کہ اُن کے دل میں اپنی محبت اور اعتماد پیدا کریں۔

بچوں کے دل میں محبت اور بھروسہ پیدا کرنے کی ایک بہت عمدہ مثال انگلستان کے مشہور ماہرِ نفسیات ہومر لین کے ایک واقعے سے پیش کی جا سکتی ہے۔ لیکن اس کے بیان کرنے سے پہلے یہ بتا دینا ضروری ہے کہ لین نے لٹل کامن ولتھ (ننھی جمہوریت) کے نام سے ایک ادارہ قائم کر رکھا ہے جہاں اس طرح کے بچوں کی تربیت ہوتی ہے اور لین بچوں کو انتہائی آزادی دے کر انہیں فطرت کے مطابق زندگی بسر کرنے کا موقع دیتا ہے اور اُن کے دلوں میں اپنی طرف سے محبت اور بھروسہ پیدا کرتا ہے۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک لڑکا اس کے مدرسے سے بھاگ گیا۔ لین نے اس کا پیچھا کیا اور اسے پکڑ لیا۔ لڑکا اس سے پہلے اس بات کا عادی تھا کہ ہر ایسے موقع پر اس کے ہاتھ باندھ دیئے جائیں۔ اس لئے اس نے فوراً اپنے ہاتھ پھیلا دیئے۔ لین مسکرایا اور اس کے ہاتھ میں ایک سونے کا سکّہ دے دیا۔ لڑکا کسی قدر سہم کر بولا کہ "یہ کس لئے؟" لین نے محبت بھرے لہجے میں کہا "پیدل جانے کی ضرورت نہیں ریل پر اپنے گھر جاؤ"۔ وہ لڑکا اسی رات لین کے مدرسے میں واپس آگیا۔

اس لئے ہر جگہ ضرورت ہے کہ استاد اور والدین محبت کے جذبے کو کام میں لاکر بچوں کی کمزوریاں دور کرنے کی کوشش کریں اور اس لئے یہ بھی ضرورت ہے کہ ہومر لین کے کامن ولتھ جیسے ادارے ہر جگہ قائم کئے جائیں۔ اس سے ملک کا ایک اہم مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔

سید وقار عظیم

غزل

کتنی پُرکیف رات تھی وہ بھی
مست تھا میں بھی، چاند بھی، وہ بھی

ہر ستارہ کہ ماہیٔ بے آب
ماہیٔ موجِ بے خودی، وہ بھی

ساز تھا چاند یا کہ چاند تھا ساز
راگنی تھی کہ چاندنی، وہ بھی

جاں لبوں پر تھی، دل تھا پلکوں پر
یاد ہے اپنی زندگی وہ بھی

خوں برستا تھا ہر سرِ مُو سے
خوں کہاں تھا تھی آگ ہی، وہ بھی

شام وہ شام اور سحر وہ سحر
موجِ بے تاب وہ بھی تھی، وہ بھی

کشتِ شاداب آرزوؤں کی
برقِ آپ اپنی بن گئی وہ بھی

جھلملاتی ہے ایک شمعِ خیال
ایسے جیسے کہ اب بُجھی وہ بھی

زمزمہ ہے کہ مرثیہ تنویرؔ
ایک ہچکی ہے آخری، وہ بھی

روشن دین تنویر

غزل

رات پھر آئے گی کبھی وہ بھی — دل تھا پہلو میں اور تھی، وہ بھی
دل تو پہلے ہی کھو چکے تھے ہم — جان باقی تھی، لو، چلی وہ بھی
شمعِ امید اِک سہارا تھی — کوئی دم جل کے بجھ گئی وہ بھی
بزمِ جمشید سے یہ جامِ سفال — ہاتھ آیا ہے اور تہی وہ بھی
میری پُر درد داستانِ الم — سُن کے رویا کئے سبھی، وہ بھی
تُو مِری اور میں ترا ہوتا — اِک یہ خواہش تھی اور کبھی وہ بھی
اُف قیامت پہ کیا قیامت ہے — وہ نظر اور جُھکی جُھکی وہ بھی
رات محفل میں ہو گیا محشر — ساتھ ساتھ اُٹھے درد بھی، وہ بھی

موت تو آگئی ہے اے شاہد
کاش آجائے اِس گھڑی وہ بھی

مسعود شاہد

خمیازہ

بی۔اے کا آخری سال تھا اور امتحان کے بعد گرمیوں کی تعطیل گذارنے کی غرض سے پونا سے میں سیدھا حیدرآباد چلا گیا، ویسے تو حیدرآباد میں بھی کافی گرمی ہوتی ہے مگر خالہ جان کے کئی سال کے متواتر اصرار سے مجھے مجبوراً ایسا کرنا پڑا، شہر کے جس حصے میں ہم لوگ رہتے تھے۔ وہ اگرچہ ذرا غیرآباد تھا مگر اپنی خوبصورتی اور شستگی کے باعث ایک امتیازی درجہ رکھتا تھا۔ اور یہاں صرف وہی لوگ رہائش رکھتے تھے جو یا تو شہر کے بڑے بڑے تاجروں میں سے تھے یا جنہیں سرکار عالی سے معقول تنخواہیں اور وظیفے ملتے تھے۔

میں چونکہ پونا میں سکولوں اور کالجوں کے ہنگامہ خیز ماحول کا عادی تھا۔ اس لئے سوسائٹی کے بغیر میری حالت اس مچھلی کی سی تھی جسے پانی سے باہر خشکی پر چھوڑ دیا گیا ہو، خالو جان کی یہ حالت کہ دن بھر دفتر میں رہتے اور شام کو کلب میں، مگر چونکہ تعلقات وسیع تھے اس لئے ہر قسم کے لوگوں سے ملنے میں آسانی تھی۔ اور ایک ہفتے کے اندر اندر میں بھی کلب کا ممبر بن گیا۔

ایک روز شام کو بہت جلد گھر واپس آ گیا۔ اور ٹینس کا ریکٹ ہاتھ میں لئے ہوئے تیزی سے اپنے کمرے میں داخل ہوا۔ مجھے وہم و گمان بھی نہ تھا کہ میری غیر حاضری میں کوئی میرے کمرے میں داخل ہو کر اس بے باکی سے اُس کا جائزہ لے رہا ہوگا۔ دروازے میں داخل ہوتے ہی میں ٹھٹھک کر رہ گیا۔

وہ ہلکے آسمانی رنگ کی ساڑی میں ملبوس تھی، پاؤں میں پیٹنٹ لیدر کا خوشنما سینڈل، ہاتھوں میں پتلی پتلی زرّیں چوڑیاں ساڑی سر سے ڈھلک کر کاندھے پر آ رہی تھی اور ایک ہاتھ ریحانہ کے سر پر رکھے ہوئے میری تصویر کا بغور مطالعہ کر رہی تھی، تصویر میں نے چلنے سے قبل پونا میں کھچوائی تھی اور کافی بڑی تھی۔

"تو یہ تمہارے بھائی ہیں؟" اس نے ریحانہ سے پوچھا۔

ریحانہ بمشکل پانچ چھ سال کی تھی، اُس نے اپنی حیثیت کے مطابق سر ہلا کر اثبات میں جواب دیا۔

"ان کا نام کیا ہے؟" اس نے دوبارہ پوچھا

"بھیا اسرت (عشرت)" اُس نے توتلی زبان سے جواب دیا۔

"اچھا — تو یہ کونسے کالج میں پڑھتے ہیں؟" اس نے دوبارہ پوچھا۔

ریحانہ بے چاری کے فرشتوں کو بھی خبر نہ تھی کہ ہم کہاں اور کونسے کالج میں پڑھتے تھے، وہ کچھ سوچ میں پڑ گئی۔

اب میری باری تھی، موقعے کو غنیمت جان کر میں آگے بڑھا اور کسی قدر ڈرامائی انداز سے گویا ہوا۔

"اگر بارِ خاطر نہ ہو تو — میں بتا دوں۔"

وہ تیزی سے میری طرف پلٹی، اس کے چہرے پر گھبراہٹ اور حجاب کی ایک عجیب آمیزش تھی، اور قبل اس کے کہ میں کچھ اور کہوں وہ جھپٹ کر خالہ جان کے کمرے کی طرف بھاگ گئی۔

میں ریحانہ کو گود میں اٹھا کر پیار کرنے لگا، میرے اعضا خوشی سے کانپ رہے تھے۔ لیمپ کی سبز روشنی میں کمرے کی ہر چیز پہلے سے زیادہ دلکش اور حسین نظر آ رہی تھی۔ ریحانہ اپنی گڑیا کو گود میں لئے ہوئے تھی۔

"ریحانہ یہ کون ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"خورشید آپا" اس نے جواب دیا۔

"کہاں رہتی ہیں؟" میں نے ذرا جھجکتے ہوئے پوچھا۔

"وہ سامنے والے بنگلے میں" ریحانہ نے انگلی سے سامنے اشارہ کیا۔

میں سوچنے لگا، آخر یہ کون ہو سکتا ہے، مجھے آئے تقریباً دو ہفتے ہو چکے تھے۔ مگر میں نے اُسے کبھی بھی نہیں دیکھا تھا۔ اگر خالہ کے یہاں اس کی پہلے ہی سے آمد و رفت ہے تو پھر اتنے دن وہ کہاں رہی؟ میں اپنے خیالات میں اس قدر محو تھا کہ مجھے اپنے گرد و پیش کی بھی خبر نہ رہی۔

"یہ اپنے یہاں ہمیشہ آتی ہیں"؟ میں نے ریحانہ سے دوبارہ پوچھا۔

"ہاں!" اس نے گڑیا کے کپڑوں کو درست کرتے ہوئے کہا۔

"تو پھر اتنے دن تک کہاں تھیں"؟ میں نے بے صبری سے پوچھا۔
ریحانہ غریب سوچ میں پڑ گئی۔

"اگر بار خاطر نہ ہو تو میں بتادوں" میری پشت کی جانب سے ایک شیریں آواز سنائی دی۔ میں تیزی سے پلٹا مگر میرے جواب دینے سے پہلے وہ جا چکی تھی۔

میں نے ریحانہ کی طرف دیکھا، وہ اپنی گڑیا کے بالوں کو سنوار رہی تھی۔ صرف پانچ منٹ کے عرصے میں دو دلوں میں جو انقلاب برپا ہو گیا تھا ریحانہ اس سے اتنی ہی بے پروا تھی جتنی ریحانہ کی گڑیا ریحانہ سے۔

میں جلد جلد لباس تبدیل کر کے خالہ کی طرف چل دیا، باورچی خانے میں وہ ماما کو کچھ ہدایات دے رہی تھیں۔ مجھے خلافِ معمول جلدی آتا دیکھ کر وہ خود میری طرف بڑھیں۔

"بڑی جلدی آ گئے عشرت، کیا کلب میں جی نہیں لگا"؟ انہوں نے میرے خوشی سے تمتمائے ہوئے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

نہیں خالہ جان ایسا نہیں ہیں ——— میرے ساتھی آج سینما گئے ہوئے ہیں۔ اس لئے میں جلد چلا آیا۔" میرے ہونٹ کانپ رہے تھے، میں کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا اور خالہ تکیوں کے غلاف بدلنے لگیں،

"یہ غلاف کتنا خوب صورت ہے"۔ انہوں نے غلاف چڑھاتے ہوئے کہا۔

میں اُسے بغور دیکھنے لگا، غلاف واقعی بنانے والے کی چابکدستی اور سلیقہ شعاری کا بہترین نمونہ تھا، درمیان میں قرمزی رنگ کے دھاگے سے Sweet dreams (خوابِ شیریں) کاڑھا ہوا تھا۔

"قیمت تو اس کی بہت ہو گی خالہ جان" میں نے غلاف کو بہت دیر تک دیکھنے کے بعد کہا۔

"قیمت ہ——— کیوں نہیں! اتنی اچھی چیز جس قیمت پر بھی ملے سستی ہے"۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا، میں ان کا مطلب نہیں سمجھا۔

"مگر یہ بازار سے نہیں خریدا گیا ہے"۔ انہوں نے میری پریشانی کو دور کرتے ہوئے کہا۔ "یہ خورشید کے ہاتھوں کا بنایا ہوا ہے، خورشید بیچاری بڑی نیک اور محنتی لڑکی ہے"۔

"کون خورشید"؟ میں نے تجاہلِ عارفانہ سے کام لیتے ہوئے پوچھا۔

"ارے ہاں! میں تو تم سے اس کا تذکرہ کرنا ہی بھول گئی"۔ انہوں نے عذر خواہی کے انداز میں جواب دیا "ابھی دو منٹ ہوئے وہ یہاں آئی تھی، پندرہ بیس روز ہوئے وہ اپنی ماں کے ساتھ اورنگ آباد گئی تھی۔ بڑی نیک بچی ہے، ویسے تو اس کے والدین بڑے مالدار ہیں اور اکلوتی لڑکی بھی ہے مگر طبیعت میں تکبر یا غرور نام کو نہیں، بمبئی اور حیدرآباد میں اُن کی کپڑے کی بڑی بڑی دکانیں ہیں، کشیدہ کاری میں اس قدر مہارت ہے کہ جو کچھ چاہو بنوا لو۔ مجال ہے کہ ذرّہ برابر فرق آ جائے"۔

میرا دل نہ جانے کیوں آپ ہی آپ دھڑک رہا تھا، مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کوئی بہت بڑا خزانہ ہاتھ آ گیا ہے، اس سے ملنے اور بات کرنے کی خواہش میرے دل میں بار بار چٹکیاں لینے لگی، کالج میں روزانہ میں بیسیوں لڑکیوں سے ملتا، بات چیت کرتا اور ہر قسم کی بے تکلفی بھی برتتا مگر میرا دل اُن میں سے کسی کو بھی دیکھ کر نہیں دھڑکا، اُن میں سے کسی سے بھی دوبارہ ملنے اور بار بار باتیں کرنے کی خواہش میرے دل میں پیدا نہیں ہوئی۔ میں خورشید کی طرف کھنچا جا رہا تھا، یہ سب مجھے ایک طلسم معلوم ہو رہا تھا ——— بہجت افزا طلسم!

اُس روز سے میں زیادہ تر خالہ کے کمرے میں رہنے لگا، چائے پینے یا اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بہانے میں گھنٹوں اُن کے پاس بیٹھا رہتا۔

ایک روز میں بیٹھا ہوا کتاب پڑھ رہا تھا اور خالہ باورچی خانے میں چائے تیار کر رہی تھیں کہ اتنے میں خورشید آ گئی۔ مگر مجھے دیکھ کر ٹھٹک گئی، میں اٹھ کر اپنے کمرے میں جانے ہی والا تھا کہ خالہ چائے کی پیالی لئے ہوئے اندر آئیں اور مجھے جاتے ہوئے دیکھ کر کہنے لگیں۔

"عشرت بیٹھو جانے کی کوئی ضرورت نہیں اور خورشید تم اب اس سے کب تک حجاب کرتی رہو گی! آخر یہ بھی تو میرا ہی لڑکا ہے پھر اپنے بھائی سے حجاب کیسا"!

خورشید نے کنکھیوں سے مجھے دیکھا اور میں نے بھی اپنی نظریں اُس کی طرف پھیر دیں، وہ مسکرائی اور میں دوبارہ بیٹھ گیا۔

خورشید کا معمول تھا کہ گھر کا کام ختم کر کے فوراً خالہ کے پاس چلی آتی اور سوئی دھاگہ لے کر کشیدہ کاری میں مشغول ہو جاتی۔

ایک دن خالہ کے پیر میں کچھ درد کی شکایت تھی جس سے وہ بار بار اُٹھ نہ سکتی تھیں۔ ماما باورچی خانے میں مصروف تھی اور چائے کا وقت ہو چکا تھا۔ خالہ نے خورشید سے چائے بنانے کو کہا، وہ اپنا سوئی دھاگہ رکھ کر فوراً چلی گئی

بنانے میں مصروف ہوگئی۔ معلوم ہوتا تھا، وہ اس حکم کی برسوں سے منتظر تھی، اس کے چہرے پر خوشی کی جھلک نمایاں تھی، چائے تیار کرکے اس نے ایک پیالی خالہ کی طرف بڑھائی خالہ نے پیالی لیتے ہوئے کہا۔

"اور عشرت کیا ہمارا منہ تکے گا؟"

"انہیں بھی مل جائے گی"، خورشید نے لجاتے ہوئے میری طرف دیکھ کر کہا۔ آخر وہ چائے لے کر آ گئی، میں کتاب کو برائے نام منہ کے سامنے تھامے رہا۔

"چائے ——" اس سے زیادہ وہ کچھ نہ بول سکی۔

"اوہ! معاف فرمائیے! تکلیف ہوئی، شکریہ!" میں نے کتاب رکھتے ہوئے کہا پیالی لیتے وقت میری انگلی اس کے ہاتھ سے چھو گئی اور بجلی کی ایک رو میرے بدن میں دوڑ گئی، میں نے آنکھیں اوپر اٹھائیں، خورشید کی شفاف اور پنکھڑیوں جیسی نرم و نازک پیشانی پر پسینے کے باریک باریک قطرے شبنم کی طرح دمک رہے تھے۔

میں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے چائے ختم کی اور اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف جانے لگا۔

"پان کھاؤ گے عشرت؟" خالہ جان نے ایک گلوری منہ میں دباتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں خالہ" میں نے جلدی سے کہا

"کیوں کھاؤ گے! انگریزی پڑھنے والے پان کیوں کھانے لگے" انہوں نے طنزاً کہا، کوئی جواب نہ دیتے ہوئے میں اپنے کمرے میں واپس آ گیا۔

اس کے بعد خورشید اکثر اس تاک میں لگی رہتی کہ خالہ جان کہیں اور وہ چائے بنائے، بعض مرتبہ تو وہ بغیر کہے بھی وقت ہونے پر آپ ہی آپ اُٹھ کھڑی ہوتی اور چائے بنانے لگتی۔

ایک روز چائے ختم کرنے کے بعد وہ خود پان بنانے لگی، ایک گلوری خالہ کی طرف بڑھاتے ہوئے اس نے معنی خیز نگاہوں سے میری طرف دیکھا، میں مسکرایا،

"خالہ جان! مدت سے ہمارے آباؤ اجداد پان کھاتے چلے آئے ہیں۔ اور ہندوستان کے بڑے بڑے لوگ اس کے گن گاتے ہیں۔ آج میں بھی تو دیکھوں کہ اس میں آخر کون سی ایسی خوبی ہے"۔ میں نے کنکھیوں سے خورشید کی طرف دیکھتے ہوئے کہا،

"ہاں ہاں ضرور! بیٹی خورشید ایک گلوری اسے بھی تو دینا" خالہ نے جلدی سے کہا۔

میں فاتحانہ انداز سے اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا، اس نے شرما کر اپنا سر جھکا لیا اور پان بنانے لگی۔

اب میرا نام بھی باقاعدہ پان کھانے والوں کی فہرست میں درج ہو چکا تھا اور کیوں نہ ہوتا۔ میں ایسا بے ذوق تو تھا نہیں کہ خورشید پان بنائے اور میں نہ کھاؤں۔

ہم لوگوں میں اب کچھ بے تکلفی پیدا ہو گئی تھی، خورشید بلا کی ذہین اور طباع تھی، اُس نے مجھے بتایا کہ اس کی تعلیم انٹرنس تک ہو چکی ہے اور وہ کالج میں بھی داخل ہونا چاہتی تھی مگر اُس کے والدین رضامند نہیں ہوئے۔ خورشید کو مطالعے کا بے حد شوق تھا۔ اردو ادب کی بیشتر اصلاحی اور معاشرتی کتابیں اس کے مطالعے سے گذر چکی تھیں جس کی وجہ سے اس کا مذاق اور بھی پاکیزہ و ارفع ہو گیا تھا، خورشید میں شوخی اور ظرافت کوٹ کوٹ کر بھری تھی، وہ اکثر مردوں کی بے جا آزادی پر طنز کیا کرتی، مگر اس کے الفاظ میں حقارت کا شائبہ بھی نہ ہوتا، صنفِ نازک کی افسوسناک بے بسی پر وہ کبھی کبھی بہت دیر تک بحث کرتی رہتی۔

ایک روز میں، خالہ اور ریحانہ بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے، میری کامیابی کے بعد ایک شاندار پارٹی کا پروگرام مرتب ہو رہا تھا، یکایک ریحانہ نے کہا۔

"امی اب کی ہم ایلورا چلیں گے۔ کئی روز سے ہم وہاں نہیں گئے"۔

"ایلو! اتنی جلدی ہی بھول گئی، ہمارے خورشید کی منگنی ہوئی تھی جب ہی تو ہم وہاں گئے تھے ابھی چھ مہینے بھی تو نہیں ہوئے"! خالہ نے ہنستے ہوئے کہا،

مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے دہکتا ہوا انگارہ میرے دل پر رکھ دیا ہو۔ "خورشید کی منگنی" اور "چھ مہینے بھی تو نہیں ہوئے"۔ یہ تھے وہ الفاظ جو تیر کی طرح میرے سینے کو چیرتے ہوئے دل کی گہرائی میں پیوست ہو گئے، میرا سر چکرایا اور میں لڑکھڑاتا ہوا اپنے کمرے میں آ گیا۔

میرا عظیم الشان مستقبل، میرے تمام منصوبے تاش کے قلعے کی طرح زمین پر آ رہے۔

نتیجے کو صرف ایک ہفتہ رہ گیا اور میری یہ حالت کہ ایک ایک لمحہ وبال جان بن رہا تھا۔ رات رات بھر جاگتا رہتا، دل بہلانے کی بہتیری کوشش کی لاحاصل۔ کلب جاؤں تو گھر آنے کی خواہش ہوتی اور گھر ہوتا تو وہاں سے بھاگ جانے کو جی چاہتا۔ آخر میں نے فیصلہ کر لیا کہ کچھ بھی ہو مجھے فوراً یہاں سے چلے جانا چاہئے۔ میں خالہ کے پاس گیا اور کہنے لگا۔

خالہ جان، ابھی ابھی میرے ایک عزیز دوست کا خط آیا ہے اُن کی شادی ہو رہی ہے اور میرا وہاں جانا ضروری بلکہ نہایت اہم ہے۔ میں آج ہی شام کی گاڑی سے چلا جاؤں گا، انشاء اللہ آیندہ چھٹیوں میں پھر آؤں گا"

پہلے تو خالہ ٹالتی رہیں مگر میری تصنّع آمیز گھبراہٹ کو دیکھ کر رضامند ہو گئیں۔

اُف کتنا روح فرسا منظر! خورشید اس روز کئی مرتبہ میرے کمرے میں آئی مگر میں جان بوجھ کر خالہ کے گرد منڈلاتا رہا۔ چلتے وقت جب میں اسباب دیکھنے کے لئے کمرے میں داخل ہوا تو دروازے پر خورشید سے مڈبھیڑ ہو گئی، وہ میرے پیر کی آہٹ سن کر گھبرائی ہوئی کمرے سے باہر نکل آئی تھی:

"اچھا خورشید اب میں جاتا ہوں، کبھی کبھی غلام کو بھی یاد کر لیا کرنا" میں نے بہ دقت تمام جملہ پورا کیا، وہ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر جذبات پر قابو نہ پا سکی اُس کے ہونٹ پنکھڑیوں کی طرح لرز رہے تھے، آخر وہ خاموش اپنے بنگلے کی طرف چلی گئی۔

میں اسٹیشن پر آ گیا مگر یہ تو معلوم ہی نہ تھا کہ مجھے کہاں جانا ہے۔ کبھی سوچتا پونا چلا جاؤں پھر خیال ہوتا وہاں چھٹیوں میں خاک اڑ رہی ہوگی، کیوں نہ بمبئی چلا جاؤں، دو ایک دوست پہلے ہی سے وہاں موجود ہیں۔ شاید طبیعت بہل جائے اور پھر بمبئی کی ہماہمی اور چہل پہل—— آخر میں نے بمبئی کا ٹکٹ کٹوایا اور گاڑی میں بیٹھ گیا۔ بہت دیر تک خیالات سے پریشان رہا۔ آخر اپنا غم غلط کرنے کی غرض سے دیوان غالب سوٹ کیس سے نکالا اور پڑھنے لگا،

جوں ہی کتاب کھولی ایک ہلکے نیلے رنگ کا چھوٹا سا ریشمی رومال کتاب سے نکل کر میرے زانو پر آ رہا، میں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اُسے اُٹھایا اور کھول کر دیکھنے لگا، رومال کے اندر ایک خوشبودار رنگین کاغذ کا ٹکڑا نہایت احتیاط سے رکھا ہوا تھا۔ جس پر خورشید کے دلآویز ہاتھوں کی ایک مختصر تحریر یہ تھی "خدا حافظ" رومال کے کنارے خوشنما رنگین دھاگوں سے پھول کی بیل بنی ہوئی تھی، اور بیچ میں سیاہ حروف میں لکھا تھا۔ Forget-me-not (مجھے بھولئے نہیں)

میرے دل میں جیسے کسی نے نشتر چبھو دیا، ایک غیر ارادی طور پر میرا سر رومال پر جھکا، لب الفاظ سے پیوست ہو گئے اور آنکھوں سے آنسو ڈھلک آئے۔

نتیجہ شائع ہو گیا اور میں کامیاب بھی ہو گیا، والدین کی مرضی تھی کہ میں اپنی تعلیم جاری رکھوں، مگر میرا دل تعلیم بلکہ دنیا کی ہر ایک چیز سے اُچاٹ ہو چکا تھا بہرحال والدین کی خوشنودی میرا فرض تھا اور میں بجائے پونا کے بمبئی جا کر ایم۔ اے اور لا کی جماعتوں میں داخل ہو گیا۔

کالج کی پہلی ٹرم جس بے چینی سے گذری اُس کا تذکرہ لاحاصل ہے۔ چھٹی شروع ہونے کے ایک دو روز قبل میرے دل میں خورشید کو دیکھنے کا ایک بے پناہ جذبہ موجیں مارنے لگا، میں نے بہت کوشش کی کہ اب دوبارہ وہاں نہ جاؤں اور اسی لئے چھٹی ہوتے ہی سیدھا پونا چلا گیا مگر وہاں پہنچ کر ایسا معلوم ہوا کہ میں خود بخود خورشید کی طرف کھنچا جا رہا ہوں، ایک رات میں سچ مچ ٹرین میں بیٹھا ہوا حیدرآباد جا رہا تھا۔

میری غیر متوقع آمد پر خالہ متعجب ہوئیں۔

"ارے عشرت! بغیر اطلاع دئیے کیسے چلے آئے اور تمہاری حالت کیا ہو رہی ہے؟ بیمار رہتے ہو کیا؟" انہوں نے میرے خشک چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

"ہاں خالہ، بمبئی کی ہوا کچھ راس نہیں آئی" میں نے ٹالتے ہوئے کہا، غسل وغیرہ سے فارغ ہو کر ہم لوگ ناشتے کے لئے بیٹھ گئے، میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا، کیا خورشید کے متعلق میں براہ راست خالہ سے سوال کروں یا پھر تنہائی میں ریحانہ سے پوچھنا چاہئے۔ میں اسی کشمکش میں مبتلا تھا کہ خالہ خود کہنے لگیں۔

"اور ہاں تم خورشید کی شادی میں کیوں نہیں آئے وہ بے چاری تم کو بہت یاد کرتی تھی۔ شادی کا خط تو تمہیں پونا کے پتے پر بھیج دیا گیا تھا، بلا تو ضرور ہو گا؟"

"پونا! مگر میں تو اب کی بمبئی کے کالج میں پڑھ رہا تھا" میں نے بظاہر تعجب سے پوچھا۔

"مگر ہمیں اس کی کیا خبر؟ تم نے کوئی خط بھی تو نہیں لکھا" انہوں نے چائے پیالی میں ڈالتے ہوئے کہا، پھر ذرا ٹھہر کر بولیں۔

عجیب پریشانی تھی اُس وقت، تمہارے جانے کے ایک ماہ بعد ہی منگنی بھی ہوئی اور شادی بھی، خورشید بہتیرا کہتی رہی کہ شادی چند ماہ کے لئے ٹال دی جائے مگر اس کے والدین رضامند نہیں ہوئے اور پھر دولھا والے بھی تو ہاتھ دھو کر پیچھے پڑے ہوئے تھے"

"میرے جانے کے ایک ماہ بعد منگنی؟ ــــ مگر خورشید کی منگنی تو اس سے پہلے ہو چکی تھی؟ آپ ہی نے تو کہا تھا ــــ؟" میں نے بے تاب ہو کر پوچھا۔

"میں نے کہا تھا؟ ــــ ہاں ہاں ٹھیک ہے میں نے ہی کہا تھا ــــ مگر وہ تو اُس کی پہلی منگنی تھی" انہوں نے بے پروائی سے جواب دیا۔

"پہلی منگنی؟" میں نے ہمہ تن گوش ہو کر سوال کیا۔

"ہاں بیٹا! خورشید جتنی نیک ہے اتنی ہی بدنصیب بھی تو ہے، ڈیڑھ سال پہلے اُس کی منگنی ہوئی تھی، مگر منگنی کے ایک ہی ہفتے بعد حیدرآباد میں بڑے زور کی طاعون پھیلی۔ اور اس کا منگیتر بیچارا دیکھتے دیکھتے دو دن کے اندر چل بسا" خالہ نے ہمدردی کے لہجے میں کہا۔

مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے زلزلے کے ایک جھٹکے سے زمین پھٹ گئی ہے اور آسمان نیچے کی طرف گرا آ رہا ہے، میں کچھ بولنا چاہتا تھا مگر کسی نے میرے گلے کو بُری طرح گھونٹ دیا۔

"تو اب ــــ خورشید کہاں ہے ــــ؟" میں نے بہ دقت تمام جملہ پورا کیا۔

"ایک ماہ سے تو وہ اپنے شوہر کے ساتھ مختلف مقامات کی سیر میں مشغول ہے۔ مگر کل اس کی اماں کہہ رہی تھی کہ وہ لوگ اسی ہفتے حیدرآباد لوٹیں گے" خالہ نے ناشتہ ختم کر کے اُٹھتے ہوئے کہا۔

میں اُٹھ کر اپنے کمرے میں آ گیا، گذشتہ واقعات فلم کی سُرعت کے ساتھ میری آنکھوں کے سامنے سے گذرنے لگے، افسوس یہ سب میری ہی جلد بازی کا خمیازہ ہے، آخر میں نے خورشید سے منگنی کا تذکرہ کیوں نہ کیا وہ یقیناً میری غلط فہمی دُور کر دیتی اور پھر ــــ اور پھر ــــ مگر اب کیا ہو سکتا ہے۔ اپنی اور اُس کی امیدوں اور آرزوؤں کو بیدردی سے روندتے ہوئے میں اُس سے جدا ہو گیا تھا، ایک ہفتے کے بعد وہ لوٹے گی، کیا مجھے اس سے ملنا چاہئے۔ ایسی حالت میں وہ مجھ سے ملنا بھی گوارا نہ کرے گی۔ بہتر ہے میں اس کے آنے سے قبل یہاں سے چل دوں، چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا، اورنگ آباد میں ایک دوست سے ملنے کا بہانہ کر کے میں فوراً اسٹیشن پر جا پہنچا۔

اب میرے سامنے پھر وہی سوال تھا۔ پونا اور بمبئی میں میرے لئے کوئی جاذبیت نہیں تھی۔ ایلورا کے غاروں کو ثانوی تعلیم کے دوران میں ایک مرتبہ دیکھ آیا تھا مجھے اس وقت یہ جگہ بہت پسند آئی تھی۔ چنانچہ میں نے اورنگ آباد کا ٹکٹ لیا اور وہاں پہنچ کر بس کے ذریعے ایلورا پہنچ گیا، اپنا مختصر اسباب قریب کی پولیس چوکی میں رکھوا کر غاروں کا معائنہ کرنے کی غرض سے جلد جلد اُوپر چڑھ گیا، نہیں معلوم میں کب تک بھٹکتا پھرا مگر جب واپس لوٹا تو سورج غروب ہونے میں نصف گھنٹے کا عرصہ باقی تھا۔ پیاس کی شدت سے میرے پیر تیزی سے اُٹھنے لگے اور میں پانی کے چشمے کے پاس آ کر رک گیا، ابھی پوری طرح میری پیاس بھی نہ بجھنے پائی تھی کہ ایک خوش وضع نوجوان سفری سوٹ پہنے کاندھے پر تھرماس لٹکائے میرے قریب آیا، اور جھک کر چشمے سے پانی بھرنے لگا، میں یکایک رک گیا۔

"بھائی شوکت!" میرے منہ سے بے ساختہ نکلا "اتنی جلدی بھول گئے؟"

وہ میرے چہرے کو بغور دیکھنے لگا پھر یکایک دوڑ کر مجھ سے لپٹ گیا۔

"ارے عشرت تم! معاف کرنا بھائی میں نے پہچانا نہیں تمہاری یہ حالت؟ نہ پہچانوں تو کروں کیا، ایسی حالت میں اگر تمہارے والدین بھی دیکھتے تو نہ پہچان سکتے، مگر یہ سب ڈھونگ کس لئے رچایا ہے تم نے؟ بھائی سیدھے سادے انسان ہو، کھاؤ پیو اور عیش کرو، آخر تمہیں فکر کاہے کا ہے؟" اس نے پُرتپاک لہجے میں کہا۔

"فکر وکر کچھ نہیں، ہاں بمبئی میں رہنے سے ذرا صحت خراب ہو گئی ہے" میں نے ٹالتے ہوئے کہا

"اچھا تو چلو ــــ آؤ! ارے ہاں بھول گیا! معاف کرنا ذرا لانا تو ہاتھ، اب ہم ڈبل ہو گئے ہیں" اُس نے میرا خشک ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر دبانا شروع کیا۔

"سچ سچ یار تم بڑے خود غرض نکلے، آخر بازی لے گئے نہ مجھ سے؟ اکیلے ہی اکیلے شادی کرلی، میں تو تمہیں اس شادی پر ہرگز مبارکباد نہیں دوں گا" میں نے تصنع آمیز مسکراہٹ سے کہا۔

"ارے بھائی مبارکباد سے تو میں عاجز آگیا ہوں، مگر یہ اکیلے اکیلے کیا معنی! میں نے تمہیں ایک چھوڑ تین تین خط لکھے مگر تم نے ایک کا جواب بھی نہ دیا" اس نے اپنے فرض سے سبکدوشی حاصل کرنے کے انداز میں کہا۔

"مگر خط تو تم نے پونا کے پتے پر بھیجا ہوگا، اور بندہ تو اس مرتبہ بمبئی میں تھا" میں نے دوبارہ اُسی کو موردالزام ٹھہراتے ہوئے کہا۔

"یہ لو، یہ اور نیا ستم! ارے بھائی بمبئی میں تو میں گذشتہ چھ ماہ سے مقیم ہوں، بیوپار جو شروع کیا ہے" اُس نے متعجب ہو کر کہا۔ پھر تھوڑے وقفے کے بعد بولا "خیر! آؤ میں تمہیں تمہاری بھابی سے ملا دوں" اور ہم لوگ ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ہوئے چلنے لگے۔

شوکت اور میں پونا میں کالج کے ہوسٹل میں متواتر تین سال تک رہے تھے، اگرچہ وہ مجھ سے دو سال آگے تھا مگر اپنی بے پروائی اور لاابالی طبیعت کی وجہ سے اکثر فیل ہو جایا کرتا تھا، بی۔ اے میں فیل ہونے کے بعد سلسلۂ تعلیم کو منقطع کرکے غیر ممالک کی سیر کو چلا گیا تھا، اُس کے والد حیدرآباد میں چمڑے کے بہت بڑے بیوپاری تھے، واپسی پر اُس نے کانپور میں نہایت اعلیٰ پیمانے پر چمڑے کا بیوپار شروع کردیا تھا اس کے بعد وہ تجارت میں ایسا منہمک ہوا کہ خط و کتابت کی فرصت ہی نہ ملی،

ہم لوگ تیزی سے قدم اٹھاتے ہوئے بڑھ رہے تھے، آخر شوکت ایک خوبصورت کار کے پاس پہنچ کر رک گیا۔

"یہ ہیں میری رفیقۂ حیات مسز شوکت ——— اور یہ ہیں میرے پرانے رفیق مسٹر عشرت" اُس نے ہمارا تعارف کراتے ہوئے کہا، میں بھی اس کی نئی دلہن کو دیکھنے کے لئے ذرا آگے جھک گیا۔

یکایک مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے میرے خون کا ہر قطرہ جم گیا ہے۔ اور میرے اعضا ساکت ہو کر رہ گئے، میں بولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر میرے حلق میں گرہ پڑ گئی۔ خورشید سبز رنگ کی شال میں لپٹی ہوئی تھی، اُس کے چہرے پر ہلدی کا سا زرد رنگ چڑھا ہوا تھا۔ اور آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑے ہوئے تھے، چھ ماہ پیشتر اس کی رگ رگ میں حُسن اور جوانی بجلی کی طرح تڑپ رہے تھے اور اب ——— اب وہ داغ فراق کی جلی ہوئی شمع تھی جو آخری بار بھڑک کر خاموش ہونے والی تھی۔

مجھے دیکھتے ہی اُس کی آنکھوں میں یاس و حسرت کا ایک دریا اُمنڈ آیا۔ اُس نے ایک خشک مسکراہٹ سے میری طرف دیکھا، میں منتظر تھا کہ وہ حقارت آمیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے میری طرف سے مُنہ پھیرے گی مگر صبر و برداشت کی اُس دیوی نے میری طرف ملتجی نگاہوں سے دیکھا۔ جیسے وہ خود کو موردالزام قرار دے رہی ہو۔

"عشرت کیا خیال ہے تمہارا؟" شوکت نے میرے کاندھے پر اپنا ہاتھ زور سے مارتے ہوئے کہا۔

"میرا خیال ———؟ اب میں سیدھا گھر جاؤں گا، میری صحت جواب دے رہی ہے" میں نے چٹانوں کی دھندلی فضا کو کھوئی کھوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ارے نہیں، میرا مطلب ہے، تمہاری بھابی کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟" شوکت نے دوبارہ پوچھا۔

مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے وہ میرے کانوں میں آتشیں سلاخیں ڈال کر بے رحمی سے کھینچ رہا ہے،

"اوہ! بہت اچھا خیال ہے، تم شروع سے ہر بات میں خوش قسمت چلے آئے ہو، پھر کیا وجہ ہے کہ شادی کے معاملے میں بدنصیب رہو" میں نے جوں توں جملہ پورا کیا۔

اس کے بعد اس نے وہی پرانا مذاق اور قہقہہ بازی شروع کردی جس کا میں پہلے سے عادی تھا، اُس نے بہت منت سماجت کی کہ میں اُس کے ساتھ حیدرآباد چل کر کچھ روز قیام کروں مگر بے سود، میں اپنی ضد پر اُڑا رہا، اور چھٹیوں کے بعد دوبارہ بمبئی میں ملنے کا وعدہ کرکے فوراً اسٹیشن کو لوٹ گیا،

یکے بعد دیگرے سٹیشن میری نظروں سے اوجھل ہو رہے تھے مگر میری آنکھوں میں خورشید کا چہرہ بار بار گھوم رہا تھا، اُس کی یاس انگیز نگاہیں سائے کی طرح میرا پیچھا کر رہی تھیں!

مجھے اُمید تھی کہ بمبئی پہنچنے کے بعد شاید سکونِ قلب حاصل ہو جائے۔ مگر یہاں اس درد نے اور بھی خطرناک صورت اختیار کرلی، ہر ٹرام میں خورشید کا بھولا چہرہ نظر آتا، ہر دوڑتی ہوئی موٹر میں اُس کی آنسوؤں سے بھری ہوئی آنکھیں میرا پیچھا کرتیں، چوپاٹی اور مالا بار ہل کی

مسحور کن فضا میں اٹھکیلیاں کرنے والی ہر دوشیزہ پر مجھے خورشید کا گمان ہوتا۔

میں اب دن بھر کمرے میں بند رہتا یا پھر جھاڑیوں کی ویران فضا میں گم رہتا، میرے دوست سمجھ رہے تھے کہ میں کسی ناول یا ڈرامے کی تکمیل میں منہمک ہوں، اُن کا خیال درست تھا، میں اپنی زندگی کے ڈرامے کو مکمل کر رہا تھا۔ اتنا شاندار ڈرامہ جو شاید ہی کسی کے دماغ میں آسکے، مگر اس ڈرامے کا اختتام ابھی ادھورا تھا، اس کا ہر منظر پورے طور سے لکھا جا چکا تھا مگر ڈرامہ کہاں اور کیسے ختم ہوگا۔ اس کے متعلق مجھے خود بھی کوئی علم نہ تھا۔

کالج کی دوسری ٹرم ختم ہوگئی اور امتحانات بھی شروع ہوگئے میں امتحان میں شریک نہ ہوسکا، اور شریک ہونے کے قابل ہی کب تھا، قانون جیسے خشک مضمون کو آسانی سے یاد کرلینا کوئی معمولی بات تو ہے نہیں،

اب کی تعطیل میں میرا گھر جانے کا ارادہ تھا۔ گھر گئے ہوئے عرصہ ہوگیا تھا اور پھر والدین اور عزیزوں کے پے بہ پے اصرار سے تو میں بالکل مجبور تھا،

ایک صبح میں اپنا اسباب باندھ کر اسٹیشن پر پہنچا اور آٹھ بجے کی گاڑی میں بیٹھ کر گھر روانہ ہوگیا، اس روز میری طبیعت کچھ پرسکون تھی۔ اور میں راستے کے مناظر میں کچھ دلچسپی بھی لے رہا تھا، یکایک گاڑی کلیان سٹیشن پر رُکی، اپنی بے چین طبیعت سے مجبور ہو کر میں سٹیشن پر اُتر کر ٹہلنے لگا، ٹہلتے ٹہلتے میں پلیٹ فارم کی دوسری جانب پہنچ گیا اور مدراس میل سے آئے ہوئے مسافروں کے اُترنے چڑھنے کا تماشا دیکھنے لگا، یکایک میری نظر شوکت پر پڑی جو ہوٹل کے ملازم سے شربت کا گلاس لے کر جلد جلد اُسے خالی کر رہا تھا۔

"شوکت" بے اختیار میرے منہ سے نکلا اور میں دوڑ کر اس کے پاس پہنچ گیا، مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"عشرت! آخر تم نے یہ کیا حال بنا رکھا ہے اپنا؟" اس نے میری ہیئت کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

"میں بالکل صحیح سلامت ہوں، بمبئی کی ہوا میں کچھ ایسی ہی تاثیر ہے کہ اچھے بھلے آدمی کو مردہ بنا دیتی ہے اور کہو بھابی صاحبہ بھی ساتھ ہیں یا اکیلے ہی سیر و تفریح ہو رہی ہے؟" میں نے جی کڑا کر کے سوال کیا، آخری جملے پر اُس کا چہرہ پھیکا پڑ گیا،

"بھابی ——— ؟ عشرت میں نے اُسے ساتھ رکھنے کی بہت کوشش کی مگر اپنے تموّل کے باوجود بھی میں کامیاب نہ ہوسکا۔" اُس کی آنکھیں پُرنم ہوگئیں۔

"بھائی خیریت تو ہے ——— تم ——— معاف کرنا۔۔۔۔

"تم ———" میں نے اکھڑی اکھڑی سانس میں کہا۔

"عشرت خورشید مجھ سے رخصت ہوگئی، ہمیشہ کے لئے میری تمام کوششوں اور دولت کے باوجود، خبر نہیں کونسی فکر اُسے لاحق تھی میں نے شادی کے بعد اُسے بہت کم خوش ہوتے دیکھا، مگر اُس کے عادات و اخلاق میں غیر معمولی کشش تھی جس نے مجھے اُس کا گرویدہ بنا لیا تھا تمہاری ملاقات کے ایک ہفتہ بعد ہم لوگ کشمیر بھی گئے مگر اس کی صحت دن بدن خراب ہوتی گئی، گذشتہ مہینے ہم لوگ حیدرآباد واپس آگئے، آخری وقت وہ اپنے والدین کے ہاں جانے کے لئے بے چین تھی۔ وہاں پہنچ کر وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مجھ سے جدا ہوگئی ———" وہ شاید کچھ اور کہتا مگر سیٹی کی دلخراش آواز نے اُسے چونکا دیا اور وہ دوڑ کر اپنے ڈبے میں داخل ہوگیا۔

"میں مدراس سے تجارتی سلسلے میں بمبئی جا رہا ہوں، پھر ملنے کی کوشش کروں گا۔"

وہ جملہ بھی پورے طور سے ادا نہ کرسکا اور گاڑی دیکھتے دیکھتے میری آنکھوں سے اوجھل ہوگئی، ممکن تھا کہیں چکرا کر گر پڑتا مگر ٹرین کی سیٹی نے مجھے چونکا دیا، اور میں دوڑ کر اپنے ڈبے میں بیٹھ گیا، گاڑی نہایت سُرعت سے بڑھی جا رہی تھی اور مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ سورج یکایک آسمان سے غائب ہوگیا ہے اور کائنات کی ہر ایک شے ہیبت ناک تاریکی میں ایک دوسرے سے ٹکرا کر پاش پاش ہو رہی ہے،

خزاں کے آخری پتّے کی طرح میرے دل میں زندگی کی صرف ایک اُمید باقی رہ گئی تھی مگر اب وہ بھی ٹوٹ کر خاک میں مل گئی،

زندگی خطرناک طور پر دلچسپ اور مسحور کن ہے مگر میرے لئے اب اُس کی رنگینیوں اور سحر آفرینیوں میں کوئی کشش باقی نہیں رہی، شگفتہ پھولوں اور چٹکتی ہوئی کلیوں کے باوجود بھی شبنم رو تی ہے،

خورشید اب آرام کی میٹھی نیند سو رہی ہے، مگر میرے لئے نیند نہیں، میری خواہش ہے کہ میں بھی ایک روز ایسی ہی پُرسکون نیند سے ہمکنار ہو جاؤں، مگر معلوم ہوتا ہے مجھے اس میں کامیابی نہیں ہوگی۔

میں نے اُس کاغذ کے حقیر ٹکڑے کو ایک روز مسل کر پھینک دیا جس پر خورشید نے "خدا حافظ" لکھا تھا۔ وہ رومال بھی تو میں نے جلا دیا جس پر اُس نے دھاگے سے "مجھے بھول نہیں" لکھا تھا۔ مگر یہ الفاظ اب کاغذ اور رومال سے منتقل ہو کر میرے دل پر نقش ہو چکے ہیں۔

"خدا حافظ" ——— کتنی مضحکہ خیز بات! زندگی اور اس کی ناآویزیاں کانٹا بن بن کر میری رگوں میں چبھ رہی ہیں اور پھر بھی میں جی رہا ہوں۔ جئے جا رہا ہوں۔ بالکل محفوظ۔ مجھے کوئی روگ نہیں۔ کوئی بیماری نہیں، میں واقعی بالکل محفوظ ہوں۔ خورشید! سچ مچ خدا میری حفاظت کر رہا ہے، معلوم ہوتا ہے وہ میری حفاظت میں اتنا منہمک ہے کہ دنیا کی دوسری چیزوں کی اُسے پروا ہی نہیں۔

مگر خدا کب تک حافظ رہے گا خورشید؟ مجھے یہ خمیازہ کب تک بھگتنا پڑے گا؟ آخر کب تک ——— ؟

محمد فاروقی

غزل

کسی کی تمنا کئے جائیے
اسی آرزو میں جئے جائیے

نہیں چارۂ کار اس کے سوا
کہ خونِ جگر ہی پئے جائیے

زمانے کے جتنے بھی آلام ہوں
دلِ ناتواں پر لئے جائیے

اگر ہے یہی شیوۂ دوستی
دئیے جائیے غم، دئیے جائیے

دل و جانِ حیرت پہ ہر حال میں
کرم ہی کرم ہے کئے جائیے

عبد المجید حیرت

ملاقات

شاہراہِ زندگی پر یوں ہی ہم تم تھے ملے
جیسے دو پتے لچکتی شاخ سے
ٹوٹ کر گر جائیں سطحِ آب پر،
ایک اِس ساحل کے پاس،
ایک اُس ساحل کے پاس،
ڈولتے نازک سفینوں کی طرح
تیز رو لہروں کے سینے پر رواں
تُند موجوں کے تھپیڑوں سے نڈھال،
جو کبھی ہو جائیں پاس پاس۔
اور کبھی ہو جائیں دُور!

بہتے بہتے
کوہساروں لالہ زاروں سے گذرتے
زندگانی کی مسافت کاٹتے،
لیکن آخر جا گریں
بحر کے آغوش میں،
شاہراہِ زندگی پر یونہی ہم تم تھے ملے!

شاہراہِ زندگی پر یونہی ہم تم تھے ملے،
میں کہیں اور تم کہیں،
گرچہ واقف تک نہ تھے اک دوسرے کے نام سے،
اور اوجھل بھی رہے اک دوسرے کی آنکھ سے
محفلِ ہستی میں لیکن ہے یہ آئینِ حیات
اتفاقاتِ زمانہ سب کو لے آئیں قریب!
لب ملے، طوفاں اُٹھا،
کانپ اُٹھا کوہسارِ زندگی،
دل نے دل سے کچھ کہا
روح نے کچھ روح سے،

میری دنیائے تصور تھی تمہارا ہی خیال
آرزوئیں کھل گئیں شاداب کلیوں کی طرح
اور اُن پہ آئی وہ رنگیں بہار
جس میں رقصاں تھا تمہارا ہی جمال؛
شاہراہِ زندگی پر یونہی ہم تم تھے ملے!

آہ! اے انسان! تیری آرزوؤں کا مآل،
جن کو کر دیتا ہے آئینِ جہاں
ٹکڑے ٹکڑے، ریزہ ریزہ، پاش پاش!
زندگی! یہ زندگی — ہاں ہاں، یہ ظالم زندگی!
جن کی طوفاں خیزیوں سے ایک موجِ تند و تیز
لے گئی تم کو بہا کر میری آنکھوں سے بھی دُور
میرے قدموں کی رسائی سے بھی دُور،
اب تمہارے حُسن کی رعنائیاں
دور ہیں جیسے شفق کی احمریں کرنوں کا رنگ،
یادِ ایامِ کی — بن گیا ہے اک فسردہ سا خیال،
اور شکستہ آرزوؤں کا جہاں بھی ہو گیا بے رنگ و بو،
جیسے کمھلائے ہوئے پتوں کی روحِ بے کسی!
سسکیاں لیتی ہیں یوں اب حسرتیں،
بجھ رہا ہو جیسے کوئی ٹمٹماتا سا چراغ!
لیکن اس بے کیف اور تاریک سی منزل میں بھی
دُور، اِس دنیا سے دُور،
چاند اور تاروں سے دُور،
ہے تمہارا ہی خیال!
جو لرزتا ہے کبھی پُرنور شعلے کی طرح
اے مجھے بھولے ہوئے!
شاہراہِ زندگی پر یونہی ہم تم تھے ملے!

ساقی

اُردو بول چال میں تذکیر و تانیث کی غلطیاں

قوانین فطرت کے مطابق ذکور و اناث کا تعلق محض جاندار یا ذی رُوح اشیا ہی کے ساتھ ہو سکتا ہے۔ کیونکہ وہ چیزیں جو بے جان ہیں۔ ان میں نر و مادہ کا وجود ہی نہیں ہوتا۔ یہ ایک عجیب بات ہے کہ ہم آخرالذکر اشیا کو بھی ذکور و اناث کی ذیل میں شمار کرکے کسی بیجان چیز کو مذکر اور کسی کو مؤنث تصور کریں۔ اور پھر اُس پر آمادۂ پیکار ہوں۔ کہ فلاں غیر ذی روح یا بے جان شے تو مؤنث ہے۔ اور آپ نے اس کو مذکر کیوں کہا۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ بہت عرصہ ہوا۔ ایک رسالہ "ڈاکٹر اقبال کی خامیاں" کے عنوان سے کسی صاحب نے شائع کرایا تھا۔ جس میں ڈاکٹر صاحب مرحوم کی بعض بڑی بڑی غلطیوں میں کچھ وہ بھی تھیں۔ جو الفاظ کی تذکیر و تانیث کے متعلق ہیں۔ مثلاً بانگِ درا میں متاع کو مذکر استعمال کیا گیا تھا۔ معترض صاحب فرماتے ہیں کہ بطور مؤنث صحیح ہے۔ لیکن قرآن السعدین کے نام سے راجہ جیسور راؤ تخلص اصغر نے ایک کتاب تذکیر و تانیث کی بحث پر طبع کرائی ہے۔ اس میں متاع کو مختلف فیہ قرار دیا گیا ہے۔ اسی طرح اور بھی سر اقبال مرحوم کی غلطیاں بحث میں لائی گئی ہیں۔ مگر اس مضمون پر ایک غائر نظر ڈالنے سے منتج ہوتا ہے۔ کہ اشیائے بیجان کے اسمائی تذکیر و تانیث کے وہ قواعد جو عام قواعد اُردو کی کتابوں میں درج ہیں۔ ایک قادر الکلام شاعر ہمیشہ ان پر پابند نہیں رہتا۔ اور جس طرح مناسب سمجھے اسم مذکر کو مؤنث اور مؤنث کو مذکر کے طور پر اپنے استعمال میں لا سکتا ہے۔ چنانچہ ان خاص قواعد میں جو جو باتیں اہلِ دہلی نے ملحوظِ خاطر رکھی تھیں پہلے اساتذۂ لکھنؤ نے اُن کو نظر انداز کیا اور دستور الشعرا یا مفید الشعراء وغیرہ رسائل طبع ہوئے۔ اور اسی قبیل کی ایک کتاب حال میں معین الشعرا شائع کی گئی ہے۔ لیکن سخت تعجب ہے کہ تذکیر و تانیث الفاظ کے استعمال کی مشکلات کم کرنے کے بجائے اور زیادہ بڑھائی جا رہی ہیں۔ اور کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جلال مرحوم کا وہ چھوٹا سا رسالہ مفید الشعرا جو غالباً دستور الشعرا کی تقلید میں لکھا گیا تھا۔ زمانہ حال کی ضروریات کے لئے بالکل غیر مکتفی ہے۔ یا جلال نے جس قدر مثالیں تذکیر و تانیث کی اپنے زعم کے مطابق درج رسالہ کی تھیں۔ اُن میں سے اکثر کو مختلف فیہ ثابت کرکے اب جدید قواعد وضع کرنے کی ضرورت ہے یا جتنی مثالیں ایک قاعدے کے مطابق مذکر الفاظ کی وہاں درج کی گئی ہیں۔ قریباً اتنی ہی مثالیں اس کے بالمقابل مستثنیٰ الفاظ کی بھی پیش کی جا سکتی ہیں۔ تو پھر ایک قاعدہ اور استثنا میں جب کچھ فرق نہ رہا۔ تو تذکیر و تانیث کے یہ قاعدے کیا ٹھہرے محض لفظوں کا ایک کھیل ہیں۔ اور یہ بات اس طرح پیدا ہوئی۔ کہ زبانِ اُردو جب تک اساتذۂ دہلی کے بنائے ہوئے قاعدوں پر چل رہی تھی۔ عوام اُن اساتذہ کے کلام کو پڑھ کر کسی لفظ کو مذکر اور کسی کو مؤنث قرار دے لیتے تھے۔ مگر لکھنؤ میں یہ تخصیص قائم نہ رہی۔ کہ کسی بے جان اسم کی تذکیر و تانیث کو جس طرح کہ بعض اساتذہ یعنی چوٹی کے شاعروں نے مدنظر رکھا۔ اسی طرح ان سے دوسرے درجے کے شعرا بھی ان کی تقلید کریں۔ چنانچہ رشکؔ نے سب سے زیادہ ان قیود کو توڑا۔ اور پھر سب سے زیادہ اُردو الفاظ بھی اسی کے تین دیوانوں میں مستعمل ہوتے ہیں۔ غرض رشکؔ کی طرح بحرؔ۔ منیرؔ۔ فائزؔ۔ جان صاحب۔ سحرؔ۔ امانتؔ۔ اسیرؔ اور جلیلؔ وغیرہ نے اس امر میں نہایت آزادی سے کام لے کر یہ ثابت کر دیا۔ کہ ان کے سامنے قوانین تذکیر و تانیث کی کچھ حقیقت ہی نہیں اور نہ صرف اساتذہ بلکہ عام شعرا بھی بے جان شے کے نام کو اگر وہ مؤنث مانا جاتا ہو تو اس کو مذکر اور اگر مذکر شہرت پا گیا ہو۔ تو خلافِ جمہور وہ اس کو مؤنث استعمال کر سکتے ہیں۔ لیکن یہ لغویت اور بھی زیادہ ترقی پاتی ہے جبکہ اُردو زبان ان لوگوں کی بول چال میں دخل پاتی ہے کہ جو اہلِ زبان نہیں ہیں یا جن کی مادری زبان اُردو نہیں ہے مثلاً انگریز لوگ دو صدی سے ہماری زبان کا خاص طور پر مطالعہ کر رہے ہیں۔ اور یہ اُن کے سول سروس کے امتحان میں بھی داخل ہے۔ تاہم عام انگریز اپنی بول چال میں اسی طرح

کی اُردو ہمیشہ استعمال کرتے ہیں۔ "ہمارا میم صاحب کا کتاب گرجے میں کھو گیا یا آج بابا لوگ کا دوائی کھا نسامہ کہیں بھول گیا" وغیرہ وغیرہ علی ہذا اُردو زبان اہلِ پنجاب کی بھی مادری زبان نہیں ہے۔ اسی لئے۔ ڈاکٹر سر محمد اقبال کو تو خیر مستثنےٰ قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس ملک کے وہ رسالے یا اخبارات جو عموماً یہاں طبع کئے جاتے ہیں۔ اہل زبان کو ان کی سطر سطر میں تذکیر و تانیث کی غلطیاں کھٹکتی ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں ہو۔ جبکہ ہم اوپر واضح کر چکے ہیں۔ کہ دہلی اور خصوصاً لکھنؤ کے درجہ دوئم کے اساتذۂ ادب ان سب قیود کو اب اپنے ہاں بالائے طاق رکھ چکے ہیں تو پھر وہی آسانیاں یا آزادیاں اہلِ پنجاب کے لئے بھی مخصوص ہونی لازم ہیں۔ غرض ذی روح یا جاندار مخلوق میں تو قدرت ہی نے ذکور و اناث کا وجود ودیعت کر رکھا ہے۔ ان کی تذکیر و تانیث میں تو اصولاً کچھ اختلاف نہیں ہونا چاہیئے تھا۔ مگر تعجب ہے کہ بلبل کو اب تک کوئی مؤنث مانتا ہے۔ اور کوئی مذکر اور آزاد مرحوم تذکرہ آبحیات میں تحریر فرماتے ہیں۔ کہ اس خاص لفظ بُل بُل یعنی بلبل کی تحلیل کر کے دیکھو تو ڈبل تانیث معلوم ہوتی ہے۔ دراصل ہمارے ہاں بیجان اشیا تو کیا وہ جاندار مخلوق جس سے ہمیں ہر روز واسطہ پڑتا ہے۔ اُس کی تذکیر و تانیث بھی ہمیشہ متنازعہ فیہ رہی ہے۔ تو غور کرنا چاہیئے۔ کہ اس قدر اختلافات کا اصلی سبب کیا ہے۔ اور ہمیں ایک ایک سطر کے لکھنے میں الفاظ کے مذکر و مؤنث قرار دینے کی حاجت کیوں پڑتی ہے۔ اگر ہم کو اسی طرح انگریزی زبان کے الفاظ کی تذکیر و تانیث سے ہر سطر میں واسطہ پڑتا۔ تو اُس وسیع زبان پر کوئی ہندوستانی تو شاید ہی قادر ہو سکتا ہے یا امریکہ اور یورپ اس کی انگریزی دانی کی داد دیتے۔ بلکہ سرکاری دفاتر میں بھی فہرستوں پر فہرستیں وقتاً فوقتاً بطور سرکلر شائع کی جاتیں کہ آئندہ فلاں انگریزی لغت مذکر مستعمل ہوگی۔ اور فلاں فلاں مؤنث جو بابو صاحب اس قاعدے کی خلاف ورزی کریںگے وہ غالباً ہمیشہ کے لئے نکال باہر کر دیئے جائینگے ـــــــ مگر انگریزی علم و ادب میں بیجان اشیاء کی تذکیر و تانیث ہرگز قرار نہیں دی گئی۔ اور دور کیوں جاؤ ـــــــ فارسی زبان میں تو انگریزی سے زیادہ یہ آسانی پیش نظر رکھی گئی ہے کہ کسی جاندار مخلوق کے نام کے ساتھ جو فعل لایا جاتا ہے۔ وہ مذکر و مؤنث دونوں کے لئے ہمیشہ ایک ہی ہوا کرتا ہے۔ مثلاً مرد آمد۔ زن آمد۔ اسی طرح اس زبان میں تذکیر و تانیث کے قاعدے اس قدر مختصر مقرر ہیں۔ کہ دنیا کی کوئی اور زبان اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اُردو میں بڑی دقت یہ ہے کہ الفاظ کی تذکیر و تانیث کا اثر ہمیشہ فعل پر پڑتا ہے۔ اور اسم و فعل ہی تو دو چیزیں ہیں۔ جن سے ایک ایک سطر کے لکھنے میں ہمیں واسطہ پڑتا ہے لہٰذا خیال کرو کہ یہ زبان جب کسی غیر اہلِ زبان کے استعمال میں آتی ہے تو اُس کو کن کن دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے ۔ مختصر یہ کہ اُردو میں قواعدِ زبان زیادہ تر فارسی قواعد زبان سے ماخوذ کئے گئے تھے۔ اور ان قواعد فارسی کی بنیاد عربی قواعد پر رکھی گئی تھی۔ لیکن تذکیر و تانیث کے قاعدے مقرر کرتے وقت ہمارے قواعد نویسوں نے نہ تو فارسی کی کچھ پروا کی نہ عربی کی۔ ورنہ اس میں کیا قباحت تھی۔ کہ "آیا" کا فعل جو عورت اور مرد دونوں سے یکساں طور پر صادر ہوتا ہے۔ ہم اُس کو اس طرح برت لیتے۔ جیسے ہم کہتے "وہ عورت آیا وہ مرد آیا" مگر اس ضمن میں خاص مطالعہ کرنے سے یہ راز کھلا۔ کہ ہماری زبان میں قوانین تذکیر و تانیث ہندی گریمر سے مستعار لئے گئے ہیں۔ اور وہ اصول تذکیر و تانیث جو ہندی میں رائج ہیں۔ ان کو سنسکرت کے قواعدِ تذکیر و تانیث کی بنا پر وضع کیا گیا تھا۔ لیکن ہندی والوں نے اصول سنسکرت کی کچھ پروا نہ کی اور بیجان اشیاء کی تذکیر و تانیث کے تعین کرنے میں اپنی مرضی کو اس قدر دخل دیا کہ خود ہندی میں بھی یہ مسئلہ بہت پیچیدہ ہو کے رہ گیا۔ اور جب اس کی شمولیت زبان اُردو میں کی گئی۔ تو یہ اور بھی زیادہ وقت طلب مسئلہ بن گیا۔ اور ایک ہی شہر مثلاً دلی میں مسلمان تو دہی کو مؤنث بولنے لگے اور ہندو مذکر۔ حالانکہ سنسکرت کے قواعد والوں نے دہی کے لفظ کو دودھ یعنی دُہنے سے وضع کر کے اس سے ایک لفظ دوہی بنا لیا تھا۔ جس کا مفہوم جما ہوا دودھ ہے۔ اور فی الحقیقت دہی کیا چیز ہے؟ یہی جما ہوا دودھ۔ لہٰذا سنسکرت میں دوہی (جس سے بگڑ کر دہی کا لفظ اردو میں مستعمل ہونے لگا) بطور مذکر مستعمل ہے۔ تو ہندی اور اُردو کے گریمر نویسوں کو لازم تھا کہ وہ ان امور میں اپنی عقل سے بھی کچھ کام لیتے۔ اور دہی کو ہمیشہ مذکر ہی قرار دیتے۔ لیکن مسلمانوں کو زبان اُردو کے قواعد بناتے وقت یہ مشکل پیش آئی۔ کہ لفظ دہی کے آخر میں "ی" علامت تانیث موجود ہے۔ لہٰذا وہ اس کو مؤنث ماننے کے لئے مجبور ہو گئے۔ مگر ہندوؤں کو اپنے خاص ماخذ زبان کی پابندیاں کرنی تھیں۔ وہ عموماً اس لفظ کو مذکر ہی بولتے رہے۔ مگر اب کثرت استعمال کی وجہ سے "دہی" کو عام طور پر مؤنث ہی تسلیم کیا گیا ہے۔

خصوصاً پنجاب ہیں۔ لہٰذا طوالتِ مضمون کے خیال سے ہم اسی ایک لفظ دہی کی تذکیر و تانیث پر اپنی اس بحث کو ختم کرتے ہیں۔ اور اپنے ہم وطن اہلِ قلم سے ملتجی ہیں۔ کہ وہ اُردو الفاظ کی تذکیر و تانیث کے استعمال میں اگر پنجابی زبان ہی کا تتبع لازم سمجھتے ہیں۔ تو ان کو لازم ہے کہ دستور الشعرا یا مفید الشعرا وغیرہ کی قسم کا کوئی رسالہ لکھ کر اپنے نکتۂ خیال کو اصحابِ اُردو کے پیش نظر رکھدیں۔ اور اپنے خصائصِ زبان کو اس زبان پہ اپنا خاص حق جتا کر بالعموم منظور و مقبول کر کے چھوڑیں۔ ورنہ ہم لوگ خواہ کتنا اُردو زبان کی تحصیل کریں اور اس کی مشق و مہارت میں شبانہ روز کوشش کریں۔ اکثر اہلِ پنجاب خصوصاً یہاں کے اُردو اخبار نویس جن کو ہر روز صفحوں کے صفحے اسی زبان میں بسرعت تمام لکھنے پڑتے ہیں۔ وہ الفاظ کی تذکیر و تانیث کے صحیح استعمال میں کبھی بھی عہدہ برآ نہیں ہو سکینگے۔ لہٰذا مکرر التجا ہے۔ کہ ہمارے اہلِ قلم اصحاب بہت جلد اس خاص ادبی معاملے کی طرف متوجہ ہوں۔ اور جس طرح دہلی و لکھنو کے اربابِ قلم نے باوجود کثیر اختلافات کے اپنے اپنے ہاں الفاظ کی تذکیر و تانیث کے مسائل کو متعدد رسالے لکھ کر طے کر لیا ہے۔ ہمارا بھی فرض ہے۔ کہ اس بارے میں محض اپنی پنجابیت سے کام نہ لیا کریں بلکہ پنجابی اسما کی تذکیر و تانیث اور اُردو الفاظ کی تذکیر کا باہم مقابلہ کر کے جو روش زیادہ پسندیدہ اور سہل تر معلوم ہو آئندہ اس پر عملدر آمد کرنے کی تحریک کریں۔ ورنہ جس طرح اہلِ زبان اقبال مرحوم کی ایسی متعدد غلطیوں پر ناک بھوں چڑھاتے ہیں۔ وہ ہمارے عام مصنفین کے کارناموں کو اس سے بھی زیادہ حقیر تصور کرینگے۔

سرخوش

شعر

ولی اس گوہرِ کانِ حیا کی کیا کہوں خوبی
مرے گھر میں وہ یوں آتا ہے جوں سینے میں راز آوے

ولی

راوی کی ایک رات

سنو ملّاح کا نغمہ۔
یہ نغمہ شعلۂ لرزاں ہے اک شمعِ محبّت کا،
سنو ملّاح کا نغمہ۔
یہ نغمہ لمحۂ شیریں ہے اک پُر کیف خلوت کا،
یہ اک دُزدیدہ رفتاری سے چھا جاتا ہے لہروں پر،
یہ اک مستی کا سیمیں جال پھیلاتا ہے لہروں پر!
اِسے سنتی ہیں لہریں اور کشتی کو بہاتی ہیں،
جِلو میں جھومتی جاتی ہیں خود مستی کے جھونکوں سے!
یونہی کشتی کو یہ منظر اُفق کا جا دکھاتی ہیں،
اُترتی ہے وہاں سیّار کشتی نرم جھولوں سے!

مگر ملّاح کی ہمدم۔
وہ آئی چھپتی چھپتی شب کی تاریکی میں تختے پر،
سنو ملّاح کا نغمہ
ہے سِحرِ نغمہ سے آنکھوں میں اُس کی اور ہی منظر!
وہ اِس دم دیکھتا ہے خواب اک رنگیں فسانے کا۔
بیاں بچپن میں جو سنتا تھا پریوں کے زمانے کا
اُفق کے سائے میں آج اس کی تعبیریں نظر آئیں،
وہیں پہنچے گا، افسانہ حقیقت بن کے نکھرے گا!
تمنائیں دلِ بےتاب کی، لو! آج بر آئیں،
وہیں پہلو میں لے کر اپنی ہمدم کو وہ جائے گا!

میراجی

قسمیں

نظر اُٹھائے تجھے دنیائے آرزو کی قسم
ادائے کوشش اخفائے رنگ و بُو کی قسم

جہانِ وہم و گماں بھی ہے گوش بر آواز
قسم قسم ترے اعجازِ گفتگو کی قسم

وہی ہے آنکھ جو ہر جنبشِ نگاہ سے دے
سرورِ بادۂ بے جام و بے سبو کی قسم

تجھی سے ضبط کی سب منزلیں چمک اُٹھیں
ٹپک سکا جو نہ آنکھوں سے اُس لہو کی قسم

سکوں سے ہے نہیں مانوس بے نیازیٔ عشق
صدائے دربدر و خاکِ کو بکو کی قسم

ہے ماورائے حیات و ممات ہستیٔ عشق
جہانِ یاس میں تجدیدِ آرزو کی قسم

مجالِ عرضِ تمنا کہاں ترے آگے
سکوتِ عشق کے الزامِ دُو بدُو کی قسم

شہیدِ تشنہ لبی ہوں فشارِ پنہاں ہوں
کمالِ خستگی ہائے کنارِ جُو کی قسم

میں شاد کام محبت میں نا اُمید سکوں
شہود میں بھی مجھے تیری جستجو کی قسم

مجھے بھی آج کے رونے کے بعد مت کہنا
حیاتِ عشق تری جاتی آبرو کی قسم

لئے تھے تو نے جو قول و قرارِ صبر و سکوں
وہ یاد ہی نہیں عشقِ بہانہ جو کی قسم!

نوید جوشِ جنوں ہے بہارِ لالہ و گل
فضائے مست میں کیفیتِ نمو کی قسم

تمام کہنے کی باتیں ہیں ہوش و بے خبری
سکوتِ شب کی قسم اس فضاءِ ہُو کی قسم

دمِ وداع وہ اصرارِ ضبطِ غم تیرا
وہ جھلملاتی ہوئی شمعِ آرزو کی قسم

فراق عینِ غشی میں بھی چونک اُٹھتا ہوں
فسونِ نرگسِ بیمار و فتنہ خُو کی قسم

فراق گورکھپوری

اُس کی پہلی اُڑان

ننھی مرغابی اونچی چٹان پر اکیلی تھی۔ اُس کے ماں باپ بھائی بہن دن نکلنے سے پہلے ہی جا چکے تھے۔ وہ ان کے ساتھ جانے سے ڈرتی تھی۔ ہر روز اڑنے کے ارادے سے چٹان کے کنارے تک دوڑتی مگر ڈر کر رہ جاتی۔ اس چٹان کے نیچے ——— بہت نیچے ایک بحرِ بیکراں موجیں مار رہا تھا۔ اس نے خیال کیا اُس کے نازک بازو اتنی گہرائی تک اس کا ساتھ نہ دے سکیں گے، وہ اپنی آرام گاہ میں چلی گئی۔ حالانکہ اس کے دو بھائی اور ایک بہن جن کے بازو اس سے کمزور تھے۔ چٹان کے کنارے تک دوڑے اور ہوا میں بازو مارتے ہوئے اڑ گئے۔ مگر اس کو جرأت نہ ہوئی۔ یہ حرکت اس کے لئے ناممکن معلوم ہوتی تھی۔ اس کے ماں باپ اس کی کم ہمتی پر ملامت کرتے اس کے آس پاس گھومتے، شور مچاتے اور اس کو فاقہ کرنے کے لئے چھوڑ دیتے۔ مگر اس کو اپنی جان پیاری تھی۔

چوبیس گھنٹے سے اُس نے کچھ نہ کھایا تھا۔ کل سے اس کو کھانے کے لئے کچھ نہ ملا تھا۔ شام ہونے کو تھی مگر اب تک اس کے پاس کوئی نہ پھٹکا۔ صبح سے شام تک وہ اپنے ماں باپ اور بھائی بہن کو اڑتے دیکھ رہی تھی۔ اس کے ماں باپ اس کے ساتھیوں کو فنِ پرواز میں ماہر بنا رہے تھے ان کو یہ بھی سکھایا جا رہا تھا کہ وہ سمندر کی خوفناک موجوں سے کس طرح بچ کر اڑیں اور کس طرح اپنے شکار کے لئے غوطہ لگائیں۔ اس نے یہ بھی دیکھا کہ اس کا ایک بھائی پہلی مرتبہ شکار کرنے میں کامیاب ہوا اور فاتحانہ انداز میں مقابل کی ایک چٹان پر بیٹھ کر بلا شرکتِ غیرے شکار کو ختم کر گیا اور اس دوران میں اس کے ماں باپ اس کے ارد گرد نعرۂ مسرت لگاتے اس کی ہمت اور بہادری کی داد دیتے ہوئے چکر لگا رہے تھے۔ تمام دن اس خاندان کے افراد مقابل کی چٹان پر مزے کرتے ہوئے ننھی مرغابی کی بزدلی پر اظہارِ نفرت کرتے رہے۔ دُور افق پر سورج غروب ہو رہا تھا۔

اور اپنی آخری کرنوں سے مرغابی کی آرام گاہ کو جو جنوبی رُخ پر واقع تھی گرما رہا تھا۔ ننھی مرغابی نے بھوک سے بے تاب ہو کر چٹان پر ایک نظر ڈالی۔ تو ایک کونے میں پس خوردہ پڑا دیکھا اس نے اسی پر اکتفا کی۔ وہ بار بار حسرت سے مقابل کی چٹان کو تکتی اور چاہتی تھی کہ بغیر اڑے کسی طرح ماں باپ کے پاس پہنچ جائے۔ لیکن جب اپنی چٹان کے کنارے پر آ کر جھانکتی تو سمندر منہ پھاڑ پھاڑ کر موت کا پیغام سناتا اُس کے اور اُس کے والدین کے درمیان ایک عمیق سمندر حائل تھا۔

ایک مرتبہ وہ چٹان کے کنارے تک پہنچ گئی اور ایک پیر پر کھڑی ہو گئی پھر آنکھیں بند کر کے غشی طاری ہو جانے کا بہانہ کیا۔ اس پر بھی اس کے ماں باپ نے کوئی توجہ نہیں کی پھر وہ مایوس ہو کر پیچھے ہٹ گئی۔ اس کے بھائی بہن دوسری چٹان پر اپنی گردنیں سکیڑے سستا رہے تھے۔ باپ پر کھولے دھوپ کھا رہا تھا۔ صرف ماں بچاری اس کی طرف بار بار دیکھ رہی تھی اور اپنے شکار کے ختم کرنے میں مصروف تھی۔ ننھی مرغابی نے دیکھا کہ ماں چٹان پر چونچ رگڑ رگڑ کر مچھلی کھانے میں مصروف ہے۔ یہ دیکھ کر اس کے منہ میں پانی بھر آیا۔ وہ دیوانہ وار اپنی چونچ بھی رگڑنے لگی اور اُس کے دل میں خیال آیا کہ کاش ایک مچھلی مجھے بھی مل جاتی۔ اسی تصور میں بیساختہ اس کے حلق سے ایک ہلکی سی چیخ نکل گئی یہ حسرت و آرزو کی ایک دردناک پکار تھی۔ اس کی ماں نے اس کا جواب دیا۔ وہ چاہتی تھی کہ ماں اس تک لا کر شکار پہنچا دے مگر ماں یہ نہ چاہتی تھی۔ تھوڑی ہی دیر بعد ماں ایک ٹکڑا چونچ میں لے کر اڑی۔ جب اس نے دیکھا کہ ماں اس کی طرف آ رہی ہے تو ننھی مرغابی کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ مگر ماں بجائے اس کے کہ اس کے پاس آ کر بیٹھتی یا ٹکڑا پھینک دیتی اُسے منہ میں دبائے اس کے قریب قریب اُڑنے لگی۔ ننھی مرغابی اس بات کی کوشش کر رہی تھی کہ کسی طرح ماں سے قریب تر ہو جائے۔ یکایک اس کی ماں اس

سے صرف ایک فٹ کے فاصلے پر چٹان کے کنارے پر ٹِک گئی ننھی مرغابی متعجب تھی کہ اس کی ماں اس کے قریب کیوں نہیں آتی۔ وہ بے تاب ہو کر بخزا اس کی چونچ سے چھیننے کے لئے جھپٹی ماں فوراً اوپر اڑ گئی۔

ایک بڑی چیخ کے ساتھ وہ چٹان سے آگے آ گئی اور نیچے گرنے لگی۔ جب وہ نیچے ہی نیچے جا رہی تھی تو اپنی ماں کے پروں کی آواز برابر سن رہی تھی۔ وہ جوں جوں سمندر کے قریب ہوتی جا رہی تھی اس کے دل میں ایک ہول پیدا ہو رہا تھا۔ یکایک اس نے محسوس کیا کہ اس کے دل کی حرکت بند ہو گئی ہے اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ یہ ساری پریشانی صرف ایک لمحے کے لئے تھی۔ دوسرے ہی لمحے میں اس نے محسوس کیا کہ اس کے بازو کھل چکے ہیں اور اس کے سینے اور بازو سے ہوا ٹکرا رہی ہے۔ اور اس کے پر ہوا کو کاٹ رہے ہیں اب وہ الٹے سر نیچے نہیں جا رہی تھی بلکہ اسے کبھی نیچے کبھی دائیں بائیں اور کبھی اوپر اڑنے کا احساس ہو رہا تھا۔ اس کے دل کی دھڑکن کم ہو رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے اندھیرا دور ہو رہا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو پوری قوت کے ساتھ بازو مارتے اور اوپر اُٹھتے ہوئے دیکھا تو فرط مسرت سے وہ چیخ اٹھی۔ اب اس کا پورا خاندان اس کے آس پاس محو پرواز تھا۔ ان سب کے قوی بازوؤں کی پھڑپھڑاہٹ اُسے صاف سنائی دے رہی تھی۔ اس نے بھی ان کی تقلید کی کوشش کی۔ وہ اپنے بھائی بہنوں کو دائیں بائیں اوپر سے نیچے ہوتے دیکھ رہی تھی۔ اب وہ بھول چکی تھی کہ اس کے لئے اڑنا ناممکن ہے۔ اُس نے ہوا میں دائیں بائیں مڑنا اوپر اٹھنا اور غوطے لگانا شروع کیا۔ اس کی چیخ پکار سے سمندر کی ساری فضا گونج اٹھی۔

اب وہ پانی سے قریب ہو چکی تھی اور پانی پر برابر اڑ رہی تھی وہ اپنے نیچے ایک عمیق سمندر کو موجیں مارتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ اسی عرصے میں اُس نے اپنے بھائی اور بہنوں کو اس نیلی سطح پر بیٹھتے ہوئے دیکھ لیا اور اپنے پروں کی حرکت کو روک کر خود بھی اس پر پاؤں ٹیک دیئے اس کے پنجے اس میں غرق ہونے لگے مارے خوف کے اس نے ایک چیخ کے ساتھ اوپر اٹھنے کی کوشش کی لیکن اس عجیب مشق اور بھوک نے اس کو کافی نڈھال کر دیا تھا۔ حتیٰ کہ اس کے پاؤں پورے غرق ہو گئے اس کا پیٹ بھی تری محسوس کرنے لگا۔ اس سے زیادہ وہ نہ ڈوب سکی۔

اب وہ پانی پر تیر رہی تھی اور اس کے ارد گرد اس کے خاندان کے سارے افراد تعریف کے ترانے گا رہے تھے اور ان کی چونچیں تحفۃً مچھلی کے ٹکڑے پیش کر رہی تھیں

اس طرح اس نے اپنی پہلی پرواز کی تکمیل کی۔

ترجمہ **محمد عبد السّتار فاروقی**



غزل

کر رہا ہوں وہی تدبیر جو تقدیر میں ہے
مری تقدیر بھی شامل مری تدبیر میں ہے

آپ کی بندہ نوازی تو مسلّم لیکن
مجھے معلوم ہے جو کچھ مری تقدیر میں ہے

آپ تعزیر کی تکلیف گوارا نہ کریں
مری تعزیر بھی داخل مری تقصیر میں ہے

اس میں کچھ میری نظر کا بھی کرشمہ ہے ضرور
یہ جو اک حُسن نمایاں تری تصویر میں ہے

ہائے اُس حُسن فسوں ساز کی جادو نگہی
جس پہ مر مٹنے کی حسرت دلِ دلگیر میں ہے

ہائے وہ دل کی تمنّا کہ نہ بر آتی ہو
ہائے اقرارِ محبت کہ جو تاخیر میں ہے

آپ آئیں تو سہی آپ سنیں بھی تو سہی
نغمۂ حُسن مرے نالۂ شبگیر میں ہے

وہ خفا ہو بھی گیا سحرِ دُعا ہو بھی گیا
اور دلِ زار ابھی خواہشِ تاثیر میں ہے

کیا کہوں برہمیٔ حُسن کا عالم، یعنی
کچھ عجب لطف محبّت کی بھی تقصیر میں ہے

ان سے کیا آرزوئے خاطرِ دلگیر کہوں
اُنہیں معلوم ہے جو خاطرِ دلگیر میں ہے

کوئی پوچھو تو سہی آپ کی مرضی کیا ہے
انہیں معلوم ہے جو کچھ مری تقدیر میں ہے

شعرِ اکبر میں بھی اک بات ہے مانا لیکن
اِس میں تاثیر کہاں جو سخنِ میرؔ میں ہے

جلال الدین اکبر

رامی

کل اسی راستے سے رامی کی ارتھی شمشان کی طرف گئی تھی۔ گاؤں کے بہت سے لوگ بھی ساتھ تھے۔ رامی کی ماں تھوڑا سا روئی بھی تھی۔

اچھا ہوا کہ وہ تھوڑا سا روئی۔ رامی کے جیتے جی تو اُسے کبھی رونا نہ آیا تھا اور نہ اس کی ضرورت ہی تھی۔ رامی تو جنم سے ہی اپاہج تھی۔ اس میں رونے کی بھلا کون سی بات تھی!

رامی مرنے سے پہلے بیمار نہیں ہوئی تھی۔ شاید ایشور اُسے اتنا اہم نہ سمجھتا ہو جتنا کہ اس کے بھائی بہن اور ماں۔ بیمار پڑ جاتی تو گھر والوں کے پاس اس کے لئے بے اتفاقی کے سوا اور کوئی دوا نہ تھی۔ پانی تک کو ترس جاتی۔ اپاہج کو بھی بیمار ہونے کا کوئی حق ہے؟

وہ چکی پیس رہی تھی، جب اچانک اُس کا آخری وقت آ گیا۔ شاید وہ مرنا چاہتی تھی۔ شاید اس کا دل کمزور تھا۔ تعجب تو یہ ہے کہ اپاہج کا بھی دل ہوتا ہے۔ جب کبھی رامی کے احساسات کے بارے میں کوئی بات چلتی تو اس کے گھر والے ہنس دیا کرتے۔ اس دن جب حسب معمول رات کو سونے سے پہلے اُس کی ماں کچھ گیہوں لے کر رامی کی کوٹھڑی میں آئی تاکہ رامی صبح ہوتے ہوتے اُن سب کو پیس ڈالے، تو اُس نے اُسے چکی پر جھکے ہوئے پایا۔ وہ مر چکی تھی۔ رامی کی ماں کو دکھ ہوا کہ گیہوں بے پیسے ہی رہ گئے اور اب چکی کو بھی گنگا جل سے صاف کرنا پڑے گا۔ پھر خیال آیا کہ رامی تو میری اپنی بیٹی ہے۔ اُس کو حیرانی ہوئی کہ آج سے پہلے اُسے یہ خیال کبھی کیوں نہ آیا۔ اُس نے آہستہ سے رامی کا سر اٹھا کر اُسے زمین پر لٹا دیا اور اُس کی آنکھیں جو کچھ کچھ کھلی تھیں بند کر دیں۔ پھر وہیں بیٹھ کر کچھ دیر روئی اور اٹھ کر باہر خبر کرنے چلی گئی کہ رامی مر گئی ہے۔

مرنے سے کچھ دن پہلے اُس نے اپنی ماں سے پھر وہی بات پوچھی تھی جو وہ آگے بھی کئی بار پوچھ چکی تھی۔ "لاہور کیسا ہے اماں، ریل گاڑی کیسے چلتی ہے"۔ ماں نے کچھ سخت سست کہہ کر دھتکار دیا تھا کہ تجھ اپاہج کو ان باتوں سے کیا۔ اس پر رامی نے یہی سوال اپنی بہن نِمی اور بھائی منّے کے سامنے دہرایا تھا۔ وہ ہنس پڑے تھے اور انہوں نے کہا تھا تو جب گھر سے باہر نکل ہی نہیں سکتی تو یہ جان کر کیا کرے گی۔ بچے پھر کھیل میں لگ گئے تھے۔ وہ شاید رُک جاتے اگر وہ دیکھ لیتے کہ رامی کے گالوں پر دو آنسو لڑھک آئے ہیں جنہیں اُس نے اپنے دوپٹے سے پونچھ دیا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ رامی کا دل بھی اور بچوں کے دل کی طرح ہی تھا۔ تبھی تو اُسے لاہور اور ریل گاڑی کے دیکھنے کا اتنا شوق تھا۔ ان کا گاؤں سٹیشن سے ایک میل کی دوری پر تھا۔ لیکن کئی بار گاڑی کی سیٹی کی آواز رامی کے کانوں تک پہنچ جاتی تھی۔ رامی کے لئے اس آواز میں ایسی مٹھاس تھی کہ عام لوگ اسے نہیں سمجھ سکتے۔ یہ آواز اُس کی ساری اُمنگوں کا مرکز تھی۔ وہ گھنٹوں چُپ چاپ بیٹھی اس آواز کا انتظار کرتی۔ سیٹی کی آواز سنتے ہی اُس کا دل دھک دھک کرنے لگتا۔ اس کے تمام جسم میں ایک عجیب سنسنی پیدا ہو جاتی۔ آنکھیں بند کر کے وہ اس سیٹی کی آواز کو سنتی۔ تصور اس ریل کی سیٹی کے ذریعے نہ جانے اسے کس دنیا میں پہنچا دیتا۔ اور ریل کے گذر جانے کے بعد بھی کتنی دیر تک وہ اپنی اس تصور کی دنیا میں کھوئی رہتی۔

لاہور کا خیال رامی کو اتنا نہ ستاتا۔ شاید اس لئے کہ وہ گاڑی کی آواز تو روز سنتی تھی لیکن اُس کی ماں بہن اور بھائی سال میں صرف ایک بار ہی لاہور جاتے۔ اگر اس میں چلنے کی تھوڑی سی طاقت بھی ہوتی تو وہ اُن کو سٹیشن تک چھوڑنے تو ضرور جاتی لیکن چلنا تو دور رہا۔ وہ کھڑی بھی نہیں ہو سکتی تھی۔ ہاں گھسٹتے ہوئے تھوڑی دور تک چلی جاتی۔ لیکن یہ اُس کی لاہور دیکھنے کی پیاس کو مٹانے کے لئے کافی

نہیں تھا۔

پیاس پانی دکھانے سے اور تیز ہوتی ہے لاہور سے لوٹ کر ننھی اور منّا ایک ہفتہ تو لاہور والے چچا کی تعریفوں کے پل باندھنے میں مست رہتے۔ رامی چُپ بیٹھی سنتی کبھی کبھی ایک آدھ سوال کر لیتی۔ منّا چاہتا کہ وہی ہر بات بتائے چچا کی بڑی بھاری کوٹھی ہے۔ فرش پر سفید پتھر ہے۔ وہاں گوبر سے لیپ نہیں ہوتا۔ اور دیواروں پر ہرے رنگ کی قلعی ہے۔ ہاں ہاں بڑی خوبصورت لگتی ہے۔ ٹھیک ہمارے کھیتوں کی ہریاول کی طرح اور وہاں بجلی ہے تو کیا جانے؟ تجھے بجلی کا کیا پتہ! ایک بٹن سا ہوتا ہے۔ دبایا اور روشنی ہی روشنی ہوگئی۔ اور لاہور میں گرمی نہیں ہوتی۔ اس کے لئے بھی بٹن دباؤ تو پنکھا گھومنے لگتا ہے۔ چچا کے پاس موٹر بھی تھی۔ کئی بار ہمیں سیر کرانے کو لے گئے اور وہاں انارکلی ہے، بڑا بازار، جہاں شیشوں والی بڑی بڑی دکانیں ہیں اور وہاں ٹھنڈی سڑک ہے میں اور کبھی وہاں میمیں دیکھنے جایا کرتے تھے وہ وہاں گھومنے نکلتی ہیں۔ کیسی ہوتی ہیں! تو تو کالی کلوٹی ہے۔ تجھے دیکھ لیں تو ڈر ہی جائیں۔ اُن کا رنگ بہت سفید ہوتا ہے۔ وہ گالوں پر کچھ لگاتی ہیں اور ہونٹوں پر بھی۔ بڑی عجیب سی لگتی ہیں وہ۔ جب وہ چلتی ہیں تو ننھی جیسے کتنے ہی بچے اُن کا مُنہ دیکھنے کے لئے ساتھ ساتھ بھاگے جاتے ہیں۔

کچھ دن تک تو رامی لاہور کے خیالات میں ڈوبی رہتی لیکن ایسے سپنوں کے لئے دماغ کی ان تھک اڑان چاہیئے۔ رامی کی نظر محدود تھی۔ لاہور کے خیالات کو وہ بہت دنوں تک اپنے دل میں نہ ٹھہرا سکتی۔ لاہور دور بھی تو بہت تھا لیکن گاڑی کی سیٹی ——— گاڑی کی سیٹی تو ایک میل سے زیادہ دُور نہ تھی کبھی وہ گھسٹ کر ہی وہاں تک جا سکتی!

شاید اُس کی ماں میں اتنی لیاقت نہ تھی کہ وہ اِن سکھ کے سپنوں کو سمجھ سکے۔ اُس کے لئے رامی گنوار، اَن پڑھ اور اپاہج تھی بس اور اسی لئے رامی کا روز کا کام یہی تھا کہ گھر کے سارے برتن مانجھے، چکّی پیسے، اور جب کبھی وقت ملے تو چرخہ کاتے۔ برتن مانجھتے مانجھتے رامی کبھی تھکی ہوئی بیٹھی رہ جاتی۔

.... پھر وہی سیٹی۔ خیال ہی میں رامی گاڑی پر پہنچتی۔ اُسے دنیا بھول جاتی۔ گھر والوں کے طعنے گاؤں والوں کی بے التفاتی بچوں کے مذاق کچھ بھی یاد نہ رہتا۔ گاڑی اور اس کی خیالی دنیا! اُس دنیا میں بے عزّتی کرنے والے نہ ہوتے۔ اپاہج۔ اپاہج کہ کر جی جلانے والے نہ ہوتے۔ دھتکار کر رُلانے والے نہ ہوتے۔ تب اچانک رامی کی ماں کی کرخت آواز سنائی دیتی اور گالیوں کی بوچھاڑ، تصوّر کے سب خواب بکھر کر رہ جاتے نِکمّی۔ کاہل۔ کلموہی۔ اِن لفظوں کا جواب رامی کے پاس اپنی بڑی بڑی پُرنم آنکھوں سے ماں کی طرف چپ چاپ دیکھتے رہنے کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا۔

گئی رات تک رامی چکّی پیستی۔ اُس نے چکّی کی گھر گھر میں اپنے دُکھوں کو بھلانا سیکھ لیا تھا۔ کوٹھڑی میں اپنے آپ کو بھلا دینے والی دنیا کو بھول کر رامی کو اپنے خیالات کی دنیا بنانے اور اُس میں کھو جانے کا موقعہ ملتا۔ جب رامی بھاگتے۔ کودتے۔ کھیلتے۔ ناچتے بچوں کو نہ دیکھتی تو اُسے اپنی قسمت کا خیال نہ آتا حقیقت خواب بن جاتی اور خواب حقیقت کا جامہ پہن لیتا۔ ایسی گھڑیوں میں رامی سکھ کا احساس کرتی اور اُسے ایشور کی ہستی کا کچھ کچھ یقین ہونے لگتا۔ کئی بار دل ہی دل میں وہ اپنی ماں کو دعائیں دیتی کہ اُس کی ماں نے اُسے کچھ کام دے کر اُسے گاؤں کے بچوں کے ہنسی مذاق سے بچا رکھا ہے۔ یہ اچھا ہی تھا کہ ماں کی طرف سے رامی کے ایسے خیالات تھے۔ کیونکہ اُس کی ماں تو اُسے انسان تک سمجھنے سے قاصر تھی۔ اُس کے لئے تو رامی ایک بے جان مشین تھی۔ رامی چل پھر نہیں سکتی بُرا بھلا کہنے پر بھی چپ رہتی ہے۔ اُسے کسی نے روتے نہیں دیکھا۔ تو پھر اُسے چکّی پیسنے میں ہی کیوں نہ لگایا جائے گھر کا پسا ہوُا آٹا اچھا بھی تو ہوتا ہے۔

اپنے بھائی اور بہن سے عام طور پر رامی کی اَن بَن رہتی۔ اُس نے انہیں کبھی بُرا بھلا نہیں کہا، حوصلہ بھی نہیں تھا اور نہ خواہش تھی لیکن بچوں نے اپنا سلوک ماں سے سیکھا تھا۔ یوں ہی رامی کو کوسنا۔ بار بار اُسے اُس کی بدنصیبی کی یاد دلانا۔ ایسی باتوں میں انہیں مزا آتا تھا۔ جب کبھی رامی سے سیدھے مُنہ بات بھی کرتے تو اس ڈھب سے گویا اُس پر کوئی احسان کر رہے ہوں۔ ماں خود ہی رامی کو اُن سے جُدا رکھتی۔ رامی کی حفاظت کے لئے نہیں ننھی اور منّا کی بھلائی کے لئے۔ رامی اپاہج تھی۔ یہی تو ثبوت تھا کہ ایشور بھی اُس سے ناراض ہے۔ اِس میں کوئی شک کی گنجائش نہیں تھی کہ وہ کلموہی ہے۔ رامی کو ننھی اور

متنے سے زیادہ ملنے دیا جاتا تو انہیں نظر لگ جانے کا ڈر تھا۔ روز اُن کے سر سے مرچیں وار ی جاتیں۔ منگو کی لڑکی سے رامی نے ایک دن باتیں کی تھیں تبھی تو منگو کی لڑکی اس طرح کراہ کراہ کر مری۔ آنکھیں اُس کی باہر کو اُبلتی تھیں۔ ہاتھ پاؤں اُس کے اکڑ گئے تھے پر جان نکلنے میں نہیں آتی تھی۔ رامی کو دو دن کوٹھڑی میں بند رکھنا پڑا تھا۔ تب کہیں لڑکی کی چھاتی سے جان نکلی تھی۔ اُن کے تو گھر میں ہی رہتی ہے۔ مرچیں بھی نہ وار ی جائیں تو نظر اور منا دیکھنے کو بھی نہ ملیں!

دن پڑھتا تو رامی اپنی اندھیری کوٹھڑی میں پناہ لیتی۔ باہر دھوپ کھلتی۔ پیپل کے نیچے بچوں کے جھنڈ اکٹھے ہونا شروع ہوتے رامی چھپ چھپ کر دیکھتی۔ جب بچوں کی کھیل کود اُس کے لئے ناقابلِ برداشت ہو جاتی تو وہ آنکھیں بند کر کے چارپائی پر لیٹ جاتی۔ اپاہج اپنا دل یسے ہی بہلایا کرتے ہیں!

شاید رامی کی ٹانگیں ٹھیک ہو جاتیں۔ موت کے وقت رامی چوبیس سال کی تھی۔ پندرہ سال ہوئے رامی کے گاؤں میں ہی کرم دین نام کا ایک بوڑھا ترکھان رہتا تھا۔ اُس نے کامل حکیم ہونے کا کبھی دعوے نہیں کیا۔ لیکن سبھی جانتے تھے کہ بوڑھے کرم دین کو دوا دارو کے کچھ ٹوٹکے آتے ہیں جو ٹھیک بیٹھتے ہیں۔ عمرو کی ماں کا جب سردی سے جسم مڑ گیا تھا تو کرم دین نے ہی اُس بے چاری کو دو ہفتے میں اچھا بھلا کر دیا تھا۔ چرن سنگھ کے لڑکے کی ٹانگ ٹوٹنے پر کرم دین ہی مسیحا بن کے آیا تھا۔ پھر رامی کی ماں نے کرم دین کو مدد کے لئے کیوں نہ بلایا۔ بلایا تو تھا لیکن بات نہ بن سکی تھی۔ کرم دین غریب تھا۔ اُس کے پاس دوا دارو کے لئے دوا خریدنے کو پیسے نہ تھے۔ رامی کی ماں سے اُس نے بیس روپے مانگے تھے۔ مجھے بیس روپے دو، اُس نے کہا تھا۔ اس سے میں علاج کے لئے دوائیں خریدوں گا۔ میں یہ تو نہیں کہتا کہ رامی بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔ لیکن مجھے پکی امید ہے اور اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا تو رامی ایک مہینے میں چلنے پھرنے کے قابل ہو جائے گی۔

لیکن رامی کی ماں کو یہ بات نہ جچی تھی۔ پرانا کی باتوں کا کسی کو کیا پتہ اور اگر پتہ ہی نہیں تو بھروسا کیسا۔ رامی کی ماں نے انکار کر دیا تھا۔ اگر رامی اچھی نہ ہوئی تو مفت میں بیس روپے ضائع ہو جائیں گے اور رامی کی ماں اس جھمیلے میں پڑنے کو تیار نہ تھی۔

اگر رامی کی ماں بہت غریب ہوتی تو بات کچھ عجیب نہ تھی۔ لیکن اُن کی تو اچھی خاصی زمینداری تھی۔ دو کوئیں اپنے تھے۔ ایک باغ بھی تھا۔ کٹائی کے وقت تیس سے زیادہ مزدوروں کی ضرورت بھی آن پڑتی تھی۔ پر پھر بھی ان بیس روپوں کا خرچ رامی کی ماں کو گراں گذرتا تھا۔ رامی سب سے بڑی لڑکی تھی اور اپنے ماں باپ کی پہلی اولاد۔ اُس کے جنم سے پہلے اس کی ماں کو پوری امید تھی کہ لڑکا ہوگا۔ مگر جنم لیتے ہی رامی نے اُس کی آرزوؤں پر پانی پھیر دیا۔ ایک تو لڑکی، دوسرے اپاہج۔ رامی کی ماں کو کچھ دکھ ہوا ضرور تھا لیکن پھر اُس نے اپنے دل کو تسلی دے لی تھی کہ اس اپاہج کا بیاہ تو اب ہونے سے رہا۔ چلو ایک مصیبت سر سے ٹل گئی۔ لیکن رامی کے باپ کو بہت صدمہ پہنچا تھا۔ وہ زندہ تو سات سال اور رہا تھا لیکن وہ پرانی رونق اُس کے منہ پر پھر کبھی دکھائی نہ دی۔

لاہور والے چچا کے سامنے بھی ایک بار رامی کا تذکرہ چلا تھا۔ بس ایک بار ہی۔ وہ دکھی لوگوں کی کہانی سننے کے شوقین نہیں تھے اُن کو اپنے دفتر کا کام ہی بہت تھا۔ شام کو وہ سینما جانا پسند کرتے یا کلب میں برج یا ٹینس کھیلنے۔ لیکن اُس دفعہ انہوں نے اپنے ایک پڑوسی کو رامی کی بابت کچھ کہنے دیا تھا۔ شاید اس لئے کہ ان دنوں اُن کا اپنا چھوٹا بچہ بیمار تھا۔ اس پر انہوں نے رامی کی ماں سے پوچھا تھا کہ رامی کا کچھ علاج بھی کرایا ہے یا نہیں۔ پہلے تو ماں نے بات ٹال دی تھی کہ اُس قسمت کی ہیٹی کی زندگی تو ایسے ہی کٹ جائے گی۔ پھر اُس کے دل میں ماتا کی ہلکی سی لہر اُٹھی تھی اور اُس نے کرم دین اور بیس روپوں کا ذکر کر دیا تھا۔ اور چچا کہنے لگے تھے کہ اگر اس خرچ سے رامی اچھی ہو جائے تو بیس روپے دے دینے چاہئیں۔ پھر آپ ہی کہنے لگے کہ اِن گنوار حکیموں پہ زیادہ بھروسہ نہیں رکھنا چاہئے۔ ہو سکتا ہے کہ اُس کی دوا سے فائدے کی بجائے نقصان پہنچ جائے۔ جواب یہ تھوڑا بہت گھسٹ لیتی ہے اس سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے اور پھر رامی کو اپنی محرومی کچھ بہت چبھتی بھی تو نہیں۔ اُسے روتے کسی نے نہیں دیکھا۔ اس بے چاری کو اپنی حالت میں مست رہنے دو۔ ہزار روپیہ ماہوار تنخواہ لینے والے لوگ ایسی باتیں خوب اچھی طرح کر سکتے ہیں۔

لیکن چچا جی کو ایک اور بھی خدشہ تھا۔ وہ سوچتے تھے کہ اگر میں نے علاج کرانے پر بہت زور دیا تو کہیں بات بڑھ نہ جائے۔ ہو سکتا ہے کہ کرم دین کا ٹوٹکا ٹھیک نہ بیٹھے۔ ان گنوار حکیموں کا علاج اندھیرے میں گولی مارنے کی طرح ہوتا ہے۔ اگر رامی کی ماں نے کہہ دیا کہ اب رامی

کو لاہور میں لاکر بھی دکھایا جائے تو پھر؟ چاچی کی آنکھوں کے سامنے رامی کی گھسٹتی ہوئی اپاہج مورت پھر گئی۔ وہ کانپ سے گئے۔ گاؤں کی اور بات ہے۔ گاؤں کے لوگ سیدھے سادے ہیں۔ وہ کسی نہ کسی طرح رامی کی موجودگی کو برداشت کر سکتے ہیں۔ یہاں کوٹھی میں اس کا ٹھہرنا مشکل ہوگا۔ کمرے کمرے میں گھسٹتی پھرے گی۔ فرش اور دریاں خراب ہوں گی روز کتنے ہی ملنے والے آتے ہیں۔ وہ دیکھ پائیں تو کیا کہیں گے۔ رامی گاؤں میں ہی اچھی ہے۔

رامی کو اپنی اس چھوٹی سی دنیا دیکھنے کے لئے بہت وقت نہیں چاہیئے تھا۔ صبح جب اندھیرے میں ہی اُٹھ کر باہر کھیتوں میں جاتی تو بڑی بھلی سی ہوتی۔ سُورج نکلنے سے پہلے ہی وہ لوٹ آتی۔ دوپہر کی کھلتی ہوئی دھوپ۔ درختوں میں ہوا کا راگ۔ کھیتوں کے لہلہاتے پودے اور دُور گاڑی کی سیٹی۔ یہ رامی کی استعداد سے بہت دور کی باتیں تھیں۔ اسی لئے اُسے اپنی زندگی کو طویل کرنے کا شوق نہیں تھا۔ اُس کا سارا دن اپنی کوٹھڑی ہی میں کٹتا۔ اس کی چار دیواری سے اب وہ اچھی طرح واقف ہو گئی تھی۔ اُس پر سے گوبر کا لیپ اُتر چکا تھا۔ پہلے تو سال میں ایک بار نیا لیپ ہوا کرتا تھا۔ لیکن کچھ سالوں سے گھر کے سب لوگ سُست پڑ گئے تھے۔ دالان میں جو دروازہ کُھلتا تھا۔ وہ عام طور پر ہمیشہ بند رہتا۔ صبح منہ اندھیرے ہی کھیتوں کی طرف جانے کے لئے رامی دروازہ کھولتی۔ پھر کھانا کھانے کے وقت کواڑ کھلتا۔ گھسٹ کر رامی دالان میں آتی۔ اُس وقت سب روٹی کھا چکے ہوتے۔ ایک تھالی میں جو سب کا بچا کھچا رہتا اُس کے آگے رکھ دیا جاتا۔ سامنے سارے گھر کے برتن مانجھنے کو رکھے رہتے۔ رامی کبھی ایک کی طرف دیکھتی کبھی دوسرے کی طرف پھر کھانا کھا کر برتن مانجھنے میں لگ جاتی۔ اس دوران میں ہی نتھی یا منا کاتنے کے لئے روئی اندر کوٹھڑی میں رکھ آتے۔ شام کو رامی کی ماں دروازہ کھول کر اندر آتی اور جب تک اندر رہتی دروازہ کھلا چھوڑ دیتی۔ ایک طرف ٹوٹی ہوئی تپائی پر پڑے ہوئے دیئے کو جلاتی جس سے چکی کے پتھر اور اُن پر لگا ہوا لکڑی کا دستہ۔ چھت پر لگا ہوا لکڑی کا جالا اور مٹی کی دیواریں جن پر اب گوبر کا لیپ نہیں رہا تھا۔ شام کے دھندلکے میں سے دکھائی دیتی ہوئی چیزوں کی مانند معلوم دیتیں۔ رامی کی ماں چکی کے پاس ہی گیہوں کی ٹوکری پیسنے کے لئے رکھ دیتی سونے سے پہلے وہ ایک بار گیہوں لے کر پھر آتی تاکہ رامی صبح سے پہلے پہلے اُن کو پیس چھوڑے۔

کوٹھڑی کی تین دیواریں تو بالکل ٹھوس تھیں۔ چوتھی میں ایک چھوٹی سی کھڑکی تھی جس میں لوہے کی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ صبح صبح رامی گھسٹ کر اپنے آپ کو کھڑکی کے پاس لے آتی اور نئے سورج کی کرنوں سے دمکتے ہوئے دور کے درختوں اور کھیتوں کو دیکھتی ٹھنڈی ہوا رامی کے چہرے کو لگتی تو رامی کا چہرہ کھل اٹھتا اور وہ خوشی سے کچھ گنگنانے لگتی۔ جونہی گاؤں کے لوگ گھروں سے باہر نکلنے شروع ہوتے۔ رامی گھسٹ کر کونے میں اپنی چکی یا چرخے کے پاس جا بیٹھتی۔ وہ لوگوں کی طنزیہ نگاہوں سے بچنا چاہتی تھی۔ جب کام کرتے کرتے تھک جاتی تو چھت پر مکڑیوں کو اپنے جال میں پھنسی ہوئی مکھیوں کو کھاتے دیکھا کرتی۔ دوپہر کو جب باہر شور رہتا تو چپکے چپکے کھڑکی میں سے بچوں کو کھیلتے دیکھتی۔ شام کی خاموشی میں آسمان کے جلتے بجھتے تاروں پر آنکھیں جمائے رکھتی۔ جب دل گھبرانے لگتا تو کھاٹ پر لیٹ کر رو لیتی۔

یہ روز ہوا کرتا۔ رامی کی دنیا یہی کچھ تھی۔ چوبیس سال تک ایسی زندگی بسر کرتے کرتے وہ تھک سی گئی تھی اور ایک دن جب چکی پیستے پیستے گاڑی کی سیٹی سننے کے لئے وہ ذرا رُکی تھی تو سیٹی کی آواز کے ساتھ ہی جیسے اُس کا تعاقب کرتے ہوئے اس کی روح اس کے جسم کو چھوڑ کر چلی گئی۔

دھرم پرکاش آنند

اعلان

"کلیم" کے دفتر کو چونکہ ملیح آباد تبدیل کر دیا گیا ہے، اور ڈکلریشن وغیرہ کے سلسلے میں ابھی کارروائی مکمل نہیں ہو سکی ہے، اس لئے افسوس کے ساتھ اطلاع دی جاتی ہے کہ آئندہ پرچہ مشترک مئی جون ۱۹۳۹ء کا شائع کیا جائے گا۔
قارئین کرام آئندہ سے مندرجۂ ذیل پتے پر مراسلت فرمائیں۔

مدیر کلیم، دفتر کلیم، ملیح آباد۔ لکھنؤ

جوانی کا خواب

صبا کی تُنک آندھیاں چل رہی تھیں عجب رات تھی وہ سہانی سہانی
سکوتِ مکمل میں گُم ساری ہستی خموشی کی تھی ہر طرف راجدھانی
تخیل بھی بیدار ہونے لگا تھا ہر اک چیز میں آ گئی تھی روانی
ابھی رات انگڑائیاں لے رہی تھی ابھی سو کے اُٹھی تھی ظلمت کی رانی
یکایک وہ آئے خراماں خراماں چلے جیسے سیّارۂ آسمانی
ہر اک گام پر نازکی کی نمائش ہر اک سانس میں نغمۂ جاودانی
اداؤں میں مستی سموئی ہوئی سی نظر سے اُبلتی ہوئی نوجوانی
جبینِ حسیں مائلِ دل رُبائی لبِ نازک آمادۂ گُل فشانی
لُنڈھاتے ہوئے جنبشِ ہر نفس سے مسرت کے جامِ مئے ارغوانی
ہر اک ذرّہ انگڑائیاں لے کے اُٹھا تمنا بدامن ہوئی عمرِ فانی

مگر ہوش آیا تو کچھ بھی نہ پایا نہ اُلفت کا مندر نہ مندر کی رانی

کوئی خواب میں جیسے دُہرا رہا تھا
محبت کی بھولی ہوئی سی کہانی

علی احمد

دُنیائے ادب

تازہ ترین رسائل کے اہم مضامین

ہمارے ہاں مدت سے دستور چلا آتا ہے کہ دنیائے ادب کے عنوان کے ماتحت ہم ہر ماہ ہمعصر رسائل کے مضامین میں سے کوئی نہایت اچھا مضمون چن کر شائع کرتے ہیں۔ اکثر اوقات اس عنوان کے نیچے ایک ہی مضمون چھپ سکتا ہے۔ چونکہ اردو کے اچھے رسالوں کی تعداد روز بروز بڑھ رہی ہے اور ان میں ہر ماہ بہت سے اچھے مضامین نظم و نثر شائع ہوتے ہیں۔ اس لئے ہم نے مناسب خیال کیا ہے کہ دنیائے ادب میں ایسے تمام مضامین کا ذکر کر دیا کریں جو اردو کے اچھے رسالوں میں گذشتہ ماہ شائع ہوئے ہوں اور جو ہمارے نقطۂ نظر سے اہم اور قابلِ توجہ ہوں۔ اس سے کئی فائدے حاصل ہوں گے ان میں سے ایک یہ ہے کہ ادبی دنیا کے ناظرین ادبیاتِ حاضرہ کی رفتار و ترقی سے آشنا رہیں گے اور انہیں معلوم ہوتا رہے گا کہ ہمارے ادب میں کیا کیا نئی چیزیں آ رہی ہیں۔ دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ آج سے ایک عرصہ کے بعد اگر کوئی اہلِ قلم کسی قسم کی علمی جستجو کرنا چاہے گا تو ادبی دنیا کے اوراق سے اسے کاروانِ اردو کے چند نقوشِ قدم ضرور مل جائیں گے۔ تیسرا فائدہ یہ ہے کہ اس طرح ہمعصر رسائل کی کچھ تھوڑی سی خدمت کر کے ہم زبانِ اردو کے ادنیٰ خادموں میں شمار ہونے کے قابل ہو سکیں گے۔ امید ہے کہ ادبی دنیا کے اس چھوٹے سے اقدام کی قدر افزائی کی جائے گی۔ (رسائل کی فہرست حروفِ تہجی کے مطابق ہے)

اُردو (سہ ماہی بابت جنوری تا مارچ)

شکسپیئر کے چند بند کا ترجمہ۔ اردو ہمارے اُن رسائل میں سے ہے جنہیں ہم آسانی سے قدامت پسند کا لقب دے سکتے ہیں۔ اس لئے زیرِ نظر شمارے میں ہمیں بلینک ورس کا ایک لمبا نمونہ دیکھ کر قدرے تعجب ہوا۔ ہماری زبان میں نظم معرّیٰ کو رواج پائے زیادہ عرصہ نہیں گذرا اور جہاں تک ہمیں معلوم ہے اس بارے میں اہلِ پنجاب ہی نے سبقت کی ہے۔ پنجاب کے رسائل میں بعض نہایت اچھی معرّیٰ اور آزاد نظمیں ایک عرصے سے شائع ہو رہی ہیں لیکن یہ جنس تو جمنا پار اور نربدا پار کے علاقوں میں کچھ ایسی مقبول نہیں ہوئی۔ بارے اب اردو کا دفتر جمنا کے اِس پار آ گیا ہے اور شاید اسی کا اثر ہے کہ اس میں ایسی نئی چیزیں شائع ہونے لگی ہیں۔ عابد نواز جنگ صاحب نے ہیملٹ کے چند مشہور بندوں کا ترجمہ بلینک ورس یعنی نظم عاری میں کیا ہے۔ انہیں چند بندوں کا ترجمہ ۵ سال ہوئے حمید عرفانی صاحب کے قلم سے ادبی دنیا میں شائع ہو چکا ہے۔ عابد نواز صاحب کے ترجمہ کا نمونہ ملاحظہ ہو:-

وے یہ موت ہے کیا شے۔ فقط اک نیند کا عالم
مگر یہ آرزو دل کی کہ ہم اس نیند سے سو کر
مٹا دیں گے وہ ساری کلفتیں جو ارثِ آدم ہیں
تمنّا ہی تمنّا ہے۔ زہے قسمت جو پوری ہو

بسمل فیض آبادی اور اودھ کی قدیم ترین مثنوی کے عنوان سے ایک سیر حاصل مقالہ اس نمبر کی زینت ہے۔ مولوی عبدالباری صاحب آسی کا ذوقِ تحقیق قابلِ داد ہے کہ انہوں نے انتہائی جستجو سے ایک ایسے باکمال اردو شاعر کا کلام معرضِ گمنامی سے نکالا ہے جس کے ذکر سے اردو کے مروّجہ تذکرے خالی تھے بسمل فیض آباد کے رہنے والے اور دربارِ آصفی سے متعلق تھے۔ اور ان پر دلی اسکول کا کوئی اثر نہ تھا۔ انہوں نے میر حسن کا زمانہ پایا لیکن ان کا رنگ بالکل جداگانہ تھا۔ دیکھئے:-

الا اے ساقی بیعت شکن ناز — نہ رکھے کو لب ساغر سے تو باز
غنیمت ہے رہے عالم کوئی دم — ہے عرصہ زندگانی کا بہت کم
کہ شمع بزم ہستی آہ نفس یاد — سدا ہستی ہے زیر دامن باد
نہ اٹھ اور جام گل رنگ بھر کر — تو جلدی سے لب ساغر کو تر کر

یاد وطن کے نام سے مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی نے ایک دلآویز نظم لکھی ہے جس میں وطن کے مختلف مناظر کا چشم تخیل سے نظارہ کیا ہے اور جب ان ذہنی نقوش کو کاغذ پر اتارا ہے تو ان میں جابجا جذبات کے رنگ بھرے ہیں۔ دیکھئے دہلی کی صبح اور جمنا کا کنارا

ہر گھاٹ پہ دلی کے حسینوں کا وہ جمگھٹ — وہ سارھیاں سونگ کی وہ ماتھے کا گھونگھٹ
وہ حسن خداداد نہیں جس میں بناوٹ — قدرت کے تماشائی کا دل جس کو ہو لپٹ

آنکھوں میں وہی پھرتا ہے جمنا کا کنارا

اور ان کا وہ پھر گھاٹوں میں ڈبکی کا لگانا — گھبرا کے گریانی سے جلدی نکل آنا
بھیگی ہوئی ساڑھی میں بدن کا وہ چھپانا — تھک تھک کے وہ چلنا تھوں سے سورج کو چھپانا

آنکھوں میں وہی پھرتا ہے جمنا کا کنارا

ہمارا رسم الخط۔ عبدالقدوس صاحب ہاشمی نے رسم الخط کے مسئلے کا غائر نظر سے مطالعہ کیا ہے۔ ادبی دنیا میں ان کے دو مضمون اردو کے لئے عربی رسم الخط اور لاطینی رسم الخط کی موزونیت اور ناموزونیت کی بحث کے سلسلے میں شائع ہو چکے ہیں۔ زیر نظر مضمون میں مذکورہ مضامین کے مواد کے علاوہ کچھ نیا مواد بھی ہے۔ جس سے مضمون نہایت جامع اور سیر حاصل ہوگیا ہے۔ ہندوستان میں رسم الخط کا مسئلہ لسانیات کی حد سے نکل کر سیاسیات کے خارزار میں پہنچ چکا ہے۔ اس لئے ہم میں سے ہر ایک کو اس سے کچھ نہ کچھ واقفیت حاصل کرنا ضروری ہے۔ ہاشمی صاحب کا انداز بیان بے حد سادہ اور زبان نہایت سلیس ہے اور وہ پڑھنے والے کی ذہنی کیفیت کو اس خوبی سے سمجھتے ہیں کہ اسے اپنے مضمون سے اکتانے نہیں دیتے۔ "ہمارا رسم الخط" زبان کے اس اہم مسئلے کی بہت سی الجھنوں کو صاف کر دیتا ہے۔

انیس النسواں دہلی (اپریل)

لڑکیوں کی تعلیم۔ مشتاق احمد صاحب زاہدی نے نہایت سنجیدگی سے اس پیش پا افتادہ مسئلہ پر قلم اٹھایا ہے لیکن اس کے بہت سے نئے زاویے اور نئے رخ پیش کیے ہیں۔ وہ دن لد گئے جب اس موضوع پر بحث ہوتی تھی کہ لڑکیوں کو تعلیم دلائی جائے یا نہ دلائی جائے۔ اب زمانہ بہت آگے بڑھ گیا ہے۔ اور مسئلے میں جو نئی پیچیدگیاں پیدا ہوگئی ہیں۔ وہ غور و فکر کے لئے بہت سی باتیں پیش کرتی ہیں۔ زاہدی صاحب نے ان کا بہت اچھی طرح جائزہ لیا ہے۔

اورینٹل کالج میگزین (سہ ماہی فروری تا اپریل)

شمس العلما مولانا محمد حسین آزاد۔ آغا محمد باقر صاحب ایم اے نبیرہ مولانا محمد حسین آزاد مرحوم نے حضرت آزاد کے سوانح حیات پر ایک نہایت جامع مضمون لکھا ہے اور آزاد مرحوم کی سیرت کے معروف اور غیر معروف پہلوؤں پر دلکش انداز سے روشنی ڈالی ہے۔ مضمون بے حد دلچسپ ہے۔ خصوصاً اس کا وہ حصہ جو آزاد کے آخری سالوں کی داستان ہے۔ از بسکہ یہ مضمون خود آزاد کے خاندان کے ایک معتبر فرد کا لکھا ہوا ہے۔ اس لئے کسی کو واقعات کی صحت سے انکار کی گنجائش نہیں مل سکتی۔ آنے والے ادبی مورخوں کے لئے یہ مضمون نہایت قیمتی ثابت ہوگا۔

جامعہ (اپریل و مئی)

اقبال کا نوجوان از نورالحسن صاحب ہاشمی ایم اے ایک جامع اور لطیف مضمون ہے جو دو قسطوں میں شائع ہوا ہے۔ اقبال نے ملک و قوم کی جو سب سے بڑی خدمت کی ہے وہ اپنے سحر کلام سے ہمارے نوجوانوں کے جذبہ عمل کو بیدار کرنے اور ان کے دلوں میں ہمت کی چنگاری روشن کرنے کی کوشش ہے۔ ہاشمی صاحب نے اپنے مضمون میں اقبال کی تعلیم کے اس رخ پر نہایت عمدگی سے روشنی ڈالی ہے اگرچہ وہ کہیں کہیں نفس مضمون سے ذرا دور جا پڑتے ہیں لیکن بحیثیت مجموعی ان کی کاوش داد کے قابل ہے۔ جابجا علامہ مرحوم کے کلام سے موزوں مثالیں لے لے کر مضمون کی دل پسندی میں اضافہ کیا گیا ہے۔

زمانہ (اپریل و مئی)

ہندوستانی زبان کا مسئلہ۔ پچھلے دنوں دہلی سے ملک کے چار پانچ اکابر کی تقریریں ریڈیو پر نشر کی گئی تھیں جن کا موضوع تھا۔ "ہندوستانی زبان کیا ہے"۔ زیر نظر بحث میں جناب سہیل عظیم آبادی نے ان تقریروں پر تنقید کی ہے۔ اور سب کا خلاصہ بیان کر کے مختلف پیش کردہ نظریوں کا مقابلہ کیا ہے اور پھر نتیجہ پر ایک دلچسپ بحث کر کے

خود چند نتائج نکالے ہیں جن میں سے ایک یہ ہے " اب ہمارے لئے صرف ایک صورت باقی رہ جاتی ہے کہ ایمانداری کے ساتھ زبان کو زیادہ آسان بناتے چلے جائیں اور بس" اور دوسرا یہ " لیکن یہ سب کچھ جبھی ممکن ہے کہ تمدن، کلچر وغیرہ کے مفروضے ہمارے دماغوں سے نکل جائیں اور ہم اپنی سیاسی اور سماجی زندگی میں ایک ہی رجحان پیدا کرلیں۔ اسی لئے ہمیں زبان کو ایک کہنے سے پہلے اپنی سیاسی اور سماجی زندگی کو ایک بنانے کی کوشش کرنی چاہئے" سہیل صاحب نے زبان کا مسئلہ سلجھانے کی ترکیبیں تو اچھی پیش کی ہیں مگر یہ ترکیبیں بجائے خود عظیم الشان مسائل کی حیثیت رکھتی ہیں۔

علی گڑھ میگزین (سہ ماہی مارچ سے مئی تک)

خاندانِ برمکی کی مختصر تاریخ از سلیم حامد صاحب رضوی ایک دلچسپ اور قابلِ قدر مضمون ہے۔ رضوی صاحب نے تاریخ خلافت عباسی کے ایک نہایت دل آویز و رنگین باب کا خلاصہ چند صفحوں میں لکھ کر رکھ دیا ہے۔ اور ضروری مطالب اور جزئیات کی تفصیل سے کہیں گریز نہیں کیا۔ خاندان برامکہ کی علم دوستی شرافت پروری اور جود و سخا کی نظیر مشرق کی تاریخ میں کہیں نہیں ملتی اور اس کے عروج و زوال کی داستان زمانے کی نیرنگیوں کی ایک ایسی مثال ہے جو یقیناً اپنا ثانی نہیں رکھتی۔ جعفر برمکی کے قتل کا منظر از بس دردناک ہے اور اس مقالے کا بہترین مقام کہلانے کا مستحق ہے۔

ساقی (مئی)

"عہد رفتہ کی یاد میں" ماہر القادری صاحب نے ایک دلپذیر نظم لکھی ہے۔

گاؤں کے وہ لہلہاتے سبزہ زار خوشنما طائر قطار اندر قطار

نالیاں کھیتوں کی مثلِ آبشار ہر طرف سرسوں کے پھولوں کی بہار

زندگانی کا فسانہ یاد ہے

مجھ کو اب بھی وہ زمانہ یاد ہے

اسی طرح کے گیارہ بارہ بند ہیں اور سبھی اچھے ہیں لیکن افسوس ہے کہ ایک بند کے مصرعۂ اول میں وزن کا خیال نہیں کیا "گاؤں کی معصوم کنواری لڑکیاں۔ معصوم کی م تقطیع میں گر جاتی ہے۔ تعجب ہے کہ مدیر ساقی کی باریک بین نظر سے یہ غلطی کیونکر چھوٹ گئی۔

شاعر آگرہ (مارچ اپریل)

ہندوستان کے ٹھگ عبدالحفیظ صاحب نظر کا لکھا ہوا ایک نہایت دلچسپ مضمون ہے جس کی تدوین میں کافی محنت کاوش اور تحقیق سے کام لیا گیا ہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے دور آخر خصوصاً لارڈ ولیم بنٹنگ کے عہد میں ٹھگی کے استیصال کی زبردست کوشش کی گئی اور کرنل سلیمن نے ٹھگوں کے حالات رسوم۔ اور اعمال پر ایک نہایت دلچسپ کتاب بھی تصنیف کی۔ اردو میں جہاں تک ہمیں معلوم ہے اس موضوع پر کوئی مستند کتاب نہیں لکھی گئی۔ اس کے پیش نظر حفیظ صاحب کا یہ مقالہ بہت دلچسپی سے پڑھے جانے کی چیز ہے۔

شاہکار (مئی)

جعلی شہزادے۔ منشی محمد دین صاحب فوق تاریخی مضامین بہت اچھے لکھتے ہیں۔ یہ مضمون انہی کے قلم سے نکلا ہے اور اپنے انداز کا نرالا مضمون ہے۔ دور مغلیہ میں اور اس طوائف الملوکی کے زمانے میں جب ہندوستان سے تیموریوں کی حکومت اُٹھ رہی تھی۔ کئی ایسے منچلے لوگ پیدا ہوگئے جنہوں نے اپنے زمانے کی مختلف مشہور و معروف ہستیوں سے اپنے کو موسوم و منسوب کرکے عوام اور عمائدِ حکومت کو فریب دینے کی کوششیں کیں۔ منشی صاحب موصوف نے کمال جستجو اور تحقیق سے ایسے بہت سے لوگوں کے حالات بہم پہنچائے ہیں یہ مضمون تاریخی لحاظ سے قابلِ قدر ہے۔

نقوشِ احساس کے عنوان سے سید عبدالحمید عدم کی ایک بہت اچھی غزل بھی اسی شمارہ کی زینت ہے۔ چند شعر ملاحظہ کیجئے۔

میں اپنے ذوقِ رنگ پرستی کو کیا کروں اس گُل میں مانتا ہوں نہ بو ہے نہ باس ہے

اللہ رے بے نقابیٔ احوالِ عاشقی ہر مضطرب نگاہ میں اک التماس ہے

میں بھی حرم نشیں ہوں مگر اتفاق سے مجھ کو ہوائے دیر بھی تھوڑی سی راس ہے

مے ہو کہ زہر کچھ تو میسر ہوائے عدم حد سے فزوں جراحتِ ہوش و حواس ہے

افسوس کہ ایک مصرعے میں ایک کی بجائے اک چھپ گیا ہے۔ وہ مصرعہ یہ ہے۔ دل ایک تشنگی ہے نظر ایک پیاس ہے۔

نگار (اپریل)

ساٹھ سال کے بعد ہماری ادبیات

احمد حسین صاحب نے مذکورہ بالا موضوع پر ایک خیال انگیز مضمون لکھا ہے اور موجودہ تعلیمی اور سیاسی رجحانات کو مدنظر رکھ کر اردو ادب کی آیندہ رفتار کو جانچا ہے۔ از بسکہ ادب زندگی کا آئینہ ہے اور زندگی اس

دور میں ایک مسلسل انقلاب کا نام ہے۔ اس لئے لازم ہے کہ ادبیات میں بھی اس قدر تبدیلی پیدا ہو جائے کہ آج سے ساٹھ سال بعد ہمارا ادب کہیں سے کہیں جا پہنچے۔ لیکن وہ کن راہوں پر چل کر مستقبل کی منازل طے کرے گا۔ اس کے متعلق صحیح اندازہ کرنا ایک نہایت دشوار امر ہے ہمیں مسرت ہے کہ صاحب مضمون نے نہایت مدلل طریقے سے اُن شاہراہوں کی تفصیل بیان کی ہے جن پر اُن کے خیال میں ہماری ادبیات گامزن ہوں گی۔ ان کے خیال میں توسیع تعلیم کے بعد ایک ہی نسل کے اندر اندر مزدور اور کسان قارئین کی تعداد کروڑوں تک پہنچ جائے گی اور عامتہ الناس کی زندگی کے ہزاروں متنوع مناظر اور مختلف پیشوں۔ ریت رسموں اور دلچسپیوں کی جیتی جاگتی تصویریں کچھ اس طرح پیش کی جائیں گی کہ ادب کی تاریخ میں پہلے کبھی نہ کی گئی تھیں۔

ہل (مئی)

زیر نظر نمبر میں ایڈیٹر صاحب (شری ناتھ سنگھ) کا لکھا ہوا ایک افسانہ "کیا وہ واقعی خونی تھا" چھپا ہے۔ موضوع دولت مند زمیندار اور غریب کسان کی باہمی آویزش ہے اور افسانے کے پلاٹ بلکہ نام تک سے کسان کی مظلومیت کا پروپیگنڈا کیا گیا ہے۔ ٹکنیک کے لحاظ سے افسانہ بہت کامیاب ہے۔ اگرچہ ایک مخصوص مقصد کو پیش نظر رکھنے کے نقائص سے خالی نہیں ہے۔ زبان سادہ اور دلکش ہے لیکن بعض جگہ ادبی غلطیاں بھی نظر آتی ہیں جو ذرا سی احتیاط سے دور کی جا سکتی تھیں۔

ہمایوں (مئی)

گلاب کا پھول۔ سید عباس علی کے قلم نے گلزار ادب میں کھلایا ہے۔ یہ ایک بہت اچھا افسانہ ہے جس میں مرد کی نیرنگیٔ فطرت کا نقشہ ایک اچھوتے انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ افسانے کی فضا بہت نکھری ہوئی ہے اور یہی اس کی سب سے بڑی خصوصیت ہے عطیہ کا کردار ایک دلچسپ انسانی مطالعہ ہے۔ اگرچہ اس کی مثالیں ہماری سوسائٹی میں بہت کمیاب ہیں۔

زلزلے۔ محمد باقر صاحب نسیم رضوانی نے لندن کی مخلوط مجلسی زندگی کا ایک دلکش مطالعہ اس عنوان کے ماتحت پیش کیا ہے ہندوستانیوں کو مغرب کی فضا میں جن معاشرتی اور تمدنی انقلابات میں سے گذرنا پڑتا ہے اُن کا ایک ہلکا سا نقش اس مضمون کی فضا پر چھا رہا ہے۔ ماورائے ماحول سے کامل سازگاری اختیار کرنے میں جو دو چار بڑے سخت مقام آتے ہیں۔ اُن پر ایک لطیف پیرائے میں طنز کی گئی ہے۔

قطرہ و دریا۔ حامد علی خاں صاحب مدیر ہمایوں کی ایک تازہ نظم ہے اور ان کے پختہ طرز کلام کی پوری آئینہ دار۔ ملاحظہ کیجئے۔

اسی عالم میں کہ بیدار نہ تھا میں گویا
مجھ سے قطرے تھے مخاطب بزبان الہام

تو نے پایا نہیں سرچشمۂ ہستی کا سراغ
ہم کو دریا میں فنا ہو کے ملا عیش دوام

یہی انجام ہے قطرے کا یہی ہے آغاز
ہے ابھی بے خبر آغاز سے تیرا انجام

ہندوستانی (اپریل)

چکبست۔ پر ڈاکٹر تاراچند صدر مدیر نے ایک دلچسپ، اگرچہ مختصر مضمون لکھا ہے اور اُن کے کلام پر تبصرہ بھی فرمایا ہے۔ چکبست کی قومی اور بیانیہ شاعری ہماری زبان میں ایک خاص امتیاز اور مرتبہ رکھتی ہے اور اُن کی ان خصوصیات کے پیش نظر یہ مقالہ بہت دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔ چکبست کا کلام اگرچہ مختصر تھا۔ لیکن اپنی تازگی سلاست اور جذبات کی صحیح عکاسی کی بدولت اُس نے ہماری ادبیات میں ایک ممتاز مقام حاصل کر لیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے یہ مقالہ لکھ کر بہت سے اہل ذوق کو "صبح وطن" کا گرویدہ بنا دیا ہے۔

صلاح الدین احمد

شعر

گاہ مری نگاہِ تیز چیر گئی دلِ وجود
گاہ اُلجھ کے رہ گئی اپنے توہمات میں

اقبالؔ

ہندوستان میں چھاپہ خانوں کا پہلا دور

(۱۵۷۷ء لغایت ۱۷۰۰ء)

ہندوستان میں چھاپہ خانوں کے آغاز کے متعلق معلومات قریب
یب معدوم ہیں۔ دو چار کتابیں ہیں بھی تو اُن غیر ملکی زبانوں میں ہیں جن سے
یہ ہندا استفادہ نہیں کر سکتے۔ انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا سے بالعموم تمام حل
ب مسائل پر کچھ نہ کچھ روشنی پڑ جاتی ہے، لیکن اس باب میں وہ
ل خاموش ہے۔ دوسری طرف بالفور کی "سائیکلوپیڈیا آف انڈیا" نے
ہدوستان میں مطابع کی تاریخ پر جو بیان درج کیا ہے، اس میں سولھویں
ستر ھویں صدی کے مطابع کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے۔ اس کے بیان
ے مطابق ہندوستان میں مطبع کا آغاز ۱۷۱۲ء میں اس زمانے میں ہوا
ب ٹراونکور میں پراٹسٹنٹ" مشنریوں نے اپنی خدمات کا سلسلہ
روع کیا تھا۔

زمانۂ حال میں سب سے پہلے "منگلور میگزین" (کرسمس ۱۹۰۱ء) نے
ہدوستان میں چھاپہ خانوں کے آغاز کے باب میں تحریر کیا تھا کہ ہندوستان
ں سب سے پہلی کتاب ۱۵۷۷ء میں کوچین میں طبع ہوئی۔ اس اعلان
ایک معنی میں سنسنی پیدا کر دی۔ متعدد اخبارات ورسائل نے اس بیان
ی مخالفت وتائید میں مضامین شائع کئے۔ سب سے زیادہ مدراس میل"
ے اس بحث میں حصّہ لیا۔ اُس نے اپنی اشاعت مورخہ ۱۸ مارچ ۱۹۰۱ء
ں لکھا تھا:۔

"سر ولیم ہنٹر نے امپیریل گزیٹیر آف انڈیا جلد چہارم ص ۱۱۲ میں
تحریر کیا ہے کہ ہندوستان میں سب سے پہلی کتاب ۱۵۷۷ء میں
کوچین کی جیسویٹ سوسائٹی نے طبع کی۔ اسی قسم کا ایک بیان لفٹنٹ
ایچ۔ ایس براؤن نے اپنی کتاب "ہینڈ بک آف پورٹس آف انڈیا
اینڈ سیلون" (ص ۲۹) میں درج کیا ہے۔ یہ دونوں بیانات غلط
ہیں۔ جیسویٹ پادری گوا میں سولھویں صدی کے اول نصف میں
آئے۔ فونسیکا نے ہسٹری آف گوا" (ص ۵۸) میں لکھا ہے۔ کہ
انہوں نے گوا میں آنے کے تھوڑے دنوں بعد یورپ سے
دو پریس منگائے اور انہیں اپنے دو کالجوں، سینٹ پال اور ر
ریشول میں قائم کیا۔ یہ دونوں کالج ۱۵۴۱ء میں قائم ہوئے اور
روز افزوں ترقی کر رہے تھے۔ ان کالجوں کے اسٹاف میں کئی
نامی گرامی ہستیاں شامل تھیں۔ مثلاً سینٹ فرانسس زیویر۔۔۔۔
گوا میں یہ پریس ۱۵۵۰ء میں آئے یعنی واسکوڈی گاما کے ہندوستان
آنے کے ۵۱ برس بعد۔ جیسویٹ پادری غیر معمولی طور پر سرگرم تھے۔
ترقی کے دلدادہ تھے۔ اور خاص طور پر کوشاں تھے کہ سائنس ولٹریچر
کی کسی شاخ کو ہاتھ لگائے بغیر نہ چھوڑیں گے۔ ان حالات میں یکیونکر
یقین کر لیا جائے کہ ان لوگوں نے دونوں پریسوں کو ۲۷ برس
تک اپنے یہاں بیکار پڑا رہنے دیا۔ ۱۵۴۱ء میں گوا کے وائسرائے
جان ڈی کیسٹرو کو شاہ پرتگال، جان سوم نے حکم دیا تھا کہ گوا کے
اُن دیہات میں جہاں مسیحی خاندان پائے جاتے ہیں، ابتدائی مدارس
قائم کئے جائیں۔ اس حکم کی تعمیل ہوئی اور مسیحی بچوں کو مذہبی تعلیم
کے لئے سینٹ فرانسس زیویر نے "مسیحی تعلیم کا خلاصہ" بطور سوال
وجواب تیار کیا جو ۱۵۵۷ء میں طبع ہوا۔"

(فونسیکا: ہسٹری آف گوا ص ۵۸، راوزینل کانکویسٹ جلد اول ص ۱۰۸)

اس خط کی اشاعت کے بعد ہندوستان کے اخبارات کے علاوہ
غیر ملکی اخبارات بھی اس بحث میں شریک ہوگئے۔ اس سلسلے میں بشپ
میڈلی کاٹ کا وہ مضمون خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہے جو آپ نے
رسالہ "ٹیبلٹ" میں شائع کیا تھا۔ آپ نے ہندوستان کے اول مطبع کا صحیح
زمانہ تعین کر کے اس بحث کو گویا ختم کر دیا۔

(۱) گوا[1] ۱۵۵۶ء جیسویٹ پادریوں نے گوا میں آنے کے کچھ عرصہ بعد
یورپ سے دو پریس منگائے اور اُن کو اپنے دو کالجوں میں قائم کیا۔
پریس ۱۵۵۰ء میں آئے تھے مگر معلوم ہوتا ہے کہ چند سال تک واقعی اُن
سے کام نہیں لیا گیا۔ ۱۵۵۷ء میں سینٹ فرانسس زیویر نے "کاٹی کزم آف
دی کرسچن ڈاکٹرن" (مسیحی تعلیمات، بطور سوال وجواب) مدوّن کی جو چھاپ کر
شائع کی گئی۔ یہ سب سے پہلی کتاب تھی جو گوا میں طبع ہوئی۔ جس کتاب سے

[1] پرتگیزی دور میں گوا ہندوستان سے الگ نہ تھا۔ بلکہ اس کا شمار بھی ہندوستانی مقبوضات" میں تھا

یہ معلومات حاصل کی گئی ہیں، اُس کا بیان ہے کہ:-

"بچوں کی صحیح تعلیم کی غرض سے زیویر نے ایک کاٹی کزم تیار کی جو گوا میں ۱۵۵۶ء میں طبع ہوئی"

(اوینیل کا کیتھولک بیسٹ مطبوعہ بمبئی ۱۸۹۷ء جلد اول)

اس کتاب میں مذکور ہے کہ کاٹی کزم کے علاوہ ایک پرائمر سے بھی کام لیا جاتا تھا جس کو فادر مارکس جارج نے تالیف اور فادر ٹامس سٹیونس ایک انگریز نے مقامی زبان میں ترجمہ کیا۔ اس بیان سے مترشح ہوتا ہے کہ ۱۵۵۶ء کی کاٹی کزم مقامی زبان میں نہ تھی، بلکہ پرتگالی زبان میں تھی۔ گوا کے مطبع کے متعلق جو دستاویزیں موجود ہیں اُن سے نیز بعض قدیم دستاویزوں سے بھی، اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ ہندوستان میں سب سے پہلی کتاب مالابار میں طبع ہوئی تھی۔

۲۔ کوچین ۱۵۷۷ء | گوا کی کاٹی کزم کی طباعت کے ۲۰ برس بعد ۱۵۷۷ء میں یعنی کیکسٹن پریس کی سب سے پہلی کتاب کی طباعت کے کامل ایک صدی بعد جیسوئیٹ سوسائٹی کے ایک ہسپانوی ممبر جان گنسالوس نے سب سے پہلی بار ملائلم تامل زبان کے حروف کندہ کئے اور سینٹ فرانسس زیویر کی "مسیحی تعلیمات" کا ترجمہ کھرسٹیہ وناکم کے نام سے چھاپا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کا ایک نسخہ پیرس کے قومی کتب خانے میں اب تک موجود ہے۔

یہاں تک تو قدیم و جدید شہادتیں متفق ہیں، لیکن جب جان گنسالوس کے پریس کے مقام وقوع کو دریافت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تو مالابار کے دو مقام اس اعزاز کے مستحق ثابت ہوتے ہیں کوچین کے با اثر اخبار آرگس کی رائے پڑھ کر تعجب ہوتا ہے جو اُس نے اس بارے میں ظاہر کی ہے

"۔۔۔ یہ بات کچھ حتمی نہیں کہ سب سے پہلی کتاب کوچین میں طبع ہوئی جیسوئیٹ پادری ۱۵۴۹ء میں کوچین میں آئے اور ۱۵۵۲ء میں یہاں کی عبادت گاہ باقاعدہ طور پر اُن کے حوالہ کی گئی۔ اس زمانے میں مشنری خدمات کا مرکز گوا تھا۔ کوچین میں اُن کا کوئی اہم ادارہ نہ تھا۔۔۔۔"

(آرگس مورخہ ۲۳ مارچ ۱۹۶۱ء)

یہ دعوے سراسر غلط ہے۔ کوچین کے قلعے میں پادریوں کی قیام گاہ اور گرجہ گھر کے علاوہ سوسائٹی کا ایک کالج بھی تھا جس میں تین سو سے زائد طلباء زیر تعلیم تھے۔ خود سینٹ فرانسس زیویر اپنے گوا اور روم کے احباب کو کوچین کالج کے بارے میں کچھ لکھتے رہتے تھے۔

ہم نے بیان کیا ہے کہ کوچین میں ملائلم تامل زبان میں کاٹی کزم طبع ہوئی تھی۔ ذرا اُن اسباب اور وجوہ پر بھی نظر ڈالنا چاہئے جو اس کے محرک ہوئے۔ جیسوئیٹ سوسائٹی کی تاریخ میں مذکور ہے کہ سوسائٹی کے جنرل نے فادر ویلیسگنانی کو وزیٹر کی حیثیت سے گوا و مالابار کے صوبوں کے معائنہ کو بھیجا تھا۔ آپ ۴۴ پادریوں کے ساتھ سنہ ۱۵۷۴ء میں گوا پہنچے۔ اس زمانے میں مغربی ساحل پر کچھ مذہبی بدمزگی پیدا ہو گئی تھی۔ فادر ویلیسگنانی اُن شکایات کو رفع کرنے کی غرض سے گوا سے مالابار تشریف لے گئے، اور کلیسائے سینٹ ٹامس کے آرچ بشپ سے متعدد ملاقاتیں کیں۔ بالآخر یہ بات طے ہوئی کہ جیسوئیٹ سوسائٹی کے کارکن وپی کوٹہ کی سکونت اختیار کریں اور عوام کی مذہبی تعلیم و تربیت میں آرچ بشپ اور اُن کے مددگاروں کا ہاتھ بٹائیں۔ ان حالات میں اس بات پر تعجب نہ ہونا چاہئے کہ انہیں سب سے پہلے کاٹی کزم کی طباعت کا خیال پیدا ہوا۔ گوا میں اس طریقے سے کام لیا جا چکا تھا۔ علاوہ بریں، کاٹی کزم کے ذریعے سے مذہبی تعلیم دینا سب سے پہلا کام ہے جو تمام مسیحی فرقوں میں اختیار کیا جاتا ہے۔

فادر فرانسس ڈی سوزا لکھتے ہیں:-

"ہم نے مالاباری زبان میں کاٹی کزم کی طباعت کے کام کو ہاتھ لگایا۔ برادر جان گنسالوس نے چھپائی کے لئے چوبی ٹھپے (بلاک) تیار کئے۔ یہ سب سے پہلی کتاب تھی جو ہندوستان میں چھپی، اور چونکہ یہ ایک بالکل نئی چیز تھی، علاقہ کے لوگوں نے بھی اس کی خاطر خواہ قدر کی۔"

یہی رائے ویراپولی کے مذہبی حلقہ کے رومن کیتھولک پادریوں کی ہے، جنھوں نے ۱۸۷۰ء میں کیرالا میں مسیحی مذہب کی تاریخ شائع کی ہے۔ اس "تاریخ" کے مصنف بشپ مائیکل نس نے قدیم یادداشتوں نیز سولھویں اور سترھویں صدی کے مصنفین سے بہت استفادہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:-

"۔۔۔ سینٹ پال کالج کے منتظمین نے قلعۂ کوچین میں ۱۵۷۷ء میں ملائلم زبان میں ایک کاٹی کزم چھاپی جس کے لئے جان گنسالوس نامی ایک جیسوئیٹ برادر نے ٹھپے بنائے تھے۔"

مسٹر جی میکنزی اپنی کتاب "ٹراونکور میں مسیحیت" میں وپی کوٹہ کے پریس کے بارے میں لکھتے ہیں:-

"ہندوستان میں یہ پہلا مطبع نہ تھا۔ ۱۵۷۷ء میں ایک ہسپانوی، جان گنسالوس نے کوچین میں سب سے پہلی مرتبہ ملائلم تامل زبان

کے حروف تیار کرکے ایک کاپی کرزم چھاپی تھی۔"

اُوزیٹیل کا نکویسٹ[1] کے بیان کے علاوہ جو دو تحریریں ہم نے پیش کی ہیں اگرچہ نسبتاً زمانۂ حال کی ہیں، لیکن بیشتر قدیم یادداشتوں پر مبنی ہیں۔ ذیل میں دو اور شہادتیں ملاحظہ ہوں:-

(۱) سب سے پہلی کتاب جو ٹائپ سے طبع ہوئی، جان گنسالوس کی طبع کردہ "مسیحی تعلیمات" ہے۔ ہمارے علم میں جان گنسالوس پہلا شخص ہے جس نے اول بار تامل حروف کندہ کئے۔"

(۲) ۱۵۷۷ء میں کوچین میں جان گنسالوس نے پہلی مرتبہ مالاباری تامل حروف لکڑی پر کندہ کئے جن کے ذریعے سے "مسیحی مذہب کی ابتدائی تعلیم" ہندوستان میں اوّل کتاب کی حیثیت سے طبع ہوئی۔"

جان گنسالوس کا پریس کوچین کے پرتگالی قلعہ میں قائم تھا۔ ۱۵۷۸ء میں بھی ایک پریس قلعہ کوچین میں تھا۔ مگر ۱۵۷۷ء والے پریس سے اس کو اُس سے کچھ واسطہ نہیں۔ کوچین پر جب چھ ماہ کے محاصرے کے بعد ڈچ قبضہ ہوا۔ (۱۶ جنوری ۱۶۶۳ء) تو انہوں نے کوچین کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ جیسوئٹ پادریوں کو بہت زیادہ نقصان اُٹھانا پڑا۔ ان کو خارج البلد کیا گیا۔ ان کے متعدد راہب خانوں، شاندار کالج، دو شفاخانوں، بشپ کی قیام گاہ اور نیز گرجوں کا نام و نشان تک مٹا دیا گیا۔ اکتوبر ۱۷۹۵ء میں کوچین پر انگریزوں کا تسلط ہوا۔ رہی سہی کسر ۱۸۰۶ء میں انہوں نے پوری کردی یعنی پرتگالی دور کے تمام آثار کو بارود سے اُڑا دیا۔ بہت سی پبلک عمارات اور ایک عظیم الشان کتھیڈرل جو ڈچ لوگوں کی دستبرد سے بچ رہے تھے، اس بار وہ بھی مٹ گئے۔

(۳) پنی کیل ۱۵۷۸ء ۱۵۷۸ء میں ایک مطبع موضع پُنی کیل (ضلع تناولی) میں قائم ہوا۔ یہ موضع کیپ کامرن سے بیس میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ اور اُس زمانے میں موتیوں کی پیداوار و تجارت کا خاص مرکز تھا۔ یہ مطبع فادر جان ڈی فبریا نے قائم کیا تھا۔ اس زمانے میں کورومنڈل کے ساحل کی زبان تامل تھی۔ پادری صاحب مذکور نے تامل زبان کے حروف خود کاٹے اور پھر اُن کو ڈھال کر مذہبی تعلیم کے لئے کئی چھوٹی چھوٹی کتابیں چھاپ کر شائع کیں۔ مزید برآں انہوں نے تامل زبان کا قاعدہ اور اسی قسم کی دو ایک کتابیں اور بھی چھاپیں تاکہ اس علاقے میں کام کرنے والے مشنری وہاں کی زبان لکھنا پڑھنا سیکھ سکیں۔ مطبوعہ کتابیں اُس زمانے میں ایک عجوبہ تھیں۔ مسیحیوں کے علاوہ غیر مسیحی بھی مانگ مانگ کر اُنہیں بڑے اشتیاق سے پڑھتے تھے۔

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ پُنی کیل کے مطبع میں جو ٹائپ استعمال ہوتا تھا، اُس کا ایک ایک حرف جمایا جاتا تھا۔ کوچین کے مطبع کی طرح سالم صفحے کا ٹھپہ تیار نہیں کیا جاتا تھا۔

(۴) وپی کوٹہ ۱۶۰۲ء سینٹ ٹامس کلیسا سے معاہدہ ہونے کے کچھ عرصہ بعد ۱۵۷۹ء میں جیسوئٹ پادریوں نے وپی کوٹہ (چنامنگلم) کو اپنا مستقر بنایا۔ یہ مقام کرنگانور سے جانب جنوب ایک میل کے فاصلے پر تھا۔ ۱۵۸۱ء میں یہاں انہوں نے ایک عبادت گاہ بنائی اور ۱۵۸۴ء میں مدرسۂ الٰہیات قائم کیا، اور ۱۵۸۷ء میں ایک کالج قائم کیا۔ اُسی زمانے میں انہوں نے پاپائے روم سے استدعا کی کہ باشندگان مالابار کی مذہبی تعلیم کے لئے مخصوص کتب ارسال کی جائیں۔ پاپائے روم (کلیمنٹ ہشتم) نے کتابیں تو ارسال نہ کیں بلکہ ایک پریس اور کلدانی زبان کا ٹائپ بھیج دیا۔ یہ پریس ۱۶۰۲ء میں آیا۔ اور فادر البرٹ لارشی نے اس کو وپی کوٹہ میں قائم کیا۔ مطبع قائم ہونے کے بعد پے در پے کئی کتابیں طبع ہوئیں۔ یہ سب کتابیں مذہب کی ابتدائی تعلیم کے متعلق تھیں، اور کلدانی زبان میں چھاپی گئی تھیں۔

(۵) امبلاکاڈ ۱۶۷۹ء ایک اور مطبع ۱۶۷۹ء میں موضع امبلاکاڈ میں قائم ہوا۔ یہ موضع ترچور سے بیس میل جانب جنوب واقع تھا۔ امبلاکاڈ سترھویں صدی میں جیسوئٹ پادریوں کی مصروفیات کا مرکزی مقام تھا۔ ۱۶۱۶ء میں اس جگہ ایک مدرسۂ الٰہیات بھی قائم ہوا تھا جو سینٹ پال سمینری کے نام سے مشہور تھا۔ اس گاؤں کا ایک حصہ وہاں کی زبان میں اب تک ایک ایسے نام (SAOPAULOUR.) سے مشہور ہے۔ جس کا ترجمہ ہے "سینٹ پال کا گاؤں"۔

ترچور کے مسیحیوں سے روایت ہے کہ امبلاکاڈ میں ایک مطبع ۱۵۵۵ء میں قائم ہوا تھا۔ لیکن کسی تحریری شہادت کی عدم موجودگی میں اس کو وثوق کے ساتھ پیش نہیں کیا جا سکتا۔ امبلاکاڈ کے مطبع سے سب سے پہلے "تامل و پرتگیزی ڈکشنری" (مولفہ فادر انتونی پرونیزا، متعلقہ مدورا مشن) ۱۶۷۹ء میں طبع ہوئی۔ اس ڈکشنری کے لئے ایک مالاباری

[1] ہر دو شہادتوں کا ماخذ لاطینی زبان کی دو کتابیں ہیں جو ۱۵۹۶ء و ۱۶۴۶ء میں روم میں طبع ہوئیں۔

مسیحی نے تامل زبان کے الفاظ کے ٹھپّے تیار کئے تھے۔

ڈکشنری کی طباعت واشاعت کے بعد امبلاکاڈ کے مطبع سے او. بہت سی کتابیں تیں چھپ کر شائع ہوئیں. بلکہ کہنا چاہیئے کہ چین اور وپی کوٹہ کے مطابع کے مقابلے میں یہاں کے مطبع نے نمایاں ترقی کی تھی۔ تامل حروف کے لئے چوبی ٹھپّے استعمال کئے جاتے تھے اور یورپین زبانوں کے الفاظ کے لئے بہت سے حروف جو لائے گئے تھے لیکن کچھ عرصہ بعد تامل حروف بھی ڈھال لئے گئے تھے چنانچہ ۱۷۱۳ء کے بعد تامل کتابیں سیسے کے حروف سے چھاپی گئی ہیں۔

جن مطابع کا ہم نے ذکر کیا ہے، اُن کا کسی سائیکلوپیڈیا میں ذکر نہیں ہے۔ چنانچہ سائیکلوپیڈیا آف انڈیا نے ہندوستان میں چھاپہ خانوں کا آغاز اٹھارھویں صدی کے شروع میں بتایا ہے۔ ہم نے صرف سولہویں اور سترھویں صدی کے مطابع کا ذکر کیا ہے، اور ہمارے خیال میں وہی زمانہ ہندوستان میں چھاپہ خانوں کا پہلا دور تھا۔ اُس کے بعد اٹھارھویں صدی میں مطابع کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے۔ پہلے دور میں چھاپہ خانوں کی پیدائش ہوئی اور دوسرے دور میں اُن کی نشوونما۔

اٹھارھویں صدی میں اس کام میں پروٹسٹنٹ مشنریوں نے نمایاں ترقی کی تھی بمنجملہ ان کے ڈاکٹر ولیم کیری کا نام خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہے، جنہوں نے ہندوستان کی دس بارہ زبانوں مثلاً بنگالی، ناگری، سنسکرت، تیلگو، پشتو، برمی، تامل، سنگالی، ملائی وغیرہ میں انجیل مقدس کا ترجمہ چھاپ کر شائع کیا تھا حتیٰ کہ چینی زبان میں بھی انجیل مقدس شائع کی، جس کی طباعت کے لئے سیسے کے حروف تیار کئے گئے تھے، حالانکہ خود چین میں چوبی حروف یا ٹھپّے استعمال ہوتے تھے۔ ڈاکٹر کیری کے مطبع واقع سیرامپور نزد کلکتہ کی مصروفیات و ترقی کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ انہوں نے اپنی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے ٹائپ فاؤنڈری اور کاغذ سازی کا کارخانہ قائم کیا تھا۔ وہاں کا کاغذ آج تک "سیرام پوری" کے نام سے مشہور ہے۔ ٹائپ کا کارخانہ ۱۸۶۰ء تک اور کاغذ سازی کا ۱۸۶۵ء تک قائم و جاری رہا۔

ڈاکٹر ولیم کیری کی گراں بہا خدمات کا تذکرہ کسی آیندہ موقع پر ہدیۂ ناظرین کریں گے۔

"زمانہ" بہ اجازت

پیارے لال شاکر (میرٹھی)

نقد و نظر

سخنورانِ دکن

مولفہ جناب تسکین عابدی۔ لکھائی چھپائی اچھی۔ کاغذ سفید ڈمی۔ ضخامت کتابی سائز کے چار سو صفحات۔ متعدد عکسی تصاویر۔ قیمت تین روپے۔ (سے)
ملنے کا پتہ: مکتبۂ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن۔

تسکین عابدی صاحب کے نام سے ناظرینِ ادبی دنیا خوب آشنا ہیں کہ ان کے شگفتہ مضامین گاہے ماہے اس رسالے میں چھپتے رہتے ہیں۔ تسکین صاحب نے سخنورانِ دکن کے نام سے دکن کے اُن اردو شعرا کا ایک تذکرہ تصنیف کیا ہے جو عہدِ عثمانی میں یعنی ۱۹۱۱ء سے لے کر آج تک سرزمین دکن میں موجود رہے۔ یا موجود تھے۔ اور اس خصوصیت میں انہوں نے ملکی اور غیر ملکی کی تمیز روا نہیں رکھی۔ اس تذکرے میں تقریباً چھ سو شعراء کے مختصر حالات اور ان کے کلام کے نمونے دیئے گئے ہیں اور حق یہ ہے کہ مؤلف نے ان کی تدوین میں بہت کاوش اور جستجو سے کام لیا ہے۔

جناب نیاز فتح پوری نے اس تالیف کا پیش لفظ لکھا ہے۔ اور ہمارے مکرم دوست سید تمکین کاظمی نے کہ جناب تسکین کے اُستاد بھی ہیں۔ ایک فاضلانہ مقدمہ تحریر فرمایا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ خاص دکن کے شاعروں کا کوئی اچھا تذکرہ اس سے پہلے نہیں لکھا گیا۔ بقول صاحبِ موصوف "مولانا صوفی ملکاپوری نے شعراءِ دکن کا ایک تذکرہ دو حصوں میں شائع کیا تھا مگر اس میں خواجہ حافظ بھی دکنی شاعر بنا دئیے گئے تھے کیونکہ ان کا مقصد دکن تشریف لانے کا تھا۔ اس قسم کی بدحواسیاں اور لوگوں نے بھی کی ہیں ــــــ مگر دکن کے شعراء کا اور پھر ایک خاص دور کی حد تک محدود تذکرہ کسی نے آج تک مرتب نہیں کیا تھا۔"

تذکرہ نویسی، جہاں تک کہ اس کا تعلق زبان کی خدمت اور ادبیات کی بقا سے ہے ہماری ادبی زندگی کا ایک ضروری جزو ہے اور ہمیں ایسی ہر کوشش کی داد دینی چاہیئے جس کے ذریعے سے کوئی مصنف یا مؤلف ادب کے کسی بکھرے ہوئے شیرازے کو یک جا کرتا اور اس کی تدوین و اشاعت سے اس کی بقا کا سامان بہم پہنچاتا ہے۔ لیکن ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ اگر ہمارے تذکرہ نویس تعداد کی بہ نسبت کیفیت کی طرف زیادہ توجہ کریں تو بحیثیت مجموعی وہ ادب کی بہتر خدمت انجام دیں گے۔ مثلاً زیرِ نظر تذکرے میں جہاں کئی ایک اچھے شعراء کا کلام درج کیا گیا ہے۔ وہاں بے شمار ایسے شاعروں کے نتائجِ طبع بھی موجود ہیں جن کی ذاتی یا ادبی حیثیت بالکل غیر اہم ہے۔ آج سے سو سال کے بعد جب کوئی محقق عہدِ عثمانی کے شعرائے دکن کی نسبت کچھ جاننے کے لئے کسی کتب خانے سے اس تذکرے کی ایک جلد حاصل کر کے پڑھے گا تو اُسے جہاں اس عہد کے بیسیوں غیر معروف شعراء کے دو دو چار چار بے مزہ اشعار ملیں گے وہاں اچھے شعراء کے بھی دو چار سے زائد اشعار دستیاب نہیں ہو سکیں گے۔ تسکین صاحب بہت اچھا کرتے اگر وہ اوجھڑ، ڈاکٹر۔ اور اس قسم کے دیگر بے شمار کم درجہ شعراء کے کلام کے زیادہ وسیع انتخاب سے اپنے تذکرہ کی زینت بڑھاتے بھلا آزاد انصاری کے آٹھ فانی کے دس صدق جائسی کے چار اور ماہر القادری کے تین اشعار سے ان بلند پایہ شعراء کے کمال کا کوئی کیونکر اندازہ لگا سکتا ہے اور پھر تذکرے تو زیادہ تر آنے والی نسلوں کے لئے ہوتے ہیں ہم اور آپ تو اپنے معاصرین اور اُن کے مدارج سے تھوڑے بہت آگاہ ہوتے ہی ہیں یہی بات حالات پر صادق آتی ہے کم درجہ کے شاعروں کی نسبت آپ بے شک یہی انداز اختیار کیجیے جو اس تالیف میں عموماً اختیار کیا گیا ہے مثلاً ــــ صاحب اورنگ آبا

کے رہنے والے ہیں کبھی کبھی مقامی اخبارات میں آپ کا کلام نظر آتا ہے۔ یا فلاں فلاں صاحب وکالت بھی کرتے ہیں اور شعر بھی کہتے ہیں" لیکن ایسے شعراء کی نسبت جن پر دورِ عثمانی کو ناز ہونا چاہئے فقط اس قسم کی معلومات بہم پہنچا کر کہ "بارہ ایک سال سے بیدر میں متعین ہیں۔ غزل اور نظم خوب کہتے ہیں آپ کی نظمیں آج کل کے رسائل کی جان ہوتی ہیں۔ نہایت اچھا کہنے والے ہیں" ان کے تذکرے کو ختم کر دینا پڑھنے والے کو گویا پیاسا مارنا ہے۔ کیا اچھا ہوتا اگر صاحبِ تذکرہ زیادہ نہیں تو چوٹی کے دس بارہ شعراء کی ادبی اور مجلسی زندگی کی گوناگوں کیفیتوں اور خصوصیتوں پر کچھ روشنی ڈالتے جو سو سے زائد قافیہ باز حضرات کے حالات اور کلام کی تلاش میں انہوں نے جس کاوش سے کام لیا ہے۔ اگر اس کا ایک حصہ بھی وہ اس لطیف جستجو میں صرف کرتے تو ان کے تذکرے کو چار چاند لگ جاتے۔

تذکرہ زیرِ نظر کی ترتیبِ مضامین یہ ہے کہ پہلے حضور نظام اور شہزادگان دکن کے کلام کا انتخاب درج کیا گیا ہے۔ ان کے بعد دکن کی کم و بیش پچیس شاعرات کو جگہ دی گئی ہے۔ ہم نے نہایت شوق سے اس باب کا مطالعہ کیا مگر افسوس کہ ایک آدھ کے سوا کسی شاعرہ کا کلام بلند پایہ نہیں ہے۔ رسارا بیگم ستارا کے چند اشعار کچھ اچھے معلوم ہوئے۔ دیکھئے:-

جوش گریہ نے کر دیا خاموش ۔۔۔ قصۂ غم انہیں سنا نہ سکے
کی دمِ نزع اس نے پرسشِ حال ۔۔۔ لب کو جنبش ہوئی بتا نہ سکے
یوں سما جاؤ میری نظروں میں ۔۔۔ پھر کوئی دوسرا سما نہ سکے

شاعرات کے بعد بہ ترتیبِ ہجا شعراء کا نمبر ہے۔ ان میں چند ایسے نام بھی ہیں جن کی شہرت دکن سے نکل کر ہندوستان کے کونے کونے میں پھیل چکی ہے۔ مثلاً استاد جلیل، ضامن کنتوری، اختر۔ عزیز۔ ثاقب۔ امجد۔ آزاد انصاری۔ فانی۔ ماہر القادری۔ علی منظور۔ وجد۔ زیبا۔ میکش۔ صدق۔ علی احمد۔ ان میں سے آخری دس شعراء سے ناظرینِ ادبی دنیا اچھی طرح آشنا ہیں۔ کیونکہ ان کا کلام اکثر ان اوراق کی زینت رہا ہے۔ اور حضرات جلیل۔ ضامن۔ اختر۔ عزیز اور ثاقب کا کلام بھی محتاجِ تعارف نہیں اور اس تذکرہ میں ان شعراء کا جس قدر انتخاب درج کیا گیا ہے۔ اس کا یہاں نقل کرنا اس لئے لاحاصل ہے کہ اس سے ان کے کمال کا پورا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ البتہ بعض ایسے شعراء کے کلام کے نمونے دینا بے جا نہ ہوگا جن سے شمالی ہند کے لوگ اچھی طرح واقف نہیں۔

حامی آپ خوش فکر نوجوان ہیں، نظم اچھی کہتے ہیں۔ نظم دیکھئے:-

گھنے درختوں کا سایہ سکوت پر تو راز ۔۔۔ فسونِ شام میں افسانہائے سوز و گداز
خموش پل سے ندی کے کوئی گذرتا ہے ۔۔۔ کہیں چراغ کسی جھونپڑے میں جلتا ہے
کچھ عورتیں کہیں اپنے گھروں کو جاتی ہیں ۔۔۔ فسردہ شام کا غمگین گیت گاتی ہیں
شگفتہ پھول سیاہی میں منہ چھپاتے ہیں ۔۔۔ کہیں چراغ ستاروں کے جھلملاتے ہیں
طیور اپنے سنہری پروں کو پھیلائے ۔۔۔ ہوائے سرد کی سرشاریوں میں لہرائے
خموشیاں سرِ کہسار کیف کا عالم ۔۔۔ ستارے ہیں محبت کا نغمۂ پیہم
فلک پہ ابر کے اڑتے ہوئے سفینے ہیں ۔۔۔ شفق کی گود میں بکھرے ہوئے نگینے ہیں
نظر کے سامنے پھیلی ہوئی حسین دنیا ۔۔۔ تصورات کے رنگین خواب ہیں گویا

توفیق۔ ان کے متعلق صاحبِ تذکرہ لکھتے ہیں:- "حضرت توفیق دکن کے بہترین غزل گو شاعر تھے۔ آج سے پندرہ بیس سال قبل حیدر آباد میں صرف دو ہی شاعر تھے۔ ایک توفیق دوسرے کیفی۔ اگر توفیق اپنے وقت کے میر تھے تو کیفی سودا۔"

انتخاب ملاحظہ ہو۔

ہاں سچ ہے کہ بیجا ہے کبھی تم نے کسی کو ۔۔۔ ہاں سچ ہے کہ میرا ہی کہیں گھر نہیں ملتا

ہزار ہا پردۂ حیا میں بھی جلوہ گر حسنِ یار ہوگا ۔۔۔ چھپے گا جتنا یہ راز بن کر اسی قدر آشکار ہوگا
لئے ہوئے چشمِ شوق میں ہم ہزار ہنگامۂ تماشا ۔۔۔ انہیں امیدوں پہ جی رہے ہیں کبھی تو عالم دوچار ہوگا

کبھی پردہ در ہوں میں راز کا کبھی ہوں میں پردۂ راز میں
کہ حقیقت اک مری مشترک ہے حقیقت اور مجاز میں
میری شہرتیں مجھے کھینچ لائیں فریب دے کے گریز میں
وہ طلسمِ عالمِ راز ہوں کہ رہا ہوں مدتوں راز میں
وہ طلسمِ گم شدگی ہوں میں کہ فنا ہے اپنی بقا مجھے
مری خامشی ہے نواگری میں نہاں ہوں پردۂ ساز میں

یوں تو مری پرسش کو احباب تمام آئے ۔۔۔ پر کوئی نہیں آیا ایسا کہ جو کام آئے

عارف (میر لطف علی) نمونۂ کلام:-

جو دل رکھ کے دلدار نے شرم رکھ لی ۔۔۔ بڑی بات کی یار نے شرم رکھ لی
مرے دل کی کچھ بھی نہ تھی قدر و قیمت ۔۔۔ مگر اک خریدار نے شرم رکھ لی

غرض اس قسم کے سینکڑوں شاعر ہیں اور ہزاروں اشعار

اور ان میں بہت اچھے، اچھے، خاصے، اور بُرے سبھی شامل ہیں تسکین صاحب نے اس تذکرہ پر بہت محنت کی ہے۔ بیان بہت سلیس اور صاف ہے اگرچہ کہیں کہیں دکنی انداز نمایاں ہے۔ ہم اپنے ناظرین سے اس کے مطالعہ کی پرزور سفارش کرتے ہیں۔

"ص"

انسان از لالہ کاشی رام چاولہ۔ حجم دوسو اٹھاسی صفحات۔ قیمت آٹھ آنے لکھائی چھپائی اور کاغذ عمدہ۔ ملنے کا پتہ: معرفت مصنف دفتر ڈپٹی کمشنر صاحب۔ ہوشیار پور۔

لالہ کاشی رام اس سے پیشتر پریم ترنگ یا ترانۂ اُلفت کے مصنف بھی ہیں۔ کرشن مہاراج، مہاتما بدھ، حضرت عیسیٰ، حضرت محمدؐ اور بابا نانک کی تعلیمات کا جو مقصد تھا اُسی کو پیش نظر رکھ کر چاولہ صاحب نے "انسان" تصنیف کی ہے۔ اس کتاب میں تصوف اور فلسفہ ملا ہوا ہے۔ لیکن اس سے کتاب کی دلچسپی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ جگہ جگہ ہندی دوہے، شلوک اور اردو فارسی اشعار نظر آتے ہیں اور فارسی اور ہندی سنسکرت کا اردو ترجمہ بھی وضاحت کے لئے درج کر دیا گیا ہے۔ کتاب میں کہیں کہیں جو دبے ہوئے مذاق کی مثالیں مل جاتی ہیں وہ مذاق سے بڑھ کر ایک حد تک مضحکہ انگیز ہو گئی ہیں۔ اُن میں سے ایک ذیل میں درج کی جاتی ہے۔ مولانا رومؒ کی مثنوی کا ایک مشہور حصہ یوں شروع ہوتا ہے،

گفت لیلیٰ را خلیفہ کاں توئی
کز تو مجنوں است حیران و غوی؟

اسی حصے کو بدلتے ہوئے لالہ کاشی رام فرماتے ہیں:۔

"موجودہ زمانے میں اگر پریم کی مثال دیکھنی ہو تو ایڈورڈ ہشتم کو دیکھئے کہ جس نے پریم کو نبھانے کے لئے اس عظیم الشان سلطنت پر ٹھوکر ماردی کہ جس کی حد میں سورج کبھی غروب نہیں ہوتا۔"

گفت سمپسن را وزیرے کاں توئی
کز تو وِنڈسر شد پریشان و غوئی
از دگر خوباں تو برتر نیستی،
گفت خامش شو تو وِنڈسر نیستی

ترجمہ (بزبانِ مصنف) ایک وزیر نے مسز سمپسن (معشوقۂ ایڈورڈ ہشتم) کو کہا کہ کیا تو ہی ہے کہ جس نے ونڈسر کو پریشان اور خراب کیا ہے۔ تو تو کوئی انوکھی حسینہ نہیں ہے۔ مسز سمپسن نے ڈانٹ کر کہا کہ بس خاموش تو ونڈسر نہیں ہے۔"

کسی کسی جگہ مصنف نے اساتذہ کے کلام پر بھی اصلاح دے دی ہے مثلاً

صفحہ ۱۲ پر غالب کا ایک شعر یوں درج ہے ؎

عاشقی صبر طلب اور تمنا بے تاب
دل کا کیا حال ہوا خون جگر ہونے تک

اسی صفحے پر ایک اور شعر ہے:۔

سر بوالہوس کا حسن پرستی شعار ہے
اب آبروئے شیوۂ اہل نظر گئی

صفحہ ۱۶۵ پر لکھا ہے ؎

وفاداری بشرطِ استواری عین ایماں ہے
مرے گر دیر میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو۔

معلوم نہیں مصنف نے شعروں کے اقتباس دیتے ہوئے دیوان غالب کا کون سا نسخہ سامنے رکھا تھا۔ امید ہے کہ آیندہ اشاعت میں یہ خامی دور کر لی جائے گی۔ اشعار کے علاوہ کتاب کی دلچسپی کو بڑھانے کے لئے اور مضمون کی وضاحت کے طور پر مصنف نے پرانی کتب سے حکایات اور روایات سے بھی مدد لی ہے۔ اور یوں کتاب کی یکسانی میں ایک تنوع پیدا ہو گیا ہے۔

"م"



SHAHI
BEST IODIC
BRAIN & NERVES
شاہی



MISWAK
MISWAK
PROPHYLACTIC
TOOTH BRUSH



فہرستِ مضامین ادبی دنیا لاہور

بابت ماہِ اگست ۱۹۳۹ء

جلد ۱۷ تصاویر۔ ۱۔ شام۔ ۲۔ اِفلاس **نمبر ۸**

سالانہ چندہ مع محصول ڈاک اور وی پی پانچ روپے ممالک غیر سے دس شلنگ

حمیدی پریس ہسپتال روڈ لاہور میں باہتمام مسٹر صلاح الدین پرنٹر و پبلشر چھپ کر دفتر ادبی دنیا کمرشل بلڈنگ مال روڈ لاہور سے شائع ہوا۔

دنیائے کاروبار

جواکسم ہیر آئل

میسرز سی۔ کے سین اینڈ کمپنی لمیٹڈ کلکتہ کا تیار کردہ بہترین ہیر آئل ہے ہندوستان قدیم کی طب یونانی میں جڑی بوٹیوں سے ایسی ایسی نادر و بیش قیمت چیزیں تیار کی جاتی رہی ہیں جو انسانی جسم کے مختلف حصوں کیلئے بہت زیادہ مفید ثابت ہوتی رہی ہیں۔ آج بھی جبکہ دنیا جدید سائنٹفک نظریات کی روشنی میں ہر چیز کو دیکھنے کی عادی ہو چکی ہے۔ جڑی بوٹیوں سے تیار شدہ ایسی ایسی چیزیں موجود ہیں جن کا جواب نہیں میسرز سی۔ کے سین اینڈ کمپنی لمیٹڈ کلکتہ کی مشہور اور پرانی فرم کی ادویات ہمیشہ قدیم ویدوں کی ہدایات کی روشنی میں بنائی جاتی رہی ہیں۔

جواکسم ہیر آئل۔ اس فرم کا تیار کردہ بہترین آئل جو اپنی نفاست اور عمدگی کی بنا پر مشہور ہونے کے علاوہ نمائشوں سے تمغہ جات حاصل کر چکا ہے۔ پبلک کے جدید رجحانات کو دیکھتے ہوئے اب اس تیل کا پیکنگ اتنا خوشنما بنا دیا گیا ہے کہ بہترین سے بہترین ولایتی تیلوں کے پیکنگ کو مات کرتا ہے۔ اب یہ تیل بہترین شیشی کے ساتھ ڈبے اور سنہری بکس میں دستیاب ہو سکتا ہے۔ ہم ناظرین ادبی دنیا سے سفارش کرتے ہیں کہ وہ ضرور اس خوش نما تحفہ کا استعمال کریں۔

آل انڈیا حج کانفرنس

پہلی آل انڈیا حج کانفرنس کا انعقاد بمبئی میں خان بہادر حاجی شیخ علی باکنہ کی زیر صدارت عمل میں آیا۔ اس کانفرنس میں حجاج کی ان تمام تکالیف پر بحث کی گئی جو انہیں حج کے دوران میں پیش آتی ہیں اور حج کرانے والی کمپنیوں کو ان کے تدارک کا مشورہ دیا گیا نیز اس امر پر بھی بحث کی گئی کہ مسلمان سرمایہ داران اس بزنس کی طرف توجہ کریں مسٹر محمد حسن ایڈیٹر روزنامہ "الہلال" چیئرمین استقبالیہ کمیٹی نے اپنی تقریر کے دوران میں اس خبر کہ پنڈال کے باہر جو ہینڈ بل تقسیم کئے جا رہے ہیں کہ یہ کانفرنس کسی خاص حج کمپنی کی حمایت میں منعقد کی جا رہی ہے کی تردید کی۔

اس کانفرنس میں کل آٹھ ریزولیوشن پاس کئے گئے۔ شمالی ہندوستان میں بکنگ کے خطرات کے پیش نظر یہ تجویز کیا گیا کہ اس کا علاج قاعدہ نمبر ۱۳ میں ترمیم کی جائے واپسی ٹکٹ کے متعلق بھی یہ ریزولیوشن پاس کیا گیا کہ جو کمپنیاں واپسی ٹکٹ دیتی ہیں وہ جدہ سے واپسی کے انتظامات سال بھر رکھیں محض دو ماہ کے لئے نہیں۔ اگر وہ ایسا نہ کر سکیں تو مسافروں کا ادا کیا ہوا کرایہ واپس کریں۔ کانفرنس نے اور ریزولیوشن بھی پاس کئے جن میں حجاج کی آسائش کے پیش نظر لائبریریوں۔ نماز کے لئے جگہ۔ بیسر کی جگہ۔ خواتین کیلئے پردے کا انتظام وغیرہ وغیرہ کا مطالبہ کیا گیا۔

لسٹر ینم ٹائلٹ سوپ

میسرز لسٹر رائٹی سپنگ اینڈ ٹریڈنگ کمپنی لمیٹڈ کلکتہ کا تیار کردہ بہترین صابن ہے اس صابن میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو ایک صابن میں ہونا چاہئیں۔ اس کا استعمال انسانی جسم کی جلد کو اچھی اور پر صحت حالت میں رکھتا ہے اور بہت حد تک ان جلدی امراض سے محفوظ رکھتا ہے جو جلد کی پرواہ کرنے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ اس صابن کے استعمال سے غسل فرحت بخش ہو جاتا ہے۔ اور جسم کے ہر حصہ میں تازگی ٹھنڈک اور سرور پیدا ہوتے ہیں۔ ان ہی اوصاف کی بنا پر یہ صابن ہندوستان کے ہر شہر میں ہر جگہ دستیاب ہو سکتا ہے۔ ہم ناظرین "ادبی دنیا" سے اس کے استعمال کی سفارش کرتے ہیں

سیمنس (انڈیا) لمیٹڈ

کی تنتیسویں رپورٹ بابت (۳۸-۱۹۳۷) حال میں ہی شائع ہوئی ہے جس میں بہت سے دلچسپ واقعات مرجود ہیں بحیثیت مجموعی کل بزنس میں گزشتہ سال کی نسبت بیس فیصدی کا اضافہ ہوا ہے۔ اس کام کے عظیم الشان ہونے کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ سیمنس (انڈیا) لمیٹڈ اور ان سے متعلقہ دوسری کمپنیوں کا کل بزنس ۱۵ کروڑ سے زیادہ ہے اس شہرۂ آفاق ادارے میں اس وقت ایک لاکھ اسی ہزار افراد کام کرتے ہیں۔ گزشتہ سال انہیں مانچکورا میں پاور سٹیشن بنانے کا ٹھیکہ حاصل ہوا۔ اسی طرح جنوبی امریکہ میں دریائے رانے نیگرو پر اور دیگر میں بجلی پہنچانے کا کام بھی انہیں کے سپرد ہوا۔ ہندوستان میں بھی اس ادارے کی شاخیں وسیع پیمانے پر کام کر رہی ہیں اور اپنے کاروبار سے متعلق ہر قسم کی ضروریات بہم پہنچانے کے لئے مشہور ہیں۔

پکار

فی الحقیقت ادبی نقطہ نگاہ سے انسانی جذبے کے اس دردانگیز اظہار کا نام ہے پکار جس میں انسانی احساس کی ترجمانی کی گئی ہو۔

اس انسانی جذبے کے احترام کے پیش نظر اور رعایا میں اصول مساوات کو برقرار رکھنے کے لئے سلاطین مغل میں سے جہانگیر ہی وہ بادشاہ تھا جس کی عظمت و جلال تک ہر انسان کے الفاظ پہنچ سکتے تھے یعنی اس کے محل میں زنجیر لٹکتی تھی جسے رعایا کا ہر فرد ہلا سکتا تھا اور اپنی فریاد جہانگیر کے سامنے پیش کر سکتا تھا

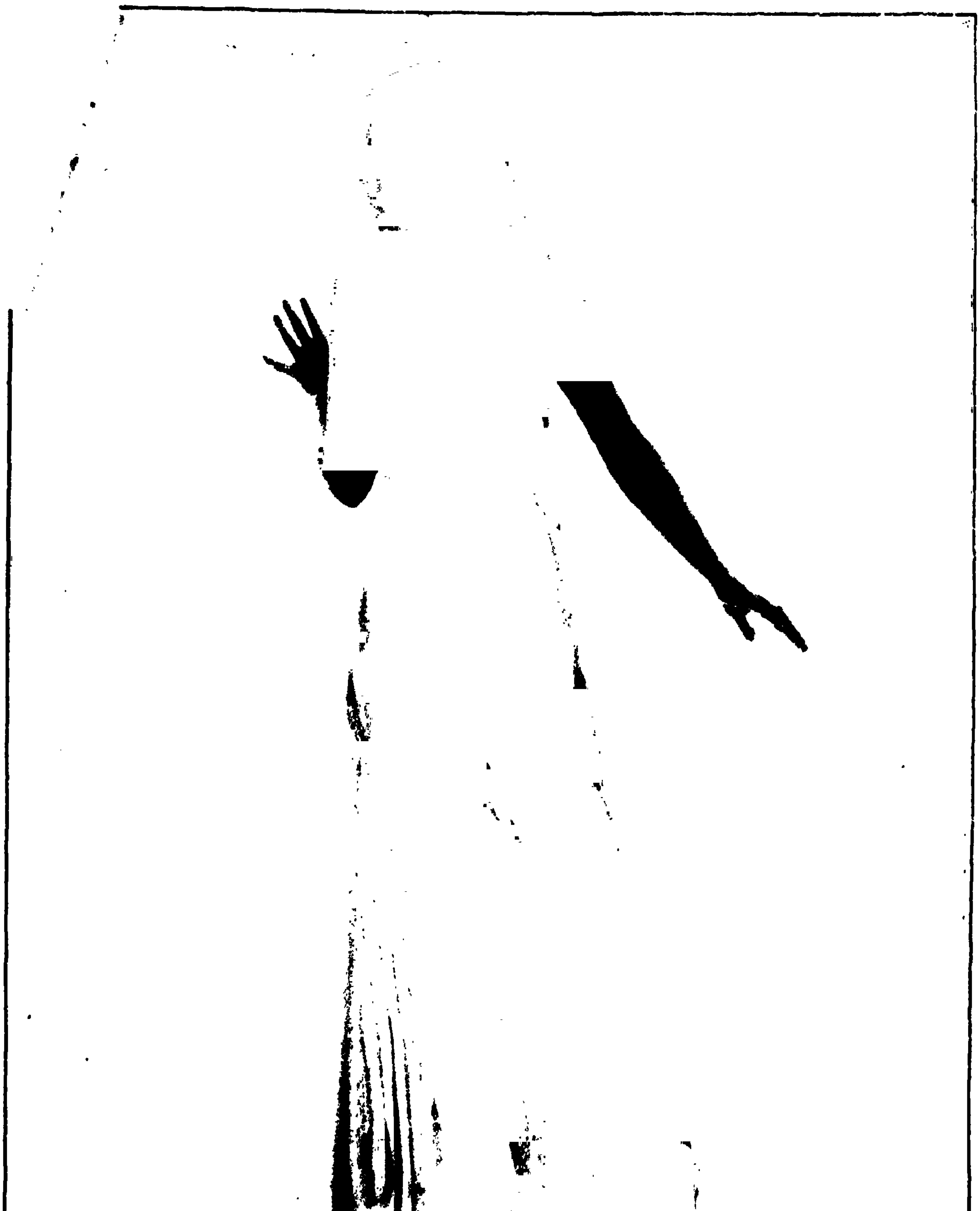
جناب سہراب مودی کی منروا مووی ٹون نے اپنی فلمیں جیلر اور طلاق بنا کر ہندوستانی فلمی صنعت میں حیرت انگیز ترقی کا اضافہ کیا ہے۔ اب آپ عہد مغلیہ کے پرجلال زمانے کی عدل پرورانہ روایات اور عدل جہانگیری کی دادرس مثالیں دنیا کے سامنے پیش کرنے کے لئے "پکار" نامی فلم بنا رہے ہیں جس میں منروا مووی ٹون کے بہترین اداکار مصروف کار ہیں۔

ہم امید کرتے ہیں کہ یہ فلم ہندوستانی صنعت فلم کی ترقی میں بیش بہا اضافے کا موجب ہوگی۔





اِفلاس



شام

بزم ادب

اس دفعہ سید شہنشاہ حسین صاحب رضوی کا مضمون عہدِ مغلیہ کی ٹکسالیں اور پروفیسر اظہر علی فاروقی کا مضمون ڈاکٹر نذیر احمد کا ایک ناول دونوں مساوی طور پر انعامی مضامین قرار پائے ہیں اور اسی طرح اُپندر ناتھ صاحب اشک کا افسانہ "تہذیب" اور خلیل احمد صاحب کا افسانہ "سایہ" دونوں کو انعام کے قابل سمجھا گیا ہے۔ ہر ماہ کی انعامی رقم بیس روپے مقرر ہے لیکن اب کے اس میں آٹھ روپے کا اضافہ کر کے چاروں صاحبوں کو سات سات روپے پیش کئے جا رہے ہیں۔

موجودہ نمبر میں اہم رسائل کے بہترین مضامین کے تعارف کی تیسری قسط شائع ہو رہی ہے۔ ہمارے بہت سے قلمی معاونین اور ناظرین نے اس سلسلے کو بے حد پسند کیا ہے۔ لیکن تعجب ہے کہ ہمارے معاصرین میں سے کسی ایک نے بھی اس پر اپنی رائے کا اظہار نہیں کیا۔ حالانکہ یہ اُن کی خاص دلچسپی کی چیز تھی۔ ہم اردو کے تمام رسائل کو ایک ہی خاندان کے ارا کین اور ایک ہی درخت کی مختلف شاخیں سمجھتے ہیں اور اس لئے ہمیں اپنے صفحات پر اُن کے ذکر سے ایک خاص مسرت محسوس ہوتی ہے۔ معلوم نہیں یہ احساس یک طرفہ ہے یا مشترک۔ مگر ابھی تک بیشتر معاصرین کی طرف سے اس کا کوئی حوصلہ افزا ثبوت نہیں ملا۔ بہر حال ہمارے ہاں یہ سلسلہ بند نہیں ہوگا اور ہمارے ناظرین ہر ماہ اردو کے بہترین مضامین نظم و نثر سے متعارف ہوتے رہیں گے۔

ہمارے شعرا نے آغاز ہی سے اپنے جذبات و افکار کے اظہار کا ذریعہ غزل کو بنا رکھا ہے۔ لیکن جب سے باقاعدہ نظم کا رواج ہوا ہے۔ یہ صنفِ سخن آہستہ آہستہ اردو شاعری پر چھا رہی ہے یہاں تک کہ ہمارے رسائل میں اکثر غزلوں کے عنوان نظموں کے ڈھب پر رکھے جاتے ہیں۔ مثلاً محض غزل لکھ دینے کی بجائے آئینۂ حیرت، محشرِ جذبات، اعجازِ بیان، نوائے راز، تجلیات، حسنِ نظر" وغیرہ عنوان لکھے جاتے ہیں۔ ان میں بعض اوقات شاعر کے تخلص کی رعایت مدنظر رکھی جاتی ہے۔ اور بعض دفعہ ایک شاعر اپنے لئے ایک عنوان یوں ہی مخصوص کر لیتا ہے۔ یہ طریقہ "ادبی دنیا" میں بھی برسوں رائج رہا۔ لیکن دو ماہ سے ہم غزل کا عنوان غزل ہی دیتے ہیں۔ اگرچہ اس سے ہمارے بعض کرمفرماؤں کو اختلاف ہے۔ اور وہ مُصر ہیں کہ اُن کی غزلوں پر اُن کے پسندیدہ عنوان دئیے جائیں غزل کو ہمارے ادب میں جو اہمیت حاصل ہے اُس سے ہرگز انکار نہیں کیا جا سکتا اور عنوانات کے موجودہ رواج سے غزل ایک غیر نمایاں سی چیز ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس لئے ہم غزل اور نظم کے امتیاز کو نمایاں کرنے کے لئے غزل کو غزل ہی کے نام سے پکارنا بہتر سمجھتے ہیں۔ امید ہے کہ ناظرین اس بارے میں ہم سے متفق ہوں گے۔

ناظرین کو یہ معلوم کر کے مسرت ہوگی کہ ہمارے معزز دوست جناب عبدالسمیع صاحب پال آثر صہبائی کی نظموں کا مجموعہ "ذکر و فکر" کے نام سے عنقریب شائع ہونے والا ہے۔ اس مجموعے میں صرف آثر کی نظمیں ہوں گی۔ غزلیں اور رباعیاں نہیں۔ جناب آثر نے جو بلند درجہ رباعیات لکھنے اور غزل کہنے میں حاصل کیا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ اپنی نظموں میں وہ اس سے بھی اونچے مقام پر پہنچیں گے۔

اسی طرح ہمارے لئے یہ اعلان کرنا بھی باعثِ مسرت ہے کہ ادبی دنیا کے معاونِ خصوصی پروفیسر رگھوپتی صاحب فراق گورکھپوری کا مجموعۂ کلام بھی بہت جلد چھپنے والا ہے۔ اس میں جناب فراق کی پختگیِ فکر کے بہت سے شگفتہ نمونے دیکھنے میں آئیں گے۔ نام ہوگا، "سازِ ہستی"۔ ہمیں امید ہے کہ ہمارے ناظرین ان دونوں مجموعوں کے مطالعے سے فائدہ اٹھائیں گے۔

صلاح الدین احمد

آئینۂ عالم

گاندھی سے ایک امریکن کی ملاقات

برما کو نکال کر ہندوستان کی آبادی ۳۸ کروڑ نفوس کے قریب ہے۔ یا شاید اس سے بھی زیادہ۔ ان تمام ہندو، مسلمان، سکھ، پارسی اور یورپین افراد میں ایک ہستی ایسی بھی ہے جس کے لئے ان تمام لوگوں کے دلوں میں عزت و احترام کا جذبہ موجود ہے۔ یہ شخص گاندھی ہے جسے اس کی بزرگی کی وجہ سے "مہاتما" کہا جاتا ہے۔

بظاہر ہندوستان پر برطانوی وائسرائے لارڈ لنلتھگو شہنشاہ معظم کی طرف سے حکمران ہیں۔ ان کے محل کے پھاٹکوں پر سپاہیوں کا پہرہ ہر وقت موجود رہتا ہے۔ جب کبھی وہ کسی تقریب پر باہر نکلتے ہیں تو نیزہ بند سواران کی گاڑی کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں اور سرکاری تقریبوں پر قیصر بکنگھم کی طرح ان کے دربار میں بھی خاص درباری لباس پہننا ضروری ہے کیونکہ ان کے دربار میں بھی ویسے ہی اہم معاملات سرانجام پاتے ہیں اسی طرح ان کے ملاقاتیوں اور ان کے سفر کے حالات روزناموں میں سرکاری نشان کے ساتھ اشاعت کے لئے بھیجے جاتے ہیں۔

لیکن ہندوستان میں سب سے بڑی حقیقی طاقت جسے وہ اگر استعمال کرنا چاہے تو ہر وقت کر سکتا ہے ایک بوڑھے شخص کے قبضے میں ہے جو سفید سوتی دھوتی باندھے اور ایک اونی کمبل لپیٹے کھجور کے پتّے کی چٹائی بچھائے کسی محل کے چبوترے پر یا کسی خس کے جھونپڑے میں جہاں کہیں بھی وہ ہو، اپنے پیروؤں کے چھوٹے سے گروہ میں گھرا ہوا عام مسائل زندگی پر غور کرتا یا ہندوستان کی گتھیوں کو سادہ لیکن مدبرانہ سوچ بچار کے ساتھ سلجھاتا نظر آتا ہے۔

مہاتما گاندھی کی عمر اس وقت ۷۰ سال ہے۔ اس کی زندگی بھی اتنی ہی سادہ ہے جتنا کہ اس کا لباس۔ اس کی روزانہ خوراک خشک میووں، تھوڑے سے چاول اور بکری کے دودھ پر مشتمل ہوتی ہے۔ اس کا دن عبادت سے شروع ہوتا ہے اور عبادت پر ہی ختم ہوتا ہے ہفتے میں ایک دن اس کی خاموشی کا دن ہوتا ہے۔ اس دن وہ کسی سے بات چیت نہیں کرتا خواہ اس کا بولنا کتنا ہی ضروری ہو۔

وہ اپنے پیروؤں کو صرف ہدایت کرتا ہے حکم نہیں دیتا۔ اس کی تعلیم عدم تشدد ہے اور اس کا تنہا ہتھیار وہ عقوبتیں ہیں جنہیں وہ اپنے آپ پر عاید کرتا ہے عوام کی کسی تکلیف کا مسئلہ ہو یا اپنے پیروؤں کو نافرمانی سے باز رکھنے کا معاملہ، وہ اس وقت تک کھانا پینا بند کر دیتا ہے جب تک کہ وہ مسئلہ سلجھ نہ جائے۔ اگر ضرورت ہو تو اس بات کا اعلان کر دیا جاتا ہے کہ یہ برت اُس وقت تک جاری رہے گا۔ جب تک یہ مسئلہ حل نہ ہو جائے یا مہاتما کی موت واقع ہو جائے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان موقعوں پر مہاتما کو مرنے نہیں دیا جاتا۔ وائسرائے جہاں کہیں بھی ہوں گھر کی طرف بھاگے آتے ہیں اور اس تکلیف کو رفع کر دیتے ہیں یا باغی ہتھیار ڈال دیتے ہیں۔ ہندوستان کی کوئی ہستی گاندھی کی موت کی تاب نہیں لا سکتی۔

گاندھی اس وسیع و عریض ملک کی سب سے بڑی ہستی ہے۔ اس کے معمولی سے اشارے پر ہندوستان کے کروڑوں نفوس بڑی سے بڑی قربانی کرنے کو تیار ہیں۔ اس کے ایک لفظ پر لاکھوں انسان اپنا مال دولت، آزادی یہاں تک کہ اپنی جان بھی نذر کرنے پر آمادہ ہیں۔ یہ طاقت دوسرے کسی انسان کو حاصل نہیں ہے اور نہ کسی

کے الفاظ میں یہ اثر ہے۔

میں دہلی میں گاندھی کا انتظار کر رہا تھا کہ مجھے اس ملاقات کا موقع مل جائے جس کا اس نے مدت سے وعدہ کر رکھا تھا۔ اپنے متعدد سفروں کے دوران میں میں جہاں کہیں بھی پہنچا ہوں وہ کسی اور جگہ ہوتا تھا لیکن آخر کار میں نے اس کی عارضی قیام گاہ کا پتہ لگا لیا۔

مغربی دنیا گاندھی کو صرف ان تصاویر اور مضامین کے ذریعے سے جانتی ہے جو اخبارات میں آئے دن چھپتے رہتے ہیں، اس کے فاقوں کے متعلق، اس کی یاتراؤں کے متعلق اور اس کے آشرم کے متعلق۔ اسے ایک سیاست دان، غیر معمولی ہستی یا عطائی بند دینا ہر پڑھنے والے کی ذہنی حالت پر منحصر ہے۔ حقیقت میں اس کی ہستی ایک قومی قوت ہے ـــــ اور شاید سب سے بڑی قوت۔

اس کے چند ہی روز بعد مجھے مہاتما سے ملاقات کا موقع مل گیا۔ گفتگو کے دوران ہی میں مجھے اس کی قوت بیان کا احساس ہونے لگا۔ وہ ایک غیر معمولی ہستی ہے۔ اس کی ملاقات کے لئے یہ ضروری تھا کہ میں صبح ۵ بجے اٹھ کر بغیر کچھ کھائے پئے اس کی قیام گاہ تک جاؤں۔ ایسے آدمی کے لئے جو چالیس سال سے نامہ نگاری کے فرائض ادا کرتے کرتے دوپہر چڑھے تک سونے کا عادی ہو گیا ہو۔ اتنا سویرے اٹھنا بجائے خود ایک اذیت تھی اور مجھے اس کا شدید احساس بھی ہوا لیکن ہندوستان کے اس بزرگ سے دوچار ہوتے ہی میں اپنی ساری کلفت بھول گیا۔

اگر کسی شخص کو اپنے فوٹوگرافروں سے قانونی چارہ جوئی کی وجہ پیدا ہو سکتی ہے تو وہ گاندھی کی ذات ہے۔ اس لئے نہیں کہ فوٹوگرافروں کا یہ رویہ حاسدانہ ہے یا ان کے کیمرے بری تصویر اتارتے ہیں بلکہ اس کی وجہ خود فوٹوگرافی کے فن کی خامی ہے۔ کیمرا صرف جسمانی اعضا کو ظاہر کرتا ہے۔ مہاتما کی تصویر میں گھٹا ہوا سر، بڑے بڑے کان، سوکھا گندمی چہرہ، اور پٹا ہوا بے دانت کا منہ بہت نمایاں ہوتا ہے اس میں اس کا نحیف و نزار جسم، بے ہنگم سفید دھوتی اور موٹا بھورا کمبل تو نظر آ جاتا ہے۔ لیکن حقیقی گاندھی بالکل پوشیدہ رہتا ہے۔

اگر آپ مہاتما کی آنکھوں میں دیکھیں جن سے ایک گوشہ نشین سادھو کی طرح عزم اور حیا کا اظہار ہوتا ہے۔ تو آپ کہیں گے "یہ ایک نیک انسان ہے"۔ اگر آپ اس کی لطیف مسکراہٹ کو دیکھیں تو آپ کہیں گے "یہ ایک کریم النفس انسان ہے جس کے دل میں ہر شخص کے لئے خیر کا جذبہ ہے اور دشمنی کا عنصر مفقود ہے"۔ اس کی نرم آواز، اس کی سوچی اور سلجھی ہوئی گفتگو ان احساسات کو اور گہرا کر دیتی ہے۔ اور بولنے والے کے اخلاص اور سچائی کو ظاہر کرتی ہے۔ یہ چیزیں کیمرے کی تصویر ظاہر نہیں کر سکتی۔

گاندھی سے گفتگو شروع کرتے ہی اس کی عقیدت کا قیدی نہ ہو جانا ناممکن ہے۔ یہ بھی ناممکن ہے کہ کوئی صحیح دل و دماغ کا انسان اس سے گفتگو کرے اور اس کے خلوص اور بے نفسی سے متاثر نہ ہو۔ وہ سوچتا بھی ہے تو بلند آواز سے جس سے انسان اس کے دلی خیالات بھی پڑھتا جاتا ہے۔

وہ سوال جو میں نے گاندھی سے کرنے کے لئے سوچ رکھا تھا۔ اور جو موجودہ ہندوستانی سیاسی مسئلے کی جان تھا۔ اس کا جواب مجھے نہ دیا گیا۔ نہایت نرمی لیکن مضبوطی کے ساتھ اس نے اس سوال کا جواب دینے سے انکار کر دیا کہ اگر برطانیہ کو یورپ کی آئندہ جنگ میں حصہ لینا پڑا تو اس کے پیروؤں کا رویہ کیا ہوگا یا ہندوستان اپنی آزادی کو برطانوی اقتدار کے ماتحت تسلیم کرے گا یا مکمل آزادی حاصل کر کے رہے گا؟ گاندھی نے نہایت نرمی سے جواب دیا کہ ان دونوں سوالوں کا جواب دینا اس وقت بہت دشوار ہے اور دوسرے سوال کے متعلق تو ابھی میں نے فیصلہ ہی نہیں کیا۔

میں نے ان سوالوں کے جواب کے لئے اصرار نہ کیا بلکہ ان کی بجائے کچھ اور پوچھنا مناسب سمجھا۔ لیکن ان کا جواب دینا بھی اس نے سیاسی تدبر کے خلاف سمجھا اور نہایت صفائی سے طرح دے گیا۔

آخر مجھے ایک ایسی بات سوجھ گئی جس سے مہاتما متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ میں نے پوچھا کہ کیا آپ دنیا کے نام کوئی ایسا پیغام دینا مناسب سمجھیں گے جو ہندوستان سے پرے ان ملکوں کو جو آمادہ پیکار ہیں امن کی تلقین کرے۔ مہاتما اس سے متاثر ہوا۔ کچھ دیر تو وہ خاموش رہا۔ پھر اس نے بلند آواز کے ساتھ سوچنا شروع کیا۔

ایسا ایک خیال اس کے دماغ میں موجود تھا اور اسے پیغام کی صورت میں پیش کیا جا سکتا تھا۔ لیکن ایسا کرنا درست بھی ہے کہ نہیں؟ اس کی رائے میں یہ خیال سچائی اور دانائی کا نچوڑ تھا۔ لیکن باہر کی سخت دل مادی دنیا اس رائے سے اتفاق نہ کرے گی۔ یہ دنیا اس

پیغام کی اور خود اُس کی ہنسی اڑائے گی۔ کیا ایک دفعہ پھر دنیا کی تضحیک کی آماج گاہ بننے سے کچھ فائدہ ہوگا؟ بہر حال ہنسی مذاق ایک پسندیدہ شئے ہے۔ کیوں نہ ایک دفعہ پھر قسمت آزمائی کی جائے۔

اس نتیجے پر پہنچ کر اس نے فوراً اپنا پیغام لکھانا شروع کر دیا۔ پیغام یہ تھا۔ "ہٹلر کو چاہیئے کہ جب وہ اپنے حلیفوں کے ساتھ مجلس مشورہ منعقد کرے تو تمام حلیفوں کو فوراً ہتھیار ڈال دینے کا مشورہ دے۔ مجھے اتنا ہی یقین ہے جتنا کہ اپنے یہاں بیٹھنے کا مجھے یقین ہے۔ کہ ہٹلر بھی اس سے متاثر ہو کر اسلحہ ڈال دے گا۔"

یہ مہاتما گاندھی کا دوسرا رخ اس بزرگ ہستی کا جسے انسان کی امن پسندی اور اخوت پر ایمان ہے۔ وہ امتیازی صفت جو اُسے دوسرے سیاست دانوں سے الگ ظاہر کر رہی ہے۔ جنہوں نے دنیا میں ایسے خیالات کو کئی بار پاؤں تلے روندا جاتے دیکھا ہے۔ اپنا پیغام لکھانے سے پہلے وہ بلند آواز سے اس کے نتائج و عواقب پر غور کر رہا تھا۔ لوگوں کا خندہ و استہزا، تضحیک، کارٹون، ٹھٹھا لیکن ہنسی بہر حال ایک لطیف شئے ہے۔ ہنسی کو پیدا کرنے والی بات کتنا اچھا فعل ہے۔ چنانچہ اس پیغام کی اشاعت کر دی جائے۔

میں نے پوچھا کیا یہ ایک معجزہ نہ ہوگا؟ لیکن اُسے تو صرف وہ فوائد نظر آرہے تھے جو اس کے نتیجے میں پیدا ہونے تھے۔ مذاق ایک پر لطف شئے ہے اور خندہ و استہزا کا نشانہ بننا اُسے ناگوار نہیں ہے۔ چنانچہ —— "شاید معجزہ ہی ہو" مہاتما نے کہا "لیکن اس سے دنیا اس کشت و خون سے بچ جائے گی جس کا امکان ہر گھڑی نظر آرہا ہے۔"

ممکن ہے ایسے معجزے رونما ہوتے ہوں اور یہ خاص معجزہ بھی ظاہر ہو جائے لیکن میرا ذہن یکایک جرمنی کی اُس لکھو کھا کی فوج کی طرف منتقل ہو گیا جو یلغار کرتی ہوئی بڑھتی چلی آرہی ہے اور جرمنی کی جدید ترین حربی ترقیاں میری آنکھوں کے سامنے پھر گئیں۔ پھر اس جد و جہد اور مشقت و محنت کا خیال آیا جو انہیں حاصل کرنے کے لئے انہوں نے برداشت کی ہے اور اس یقین کا تصور کر اس طاقت کے بھروسے پر وہ دنیا کو زیر کر کے اپنے دل کی خواہشوں کو پورا کریں گے اور جب میرا تصور واپس اپنے ماحول پر دوبارہ منعطف ہوا تو وہی سادہ مزاج اور پُر خلوص بڈھا میرے سامنے بیٹھا تھا جسے کبھی ایسے خونخوار دشمنوں سے پالا نہیں پڑا جس کا مقابلہ نسبتاً رحم دل اور نرم طبیعت والے لوگوں سے ہے جو سول نافرمانی اور فاقے جیسے کمزور اور بے ضرر ہتھیاروں سے بھی دب جاتے ہیں۔

اتنی سی ملاقات کے بعد اس کا نحیف و نزار جسم جو حال ہی کے فاقے سے اور بھی کمزور ہو چکا ہے تھک گیا اور اس کے ہر وقت مستعد رہنے والے دل کو یورپ کے سیاسی مسائل حل کرنے کے علاوہ کئی اور باتیں یاد آئیں جو اسے آج ہی سر انجام دینی تھیں۔

"کیا آج کی صبح کے لئے اتنا ہی کافی نہیں ہے؟" مہاتما نے کہا امن و صلح کا جو حل گاندھی نے بتایا ہے۔ دنیوی کاروبار کی گہما گہمی میں شاید اس مضمون کے شائع ہونے سے پہلے ہی مجھے بھول گیا ہوگا۔ لیکن یہ تصویر ادھوری رہ جائے گی اگر میں اُس اثر کا اظہار نہ کروں جو اس کی اشاعت سے ہندوستان پر ہوا۔

اس پیغام کو ہندوستانی تار بابوؤں کے رحم پر چھوڑنے سے پہلے یہ ضروری تھا کہ میں اسے اُن کی آسانی کے لئے ٹائپ کرا لیتا۔ چنانچہ میں ایسوسی ایٹڈ پریس کے دفتر میں جو امریکن ایسوسی ایٹڈ پریس سے ملحق نہیں ہے اپنے ایک دوست کے پاس چلا گیا اور اس سے ٹائپ کی مشین اور ایک کلرک کی خدمات حاصل کیں۔

جب میں کام کرا کے رخصت ہونے لگا تو دفتر کا انگریز مینیجر میرے پاس آیا اور کہنے لگا کہ اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو "ٹائمز" میں شائع ہو جانے کے بعد اس روئیداد کو ہم بھی استعمال کر لیں؟ مجھے اس پر کوئی اعتراض نہ تھا چنانچہ میں نے مضمون کی ایک نقل اُسے دے دی جسے وہ ایک خاص مدت کے بعد استعمال کر سکتا تھا۔ دو دن کے بعد یہ تمام واقعہ میرے ذہن سے اُتر گیا۔

تیسرے روز کلکتے میں میرے ہوٹل کے دروازے کے سامنے ایک اخبار فروش کھڑا تھا جس کے ہاتھ میں اخبار کے اہم عنوانات کا اشتہار بھی تھا۔

"مہاتما گاندھی نے یورپ کی سیاسی گتھی سلجھا دی"

یہ عنوان پورے صفحے کی چوڑائی پر جلی حروف میں لکھا نظر آتا تھا اور اس کے نیچے مہاتما کی تصاویر کے پرانے ذخیرے میں سے جلدی میں انتخاب کی ہوئی ایک تصویر چھپی ہوئی تھی۔ ہندوستانی صحافت نگاری کی روایات کے مطابق گاندھی کے الفاظ "کشت و خون" کو "قضیئے" سے بدل دیا گیا تھا جس سے اس کا اصل مطلب ہی فوت ہو گیا تھا اور پھر بعض جگہ

میرے حواشی کو گاندھی کے الفاظ سے تعبیر کیا ہُوا تھا لیکن گاندھی کا پیغام بہر حال موجود تھا۔

لوگ جھپٹ جھپٹ کر اخبار خرید رہے تھے اور چائے پینے کے کمرے میں چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں تقسیم ہو کر نہایت مسرت اور اور فخر کے ساتھ مہاتما کے متعلق بحث کر رہے تھے۔ نتیجہ اخذ کرنے میں سب متفق تھے"۔ کوئی جنگ نہ ہوگی۔ گاندھی نے کہہ دیا ہے۔ اُس نے اس مسئلے کو حل کر لیا ہے"! اگلی صبح کے تمام ہندوستانی اخبار اس نتیجے کے دہرانے میں یک زبان تھے۔

اس وسیع و عریض برِ اعظم یعنی ہندوستان کے بسنے والے ایک ہی لکیر کے فقیر ہیں اور یورپ کے دور افتادہ ممالک کے متعلق یا وہاں کے ہولناک معاملات کے متعلق کچھ نہیں جانتے[1]۔ ہندوؤں میں سے اکثر کا اس بات پر ایمان ہے کہ وہ الگ اور نہتے رہ کر صرف سول نافرمانی اور فاقوں کے ہتھیاروں کے بل پر اس حقیقی دنیا کے خونریز ارادوں اور ہولناک اسلحہ سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔ آسٹریا، چیکوسلوویکیا اور البانیہ کی خونریز داستانیں ہندوستان کو ابھی سے بھول چکی ہیں اور روانتی چکنے گھڑے پر سے بوند کی طرح پھسل گئی ہیں۔

اور گاندھی، خوش آئند سپنے دیکھنے والا مہاتما اس ہندوستان کا پیر اور پیغمبر ہے۔ ممکن ہے کہ وہ حقیقت میں اس سے زیادہ چالاک ہو جتنا کہ وہ نظر آتا ہے کیونکہ وہ ہر قسم کے حالات کے مطابق اپنے آپ کو نئے سانچے میں ڈھال لیتا ہے لیکن آخر وہ ایک بڈھا آدمی ہے

۱۰.....

(ایک مغربی نامہ نگار)

مظفر احمد

(ترجمہ)

[1] جیسے مغرب والے ہندوستان کو صرف شیر چیتوں، ہاتھیوں، سپیروں اور راجوں مہاراجوں کا مجموعہ ہی سمجھتے ہیں۔ ادارہ

قطعات

(۱)

برس کے چھٹ گئے بادل، ہوائیں گانے لگیں
گرجتے نالوں میں چرواہیاں نہانے لگیں
وہ نیلی، دھوئی ہوئی گھاٹیوں سے دو کونجیں
کسی کو دُکھ بھری آواز میں بلانے لگیں

(۲)

وہ رات ختم ہوئی تارے ٹمٹمانے لگے
وہ لے رہی ہے سحر کی حسینہ انگڑائی
میں اب بھی وادیٔ ویراں میں منتظر ہوں ترا
صبوحی کیوں تجھے وعدے کی شب نہ یاد آئی؟

(۳)

جو وقت بیت چکا پھر نہ آئے گا لیکن،
تصورات سے دل خوش ہیں نوعِ انساں کے
وہ کس کے ہاتھ کے ہیں منتظر خدا جانے!
لرزتے رہتے ہیں پردے حریمِ جاناں کے

احمد ندیم قاسمی

عذر گناہ

جوشِ جنوں میں زہر کے پیالے پئے بہت ظلم آپ اپنی جان پہ ہم نے کئے بہت
ہم کھیلتے رہے ہیں ہلاکت کی فوج سے سوتے رہے لپٹ کے تباہی کی موج سے
ہم اپنا سر پہاڑ سے خود پھوڑتے رہے خود اپنے دل کے آئینے کو توڑتے رہے
بدمستیوں سے شام و سحر جھومتے رہے جُھک جُھک کے دستِ اہرمنی چومتے رہے
رگ رگ میں زہرِ درد و الم جب اُتر گیا جب گوشہ گوشہ روح کا ظلمت سے بھر گیا
عذر گناہ ہم نے کیا بھی تو کیا کیا تقدیر اور خدا کا بہت ہی گلا کیا

اپنے سوا ہر اک کو بُرا برملا کہا
قسمت کا نام لے کے خدا کو بُرا کہا

آثر صہبائی

پرانے ہندوستان کا ایک شاعر

امارو

یوں تو جو بیت چکی وہ پرانی ہوئی، لیکن وقت اور فاصلہ دو ایسی چیزیں ہیں، جن کی آئندہ اور گذشتہ کے لحاظ سے کوئی حد ہی نہیں ہے پرانے ہندوستان کی قدامت کا تصور بھی وقت ہی کی طرح بے پایاں اور عمیق ہے۔ کیونکہ یہ کوئی چند صدیوں کی بات نہیں ہے اس قدامت کا کچھ اندازہ اس بات سے بھی کیا جاسکتا ہے کہ بعض ماہرین کے نزدیک پہلا انسان اسی سرزمین پر نمودار ہوا تھا۔

ویدوں کے زمانے کو قدامت کے لحاظ سے جو رتبہ حاصل تھا، وہ موہن جو داڑو اور ہڑپہ کی کھدائی سے جاتا رہا۔ ویدوں کا زمانہ نسبتاً جدید ہوگیا، اور علم انسانی کو ایک اور قدیم تر تمدن سے آگاہی ہوئی۔ ان دونوں زمانوں کے دوائر کی ہم آہنگی کے متعلق ابھی قطعی فیصلہ نہیں کیا جاسکا۔ آریاؤں اور سندھ کے تمدن میں کوئی باہمی تعلق تھا یا نہیں، یہ ابھی ایک پراسرار مسئلہ ہے۔ البتہ ایک بات ظاہر ہے کہ وادیٔ سندھ کے مردوں اور عورتوں کی تخلیقات کے اثرات مشرق میں ملتان پنجاب اور راجپوتانہ اور مغرب میں ایران، ایشیائے کوچک بلکہ مصر تک ملتے ہیں ان اثرات کی وضاحت کے لئے ابھی ہمیں اور انتظار کرنا ہوگا، لیکن گمان غالب ہے کہ مستقبل کے ماہرین یہ ثابت کردیں گے کہ ان قدیم سندھیوں اور آریاؤں میں باہم تمدنی تعلقات تھے۔ اگر یہ بات ثابت ہوگئی تو آریاؤں کی قدامت اور بڑھ جائے گی اور ہندوستان کی تہذیب آریہ، یونانی اور مغل اثرات کا مجموعہ ہونے کی بجائے ایک ایسی خود رو تہذیب ہو جائے گی جس پر ماضی میں آئے دن نئے اثرات ہوتے رہے۔

آریہ باہر سے آئے تھے۔ شمالی پہاڑوں کو پار کرکے اُن کے سامنے ایک ایسی نئی سرزمین پھیلی ہوئی تھی جس پر قابو پانا اور جس کے رہنے والوں کو مفتوح بنانا اُن کا پہلا مقصدِ حیات تھا۔ جسمانی حالت اور نسلی امتیاز کے لحاظ سے وہ قدیم باشندوں سے برتر تھے اور انہیں خود بھی اس بات کا پورا احساس تھا۔ چنانچہ اس احساس کا اظہار ویدوں کے اُس قدیم ترین ہندوستانی ادب میں ہے جنہیں انہوں نے ترتیب دیا۔ اتھروو وید میں ایک جگہ لکھا ہے:۔

"میں بلوان ہوں میرا نام بڑا، اس دھرتی پر جیتنے والا، ہر چیز کو جیتنے والا، اس کے ہر حصے کو پورے طور پر قابو میں لانے والا"

گویا زندگی کی ضروریات کے لحاظ سے پرانے ہندوستان کے ادب کی پہلی آواز فاتحانہ جذبات و احساسات کی حامل تھی۔ ہر شخص کے لئے کام تھا، ہر شخص ضروریاتِ زندگی کے لئے صرف اپنی ہی قوت بازو کا محتاج تھا، ہر شخص مطمئن تھا اور حال میں مست۔ اُسے آئندہ اور گذشتہ کی کوئی سوچ نہ تھی۔ اس کا ماضی خوشگوار نہ تھا اور بیتے ہوئے زمانے کی تلخی کو وہ اس نئی سرزمین کے زندگی بخش اثرات میں بھلا رہا تھا اور اس کا مستقبل ابھی ایک بہت دور کی بات تھا۔ ویدوں کی شاعری سے اُسی فلسفۂ حیات کا اظہار ہوتا ہے جو حال میں مگن اور مصروف رہنے والے لوگوں کے اندازِ نظر سے بنا ہو۔ اس حیات پرور زمین کو دیکھ کر اُن کے دل میں ستائش کے جذبات پیدا ہوتے تھے، اور وہ اپنی اور قدرت کی تعریف کرتے تھے، لیکن انہیں اپنے فطری اور خداداد زور اور بل کو قائم رکھنے اور بڑھانے کی بھی ضرورت تھی، انہیں ایک ایسی شکتی کی ضرورت تھی جو انہیں اندیشۂ فردا سے بے نیاز کردے چنانچہ رگوید کا ادب ایک ایسی ہی شکتی کی جستجو کو ظاہر کرتا ہے۔ اس میں اگنی کی برتری کے گن گائے گئے ہیں۔ تہذیب و تمدن کے ارتقا کے لئے آگ کی ضرورت تھی۔ آگ کی دریافت انسانی کشمکش حیات کا پہلا باب ہے۔ رگوید اسی زمانے اور اس کشمکش کا اظہار کرتا ہے۔ یہ ابتدائی

اُلجھنیں رفتہ رفتہ مٹتی گئیں، یہاں تک کہ ہندوستان میں انسان کی تخلیقی کارفرمائیوں نے ایک مستقل حیثیت اختیار کر لی۔ جب انسان نے آگ پر قابو پالیا تو وہ اس نئی اور اندھی شکتی سے جن باتوں کا متقاضی ہوا، اُن کا ذرا سا بیان سنئے:

"جلا دے اے اگنی! قریب ترین دشمنوں کو، جلا دے دُور کے بدخواہوں کو، ان دیکھوں کو جلا دے: تیرے ہر دم بڑھنے والے تیز شعلے پھیلتے ہی جائیں، جو تیرے لئے جان مارتے ہیں، انہیں اندھا زور دے۔ انہیں خوش بختی دے اور خوشحالی اے اگنی!"—رگ وید۔

لیکن سونے جاگنے اور کھانے پینے پر ہی انسانی ضروریات کا خاتمہ نہیں ہو جاتا۔ چنانچہ ویدوں میں اُرواسی کے فسانے میں محبت کا رومان بھی موجود ہے۔ جس سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت بھی عورت ایسی ہی محبت رکھتی تھی جیسی آج رکھتی ہے، صرف زمانے کے اثرات کا فرق ہے۔

آریہ تنومند تھے، چوڑے چکلے جسموں والے، اچھے ہاضم معدوں والے، کڑے سخت، جنگ میں چابک دست اور بہادر اور اس لئے وہ بہت جلد شمالی ہندوستان پر قابض ہو گئے۔ تیر کمان اُن کا ہتھیار تھا اور وہ رتھوں میں نیزوں کے ساتھ دشمن پر حملہ کرتے تھے۔ آہستہ آہستہ اُنہوں نے دریائے سندھ اور گنگا کے ساتھ ساتھ مشرق اور جنوب کی طرف بڑھتے ہوئے دریائے نربدا تک قبضہ جما لیا۔

جُوں جُوں اُن کی فتوحات مکمل ہوتی گئیں اور جنگی ضروریات کم، وہ اطمینان کے ساتھ مختلف علاقوں میں قائم ہو کر زراعت پیشہ بنتے گئے، اور اُن کے قبیلے چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تبدیل ہونے لگے۔ ہر ریاست پر ایک مہاراجہ حکومت کرتا تھا اور اس خیال سے کہ کہیں وہ حکومت کے نشے میں اعتدال کی حد سے تجاوز نہ کر جائے، اس کے مشیر کار کی حیثیت سے فوجی سرداروں کی ایک کمیٹی ہوتی تھی۔ ہر قبیلے کا حاکم راجہ ہوتا تھا اور پھر اُس کی بھی ایک چھوٹی کمیٹی اور ہر گاؤں میں مختلف گھرانوں کے بڑے بوڑھے ہر طرح کا انتظام اور فیصلہ کرتے تھے۔ ان فیصلوں کے لئے سب گاؤں چوپال میں اکٹھا ہوتا تھا۔ مہاتما بدھ نے ایک مکالمے میں لکھا ہے: "جب تک وہ یونہی اکٹھے ہوا کریں گے اور اپنی سماج کی جماعت بندی میں حصہ لیتے رہیں گے، انہیں زوال نہ آئے گا۔ اور وہ خوش حال ہوں گے اور ترقی پائیں گے۔"

آریاؤں کو اس نئی سرزمین میں اطمینان و فراغت کے ساتھ مختلف علاقوں میں آباد ہو جانے پر ایک اور خطرہ بھی لاحق ہوا اور وہ یہ کہ یہاں کے پہلے باشندوں سے ان کے اپنے لوگ شادی بیاہ کے تعلقات قائم نہ کر لیں، کیونکہ اس طرح انہیں اپنے نسلی امتیاز کے کھوئے جانے کا اندیشہ تھا۔ اس لئے انہوں نے شادی پر پابندی رکھنے کے لئے سماجی اصول بنائے۔ ان اصولوں کا مقصد یہ تھا کہ لمبی ناکیں چپٹی ناکوں سے علیحدہ رہیں۔ یہ پابندی اگرچہ نسل کو دوغلا ہونے سے بچانے کے لئے تھی لیکن آگے چل کر اسی سے ذاتوں کی تقسیم عمل میں آئی۔

ویدوں کے زمانے میں شادی بیاہ پر تو پابندی تھی۔ لیکن ذات پات کے بندھن کوئی نہ تھے۔ ان بندھنوں کے لئے ہندوستان اُن برہمنوں کا ممنون ہے جنہوں نے منو سے لے کر آئندہ ہر زمانے میں اپنے فرقے کی طاقت کو بڑھانے کے لئے مساوات کے اصول کو بھُلا دیا۔ جب ویدوں کا زمانہ ختم ہوا اور مہابھارت اور رامائن کا دور آیا تو ذات پات کا جال سخت ہونے لگا۔ اور پیشے روز بروز وراثتی حیثیت اختیار کرتے گئے۔ ابھی تک چونکہ برہمنوں ہی کو مطالعے کا حق اور فرصت حاصل تھی اس لئے وہی ادب کے بانی ہوئے اور شروع میں شاعری بھی مذہبی رنگ ہی لئے رہی۔ ذات پات کے بندھن تو سخت ہوئے لیکن رامائن اور مہابھارت کے زمانے میں بھی برہمنوں کو کوئی امتیازی درجہ حاصل نہ تھا۔ وہ صرف کل انسانوں کے ایک گروہ ہی کو ظاہر کرتے تھے۔ بلکہ رامائن میں تو یہ بھی لکھا ہے کہ ایک کشتری کا درجہ برہمن سے بڑھ کر ہے۔ جینیوں نے بھی خود بخود کشتریوں کو سب سے اعلیٰ سمجھنا اور کہنا شروع کر دیا اور بدھ لٹریچر میں تو برہمن کو "نیچ" بھی لکھا ہے۔

جنگ اور فتوحات کا دور مٹتا گیا اور آریہ امن کے ساتھ بسنے لگے اور مذہب جس کا تصور ذہن انسانی میں زراعتی معاملات کے لئے قدرت کے رحم و غضب کو قابو میں رکھنے کے واسطے پیدا ہوا تھا، پہلے سے پیچیدہ ہوتا گیا اور اس بات کی ضرورت پیدا ہوئی کہ انسان اور دیوتاؤں کے تعلق کو استوار بنانے اور احسن طریق پر چلانے کے لئے مخصوص اور ماہر لوگ مقرر ہوں۔ چنانچہ اسی ضرورت کی بنا پر برہمن کثرت، دولت اور طاقت میں روزافزوں ترقی کرنے لگے۔

لیکن بدھ کے زمانے تک کشتریوں نے ذہنی برتری کا اجارہ کلیتہً برہمنوں کو نہیں دے دیا تھا۔ ویش لوگ بھی باقاعدہ صورت میں بدھ کے زمانے کے بعد ہی سے ظہور میں آئے اور پھر رفتہ رفتہ ہندوستان کے قدیم باشندے شُودر کہے جانے لگے۔

اِن آریاؤں کے رہن سہن کا طریقہ کیا تھا؟ — پہلے جنگ پھر گلّہ بانی اور زراعت اور پھر دست کاری۔ ہندوستانی آریہ گایوں کو پالتے اور پرورش کرتے تھے، لیکن ابھی اس جانور کو وہ مقدس رتبہ حاصل نہ ہوا تھا جو بعد میں جا کر ہوا۔ آریاؤں کو ضرورت پڑنے پر اس کا گوشت استعمال کرنے میں بھی احتراز نہ تھا۔ ویدوں کے زمانے میں جو کی کاشت ہوتی تھی لیکن چاول کا نام نہ تھا۔

ان قدیم ہندوستانیوں کی ذہانت اور جوہرِ خداداد کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے۔ کہ فلکیات کو انہوں نے یونانیوں سے اخذ کیا (اگرچہ جوتش پہلے ہی یہاں موجود تھی) لیکن اس علم کو اُن سے کہیں بڑھ کر تکمیل کو پہنچایا۔ ریاضی میں ہندسے اور اعشاریہ کا طریق شمار ایجاد کیا۔ الجبرا بھی انہی کی ایجاد تھی۔ اگرچہ اس علم نے عرب سے مغرب کو جاتے ہوئے مستقل طور پر عربی نام ہی اختیار کر لیا۔ جیومیٹری میں البتہ قدیم ہندوستانی کچھ خاص کامیاب نہ ہوئے لیکن اس میں بھی بہت سی باتیں پہلے پہل انہی نے معلوم کیں۔ البتہ ٹرگنومیٹری میں وہ یونانیوں سے سبقت لے گئے۔ یہ سب کام عموماً صرف تین آدمیوں کے ممنونِ تکمیل ہیں۔ آریہ بھاٹ، برہم گپت اور بھاسکر۔ بعد میں یہ علوم عرب سے ہوتے ہوئے یونان میں پہنچے اور پھر یورپ میں پھیلے لیکن اِن خشک علوم میں بھی آریاؤں نے اپنی شاعرانہ ذہنیت کو ہاتھ سے نہ دیا۔ ذیل میں الجبرے کے دو سوال دیکھئے:۔

"مدھ مکھیوں کے ایک بڑے جھرمٹ میں سے کل کا پانچواں اُڑ کر کدم کے پھولوں پر جا بیٹھیں، کل کا تیسرا سلندھرا پھولوں پر اور ان دونوں کے فرق کا تین گنا کُٹجا کی کلیوں پر۔ ایک مدھ مکھی پیچھے رہ گئی اور وہ یوں ہی ہوا میں منڈلاتی رہی۔ اے سندر ناری! بتا تو سہی، سب کتنی مکھیاں تھیں؟"

"میری پیاری! تیرے کانوں میں جو یہ آٹھ لعل، دس زمرّد اور سو موتی ہیں، انہیں میں نے تیرے لئے یکساں قیمت پر خریدا تھا اور وہ قیمت آدھے سو سے تین کم تھی۔ اے شبھ ناری! مجھے ہر ایک کی قیمت بتا دے۔"

یہی شاعرانہ ذہنیت آگے چل کر علم ادب میں ایسے جواہر ریزوں کی تخلیق کا باعث ہوئی جو آج تک ساری دنیا کے لئے کیف و انبساط کا سامان ہیں لیکن اِس شاعرانہ افتادِ طبع نے انہیں اُن علوم میں ترقی کرنے سے نہ روکا جو نوعِ انسانی کے لئے عملی طور پر افادی درجہ رکھتے ہیں۔ کیمیا، طب اور علم تشریح الابدان کی دریافت اور ترقی بھی ان کے لئے جاذبِ نظر رہی۔ وہ ذرا ذرا سی باتیں جو آج ہمیں مغرب کے علماء کی بتائی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ قدیم ہندوستانیوں کے ذہن سے ہی نکلی تھیں۔ یہ دنیا ذرّات کا مجموعہ ہے، یہ انہی کی معلوم کی ہوئی بات ہے۔ انسان ایک جرثومے سے نشو و نما پا کر دنیا میں آتا ہے، یہ بھی انہی کی معلوم کی ہوئی بات ہے۔ یہ تو ہوئے وہ علم جو عملی زندگی میں مفید ہیں۔ ذہنی زندگی میں سب سے بڑھ کر ترقی دینے والا علم فلسفہ ہے، اور فلسفے میں قدیم ہندوستانیوں نے جو کچھ کیا وہ تمام دنیا کے سامنے ہے اور عام بھی ہے۔ اس لئے میں بھی اس کی طرف اشارہ ہی کرنے پر اکتفا کرتا ہوں۔ یہ سب کام برہمنوں کے تھے۔ لیکن برہمنوں کی روز افزوں طاقت کے لئے ایک زبردست صدمہ بھی ہند قدیم ہی میں پیدا ہوا، یہ مہاتما بدھ کی انسانیت پرست شخصیت تھی۔ بدھ کا ہر اصول برہمنوں کے مفاد کے منافی تھا۔ ایک ہی بات کو لیجئے۔ بدھ مساوات کا حامی بلکہ موجد تھا اور مساوات برہمنوں کی ذات کو مٹا دینے والا زبردست حربہ لیکن اُس زمانے میں تعلیمی شعور چند محدود انسانوں میں ہی تھا۔ چنانچہ بدھ مت تو پھیلا لیکن برہمنوں کی طاقت از سرِ نو قائم ہو کر بڑھتی رہی۔ ۵۰۰ قبل از مسیح کے قریب ہندوستانی ادب میں برہمنوں کے بنائے ہوئے پُرانوں کی تخلیق ہوئی۔ ۳۲۹ء میں اسکندر نے ستلج تک تمام ملک کو تہ و بالا کیا اور اس کی فوج کے لوٹ جانے پر ہندوستان کی تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔

یہاں تک تو اُس فضائے بعید پر ایک جھلکتی ہوئی نظر ڈالی گئی ہے جس کے اثرات میں امارو ایسا شاعر پیدا ہوا لیکن امارو کی شاعری آسودہ نفسی احساسات کو لذّت بخشتی ہے، اس لئے ضروری ہے کہ ایک مختصر خاکہ اُس زمانے کے جنسی اور اخلاقی معیار کا بھی مدِ نظر رکھ لیا جائے۔ ویدوں کے زمانے سے لے کر اشوک اور چندر گپت تک عام اخلاق بہت ہی بلند تھے۔ ہم اپنی موجودہ حالت کو دیکھتے ہوئے

اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ ویدوں کے زمانے میں راجہ مہاراجہ لوگوں سے زبردستی کر لیتے تھے۔ لیکن سکندر کے مورخ کا بیان ہے "ہندو راست بازی میں ایک امتیاز رکھتے ہیں۔ ان کا چلن اس قدر معقول ہے کہ انہیں شاذ ہی باہمی معاملات کے فیصلے کے لئے مقدمہ بازی کی طرف رجوع ہونا پڑتا ہے۔ ان کی ایمانداری کا اندازہ اس حقیقت سے کیا جا سکتا ہے کہ وہ کبھی کوئی تحریری عہد نامہ نہیں کرتے۔ ہر بات زبانی ہی طے پا تی ہے۔ نیز وہ اپنے گھروں کو قفل بھی نہیں لگاتے۔ گویا وہ سچائی کے بہت زبردست پرستار ہیں۔ یہ رہی عام اخلاق کی حالت لیکن جب ہم جنسی تعلقات کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو ہمیں رگوید میں ہی حرام تعلقات، اغوا، قحبگی، اسقاط اور بدکاری کا ذکر مل جاتا ہے۔ بلکہ اختلاط ہم جنسی کا بھی خال خال بیان ہے۔ لیکن ویدوں سے ہی جو عام تصور ہم اس زمانے کے جنسی اخلاق کا قائم کرتے ہیں وہ بہت بلند ہے۔ مہابھارت اور رامائن میں بھی یہ بلندی قائم ہے ان تمام کتابوں سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ جنسی معاملات، زن و شوہر کے تعلقات اور گھریلو جھمیلوں میں اُن لوگوں نے معیار کی بلندی آج کل کے لوگوں کے لئے قابلِ رشک درجے تک پہنچی ہوئی تھی۔

شادی بیاہ کے مختلف طریقے تھے۔ زبردستی اٹھائے جانا، خرید کر لائے جانا یا باہمی رضامندی سے فیصلہ کر لینا۔ لیکن باہمی رضامندی کو کچھ مستحسن نہ خیال کیا جاتا تھا۔ عورتیں اس بات کو اپنے لئے قابلِ فخر سمجھتی تھیں کہ انہیں خرید کر حاصل کیا جائے۔ یہ خرید و فروخت کا کام غالباً مشاطہ یا دلال کے ذریعے سے انجام پاتا تھا جس کی مثال ہمیں امارو کی ایک نظم میں بھی ملتی ہے۔ زبردستی اٹھائے جانا بھی ایک عورت کے لئے عزت کا باعث تھا۔ شاید یوں اس کی خود پرستی کو تسکین ملتی تھی کہ ایک شخص اُسے ہر قسم کے خطرات کے باوجود اٹھا کر لے گیا یعنی وہ اُسے بہت چاہتا ہے۔ اس نے اسی کو منتخب کیا ہے۔ کثرتِ ازدواج کا رواج بھی تھا۔ اور بڑے اور امیر لوگوں میں تو یہ ایک لازمی بات تھی اس کے مقابل میں کثرتِ ازدواج نسائی کی مثال بھی دروپدی کے افسانے سے ملتی ہے۔ یہ رسم لنکا میں ۱۸۵۹ء تک رائج تھی اور تبت کے چند علاقوں میں اب بھی ہے۔ لیکن عموماً کثرتِ ازدواج کی عشرت پرستی کا حق صرف مرد ہی کو حاصل تھا۔ اور اُس زمانے کے گھر پر مرد کی ایک راجے کی مانند کلّی حکومت ہوتی تھی۔ اُس کی بیوی یا بیویاں اور بچے اُس کے دوسرے ساز و سامان کی طرح اس کی ملکیت تصور کئے جاتے تھے لیکن ان باتوں کے باوجود اُس زمانے میں عورت کو بعد کے ہندوستان سے (خصوصاً رامائن کے بعد سے) کہیں زیادہ آزادی حاصل تھی۔ اگرچہ شادی بیاہ کی جو صورتیں اوپر بیان کی گئی ہیں۔ اُن سے یہ اندازہ نہیں ہو سکتا لیکن اُس دور کی عورت کو اپنے رفیقِ حیات کے انتخاب میں بہت کچھ کہنے سننے کا حق تھا۔ عورتیں دعوتوں، رقص و سرود کی محفلوں اور پوجا پاٹ کے موقعوں پر مردوں کے دوش بدوش ہر قسم کے مجلسی ہنگاموں میں حصہ لیتی تھیں۔ انہیں مطالعے کی بھی اجازت تھی وہ فلسفیانہ اور علمی گفتگو میں بھی دخل رکھتی تھیں۔ لیکن مہابھارت اور پھر رامائن کے زمانے میں عورت کا یہ آزاد رتبہ برقرار نہ رہا تھا۔ امارو دو ایک کا ذکر بھی کرتا ہے۔ لیکن اُس کی نظموں سے عورتوں کے مرتبے کا جو تصور قائم ہوتا ہے وہ رامائن سے کہیں زیادہ آزادانہ محسوس ہوتا ہے۔ کیونکہ رامائن کے بعد سے عورتوں کے لئے ویدوں کا پڑھنا بھی غیر مستحسن بلکہ باعث فساد تصور کیا جاتا تھا۔ بیواؤں کی شادی ممنوع ہو گئی تھی۔ عورتوں اور مردوں کے سماجی میل جول پر پابندیاں عائد کر دی گئی تھیں اور ستی کی رسم بھی جاری ہو گئی تھی مثالی عورت وہی سمجھی جاتی تھی جو سیتا کے نقشِ قدم پر چلے۔ لیکن امارو کی نظموں میں ہمیں عورت کی ذات پر یہ پابندیاں نظر نہیں آتیں۔

یہ زمانہ تھا، یہ لوگ تھے، یہ مرد، یہ عورتیں اور یہ سماج —— علوم و فنون کی ترقی اور علم ادب اور سنسکرت زبان کا معیار انتہا کو پہنچ چکا تھا۔ اسی دور میں امارو کی شاعری پیدا ہوئی۔

امارو کے متعلق ہم سوانحاتی مواد کی غیر موجودگی کے باوجود اس کی نظموں کی اندرونی شہادت سے بھی کچھ اندازہ لگا سکتے ہیں۔ مثلاً ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ شہری تھا۔ عالم فاضل تھا، اور اس لئے گمان غالب ہے کہ برہمن ہو گا۔ اغلباً اُس کا تعلق کسی راجے کے دربار سے نہ تھا۔ کیونکہ اس صورت میں اس کا کچھ نہ کچھ حال ہمیں ضرور معلوم ہو جاتا۔ اس کی اپنی زندگی خواہ وہ برہمن تھا یا غیر برہمن۔ بہت رومانی رہی ہو گی۔ کیونکہ ان نظموں میں جن احساسات کا اظہار ہے ان کے متعلق اس عمدگی سے بغیر ذاتی تجربے کے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ عورتوں سے اُس کے تعلقات بہت وسیع تھے۔ جن میں سے بعض کے نام بھی اُس نے اپنی نظموں میں لئے ہیں۔ لیکن امارو کا ہمیں صرف نام ہی معلوم ہے۔ سو اور سوسے اوپر کچھ

نظمیں۔ اُس کی زندگی کے متعلق ہمیں کوئی بات معلوم نہیں البتہ ایک روایت ہے کہ وہ روح جو امارو کے جسم میں تھی اپنے پہلے سو جنموں میں عورت کے جسم میں ظاہر ہوئی تھی اس ناقابلِ قبول روایت کی بھی ایک وجہ ہے امارو کی نظموں کے معتدبہ حصے میں عورت کے جذباتِ محبت کو اس سلیقے، نفاست اور عمدگی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ کسی مرد سے وہ ممکن ہی نہیں تاوقتیکہ اس میں کافی حد تک نسائیت کا عنصر موجود نہ ہو۔ ایک روایت کے مطابق امارو کی نظموں کو شنکر آچاریہ کے نام لگایا جاتا ہے جبکہ اس نے راجہ امارو کے مردہ جسم میں جان ڈالی کہ وہ منڈا مصر کی بیوی سے نوعی موضوع پر مباحثہ کر سکے۔ روایت ہی کے طور پر امارو کو بکرماجیت کے نو رتنوں میں سے بھی بیان کیا گیا ہے لیکن یہ ممکن نہیں کہ وہ کالیداس کا ہمعصر ہو مختلف کتب کی اندرونی شہادت کی بنا پر کہا جاسکتا ہے کہ امارو آنند وردھن سے پہلے تھا۔ اس لئے اس کا زمانہ ۸۵۰ء کے بعد تو ہو ہی نہیں سکتا بکرماجیت کا دور ۳۸۰ء سے ۴۱۳ء تک ہے لیکن اگر بکرماجیت کے زمانے میں امارو کی شاعری تخلیق پاتی تو ہمیں بکرماجیت کے اور رتنوں کی طرح اس کے حالات بھی معلوم ہو سکتے۔ "امارو شتک" یعنی امارو کی سو نظموں میں ایک نظم ایسی بھی ہے جس کے شروع میں ایک وضاحتی کلمہ ہے: "یہ بدھ کی بیوی کی پرارتھنا ہے"۔ اس سے ہمیں ایک بات معلوم ہوتی ہے کہ امارو کا زمانہ بدھ کے بعد کا ہے۔ گویا پرکار کے نصف قطر کو گھٹاتے ہوئے ہم امارو کے زمانے کو ۴۸۳ قبل مسیح اور ۸۰۰ بعد مسیح کے درمیانی حصے میں محدود کر سکتے ہیں۔

امارو شتک یا امارو کی سو نظموں کو ہندوستان بلکہ دنیا کی عشقیہ شاعری میں ایک خاص امتیاز حاصل ہے۔ امارو کی شاعری نے سنسکرت ادب میں پہلی بار اس حقیقت کو منوایا کہ صرف محبت ہی کو شاعری کا بنیادی موضوع بنا کر گوناگوں نغمے چھیڑے جا سکتے ہیں۔ نیز امارو کی شاعری ہی سے محبت کی غزلیہ نظموں نے باقاعدہ بند کی ہیئت اختیار کی۔ ایک بند کی محدود وسعت میں محبت کے کسی احساس کو مکمل طور پر بیان کرنا اس شاعری کا مقصد ہے لیکن احساسات کی ایسی نقاشی کوئی آسان کام نہیں ہے۔ کیونکہ اس میں چند مختصر لفظوں اور چند سے تلے فقروں میں ایک احساس کی شدّت اور ایک جذبے کے تاثر کی ترجمانی کرنا ہوتی ہے۔ لیکن آج کل کی شاعری میں جو تجزیاتی عنصر ہے وہ اس میں موجود نہیں ہوتا گویا یوں کہئے کہ اس نغمے میں ہر ماترے کو علیٰحدہ نہیں کر دیا جاتا بلکہ ناپ تول کے باوجود اُن کی باہمی آمیزش اس طور پر رکھی جاتی ہے کہ ذہن کو وہی لذّت حاصل ہو جو کسی راگ سے ابھرتی دُھن کو سننے سے ہوتی ہے یعنی اس نغمے میں سرگم کی بےکیفی نہیں ہوتی۔

پراکرت کی عشقیہ شاعری میں جو رتبہ ہال کا ہے وہی رتبہ سنسکرت کی عشقیہ شاعری میں امارو کا ہے۔ امارو کی تمام نظمیں (امارو شتک) پانچ چھوٹے حصوں میں منقسم ہیں۔ پہلا حصہ مرد کے جذبات پر مشتمل ہے۔ دوسرا عورت کے احساسات پر، تیسرے حصے میں مرد اور عورت کی بات چیت اور نوک جھونک ہے، چوتھے میں عورت کے عورت کے متعلق جذبات ہیں، اور پانچویں حصے کا عنوان "مشاہدات" ہے۔ یہ پانچواں حصہ ایک طرح سے شاعر کے شخصی احساسات و تخیلات کا آئینہ کہا جاسکتا ہے قدیم نقاد آنند وردھن کی رائے میں امارو کی نظمیں شاعری کے امرت سے لبریز ہیں۔ امارو کا کلام فنی لحاظ سے بھی بہت بلند اور قابلِ توجہ ہے چنانچہ سنسکرت کے تمام علماء اور قواعد دان فنی اور لسانی وضاحتوں کے لئے امارو ہی کی مثالیں دیتے ہیں۔ سنسکرت کے تخیلی اور تخلیقی ادب میں امارو ایک نئی نشوونما کا پہلا علمبردار ہے۔ تصوّر کی نفاست، اظہار و تاثر کی گہرائی اور احساسات و خیالات کی نزاکت سنسکرت شاعری کی خصوصیات عمومی ہیں۔ لیکن انہیں جاری اور رائج کرنے میں امارو ہی کے کلام نے آنے والے شعراء کی اعانت کی ہے۔ امارو کی نظموں میں محبّت کی سیدھی سادی سلجھی ہوئی باتیں بھی ہیں، اور اُلجھے ہوئے پیچیدہ معاملات بھی۔ بیسویں صدی کے ماہرینِ نفسیات نے محبت کے واحد جذبے میں جس کثرتِ احساس کی دلیلیں مہیّا کی ہیں۔ امارو آج سے انیس صدی پیشتر ان سب کو اپنی نظموں میں بیان کر گیا ہے۔ محبت کی بوقلموں کیفیات، عشق کے متلوّن خیالات، انوکھی اُلجھنیں، غیر متوقع تاثرات انجانی تحریکاتِ طبعی، آرزو، اضطراب، ناامیدی، شکستہ دلی، میل ملاپ، جدائی، دُور دُور کی شیفتگی، شرم و حیا، اختلاط، بے باکی، وہ جذبہ جو کلیوں سا اچھوتا ہو اور وہ احساس جو پورب سے نکلنے والے سورج سے بھی پرانے ہو چکے ہوں ——— یہ سب باتیں امارو کی سو نظموں میں موجود ہیں۔ امارو کی نظموں میں محبّت ایک تنہا اور شدید جذبہ نہیں ہے، جیسے کہ محبت کی عام شاعری میں ہوتا ہے، بلکہ ان میں محبت کے دکھ سکھ کو بڑھا کر انہیں اور دلکش بنانے والی تمام باتیں ہیں۔

ایک تنہا خیال یا واقعے کو ایک محدود جگہ میں قید کرنے سے شعر میں ایک حسنِ بیان پیدا ہو جاتا ہے۔ اردو کی غزل اس کی روشن مثال ہے۔ اور جاپان کی ہیکو شاعری بھی۔ اگرچہ امارو کی ان مختصر نظموں میں عموماً ہلکی پھلکی شگفتہ محبت کا بیان ہے، اُس عشق کا بیان جسے لذتِ وصال حاصل ہے یا بہت جلد حاصل ہو جانے کی توقع ہے۔

لیکن بعض دفعہ یاس اور ناامیدی پر نظم کی بنیاد رکھتے ہوئے سوز شعر سے گہرے اور گمبھیر شعر بھی نکل آتے ہیں لیکن اُن میں بھی شگفتہ اور مطمئن محبت ہی کی گہری امنگ ہے۔ امارو کی فنی بلندی ہر نظم میں ایک ہیرے کی طرح چمکتی اور بعض اوقات چندھیاتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

اور اب امارو کی پریم کتھا شروع ہوتی ہے۔ جیسے کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، اس کے پانچ حصے ہیں جن کے عنوان ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:

۱۔ مرد ۲۔ عورت ۳۔ مرد عورت، ۴۔ عورت سے عورت اور ۵۔ [illegible]۔

یہ ترجمہ ہم نثر میں دے رہے ہیں کہ اصل کا حسن اسی طرح برقرار رہ سکتا تھا۔

۱۔ مرد

(۱)

اگر مجھے والمیکی کی قابلیت حاصل ہو جاتی تو میں اپنی محبوبہ کے متعلق ایک نظم لکھتا۔
پہلے دس شعر اُس کے ہاتھوں کی دس انگلیوں کے بارے میں ہوتے؛
کیونکہ انہی انگلیوں نے ایک ایسا نقاب گوندھا جس میں مَیں نے اپنے پہلے تمام افسانۂ محبت لپیٹ دئے ہیں۔
اور دوسرے دس شعر اُن دس راتوں سے منسوب کرتا جو ہم نے ساتھ ساتھ میں گذاریں!

(۲)

اے دریا میں نے تجھے منبع پر بھی دیکھا ہے،
ایک بچہ بھی تجھے پھلانگ سکتا ہے۔
پھولوں کی ٹہنی سے بھی تیرا راستہ بدلا جا سکتا ہے!
لیکن اب تو ایک پھیلا ہوا طوفان ہے۔
اور اچھی سے اچھی کشتی کو بھنور میں گھیر سکتا ہے!
افسوس! دیا متی! دیا متی کی محبت!![1]

(۳)

وہ مجھے پوری طرح پرنام کرتی ہے،
اور پھر جھالر کے نیچے اپنے پاؤں کھینچ لیتی ہے،
وہ اپنی پنکھیا پر بنے ہوئے پھولوں کو غور سے دیکھتی ہے،
اگر میں اُس کی ہرنی کو پچکاروں، تو وہ اپنی مینا کے پروں کو سہلانے لگتی ہے!
اگر میں اُس سے کچھ کہوں تو وہ اپنی سکھیوں سے بات کرنے لگتی ہے!
اُس کی اِن شرمیلی اداؤں میں مجھے بے شمار مسرتیں حاصل ہوتی ہیں!

(۴)

اگر میں ندی سے اپنا دُکھ کہوں تو ندی میرے لئے ٹھہر جائے۔
اگر میں کھجور کے پیڑ سے کہوں تو کھجور کا پیڑ میرے لئے جھک جائے۔
لیکن تم گاتی ہوئی چلی جاتی ہو،
اور میری طرف دیکھتی بھی نہیں؛
میں اپنا دُکھ ندی سے کہوں گا،
اگر ندی میرے لئے نہ رُکی تو کم سے کم میں اُس میں اپنی آنکھیں ہی دھو کر ٹھنڈی کر لوں گا؛
میں اپنا دُکھ کھجور کے پیڑ سے کہوں گا۔
اگر وہ میرے لئے نہ جُھکا تو کم سے کم اُس کا سایہ ہی مجھ پر رہے گا!
آج پھر میں نے شرم اور جھجک کو بُھلا کر تم سے اپنا حال کہا،
لیکن تم اپنے ہونٹوں کا امرت، اپنے سائے کی چھاؤں مجھے نہیں دیتیں!

(۵)

تمہارے بال کندھوں پر بکھرے ہوئے ہیں،
اور ریشم آدیت کا جنگل، مصر اکیشی کے رنگین مندر کو اپنی گود کے گھیرے میں لئے ہوئے ہے!

(۶)

جب سے تُم چلی گئی ہو کسی نے مجھ سے تمہاری بات نہیں کی،
لیکن ہوا جب گذر رہی تھی تو میں نے تمہارا نام کہا،

[1] کہ عشق آساں نمود اول، ولے افتاد مشکلہا۔ حافظ
ہوتے ہوتے جان دوبھر ہو گئی
بڑھتے بڑھتے بڑھ گئیں بیماریاں ۔ حفیظ جالندھری

اور ایک شخص مر رہا تھا تو اُس کے سامنے بھی میں نے تمہارا
نام لیا،
میری پیاری اگر تم زندہ ہو تو کسی دن ہوا کا گذر تمہارے پاس
سے ہوگا،
اور اگر تم مر چکی ہو تو اس شخص کی روح تمہیں بتا دے گی کہ
مجھے تم اب بھی یاد ہو!

(۷)

گیا تیری! تیری محبت تو بھروں والی جھیل میں کسی شاخ کی
پرچھائیں سے بھی زیادہ ناپائیدار ہے۔
جب بھرے جا چکیں تو جھیل آئینے کی طرح ہموار ہو جاتی ہے
لیکن تیرے دل میں مجھے معاف کر دینے پر بھی میرے متعلق
بدگمانیاں ہیں!

(۸)

میرے باغ کے پیڑوں پر بیٹھے ہوئے پرندو!
کیا تم اپنے موسیقانہ جال میں میری آرزوؤں کو گرفتار کرسکتے
ہو؟
میری آرزوئیں میری ہیتیم کی طرف کھنچی چلی جا رہی ہیں،
جسے میں نے تیس دن سے نہیں دیکھا ہے؛
میری آرزوئیں جلدی میں ہیں کہ اُس کے معطر سینے کو جا
چھوئیں، اور اُس کی بھینی آوازیں گھل مل جائیں؛
اچھے پرندو! انہیں نہ روکو!

(۹)

اُس نے پھولوں کو اپنی ڈاب میں رکھ لیا اور اُن کی پتّیاں
سمٹ کر بند ہو گئیں۔
وہ بولی: لو دیکھو یہ کیا ہوا!
اور میں نے جواب دیا:
تم نے اپنی کالی آنکھوں کی سیاہی سے انہیں دیکھا اور وہ سمجھے
کہ رات ہو گئی[۱]

(۱۰)

نہیں مجھ پر رحم کیوں نہیں آتا!

دیکھو ستارے سمندر سے نفرت نہیں کرتے،
وہ اُن میں اپنے عکس کو سراہتے ہیں!

(۱۱)

سامنے وہ سفری بادل چاند کے قدموں میں آکر ٹھہر گیا، اور
ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر گیا۔
اے تو! کہ جو کسی دن اِن شعروں کو پڑھے، ذرا سوچنا تو سہی
کہ انہیں لکھتے ہوئے میں نے آہ کیوں بھری۔

(۱۲)

اگر گوندہ بن کے پیڑوں پر بہت سے پنچھی چہچہاتے ہیں،
اور اگر گوندہ بن کے پھول کبھی نہیں مرجھاتے،
اور اگر گوندہ بن کے آکاس پر کبھی گھٹائیں نہیں چھاتیں،
تو پیاری!
یقیناً کبھی نہ کبھی تمہارا وہاں سے گذر ہوا ہوگا![۱]

(۱۳)

چپ رہو!
تمہاری پیار کی باتیں میری خوشی کو نہیں بڑھاتیں،
بولنا بند کر دو!
سورج کی اس کرن کے اُجالے میں میٹھی رہو!

(۱۴)

وہ مر چکی ہے، لیکن پھول اب بھی مرجھاتے ہیں،
اے موت!
اس لڑکی کو حاصل کرنے کے بعد تجھے مارنے کی فرصت کیسے
ملتی ہے!

(۱۵)

اے صبح! جنگل نے تجھے قیدی بنا رکھا تھا،
اور پیڑوں کے تنے تیرے بندی خانے کی سلاخیں تھے،
ندی کا گیت تیرے لئے خوشیوں سے بھرپور تھا،
اور جنگل کی گھاس تیرے لئے نرم تھی،
لیکن تو نے، روشنی سے، اپنا پنجرہ توڑ ڈالا،
اور اے صبح! تو چلی گئی!
مجھے مادھوی کا دھیان آتا ہے جو مجھ سے ایک رات صبح

۱؎ میرے خونِ دل کی سرخی سے تیرے پاؤں لال ہیں
۲؎ لیکن تمہارے دم سے ہر رونق بہار ہستی کی

تک پیار کرتی رہی۔

(۱۶)

طوفان کے باوجود وہ آ ہی گئی۔
کاش! تم نے بیڑیوں کے پھولوں سے اُس کے بالوں پر پڑتی
ہوئی پھوار دیکھی ہوتی!
کاش! اُس کی متزیوں کی مالا نوٹ کر اس کی چھاتیوں پر چمکنے لگتی!

(۱۷)

میں کوئی نادان نہیں،
مُحبت کے سامنے جھوٹ کہنا بیکار ہے،
مجھے تمہارے سینے پر پیرہن کے بوسوں کے نشان دکھائی دے
رہے ہیں"
لیکن میں بہت زور سے اُسے اپنے سینے سے کھینچتا ہوں،
تاکہ وہ ناانداشیانہ نشان مِٹ جائیں۔
اور وہ انہیں بھول جائے!

(۱۸)

جب سے میں نے اُس کے ہونٹوں کو پہلی بار چوما ہے، میری
پیاس دُگنے زور سے بھڑک اٹھی ہے،
لیکن اس میں حیرانی کی کوئی بات نہیں،
اُن بوسوں میں ایک سلونا پن تھا!

(۱۹)

اُس کا لباس بدن سے چمٹ گیا، اور لباس کے ریشوں سے
آر پار دکھائی دینے لگا۔
اے برکھا! تیرا شکریہ!
سنانوی! تم تو یوں تھیں گویا عریاں ہوا
لیکن جب دھنک پھوٹی تو تمہاری ننھی، کانپتی ہوئی چھاتیاں
کس نے گرم کیں!

(۲۰)

محبت کی خوشبو! محبت کی مسکراہٹو!
اے سورج کے جلال! اور اے تاروں بھری رات کی شوکت!
موت کے مقابلے میں تم مجھے ہیچ نظر آتے ہو!
لنکا کی لڑکیو! سارتھ کے تاڑ کے درختو! ارگی کی ندیو! اکمل میں
شاہدانے کے درختوں میں ہوا کے گیتو! میں تمہیں الوداع کہتا ہوں!

۲۔ عورت

(۱)

میں اپنی بھوؤں کے سنگار میں ہی بہت سا وقت صرف کر دیتی ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ چتون کو ترچھی چتون کیونکر بنایا جاتا ہے۔ تبسم میں زیادہ سے زیادہ دلکشی پیدا کرنی مجھے خوب آتی ہے۔ جب میری سکھیاں میری ہنسی اڑاتی ہیں تو میں بالکل چُپ سادھ لیتی ہوں۔ اور جب کبھی مجھے دل میں درد محسوس ہوتا ہے تو میں اپنے کمربند کو کس کے باندھ لیتی ہوں۔ لیکن ان ساری باتوں میں کامیابی حاصل ہونا تو ایشور کے ہاتھوں میں ہے!

(۲)

اس جنگل کے کنارے پر چاندنی ہوئے اجنبی! تو کہاں دوڑا جا رہا ہے! کیا محبت نے یہ قوتِ پرواز تجھے دے رکھی ہے، اور تو اپنی محبوبہ کی رہنے کی جگہ کی طرف روانہ ہے! جس طرح مضراب سازِ نیت کے تاروں پر نہیں ٹھہرتا، تیرے قدم زمین پر نہیں ٹھہرتے۔ کیا تجھ پر روحانیت نے غلبہ پا لیا ہے؟ اور تو اپنے کو اپنے جسم سے علیحدہ کر کے قابو میں کرنے کی کوشش میں ہے؟

(۳)

میں ضرور جاؤں گی،
میں شفق پھیلنے تک باہر رہنے کے لئے کوئی نہ کوئی بہانہ بنا دونگی۔
میں چاہتی ہوں کہ خوشبیوں کو اپنے میں جذب کر لوں، اس لئے
میں دُور کے رستے سے فوارے کے سامنے جا پہنچوں گی،
اور وہاں میں اپنی سکھیوں سے کہوں گی کہ
میں تو یہ دیکھنے آئی ہوں کہ طوفان سے میرے باپ کے کھیتوں کو
کوئی نقصان تو نہیں پہنچا!
محبت ہر بات کو جیت لے گی،
میں ضرور جاؤں گی،
اے وحشی دل!

(۴)

میں اب اپنے جسم کو پانی کے بوسوں کے حوالے کرتی ہوں۔
اور پھر لمحوں کے بوسوں کو سونپ دوں گی۔

اے لبوں کے بوسو! کیا تم بھی شفاف پانی کی طرح میری روح
سے خوشبو کا اثر چھوڑ جاؤ گے!

(۵)

اے دن! کبھی تو کیسا پیارا ہو جاتا ہے، اے رات! تو کیسی اداس
ہی ہے۔
اے رات! کبھی تو کیسی میٹھی بن جاتی ہے! اے دن! تو کیسا
دل سے بھر جاتا ہے۔
اگر اس نے کبھی آنا ہی نہیں تو
تم دونوں معدوم ہی کیوں نہیں ہو جاتے!

(۶)

"وہ تو سو گئے، اب تم بھی سو جاؤ"
یوں مری سکھیوں نے مجھ سے کہا، اور مجھے چھوڑ کر چل دیں۔
اور پھر محبت کا ایک مستانہ غلبہ مجھ پر آ گیا،
اور میں نے ہونٹوں سے اپنے جان دولہا کے گال کو سہلایا
مجھے محسوس ہوا کہ وہ لرز اٹھا ہے،
میں جان گئی کہ سونے کا بہانہ ہی تھا،
اُس وقت مجھے شرم آ گئی،
لیکن جلد ہی میں نے مسرت کی آہیں بھریں۔[1]

(۷)

میرا باپ کسی کام کے لئے سفر پر ہے،
میری بہن بیمار ہے اور میری ماں صبح سے اُسے دیکھنے گئی ہے!
رات چھا رہی ہے،
اور میں بالی ہوں،
اور اکیلے ڈرتی ہوں،
اے پیارے اجنبی! آؤ — یہاں آ جاؤ!

(۸)

جس طرح اُس پرندے کے بوجھ سے ٹہنی خم کھاتی ہے، اُسی
طرح میں تمہاری چاہت کے بوجھ سے لچکتی ہوں۔
پرندہ اڑ جائے تو ٹہنی پھر ویسی ہی ہو جاتی ہے،
لیکن تمہارے چلے جانے پر میں پھر ویسی نہیں بن سکتی۔
لیکن پھر کیا؟
پنچھی! — گاتا جا،
میں بھول گئی تھی کہ تو جلد ہی گانا چھوڑ دے گا۔
میں بھول گئی تھی کہ ابھی تیرا گیت مجھے یاد نہیں ہوا ہے!

(۹)

اُس نے کئی بار سرگوشی میں کہا۔
"آؤ میں تمہیں اپنی مینا دکھاؤں"۔
میں اس کے پیچھے پیچھے گھر میں گئی،
لیکن گھر کی عورتیں ہمیں دیکھ رہی تھیں،
وہ بولی "مینا باغ میں ہوگی"۔
مینا باغ میں بھی نہ تھی۔ کیونکہ وہاں چنبیلی کے پھولوں کی خوشبو
بہت ہی زیادہ تھی۔
ندی کے کنارے بھی مینا نہ تھی، کیونکہ وہاں ایک چھوٹا سا لڑکا
لکڑیاں کاٹ رہا تھا۔
آخر ہمیں ایک ویران گنبد میں ایک رنگین چبوترے پر مینا ملی!

(۱۰)

اے رات! تو کئی بار میرے پاس دبے پاؤں آئی ہے اور تو نے
میرے روتے ہوئے چہرے کو چھپا لیا ہے۔ آج کی شام میرے پیالے
میں امرت دمک رہا ہے، اور میرے پریتم میرے سینے پر سر رکھے
سو رہے ہیں، اے رات! آج کی رات جب تک تیرا جی چاہے،
میرے ہی پاس رہ۔

(۱۱)

اگر تمہیں میرے پیار یاد ہیں تو جب تم اپنی پیاری کو زور سے
بھینچو تو ایک بار چپکے سے میرا نام بھی لے لینا۔

(۱۲)

ہم تین ہیں، لیکن اس کے باوجود ہم چار ہیں، کیونکہ محبت بھی تو
ہمارے پاس ہی رقص کناں موجود ہے۔ رات چھا چکی ہے لیکن
ہمیں تو نارانی کی چھاتیوں کا اُجالا حاصل ہے۔ پھولوں نے اپنی پتیاں
سمیٹ لی ہیں، لیکن پروا جب ہمارے قریب ہوتی ہے تو اُس کے
سانس کی خوشبو ہمیں تازہ دم بنا دیتی ہے۔ ارا ہا! آؤ، ہم اپنا پنہاں
ترین رقص کریں۔ آؤ کہ ہمارے پاؤں اس گھاس کو ایک شادمانی سے
مسل دیں۔ نارانی! بالوں کی لٹ نے تیرے گلے کو چھپا رکھا ہے،

[1] درد اور مسرت میں ایک گہرا نفسیاتی تعلق ہوتا ہے موجودہ ماہرین نفسیات نے اس پر مفصل بحثیں کی ہیں لیکن دیکھئے کہ امارو کو اس کا شعور اس وقت بھی تھا جب موجودہ نفسیاتی وضاحتوں کا کسی کو خیال بھی نہ

اسے ہشاد ہے۔ پریوا، ذرا اور پاس آجاؤ۔ اے محبت! ہمارے جسموں کو دیکھنی جا! ہمیں دیکھتی جا! ہمیں، ـــ نارانی کو، پریوا کو اور دوسبھی کو! ہم سب پیار کرتے ہیں، اور جنگل میں چھائی ہوئی رات کے بلاوے بھی ہمیں جدا نہیں کر سکتے! رات چاہتی ہے کہ ہماری فریادوں کو اپنی بھاری لوچ کی ہم آہنگ بنا لے، لیکن ارا ہا! ہم اس وقت تک ناچتے ہی رہیں گے کہ سحر کے منتاثی آثار نمایاں ہو جائیں۔ اس وقت تک ہم پریوا کو اپنے رہنے کی جگہ پہنچا نہیں سکے جائیں گے، اور نہ اس کے پینے کی شراب نوش کریں گے۔ ارا ہا! ہا! تمہارا پیٹ ڈولوں جیسے گویا کسی جھیل کی سطح پر طوفانی کوڑے پڑ چکے ہوں، اے نارانی! تمہارا پیٹ تو دیوں ہے۔ تم نے ابھی سے آخری ناچ کیوں شروع کر دیا! اور تم پریوا! ـــ پریوا! اے رات! ہم آتے ہیں!

(۱۳)

یہ بدھ کی بیوی کی پرارتھنا ہے!۔

اے مردوں میں سب سے سندر! اے چندر مکھ! تیری آواز ایسی میٹھی ہے، جیسی کلونکا پنچھی کی آواز۔ وہی کلونکا پنچھی جس کی آواز نے ایشور کو بھی پاگل بنا دیا تھا۔ اے میرے اُجیالے پتی! تو نے اُن باغوں کی جنت میں جنم لیا تھا جو مدھ مکھیوں کی گنگناہٹ سے گونج رہے تھے۔ اے گیان کے اونچے پیڑ! مکتی داتاؤں کی مٹھاس! اے میرے پتی! تیرے ہونٹ آلوچوں کی طرح گلابی ہیں، تیرے دانت برف کے گالوں کی طرح، تیری آنکھیں کنول ہیں، تیری کھال گلاب کا ایک پھول ہے! اے پھولوں میں سب سے روشن! اے میرے سہانے موسم! اے عورتوں کے بھون کی خوشبو! کہ جو چنبیلی سے اچھی ہے! ...... اے گھوڑوں میں سب سے اچھے گھوڑے، کنتھکا! وہ تجھ پہ سوار ہو کر کدھر چلا گیا!

۳۔ مرد اور عورت

(۱)

آج موسم کیسا ہے!

ہم کیا جانیں!

کیا کہا! ـــ گاؤں سے نکل کر آئی ہو اور تم کیا جانو!؟

دھرتی دھوپ سے اُجیالی ہے، لیکن جب تک میں یہ نہ جان لوں کہ تم شاداں ہو یا ملول، کیا پتہ کہ دن اچھا ہوگا یا بُرا!

(۲)

میری پیاری، میری پیاری پریتما! اس کالی رات میں تم کہاں جا رہی ہو؟

میں تو دُور کر اُس جگہ پہنچنے کو ہوں، جہاں وہ میری راہ دیکھ رہا ہے جو دن سے کہیں سندر ہے۔

لیکن کیا تمہیں اکیلے جاتے ڈر نہیں لگتا، میری پیاری، میری پیاری پریتما!

مدن اپنے کا ری تیر لئے میرے ساتھ ہے۔

(۳)

شکھ کی انجیر!

کہاں؟

شکھ کی انجیر! تمہیں نہیں پتہ کہ کہاں ہے۔

تو پھر تم ہی بتا دو۔

دو شاخوں کے درمیان۔

ادھر؟

نہیں۔

اُدھر؟

نہیں۔

اُوپر؟ نیچے؟

نیچے۔ لیکن ہلو نہیں۔

تو پھر تم ہی اسے توڑ لو۔

میں اُوپر چڑھوں گا۔

ہے بھگوان! میّا! اری میّا!

کیا ہوا ننھی؟

کچھ نہیں، میں گرنے لگی تھی۔

سندا تی! یہ انجیر بھی کیسی گرم چیز ہے!

(۴)

میں تو تمہیں دیکھ رہی تھی۔

میں تو کب سے یہیں ہوں۔

بھینسا نکل بھاگی تھی، اس لئے مجھے دیر لگ گئی۔

جھوٹ بولنے کی کوئی ضرورت نہیں، میں نے تمہیں مدّو کی
کے ساتھ دیکھا تھا۔
میں تو اس سے پوچھ رہی تھی کہ اُس نے کہیں میری بچھیا کو تو
نہیں دیکھا۔
اور پھر تم دونوں اُسے مل کر ڈھونڈتے رہے!
ہاں!
بڑی دیر تک؟
ہاں کافی دیر تک۔
اوہ! اسی لئے اُسے چلنا دوبھر ہو رہا ہے

(۵)

مجھے کہیں گرمی نہ لگ جائے، اس کا ڈر ہے۔
میرا گھر دریا کے کنارے پر ہے اور وہاں تازگی چھائی
رہتی ہے۔
اگر میں تمہارے گھر تک گئی تو لوگ مجھے دیکھ لیں گے۔
میرا گھر تو جنگل میں ہے، صرف پھول ہی تمہیں آتے جاتے
دیکھیں گے۔
پھول مدھ مکھی سے کہہ دیں گے، مدھ مکھی مینا سے کہہ دے گی
اور مینا تو سبھی سے کہہ دیا کرتی ہے۔
جب تم وہاں سے گذرو گی تو پھول تو بڑی دیر تک گونگے
بنے متوالے ہو کر جھومتے رہیں گے۔
جب میں لوٹوں گی تو میری ماں میرے بکھرے بال دیکھ لے گی۔
میرے آئینے میں تم اپنے بال پھر سے سنوار لینا اور اس
آئینے میں تمہاری مسکراہٹ کا عکس ہمیشہ ہمیشہ کے لئے
رہ جائے گا۔
مجھے تو تم سے پیار ہے، مجھے تو یہ بھول ہی چکا ہے کہ مسکرانا کسے
کہتے ہیں!

(۶)

آج تو تم جو چاہو مجھ سے مانگ لو، میرے پتی بہت دور گئے
ہوئے ہیں۔
افسوس، افسوس، لیکن مجھے تو صرف اچھوتی چنبیلی
ہی کی خوشبو بھاتی ہے۔

یہ محبت سے بھیگی ہوئی آنکھیں، جو کسی مست متوالی فاختہ کے
بازوؤں کی طرح آدھی کھلتی اور پھر بند ہوئی جاتی ہیں، جو دل کی ہر بات کو
پورے طور سے ظاہر کر رہی ہیں، وہ کون سا خوش قسمت ہے جس پر یہ
آنکھیں مرکوز ہوں گی؟
یہ آنکھیں اُسی پر مرکوز ہوں گی جو مجھ سے میری پریتم کی
باتیں کرے گا۔

۴۔ عورت اور عورت

(۱)

ابھی تھوڑی دیر ہوئی کہ وہ مجھے سدا کے لئے چھوڑ گیا! لیکن میں
ہمت سے کام لوں گی اور کوئی بھی میری ناامیدی کو دیکھ نہ پائے گا۔
میں مسکراتی ہوں، میں تو مسکرا ہی رہی ہوں۔
تمہاری مسکراہٹ میں ویسی ہی اُداسی ہے جیسی اُس
صبح میں جو کسی آتش زدہ گاؤں پر نمودار ہوئی ہو۔

(۲)

یہ لڑکیاں کپڑے دھوتے ہوئے اپنی چنچل باتوں سے اتنا شور
مچاتی ہیں کہ جو تم کہہ رہی تھیں وہ میں سُن ہی نہ سکی۔
اُس نے میری گردن کو اپنے بازوؤں کی لپیٹ میں لے
لیا، اپنی سانس میری سانس میں ملا دی اور اپنے ہونٹ
میرے ہونٹوں سے۔

(۳)

اُس کے پچاس ریوڑ ہیں، اُس کا انگوٹھے ایسا بیضوی چہرہ ہے
اس کے بدن سے کوئی بدن لگا نہیں کھا سکتا۔ جب وہ کالی جھیل میں
سے نہا کر نکلتا ہے تو گویا چاند رات میں نمودار ہوتا ہے۔ تمہیں بات چکانی
ہی پڑے گی۔
تمہیں کچھ جلدی ہے کیا؟
بہت۔
تو پھر اس سے کہہ دینا کہ وہ صرف میرے بالوں ہی سے کھیل سکے گا
پگلی ہوئی ہو کیا؟ میں اُسے یہ کیوں کہتی پھروں!
کیونکہ آج ہی سویرے وجُونا نے اُتنی ہی رقم ایک ایسے
دلال کے واسطے سے پیش کی ہے جو میرے دل بہلاوے
کے لئے اچھا خاصا ہے۔

(۴)

کون ہے؟

میں ہوں بہن۔ کتنی ہی دیر سے کواڑ بجا رہی ہوں۔

تمہارا نام کیا ہے؟

مہاڑیوا، مجھے پتہ ہے تم میری آواز کو پہچان گئی تھیں۔

پہچان تو میں گئی ہی تھی، کیونکہ تمہارے ہی سپنے دیکھ رہی تھی۔

تو لو، میں بھی آ پہنچی۔

لیکن اب تمہاری کوئی ضرورت نہیں۔ سپنے ہی میرے لئے کافی ہیں۔

(۵)

اری دیا متی! تو تو سب کچھ جانتی ہے یہ جوان مجھے کیوں تاکتے ہیں۔ میں ہوا کے مخالف ہو کر چلتی ہوں، یہاں تک کہ میرا لہنگا بدن سے چمٹ جاتا ہے۔ لیکن وہ راستہ کاٹتے ہوئے اپنی راہ چلے جاتے ہیں۔ میں کون سا جتن کروں کہ وہ یہ جان لیں کہ میں اب جوان ہوں؟

تمہیں انہیں یہ دھیان دینا چاہئے کہ تم پریم کی باتیں جانتی ہو۔

کیسے؟

اپنے دل کے جوش اور لگن سے۔

میرا یہ مطلب نہ تھا۔ میں تو کہتی تھی کہ میں انہیں اپنی جوانی کیونکر سمجھاؤں؟

ایک دن وہ دیکھیں گے کہ تم ہوا کے مخالف ہو کر نہیں چلتی ہو اور تم نے اپنے لہنگے میں بے شمار چھپانے والی تہیں بنا لی ہیں۔

(۶)

قسم کھا کر کہتی ہوں، کہ اس نے تمہیں دھوکا دیا۔ وہ نارائنی کے ساتھ تھا کہ ادھر سے میں جا پہنچی۔ اور کل اس نے میرے سینے کو چھو لیا اور آج صبح اس نے مجھے زبردستی چوم لیا اور میرے ہونٹوں کو گھائل کر دیا۔

تم جھوٹ کہتی ہو۔

تو یہ زخم دیکھ لو۔

مجھے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہیں۔ میں انہیں چوس کر دیکھوں گی، چوس کر؟ مجھے چوسنا ہی پڑے گا۔

(۷)

سمجھ میں نہیں آتا کہ تم کیسے اس رسیا پریمی کو دروازے سے باہر رکھتی ہو اور وہ گیت گاتا رہتا ہے۔ اس سے تو وہ اپنے پیارے گیت بالو پر ہی لکھ آئے تو اچھا، کیونکہ تم تو اس کا مذاق اڑانے کے لئے اپنی مینا کو وہ گیت سکھا دیتی ہو۔ وہ نوجوان تو دھن دولت والا ہے اور تمہیں روپے پیسے کی ضرورت ہے۔

(۸)

پھر اس نے کیا کیا؟

اس نے تازہ گھاس کا ایک تکیہ بنا کر میرے سر کے نیچے رکھ دیا اور آپ دودھ لینے چلا گیا۔

اور تم یونہی سوتی رہیں؟

تم بھی کیا نادان ہو۔ میں اٹھی اور میں نے "دادلی" کی ایک ٹہنی توڑی اور اپنے ہونٹوں کو چھال سے سرخ کیا اور جنگلی داکھ سے اپنے پپوٹوں کو نیلا بنایا اور بڑے بڑے کنول کے پھولوں سے برادہ لے کر اپنی چھاتیوں پر چھڑک لیا۔

۵۔ مشاہدات

(۱)

وہ اسے بتانے آیا کہ وہ اسے چھوڑ دے گا، کیونکہ اسے کسی اور سے پریم ہے اور وہ رو دی۔ اس نے اپنے بالوں کو ایک نئے انداز میں بنا رکھا تھا اور وہ اس نئے انداز کے متعلق بغیر کچھ کہے چلا گیا۔

(۲)

اس نے اس کے چہرے کو، اس کی چھاتیوں کو اور اس کے بازوؤں کو بوسوں سے ڈھانپ دیا اور پھر وہ چلا گیا۔ چونکہ اس نے اس کے منہ کو چومنے کی ہمت نہ کی اس لئے اب وہ اپنے کانپتے ہوئے بازوؤں پر اپنے ہونٹ پھرا رہی ہے۔

(۳)

پوست کا وہ پھول جسے کھلنے میں دیر لگتی ہے ہوا کا ایک جھونکا اس کی پتیوں کو کھول دیتا ہے۔ محبت ایک لڑکی کی روح کو اچانک ایک پھول کی طرح کھلا دیتی ہے۔

(۴)

دیکھنا، یہ بسنت کی ہوائیں جو صبح سویرے کنول کی خوشبو سے بوجھل

ہیں، اس لڑکی کے ماتھے سے چمکتے ہوئے پسینے کو کس طرح صاف کر دیتی ہیں، اور کسی پریمی کی طرح اس کے گھونگٹ کو چھیڑتی ہیں اور اُس کی شکتی اُسے واپس دے دیتی ہیں۔

(۵)

میں اس جوشیلی اور رس بھری آواز کو زیادہ اچھی طرح سننے کے لئے گھر سے باہر نکل آیا ہوں، یہ آواز جو کھیتوں کو چوم رہی ہے۔ یہ آواز تو گویا کسی عورت کی آواز ہے، حرارت سے لبریز اور سنجیدہ، محبت میں ڈوبی ہوئی، ــــــ لیکن یہ تو بند ہو گئی۔ بلبلیں آج رات چپ ہی رہی ہیں۔

لہ(۶)

..... اور وہ عورتیں جنہوں نے اپنی بنسریاں توڑ دی ہیں۔
پایاب پانی کے کنارے سپنے دیکھنے کو جاتی ہیں .....

(۷)

آرزو، احساس اور بے صبری سے لرزتے ہوئے وہ لمبے سفر کے بعد اپنی محبوبہ کے مکان میں داخل ہوا۔ اور اس نے دیکھا کہ اُس کی سکھیاں اُسے گھیرے ہوئے ہیں، اس کی سکھیوں کو اپنی ملاقات بڑھانے میں ایک تیکھا مزہ آتا تھا لیکن اُس کی محبوبہ اُس سے بھی زیادہ مشتاق تھی، اور یہ چلاتے ہوئے "اوئی! یہ کیا کاٹ گیا!" ــــــ اُس نے اپنا گھونگٹ اٹھایا اور اُس گھونگٹ سے اُس اکیلے دیئے کی لو کو بجھا دیا جو وہاں جل رہا تھا اور اندھیرے کی وجہ سے اُس کی سکھیاں رخصت ہو کر چل دیں۔

(۸)

مردوں کی باتیں:۔

تم تو بے وقوف ہو، اگر وہ نہ مانی تو یہ رونا دھونا کیسا! آنسو پونچھو اور چنبیلی کے پھولوں سے اپنے سر کو سجاؤ۔ اُس کی داسی کے دیس کا کوئی گیت گاؤ کیونکہ وہ داسی بھی تو سندر ہے، اپنی مالکن سے زیادہ سندر ہے وہ بہت جلد مان جائے گی، اور اپنی مالکن کی سختی کا کفارہ ادا کر دے گی۔

جاؤ جاؤ، مجھے چھوڑ دو، مجھے تو داپہا سے ہی محبت ہے،
مجھے چھوڑ دو۔

وہ داسی بڑی سندر ہے۔
صرف سندر تا ہی کافی نہیں ہوتی۔
اُس کی چھاتیاں، اُس کی ٹانگیں۔

وہ کس دیس کی ہے؟
مہاپورہ کی۔
شاید وہ میرے بھائی کو جانتی ہو، میرا بھائی بھی تو وہیں کہیں پاس ہی رہتا ہے۔ چونکہ تم کہتے ہو اس لئے میں گیت گا کر اُسے گھر سے باہر بلاؤں گا۔
مجھے یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ تمہیں اپنے بھائی سے اتنا پریم ہے اچھا، رام بھروسے!

(۹)

اُسے اُس شام کا دھندلکا یاد ہے جب اُس نے پھولوں سے لدے ہوئے پودے کے سائے میں اسی کے پریم کی قسم اٹھائی تھی۔ اُسے اُس کی بے وفائی بھی یاد ہے، اُس کا جھوٹ، اُس کا بے رحمی سے چلے جانا، اور وہ خوش ہے کہ وہ ایسے آدمی کے پھندے سے بچ گئی لیکن چاندنی میں پیڑ پر کھلے ہوئے پھول اُسے ہمیشہ دھندلے ہی نظر آتے ہیں۔

(۱۰)

بجلی کا رتھ بادلوں پر کڑکڑا رہا ہے۔ اب قریباً اندھیرا چھا چکا ہے۔ اور لو، برسات بھی آن پہنچی۔ آؤ سندری! میرے اس پیڑ کے نیچے پناہ لے لو۔ میں تو تمہیں تمہارے اس نئے لہنگے کے خراب ہو جانے کے خیال سے یہاں پناہ لینے کو کہہ رہا ہوں اور میرے پیڑ کی ٹہنیوں میں جو پنچھی چھپا بیٹھا ہے۔ اُس کے خیال سے کہہ رہا ہوں، کیونکہ اس پنچھی نے کبھی ایسا موقعہ نہیں دیکھا کہ ایسے طوفان سے کسی مرد اور عورت نے فائدہ نہ اٹھایا ہو۔
"افسوس! افسوس! مجھے تمہاری بات ماننا ہی پڑے گی" ــــــ
لیکن اس کے باوجود پنچھی جلد ہی اڑ گیا۔

(۱۱)

گہرے نیلے کنول کی بجائے اُس کی ایک نظر، چنبیلی کے پھولوں کی بجائے اس کے مسکراتے ہوئے روشن منہ کے دانت، پیالے کی بجائے اُس کی ایک ہلتی ہوئی چھاتی، ــــــ اور یوں وہ اس موقعے پر کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی اُس کے لوٹ آنے کی دھوم دھام منا رہی ہے۔

(۱۲)

"تم گھونگٹ کے بغیر زیادہ سندر دکھائی دیتی ہو" اور اس کا بے صبر ہاتھ کمر کی طرف سرکتا ہے۔ نوجوان لڑکی کی آنکھوں میں ایک چمک جاگ اٹھتی ہے اور اُس کی سکھیاں اور داسیاں دانشمندی سے کام لیتے ہوئے وہاں

لہ منداں ووچ روون کھلیاں کچی ٹٹ گئی جنہاں دی یاری۔ م۔

سے چل دیتی ہیں۔

(۱۳)

بھوانی، امبالیکا اور رَدہنی نے اپنے مسکراتے ہوئے چہروں کا عکس پانی میں دیکھا اور بھوانی یہ پکارتے ہوئے کہ مجھے تو پیاس لگی ہے، اس سنہرے دائرے پر جھکی جو رودہنی کا چہرہ تھا اور اُس نے اُسے چوم لیا جب وہ دائرہ لرزتا ہوا سطح پر تیر رہا تھا اور امبالیکا رونے لگی۔

(۱۴)

وہ پربت کے دھارے کو دیکھتی ہے جہاں بن لاہری اپنے پاؤں کو رکھتا ہے اور کہتی ہے "اے دھارے! اے ندی! کیا تو نے اسے دیکھا ہے؟" اور دھارا اپنے جھاگ چھوڑتے ہوئے منہ سے کہتا ہے۔ "میں نے تو نیلے آسمان اور سفید چٹانوں کو دیکھا ہے" "کیا تو نے بنسری کی تان سُنی ہے؟" "میں نے تو چٹانوں سے ٹکراتی ہوئی ہوا کا شور سُنا ہے!" "اے دھارے! اے ندی! کیا تو نے کہیں منڈلاتے ہوئے عقاب کو دیکھا ہے؟" دھارا کہتا ہے "میں نے عقاب کو دیکھا ہے" اور وہ کہتی ہے "میں خوش ہوں کہ تو نے اُس عقاب کو دیکھ لیا جس نے اسے دیکھا ہے!"

(۱۵)

اے اگنی کہ جس سے بڑھ کر شکتی والے صرف اندر مہاراج ہیں، اے قدرت کی حرارت! برفانی پہاڑوں سے چھلکتی ہوئی، ستاروں کے چمکتے ہوئے گھیرے سے بہتی ہوئی اگنی، اگنی، اگنی! تجھ میں ہزاروں کنول تلملاتے ہیں، تو لوہے کو سرکنڈوں کی طرح موڑ دیتی ہے، تو ناچنے والوں کے دلوں میں جوت جگائے ہوئے ہے، اُن غزالوں کے لہو میں بھڑک رہی ہے جو شکاریوں کے آگے آگے ہانپتے ہوئے قلانچیں بھرتے چلے جاتے ہیں، تو چمٹے ہوئے پریمی اور پریتم کے بازوؤں میں ہے اگنی، اگنی، اگنی!

(۱۶)

مندر کی گھنٹی نے اپنی آواز کے تیر کو رات پر ڈھیلا چھوڑ دیا ہے اور تیز تیز سائے گذر رہے ہیں۔ وہ جو چاندی کے پازیبوں کی جھنکار سنائی دے رہی ہے، وہ پرتھا ہے اور وہ اُداس گیسوؤں والی ہنمد نینا ہے۔ وہ آ ملی ہے اور وہ گاتی ہے۔ جلد ہی وہ لوٹ آئیں گی اور ہر ایک کے پاس نیلوفر کے پتے میں سنکلپ کیا ہوا ایک ایک کوئلہ ہوگا اور ہمیشہ کی طرح پرتھا کے کوئلے میں گھاس پر کی اوس جذب ہو جائے گی کیونکہ وہ پیار دینے کے لئے کوئلے کو زمین پر رکھ دیا کرتی ہے۔

(۱۷)

بھوانی اور پرتھا سرگوشی کر رہی ہیں۔ وہ کیا کہہ رہی ہیں؟ لو، اب پرتھا دوڑ پڑی۔ وہ کہاں جا رہی ہے؟ اب اُس کے پازیبوں کے ننھے ننھے گھنگروؤں کی آواز نہیں آ رہی۔ بہت دور، وہاں دیکھنا، دو لڑکیاں ایک دوسری کا منہ نوچ رہی ہیں اور ایک نوجوان مرد کھڑا ایک پھول کی پتیاں توڑ رہا ہے۔

(۱۸)

بنسریاں چُپ ہوگئیں۔ الھڑ لڑکیاں دوڑ رہی ہیں۔ پھول مسلے گئے، طوفان آگیا۔

(۱۹)

اے صبح سویرے کی صورت والی موت! اے پھولوں کے تاج والی موت! اے وہ کہ جو ازل سے آج تک ہر مرد اور عورت کے جسم کو اپنے آغوش میں لینے کی مستی میں چور ہے! اے وہ کہ جس کے ہونٹوں پر مہر لگی ہے! اے موت کہ جو گرے ہوئے شکستہ رقاصوں کی تسلیم و نیاز سے بھری ہے! اے صبح سویرے کی صورت والی موت!

. . . .

یہاں امارو کی پریم کتھا ختم ہوتی ہے۔

اس بات کے باوجود کہ ہمیں صرف امارو کا نام معلوم ہے اور اُس کی یہ نظمیں اور "انداز" اُس کا زمانہ۔ ہم اِن نظموں ہی سے اُس کی زندگی کے متعلق بہت کچھ اندازہ لگا سکتے ہیں اور "مشاہدات" کے حصے میں تو (جسے میرے خیال میں ذاتی نظمیں کہا جا سکتا ہے اگرچہ ان کا انداز خارجی ہے) ہمیں زندگی کے متعلق امارو کے خیالات کی بھی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ مثلاً پہلی نظم سے پتہ چلتا ہے کہ امارو کے خیال میں مرد کی ذات بے وفا ہے۔ چھٹی نظم میں بھی ناقابلِ فہم طریق پر یہی خیال جھلک رہا ہے۔ آٹھویں نظم میں تو علی الاعلان مردوں کو معتوب کیا گیا ہے۔ نویں نظم سے عورت کی وفاداری ظاہر ہے، اور آخری نظم میں اچانک ہمیں اس کتھا کے انجام پر معلوم ہوتا ہے کہ یہ رنگ رلیاں اور یہ عیش و عشرت تبھی تک ہیں کہ سانس چل رہی ہے۔
لیکن یہ تمام نظمیں مل کر زیرِ لب یہ کہتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں کہ ؎

ساقیا! یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ　　جب تلک بس چل سکے ساغر چلے

میراجی

بغاوت

(نظم)

زندگی محبوب ہے، پھر بھی دعائیں موت کی،
مانگتا ہے دل مرا دن رات کیوں ؟
قسمتِ غم گیں کے ہونٹوں پر کبھی ،
آ نہیں سکتی خوشی کی بات کیوں ؟

کیوں نگاہوں پر مری چھائے ہیں آنسو کے نقاب،
اس سوالِ مستقل کا کیوں نہیں ملتا جواب؟
کیا خودی کی الجھنیں میرے ارادے توڑ کر
کر رہی ہیں مجھ کو اس دنیا میں ناکامِ حیات؟
کیوں نہیں آتی وہ رات
جس کی ضَو ہو تمّ تر سحر
آرزو ہے، مجھ سے ہو اب ہم کلام؛
راحتیں معدوم ہیں میرے تخیل سے تمام!
راستہ مجھ کو نظر آتا نہیں!
راستہ مجھ کو خوشی کا کیوں نظر آتا نہیں؟

چل مرے دل! آج اس محدود خلوت سے نکل!
ہاں سنبھل، قعرِ خموشی میں نہ گر، لے اب سنبھل!
بے خودی مسلک بنا لے، بھول جا سب آج کل!
چھوڑ دے مرکز کی چاہت، مضطرب ہو اور مچل!
سینۂ آتش فشاں کی طرح گرمی سے اُبل!
چل مرے دل! راستہ خوشیوں کا دیکھ!
اور شعلہ عیش کے لمحوں کا دیکھ!
دل گرفتہ! آنسوؤں کو خشک کر!
دیکھ رستہ! آنسوؤں کو خشک کر!
چھوڑ دے مرکز کی چاہت، مضطرب ہو، اور مچل!
چل مرے دل! آج اس محدود خلوت سے نکل!

میرا جی

نوادرِ ادبی

حالی کا ایک غیر مطبوعہ خط

بہت عرصے تک ہندوستان میں فن کار کی زندگی کو اس کے فن سے ایک علیحدہ چیز سمجھا جاتا رہا۔ اسی وجہ سے کسی شاعر، مصور یا راگی کی نجی زندگی کے واقعات کو آئندہ نسلوں کے فائدے کے لئے ضبطِ تحریر میں لانے کا رواج آغاز ہی سے بہت کم رہا اور یوں موجودہ زمانے میں جب ہمیں معلوم ہوا کہ زندگی اور فن کے گہرے تعلق کو خاطر خواہ طور پر سمجھا نہ گیا۔ لیکن فن کار کی نجی زندگی کا علم بھی ایک ضروری جزو ہے تو عموماً اس سلسلے میں تحقیق و تفتیش کرتے ہوئے بہت سی مشکلات حائل ہوئیں۔ اردو شعراء کے حالات معلوم کرنے میں جو چیزیں زیادہ تر ہماری معاون ثابت ہوتی ہیں، لطائف، خطوط اور واقعاتی نظمیں، کیونکہ باقاعدہ سوانح عمری کا رواج ابھی ایک نئی بات ہی ہے۔

جون کے شمارے میں جناب مالک رام ایم اے نے نوادرِ ادبی کے عنوان سے غالب کا ایک غیر معروف واقعاتی قطعہ ناظرین ادبی دنیا کی دلچسپی کے لئے پیش کیا تھا۔ موجودہ شمارے میں وہ مولانا الطاف حسین حالی پانی پتی کا ایک غیر مطبوعہ خط پیش کرتے ہیں جس سے بیک وقت غالب، انیس، حالی، احسن لکھنوی اور بعض دوسرے اصحاب کے متعلق کچھ حالات معلوم ہوتے ہیں۔ ہم اس خط کے لئے صاحبِ موصوف کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ (ادارہ)

(ہم آج مولانا حالی مرحوم کا ایک خط ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں۔ جو ان کے مکتوبات کی دونوں جلدوں میں نہیں چھپا ہے اور نہ کہیں اور جگہ ہماری نظر سے گذرا ہے۔ چونکہ یہ خط ایک خاص واقعے کے سلسلے میں لکھا گیا ہے۔ اس لئے اس کی وضاحت کے لئے چند تمہیدی سطور درج ذیل ہیں۔

۱۹۰۵ء میں منشی مہدی حسن صاحب احسن لکھنوی نے میر انیس مرحوم کی سوانح عمری بنام "واقعات انیس" شائع فرمائی۔ احسن صاحب نے کتاب مذکور کے صفحہ ۱۹ پر لکھا۔

"چنانچہ مرزا غالب مرحوم سے لکھنؤ میں جب میر انیس کی ملاقات ہوئی اور مرزا صاحب نے غزل سننے کا شوق ظاہر کیا تو میر انیس مرحوم نے صنف غزل گوئی کا ابتذال ظاہر کر کے اکثر سلاموں کے مطلعے اور شعر سنائے جو تغزل کے رنگ میں صنفِ غزل سے بدرجہا بلند و مضمون خیز تھے اور مرزا صاحب سے دل لگی دل لگی میں مرثیہ کہنے کی فرمائش بھی کر دی۔ میر انیس کا مقصود یہ تھا کہ غالب سا شاعر بھی مرثیے کی فکر کر کے دیکھ لے کہ یہ راستہ کس قدر دشوار گذار ہے چنانچہ مرزا غالب مرحوم نے صرف تین بند مرثیے کے بڑی کاہش و کاوش سے لکھے ہیں اور میر صاحب کے پاس اصلاح کو روانہ کئے ہیں اور اس کے ساتھ جو خط ہے اس کی عبارت یہ ہے:۔

امتثال امر سے مجبور تھا۔ صرف تین بند لکھ کر جو غور کیا تو مرثیہ کاہے کو ہے واسوخت معلوم ہوتا ہے۔ اصل بات تو یہ ہے کہ یہ آپ ہی کا کام ہے"

احسن صاحب کے اس بیان سے مندرجہ ذیل امور ظاہر ہوتے ہیں۔

(۱) میرزا غالب کلکتہ جاتے ہوئے لکھنؤ ٹھہرے تو ان کی میر انیس سے ملاقات ہوئی۔

(۲) میر انیس نے میرزا سے مرثیہ لکھنے کی فرمائش کی۔

(۳) میرزا نے بڑی کاہش و کاوش سے تین بند لکھے اور انہیں بغرضِ اصلاح میر انیس کے پاس بھیجا اور صنفِ مرثیہ میں اپنے عجز کا اعتراف کیا۔

میر انیس کی عظمت سے کوئی انکار نہیں مگر جس رنگ میں احسن صاحب نے یہ واقعہ لکھا ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس سے انیس کی عظمت کے اظہار سے زیادہ غالب کی منقصت منظور تھی (وہی لکھنؤ اور دہلی کی روائتی چشمک اور بے جا جنبہ داری) چنانچہ جب "واقعات انیس" نواب ضیاءالدین احمد خاں نیرِ درخشاں کے صاحبزادے مرزا سعید الدین

احمد خاں طالب مرحوم کی نظر سے گذری تو انہوں نے احسن صاحب سے اس واقعے کے لئے سند طلب کی اور پوچھا کہ وہ خط کہاں ہے جس کا حوالہ آپ نے اپنی تحریر میں دیا ہے۔ احسن صاحب نے اس کے جواب میں ایک طویل خط لکھا۔ یوں یہ خط وکتابت کا سلسلہ کچھ مدت جاری رہا۔ احسن صاحب کو اس واقعے کی صحت پر اصرار تھا۔ اور طالب مرحوم اسی تحدی سے اسے غلط قرار دیتے تھے۔ اور کسی طرح فیصلہ ہونے میں نہیں آتا تھا۔

آخر طالب نے یہ تمام خط وکتابت چھپوا کر دہلی اور اطراف کے صاحبان علم کے پاس بھیجی اور درخواست کی کہ وہ اسے مطالعہ فرما کر محاکمہ کریں کہ کون سچا ہے اور کون جھوٹا۔ اس پر مولانا حالی مرحوم نے جو خط نواب صاحب کو لکھا ہے وہ ہدیۂ ناظرین ہے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس کے بعد احسن صاحب نے اپنی غلطی کا اعتراف کر لیا کہ میر انیس اور مرزا غالب کی ملاقات کا واقعہ ہی سرے سے غلط ہے۔ مالک رام

منجانب شمس العلما مولوی خواجہ الطاف حسین

بنام نواب سعید الدین احمد خاں طالب مرحوم

جناب نواب صاحب مخدوم ومکرم تسلیم۔ کتاب "واقعات انیس" کے بعض مضامین کے متعلق آپ کے اور مصنف "واقعات" کے درمیان جو خط وکتابت ہوئی ہے وہ چھپی ہوئی میرے پاس پہنچی۔ میں اس باب میں زیادہ لکھنا نہیں چاہتا۔ صرف اس قدر لکھنا کافی سمجھتا ہوں کہ مرزا صاحب (غالب) کی ملاقات لکھنؤ میں نہ انیس مرحوم سے ہوئی نہ ہو سکتی تھی۔ مرزا صاحب لکھنؤ اس وقت گئے ہیں جب کہ وہ سپریم کورٹ (عدالت عالیہ) میں اپنی پنشن کی بابت استغاثہ کرنے کے لئے کلکتے جاتے تھے اور اثنائے راہ میں چند روز لکھنؤ ٹھہرے تھے۔ یہ زمانہ جیسا کہ مرزا صاحب کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے نصیر الدین حیدر کا تھا چنانچہ وہ ایک خط موسومہ منشی حبیب اللہ خاں ذکا میں جو اردوئے معلی مطبوعہ ۱۸۹۹ء کے صفحات ۷۰، ۷۹ میں درج ہے اپنا کلکتے جانا ۱۸۳۰ء میں لکھتے ہیں[1]۔ نصیر الدین حیدر جیسا کہ تواریخ اودھ میں مذکور ہے ۱۸۲۷ء میں تخت نشین ہوئے۔ اس سے ظاہر ہے کہ ۱۸۳۰ء میں عہد نصیر الدین حیدر کا آغاز تھا۔ اس وقت تک میر انیس نہ لکھنؤ میں فیض آباد سے آئے تھے اور نہ لکھنؤ میں ان کی کچھ شہرت تھی اور نصیر الدین حیدر دس برس تخت نشین رہے اور ان کے بعد پانچ برس کے قریب محمد علی شاہ تخت نشین رہے۔ ان دونوں کے عہد میں میر انیس صاحب جیسا کہ واقعات انیس سے ظاہر ہے فیض آباد ہی میں رہے اور امجد علی شاہ کے زمانے میں فیض آباد سے آکر لکھنؤ میں ان کے خاندان نے سکونت اختیار کی۔ چنانچہ واقعات انیس کے صفحہ ۶۶ میں لکھا ہے کہ نصیر الدین حیدر کے زمانۂ سلطنت تک میر انیس کی شہرت لکھنؤ میں نہیں پائی جاتی۔ کیونکہ مرزا رجب علی بیگ کے "فسانۂ عجائب" کی ابتدا زمانہ غازی الدین حیدر میں ہوئی اور عہد نصیر الدین حیدر میں وہ تمام ہوا۔ سرور نے اس کتاب میں لکھنؤ اور صاحب کمالان لکھنؤ کا ذکر کیا ہے۔ اس وقت کی انشا پردازی کے موافق تلمیح علما و حکما سے لے کر ادنیٰ طبقے کے لوگوں تک کا ذکر کر گئے ہیں۔ اس فہرست میں میر انیس کا نام نہیں پایا جاتا۔ اس کے بعد اسی صفحے پر لکھا ہے کہ لکھنؤ کے اکثر کہن سال بزرگوں سے بھی یہی دریافت ہوا کہ زمانۂ امجد علی شاہ میں میر انیس کا مستقل قیام لکھنؤ میں ہوا ہے۔ جو فہرست مشاہیر لکھنؤ کی "فسانۂ عجائب" کے مصنف نے نقل کی ہے۔ اس میں مرزا دبیر کا نام تو پایا جاتا ہے لیکن میر انیس کا نام نہیں ہے۔ اس کے علاوہ صفحہ ۲۷ پر یہ لکھا ہے: میر انیس مرحوم خود فرماتے تھے کہ جب ہم نے لکھنؤ میں مرثیہ پڑھنا شروع کیا تو اس وقت دو صاحب اس فن کے لکھنؤ میں نامی گرامی تھے۔ ایک تو میر مدآری صاحب اور دوسرے مرزا سلامت علی دبیر۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ میر انیس کی شہرت لکھنؤ میں مرزا دبیر سے بہت پیچھے ہوئی ہے۔ مگر مرزا دبیر سے بھی مرزا غالب کا لکھنؤ میں ملنا کسی تحریر سے یا کسی زبانی روایت سے ثابت نہیں ہوتا۔ البتہ شیخ امام بخش ناسخ اور میر ضمیر سے ان کا ملنا بخوبی ثابت ہے اس سے کسی کو انکار نہیں ہے۔ اگر ان یقینی شہادتوں سے قطع نظر کی جائے تو مصنف "واقعات انیس" کی طرز تحریر ایسی واقع ہوئی ہے کہ جو مکالمہ میر صاحب اور میرزا صاحب کی طرف منسوب کیا گیا ہے وہ دونوں صاحبوں کی شان سے نہایت بعید معلوم ہوتا ہے۔ مرزا صاحب جو گویا اہل لکھنؤ کے مہمان تھے۔ ان سے میر انیس کا پہلی ملاقات میں یہ کہنا کہ غزل ایک مبتذل صنف کلام ہے اور ان سے مرثیہ لکھنے کی فرمائش کرنا اور گویا در پردہ یہ کہنا کہ اس میدان میں آؤ تو حقیقت معلوم ہو کس قدر خلاف انسانیت، خلاف تہذیب اور خلاف اخلاق باتیں ہیں جن کو کوئی مرد آدمی باور نہیں کر سکتا۔ خاکسار کا یہ بیان آپ جس رسالے یا اخبار میں چاہیں شائع کرا دیں۔

راقم خاکسار الطاف حسین حالی از پانی پت ۴ مارچ ۱۹۰۹ء

[1] مرزا غالب لکھنؤ جاتے ہوئے ۱۸۲۶ء یا ۱۸۲۷ء میں لکھنؤ ٹھہرے یہاں مرزا غالب اور حالی دونوں کو تاریخ کے تعین میں سہو ہوا ہے۔ دیکھو ذکر غالب صفحہ ۳۰-۳۱ (مالک رام)

غزل

یکساں روشِ شیخ و رہِ برہمنی ہے
دنیا جسے کہتے ہیں خدا کی صنمی ہے

ہرچند کہ ارزاں ہیں یہاں حسن کے جلوے
لیکن ابھی دنیا میں محبت کی کمی ہے

اپنی ہوسِ دید کو بدنام کریں کیوں؟
خود حسن کی فطرت میں تماشا طلبی ہے

کہتے ہیں تری جلوہ گہِ ناز ہے دنیا
اب ہوش میں آنا بھی یہاں بے ادبی ہے

جو حوصلۂ ارض و سما پھونک کے رکھ دے
وہ برقِ تجلی مرے خرمن پہ گری ہے

جس دم نظر آجائے ترا حسنِ دل آرا
میرے لئے وہ لمحہ حیاتِ ابدی ہے

اس سوزشِ پیہم نے کہیں کا بھی نہ رکھا
یہ دل ہے کہ اک آگ سی سینے میں بھری ہے

جب تک نہ ہو دل واقفِ اسرارِ خدائی
اے شیخ وہ سجدہ نہیں بیہودہ سری ہے

پروانے سرِ شام ہی جس سے تڑپ اٹھے
وہ آگ دلِ شمع میں تا صبح جلی ہے

لا بادۂ غم سوز کہ غم کا نہیں یارا
اللہ کو اندازۂ ضبطِ بشری ہے

ساغر کی ہوس کفر ہے میرے لئے تاباں
خوش ہوں کہ اسی میں مرے ساقی کی خوشی ہے

ظفر تاباں

ڈاکٹر نذیر احمد کا ایک ناول

کسی ناول، قصے یا کہانی میں جو بات سب سے پہلے دیکھی جاتی ہے وہ اس کا موضوع ہے۔ ناول کے ذریعے سے کن موضوعات پر اظہار خیال کیا جا سکتا ہے اور کیا مولوی نذیر احمد اپنے فسانوں میں ناول کے مقررہ موضوع پر خامہ فرسائی کرتے ہیں یا نہیں۔ یہ سوالات ایسے ہیں جو ہر ناول پڑھنے والے کے دماغ میں پیدا ہو سکتے ہیں۔

ناول کے موضوع کے متعلق سمجھ لینا چاہئے کہ اس کے موضوع کی وسعت خود ذات انسانی سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ ناول نگار عورتوں اور مردوں کا گہری نظر سے مطالعہ کرتا ہے، اس کا تعلق ان کے افعال۔ ان کے خیالات۔ ان کی غلط کاریوں، ان کی عظمت اور ان کی فرومائگی سے ہے۔ بے شمار حسین صورتیں، ان کی تلون مزاجی، خوف۔ احساسات۔ جوش اور جذبات جو انسانی قلوب میں تموج برپا رکھتے ہیں۔ یہ سب ناول کے موضوع ہیں۔ گویا اس کا موضوع خود انسان ہے۔

علامہ نذیر احمد کے تمام ناول اس معیار پر پورے اترتے ہیں۔ ان کے ناولوں کا موضوع خود انسان ہے اور انسان بھی کون؟ وہی جو ہماری اور آپ کی طرح ہندوستانی ہو۔ محصنات کے دیباچے میں علامہ نے اپنے ناولوں کے متعلق خود جو کچھ لکھا ہے وہ یہ ہے "۔ . . . عورتوں کی تعلیم کا سلسلہ مرتب ہو گیا۔ خانہ داری میں مراۃ العروس معلومات ضروری میں بنات النعش خدا پرستی میں توبۃ النصوح . . . "

اس سے صاف ظاہر ہے کہ علامہ نذیر احمد کے ناولوں کا موضوع انسان ہے اور ان کے موضوع کی نوعیت اصلاحی۔ مراۃ العروس کی ابتدا کو ملاحظہ فرمائیے۔

"جو آدمی دنیا کے حالات پر کبھی غور نہیں کرتا۔ اس سے زیادہ کوئی بے وقوف نہیں ہے اور غور کرنے کے واسطے دنیا میں ہر طرح کی باتیں ہیں لیکن سب سے عمدہ اور ضروری آدمی کا حال ہے . . . "

اسی طرح توبۃ النصوح میں اپنے مقصد کو اس طرح پیش کیا ہے

"اس کتاب میں انسان کے اس فرض کا مذکور ہے جو تربیت اولاد کے نام سے مشہور ہے . . . . "

محصنات کا موضوع خود انسان ہے اور اس کے موضوع کی نوعیت بھی اصلاحی ہے چنانچہ وہ دیباچہ کتاب میں تحریر فرماتے ہیں:

"ان ہی دنوں مجھے یہ خیال ہوا تھا کہ مسلمانوں کی معاشرت میں عورتوں کی جہالت اور نکاح کے بارے میں آزادی، دو بہت بڑے نقص ہیں میں نے ایک نقص کے رفع کرنے میں کوشش کی ہے تو دوسرے نقص کے رفع میں بھی کچھ کرنا ضرور ہے۔"

محصنات کا مقصد اگرچہ نکاح کے بارے میں آزادی ہے۔ مگر صرف یہی نہیں بلکہ علامہ نے اس کے تحت میں ان تمام امور پر روشنی ڈالی ہے جن کے ناقص رہنے سے ازدواجی زندگی میں خرابیاں واقع ہو جاتی ہیں اور ضمناً ان تمام خرابیوں کو بھی دور کرنے کی سعی کی ہے۔ جو اس وقت ہندوستانیوں میں عام طور پر اور مسلمانوں میں خاص طور پر جاگزیں تھیں۔ چنانچہ تعلیم کے متعلق جو خیالات انہوں نے ظاہر کئے ہیں۔ ان میں اخلاق کی درستی پر خاص زور دیا ہے۔ انہوں نے ناول کے ہیرو مبتلا کا کیریکٹر بیان کرتے وقت اس خیال کو اس طرح ادا کیا ہے

"دنیا میں سارے لوگ پڑھے لکھے نہیں ہوتے اور نہ پڑھنے لکھنے پر زندگی یا معاش کا انحصار ہے۔ اصل چیز ہے عادات کی درستی۔ مزاج کی شائستگی طبیعت کی اصلاح . . . . "

ایک دوسری جگہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ اگر اخلاق درست نہیں ہیں تو پڑھنے سے کوئی فائدہ نہیں۔

ے انہیں۔ ا۔ ع۔

"۔۔۔۔ فرض کیا وہ اچھی طرح پڑھتا ہی ہے تو بد وضع کو پڑھنے

سے فائدہ علم سے حاصل؟ اس سے جاہل بدوضع بہتر۔

ان پڑھ کہیں بھلا ۔۔۔"

علامہ نے قدیم نظام تعلیم اور جدید طرز تعلیم کا مقابلہ نہایت خوبی سے کیا ہے اور جدید نظام میں ان کو جو خوبیاں نظر آئی ہیں انہیں نہایت خوبی سے سراہا ہے یعنی جماعت بندی، مختلف مضامین کا مختلف اوقات میں پڑھانا، کھیل کود، ورزش جسمانی، نصاب تعلیم کا منظم صورت میں ہونا وغیرہ لیکن یہاں اساتذہ اور پروفیسروں پر ایک طنز ملیح کی ہے کہ ان کو بھی طلبہ کے اخلاق کی درستی کا خیال نہیں۔

"چوری کرو، جھوٹ بولو، سر بازار جوتی پیزار لڑو، گالیاں دو اور

گالیاں کھاؤ۔ شرافت کو بٹہ لگاؤ۔ بدمعاشوں میں رہو اور بدمعاش

بنو ۔۔۔۔ غرض جو تمہارا جی چاہے سو کرو، مگر جو چیزیں

پڑھائی جاتی ہیں۔ ان میں امتحان اچھا دو تو اسکالرشپ بھی

ہے۔ انعام بھی ہے سرخروئی بھی ہے۔ مدرس خوش، پرنسپل

بھی راضی ۔۔۔۔" صفحہ ۱۹

موجودہ نظام امتحان کے متعلق ان کی رائے ہے کہ

"شوق کے مشتعل کرنے کو امتحان کا قاعدہ نہایت عمدہ تھا!"

مگر امتحان محض رٹائی کا دوسرا نام ہے اور وہ ذاتی قابلیت کی جانچ کا صحیح طریقہ نہیں ہے۔

"ایک بار تو امتحان ہوتا تھا۔ اکثر انگریزوں کے بڑے دن سے

پہلے۔ پس امتحان کے مہینے ڈیڑھ مہینے آگے سے وہ تیاری

کر لیتا ہوگا ۔۔۔۔" صفحہ ۲۰

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ امتحان محض دھوکا ہے اور طلبہ میں استعداد پیدا نہیں کر سکتا کیونکہ طلبہ امتحان کو ناجائز طریقوں سے بھی پاس کر لیتے ہیں۔

"۔۔۔۔ اگرچہ چوری چھپے ناجائز طور پر دوسروں سے مدد لے

کر ہی کیوں نہ ہو" صفحہ ۱۹

بچوں کی تعلیم سے وابستہ دوسری بات جس پر انہوں نے بہت زیادہ زور دیا ہے خانگی تعلیم اور مادری تربیت ہے اور یہ واقعہ ہے کہ جس وقت سے بچہ پیدا ہوتا ہے اسی وقت سے اس کی تعلیم شروع ہو جاتی ہے گویا آغوش مادری اس کا اسکول ہے اور گہوارہ اس کی تعلیم گاہ۔

مگر کتنے لوگ ہیں جو اس کا خیال رکھتے ہیں۔ علامہ نذیر احمد اس کے سختی سے پابند ہیں چنانچہ انہوں نے مبتلا کی تباہی کا ذمہ دار اس کی ناقص تربیت ہی کو قرار دیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ آغوش مادری ہی بچے کے لئے بہترین تربیت گاہ ہے:۔

"ظاہر میں معلوم ہوتا ہے کہ بچے ایک مضغۂ گوشت کی طرح پڑے

ہیں۔ نادان اور لاعقل نہیں ہیں۔ وہ اپنے سارے حواس سے

ظاہری ہوں یا باطنی، بڑی کوشش سے کام لے رہے ہیں

چیزوں کو دیکھتے ہیں۔ ٹٹولتے ہیں۔ آوازوں کو سنتے ہیں اور جو

دیکھتے ہیں یا سنتے ہیں ان کو حافظہ میں رکھتے جاتے ہیں ۔۔۔" صفحہ ۶

جس فضا اور ماحول میں انسان پرورش پاتا ہے اس کے اخلاق پر اس کا خاص اثر پڑتا ہے یہی وجہ ہے کہ ناول نگار اس ماحول اور فضا کا تعارف قارئین سے کرا دیتا ہے۔ چنانچہ محصنات میں بھی یہی بات پائی جاتی ہے۔ چونکہ مبتلا کا تعلق ایک زمیندار خاندان سے تھا اس لئے ضروری تھا کہ اس عہد کے زمینداروں کی حالت کا نقشہ مکمل طور سے کھینچا جائے۔ علامہ نذیر احمد نے زمینداروں کی حالت کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے کہ پہلے سیّدوں کی خبر لی ہے کیونکہ مسلمانوں میں یہی قوم با اثر اور صاحب ثروت تھی۔ اس کے بعد کسانوں اور زمینداروں کی حالت بیان کی ہے۔ سیّد جو اشرف الاشراف سمجھے جاتے تھے اور جن سے امید کی جاتی تھی کہ وہ تمام صفات حمیدہ سے متصف ہوں۔ ان کی حالت اس درجہ بدتر ہو گئی کہ برعکس نہند نام زنگی کافور کا مصداق بن گئے۔ یہ خیال انہیں کے الفاظ میں ملاحظہ فرمایئے۔

"اب سیّد کے معنی ہیں مفسد، لڑاکو، جھگڑالو، مردم آزار، جھوٹا،

جعلساز، مفتری، فتنہ پرداز ۔۔۔۔" صفحہ ۱۱

ایک دوسری جگہ انہیں سیّدوں کے کارنامے اس طرح بیان کئے ہیں۔

"جھوٹ بولنا، جھوٹا حلف[1] اٹھانا، جھوٹے گواہ، جھوٹی روداد اور

جھوٹی دستاویزیں بنانا۔ حاکم کو دھوکا دینا۔ پرایا حق مار بیٹھنا۔

لوگوں کو ناحق ستانا۔ ان باتوں کو ہنر اور داخل ہوشیاری

سمجھتے تھے ۔۔۔" صفحہ ۵

کمزوروں کو ستانا۔ ان کو پٹوانا۔ آپس میں لڑنا جھگڑنا۔ بات بات میں مقدمہ بازی۔ گالی گلوچ کرنا جلالی اور رعب دار زمینداروں کے امتیازی خصوصیات ہیں۔ علامہ نذیر احمد نے اپنے زمینداروں کا خاکہ میرٹھ کے

[1] لکھنؤ اور اس کے گرد و نواح میں حلف کی تانیث مشہور ہے

ملاحظہ کرو ۔۔۔ ا ۔ ع

کیرکٹروں میں اس طرح اڑایا ہے۔

"۔۔۔۔ بڑے غصیلے اور بڑے ظالم اور بڑے سخت گیر اور بڑے جابر مشہور تھے کہتے ہیں کہ دو تین خون ان کے ہاتھ سے ہوئے مگر دب گئے انہوں نے ظلماً کئی بھلے آدمیوں کی ناموس بگاڑی اور عزت ریزی کی۔۔۔۔"

آپس میں گالی گلوچ سب وشتم اور لٹھ بازی کا نقشہ کس خوبی سے اتارا ہے۔

"جب مقتدر نے داتا سنگھ کے کارندے کو برا بھلا کہا اور اس کے مالک کو علی رؤس الاشہاد مغلظات سنائیں۔ وہ بے چارہ اپنا سا منہ لے کر لوٹ گیا اور داتا سنگھ کے آگے جا کر اپنی بگڑی زمین پر دے ماری اور کہا تم نے مجھ کو بے عزت کرایا اور خود بھی بے عزت ہوئے۔۔۔۔" صفحہ ۱۹

اب کیا تھا داتا سنگھ کو غصہ آ گیا اور کہنے لگا۔

"اس مسلمان چھوکرے کا اتنا مقدور۔ خیر اب لڑائی ہے تو لڑائی ہی سہی۔" صفحہ ۵۹

دونوں نے اپنے اپنے کاشتکاروں کو جمع کیا اور لٹھ چل گیا۔ "دوپہر کامل لٹھ چلا" جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں کے دو دو سو آدمی زخمی ہوئے۔ چار گھڑی رات جاتے سرکاری فوج توپ لے کر آ پہنچی۔ پکڑ دھکڑ شروع ہوئی ۔۔۔۔ میر متقدر کسی تدبیر سے بھاگ نکلے۔ گھر بار ضبط ہوا۔ اسباب نیلام ہوا۔ کسی نے پھانسی پائی ۔۔۔۔"

کسانوں کی سدھائی اور ایمانداری کا اعتراف علامہ کو بھی ہے چنانچہ غریبا کے کیرکٹر سے کسانوں کی دیانت پر روشنی ڈالی ہے۔

"۔۔۔۔ کیوں صاحب آپ نے دیکھا۔۔۔۔ یہ بے چارہ نہ تو پڑھا لکھا اور نہ شاید ساری عمر کسی پنڈت برہمن کی صحبت میں بیٹھا۔ اندیشہ پاسبان سے مطلق اور اس پر چوری کو سمجھتا ہے کہ برا کام ہے۔۔۔۔" صفحہ ۵۹

۔۔۔۔۔۔۔۔

اس کے علاوہ پردہ حسن اور تعدد ازدواج یہ تین ایسی خاص باتیں ہیں جن کے متعلق علامہ نذیر احمد نے اپنے خیالات کا اظہار نہایت آزادی سے عارف کے کیرکٹر میں مکالموں کے ذریعے کیا ہے اور ان سب کے سامنے برملا اس تمام خیالات کی بیخ کنی نہایت شد و مد سے کی ہے جو عوام تو عوام خواص کے قلوب میں بھی جاگزیں ہیں۔ ان تینوں باتوں سے بحث کرتے وقت آپ نے جس خاص بات پر زور دیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں نے مذہب اور رسم و رواج کو اس قدر خلط ملط کر دیا ہے کہ ایک کو دوسرے سے جدا کرنا مشکل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض مذہبی امور رسوم کی پابندیوں کے ساتھ اس درجہ الجھ گئے ہیں کہ بے چارے فقیہہ بھی ان کو سلجھانے سے قاصر رہ جاتے ہیں۔ چنانچہ پردے کے متعلق آپ کے خیالات ملاحظہ ہوں:۔

"ہندوستان کے مسلمانوں نے رسم اور مذہب دو چیزوں کو ملا کر اپنے طرز معاشرت کو آدھا تیتر اور آدھا بٹیر بنا لیا ہے۔ مثلاً پردے سے چلو۔ بلاشبہ اسلام کا حکم ہے کہ بیبیاں پردہ کریں اور اس میں شک بھی نہیں کہ ایک پردے سے ہزارہا فسادوں کا انسداد ہوتا ہے۔ مگر جس سختی کے ساتھ ہم لوگوں نے پردے کو لازم کر لیا ہے افراط ہے۔ حد شرع سے متجاوز پردہ نہیں ہے گر قید اور قید جس قدر سخت اسی قدر زیادہ۔۔۔۔"

فسانۂ مبتلا صفحہ ۱۳۹

ڈاکٹر نذیر احمد نے حسن کے متعلق جو معیار قائم کیا ہے وہ عوام کے معیار کے مطابق نہیں ہے انہوں نے حسن کے متعلق اپنے خیالات فسانۂ مبتلا کے علاوہ رویائے صادقہ، الحقوق والفرائض اور امہات الامۃ میں بھی ظاہر کئے ہیں ان کے نزدیک حسن صورت فی نفسہ کوئی چیز نہیں ہے ہاں اس بات کو ضرور مانتے ہیں کہ تعدد ازدواج کا محرک یہی حسن ہے چنانچہ امہات الامۃ میں اس بات کو اس طرح لکھتے ہیں:۔

"فی اکثر الاحوال تکثیر ازدواج کی اصلی محرک حسن پرستی ہوتی ہے۔۔۔۔"

اس کتاب میں آگے چل کر حسن کا مفہوم بیان کیا ہے، لیکن ہم یہاں فسانہ مبتلا سے وہ اقتباس دیتے ہیں جو حسن کے مفہوم کو ادا کرتا ہے اور اس بات پر روشنی ڈالتا ہے کہ حسن فی نفسہ کوئی شے نہیں ہے:۔

"اگر یہ خیالات طبعی ہوتے تو ضرور تھا کہ سب آدمیوں کے ایک ہی طرح کے ہوتے، کیونکہ آدمی آدمی انسانیت میں سب یکساں ہیں تو اس کے یہی معنی ہیں کہ طبیعت انسانی سب میں یکساں ہے اور طبیعت یکساں ہوئی تو چاہئے کہ سب کے تقاضے یکساں ہوں، مگر ہم دیکھتے ہیں کہ جو ایک کے نزدیک مطبوع

ہے۔ دوسرے کے نزدیک مکروہ ..... مثلاً بڑی خوبصورتی رنگ کی ہے کہتے بھی ہیں ایک رنگ ہزار ڈھنگ لیکن رنگ کے بارے میں مذاق اس قدر مختلف ہیں کہ گورا، سرخ و سفید، گندم گوں، سانولا، چمپئی وغیرہ کتنی قسم کے رنگ ہیں جن کے دیکھنے ہمارے ملک کے لوگ سر دھنتے ہیں لیکن فرض کرو کہ ان رنگتوں میں سے کسی رنگ کا آدمی افریقہ میں جا نکلے تو وہاں اس کی کیسی قدر ہوگی جیسی ہمارے یہاں بدذاتی اور مبروص کی ..... خاص خاص اعضا کی نسبت بھی مذاقوں کے اختلاف کا یہی حال ہے مختلف ملکوں کی تاریخیں اور جغرافیے پڑھو تو معلوم ہو کہ حسن کی نسبت لوگوں کے خیالات کس قدر مختلف ہیں۔ قومی اختلافات سے اتر کر شخصی اختلافات پر آؤ تو ہر جگہ وہی معاملہ ہے کہ "لیلیٰ را بچشم مجنوں باید دید"۔ غرض جہاں تک غور کیا جاتا ہے حسن کا مفہوم متعین نہیں ٹھہرتا پس مفہوم حسن کا انسان کا طبعی خیال سمجھنا غلط ہے۔"

تعدد ازدواج کے بارے میں عام طور پر قرآن شریف سے جو آیت استدلال میں پیش کی جاتی ہے اس کا ترجمہ یہ ہے کہ اگر تم کو یہ ڈر ہو کہ ہم یتیموں کے حق میں انصاف نہ کرسکیں گے تو عورتوں میں سے دو دو تین تین، اور چار چار جتنی تمہاری خوشی ہو نکاح کرلو، لیکن علامہ نذیر احمد چونکہ حافظ قرآن تھے اور ساتھ ہی ساتھ منطقی اور فلسفی، اس استدلال کو اس طرح رد کرتے ہیں کہ اس آیت کے آگے کا جملہ تلاوت کردیا جس کا ترجمہ یہ ہے "اگر تم کو یہ خوف ہے کہ متعدد بیبیوں میں برابری نہ کرسکو گے تو ایک ہی بی بی کرلو" اس کے ساتھ ہی ایک اور آیت کا اضافہ کیا جس کا ترجمہ یہ ہے "تم بہتیرا چاہو مگر تم سے یہ ہو ہی نہ سکے گا کہ عورتوں میں برابری کرسکو پس سارے کے سارے ایک طرف کو مت جھکو کہ اس بے چاری کو ادھر میں لٹکتا ہوا چھوڑ دو ....."

اب منطقی اصولوں سے ان دونوں کو ملانے سے نتیجہ یہ نکلا کہ محض ایک بی بی کرو۔ مولانا نذیر احمد تعدد ازدواج کے سخت مخالف ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:۔

"..... محصنات تعدد نکاح پر ایک کتاب لکھی ہے۔ اس کے نزدیک ان دونوں آیتوں کے ملانے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ بس ایک بی بی کرو۔" صفحہ ۱۳۲

اب رہا یہ سوال کہ آنحضرت پیغمبر نے ایک سے زیادہ بیویاں کیوں کیں؟ اس کے جواب میں آپ فرماتے ہیں کہ پیغمبر کے عمل سے استشہاد غلط ہے۔ کیونکہ یہ دونوں آیتیں عام مسلمانوں کے واسطے ہیں پیغمبر صاحب کے نکاح ان میں شامل نہیں۔ حضرت رسالت مآب کے لئے سورۂ احزاب میں ایک پورا رکوع موجود ہے جس کا مطلب یہ ہے:۔

"اے نبی! ہم نے آپ کے لئے ان تمام عورتوں کو حلال کردیا ہے جن کے آپ مہر ادا کریں الخ"

مزید براں ان کے لئے عدل و مساوات کی بھی ضرورت نہ تھی اسی رکوع میں موجود ہے۔ "اپنی بیویوں میں سے جس کو چاہو اپنے سے جدا رکھو اور جس کو چاہو اپنے پاس جگہ دو اور جس کو چاہو ہٹا کر پھر ملا لو تو تم پر کچھ گناہ نہیں"۔ اسی طرح پیغمبر کے لئے بغیر مہر کے بھی نکاح کرلینا جائز تھا۔ حالانکہ پیغمبر ازواج مطہرات میں اپنی طرف سے عدل فرماتے تھے۔ مگر خدا نے اُن پر اس بات کو بھی لازم نہیں کیا تھا یہ باتیں خصائص نبوی میں سے ہیں۔ مختصر یہ کہ مولانا تعدد ازدواج کے سخت مخالف تھے جس کو عارف کے کیرکٹر میں اس سے صاف صاف کہلوا دیا ہے:۔

"از برائے خدا کہیں جلدی سے فرما بھی چکے کہ تعدد نکاح کے موید ہو یا مخالف؟" "سخت مخالف" صفحہ ۱۳۹

. . . .

ناول میں پلاٹ اور موضوع کے بعد دوسری چیز کردار نگاری ہے۔ کردار نگاری مختلف طریقوں سے کی جاتی ہے بیانات سے، ملبوسات سے، مکالمات، حرکات و سکنات وغیرہ سے، ان تمام باتوں کی تشریح طوالت کے خیال سے نہیں کی جاتی۔ مولانا نے کردار نگاری میں بیانیہ تمہید کو خاص طور سے اپنایا ہے۔ محصنات میں مبتلا کا کیرکٹر بیانی تمہید سے اس طور پر شروع کیا ہے۔

"نور کا پتلا ہے۔ بڑی بڑی غلافی آنکھیں۔ اونچی اور ستی ہوئی ناک پتلے ہونٹ ....." صفحہ ۹

اسی طرح غیرت بیگم کے کیرکٹر کا بیان اس طرح شروع ہوتا ہے:۔

"ذات جماعت کچھ پوچھنی نہ تھی سگی پھوپھی کی بیٹی۔ رہی صورت، کوئی خاص چیز تو چنداں بری نہ تھی بلکہ الگ الگ دیکھو تو رنگ بھی گورا نہیں تو کھلتا ہوا چمپئی۔ آنکھ، ناک، دہانہ، ماتھا، مانگ کسی میں کوئی عیب نہ تھا ....." صفحہ ۱۷

محصنات میں کردار نگاری ملبوسات کے ذریعے بہت کم کی گئی ہے۔ حالانکہ اس کا فقدان نہیں ہے۔ میر متقی کا کیرکٹر ملبوسات کے ذریعے

بہت کچھ بیان کیا گیا ہے۔ توبۃ النصوح میں مرزا ظاہر دار بیگ کا کیرکٹر اس کی بہترین مثال ہے۔

محصنات میں کردار نگاری زیادہ تر بیانیہ اور نفسیہ کے ذریعے کی گئی ہے۔ مکالمات سے بہت کم مدد لی گئی ہے۔ البتہ غریبا اور سید ناظر کی تفصیل ان کے ذریعے کھینچا ہے۔

بعض بعض کیرکٹر اس درجہ نفسیاتی اصول پر بیان کئے گئے ہیں کہ بالکل فطری معلوم ہوتے ہیں۔ خصوصاً اس وقت میں جبکہ ناولوں میں کردار نگاری کا فقدان تھا۔ ایسے کیرکٹروں میں عارف اور مبتلا کے کیرکٹر خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ مولانا کی کردار نگاری کے متعلق ہم دنیائے افسانہ سے وہ اقتباس پیش کرتے ہیں جس سے ان کی کردار نگاری پر روشنی پڑتی ہے۔

> کردار نگاری میں بعض جگہہ اس قدر نفسیاتی طریقے سے کام لیا گیا ہے کہ انگریزی ناول نگار جارج ایلیٹ کے ناول یاد آجاتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ جارج ایلیٹ کی طرح ان کی بڑی عمر نے ان کو مختلف سوسائٹیوں کے مطالعے کا نہایت عمدہ موقع دیا تھا۔ دونوں اپنے افسانوں میں ایک خاص مذہبی اعتقاد کی طرف اشارہ کرتے ہیں ....."

ناول کی کردار نگاری میں ایک خصوصیت یہ بھی ہونا چاہیئے کہ پڑھنے والے کو یہ بات معلوم ہو جائے کہ دراصل شخص قصہ کے اوپر کس طرح کے جذبات کا اثر ہے اور ان کا کیا مطلب ہے؟ مثلاً رنج اور خوشی، غیظ و غضب شرم و حیا وغیرہ جذبات جو افراد ناول پر طاری ہوں وہ پڑھنے والے کو معلوم ہو جائیں اور یہ بات حرکات و سکنات کا بغور مطالعہ کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔ علامہ نذیر احمد کو اس قسم کی کردار نگاری میں ایک خصوصیت حاصل تھی۔ اُن کے اشخاص قصہ پر جو جذبات طاری ہوتے ہیں وہ فوراً ان کی کیفیت اور حالت سے ظاہر ہو جاتے ہیں۔

محصنات میں مبتلا کا ہریالی کے عشق میں دیوانہ ہونا کوئی ایسی بات نہیں جو کسی سے پوشیدہ ہو اور اس کا ہریالی کو ماما بنا کر گھر میں داخل کرنا اس کی انتہائی محبت اور الفت کی دلیل ہے۔

کردار نگاری میں کرداری ارتقا بھی بہت ضروری ہے۔ علامہ نذیر احمد کے ناولوں میں اس قسم کے ارتقا کا اگرچہ فقدان تو نہیں ہے مگر ہے بہت کم۔ توبۃ النصوح کے کلیم کی طرح مبتلا مرتے مرگیا مگر اس کے کیرکٹر میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی۔ ہاں ایک خاص جو بات مولانا کے ناولوں کے کرداروں میں پائی جاتی ہے۔ اور دوسرے ناول نگاروں کے ہاں کم ہے۔ وہ ہے کرداروں کا صبر و استقلال۔ نصوح آخر وقت تک کلیم کی اصلاح کے لئے سرگرداں ہے۔ محصنات میں حاظر اپنے بھائی ناظر کی اصلاح کس صبر و استقلال سے کرتا ہے۔

تیسری ضروری بات اسلوب بیان ہے اور اس میں مکالموں کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ علامہ نذیر احمد پہلے ناول نگار ہیں جنہوں نے ناولوں میں مکالموں کو داخل کیا ہے اور ان کے مکالمے نہایت کامیاب ہیں۔ وہ جہاں ایک گنوار کو گفتگو کرتے دکھائیں گے۔ تو اس کی زبان بالکل وہی پیش کریں گے جو ایک گنوار کی ہوتی ہے۔ اسی طرح عورتوں، بچوں، مولویوں، نوکروں وغیرہ سب کی زبان وہی ہوگی جو در اصل ان لوگوں کی ہوتی ہے بنات النعش میں اصغری بیگم، حسن آرا، محمودہ اور مغلانیوں وغیرہ کی بات چیت ملاحظہ فرمایئے تو صاف معلوم ہوگا کہ دہلی کی عورتیں گھروں میں بیٹھی بات چیت کر رہی ہیں۔ توبۃ النصوح میں علیم اور نصوح کا مکالمہ، اسی طرح محصنات میں غریبا اور میر متقی کا مکالمہ، بھانڈوں کی نقل اس کی نہایت عمدہ اور بے نظیر مثالیں ہیں۔

مولانا نذیر احمد کی تحریر میں سب سے زیادہ نمایاں چیز عربیت کا غلبہ ہے۔ چونکہ مولانا خود درس نظامیہ کے منتہی اور حافظ قرآن تھے اس لئے بات بات میں قرآن مجید سے حوالے دیئے چلے جاتے ہیں چونکہ ان کے ناولوں کا مقصد معاشرتی اصلاح ہے اور اصلاح بھی کس کی؟ مسلمان خاندانوں کی! اس لئے لازمی طور پر ان کو دلائل میں قرآن مجید اور احادیث سے حوالے دینے پڑے۔ سیکڑوں عربی الفاظ فقرے اور ضرب الامثال استعمال کر گئے جو اپنی اپنی جگہہ پر نہایت موزوں اور چسپاں ہیں۔ اگرچہ بادی النظر میں کھٹکتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں خصوصاً ان لوگوں کی نظروں میں جو عربی سے بالکل نابلد ہیں۔ مثال کے طور پر نفل اشراق، صلوٰۃ الخوف امام، مقتدی، بدعتی، قدوری، صوفی، فقیہ، حب الشی یعمی و یصم، عُشر .... فریقٌ فی الجنۃ و فریقٌ فی السعیر۔ مگر یہی عربی الفاظ اور فقرے بعض بعض موقعوں پر اس بری طرح کھپائے گئے ہیں کہ تمام عبارت کو خراب کر دیتے ہیں اور نہایت نامانوس معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً "ہمارے خاندان میں اباً عن جدٍ چلی آتی ہے (محصنات صفحہ ۹۸) .... الدنیا والدین ضرتان (صفحہ ۹۶) اس مضمون کو سعدی نے کیا قل و دل کے طور پر ادا کیا ہے (صفحہ ۹۸) اس کی حالت یوماً فیوماً ردی ہوتی گئی (صفحہ ۲۱۲) سید حاضر

Soliloquy . (تنہا گوئی) NARRATIONAL

نے بہ تقاضائے دینداری علی رغم انف سید ناظر اپنی بہن کو اس کا حق دلایا۔
(صفحہ ۴۷) اس کے مالک کو علی روس الاشہاد مغلظات سنائیں (ص ۵۹)"
شاید اسی قسم کے جملوں کو پڑھ کر جناب رام بابو سکسینہ نے مولانا کی تحریر کے تعلق یہ رائے قائم کی ہے:۔

"..... البتہ کبھی کبھی بڑے بڑے عربی فارسی کے غیر مانوس الفاظ لے
آتے ہیں جس سے کہیں کہیں رنگین عبارت میں بجائے چستی اور
خوبصورتی کے بھونڈا پن اور خرابی پیدا ہو جاتی ہے . . . !"

مولانا کے ہاں شوکت الفاظ اور عبارت کی شان خاص طور پر دیکھنے کے لائق ہے۔ تنہا صاحب اس کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"ان کی تحریر کا انداز خاص یعنی الفاظ کی شوکت۔ عبارت کی متانت
طرز ادا کی بلاغت ان کے قلم کی خاص اور ما بہ الامتیاز صفت تھی۔"

کہیں کہیں سادگی اور سلاست اس درجہ بڑھ گئی ہے کہ معلوم ہوتا ہے لوگ آپس میں بیٹھے کر رہے ہیں۔

"مکتب کیا تھا بہلاوا تھا اس کا جی بہلنے کے لئے چار پانچ رئیسی
لڑکے اور بٹھلائے گئے تھے یعنی بسا بسا بے چودہ برس کی عمر تک مبتلا
بھونرے کی طرح پلا۔"

بعض بعض جگہ اس درجہ ڈرامائیت پائی جاتی ہے کہ شاید ڈرامانگار خود اس سے زیادہ نہ پیدا کر سکتے اگر ان کو وہی بات لکھنا ہوتی۔ محصنات میں ناظر اور مبتلا کی لڑائی، ہریالی اور غیرت بیگم کا مکالمہ میر متقی اور غیرت بیگم کی ملاقات کے مناظر کس درجہ ڈرامائیت کے حامل ہیں۔

مولانا کے ناولوں کے متعلق یہ کہنا کہ ان میں ناصحانہ عنصر پایا جاتا ہے معمولی بات ہوگی بلکہ ان کے ناول پند و نصیحت کے مجموعے ہیں۔ محصنات میں میر متقی کے وعظ۔ عارف اور مبتلا کے مباحثے پڑھئے تو آپ کو ایسا معلوم ہوگا کہ آپ ناول نہیں پڑھ رہے ہیں بلکہ کسی مسجد میں بیٹھے ہیں اور پیش امام صاحب کا وعظ سن رہے ہیں اور اگر یہ بات صحیح ہے کہ ہر فن لطیف کو اعلیٰ رتبے پر پہنچنے کے لئے اس میں اخلاقی جزو کا پایا جانا بے حد ضروری ہے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ مولانا نذیر احمد کے ناول اس حیثیت سے ناول نگاری کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔

ان تمام چیزوں کے علاوہ ناول میں اس کا خاتمہ بھی خاص اہمیت رکھتا ہے۔ مولانا نذیر احمد کے تمام ناولوں کے خاتمے بالکل فطری طور پر ہوئے ہیں۔

اظہر علی فاروقی

لطفِ معاملہ

فطرت کا مزاج آشنا ہوں
وہ چاہیں مجھے میں اُن کو چاہوں

سرشارِ نشاطِ مدعا ہوں
منشائے طرب سمجھ چکا ہوں

صورت کا ہے اعتبار کتنا! ہے حُسن فریب کار کتنا!
شوخی کی ہے جان یہ متانت

انساں کو "پری" سمجھ رہا ہوں
ہنستے نہیں وہ، میں ہنس رہا ہوں

وارفتۂ حُسنِ خود نما ہوں
بر وقت بدل رہا ہوں اسلوب اب بھی ملاؤں ہاں میں ہاں خوب!

اب بھی نہ ہو کیف دید طاری!
کس سحر بیاں کا ہمنوا ہوں

بے پردہ یہ کس کو دیکھتا ہوں!
کیا آج میں یونہی جھومتا ہوں

یہ شکل یہ خوشنما تبسم! یہ وضع یہ دل ربا تکلم!
خود مجھ کو خجل وہ پا رہے ہیں

میں لطفِ حیات پا رہا ہوں
یوں اُن کا حجاب اُٹھا رہا ہوں

دلدادۂ حُسنِ جانفزا ہوں
باتیں بھی نہیں سنے گی کبھی وہ روٹھے ہوئے ہیں ایسے ابھی

جو راز ہے خوش نگاہیوں کا
اپنی ہی خطا سمجھ رہا ہوں

اُن سے نہیں دل سے پوچھتا ہوں
اور اُن کو ابھارتا چلا ہوں

مقصودِ حیات اور کیا ہے دل میرا یہی تو چاہتا ہے

علی منظور

تہذیب

صبح کے آٹھ بج گئے تھے لیکن میری بیوی سیلکھا اور میں ابھی تک اپنے اپنے لحافوں میں سمٹے باتیں کر رہے تھے۔ جمعدارنی ابھی تک آئی نہ تھی اور میں انتظار کر رہا تھا کہ وہ صفائی کر جائے تو میں اُٹھوں۔

علی الصبح اُٹھنے کی تو ویسے بھی مجھے عادت نہیں۔ سردیوں کے دن ہوں اور سوکھا جاڑا پڑ رہا ہو تو ہمیشہ اپنے گرم لحاف میں لیٹا سوچا کرتا ہوں کہ وہ لوگ کیسے دل کے مالک ہیں جو اس تیر کی طرح جسم میں پیوست ہو جانے والی سردی میں بلاناغہ پانچ بجے اُٹھ کر سیر کو جاتے ہیں۔ وہ سیر کرتے ہیں یا سزا کاٹتے ہیں؟ اور اُس دن تو روز کی بہ نسبت اور بھی دیر ہو گئی تھی۔ صرف جمعدارنی کا وقت پر نہ آنا ہی اس کی وجہ ہو، یہ بات نہ تھی، اس دن مہینے کا آخری اتوار تھا۔ ڈسپنسری بند تھی اور دوسرے لاہور میں ہی ہمارے ایک دور کے رشتہ دار کے بھائی کی نہایت اندوہناک حالات میں موت واقع ہو گئی تھی۔ تیسری منزل کے جنگلے پر قدرے آگے کو جھکے ہوئے وہ داتن کر رہے تھے کہ جنگلہ ٹوٹ گیا اور وہ نیچے بجری کی سخت کالی سڑک پر آ گرے۔ ہڈی ہڈی اُن کی پس گئی۔ اس سے پیشتر کہ کوئی اُن کی امداد کو جاتا روح اور جسم کا ساتھ ختم ہو چکا تھا۔

اُن کی عمر ابھی تیس برس کی بھی نہیں تھی۔ اور دو بچے وہ اپنے پیچھے چھوڑ گئے تھے۔

ہمارے یہ دور کے رشتہ دار جن کے بھائی کی موت ان افسوسناک حالات میں واقع ہوئی تھی۔ لاہور ہی میں رہتے تھے۔ رشتہ دار بھی وہ ہمارے بہت ہی دُور کے تھے۔ سیلکھا کے جو بڑے بھائی لاہور میں ملازم تھے اُن کے وہ ہم زلف تھے۔ ہمارے لئے تو اُن کے بھائی کی موت روزانہ اخبار کی ایک خبر سے زیادہ اہمیت نہ رکھتی اگر سیلکھا کے بھائی کو لے کر وہ خود ہی اس دُور کے رشتے کو ذرا اور نزدیک لانے کے لئے ایک دن اچانک خود ہی وارد نہ ہو جاتے۔ آدمی وہ اچھے ہنس مکھ ہیں۔ ایک بیمہ کمپنی میں انسپکٹر ہیں۔ تنخواہ کافی پاتے ہیں اور رینیوئل (Renewal) میں بھی کافی پیسے انہیں مل جاتے ہیں۔ کامیابی تو جیسے ان کے چہرے پر لکھی ہوئی ہے۔ پورے پورے کاروباری آدمی ہیں۔ اپنے انہی مرنے والے بھائی صاحب سے انہوں نے ایک دن کہا تھا کہ تھوڑے بہت انشورنس کے ذریعے مستقبل کا انتظام آپ کو کر دینا چاہئے اور اس مطلب کے لئے اپنی بیمہ کمپنی سے وہ خاص رعایت بھی کرا دینے کو تیار تھے۔ لیکن پرائمری سکول کی مدرّسی سے جو پندرہ روپے انہیں ملتے تھے۔ اس سے حال کا نبھانا ہی مشکل تھا۔ مستقبل کی تو بات ہی کیا کی جائے اور ادھر تو کئی مہینے سے وہ بیکار ہی چلے آتے تھے۔ بیوی کی بیماری میں لگے رہنے سے انہیں ملازمت چھوڑنی پڑی تھی اور اس کی موت کے بعد جب وہ پھر سکول پہنچے تو انہیں معلوم ہوا کہ ان سے کہیں زیادہ تعلیم یافتہ اور ڈگری یافتہ ایک نوجوان ان کی جگہ سنبھالے بیٹھا ہے۔ ناچار دو تین مہینے ادھر اُدھر ٹھوکریں کھانے کے بعد وہ اپنے انہی متمول بھائی کے پاس لاہور آگئے تھے کہ کہیں پندرہ بیس کی نوکری ہو جائے تو بے ماں کے بچوں کا پیٹ پالنے کی سبیل ہو۔ لیکن یہاں آنے پر بے ماں کے بچے اب باپ کے سائے سے بھی محروم ہو چکے تھے۔ ان بے کس غریب بچوں کا، لمبی بیماری کے بعد مرنے والی ان کی ماں کا، دیکھتے دیکھتے موت کی گود میں سو جانے والے ان کے مرحوم باپ کا اور ان غریبوں کے تاریک مستقبل کا ذکر کر کے سیلکھا کئی بار آنکھوں میں آنسو لا چکی تھی۔ بھگوان کی یہ کیسی مایا ہے جہاں بچے ہیں وہاں پالنے والا کوئی نہیں اور جہاں پالنے والے ہیں وہاں بچوں کی کمی ہے۔ میں اسے سمجھا سمجھا کر ہار گیا کہ نہ پال سکنے سے تو اچھا ہے کہ بچے ہی نہ ہوں۔ کون جانتا ہے کہ اگر کوئی بچہ ہوتا تو ہم اس کی خورد و پرداخت کرنے کے لئے زندہ بھی رہتے یا نہیں لیکن ان دلیلوں سے جب میری ہی تسلی نہ ہوتی تھی تو وہ کیسے صبر کر لیتی۔

ہم اسی طرح کی باتیں کر رہے تھے کہ جمعدارنی آگئی۔ بات چیت کے موضوع کو پلٹنے کے خیال سے میں نے جلدی سے اٹھ کر کنڈی کھولی اور اسے ڈانٹا کہ اتنی دیر سے کیوں آئی ہے اور اگر تجھے صبح صبح نہ آنا ہو تو صاف کہہ دے تاکہ ہم کوئی دوسرا انتظام کر لیں۔

جمعدارنی کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں اور اس کے ہونٹ سوکھے ہوئے تھے ہکلاتے ہوئے اس نے بتایا کہ اس کی جیٹھانی بڑی خطرناک حالت میں بستر پر پڑی ہے اور ساری رات وہ اس کے سرہانے بیٹھی جاگتی رہی ہے اور اس وقت بھی وہ صفائی نہیں بلکہ یہ درخواست کرنے آئی ہے کہ میں چل کر اسے دیکھ لوں۔ شاید اسی بہانے پر ماتما اس کے بچوں کے لئے اس کی جان بخش دے۔

میں کہنے ہی والا تھا کہ آج چھٹی کے دن میں کہیں نہیں جاتا لیکن سلیکھا نے کچھ ایسی نظروں سے میری طرف دیکھا کہ الفاظ میرے لبوں پر ہی رہ گئے۔ کہنے لگی ــــ ہوگا تو وہی جو پرماتما کو منظور ہے لیکن ذرا دیکھ آئیے چھٹی تو آج آپ کو ہی ہے اور نہ سہی ان غریبوں کو کچھ حوصلہ ہی ہو جائے گا۔ میں کنڈی کھول چکنے کے بعد پھر لحاف میں بیٹھنے والا تھا کہ اس کی بات سن کر چپ چاپ اوپر کو چل پڑا۔

برسوں سے طرح طرح کے دیوی دیوتاؤں کی منتیں ماننے کے بعد بھی ہمارا آنگن سونا ہی تھا۔ اور اسی لئے سلیکھا کی آنکھوں سے ہمیشہ کچھ اس طرح کی مایوسی جھلکتی رہتی تھی کہ مجھے اس کی کسی فرمائش کو ٹالنے کا حوصلہ نہ ہوتا تھا۔ خصوصاً جب اس کی یہ فرمائش کسی غریب بیکس سے متعلق ہوتی۔ ارادہ نہ ہونے پر بھی پندرہ منٹ میں تیار ہو کر میں جمعدارنی کے ساتھ چل پڑا۔

....

میونسپلٹی کی صفائی کی گاڑیاں بدبو پھیلاتے ہوئے ابھی گلیوں میں ہی پھر رہی تھیں اور دنیا بھر کی صفائی کرنے والی مہترانیاں میل اور عفونت کی پتلیاں بنی ان بھرپور گاڑیوں کو اور بھی بھرتی جا رہی تھیں جمعدارنی کا گھر نزدیک ہی بھنگیوں کی گلی میں تھا۔ گھر کیا صرف ایک کمرہ تھا جس کی دیواروں کی خستہ اور بوسیدہ اینٹیں لال مٹی بن بن کر روز بروز اور بھی خستہ اور بوسیدہ ہوتی جا رہی تھیں۔ اسی ایک کمرے میں جمعدارنی اس کا خاوند اور ان کے پانچ بچے برسوں سے سردی گرمی کاٹتے آ رہے تھے۔ یہی اُن کی رسوئی تھی۔ یہی سونے اور سامان رکھنے کا کمرہ۔ گلی کے باہر جمعدارنی کے خانہ مست بچے اپنی ٹھٹھرتی ہوئی ننگی ٹانگوں اور نیم برہنہ جسموں کو سکوڑے شاید اس کو پاس سے گذرتے دیکھ کر اس کی ٹانگوں سے چمٹ گئے۔ چیخ کر اپنی لڑکی کو آواز دیتے ہوئے جمعدارنی نے اُن کو الگ کیا اور لڑکی سے کہا کہ انہیں چپ کرائے اتنی دیر میں وہ آ جائے گی نہیں تو کسی پڑوسی کے گھر سے ایک باسی روٹی لا کر انہیں کھلا دے۔ اور لڑکی روتے چیختے، گرتے پھسلتے، بچوں کو بڑی مشکل سے سنبھالتی سنبھالتی چلی گئی۔

میں نے پوچھا۔ "تمہارا یہاں نہیں کیا؟"

"نہیں جی وہ تو یونیورسٹی کے کوارٹروں میں ہے۔"

یونیورسٹی کے کوارٹروں میں ــــ اتنی دور! اور میں نے ابھی داتن بھی نہ کی تھی۔ لیکن اب تو کوئی چارہ ہی نہ تھا۔ کچھ دیر تک ہم چپ چاپ چلتے رہے۔ پھر میں نے پوچھا ــــ "تو تمہاری جیٹھانی بیمار ہے نا؟"

"جی"

"لیکن تم نے تو کہا تھا کہ تمہارے جیٹھ کی بیوی عرصہ ہوا مر گئی۔"

"یہ میری دیورانی ہے۔"

"دیورانی؟" ــــ چونک کر میں نے پوچھا۔

"جی پہلے وہ میرے دیور کے گھر تھی۔ لیکن اس کے مر جانے پر جیٹھ کے گھر بیٹھ گئی۔ اس طرح دیورانی کہو یا جیٹھانی، جو ہے یہی ہے"

اور یہ کہہ کر جمعدارنی نے اپنی اس ملی جلی دیورانی جیٹھانی کی بیماری کے سلسلے میں بتایا کہ کس طرح دیوالی کے دن ہی سے وہ بیمار پڑی ہے۔ پہلے اسے معمولی بخار ہوا تھا لیکن معمولی بخار کو لے کر اگر کوئی کھاٹ پکڑے تو کام کیسے چلے۔ سات اس کے بچے تھے اور گول باغ سے لے کر بڑے ڈاک خانے تک میونسپلٹی کی سڑکوں کو منہ اندھیرے پانچ بجے اٹھ کر اسے صاف کرنا پڑتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بخار تیز ہو گیا اور جسم ٹوٹنے لگا جب کام کرنے کی سکت بالکل نہ رہی تو میونسپلٹی کی سڑکوں کو کسی اور خوش قسمت کے لئے چھوڑ کر وہ کھاٹ پر جا پڑی۔ تب اس کے خسر کو جتنے ٹونے ٹوٹکے یاد تھے اس نے آزمائے۔ ان سے فائدہ نہ ہوا تو وید و حکیم کی شرن لی گئی۔ جب اس کے نسخے بھی بے سود ثابت ہوئے تو بھوت پریت کا سایہ سمجھ کر پیر علی بخش کو بلایا گیا اور جب یوں بھی کچھ نہ بن آئی تو جو کسی نے

کھلا لاکر دیا۔ اس ساری تیمار داری کے باوجود جب مریضہ کی حالت بد سے بدتر ہوتی گئی تو آخر اسے ہسپتال پہنچایا گیا۔ تب معلوم ہوا کہ اسے نمونیہ ہو گیا ہے۔ تین دن تک وہ ہسپتال میں رہی۔ اس اثنا میں چھوٹا بچہ گھر میں بیمار ہو کر دوا دارو کے بغیر مر گیا۔ ہسپتال میں جیٹھانی کی حالت سدھر رہی تھی لیکن بچے کی موت کی خبر سن کر پھر بگڑ گئی۔ کل نازک حالت میں اسے ہسپتال سے لایا گیا۔ گھر میں دوسری عورت تھی نہیں۔ اس لئے جب جمعدارنی کو پتہ چلا تو ساری رات وہ اس کے سرہانے جاگتی بیٹھی رہی۔

. . . .

اُن بازاروں میں سے گذر کر جہاں صبح صبح جانے والوں کا خیر مقدم دُکاندار اپنی دُکانوں کی گرد سے کرتے ہیں اور ان سڑکوں کو پار کر کے جہاں تانگوں موٹروں اور بسوں کی چرّ پوں صبح ہی سے کانوں کے پردے پھاڑنے لگتی ہے جب ہم یونیورسٹی کے نزدیک پہنچے تو میں سوچنے لگا کہ کہیں انہیں تسلّی دوں گا لیکن مجھے اتنی تکلیف نہیں کرنی پڑی۔ بھنگیوں کے احاطے کے باہر ہی سے بَین کی آواز نے بتا دیا کہ مریضہ دواؤں اور ڈاکٹروں سے اتنا تنگ آ چکی تھی کہ اب ایک اور ڈاکٹر کا انتظار کرنا اس نے مناسب نہیں سمجھا۔

اندر پہنچتے ہی جمعدارنی تو یہ بھول گئی کہ وہ ایک شریف ڈاکٹر کو اس کے گرم بستر سے اٹھا کر لائی ہے اور مجھے وہیں کھڑا چھوڑ مریضہ کے سرہانے بیٹھی ہوئی عورتوں میں شامل ہو گئی اور پھر اس کے بَین بھی پڑوسنوں کے نالہ و بکا میں مل گئے۔ میں مبہوت و ساکن وہیں کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ فہم و فراست کی طاقتیں جیسے جواب دیتی ہوئی معلوم ہوئیں۔ اب یہیں سے واپس چلا جاؤں، یا اتنی دور آیا ہوں تو تعزیت کے دو بول کہتا چلوں میں کچھ بھی فیصلہ نہ کر سکا۔ اتنے میں جمعدار کی نگاہ مجھ پر پڑی۔

"آپ بھی آ گئے ڈاکٹر صاحب" اور غم کی تاریکی اس کے چہرے پہ جیسے اور بھی گہری ہو گئی۔

میں نے کہا "ابھی جمعدارنی نے مجھے بتایا لیکن تم لوگوں نے مجھے پہلے خبر کیوں نہ کی؟"

یہ سن کر جمعدار کا دبا ہوا غصّہ جیسے اُبھر پڑا۔ نسیں تن گئیں اور سیاہ چہرہ غم و غصّہ کی وجہ سے اور بھی سیاہ ہو گیا۔ وہ کوئی نہایت تلخ بات کہنا چاہتا تھا لیکن کہا اس نے صرف اتنا ہی ـــ "وہ . . . . . وہ تو مجھے اپنا دشمن سمجھتا ہے"۔

اس کا اشارہ اپنے بھائی کی طرف تھا جو اپنے چھ روتے بلکتے بچوں کے ساتھ گم سُم بیٹھا تھا۔ پھر کچھ شانت ہو کر اس نے اتنا اور کہا ـــ ہم تو بے شرم ہو کر چلے آئے بابو جی۔ موقع ہی ایسا تھا۔ نہیں وہ تو اتنا ضدّی ہے کہ . . . . . فقرہ اس سے ختم نہیں ہو سکا۔ غصّہ اور رنج سے بھر آنے والی آنکھوں کو پونچھتے ہوئے اُس نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

. . . .

میرا وہ چھٹی کا دن کچھ اُداس اُداس ہی بیتا۔ گھر آیا تو سلیکھا کو سب باتیں سنانی پڑیں اور بھرے پورے گھر کو یوں بے بسی سے چھوڑ کر چلی جانے والی کے دلی جذبات اور بے ماں کے اُن چھ بچوں کی زبوں حالی کا خیال کر کے وہ کئی بار آنکھوں میں آنسو بھر بھر لائی۔ تب میں نے اُسے اِدھر اُدھر کی باتوں سے بہلانے کی کوشش کی۔ سینما کے متینی شو میں بھی میں اسے لے گیا۔ لیکن اس دن وہ کھلی نہیں ملول ہی سی رہی اور شام کو جب میں سمجھ رہا تھا کہ صبح کے اندوہناک واقعات کو وہ بھلا چکی ہوگی تو اپنے بھائی کے ہم زلف کی بات لے بیٹھی اور مجھ سے اصرار کرنے لگی کہ اس غریب کے بھائی کے چوتھے میں میں ضرور شرکت کروں۔

چوتھے کے دن میں معمول سے بہت پہلے اُٹھا۔ مجھے الارم لگانا پڑا تھا اور یہ جان کر مجھے تسلی ہوئی کہ میں ٹھیک وقت پر ان کے یہاں پہنچ گیا۔ شمشان سے پھول چُن کر وہ واپس آ گئے تھے۔ اور لوگ ابھی تعزیت کی غرض سے بیٹھے ہی تھے۔ تب اُن سے مل کر میں نے محسوس کیا کہ بھائی کی موت کا دُکھ کتنا گہرا ہوتا ہے۔ ان کے ہنس مکھ چہرے پر مُردنی چھائی ہوئی تھی۔ داڑھی بڑھ گئی تھی اور بال پریشانی کے عالم میں بکھرے ہوئے تھے۔ جوان بھائی تو دایاں بازو ہوتا ہے جس کا بھائی مر جائے اس کا تو گویا ایک بازو ہی کٹ جاتا ہے اور پھر ان کا تو صرف بھائی ہی نہ مرا تھا بلکہ دو بچے بھی اپنے پیچھے چھوڑ گیا تھا اور اثاثہ کے نام سے ایک پیسہ بھی نہیں۔ جب سب لوگ تعزیت کر کے چلے گئے تو میں نے اپنی اور سلیکھا کی طرف سے ان کے بھائی کی اس بے وقت موت پر اظہارِ افسوس کیا۔ پھر دوسری باتیں چل پڑیں۔ ایں پر

اُنہوں نے کہا ۔ "دیکھئے اسی دن کے لئے آدمی بیمہ کراتا ہے ۔ میری آمدنی کا تو جو حال ہے کسی سے پوشیدہ نہیں ۔ لیکن پھر بھی چار ہزار کا بیمہ میں نے کرا چھوڑا ہے ۔ ان سے میں نے بارہا کہا کہ بھائی صاحب اور نہیں تو کم از کم ایک ہزار کا بیمہ تو کرا ہی چھوڑ دو لیکن ان کے کان پر جوں تک نہیں رینگی اور اب دو بچوں کو چھوڑ کر مر گئے ۔ زندگی کا کیا بھروسہ ہے ۔ خیر اب تو میں ہوں ، کسی نہ کسی طرح سنبھال ہی لوں گا لیکن اب اگر میں بھی نہ رہوں تو کیا ہو ؟"

اس کے بعد انہوں نے بتایا کہ کس طرح اُن کی بیوی ہمیشہ بیمار رہتی ہے ۔ اور اس سے اپنے بچے ہی سنبھالے نہیں جاتے ۔ کہنے لگے ۔ "مجھے فکر ہے تو اسی بات کی ، ورنہ ڈپوں کی میں کیا پروا کرتا ہوں !"

میں نے کہا ۔ "آپ ٹھیک کہتے ہیں ۔ لیکن آپ انہیں ان کے ننہال کیوں نہیں بھیج دیتے ؟"

وہ بولے ۔ "اول تو وہاں کوئی ہے ہی نہیں ۔ ہو بھی تو اپنے بھائی کے بچوں کو میں یوں در در کی ٹھوکریں کھانے کے لئے کیسے چھوڑ سکتا ہوں ؟"

میری آنکھیں بھر آئیں ۔ انہیں تسلی دیتے ہوئے میں نے کہا "آپ جیسا بھائی ملنا اس خود غرض دنیا میں ناممکن ہے ۔ پرماتما مالک ہے ۔ وہ آپ کو اس مصیبت کا مقابلہ کرنے کی طاقت دے ۔"

اس کے بعد میں نے ان سے رخصت لی ۔ اُس دن پہلی بار مجھے اس خیال سے تسلی ہوئی کہ اچھا ہے کہ میری کوئی اولاد نہیں جو میرے اچانک مرجانے سے دوسروں پر بوجھ بننے کے لئے رہ جائے اور اس بات سے بھی مجھے اک گونہ مسرت ہوئی کہ اگر ایسا ہو بھی تو بیمہ کی ایک رقم سلیکھا کے نام کمپنی کے دفتر میں چپ چاپ بڑھ رہی ہے ۔ چلتے چلتے میں نے ان سے کہہ بھی دیا کہ آج زندگی میں پہلی بار مجھے اپنے بیمہ کرانے پر دلی مسرت ہوئی ہے ۔

. . . .

اس کے بعد کئی دن گذر گئے اور وہ ہمارے دور کے رشتے دار پھر کبھی دکھائی نہیں دیئے ۔ شائد رشتہ داری کے جس جوش سے متاثر ہو کر وہ سلیکھا کے بھائی کو لے کر آ دھمکے تھے وہ یہ جان کر عنقا ہو گیا کہ ایک مشہور بیمہ کمپنی میں میں نے کافی رقم کا بیمہ کرا رکھا ہے ۔ سلیکھا سے بھی میں نے ہنس کر یہی بات کہی تو وہ بگڑ گئی ۔ کہنے لگی ۔ "کوئی [illegible]

معروف آدمی ہیں کہیں پھنس گئے ہوں گے اور اب تو اپنے بھائی کی گرہستی کا بھی بار آپڑا ہے ۔ آپ کو چاہئے کہ کسی دن جا کر ان کی خیر خبر ہی پوچھ آئیں ۔"

کچھ خفیف سا ہو کر میں نے کہا ۔ "خیال تو آیا کہ کسی دن ہو آؤں لیکن وقت ہی نہیں ملتا ۔"

اور اسی حیص بیص میں ایک مہینہ اور گذر گیا اور میں ان کے یہاں نہ جا سکا ۔ ایک دن ڈسپنسری میں اپنا کام ختم کر کے میں اُٹھنے ہی والا تھا کہ مرکزی یتیم خانے کے انچارج لالہ سندر لال آپہنچے اور اصرار کرنے لگے کہ میں ان کے ساتھ یتیم خانے میں آدھے گھنٹے کے لئے ہو آؤں چلوں ۔ میں بہت تھکا ہوا تھا اور گھر جانے کی بھی مجھے جلدی تھی لیکن سلیکھا کا یہ اصرار تھا کہ جہاں کہیں بے بس اور یتیم کا سوال آئے میں لیت و لعل نہ کروں ۔ اس لئے میں ان کے ساتھ چل پڑا ۔ وہاں دو بچوں کو میرے سامنے لایا گیا ۔ ایک سات آٹھ برس کی ننھی لڑکی تھی اور دوسرا تین ایک برس کا مریض دُبلا پتلا لڑکا ۔

"بھائی بہن ہیں" ۔ سندر لال جی نے کہا ۔

میں نے ان کا معائنہ کر کے ان کے لئے نسخہ لکھ دیا اور ان کی کمزوری کے پیش نظر یہ بھی صلاح دی کہ دو چار انجکشن دونوں کو دے دیئے جائیں اور اگر ہو سکے تو کوئی طاقت کی دوا بھی کھلائی جائے ۔

جب بچے چلے گئے تو میں نے پوچھا ۔ "یہ شائد نئے آئے ہیں ۔ پہلے تو اِن کو کبھی نہیں دیکھا ۔ کہاں سے آئے ہیں یہ ؟"

سندر لال جی نے بتایا کہ لاہور ہی کے ہیں اور ان کا باپ حال ہی میں ایک سہ منزلے مکان سے گر کر مر گیا ہے ۔

چونک کر میں نے پوچھا ۔ "تو اِن کا اور کوئی نہیں ؟"

انہوں نے بتایا کہ نہیں چچا ہیں لیکن ان بے چارے کی بیوی بیمار رہتی ہیں ۔ اپنے ہی بچوں کو نہیں سنبھال سکتیں ۔ اس لئے وہ انہیں یہاں چھوڑ گئے ہیں ۔ کچھ رقم ماہ بماہ دینے کا انہوں نے وعدہ کیا ہے اور یہ بھی یقین دلایا ہے کہ لڑکی کی شادی پر بھی کچھ نہ کچھ ضرور دیں گے ،

. . . .

اُسی شام کو جب میں گھر آیا تو سلیکھا نے کہا ۔ "سنا جی آپ نے ہماری جمعدارنی بیٹھ کے سب بچوں کو اپنے گھر لے آئی ہے"چونک کر میں نے کہا "لیکن اس کے تو اپنے ہی پانچ بچے ہیں اور کہ بھی اُن کے پاس ایک ہی ہے" "یہ تو ٹھیک ہے" سلیکھا بولی "لیکن جمعدار کہتا ہے کہ اپنے بھائی کے بچوں کو [illegible] کھانے کے لئے نہیں چھوڑ سکتا ۔ [illegible]

تنگ دلی

ہر شعورِ نَو میں ہے کیفیتِ موجِ شراب
ہر تخیّل ہے کسی تازہ سحر کا آفتاب

پی چکا ہے کس قدر چھلکے ہوئے گلگوں ایاغ
میرا میخانہ طرازو رندو صہبا گرد ماغ

خامشی سے اک سرودِ راز سُن لیتا ہوں میں
دامنِ گردوں سے شب کو پھول چُن لیتا ہوں میں

نغمہ موجِ ہوا ہوتا ہے جب پیکرِ طلب
بخشنا پڑتا ہے لفظوں کو ہوا کا نطق و لب

کتنی راتوں کی حلاوت کتنے کاموں کا فسوں
کتنی موجوں کی لچک کتنی بہاروں کا جنُوں

کتنی زلفوں کی مہک کتنی نگاہوں کا اثر
صرف ہو جا کر تو بنتا ہے کہیں اک شعرِ تر

شعر کے ایوان لافانی میں تھرّائی ہوئی
ہے صدا صدیوں کے ڈوبے حُسن کی آئی ہوئی

اک شبِ مہتاب کی خاموش موسیقی کا سحر
پُر جنوں، عشق آفریں، مدہوش موسیقی کا سحر

اک طلوعِ روح پرور کی ادائے جاں رُبا
اک غروبِ حیرت آرا کا فسونِ سحر زا

اک بہارِ خندہ زن کی انجمن آرائیاں
اک خزاں کی نیند میں ڈوبی ہوئی تنہائیاں

گلشنِ دنیا کے خدوخال ہیں بکھرے ہوئے
پھول کے پتے ہیں میرے ذہن میں بکھرے ہوئے

جنتیں کتنی ہیں آسودہ نظر کے گام میں
نغمے خوابیدہ ہیں تارِ بربطِ الہام میں

حُسنِ بے پایاں کے بُت خانے بنا دیتا ہوں میں
دیکھتا ہوں جو زمانے کو دکھا دیتا ہوں میں

تیرے قبضے میں بس اک جنت ہے وہ بھی بے سراغ
کتنے بے مصرف ہیں یارب تیرے صہبا و ایاغ

سو حجابوں میں چھپا رکھا ہے تُو نے خُلد کو
اک فسانہ سا بنا رکھا ہے تو نے خلد کو

کیا کشادہ قلب ہوں گو بے نوا انسان ہوں
تُو خدا ہو کر ہے کتنا تنگ دل، حیران ہوں

عدم

شمالی ہندوستان میں عہد مغلیہ کی چند ٹکسالیں

سلاطین مغلیہ کے سکوں پر بہت سی ٹکسالوں کے نام پائے جاتے ہیں جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مغلوں کے عروج کے ساتھ ٹکسالوں کی تعداد بھی بہت زیادہ ہو گئی تھی۔ ظہیر الدین بابر کے عہد میں ہندوستان میں مغلوں کی صرف سات ٹکسالیں تھیں۔ ہمایوں کے زمانے میں ڈو ٹکسالوں کا اضافہ ہوا اور یہ تعداد نو تک پہنچی۔ جلال الدین محمد اکبر نے بہتّر ٹکسالیں قائم کیں جس کا سبب غالباً اس کی نئی نئی فتوحات تھیں لیکن یہ بھی کوئی ضروری بات نہ تھی کہ فتوحات کی تعداد کے ساتھ ٹکسالوں کی بھی تعداد بڑھے۔ کیونکہ اورنگزیب کی سلطنت بہ اعتبار وسعت کے اکبر سے کہیں زیادہ تھی لیکن اس کے عہد میں صرف اڑسٹھ ٹکسالیں رہ گئی تھیں۔

کسی مقام پر ٹکسال کا قیام چند امور پر منحصر تھا۔ اولاً اس مقام کی معدنی حالت، یا یوں کہئے اگر اس مقام کے قرب و جوار میں کسی دھات کی کان تھی یا کسی دھات کی فراہمی میں آسانیاں تھیں تو اس دھات کے سکے بنانے میں بھی آسانیاں اور کفائتیں تھیں۔ دوئم اس مقام کی جغرافیائی حالت، آپ دیکھیں گے کہ اکثر اوقات دو قریب کے شہروں میں ٹکسالیں قائم تھیں لیکن ان شہروں کے جغرافیائی حالات ایک دوسرے سے مختلف تھے اس لئے اگر ایک مقام سے کسی دوسرے صوبے میں سکہ لے جانے میں آسانی ہوتی تھی تو اس کا لحاظ کیا جاتا تھا۔

شمالی ہندوستان میں اکبر کی مشہور ٹکسالیں آگرہ، الہ آباد، جونپور، فتح پور اور لکھنؤ میں تھیں۔

ہم سب سے پہلے آگرہ کی ٹکسال پر بحث کریں گے۔ اس ٹکسال نے مختلف قسم کے بہت سے خوبصورت سکے نکالے ہیں۔

آگرہ سب سے پہلے بابر نے آگرے میں ٹکسال قائم کی۔ بابر اور ہمایوں کے عہد حکومت میں یہاں صرف چاندی اور تانبے کے سکے تیار ہوئے چاندی کے سکے کا نام "درہم" تھا یہ دوسرے مشرقی ممالک کے "درہم" کی طرح پتلا ہوتا تھا۔ تانبے کے سکے بہلولی وزن ۱۴۵ گرین پر بنائے گئے تھے۔ ان پر بادشاہوں کے نام نہیں ہیں۔ بلکہ آگرے کی جگہ پر "دارالخلافت آگرہ" "دارالعدالت آگرہ" اور "دارالعمال آگرہ" لکھا ہوا ہے۔ اکبر کے زمانے میں اس ٹکسال سے سونے کے سکے بھی بننا شروع ہوئے اس کی مہر کا وزن ۱۶۸ گرین ہے اور روپیہ یا درہم کا ۱۷۸ گرین ۹۸۱ھ میں اکبر نے ایک خاص قسم کی مہر جو محرابی شکل کی ہے جاری کی۔ اسی کی ایک اور مہر آگرہ ٹکسال سے اکبر کے انچاسویں سن الٰہی میں جاری ہوئی اس کا ایک نمونہ ہمارے لکھنؤ کے عجائب خانے میں اب بھی موجود ہے لندن کے عجائب خانے میں ایک بہت ہی نایاب مہر ۵۰ سنہ الٰہی کی موجود ہے۔ اس پر ایک طرف بطخ بنی ہے اور دوسری طرف حسب ذیل عبارت ہے۔

اللہ اکبر
۵۰ خورداد الٰہی
ضرب آگرہ

ایک اور چاندی کا سکہ ہے جو بہت نایاب ہے لیکن خوش قسمتی سے لکھنؤ میوزیم کے لئے حاصل کر لیا گیا ہے۔ اس پر لفظ روپیہ لکھا ہوا ہے۔ واضح رہے کہ اس سے قبل ہندوستان میں کسی سکے پر روپے کا لفظ نہیں دیکھا گیا۔ اکبر کے تانبے کے سکوں کے نام فلوس، ٹنکا، نیم ٹنکا، چو ٹانکی، دو ٹانکی اور ایک ٹانکی ہیں۔ جہانگیر کے عہد میں آگرے کی ٹکسال اور نکھری اور اس نے نہایت حسین اور خوشنما سکے ڈھالے۔ سکوں کی تول میں بھی کچھ اضافہ کیا گیا۔ چنانچہ ایک اشرفی جس کا وزن ۲۴۲ء۸ گرین تھا ۱۰۲۹ھ میں رائج ہوئی تھی۔ یہ اشرفی اس وقت بھی برطانیہ عظمیٰ کے عجائب خانے میں موجود ہے۔ اس پر حسب ذیل عبارت کندہ ہے۔

از شاہ جہانگیر بود دورِ زماں
در آگرہ زنام اوست زر نور فشاں
تا ہست نشان زر پنج نوبت بجہاں
این سکہ پنج مہر پس باد رواں

سنہ [illegible]ھ میں جہانگیر نے راسی مہریں تیار کرائیں۔ یہ اس کی بالکل نئی ایجاد تھی۔ اس سے قبل کبھی بھی دنیا کی کسی قلمرو میں راسی سکہ رائج نہیں ہوا۔ یہ جہانگیر ہی کو سوجھی۔ معلوم نہیں اس میں کیا مصلحت تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت ہندو نجومیوں کا اثر بادشاہ اور دربار پر بہت تھا۔ بہر نوع راسی مہریں ایک بالکل نئی ایجاد تھیں، ان مہروں پر ایک طرف بادشاہ اور ٹکسال کا نام ہے اور دوسری طرف اس خاص راسی کی شکل ہے جس راس کے مہینے میں وہ سکہ جاری کیا گیا تھا۔ مثال کے لئے ماہ فروردین کے سکوں پر میش کی بہت خوبصورت شکل ہے۔

جہانگیر کے سکوں پر جو آگرے کی ٹکسال کے بنے ہوئے ہیں۔ حسب ذیل کتبے ہیں۔

(۱) سکہ زد در شہر آگرہ خسروِ گیتی پناہ
شاہ نورالدین جہانگیر ابن اکبر بادشاہ
(۲) زد بہ آگرہ سکہ شاہی بزر در مہر و ماہ
شاہ نورالدین جہانگیر ابن اکبر بادشاہ
(۳) در مہ آبان بآگرہ سکہ زد ظل اللہ
شاہ نورالدین جہانگیر ابن اکبر بادشاہ
(۴) در مہ بہمن بہ آگرہ سکہ زد ظلِ الہ
شاہ نورالدین جہانگیر ابن اکبر بادشاہ
(۵) در اسفندار این سکہ را در آگرہ زد بر زر
شہنشاہ زماں شاہ جہانگیر ابن شاہ اکبر
(۶) بفروردین زر آگرہ فروزاں گشت چوں اختر
زنور سکہ شاہ جہانگیر ابن شاہ اکبر
(۷) یافت در آگرہ روئے زر زیور
از جہانگیر شاہ شاہ اکبر
(۸) سکہ آگرہ داد زینتِ زر
از جہانگیر شاہ شاہ اکبر

ان کے علاوہ ایک سکہ جس پر نور جہاں بیگم کا بھی نام موجود ہے آگرے کی ٹکسال سے جاری ہوا تھا اس پر یہ بیت تھی۔

بحکم شاہ جہانگیر یافت صد زیور
زنام نور جہاں بادشاہ بیگم زر

سنہ ۱۰۳۸ھ مطابق ۱۶۲۹ء میں شاہ جہاں نے آگرے کا نام بدل کر اکبرآباد[1] رکھ دیا اور اس شہر کو دارالخلافت اکبرآباد کے نام سے نامزدگی حاصل ہونا شروع ہوئی۔

اورنگ زیب کے عہد حکومت میں بھی اکبرآباد کی ٹکسال سے سکے نکلتے رہے۔ اور جلوس کے انیسویں سال اکبرآباد کو "مستقر الخلافت" کا بھی خطاب عطا ہوا۔ اورنگ زیب کے سکوں پر حسب ذیل بیت ملتی ہے۔

سکہ زد در جہاں چو مہرِ منیر
شاہ اورنگ زیب عالمگیر

یہ تو سونے کے سکوں پر ہے اور چاندی کے سکوں پر "مہر" کے بجائے "بدر" کا لفظ ہے۔ سلاطین عظمیٰ کے بعد شاہ عالم بہادر شاہ کا زمانہ آیا جس نے اکبرآباد کا نام پھر بدلا اور آگرہ آگرہ کہلانے لگا۔ جہاندار شاہ اور فرخ سیر نے کوئی تبدیلی نہیں کی جس کی وجہ یہ تھی کہ ان کا دورِ حکومت اس قدر مختصر تھا کہ اس میں تبدیلی کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا تھا۔ سلطنت ایک وبالِ جان تھی اور آخر کار جان لے کر رہی۔ کہتے ہیں کہ فرخ سیر نے جلوس کے پانچویں سال آگرے کو مستقر الخلافت کہنا پھر شروع کیا اور پھر شاہ عالم دوئم تک اس نام میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ لیکن اس کی کوئی تحقیق ہنوز نہیں ہوئی ہے نہ کوئی شاہی فرمان ایسا دستیاب ہوا ہے جس سے نام کی تبدیلی ثابت ہو سکے۔ بہر کیف یہ ثابت ہے کہ آگرہ کبھی اکبرآباد کبھی مستقر الخلافت کے خطاب یا نام سے موسوم ہوتا رہا۔

الہ آباد آگرے کے بعد شمالی ہندوستان میں الہ آباد مغلوں کی قدیم ٹکسال ہے۔ سنہ ۹۸۲ھ مطابق ۱۵۷۴ء میں شہنشاہ اکبر نے دریائے گنگا اور جمنا کے سنگم پر ایک قلعے کی بنیاد رکھی۔ اس قلعے کے گرد و پیش ایک شہر آباد ہونا شروع ہو گیا۔ معاصر مورخ بدایونی تیئیس ماہ صفر سنگ بنیاد نصب کئے جانے کی تاریخ لکھتا ہے۔ اس زمانے میں شہنشاہ کا قیام الہ آباد میں تھا۔ اس وقت میں یہ بستی الہ آباد کہلانے لگی۔ لیکن پرانا نام

[1] بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اکبر نے آگرے کا نام اکبرآباد رکھا تھا یہ غلط ہے۔

آلہ آباس ۱۵۹۷ء تک قائم رہا۔ اس کا ثبوت لاہور کے عجائب خانے میں ایک چھوٹا تانبے کا سکہ نمبر ۶۱۲ ہے جس پر ۴۲ الٰہی مطابق ۱۰۰۵ھ مطابق ۱۵۹۷ء تحریر ہے اور پرانا نام "الٰہ آباس" بھی کندہ ہے۔ قلعے کی تعمیر کے بعد ٹکسال بھی قائم ہوئی اور اس سے چاندی اور تانبے کے سکے نکلنے لگے۔ الٰہ آباد کے سکوں پر حسب ذیل بیت کندہ تھی۔

همیشه هم چو زر مهر و ماه رائج باد
بغرب و شرق جهاں سکہ الٰہ آباد

تذکروں سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ جب اکبر سیر و تفریح کی غرض سے الٰہ آباد آیا تھا تو اس کو اس مقدس مقام کو ہندوستان کا دارالحکومت بنانے کا خیال پیدا ہوا تھا۔ اس خیال نے عملی صورت اختیار نہیں کی لیکن اس میں شک نہیں کہ الٰہ آباد اس وقت سے عزت کی نظروں سے دیکھا جانے لگا۔

نامور باپ کی طرح جہانگیر کی بھی نظر التفات الٰہ آباد پر رہی۔ اور اس کے عہد میں بھی الٰہ آباد سے چاندی کے سکے نکلتے رہے چنانچہ ایک خوبصورت چاندی کا سکہ لکھنؤ میوزیم میں اس وقت بھی موجود ہے جس پر حسب ذیل بیت کندہ ہے ؎

همیشه نور زر سکۂ الٰہ آباد
زنام شاہِ جہانگیر شاہ اکبر آباد

جہانگیر کے "سلیمی" سکے جو شہنشاہ اکبر کی حیات میں چلے تھے وہ الٰہ آباد کی ٹکسال کے نکلے ہوئے تھے۔

لکھنؤ | لکھنؤ کی قدیم تاریخ بتلاتی ہے کہ سلاطین شرقیہ کے عہد میں وہ جونپور کے زیر نگیں تھا۔ ۱۴۷۸ء میں بہلول لودھی کا اس پر تسلط ہوا۔ پھر ۱۵۲۶ء میں جنگ پانی پت کے بعد یہ بابر کے قبضے میں آیا۔ اس وقت سے بابر نے چاندی کا "درہم" لکھنؤ کی ٹکسال سے جاری کیا اس اعتبار سے لکھنؤ الٰہ آباد پر فوقیت رکھتا ہے لیکن لکھنؤ کی ٹکسال کو تاریخ ہندوستان میں وہ اہمیت کبھی بھی نصیب نہیں ہوئی جو الٰہ آباد کو حاصل تھی۔ بابر کے سکے نایاب ہیں۔ مشہور ہے کہ ماسکو میں ایک سادھو کے پاس لکھنؤ کا ایک بابری سکہ ہے جس پر حسب ذیل عبارت کندہ ہے۔

لا الٰہ الا اللہ
محمد
رسول اللہ

پھر ایک منقش مربع شکل میں۔

ابوبکر الصدیق
عمر الفاروق

دوسری طرف ایک خوبصورت محراب کے اندر

۹۳۶
ظہیر الدین محمد بابر
بادشاہ غازی

اور محراب کے اوپر

[السلطا] ن الاعظم خاقان [المکرم]
[خلد] اللہ تعا [لیٰ] ملکہٗ لکھنؤ
وسلطنتہٗ ضرب

اس کے بعد شیر شاہ نے تانبے کے سکوں کی ایک ٹکسال قائم کی ان سکوں پر یہ عبارت تحریر تھی۔

ایک طرف	دوسری طرف
فی عہد	ابوالمظفر
الامیر الحاکم	شاہ سلطان
فی الدنیا والدین	شیر
	ضرب خلد اللہ
	لکھنؤ ملکہٗ

یہ ٹکسال اکبر کے عہد حکومت کے سنتیسویں (۳۷) سال تک قائم رہی اور اس میں چاندی کے سکے بھی ڈھلتے رہے۔ لکھنؤ میوزیم میں عہد اکبری کا ایک چاندی کا سکہ اس وقت بھی موجود ہے۔ اکبر کے تانبے کے سکے جو لکھنؤ کی ٹکسال سے ۹۶۳ھ میں بنے تھے ان پر "لکھنؤ خطہ" لکھا ہوا ہے اور ۹۶۷ھ کے سکوں پر "لکھنؤ سرکار" اور ۹۷۵ھ لغایت ۹۸۷ھ کے سکوں پر "دارالخلافت" کندہ ہے۔ جہانگیر کے عہد کا کوئی سکہ لکھنؤ کی ٹکسال کا دیکھنے میں نہیں آیا۔ لیکن ٹکسال کے وجود کا پتہ ضرور چلتا ہے شاہ جہاں کے عہد کی ایک مہر لاہور میوزیم میں محفوظ ہے۔ جو لکھنؤ کی ٹکسال کی ڈھلی ہوئی ہے۔ اس کے بعد سے اورنگ زیب۔ بہادر شاہ۔ جہاندار شاہ فرخ سیر رفیع الدرجات محمد شاہ تک کے زمانے کے سکے لکھنؤ کی ٹکسال کے دستیاب ہوتے ہیں۔

فتحپور سیکری | فتحپور کی بنیاد قصبہ سیکری میں اکبر نے ڈالی تھی اور کچھ عرصے تک فتحپور دارالسلطنت بھی رہا تھا۔ ۹۸۲ھ کا ایک تانبے کا سکہ ملتا

ہے جس پر فتحپور کو دارالسلطنت تحریر کیا گیا ہے۔ اکبر کا چوکور روپیہ جو "چار یاری" روپیہ بھی کہلاتا ہے۔ فتحپور ہی سے نکلا تھا۔ جہانگیر کے سونے اور چاندی کے راسی سکے بھی فتحپور کی ٹکسال میں ڈھلے تھے۔ ان میں سے ایک کا ذکر رائل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے جرنل ۱۸۸۲ء میں آیا ہے۔ اس سکے پر حسب ذیل بیت کندہ تھی۔

بفتحپور فروزندہ گشت سکۂ زر
ز نور نام جہانگیر شہ شہ اکبر

فرخ آباد: یہ ٹکسال عہد فرخ سیر میں ۱۱۳۰ھ میں قائم ہوئی اور اسی سبب سے یہ قصبہ فرخ آباد کہلایا۔ محمد شاہ کے زمانے میں فرخ آباد صوبہ اودھ کے زیر نگیں ہوا لیکن کچھ زمانہ بعد احمد شاہ نے پھر اس پر تسلط کر لیا۔ اس وقت سے فرخ آباد کو احمد نگر بھی کہنے لگے لیکن یہ نام زیادہ مقبول نہیں ہوا تاہم عالمگیر دوئم کے زمانے کے سکوں پر احمد نگر فرخ آباد ہی تحریر ہے۔

جب ۱۲۱۷ھ میں انگریزوں نے فرخ آباد پر قبضہ کیا تو اس وقت وہاں کی ٹکسال بند ہو چکی تھی۔

مقامات مندرجہ بالا کے علاوہ شمالی ہندوستان میں بہت سے مقامات ہیں جن میں عہد مغلیہ کے کسی نہ کسی دور میں ٹکسال قائم ہوئی تھی اس کی ایک مختصر فہرست جو تحقیقات کے بعد مرتب کی گئی ہے حسب ذیل ہے۔

(۱) اکبرپور ٹانڈہ (ضلع فیض آباد)
(۲) آنولہ ضلع بریلی
(۳) بریلی آصف آباد "
(۴) بسولی
(۵) اودھ (خطہ اختر نگر صوبہ)
(۶) اٹاوہ
(۷) اسلام آباد متھرا
(۸) بلونت نگر جھانسی
(۹) بنارس محمد آباد
(۱۰) بندرابن مومن آباد
(۱۱) بہرائچ
(۱۲) سری نگر گڑھوال
(۱۳) سہارن پور
(۱۴) ظفرآباد
(۱۵) قنوج (شاہ گڑھ و شیر گڑھ دارالخلافت شاہ گڑھ)
(۱۶) کالپی
(۱۷) کورا
(۱۸) کوبخ
(۱۹) گورکھپور (معظم آباد)
(۲۰) مرادآباد
(۲۱) مصطفےٰ آباد رامپور
(۲۲) میرٹھ
(۲۳) ہاتھرس
(۲۴) ہردوار
(۲۵) بدایوں
(۲۶) علی نگر
(۲۷) نجیب آباد
(۲۸) سنبھل
(۲۹) دوگانواں
(۳۰) نجف گڑھ
(۳۱) نانک پور
(۳۲) چنار مرزاپور
(۳۳) عبداللہ نگر پہان

ایک بات سمجھ میں نہیں آتی وہ یہ ہے کہ اتنے قریب قریب ٹکسالوں کے قائم کرنے کی کیا وجہ تھی؟ ممکن ہے کہ روپیہ کو کثیر تعداد میں گردش میں رکھنے کی غرض سے قریب قریب ٹکسالیں بنائی گئی ہوں۔ ابھی تک عہد مغلیہ کی ٹکسالوں اور ان کے انتظام انصرام کے متعلق اطمینان بخش ریسرچ نہیں کی گئی ہے۔ لیکن اتنا پتہ ضرور چلتا ہے کہ ٹکسال کا ایک مخصوص محکمہ تھا اور اس کے عمال بھی بہت متدین لوگ ہوتے تھے ٹکسالوں کے بھی درجے تھے اور ہر درجے کی ٹکسال کے اختیارات محدود تھے۔ مثلاً درجہ اول کی ٹکسال ہر ماہ میں ایک ہزار مہر اور دس ہزار روپیہ اور بیس ہزار ٹنکا ڈھال سکتی تھی۔ ان اختیارات

کے صحیح استعمال کی سختی سے نگرانی ہوتی اور ملک کی دولت کے برقرار اور رائج و متحرک رکھنے کے لئے ایک مضبوط نظام قائم تھا۔ جو میزان (Equilibrium) کے کسی پلے کو کسی طرف جھکنے نہیں دیتا تھا۔

میں نے اس مضمون میں صرف شمالی ہندوستان کی ٹکسال سے بحث کی ہے شمالی ہند کے علاوہ ہر خطے کے ممتاز مقامات پر ٹکسالیں موجود تھیں۔ جن سے سکّے نکلتے رہتے تھے۔ موضوع ریسرچ کا تشنہ ہے[1] اور بغیر عمیق مطالعہ اور تحقیقات کے قلم اٹھانا آسان نہیں ہے ممکن ہے کہ آیندہ کسی اشاعت میں اجمال کی تفصیل کی کوشش کی جاسکے۔

[1] رائے بہادر بابو پراگ دیال کیوریٹر لکھنؤ میوزیم نے ایک طویل مضمون ہندی میں اس موضوع پر لکھا ہے۔ یہ مضمون بہت پُر معلومات و دلچسپ ہے علاوہ بریں بہار و اڑیسہ ریسرچ سوسائٹی جرنل ۱۹۱۹ء میں ڈاکٹر اسپونر۔ ڈاکٹر ہنٹ۔ ارکرا اور مسٹر ای اے ایچ ورش کے مضامین بھی قابلِ ذکر ہیں۔

شہنشاہ حسین رضوی

غزل

تنگ آ چکے ہیں گردشِ دورِ زماں سے ہم
امیدِ فیض کیسے رکھیں آسماں سے ہم

مر کر ملا ہے منزلِ مقصود کا پتہ
پہنچے وہیں پہ آ کے چلے تھے جہاں سے ہم

شائد کہ رازِ جلوہ گہِ دوست پا سکیں
آگے بڑھیں گے سرحدِ فہم و گماں سے ہم

ساقی اُجگا جنوں کو، پلا تند و تیز دے
اُٹھیں گے بے پئے نہ ترے آستاں سے ہم

دل سرد ہو گیا ہے تمنّا ہے بے خروش
جائیں کہاں کو اُٹھ کے ترے آستاں سے ہم

نذیر احمد مرغوب

کیفیتیں

جا اے نسیمِ صبح پیامِ فغاں لئے
شعلوں کا اپنے دوش پہ اک کارواں لئے

ہر ذرہ ہے شگفتہ گلستاں کا مثلِ گل
ہر گُل کنار میں طربِ جاوداں لئے

میں ہوں رہینِ کشمکشِ اضطراب، اور
وہ چُپ پڑے ہیں دامنِ خوابِ گراں لئے

اُڑتا ہوں عرش پر میں زمیں کو لئے کبھی
گرتا زمیں پہ ہوں کبھی ہفت آسماں لئے

چلتا ہوں کاروانِ کواکب کے ساتھ ساتھ
بیٹھا ہوں دل میں گردشِ دورِ زماں لئے

بیٹھا ہے ایک پیکرِ حیرت بنا ہُوا
تصویر ان کی صانعِ کون و مکاں لئے

شاہدؔ اب اُٹھ کہ دیر سے ہے منتظر ترا
ساغر شرابِ ناب کا پیرِ مغاں لئے

مسعود شاہد

لطیفہ

اگر آپ نے لطیفہ کی آنکھیں نہیں دیکھیں تو آپ یہ جان ہی نہیں سکتے کہ پیاری آنکھیں کیسی ہوتی ہیں۔ جب میں جوان تھا اور لطیفہ ایک معصوم دوشیزہ تھی، تو میں اکثر یہ کہا کرتا تھا۔

گو اُس بات کو مدت گذر چکی ہے لیکن میں اب بھی اپنے کہے پر قائم ہوں۔

جنوری کا مہینہ تھا اور برسات کا موسم۔ میں چند عربوں کے ہمراہ باہر کھیتوں میں انگور کی بیلوں کی کاشت کے لئے زمین کو ہموار کروانے میں مصروف تھا۔ میرے دل کی رنگینیاں انگڑائیاں لے رہی تھیں۔ اور یوں نظر آتا تھا کہ فضا میں ہر سُو مخمور طلسمی کیفیتیں لرزاں ہیں۔

بہت ہی سہانا دن تھا۔ ہوا دل کو گدگداتی تھی۔ مشرق سے اُبھرتے ہوئے آفتاب کی سپیں کرنیں ہر شے کو منور کر رہی تھیں۔ ایسے سمے میں سانس لینا بھی اک مسرت تھی پھیپھڑوں کو ان کی آخری وسعت تک تازہ ہوا سے بھر لینا ایک عشرت تھی۔ ہر چیز پر مستی چھائی ہوئی تھی۔ اور کائنات کا ذرہ ذرہ بہار سے متاثر نظر آتا تھا۔ وادی کے آوارہ پھول جھوم جھوم کر انجان اشارے کر رہے تھے۔ جو عرب عورتیں پتھر صاف کر رہی تھیں۔ اُن میں مجھے ایک شگفتہ چہرہ جنگل کے پھول سے بھی زیادہ شاداب نظر آیا۔ یہ ساحرہ کوئی چودہ برس کی لڑکی تھی۔ سرو قد، انجان اور بے خبر سی۔ اُس نے نیلگوں لباس پہن رکھا تھا۔ سفید رومال کا ایک کونا اُس کے سر پر تھا اور دوسرا اُس کے کندھے پر پڑا تھا۔

"کیا تم اپنا نام بتا سکتی ہو؟" میں نے کہا ——

ایک معصوم اور شرمیلا چہرہ میری طرف پھرا اور دو ستاروں کی مانند روشن آنکھیں شعلہ بار ہوئیں۔ اُس کی آنکھیں بہت ہی پیاری تھیں۔ بڑی بڑی سیاہ۔ اور روشن شمعیں جن پر لانبی لانبی گھنی پلکیں مسرت اور احساس جوانی سے چمک رہی تھیں۔

"دختر شیخ سلمان" ایک عرب نے طنزاً کہا اور کام میں مشغول ہو گیا اور پھر معنی خیز نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے مسکرایا اور گنگنانے لگا۔ "بہار کی طرب انگیز راتوں میں دو ستاروں کی مانند ——"

اس واقعے کے بعد مجھے اپنے کام میں ایک نئی دلچسپی پیدا ہو گئی۔ جب کبھی میں تھکاوٹ محسوس کرتا یا اُداس ہوتا تو لطیفہ کو دیکھ لیتا۔ جس سے خون میں حرارت پیدا ہو جاتی اور روح میں شگفتگی آ جاتی۔ اور اُس کی سحر پرور نگاہیں مجھ میں زندگی بھر دیتیں۔ میں اکثر جبکہ وہ میری طرف دیکھتی اس کی نگاہوں کی حرارت کو محسوس کرتا اور اس کی آتشیں نگاہیں میری روح کو گرماتیں۔ لیکن کبھی کبھار یہ آنکھیں اُداس بھی ہو جاتیں۔

ایک دن میں گھوڑے پر سوار کھیت کی طرف جا رہا تھا کہ راستے میں کنوئیں کے پاس مجھے لطیفہ ملی۔ اُس کے سر پر ایک گھڑا تھا۔ وہ مزدوروں کے لئے پانی لا رہی تھی . . . . .

"کیا حال ہے لطیفہ؟"

"میرا باپ مجھے کام کی اجازت نہیں دیتا . . . . ."

یہ لفظ اُس کے منہ سے اس طرح نکلے جیسے کہ وہ انہیں کہہ کر اک ایسے بوجھ کو ہلکا کر رہی ہے جو مدت سے اُس کے دل پر پڑا تھا۔ اُس کی آواز میں افسردگی تھی اور یوں محسوس ہوتا تھا کہ اُس کی سادہ اور معصوم روح کو کوئی شدید صدمہ پہنچا ہے۔

"تو کیا گھر پر رہنا کام سے بہتر نہ ہوگا؟" میرے ان الفاظ پر لطیفہ نے مجھ پر اک گہری نگاہ ڈالی۔ اُس کی آنکھیں کچھ مدھم ہو گئیں اور چند لمحے وہ بالکل خاموش رہی اور پھر کہا "میرا باپ مجھے شیخ اصغر کے لڑکے سے بیاہ دینا چاہتا ہے"۔

"اور تم؟"

"میں اس پر موت کو ترجیح دیتی ہوں!"

وہ ایک دفعہ پھر چپ ہو گئی اور کچھ لمحوں کے بعد کہنے لگی۔

"حاجا! کیا یہ سچ ہے کہ تمہاری صرف ایک ہی بیوی ہوتی ہے۔"

"ہاں صرف ایک!" . . .

"اور تم لوگ عورتوں کو مارتے بھی نہیں۔"

"نہیں۔ جس عورت کو پیار کرتا ہو اسے کوئی کب اذیت پہنچاتا ہے خصوصاً جبکہ وہ عورت بھی اُسے پیار کرتی ہو ——"

"تمہارے ہاں تو ہر دوشیزہ اپنے محبوب سے شادی کرسکتی ہے نا؟"

"یقینی طور پر ——!"

"ہمیں تو یہاں حیوانوں سے بھی بدتر تصور کیا جاتا ہے۔"

ایسی ساعتوں میں لطیفہ کی آنکھوں کی دلکشی نظارہ سوز حد تک بڑھ جاتی تھی اور نگاہوں کی گہرائی اور سیاہی کی حدود کا جاننا محال ہو جاتا تھا۔

"میرا باپ کہتا ہے کہ مجھے وہ تمہیں دے دے گا۔ بشرطیکہ تم مسلمان ہو جاؤ . . . . ."

"مجھے؟"

میں بے اختیار ہنس پڑا۔ لطیفہ میرا منہ تکتی رہی۔ اس کی نگاہیں غم انگیز تھیں ——

"لطیفہ یہودی بن جاؤ، میں تم سے شادی کرلوں گا۔"

"نہیں حاجا یہ بات ناممکن ہے۔ میرا باپ میری جان لے لے گا اور تمہیں بھی مار ڈالے گا۔"

اگلے روز بوڑھا شیخ پھر کھیت پر آیا۔ وہ سفید گھوڑی پر سوار تھا اور اُس کے سر پر ایک شاندار دستار تھی۔ اس نے مزدوروں کے سلام کا تمکنت سے جواب دیا اور وہ سب اُس کے سامنے عاجزی سے جھک گئے اور خاموش ہو گئے۔ اُس نے میری طرف قہر آلود نگاہوں سے گھورا اور وہ مجھ سے نہایت سردمہری سے پیش آیا۔ میں نے ویسا ہی خشک جواب دیا۔ آبادی کے لوگ شیخ کو کچھ قدر کی نگاہ سے نہ دیکھتے تھے۔ کیونکہ اُسے یہودیوں سے بہت نفرت تھی۔ مگر اس کے باوجود اُس سے سب خائف تھے۔

جب شیخ نے اپنی دختر کو دیکھا تو وہ مشتعل ہو گیا۔

"کیا میں نے تمہیں یہودی کے پاس جانے سے منع نہ کیا تھا۔" اُس نے غراتے ہوئے کہا۔ اور پھر وہ جوش میں آکر کہنے لگا۔

"اُن مسلمانوں کو شرم آنی چاہئے جو اپنی زمین کفار کے ہاتھ فروخت کر دیتے ہیں۔" ان الفاظ کے ساتھ اُس کے ہاتھ کی چھڑی کئی بار لطیفہ پر بے رحمی سے برسی۔ میں نے بڑھ کر لطیفہ کی مدد کرنا چاہی مگر لطیفہ کی نگاہوں نے مجھے بے حس و حرکت رہنے کی تلقین کی اور میں چُپ کھڑا اس اندوہ افزا منظر کو دیکھتا رہا۔ اس کے بعد . . . .

شیخ اور اُس کی دختر چلے گئے۔ مزدوروں نے بھی اطمینان کا سانس لیا۔

"شیخ سلمان بے رحم ہے" کسی نے کہا۔ "اس لئے مزدور پیشہ لوگ خوشی سے اُس کے پاس کام کرنے کے لئے نہیں جاتے۔ ایک تو تشدد سے کام لیتا ہے اور دوسرے اُجرت بھی کم دیتا ہے بھلا ایسے میں کون دن رات اُس کی غلامی کرے جبکہ مقابلتاً یہودی زیادہ اُجرت دیتے ہیں اور کام بھی تھوڑا لیتے ہیں۔"

"اُسے جس بات کا غصہ تھا میں خوب جانتا ہوں" ایک نے معنی خیز نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

اس کے بعد لطیفہ کام پر واپس نہ آئی . . . . .

کچھ دن بعد جب میں اپنے گھر سے باہر نکلا تو وہ راستے میں مجھے ملی۔ سڑک کے کنارے بیٹھی مرغیاں فروخت کر رہی تھی۔ مجھے آتا دیکھ کر وہ اُٹھ بیٹھی۔ اُس کی آنکھیں پہلے سے زیادہ حسین اور اُداس تھیں۔

"کیا حال ہے لطیفہ؟" میں نے پوچھا

"شکریہ" اُس نے جواب دیا۔ اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ لطیفہ اکثر مرغیاں فروخت کرنے کے لئے آیا کرتی اور ہمیشہ شام ہی کو آتی ——

ایک دن میرے ایک مزدور نے مجھے بتایا کہ لطیفہ کی شادی شیخ اصغر کے لڑکے سے ہو گئی ہے اور وہ شیخ اصغر کے گھر چلی گئی ہے۔ اس کا لڑکا پست قامت اور بے بضاعت ہے۔ اُس کے بعد میں نے سنا کہ شیخ اصغر کے لڑکے کا گھر جل کر راکھ ہو گیا ہے اور لطیفہ اپنے باپ کے پاس واپس آگئی ہے۔

پھر سُنا کہ اُسے زبردستی سسرال بھیج دیا گیا ہے . . . .

یوں ہی کئی برس گذر گئے۔ میں اپنے نئے مکان میں رہتا تھا۔ اور کسی کی خوبصورت آنکھوں نے مجھے لطیفہ کی حسین آنکھوں کو بھول

جانے پر مجبور کر دیا تھا۔

ایک صبح میں گھر سے باہر نکلا تو دو معمر عرب عورتیں مرغیاں فروخت کر رہی تھیں۔ ایک عورت میری طرف بڑھی۔

"کیا بات ہے؟" میں نے پوچھا۔

"کیا تم حاجا نہیں؟" اُس نے جواب میں کہا۔

"لطیفہ!" میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

آہ! یہ لطیفہ تھی۔ ایک بوڑھی اور عمر رسیدہ عورت، اُس کی جوانی اُس کے چہرے کی جھریاں بن کر رہ گئی تھی، مگر اُس کی آنکھوں میں اب بھی کسی گزرے ہوئے عہد کی یاد دلانے کے لئے روشنی باقی تھی۔

"تم نے اب داڑھی رکھ لی ہے۔ تم کس قدر تبدیل ہو چکے ہو۔" اُس نے میرے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا ——

"تم کیسی ہو۔ تم میں بھی تو زبردست انقلاب آ گیا ہے۔"

"قدرت کو یہی منظور تھا اور ایسا ہی ہونا تھا۔" وہ چُپ ہو گئی اور پھر کچھ سوچ کر کہنے لگی۔

"حاجا! اب تمہارے گھر بیوی بھی ہو گی؟"

"ہاں لطیفہ!"

"میں اُسے دیکھنا چاہتی ہوں۔ . . .!"

میں نے اپنی بیوی کو باہر بلایا۔

لطیفہ دیر تک اُس کی طرف دیکھتی رہی۔ اُس کی آنکھوں میں دو بڑے بڑے آنسو جھلک رہے تھے۔ تب سے میں نے لطیفہ کو کبھی نہیں دیکھا —— !

"موسیٰ بسل آتشکی" **مجید لشاری**

شعر

نہ دیکھا میرِ آوارہ کو، لیکن
غبار اک ناتواں سا کو بکو تھا

میر تقی

بٹوت

ہے ٹھنڈی ٹھنڈی بادِ بہاری بٹوت میں — اور میٹھے میٹھے چشمے ہیں جاری بٹوت میں
صورت میں لالہ و گلِ خودرو کی دیکھئے — حسنِ ازل کی نقش نگاری بٹوت میں
اشجارِ سبز پوش کے آئی لباس میں — خضرِ خجستہ پے کی سواری بٹوت میں
ابرِ بہار جھوم رہا ہے خمار میں — عالم وہ مستیوں کا ہے طاری بٹوت میں
واعظ کے وعظ میں بھی ہے مستی شراب کی — زاہد ہے وقفِ بادہ گساری بٹوت میں
مسکن ہے اپنا ابرِ بہاری کی سیرگاہ — میخانہ ہے بغل میں ہماری بٹوت میں
ہے ٹھنڈی باولی پہ حسینوں کا جمگھٹا — اور کچھ نظر گزر کے بھکاری بٹوت میں
اک شوخ چنچل اتری پہاڑی سے ڈگری — نینوں کی چل رہی ہے کٹاری بٹوت میں
دھونی رمائے بیٹھے ہیں چیلوں کی چھاؤں میں — پربت کی موتوں کے پجاری بٹوت میں

حاضر حضورِ حق میں ہے غائب زمانے سے
اللہ ہو زباں پہ ہے جاری بٹوت میں[1]

خوشی محمد ناظر

[1] عام طور پر قبلہ ناظر صاحب کا رنگ سفیدی لئے ہوئے ہوتا ہے لیکن یہ ایک ہلکی پھلکی چیز ہوتی ہے چنانچہ مقطع میں ناظر صاحب کا لباس پہنے ہوئے ہیں اور اس تبدیلی میں بھی ایک بات پیدا ہو گئی ہے۔

سایہ

لارنس باغ میں ایک تنہا اور غیر آباد کونے میں سجاد بیٹھا ہُوا جمیلہ کا انتظار کر رہا تھا، وہ کونہ غیر آباد تو تھا لیکن اس قدر نہیں کہ وہاں پرندہ بھی نہ پھٹک سکتا ہو، کبھی کبھی کوئی موٹر سامنے والے موڑ سے گذرتی تو اس کی تیز تیز آنکھوں میں سے روشنی نکل کر بہت سی غیر مانوس اور پوشیدہ تاریکیوں پر پڑ جاتی اور اسی لپیٹ میں سجاد بھی آجاتا، اس نے بہت سوچ سمجھ کر وہ جگہ چُنی تھی، ایک بڑے اور جھکے ہوئے درخت کے نیچے تنے کے ساتھ لگا ہُوا سیاہ رنگ کا بنچ —— لیکن موٹروں کی تیز تیز آنکھوں سے کوئی کہاں تک بچے! آنکھوں کو چندھیا دینے والی روشنی کو بُرا بھلا کہتے ہوئے سجاد نے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا، اس کو اس بات سے بہت نفرت تھی کہ کوئی اسے تنہائی میں بیٹھا ہُوا دیکھے،

جمیلہ کا ابھی تک کہیں نام و نشان نہ تھا!

سجاد نے اپنی دونوں ٹانگیں بنچ پر دراز کرلیں، اور پھر درخت کے پتوں میں —— بالکل تاریک پتوں میں نگاہیں جما دینا تو اس کے اختیار کی بات تھی، اچانک ایک پرندہ پھڑ پھڑاتا ہُوا درخت میں سے باہر نکلا غالباً وہ نہیں چاہتا تھا کہ رات کی تاریکی میں کوئی انسان اسے گھور گھور کر دیکھے، وہ اس وقت اڑ کر کہاں جا سکتا تھا، اڑا اور اڑ کر ساتھ ہی دوسرے درخت پر جا بیٹھا، سجاد کی نگاہیں اس کے پیچھے لگی رہیں۔ پھر وہ مسکرا دیا اُس نے مڑ کر عقبی سڑک پر نظر دوڑائی۔ جہاں سے جمیلہ اسے سائے کی طرح بڑھتی ہوئی نظر آسکتی تھی لیکن ابھی تک وہ سایہ مفقود تھا۔

اس کے دہنی طرف بھی ایک سڑک تھی جس پر سے موٹریں گذر رہی تھیں لیکن اُن کی روشنی اس پر نہ پڑ سکتی تھی اس لئے وہ خوش تھا، کوئی موٹر گذرتی تو جب تک وہ پودوں کی اوٹ میں نہ ہو جاتی۔ وہ پیچھے دیکھتا رہتا اور خوب نگاہیں جما کر ہر ایک کا نمبر پڑھنے کی کوشش کرتا، پھر مسکرا دیتا —— وہ تو سمجھتے ہوں گے کہ اس درخت کے نیچے تاریکی ہی تاریکی ہے، یہاں پر کسی انسان کا کیا کام، بے وقوف لوگ! یہ سوچ کر وہ مسکرا دیا۔

اس نے پھر اپنی بڑی بڑی آنکھیں پھاڑ کر تاریکی میں دیکھا اور چند لمحوں تک دیکھتا رہا، یہاں تک کہ تاریکی میں نگاہیں گاڑے ہوئے بھی اس کی آنکھوں سے پانی بہہ نکلا،

جمیلہ کا سایہ کہیں بھی حرکت کرتا ہُوا نظر نہ آیا،

ہوا کا ایک تند سا جھونکا اس کے درست بالوں کو پریشان کرتا ہُوا گزر گیا، اس نے اپنی انگلیوں سے انہیں درست کیا، بہت پرے لیمپ کے پودوں کو جب ہوا نے جنبش دی تو ایک بتّی جھلکنے لگی، وہ بنچ پر سرک کر تاریک کونے میں جا بیٹھا۔ جہاں بتّی کی مدھم سی شعاعیں نہ پڑ سکتی تھیں،

چند لمحوں کے بعد جمیلہ وہاں ہوگی اور پھر اس کے جذبات میں کس قدر ہیجان برپا ہوگا، یہ خیال کس قدر دلچسپ اور مسرت انگیز تھا اور یہی تصوّر تو اُسے اس تاریکی میں لئے بیٹھا تھا۔

وہ اسی لارنس باغ میں جمیلہ سے ملا، کس طرح ملا! اس کی تفصیل اس کے ذہن سے اُترنہیں چکی تھی لیکن غیر ضروری تفصیل کی ضرورت ہی کیا تھی! —— اب تو وہ ایک جذبات خیز دھارے میں بہتا ہُوا جا رہا تھا —— ! اس کا جمیلہ سے ملنا ایک قدرتی واقعہ تھا، انسانی فطرت کا ایک تقاضا لیکن جمیلہ نے آخر اسے کیوں پسند کیا؟ اس میں خصوصیت ہی کیا تھی؟

دفتر کا ایک بے حقیقت سا کلرک، محدود آمدنی کا مالک، وہ شاعر نہیں تھا، افسانہ نگار نہیں تھا، قابلِ رشک عہدے پر بھی فائز نہیں تھا، آخر وہ کیا تھا —— جمیلہ نے اِس کی طرف کبھی توجہ نہیں دی، ایک دو دفعہ سجاد نے اپنی اخلاقی جرأت کا ثبوت دینے کے لئے یہ

کہا بھی،

"جمیلہ! میں ایک بے حقیقت سا کلرک ہوں، میری کوئی خاص حیثیت نہیں ہے۔ ممکن ہے شادی کے بعد۔۔۔!"

لیکن جمیلہ نے ان باتوں کو غیر ضروری سمجھ کر سُنا اَن سُنا ایک کر دیا، وہ حیران تھا کہ آخر اس کی وجہ کیا ہے! جمیلہ سے ملتے جسے اُسے کافی عرصہ ہو چکا تھا لیکن اُسے یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ کون ہے، جب اُس نے سجاد کی باتیں سنیں تو وہ اس کے متعلق کچھ کیونکر پوچھ سکتا تھا لیکن وہ اسے بھول نہیں سکتا۔ اس کی یاد سے اسے ایسا معلوم ہوتا تھا گویا اس کا معطر جسم اس کے جسم کے ساتھ چھو گیا ہو۔ اُس نے مڑ کر تاریک سڑک پر پھر نگاہ دوڑائی۔

جمیلہ کا تاریک سایہ اب تک اُس کی آنکھوں سے اوجھل تھا، اس نے ایک لمبی سانس کھینچی گویا واقعی اسے جمیلہ سے عشق تھا۔ لیکن پھر وہ اپنے حالات پر غور کرنے لگا، کیا اُسے واقعی جمیلہ سے محبت تھی؟ ایک مدت گزر گئی، وہ محبت کئے جا رہا تھا۔ خاموش محبت ۔۔۔ لارنس باغ کے تاریک کونوں میں وہ کئی بار اس سے مل چکا تھا ۔۔۔ اور چاندنی راتوں میں حسن و عشق کے تصادم کی بے نام چیخیں کئی بار بلند ہو چکی تھیں، آخر اس کارزار کا مقصد کیا تھا؟ جمیلہ کیا چاہتی تھی۔ ۔۔۔؟ وہ کیا چاہتا تھا ۔۔۔؟ بے معنی محبت ۔۔۔ ابلتے ہوئے جذبات کا دھارا ۔۔۔!!

ایک دو دفعہ اس نے اس بات کی کوشش بھی کی کہ وہ کسی نہ کسی حیلے سے جمیلہ تک رسائی حاصل کر لے اور دائمی بندھن کی کوئی صورت نکالے۔ لیکن جمیلہ نے اس مشورے کو نہایت معمولی اور بے معنی سمجھ کر ٹال دیا، آخر بغیر کسی مقصد کے ہوا میں اڑنے سے کیا حاصل؟

معاً تاریک سڑک کی جانب سے گانے کی آواز آئی۔ کوئی شخص سائیکل چلاتا ہوا گا رہا تھا، "دیوانہ بنانا ہے تو دیوانہ بنا دے" وہ چند لمحوں کے لئے اس بے معنی مصرعے پر غور کرتا رہا لیکن اپنی محبت کے بے معنی ہونے کا رنج اسے زیادہ تھا۔ اس لئے پھر جمیلہ کی تصویر اس کی آنکھوں کے سامنے پھرنے لگی۔

رات کے دس بج چکے ہوں گے، سیاہ اور پختہ سڑک پر جھاڑو کی آواز اس کے کانوں میں پڑی، درختوں کی خاموش فضا میں وہ آواز عجب معلوم ہو رہی تھی، بھنگی اپنی مزدوری میں کس قدر مستعد تھا، دوسروں کے لئے کام کرنا اس کی فطرت میں داخل ہے، اس اندھیرے میں اس کا کوئی محافظ تو ہے نہیں جو اس کے کام کی پڑتال کرے۔ نیز اسے اس بات کا بھی یقین ہے کہ آسمان گدلا ہو رہا ہے۔ جھکڑ ضرور چلے گا سڑک کی صفائی کرنا نہ کرنا برابر ہے، کام نہ کرنے کے لئے اس کے پاس کافی بہانے ہیں۔ لیکن پاگل کہیں کا پھر بھی کام کئے جا رہا ہے، سجاد نے سوچا، اس کے پاس تو ضعیف سے ضعیف بہانہ بھی ہو تو وہ دفتر کا کام چھوڑ دیا کرتا ہے، افسر ہر وقت سر پر بیٹھا رہتا ہے اسی لئے وہ کام میں مصروف نظر آتا ہے اور بسا اوقات وہ موٹی موٹی مسلیں یوں ہی سامنے کھول کر بیٹھا رہتا ہے۔ آخر دوسروں کے لئے اتنا کام کرنے کا فائدہ ہی کیا؟ بھنگی تو بے وقوف ہے، وہ لکھا پڑھا انسان ہے۔ وہ اس قدر احمق نہیں ہو سکتا، بہت بے معنی سی بات تھی جس پر وہ اس قدر دماغ سوزی کر رہا تھا لیکن جمیلہ کی محبت ۔۔۔؟ وہ غالباً اس سے بھی زیادہ بے معنی تھی جس کے انتظار میں وہ دنیا سے بغاوت کر رہا تھا۔ اس نے مڑ کر ایک دفعہ پھر تاریک درختوں میں نظر دوڑائی،

جمیلہ کا سایہ کہیں حرکت کرتا ہوا نظر نہ آیا۔!

جمیلہ نے ٹھیک نو بجے باغ میں پہنچنے کا وعدہ کیا تھا لیکن وہ ابھی تک نہیں آئی، اس قسم کے وعدے اتنے بے معنی تو نہیں ہوتے کہ انہیں توڑا جا سکے، ایک دفعہ پہلے بھی جمیلہ نے اسی طرح کیا تھا۔ وہ رات بھر انتظار کرتا رہا اور وہ رات بھر نہ آئی، صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو وہ اس بنچ پر سویا ہوا تھا، دوسرے دن جمیلہ قہقہے لگاتی ہوئی آئی اور جب سجاد نے اسے یہ بتایا کہ صبح تک وہ اُسی بنچ پر سوتا رہا تھا تو اس نے ضرورت سے زیادہ قہقہے لگائے گویا وہ اس کی اس حرکت کا مذاق اڑا رہی تھی، معلوم نہیں اُس دن اُسے اس تضحیک کا احساس کیوں نہ ہوا، آج تو یہ بات بالکل صاف ستھری ہو کر اس کے ذہن میں آ چکی تھی، جب اس نے جمیلہ سے نہ آنے کی وجہ پوچھی تو وہ نہایت دلچسپی کے ساتھ اس بات کا ذکر کرنے لگی کہ کس طرح اُسے دیکھنے کے لئے ایک بہت بڑے خاندان کے چند افراد آئے ہوئے تھے۔ جس نوجوان کے لئے وہ رشتہ مانگنے کے لئے آئے تھے وہ خوبصورت بھی تھا اور پی سی ایس کے اعلیٰ عہدے پر فائز تھا ۔۔۔ بہت بڑے خاندان کے چند افراد۔ اگویا وہ تو ایک ادنیٰ درجے کا بابو تھا ۔۔۔ یہ بات آج ہی اس کے ذہن میں آئی، اس دن تو وہ اس اہمیت کو نہ پا سکا ۔۔۔ اس نے جمیلہ سے بہت دفعہ پوچھا

بھی کہ اس کے باپ نے اس رشتے کے متعلق ان لوگوں کو کیا جواب دیا لیکن ہر دفعہ اس نے یوں ہی باتوں میں ٹال دیا، اس کی بھی کوئی خاص وجہ ہوگی ورنہ اسے بتا دینے میں کوئی اعتراض نہ ہو سکتا تھا دیدہ دانستہ اس نے اس کے بہت بڑے سوال کو یوں ہی ٹال دیا ——— یہ کیوں ۔؟

اس نے مایوس لیکن باغیانہ نگاہوں سے تاریک سڑک پر پھیلتی ہوئی نگاہ ڈالی اور پھر ایک طنز آمیز مسکراہٹ سے گزرنے والی موٹر کو دیکھنے لگا۔

جمیلہ خلافِ معمول ابھی تک نہ آئی تھی!

اس میں شک نہیں کہ وہ جمیلہ سے محبت کرتا ہے لیکن دیدہ دانستہ وعدہ شکنی کرنے کا کیا مطلب ۔؟ ممکن ہے آج بھی اسے دیکھنے کے لئے کسی اور بڑے خاندان کے افراد آئے ہوں، کیا اس کی کوئی اہمیت نہیں! وہ بار بار اپنے بالوں کو درست کرتا اور سوچتا ——— اور اسی ایک کی یاد میں پھر جمیلہ کا دلآویز حسن اس کی آنکھوں کے سامنے پھر جاتا اور پھر وہی احساس ——— گویا اس کا معطر جسم اس کے جسم کے ساتھ چھو گیا ہو، اسے چھوڑنا تو بڑا مشکل کام ہے ——— خواہ اسے انتظار میں آج بھی صبح تک بنچ پر ہی سونا پڑے ——— لیکن جمیلہ کی بے وفائی پر ایک طنز آمیز مسکراہٹ اس کے چہرے پر کھیل ہی گئی، میں نے زندگی میں پہلی دفعہ ایک عورت سے محبت کی تھی اور پہلی دفعہ ہی مجھے اس قسم کی نوجوان عورت ملی جو صرف اپنے جسم سے کھیلنا جانتی ہے اور بس، کیا عورت اور مرد کی محبت کا یہی مآل ہے؟ سجاد کی آنکھوں کے سامنے پھر جمیلہ اپنی تمام عریانیوں کے ساتھ بے نقاب ہوئی، سوچتے سوچتے اس نے ایک اور رستہ ڈھونڈ نکالا۔

سجاد کی آنکھیں تاریکی میں بھی چمکنے لگیں۔ اگر عورت اور مرد کی محبت کا یہی انجام ہے تو پھر غم کھانے کی کیا ضرورت تھی ۔!!

منٹگمری ہال کی بچی کھچی موٹریں مدہوش سواروں کو لئے ہوئے جا رہی تھیں اور رقص گاہ پر اداسی ہی اداسی چھا گئی۔

اس نے پھر ایک دفعہ تاریک سڑک پر نظر دوڑائی لیکن جمیلہ کہیں آتی ہوئی دکھائی نہ دی۔

یکایک دور روشنی میں اس نے ایک عورت کو سڑک پر آتے دیکھا، کبھی کبھی اس عورت کی ساڑی روشنی میں چمک جاتی، اس کی چال نوجوان عورتوں کی سی تھی اور باغ کی تنہائی اور وقت کی غیر موزونی سے وہ بے خوف معلوم ہوتی تھی۔ سجاد نے غور سے دیکھا، یہ جمیلہ تو نہ تھی ——— اس لئے اس نے منہ دوسری طرف پھیر لیا، اس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ جمیلہ آج نہیں آئے گی، نہ آئے تو کیا وہ انتظار بھی نہیں کر سکتا! لیکن اسے یقین ہو چکا تھا کہ جمیلہ کی محبت دو تند و تیز لہروں کی ٹکر کے مانند ہے، مل گئیں تو مل گئیں! نہ ملیں تو ایک دوسرے سے بہت دور نکل گئیں۔

وہ ٹہلتا ہوا ایک پھول کے پودے تک گیا جو اندھیرے میں بھی اپنی خوشبو سے فضا کو معطر کر رہے تھے، پودے کے قریب کھڑے ہو کر ایک لمحے کے لئے اس نے سوچا ——— ہر پھول خوبصورت ہے۔ ہر پھول کی خوشبو دل کو لبھا سکتی ہے!

وہ لڑکھڑاتا ہوا واپس آیا اور پھر بنچ پر آکر گر گیا، چمکتی ہوئی ساڑی پر پھر اس کی نگاہ پڑی، وہ عورت اسی طرف بڑھتی ہوئی چلی آ رہی تھی، اسی تاریک کونے کی طرف ——— سجاد وہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھا۔ لیکن ہوا کا ایک ہلکا سا جھونکا اپنے ساتھ غازے اور خوشبو کا ایک طوفان لایا ——— سجاد کے سینے میں اس قسم کی خوشبو ایک ہیجان برپا کر سکتی تھی، اور اس کے پریشان خیالات کو اور منتشر کر سکتی تھی۔

چمکدار ساڑی والی عورت گھاس پر تیرتی ہوئی بڑھتی چلی آئی، اسی تاریک کونے کی جانب جہاں سجاد چھپا ہوا بیٹھا تھا، وہ سمٹ کر بنچ کے ایک کونے میں دبک گیا،

اب سجاد میں بھاگنے کی طاقت نہ رہی تھی!

وہ عورت بے باکانہ انداز سے آئی اور بنچ کے نزدیک پہنچ کر جھجک تک نہیں، غالباً اس کی تیز نگاہوں نے دور سے ہی دیکھ لیا تھا کہ کوئی شخص بنچ پر بیٹھا ہے، اس نے نہایت سریلی آواز میں کہا۔

"آپ کون ہیں؟..... یہاں کیا کر رہے ہیں؟"

"میں ——— میں ——— یہاں ———"

"انتظار کر رہا ہوں، صاف کہہ دیجئے نا!" یہ کہہ کر فضا میں ایک نقرئی قہقہہ بلند ہوا اور وہ عورت بے تکلف بنچ پر بیٹھ گئی۔

"اف! یہ انتظار کی گھڑیاں بھی کس قدر طویل ہوتی ہیں، انسان اپنے دوست کا انتظار کر رہا ہو اور وہ نہ آئے تو کتنا دکھ ہوتا ہے"!

"کتنا دکھ ہوتا ہے!" سجاد نے احمقوں کی طرح فقرے کا آخری

حصّہ دہرایا۔ چمکدار ساڑی والی عورت نے بنچ کی پشت کے ساتھ اپنی پشت لگاتے ہوئے کہا۔

"اور اگر خدانخواستہ جس شخص کے لئے انسان انتظار کر رہا ہو وہ جان بوجھ کر یہاں نہ آئے ـــ میرا مطلب ہے کہ وہ کسی اور دوست کے ساتھ معروفِ عیش ہو تو پھر دُکھ کی انتہا نہ رہے گی"۔

"کسی اور دوست کے ساتھ"! سجّاد نے چلّا کر کہا اور اپنی جگہہ سے اُٹھ کھڑا ہوا اور تاریک سڑک پر نظریں گاڑ دیں، وہ دیر تک یونہی کھڑا دیکھتا رہا۔

چمکدار ساڑی والی عورت اپنی جگہہ سے اٹھی اور اٹھ کر اس نے سجاد کے کاندھوں پر اپنا معطّر اور نازک سا ہاتھ رکھ دیا، اس کے کمزور پژمردہ اور منتظر سینے میں پھر ایک ہیجان پیدا ہؤا اور اُس نے بے اختیارانہ اس عورت کے ہاتھ کو دبایا،

سجّاد اور وہ عورت پھر بنچ پر بیٹھ گئے، جذبات کی تند اور تیز لہریں اٹھیں اور وہ ایک دوسرے سے چمٹ کر بہت دیر تک آپس میں بے معنی سی باتیں کرتے رہے۔ اب سجّاد کی نگاہیں اس تاریک سڑک کی طرف نہ اٹھیں جہاں سے جمیلہ کے آنے کا امکان ہو سکتا تھا۔

پچھلی رات جھکڑ چلنے لگا، سجّاد اور وہ عورت دونوں گھاس پر مدہوش لیٹے ہوئے تھے، اس عورت کے ریشمیں اور معطّر بال اُڑ اُڑ کر سجاد کے چہرے پر پڑ رہے تھے۔

وہ سڑک جسے بھنگی نہایت محنت سے صاف کر کے گیا تھا سوکھے ہوئے پتّوں سے بھر چکی تھی۔!

خلیل احمد

شعر

ابر چھایا ہے مینہہ برستا ہے
جلد آجا کہ جی ترستا ہے

گنّا بیگم

ماہِ طلعت

ماہِ طلعت کھڑی ہے کھڑکی میں
خود نزاکت کھڑی ہے کھڑکی میں

رُخ سے سرکا ہؤا دوپٹّا ہے
ابر سرکا ہے، چاند نکلا ہے

اس کے عارض پہ زلف ہلتی ہے
شام نورِ سحر سے ملتی ہے

مست ہیں اُس کی سرمگیں نظریں
اُف ہیں تلوار یہ حسیں نظریں

یوں چمکتے ہیں اس کے آویزے
جیسے ہوں ننھے ننھے مہ ریزے

اس کی کوئل سی ہے حسیں آواز
اپنی آواز پر ہے اس کو ناز

سامنے کے کواڑیں چھپ کر
تاکتا رہتا ہے "کوئی" دن بھر

مہدی علی خاں

دنیائے ادب

تازہ ترین رسائل کے اہم مضامین

(اس مضمون کو رسائل پر کسی قسم کی تنقید نہیں سمجھنا چاہئیے کیونکہ اس میں فقط چند خاص اور اچھے مضامینِ نظم و نثر کا ذکر ہوتا ہے معمولی یا ادنےٰ مضامین کا مطلقاً تذکرہ نہیں کیا جاتا]

(رسائل کا ذکر حروف تہجی کے لحاظ سے ہے)

ادبِ لطیف (ڈراما نمبر اشاعت اپریل و مئی)

دینو۔ دھرم پرکاش آنند اردو کے نئے لکھنے والوں میں سے ہیں۔ ان کا ایک افسانہ رامی ناظرینِ ادبی دنیا کی نظروں سے گذر چکا ہے۔ دھرم پرکاش ہمیں زندگی کی تاریک گہرائیوں میں لے کر اُتر جاتے ہیں۔ اور وہاں ہمیں ایسے مناظر دکھاتے ہیں جن کی ہیبت ناک حقیقت سے ہماری مسرت طلب نگاہیں دوچار نہیں ہونا چاہتیں۔ یہ مختصر ڈراما اُن کے اسی اندازِ نظر کا ایک اچھا نمونہ ہے۔ پنجاب کے پہاڑی علاقے کے لوگوں کا افلاس کسی تشریح کا محتاج نہیں اور ان کی سب سے بڑی دولت شاید وہ نسبی غرور ہے جو کبھی کبھی خود فراموشی کے عالم میں اُن کی سوکھی ہوئی شریانوں میں زندگی کا خون دوڑا دیتا ہے۔ اس ڈرامے میں ایک طرف افلاس کی جاں گداز مصیبت اور اس مصیبت سے پیدا ہونے والی گوناگون کیفیتوں کی آئینہ داری کی گئی ہے تو دوسری جانب اُس نام نہاد اور مصنوعی ہمدردی کا مضحکہ اڑایا گیا ہے جو ہمارا بورژوا تمدن افلاس کے ساتھ روا رکھتا ہے۔ آنند صاحب اگر اسی انداز میں لکھتے رہے تو وہ ترقی پسند ادب میں بیش بہا اضافہ کریں گے۔

ادبِ لطیف (جون)

بچپن۔ از کرشن چندر

اَلھڑ دیہاتی لڑکیوں اور بیکار شہری نوجوانوں کے کامیاب چربے اتارنے کے بعد اب کرشن چندر کے تخیل نے بچپن کی معصوم کیفیتوں کا جائزہ لینا شروع کیا ہے۔ زیرِ نظر افسانہ اس نئی روش کا ایک بہت اچھا نمونہ ہے۔ ننھے رفیع کے نازک احساسات اور اُلجھے ہوئے طرزِ عمل کا عکس اُتارنا ایک اچھے ماہرِ نفسیات کا کام تھا۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ کرشن چندر اس میں خوب کامیاب ہوئے ہیں اور پھر رفیع اور نیلا کا مکالمہ کس قدر دل آویز ہے۔ اور رفیع کے مردانہ غرور کا مدّوجزر اور آخر کار نیلا کے آنسوؤں کی تاب نہ لا کر آدم کے ایک سچے بیٹے کی طرح اپنے سارے ہتھیار ڈال دینا اور اپنی تمام پونجی جو تیتریوں کے تین سو پروں پر مشتمل تھی۔ حوا کی بیٹی نیلا کی نذر کر دینا، اس سے بھی خوب تر ہے۔ اور آخر کار جب زمانہ اور شباب دونوں ایک باہمی سازش سے ان کے بچپن کے خوابوں کو پریشان کر دیتے ہیں اور وہ ایک دوسرے سے بچھڑ کر ایک مدت کے بعد شاہ راہِ زندگی پر پھر ملتے ہیں تو نیلا جوان ہو کر ماں بن چکی ہوتی ہے اور رفیع ——— تخیل پرست رفیع

"باغ میں ایک سیب کے درخت کے نیچے کتاب کھولے بیٹھا تھا کہ کوئی اس کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ ہاں یہ نیلا ہی تھی، سرو کی طرح بلند قامت۔ شباب کی رعنائیوں کا مرقع جمیل، اس کے لبوں پر ابھی معصوم سی مسکراہٹ تھی جو شاید سورج کی کرنوں سے مل کر بنی تھی اور اس کی گود میں ایک ننھا سا بچہ تھا ..... یہ تمہارا لڑکا ہے نا؟ کتنا خوبصورت ہے، اس کا کیا نام ہے؟..... نیلا نے کانپتی ہوئی آواز میں آہستہ سے کہا، ہاں، اس کا نام ہے رفیع (رفیق) محمد رفیع، ..... کتنی ہی دیر رفیع خاموش کھڑا رہا نہ اس کے پاؤں تلے زمین تھی اور نہ سر پر آسمان، وہ خلا میں گھوم رہا

تھا، نہایت تیزی سے گھوم رہا تھا، پھر یکایک ایک جھٹکے کے ساتھ وہ بچپن کی زندگی میں لوٹ آیا، وہ چھوٹا سا تھا، ننھا رفیع نیلا کے ساتھ بھاگ بھاگ کر تیتریاں پکڑ رہا تھا، نیلا اور وہ سنبلو کی شاخوں پر بیٹھے تھلو کھا رہے تھے ندی کے کنارے اونچے ٹنک پر جھولا جھول رہے تھے۔ گڈریئے بانسریاں بجا رہے تھے ..... براتی سجے ہوئے تھے اور نیلا اس کی دلہن .....

نیلا کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے لیکن رفیع نے نہایت ہمت سے کام لے کر اپنے آنسوؤں کو اپنی آنکھوں میں روک لیا اور نگاہیں اٹھا کر گہرائی سے آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔ جہاں سفید سفید چمکتے ہوئے بادل ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے ہوئے جا رہے تھے؛ دیکھئے یہاں مصور اور ادیب باہمد گر اس طرح مل گئے ہیں کہ ایک کو دوسرے سے جدا کرنا کتنا دشوار ہے زبان کے لحاظ سے اس افسانے میں چند خامیاں بھی ہیں۔ کرشن چندر جیسے بلند پایہ افسانہ نگار کو اس بارے میں زیادہ احتیاط سے کام لینا چاہیئے۔ وہ ہمارے بہت سے لکھنے والوں سے بہتر زبان لکھتے ہیں اور ان کا طرزِ بیان بے حد شگفتہ ہوتا ہے لیکن کہیں کہیں وہ بلاتکلف پنجابی الفاظ استعمال کر جاتے ہیں اور بعض اوقات فقروں کی ساخت پر نظرِ ثانی نہیں کرتے۔ مثلاً ایک جگہ لکھا ہے "وہ چنبیلی کے پھولوں کے پودوں سے پھول توڑ رہا تھا" یہی فقرہ یوں لکھا جا سکتا تھا کہ "وہ چنبیلی کے پھول توڑ رہا تھا" یا اس طرح کہ "وہ چنبیلی کے پودوں سے پھول توڑ رہا تھا" یہ کہنا کس قدر طویل اور غیر ضروری ہے کہ "وہ چنبیلی کے پھولوں کے پودوں سے پھول توڑ رہا تھا" اسی طرح ایک جگہ جھولے کی بجائے پینگ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ پینگ پنجابی میں وہی چیز ہے جسے اردو میں جھولا کہتے ہیں۔ البتہ اس جھکولے کو جو جھولنے والا لیتا ہے اردو میں پینگ کہتے ہیں اور پینگیں بڑھانے کا محاورہ اسی سے بنا ہے مگر پینگ رسی کی ہو یا کسی اور چیز کی جھولے کے معنی میں اسم جامد کے طور پر اردو میں جائز نہیں ہے۔ امید ہے کہ جناب کرشن چندر اپنی آئندہ تحریروں کو ان چھوٹے چھوٹے نقائص سے محفوظ رکھیں گے۔

زمانہ (جون)

حضرتِ اکبر الہ آبادی۔ یہ فینی مضمون جو اکبر مرحوم کی زندگی کے چند دلچسپ پہلوؤں پر روشنی ڈالتا ہے۔ مرحوم کے فرزند سید عشرت حسین صاحب کلکٹر یو۔پی نے لکھا ہے اور خوب لکھا ہے۔ اکبر مرحوم کی وضعداری تو ان کے کلام سے عیاں ہے۔ لیکن اس مضمون کے مطالعے سے اس وضعداری کی بہت سی مثالیں سامنے آ جاتی ہیں۔ زندگی درحقیقت چھوٹے چھوٹے واقعات ہی سے بنتی ہے۔ اور ان ہی کے آئینوں میں جھلکتی ہے۔ اس لئے ہمیں اکبر کی بولتی چالتی تصویریں منتشر واقعات میں ایسی صاف نظر آئی کہ اس سے پہلے نظر نہ آئی تھی۔ اس مضمون میں ایک خط بھی شامل ہے جو عشرت صاحب کی شادی کی تقریب پر لسان العصر نے اپنے ایک عزیز دوست کو لکھا تھا ان صاحب نے شادی پر ناچ کا ہونا ضروری قرار دیا تھا۔ جواب میں فرماتے ہیں "محبت نامے کے مضامین نے دل کو باغ باغ کر دیا۔ میرے

ایک عزیز جو دبی زبان سے اسی بات کے لئے اشارے کر رہے تھے آپ کے خط کو سن کر پھڑک گئے۔ فرمانے لگے کہ بس یہ شخص آپ کا سچا محب اور زندہ دل دوست ہے ..... بیس سال سے زیادہ ہوئے میں نے عقل اور مصلحت سے فتوے حاصل کر کے ناچ مجرے دیکھنا چھوڑ دیا ...... آپ کہیں گے کہ حضور لکچر دے رہے ہیں یا یارانِ بے تکلف کو خط کا جواب لکھ رہے ہیں اچھا صاحب۔ لکچر موقوف۔ کان پکڑتا ہوں۔ ہزار بار توبہ۔ اب کفر نہ بھانکوں گا۔ پوری اندر سبھا پر ایمان لایا ..... بھائی صاحب چیت کا مہینہ، آغاز بلکہ عین موسم بہار ہوگا۔ کیسے کیسے وضعدار نوجوان ہمارے دوست رونقِ محفل ہوں گے۔ عشرت سلمہٗ زرد جوڑا پہنے ہوئے زینتِ مسندِ عروس ہوں گے۔ دل تو یہ چاہتا ہے کہ ایک شوخ طرار پرکالۂ آتش یہ گاتی ہوئی سامنے آئے ؎

ہے جلوۂ تن سے در و دیوار بسنتی ٭ پہنے ہے جو پوشاک وہ طرار بسنتی

آپ گھوڑے سے ہیں، اجلاس سے مولوی برکت اللہ صاحب منبر سے گر پڑتے لیکن ..... مطرب خام ہے نیز رنڈیاں کے ملتے ہیں ..... پورا شاعرانہ اور گورنمنٹی زور لگا کر بھی بیس اکیس اور چند پالکیوں اور دس بارہ ہاتھیوں سے زیادہ کا انتظام ناممکن ہے بہ مجبوری خاص خاص اعزہ اور احباب کو ساتھ لوں گا... اب فرمایئے کیا مزا ہے کہ جنت کی حوریاں پک ڈنڈیوں پر پھسلتی پھر رہی ہم لوگ خود سفر کئے ہوئے کچھ آرام کریں گے۔ پھر بارات جائے گی

پھر نکاح ہوگا۔ بیچاری گرمیوں کی ماری لیلائے شب کی بساط ہی کیا۔ چار انگڑائیاں لیں اور بھور ۔۔۔۔ بتلایئے کیا وقت ملے گا کہ اطمینان سے خنجر نگاہ کے زخمی ہوں اور قاتل کو داد دیں ۔ آپ کارگذار افسر ہیں ممکن ہے کہ اس کام کی فرصت نکال لیں۔ لیکن جب تک مرگِ انبوہ نہ ہو کیا مزا ہے ۔۔۔۔ لوگ کہتے ہیں اور سچ کہتے ہیں کہ نوشہ میاں تو رسم رسوم اور خیالِ عروس اور سہرے کے سلسلے میں بسر کریں گے۔ باراتی بے چارے کیا کر کے رات گذاریں گے! میں یہ کہوں گا کہ نفلیں پڑھو تہجد ادا کرو اور اس میں بدشگونی سمجھو تو گپ اڑاؤ اور شعر خوانی کرو۔ آپ کے ولولے حق بجانب۔ آپ کی محبت کا میں معترف لیکن اس کو دوسرے وقت پر اٹھا رکھئے۔ بہت سے مواقع ہیں ہم سے آپ سے اس باب میں گفتگو ہو جائے گی۔"

آپ نے دیکھا۔ یہ بزرگ کہاں پہنچے ہوئے تھے۔ ایسے زندہ دلوں کے ہوتے ہوئے ہم کیونکر کہہ سکتے ہیں کہ "اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو"۔ اور زبان و بیان کی کرامت آپ نے ملاحظہ فرمائی۔ آج یہ بات کسے نصیب ہے۔

کیا قومی زبان بنائی جا سکتی ہے۔ ایک خیال انگیز مضمون ہے جسے ح۔ ی۔ ع صاحب ایم اے نے لکھا ہے۔ درحقیقت یہ "زمانہ" کے مستقل مضمون نگار "حق پرست" کے ایک مضمون کا جواب ہے۔ صاحبِ مضمون نے "حق پرست" کے اس نظریئے کی تردید کی ہے کہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ ان کے بعض دلائل بہت وزن دار ہیں۔ ایک اور بات انہوں نے یہ کہی ہے کہ ہماری یہ کوششیں کہ زبان میں سے بعض قسم کے الفاظ نکال دیئے جائیں اور بعض شامل کر لئے جائیں کبھی کامیاب نہیں ہوں گی۔ کیونکہ زبان ایک قدرتی چیز ہے اور اس میں آورد اور تصنع سے کام نہیں چلتا۔ آخر میں انہوں نے ایک دو باتیں بہت صاف بیانی سے کی ہیں۔ اور زبان کی بحث میں اُن کا یہ قول ایک حد تک قابلِ توجہ ہے کہ

"اردو، ہندی، ہندوستانی کی بحث بالکل فضول ہے۔ پہلے خدا کے واسطے دل ملایئے۔ پھر زبان ملایئے گا۔ جب تک دل نہیں ملیں گے زبان نہیں ملے گی۔ زبان مختلف ہی رہے گی یہ کوشش بالکل فضول ہے کہ پہلے زبان ایک کی جائے اُس کے بعد دل ملائے جائیں۔ اس کوشش میں دل اور پھٹ جائیں گے اور نہ زبان ایک ہوئی ہے اور نہ ہو گی۔"

ظاہر ہے کہ صاحبِ مضمون جوش میں بہت آگے چلے گئے ہیں۔ ہمارا ذاتی خیال یہ ہے کہ کم از کم وادیٔ سندھ اور وادیٔ گنگا و جمن کی زبان ایک ہو سکتی ہے۔ بشرطیکہ دونوں فریق یہ سمجھیں کہ جیت اسی بولی کی ہے۔ جو اپنے بازو پھیلا کر اپنی موہنی سے دوست دشمن سب کو رام کرے گی۔ اور جو بولی الگ تھلگ رہ کر اپنے نادان چاہنے والوں کے جُھرمٹ سے نہیں نکلے گی۔ وہ آخر ایک دن اپنی حریف کے سامنے نیچا دیکھے گی۔

دلگداز۔ (جولائی)

قصیدہ اور اردو ادب۔ ایک مختصر مگر جامع مضمون ہے جس میں گرجا شدن صاحب نے اردو میں قصیدہ گوئی کی مختصر تاریخ بیان کی ہے۔ معروف قصیدہ گو شعراء کے کلام کے نمونے دیئے ہیں۔ اور آخر میں وہ اثرات گنوائے ہیں جو قصیدہ گوئی نے ہماری شاعری پر کئے۔ اس مضمون کا وہ حصہ خاص طور پر قابلِ مطالعہ ہے جس میں صاحبِ مضمون نے قصیدہ کا اثر مرثیہ پر دکھایا ہے۔ اس باب میں انہوں نے چند ایسے نکات بھی پیش کئے ہیں۔ جن کی طرف عام طور پر ابھی تک توجہ نہیں کی گئی تھی۔ مضمون ہر لحاظ سے دلچسپ ہے۔ مگر اس قدر مختصر ہے کہ بحث کچھ تشنہ رہ گئی ہے۔

سب رس (جولائی)

محمد قلی قطب شاہ کی بارہ پیاریاں۔ یہ دلچسپ مضمون سید محی الدین قادری زور کی علمی جستجو کا نتیجہ ہے۔ محمد قلی قطب شاہی سلاطین میں سب سے بڑھ کر عیش پسند اور خوش باش بادشاہ تھا۔ اور شعر و سخن اور ادب کا نہایت اچھا ذوق رکھتا تھا۔ اس نے اپنے دیوان میں اپنی منظورِ نظر معشوقاؤں کا ذکر نہایت دل آویز پیرائے میں کیا ہے۔ یوں تو اس کے حرم میں بے شمار مہ جبینیں تھیں۔ لیکن میں سے بارہ انتخاب تھیں اور یہ بارہ کا عدد بارہ اماموں کی رعایت سے مقرر کیا گیا تھا۔ ان میں سے چند کے نام یہ ہیں۔ ننھی۔ سانولی۔ پیاری۔ موہن۔ محبوب۔ پدمنی۔ سندری۔ سجن۔ رنگیلی وغیرہ۔ صاحبِ مضمون آخر میں لکھتے ہیں۔

"شباب کی رنگا رنگیوں اور جذبات کی جولانیوں کے اظہار میں اس کا قلم غیر معمولی قدرت رکھتا تھا اور یہ قدرت تخیلی یا ذہنی عشق عاشقی

سے پیدا نہیں ہو سکتی۔ مختصر یہ کہ صحیح معنوں میں اس میدان کا مرد تھا اس کے فسیح الشان محل نہ تھے بلکہ اصل میں یہ قومی حسن و نغمگی وسیع اور آراستہ و پیراستہ نمائش گاہیں تھیں۔ ان میں کئی ملکوں، کئی مذہبوں اور ہر وضع و قطع کی نازنینیں آزادی اور بے تکلفی کے ساتھ اپنے حسن و جمال کی آرائش و زیبائش میں مصروف و منہمک اور عشق و مستی کی عجیب و غریب کیفیتوں اور جوانی و رعنائی کے بے پناہ جذبات کے مظاہرے کرتی رہتی تھیں"۔

یہ مضمون اس دفعہ ہماری "دنیائے ادب" کی زینت ہے۔

کلیم (مئی و جون)

جدید رسم الخط از حکیم آزاد انصاری۔

جناب آزاد انصاری سے ناظرین ادبی دنیا اچھی طرح آشنا ہیں لیکن ہم سب انہیں ایک شاعرِ نغز گو کی حیثیت میں جانتے ہیں۔ ہمیں معلوم نہیں تھا کہ وہ ایک اعلیٰ درجے کے محقق اور ماہرِ رسم الخط بھی ہیں زیرِ نظر مضمون ایک نہایت بلند پایہ اور سیر حاصل مقالہ ہے جس میں حکیم صاحب موصوف نے رسم الخط کی تاریخ پر ایک حکیمانہ نظر ڈالی ہے۔ انہوں نے بتایا ہے کہ انسان نے اوّل اوّل اپنے مطلب کی ادائی کے لئے کس طرح نقوش سے کام لیا۔ پھر ان نقوش نے ترقی پا کر مصر قدیم میں ایک تصویری رسم الخط کی صورت اختیار کر لی۔ تصویری رسم الخط ارتقاء کی منزلیں طے کرتا ہوا فنیقی قوم کے ہاتھوں میں آیا اور ان سے یونانیوں نے حاصل کیا اور اسے دائیں جانب سے لکھنے کی بجائے بائیں جانب سے لکھنا شروع کیا۔ اسی زمانے میں یہ رسم خط دو اقسام پر منقسم ہوا۔ (۱) مشرقی اور مغربی۔ مشرقی کی ترقی یافتہ صورت عربی رسم الخط اور مغربی کی رومن ہے لیکن ان کی اصل ایک ہے۔ حکیم موصوف نے بہت سی مثالیں دے کر اور ایک ایک حرف کو لے کر یہ ثابت کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے کہ دراصل دونوں قسم کے حروف ایک ہی ماخذ سے تعلق رکھتے ہیں اس کے بعد رومن اور عربی خطوں کے محاسن اور معائب پر ایک مفصل اور دیانتدارانہ بحث کی ہے۔ جو اس سارے مضمون کی جان ہے اور ہم نے اس سے پہلے ایک مضمون میں حروف کی نشست و ساخت اور رسم الخط کی آسانیوں اور دقتوں پر اس سے بہتر بحث کہیں نہیں دیکھی۔ اس کے بعد خط نسخ سے گذر کر نستعلیق کا ذکر کیا ہے۔ اور پھر نستعلیق کے حسن و خوبی کا تذکرہ کرتے ہوئے اُن مشکلات کو شمار کیا ہے جو اس کے ٹائپ اور ٹائپ رائٹر کے رواج میں پیش آ چکی ہیں اور آخر میں نستعلیق کے ان معائب کو رفع کرنے کی چند صورتیں پیش کی ہیں اور یہاں آ کر جناب آزاد نے ایک اجتہادی غلطی کی ہے۔ وہ یہ ہے کہ نستعلیق کا ٹائپ بناتے بناتے انہوں نے اس خط ہی کو یکسر بدل کے رکھ دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ رومن کی طرح نستعلیق کے بھی دو رسم الخط ہونے چاہئیں۔ لکھنے کا الگ اور چھپنے کے لئے الگ۔ لکھنے کا تو جیسا اب ہے ایسا ہی ہو اور چھپائی کے لئے ہر حرف جدا جدا ہو اور چند حروف صحیح رومن سے لے لئے جائیں مثلاً K اور D وغیرہ اور چند حروف علت بھی مثلاً U۔ O۔ E۔ A اور موجودہ حروف میں بھی تبدیلیاں کی جائیں جن سے وہ دیدہ زیب اور خوشنما بھی ہو جائیں اور جگہ بھی کم گھیریں مثلاً ب پ ت کو یوں لکھا جائے T:T T Ṫ۔ ان تجاویز کی بھی آپ نے مختلف چار صورتیں پیش کی ہیں اور چند فقرے اپنے تجویز کردہ رسم الخط میں لکھ کر بھی دکھائے ہیں۔

مثلاً "کہ مشق آسان نمود اول و لے افتاد مشکلہا" کو اس طرح پر لکھا ہے

(۱) کہ م ا ش ق آ س ا ن ن م ود اول و ل ے ا ف ت ا د م ش ک ل ہ ا

(۲) کہ م ا ش ق آ س ا ن ن م ود ا و ل و ل ے ا ف ت ا د م ش ک ل ہ ا

اب ناظرین خود اس بات کا فیصلہ کر لیں کہ وہ اس خط کو محض اس لئے قبول کرنے کو تیار ہیں کہ یہ آسانی سے ٹائپ اور ٹائپ رائٹر کے ذریعے سے چھاپا جا سکتا ہے۔ ہمارے نستعلیق کے مقابلے میں یہ مجوزہ خط اس قدر طویل اور غیر مربوط ہے کہ اس کے رواج کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا ہم جو نستعلیق کے مقابل نسخ تک کو گوارا نہیں کرتے ایسے خط کو کیوں کر قبول کر سکتے ہیں۔ نسخ اور نستعلیق میں کوئی اصولی فرق نہیں ہے۔ فرق صرف حروف کی کاٹ کا ہے۔ باقی تمام قاعدے اور اصول ایک ہیں اور نسخ میں ٹائپ بھی موجود ہے اور ٹائپ رائٹر بھی پس اگر ہم ٹائپ اور ٹائپ رائٹر کے بغیر اپنا گذارہ نہ کر سکیں گے تو نسخ ہمارے پاس موجود ہے۔ اس سے کام چلا لیں گے لیکن ہم جو نستعلیق کے حسن کے قتیل ہیں اور محض اس حسن کی وجہ سے نسخ کو قبول نہیں کرتے حکیم صاحب کے مجوزہ خط کو کیسے قبول کر لیں گے۔ مانا کہ ہمارا رسم الخط بے عیب نہیں لیکن کونسا ایسا رسم الخط ہے جس میں ہمارے نستعلیق سے زیادہ عیب نہیں ہیں۔ مضمون کے مذکورہ حصے سے ہمیں سخت

اختلاف ہے لیکن علمی حیثیت سے یہ مضمون بے حد کارآمد اور دلچسپ ہے۔

معارف (جون ۱۹۳۹ء)

تہنید - از علامہ سید سلیمان ندوی۔

دوسری زبانوں کے الفاظ ہندوستانی زبان میں سے آنا تہنید کہلاتا ہے۔ اور یہ عمل ہماری زبان کی ترقی کے لئے بہت مفید ثابت ہوا ہے۔ فاضل مضمون نگار نے بہت سی مثالیں ایسے الفاظ کی دی ہیں جو غیر زبانوں سے اردو یا ہندی میں آئے۔ یہاں آ کر انہوں نے اپنے معنے اور بسا اوقات اپنی صورتیں بھی بدل لیں اور پھر یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ ایک مثال سنئیے "عربی میں فلک

آسمان کو کہتے ہیں چونکہ نجوم اور جوتش نے ہم کو یہ یقین دلایا ہے کہ ہماری ساری مصیبتیں آسمان کی گردش کا نتیجہ ہیں۔ اس لئے ہم نے فلک سے فلاکت بنالیا اور اس سے فارسی کی ترکیب دے کر فلاکت زدہ (فلاکت کا مارا ہوا) کہا۔ اور پھر اس کو عربی لفظ سمجھ کر اس کا مفعول مفلوک بنا لیا اور عربی اضافت دے کے مفلوک الحال کہہ دیا۔ حالانکہ اس کے ان معنوں کو عرب جانتا بھی نہیں۔"

غرضکہ اس قسم کی بہت سی مثالیں دے کر علامہ موصوف نے ہندوستانی زبان کی اُس سب سے بڑی خوبی کو ظاہر کیا ہے جسے ہم "اپنا لینا" کہتے ہیں۔ اور یہ سلوک صرف عربی فارسی سے نہیں ہوا بلکہ انگریزی پرتگالی اور سنسکرت سے بھی اسی طرح روا رکھا گیا ہے اور "یہ ہر خود مختار زبان کا حق ہے اور کسی کی قدرت نہیں کہ وہ اس سے اس کے اس حق کو چھین سکے۔"

ہمارے ان فاضل دوستوں کو جو اردو کے بعض مروج الفاظ کو اُن کے عربی فارسی یا سنسکرت کے معانی یا تلفظ کا پابند کرنا چاہتے ہیں۔ ان مفید مضامین کا ضرور مطالعہ کرنا چاہئے۔

نگار (جولائی)

اشتراکیت اور اس کا مستقبل

ہمارے ہاں آج کل اشتراکی ہونا فیشن میں داخل ہو گیا ہے۔ اگر آپ اشتراکی نہیں ہیں یا کم از کم اپنے اشتراکی ہونے کا جا و بے جا اعلان نہیں کرتے رہتے تو آپ فرسودہ اور تنگ خیال سمجھے جاتے ہیں۔ گلاب چند صاحب نے اس مختصر مضمون میں اشتراکیت اور اس کے متعلقات پر ایک چھچلتی ہوئی نگاہ ڈالی ہے اور بتایا ہے کہ اشتراکیت کی نسبت ہم بہت سی غلط فہمیوں میں مبتلا ہیں اور اگرچہ دنیا آہستہ آہستہ انفرادیت سے اشتراکیت کی طرف جا رہی ہے۔ لیکن ہر اشتراکیت روسی قسم کی اشتراکیت نہیں ہے اور نہ یہ ممکن ہے کہ نوع انسان سے انفرادیت کا جذبہ یکسر محو ہو جائے۔ انہوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ فرد کی حیثیت قائم رکھے بغیر سوسائٹی کبھی ترقی نہیں کر سکتی۔ بدقسمتی سے ہم ہر چیز میں مبالغہ چاہتے ہیں۔ اس لئے ہمیں آج انفرادیت سراسر ظلم و ناکامی اور اشتمالیت نوع انسان کی نجات کا واحد ذریعہ نظر آتی ہے۔ لیکن حقیقت شاید اس سے کچھ مختلف ہے۔ دنیا کے لئے "اشتمالیت اور انفرادیت دونوں چیزیں ضروری ہیں۔ انسان نہ تو ایک مشین ہے اور نہ ایک خود رو پودا۔" بہر حال مضمون بہت خیال انگیز ہے۔

صلاح الدین احمد

محمد قلی قطب شاہ اور اس کی بارہ پیاریاں

سلاطین قطب شاہیہ میں محمد قلی قطب شاہ ہی ایک ایسا بادشاہ ہے جس کا زمانہ زیادہ سے زیادہ امن و امان اور راحت و آرام سے گذرا۔ اور جس نے اپنی تمام زندگی عیش و عشرت اور بہجت و کامرانی میں گذار دی۔ مغل مورخوں نے قطب شاہوں کے آخری یادگار ابوالحسن تاناشاہ کو بدنام کرنے اور شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کی فتوحات کو حق بجانب ثابت کرنے کے لئے تاناشاہ کو بڑا عیاش اور رند بدمست مشہور کر رکھا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ سلطان محمد قلی کو عیاشی کے جو موقعے حاصل ہوئے تاناشاہ کو ان کا عشر عشیر بھی نصیب نہ ہو سکتا تھا۔

محمد قلی نے بچپن سے محل کے ناز و نعم میں پرورش پائی اور اگر وہ بھاگ متی والا قصہ صحیح ہے (جس کی رو سے بھاگ متی کی خاطر اس نے زبردست طغیانی کے باوجود رود موسیٰ میں اپنا گھوڑا ڈال دیا اور بعد کو اس جرأت کی پاداش میں محل سرا میں نظر بند کر دیا گیا اور وہاں ملک ملک کی حسین دوشیزاؤں کو اس کے ساتھ چھوڑ دیا گیا تاکہ اس کا دل بہلائیں اور رقاصۂ عالم کا خیال اس کے دل سے دور کر دیں) تو ظاہر ہے کہ عنفوانِ شباب کے ساتھ ہی وہ مہ جبینوں کے ماحول میں رہنے لگا جن میں سے ہر ایک اس پر جان و دل فدا کرنے کو تیار تھی۔

اس حسین و رنگین ماحول کے ثبوت خود محمد قلی کے کلام سے بھی دستیاب ہوتے ہیں۔ ہر تقریب میں اس کے اطراف خوبرویوں کا جمگھٹا رہتا اور رمضان اور محرم کے مہینوں کے سوا اس کی زندگی کے بہت کم لمحے ایسے ہوں گے۔ جب شاہد و شراب و نغمہ اس سے دور رہتے ہوں اتنا ضرور ہے کہ رمضان اور محرم میں وہ شراب قطعاً ترک کر دیتا تھا اور عیش و عشرت چھوڑ کر ایسا زاہد مرتاض اور متقی و پرہیزگار بن جاتا تھا کہ اس کے رند شاہد باز ہونے پر شاید شبہ ہونے لگتا۔ یہ اس کی طبیعت کا استقلال اور تربیت کی خوبی تھی۔

بھاگ متی کے متعلق تفصیل سے آیندہ لکھا جائے گا۔ لیکن اس کے علاوہ سلطان محمد قلی کی بیبیوں اور معشوقائیں تھیں جن میں سے حسب ذیل کے نام یا عرف اس کی کلیات میں بار بار دستیاب ہوتے ہیں۔

۱۔ ننھی ۲۔ سانولی ۳۔ کونلی ۴۔ پیاری ۵۔ گوری ۶۔ چھبیلی ۷۔ لالہ ۸۔ لالن ۹۔ موہن ۱۰۔ محبوب ۱۱۔ بلقیس زمانی ۱۲۔ حاتم ۱۳۔ ہندی چھوری ۱۴۔ پدمنی ۱۵۔ سندر ۱۶۔ سجن ۱۷۔ رنگیلی ۱۸۔ مشتری ۱۹۔ حیدر محل۔

ان بیبیوں مہ جبینوں میں بارہ ایسی ہیں جو خاص طور پر اس کی منظور نظر تھیں۔ کیونکہ محمد قلی بارہ اماموں کی رعایت سے ہر چیز میں بارہ کے عدد کا لحاظ رکھتا تھا۔ چنانچہ جب اس نے حیدرآباد کے جانب جنوب کی خوش منظر پہاڑی پر (جہاں اب قصر فلک نما واقع ہے) ایک عالی شان قصر محل کوہ طور کی تعمیر کی تو اس میں انہی دوازدہ آئمہ معصومین کی رعایت سے بارہ برج بنائے تھے۔ چنانچہ اسی محل سے متعلق اس نے ایک نظم بھی لکھی ہے جس میں ان برجوں کا ذکر اس طرح کرتا ہے "چونکہ ان بارہ برجوں پہ بارہ اماموں کی نظر عنایت ہے۔ اسی لئے ان پر ایمان کی تجلی جھلکتی رہتی ہے" اس کا شعر ہے ؎

بارہ بروج پہ ہے بارہ امام و شنی الظر تو اس اُپر جھلکتا ایمان کا اجالا

بارہ پیاریوں کی تخصیص کے متعلق بھی اس کے کلام سے مستند شہادت ملتی ہے۔

شہر حیدرآباد کی تعمیر کے وقت محمد قلی نے کئی عالی شان قصر تعمیر

کئے تھے اور خاص کر اپنے لئے ایک رفیع الشان سات منزلہ محل بنوایا تھا جس کا نام خداداد محل رکھا تھا۔ اس محل کی آرائش و زیبائش کے متعلق اس کی ایک نظم اس کی کلیات میں موجود ہے (دیکھو صفحہ ۲۱۱) اس نظم سے معلوم ہوتا ہے کہ جب اس محل میں آکر رہا تو اپنے ساتھ صرف ان بارہ پیاریوں کو لے آیا تھا جو اُس وقت اس کی منظورِ نظر تھیں۔ اس نظم کا ایک شعر ہے ؎

نبی صدقے بارا اماماں کا تھے   کرو عیش جم بارہ پیاریوں سیتی پیالے

اسی طرح عید میلاد کی ایک نظم (دیکھو صفحہ ۲۹) میں بھی اس نے ان بارہ محبوبوں کا بارہ اماموں ہی کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ وہ کہتا ہے ؎

مبارک منج اچھو عید ہور مولود نبیؐ کا   ہے ہیں قطب سوں بارہ اماماں ہور نگاراں خوش

ان بارہ پیاریوں میں چند کی خصوصیتیں ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔ سب سے پہلے ننھی کا ذکر ہے۔ اس کی تعریف میں محمد قلی نے کئی نظمیں لکھی ہیں اور اکثر نظموں اور غزلوں میں اس کا ذکر بھی کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ :۔

ننھی کی جیسی حسین تو آسمانوں میں بھی نہیں۔ سرو اس کے قد کے مقابل کبھی نہیں آسکتا۔ اس نے پھول کے رنگ کی ساڑی باندھی ہے جس کے کنارے عجب ہی موتی ٹنکے ہوئے ہیں۔ اس کی یاد کی مستی قطب شاہ کو خوشی ہے اور وہ اس کو دیکھانے کی خاطر دوتارے پر عجیب تان بجا

ایک دوسری نظم میں کہتا ہے

اے سکھیو! میں ننھی کے پریم میں موہا ہوں، تم سمیٹ کر ان کو خوشی سے کہو مرے ننھی میرے ہی کا داؤ کھیلتی ہے۔ اور اپنے چاند سے چہرے کو دکھا رہی ہے۔ اے ننھی میں تیرے جسم کی خوشبو کا ذکر کروں یا تیری کہانی بیان کروں کیوں کہ تیری خوشبو کی مہکاش عاشق کو بہکا دیتی ہے۔ خوشبو تیرے جسم سے اسی طرح مہکتی ہے جیسے بارش سے مہکتی ہو تیری آنکھوں کی چمک میں کاجل بہت اچھا لگتا ہے اور یہ تو اس لئے لگاتی ہے کہ رقیبوں کے منہ نہ لگیں۔

ایک نظم میں ننھی کے ہنستے کھیلتے ہوئے پیالہ پلانے کا ذکر کیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ بڑی ہنس مکھ اور حاضر جواب تھی وہ شراب کی صراحی ہاتھ میں لینے یا قطب کو بھر بھر کر دینے کو پسند نہیں کرتی تھی اور چاہتی تھی کہ قطب شاہ زیادہ شراب نہ پئے۔ اس لئے طرح طرح سے ٹالتی رہتی تھی۔ اس کا ذکر سالگرہ کی ایک نظم میں بھی کیا ہے (دیکھو صفحہ ۱۵۸) یہ تو بعد کے اوصاف تھے۔ ابتدا میں ننھی کی کیا حالت تھی اور بادشاہ نے اس کو ننھی کا لقب کیوں دیا تھا۔ اس کا علم ان دو نظموں سے ہوتا ہے جو صفحات ۲۲۸ تا ۲۳۱ میں درج ہیں جس میں وہ کہتا ہے کہ :۔

اے نازک ننھی تو ابھی محبت سے ناواقف ہے۔ تیری آنکھیں کاجل کی وجہ سے چمکتی ہیں لیکن تو نہیں جانتی کہ یہ کیا جادو جگا رہی ہیں۔ تیرا دل عشق و عاشقی کی طرف بھی مائل نہیں نہ تو شیشہ و پیالہ میں شراب بھرتی ہے اور نہ میری عرض مانتی ہے لیکن مجھے تجھ سے آس ہے اگرچہ تو دل لگانے کے طریقوں سے ناواقف ہے۔ لیکن میرا معشوق تو ہے۔ تجھے اپنے بچپن کے کھیلوں کا مرل نہیں معلوم نہ یہ جانتی ہے کہ تیرے ہونٹوں میں آبِ حیات ہے۔ اس لئے تو منہ سے صاف صاف بات نہیں کرتی۔ سچ تو یہ ہے کہ تجھے ابھی اپنی قیمت معلوم نہیں۔ تجھے چاہئے کہ قطب زماں کو جانے، محبت کی باتوں کو سمجھنے اور عشق کی سیوا کرے تو کب تک اسی طرح اپنے کو کھینچتی رہے گی۔

ایک اور نظم میں محمد قلی نے ننھی کے متعلق لکھا ہے کہ :۔

جب چمن میں ننھی محوِ خرام ہوتی ہے تو شرم کے مارے آنچل ڈال لیتی ہے۔ معلوم نہیں کہ اس ننھی ڈالی پر ابھی سے شباب کے پھل کیوں لگ گئے۔ جب وہ غصہ یا ناز سے خطِ سرمہ کے اشارہ سے بات کرتی ہے۔ اور اس کے ہونٹ عرق آلود ہو جاتے ہیں تو دل چاہتا ہے کہ اس کو گھن دیکھوں۔ میری محبت کے نونہالوں میں سے ایک کو اچھے پھل زیب لگے ہیں۔ اے خداوند میرے باغ کا ایک سرو ہے اس کی حفاظت کر۔ اس کی بہشتی خوشبو سے جگ کے تمام پھول کھلتے ہیں۔ اس کی خوشبو خطا اور ختن بھی نہیں پاسکتے۔ اے ننھی تیرے چہرے سے سب خوبرویوں کو روشنی ملی۔ تیرے چہرے کو زیور و جواہر کی کیا ضرورت! جب تو چاندنی میں نکلتی ہے تو چاند چھپ جاتا ہے۔ اور تارے آسمان پر سے تجھ پر نثار ہونے کے لئے آتے ہیں۔ میں نہیں جانتا کہ تو کیسے نور سے پیدا ہوئی ہے۔ سب پرند تیری چمکا چوند روشنی کے لئے اپنا اپنا وطن چھوڑ آئے ہیں۔

تو غصہ سے کیوں میری طرف بھوؤں کی کمان چڑھا کر دیکھتی ہے
تجھے تو چاہیے کہ ناز و غمزے کے ساتھ مجھے اپنے ہونٹوں کا بوسہ
دے۔"

(۲)

کیفیات میں نہمی کے بعد سانولی کا ذکر زیادہ ملتا ہے۔ اس کے متعلق محمد قلی نے لکھا ہے کہ میری سانولی من کی پیاری نظر آتی ہے۔ کیونکہ وہ رنگ روپ میں بالکل کونلی عورت ہے۔ سب سہیلیوں میں اس کا قد ایسا بالا ہے کہ معلوم ہوتا ہے سرو کو اس پر سے نثار کر دیا گیا ہے۔ جب وہ سکھیوں کے ساتھ عشق کا کھیل کھیلتی ہے تو اس کے چہرے کی روشنی میں چاند ذلیل و خوار نظر آتا ہے۔ کونپل اس کے ہونٹوں کے مقابلے میں ہاری ہوئی نظر آتی ہے۔ اس کی اچھی چال سب کے دل کو بھاتی ہے اور وہ اپنی ساتھیوں میں ایک نادر پھول نظر آتی ہے۔ اگرچہ سکھیوں نے اپنے چہرے کو طرح طرح سے غازہ لگایا اور اپنے جسم کو رنگین بنایا لیکن اس کے قدرتی رنگ کی بات کسی عورت میں نہیں آتی۔

دوسری نظم میں لکھا ہے:۔

سانولی پیاری نے اپنے سبز رنگ میں نزاکت دکھا کر ہمارے دل کو موہ لیا۔ اس کے ہونٹوں پر پان کی رنگیلی دھڑی ایسی سہانی معلوم ہوتی ہے کہ دنیا کی تمام رنگینیاں اس پر ریجھ جاتی ہیں۔ جب وہ ہنستی ہے تو اس کے کنول جیسے منہ سے موتی جھڑتے ہیں اور ان موتیوں سے عالم چمکنے لگتا ہے۔

تیسری نظم میں لکھتا ہے کہ:۔

جب سے اے سانولی تجھ پر نظر ہے ہوش و حواس گم ہیں اور بے خبر ہو گیا ہوں۔ جب تو اپنی شوخ آنکھوں سے ناز و غمزہ کرتی ہے تو میرا رواں رواں اس سے متاثر ہو جاتا ہے۔ جب تو ناز سے ہنستی ہے تو تیرے دانتوں کی چمک چاند کی طرح جھلکتی ہے۔ تیرا سرو جیسا قد جب محوِ خرام ہوتا ہے تو تیرے بالوں کا لمبا جوڑا چنور کا کام کرنے لگتا ہے۔ جب تو لباس پہن کر صحن میں نکل آتی ہے تو تیرے چمکدار کپڑوں سے آسمان روشن ہو جاتا ہے۔ جب تو موتی کے رنگ کی نیم تنی پہنتی ہے تو مجھے ایک بہشتی حور نظر آتی ہے۔ قطب شہ تیری نزاکت سے ناواقف نہیں۔"

(۳)

سانولی کے بعد محمد قلی کونلی کی تعریف میں رطب اللسان ہے۔ وہ لکھتا ہے کونلی اپنے ہاتھ میں پیالہ لے کر کھڑی ہے اور اتنی دبلی پتلی ہے کہ ہوا سے ہل رہی ہے۔ وہ بالوں میں پھول جماتی ہے اور چوٹی میں دو نادر بالا باندھتی ہے۔ اپنے کونلے ہوئے چہرے پر وہ اپنی بھوؤں کو اس طرح چڑھاتی ہے کہ نون معلوم ہونے لگتی ہے۔ اگرچہ بظاہر شرم و ناز سے کھنچی کھنچی رہتی ہے لیکن آنچل کے اندر سے اپنی آنکھوں کی چنچل پتلیوں کو نچاتی ہے۔ اس کے جسم کے رنگ سے نورتن کو روشنی ملی ہے اور اس گلے میں چاند سورج کے حمائل بنا کر ڈالے گئے ہیں۔

دوسری نظم میں لکھتا ہے:

اے کونلی تیرا قد دیکھ کر چمن کے سرو سے کرنے لگتے ہیں تیرا قد باغ فردوس کے لئے بھی باعث رشک ہے۔ میں نے اپنی پلکوں کو تکیے بنا کر رکھا ہے تاکہ اے ہند تو میری آنکھ میں آ کر آرام کرے۔ تیرے دونوں ہونٹ ایسے رنگیں کہ یاقوت نے اُن سے رنگ مانگا اور عقیقوں نے یمن میں اُن سے بھیک لی۔ تیری باریک کمر کے عشق میں میں بال کی طرح ہو گیا ہوں۔ یہ اتنی باریک ہے کہ پیرہن کا کوئی تار اتنا نہ ہو گا۔ دکھن کی اس کونلی سکھی کو دیکھ کر میری جتنی کالی سہیلیاں تھیں میں ان سب کو بھول گیا۔

تیسری نظم میں لکھتا ہے کہ:۔

اے اچھی پیاری نظر بازی کرنے کے لئے آنکھ سے آنکھ ملا کر کھڑی ہوتی ہے۔ میرے لئے نظر ٹکانا دشوار ہو جاتا ہے۔ تو کندنی رنگ کی ہے۔ جس کا روپ کونلا ہے۔ تیری گلابی آنکھ ارموں میں مار تار رہتا ہے اور تیرے سورج سے گالوں پر نورتن کی طرح جڑے ہوئے ہیں۔ تو بالے بال زنگار رنگ ہے۔ خوبرویوں پر راج کرنا تجھے سجتا ہے اے گلابی سہیلی تو میرے دل کی پیاری ہے۔

ایک اور نظم ہے کہ:۔

یہ شگفتہ جسے یہاں سبز آنچل اوڑھے اور پھولوں کی کلغی لگی۔ اس کی البڑ چال سے شراب کا خمار اور

آنکھوں میں رنگ کے ڈورے نظر آرہے ہیں۔ اس حسین کی محبت اور اس کے پاؤں کی جھنکار دل کے لئے امید، تن کے لئے عیش اور کان کے لئے ذوق کا باعث ہے۔ وہ گالی دیتی ہے اور دکھ سے کاری ہو کر گھات کرتی اور لاکھ خوشامد اور ریجھ سے دروازے میں ہیکڑ آلٹے آتی ہے یہ سب میں ہوشیار عورت ہے کیونکہ بھید کو جانتی عشق کو پہچانتی، اور اپنے گھر میں تخت پر بیٹھتی ہے۔

(۴)

پیاری بھی محمد قلی کی نہایت چہیتی تھی، لیکن وہ اپنے حسن و نزاکت پر بڑی مغرور تھی کہ ہمیشہ محمد قلی کو ترساتی اور ستاتی رہتی تھی اور وہ ہمیشہ اس کو منانے کی فکر میں رہتا چنانچہ کہتا ہے کہ:۔

اے سکھیو تم آج جا کر پیاری کو سمجھا منا کر لے آؤ کیونکہ تمام عشوہ طرازوں کا تاج اسی کے سر سجتا ہے۔ اس سے کہو کہ قطب شہ نے اپنے مکان کو بہت ہی زیبائش و آرائش سے سنوارا ہے۔ لیکن تیرے بغیر گذارنا مشکل ہے۔ اگر تجھے عشق ستاتا ہے تو آ اور دیوانہ بنا لے کیونکہ یہاں تیرا ہی راج ہے۔ تیرا لباس حسن ایسا عجیب ہے کہ اس کے ساتھ یہ عشوے تجھے زیب دیتے ہیں تو اپنے روپ کی وجہ سے شاہ خوباں ہے۔ اس لئے سب تجھے خراج عشق ادا کرتے ہیں جس وقت میں تیرے چہرے کا نور دیکھتا ہوں تو وہ ایک لمحہ میرے لئے سو برس کی عشرت کے برابر ہے

دوسری نظم میں کہتا ہے:

اے پیاری تو مجھ سے غرور نہ کر۔ جب یہ جوانی چلی جائے گی تو غمیدہ ہو جائے گی یقین جان کہ یہ بات دنیا میں مشہور ہے کہ ٹوٹے ہوئے موتی کا مول کم ہو جاتا ہے۔ جوانی اور جوبن اسی لئے ہے کہ اپنے سائیں کے لئے باعثِ عیش ہو۔ تو اپنے دل میں سائیں کی محبت قائم رکھ کیونکہ تیری ہی وجہ سے اس کا عیش ہے۔ جب تو عشوہ و ناز کے ساتھ سنگھار کر کے آتی ہے تو تیرے چہرے پر پسینے کی بوندیں اسی طرح بھلی معلوم ہوتی ہیں جس طرح پھول پر شبنم۔ تو اپنی شراب حسن سے سکھیوں کو فیضیاب کرتی ہے اور تمام خوبرویوں میں اپنا علم سرفرازی بلند رکھتی ہے۔

دوسری نظم میں یوں لکھا ہے:۔

اے پیاری تیرے بچھڑنے کی وجہ سے مجھے راتوں کو نیند نہیں آتی تجھے قدرت نے ایسا اچھا گھڑا ہے کہ تیرے بغیر مجھے ایک گھڑی بھی محبت نہیں بھاتی جو دل سے تیرا عاشق ہے اس کو رات اور دن کچھ بھی سجائی نہیں دیتا۔ تیری یاد کچھ اس طرح لگی ہوئی ہے کہ پھر کچھ بھی یاد نہیں آتا۔ تیرے بیمار محبت کا علاج لقمان بھی نہیں کر سکتا۔ جب تک تو اپنے ہونٹوں کا شربت نہ چکھائے گی تیرے عاشق کو کیونکر صحت ہوگی؟ یہ سچ ہے کہ تیرے ساتھ ایک رات رہنا میرے لئے سو راتوں کے برابر ہے۔ تو ہی کہہ کہ جب تو مجھے اپنے سیج پر نہ بلائے تو میں پھر کس کے سیج پر رہوں۔ تیری اس فرقت کی آگ میں میرا دل موم کی بتی کی طرح پگھل رہا ہے لیکن تو مصری کی طرح سخت اور گھٹ ہے اور خود کو ذرا بھی نہیں پگھلاتی تیری گفتار، تیز رفتار، تیرے تیور، طرح طرح کے ہیں تو جو کچھ برا بھلا کہنا چاہتی ہے کہہ دے لیکن مجھے نا امید نہ کر۔ تجھ کو خدا نے اتنی قدرت دے رکھی ہے۔ کہ قطب شاہ کو سمجھا سکتی ہے۔

ایک اور نظم میں لکھتا ہے:۔

اے پیاری تیرا بول مجھے سارے ڈالتا ہے: تیری ہر بات مجھے کٹاری نظر آتی ہے: تیری چوٹی ناگ کی طرح ہے جس کا زہر کڑوا ہوتا ہے تو کھیلتے وقت اپنی اس ناگ جیسی چوٹی کی وجہ سے سچ مچ سپیرا معلوم ہوتی ہے۔ میں بھنورے کی طرح تیرے اطراف پھر پھر کر تیری خوشبو لیتا ہوں کیونکہ اس خوشبو میں نرگس کی طرح خلد نہیں ہے۔ تیرے جسم سے صندل اور مشک کی خوشبو نکلتی رہتی ہے تو کانچ کی چوڑیاں پہنے ہوئی ہے اور ہاتھ میں اچھری باندھی ہے ٹھیکری اور کانچ میں وہ ہندوی گنوار کیا فرق کر سکتی ہے۔

پھر بگڑ کر لکھتا ہے۔

تیرے بول میں نمک نہیں اور تیرے ہونٹوں میں رس نہیں ہے۔
تیری چال کسی ہوتی نہیں ہے اور تیری چوٹی اندھیرا ہے۔

(۵)

محمد قلی کی بارہ پیاریوں میں ایک گوری بھی ہے۔ اس کی نسبت ایک نظم میں لکھتا ہے:۔

گوری کا چہرہ حسن کی وجہ سے اس قدر سہانا معلوم ہوتا ہے کہ اس چاند سے چہرے سے شرما کر خود چاند نقاب پوش ہو جاتا ہے۔ وہ سرو جیسا قد نہیں بلکہ ایک کندنی درخت ہے جس سے سورج جیسی

روشنی نکلتی ہے۔ اے گوری تو رنگ اور رس کے باغ کی کلی ہے اس لئے تیرے چہرے سے زندگانی کا پانی ٹپکتا ہے۔ تیرے رسیلے ہونٹوں میں شراب بھری ہے۔ یہ عاشقوں کے دل کو جلا کر کباب بنا دیتے ہیں۔

ان کو میں زلفیں کہوں یا تازہ سنبل، جو تیرے پھول جیسے چہرے پر اس طرح بکھرتی ہیں جیسے چاند پر ابر۔

تیری مستانہ چال سے ہاتھی شرماتے ہیں کیونکہ ان میں یہ ناز اور شوخی نہیں۔ اے قطب شاہ نبی کے صدقے میں تجھے گوری ملی ہے تو اس کے گلے میں بانہیں ڈال اور اس کے ساتھ شراب پی

دوسری نظم میں کہتا ہے:۔

گوری عشق کی ایک رنگیلی پتلی ہے جو تمام خوبرویوں میں چھبیلی نظر آتی ہے۔ تجھے پدمنیوں سے چہروں کی بزم آرائیاں زیب دیتی ہیں۔ کیونکہ تو چاند جیسی صورت رکھنے والیوں میں سب سے زیادہ رسیلی ہے۔ سولہ سنگار صرف تیرے جسم کی سج دھج کو دیکھ کر بنائے گئے ہیں کیونکہ تمام مہ جبینوں میں تو ہی سب سے زیادہ حسین ہے تیرے سر پر نور کا جلوہ برستا ہے۔ تیری جیسی سندر سہیلی اور کوئی نظر نہیں آتی۔ نبی کے صدقے میں قطب شاہ سے ایسی پیاری حسن کا پیالا پہن کر آئی۔

تیسری نظم میں کہتا ہے:۔

اے عشق کی پتلی تو میرے دل میں کھڑی ہوئی ہے اور عشق کی وجہ سے تجھے نور پہ رنگ گئے ہیں۔ اس پتلی کو عشق و محبت پہ ناز کرنا زیب دیتا ہے۔ وہ عشق بازی کے لئے کمر بند کر تیار اور جوبن کے پیالے اپنے ہاتھ میں لے کر کھڑی ہوئی ہے۔ اے پریم کی سہیلیو بتاؤ کہ پریم کے باغ میں یہ پیاری سجتی ہے کہ نہیں۔ اے گوری تیرے جسم پر سر تا قدم پھول ہی پھول ہیں۔ تو اپنی پرستش کرانے کے لئے کھڑی ہے تو مجھے عشق کی صحبتوں میں پیالہ پلا۔ مجھ پہ تیرے عشق کی بھٹی کی مستی چڑھی ہوئی ہے۔ نبی کے صدقے میں مجھے ایسی گوری ملی ہے کہ سورج اور مشتری جس کے عکس ہیں

اسی طرح بارہ پیاریوں میں سے ہر ایک پر کئی کئی نظمیں لکھی ہیں جو کلیات کے صفحات ۲۲۴ تا ۲۶۴ پر درج ہیں اور ان خاص پیاریوں کے علاوہ اور دوسری پیاریوں پر بھی اس کی نظمیں موجود ہیں جو کلیات کے صفحات ۲۶۵ تا ۲۸۱ پر شائع ہوئی ہیں۔

ان سب پیاریوں کی نظموں کے خاکے یا خلاصے پیش کرنا طوالت ہے اس لئے ہم یہاں اس کی صرف خاص خاص پیاریوں کے اسی کی نظموں سے اخذ کر کے نہایت مجمل الفاظ میں پیش کر دیتے ہیں

۱۔ **ننھی** بالاقد۔ چاند سا روشن چہرہ۔ چمکدار آنکھیں جسم میں ایک خاص خوشبو۔ ابتدا میں نہایت شرمیلی اور سیدھی سادی لڑکی تھی جو جلد عنفوان شباب کو پہنچ گئی۔ ملنے اور بات کرنے سے جھجکتی تھی۔ شراب سے نفرت کرتی تھی اور شراب کی صراحی اور پیالہ لینے اور پینے پلانے سے ہمیشہ بچتی تھی۔ آنکھوں میں کاجل لگاتی اور خط سرمہ کھینچتی تھی۔ مدن پھول کے رنگ کی ساری باندھتی جس کے کنارے عجیب و غریب موتی ٹنکے ہوتے۔ وہ بعد کو بڑی ہنس مکھ، ظریف، اور حاضر جواب ہو گئی تھی۔

۲۔ **سانولی**۔ بلند و بالا قد۔ دلفریب سانولا سلونا رنگ جس کی وجہ سے بہت نازک اور کومل معلوم ہوتی تھی۔ خوش آواز، خوش خرام۔ موتی کی طرح دانت۔ شوخ آنکھیں۔ زرق برق لباس پہننے والی۔ موتی کے رنگ کی نیم تنی زیب بر کرتی۔

۳۔ **کومل**۔ ایسی دبلی پتلی کہ ہوا سے ہلنے والی جسم کو شرم و ناز سے اتنا چرا رکھتی کہ کمر کے ہونے نہ ہونے کا شبہ ہوتا۔ دکنی مہ جبیں۔ کندنی رنگ۔ گلابی آنکھیں جو رنگین ڈوروں کی وجہ سے ہمیشہ خمار آلود نظر آتیں۔ چڑھی ہوئی بھوئیں یاقوت اور عقیق یمن کو شرمانے والے ہونٹ۔ چمکدار رخسار۔ نورتن جیسے دانت۔ سر تا پا زنگار رنگ اور چنچل۔ سبز آنچل اوڑھتی۔ بالوں کو پھولوں سے سجاتی بہت ہی ہوشیار۔

۴۔ **پیاری**۔ ہمیشہ روٹھنے اور بگڑنے والی۔ بہت ہی خوبصورت اور اپنے حسن پر مغرور۔ روشن چہرہ۔ جب بن سنور کر نکلتی تو چہرے پر پسینے کی بوندیں ایسی بھلی لگتیں جیسے پھول پر شبنم۔ تند مزاج اور تلخ گفتار کرنے والی۔ ناگ کی طرح سیاہ بل کھائی ہوئی لانبی چوٹی۔ خوشبودار جسم۔ کانچ کی چوڑیاں پہنتی اور ہاتھ میں اچھری باندھتی ہے۔ عشوہ طراز۔

۵۔ **گوری**۔ چاند سا چمکتا چہرہ۔ روشن پیشانی۔ پراگندہ زلفیں۔ رسیلے ہونٹ مستانہ چال۔ ابھرا ہوا سینہ۔ پتلی جیسا خوبصورت اور پھولا

کی طرح نرم و نازک اور شگفتہ جسم۔

۶ چمپیلی۔ رخسار پر تل۔ ژولیدہ زلفیں۔ شکاری آنکھیں۔ خط سرمہ کھنچا ہوا۔

۷۔ لالا۔ ہونٹوں میں آب حیات۔ گلابی پھولوں کی طرح دانت۔ سرپستان سے جوانی ٹپکتی ہوئی۔ مست کرنے والی چال ہنسی سے رات کو دن بنانے والی عشق و محبت کی پیاسی۔ غمزدۂ فراق۔

۸ لالن۔ نُقل جیسے ہونٹ ہنس جیسی چال۔ پھول کی کلی سے نازک کم عمر اور نادان۔

۹۔ موہن۔ جادو سے بھری ہوئی آنکھیں۔ عشوہ طراز اور گُن والی۔ چہرے پر عیش وصال کی کیفیت نمایاں۔ آنکھیں رات کی خماری سے متوالی۔ سہانی سبز ساری جس پر شفق کے رنگ کی کناری لگی ہوئی۔ محبت میں دیوانی۔

۱۰۔ محبوب۔ گلاب کے پھول ایسے گال۔ باریک کمر۔ زریں پٹکہ کسی ہوئی۔ یوسف سے زیادہ حسین۔

بارہ پیاریوں میں سے اور دو پیاریوں مشتری اور حیدر محل کا ذکر آئندہ تفصیل سے آئے گا۔

ان پیاریوں کے علاوہ محمد قلی نے متعدد نظمیں بھی لکھی ہیں جو اُس کی عیش و عشرت کی ترجمان ہیں۔ اور عشق عاشقی کی دلچسپ داستانوں کا کام دیتی ہیں۔ ان نظموں میں بعض بہت عریاں ہیں جن میں اُس نے وصال کے پُرکیف مرقعے پیش کئے ہیں اور بعض نظمیں جوانی کی راتوں اور رمرادوں کے دنوں کے تفصیلی اور دلچسپ بیان ہیں حسن و عشق کے راز و نیاز کا شاید ہی کوئی موضوع ہو جو چھوٹ گیا۔ شباب کی رنگا رنگیوں اور جذبات کی جولانیوں کے اظہار میں اس کا قلم غیر معمولی قدرت رکھتا تھا۔ اور یہ قدرت تخیلی یا فرضی عشق عاشقی سے نہیں پیدا ہو سکتی۔ محمد قلی صحیح معنوں میں اس میدان کا مرد تھا۔ اس کے رفیع الشان محل نہ تھے بلکہ اصل میں بین قومی حسن و نغمہ کی وسیع اور آراستہ و پیراستہ نمائش گاہیں تھیں۔ ان میں کئی ملکوں، کئی مذہبوں اور ہر وضع و قطع کی نازنینیں آزادی اور بے تکلفی کے ساتھ اپنے حسن و جمال کی آرائش و زیبائش میں مصروف و منہمک اور عشق و مستی کی عجیب و غریب کیفیتوں اور جوانی و رعنائی بے پناہ جذبات کے مظاہرے کرتی رہتی تھیں۔

"سب رس" **سیّد محیّ الدین** قادری زورؔ

رسالہ "ایشیا" امیر گڈھ (سہ ماہی)

پنڈت جواہر لال نہرو کی نظر میں!

ایڈیٹر۔ ساغر نظامی

(ماہنامہ "ایشیا" (سہ ماہی) کے لئے میری بہترین دعائیں قبول فرمایئے۔ مجھے یہ معلوم کرکے مسرت ہوئی کہ ایسے میگزین اردو شائع کئے جارہے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ رسالہ "ایشیا" اس عظیم الشان برّاعظم کے اہم مسائل کے علم و وقوف کی اشاعت میں مدد دے گا۔ اور ان مسائل کے باہمی ربط و تعلق کو واضح کرے گا۔ کیونکہ انجام کار یہ مسائل ایک بہت وسیع مسئلہ کا جزو ہیں۔

خود ہمارے ملک میں اس مسئلہ کا اہم پہلو یہ ہے۔ کہ ملک کو آزادی حاصل ہو اور عوام سے جو ناجائز فائدہ اُٹھایا جا رہا ہے۔ اُس کو دور کیا جائے۔ میں اُمید کرتا ہوں کہ رسالہ "ایشیا" اس مقصد کی تکمیل کا حامی ہے۔

جواہر لال نہرو

۲۰ ستمبر ۱۹۳۶ء الہ آباد

سالانہ چندہ ۵ روپے جلد۔ مجلدے ۶ فی نمبر ۱۲ علاوہ محصول محصول ۱۲

پتہ۔ دفتر رسالہ "ایشیا" (سہ ماہی)، ادبی مرکز، میرٹھ (یوپی)

THE ADABI-DUNYA

ادبی دنیا

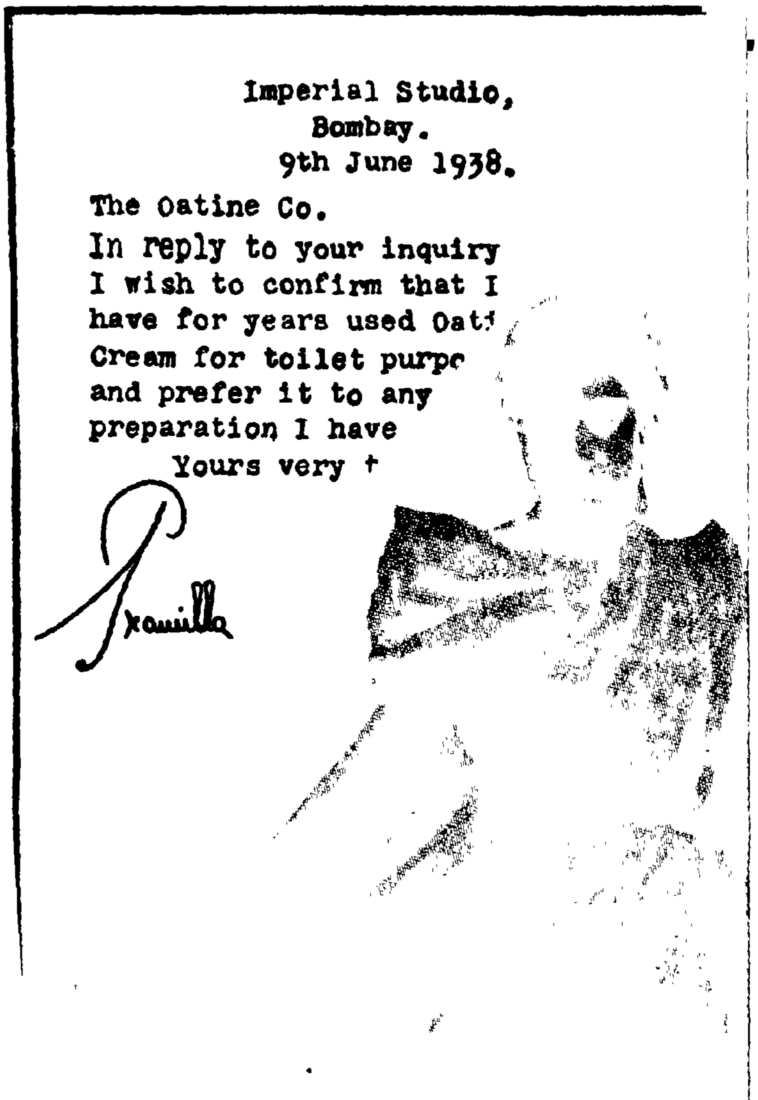
17(11)

OVEMBER 1939

INDIA'S PREMIER MAGAZINE

Price As. 6

اوٹین کریم اور سنو



فلم اور سٹیج کے درخشاں ستاروں کے رنگ و روپ کو پائدار بنانے کے لئے بہت احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے اس کے لئے اعصاب اور پٹھوں کی صفائی پرورش کے لئے خوراک اور زندگی بخش طریقوں کی ضرورت ہوتی ہے۔

اوٹین کریم اس بلند معیار کی تمام حاجتوں کو پورا کرتی ہے۔

یہ مسام سے فالتو مواد کو خارج کرتی ہے ان کے بند ہو جانے کو روکتی ہے اور اس طرح جلد کو ہوا سے پورا فائدہ اٹھانے کا موقع دیتی ہے اس سے جلد کی دونوں طرف کے سوراخوں کی پرورش ہوتی ہے جلد کے نیچے خون کے جو ننھے ننھے ذرے موجود ہوتے ہیں اس سے وہ تازہ ہو جاتے ہیں اور خون کی گردش صحت کے صحیح اصولوں کے مطابق ہوتی ہے اور رنگ و روپ میں جوانی کی تازگی لوٹ آتی ہے۔

ہر روز سوتے وقت اوٹین کریم کی مالش سے چہرے اور گردن کے اعصاب زور حاصل کرتے ہیں، یہ کریم جلد کو ڈھیلا ہونے یا اس پر جھریاں پڑنے سے بچاتی ہے اور بہت آسانی سے قدرتی طور پر نیند کے دوران میں آپ کے حسن میں ایک نئی زندگی لاتی ہے۔

دن کے وقت اوٹین سنو کے استعمال سے ایک ٹھنڈک پہنچتی ہے اور حسن کو دن بھر دھوپ، ہوا، گرد اور پسینے سے محفوظ رکھتی۔

خوبصورتی کو بڑھانے اور قایم رکھنے کے لئے صرف ان دو چیزوں کی ہی ضرورت ہے

فہرست مضامین ادبی دنیا لاہور

بابت ماہ نومبر ۱۹۳۹ء

جلد ۱۷ نمبر ۱۱

تصاویر:- ۱- جنگ ۲- اب تک اثر خواب ہے معلوم نہیں کیوں!

سالانہ چندہ مع محصول ڈاک اور وی پی یا پانچ روپے ہر ایک خاص پرچہ [illegible]

(... پرنٹر و پبلشر ... اردو دفتر ادبی دنیا ... روڈ لاہور سے شائع ہوا)

دنیائے کاروبار

سرکاری ملازمت گورنمنٹ میسور میں ہریجن گریجویٹ کیلئے خاص مواقع و مراعات

تجارتی تعلیم کی تسہیل

مسٹر سبرمنیا ایکر نے جن کو تجارتی تعلیم کا شہید مند کا مربی و سرپرست کہا جاتا ہے۔ تقریب سنگ بنیاد انجمن مختصر نویسی ریاست میسور بے ساختہ کہا کہ صنعتی تجارتی تعلیم کی ترقی میں ریاست میسور نے مدراس کے مقابلہ میں کہیں زیادہ اقدام کیا ہے اس لئے کہ میسور گورنمنٹ سرکاری ادارہ تجارت دکامرس کو ہنوز قائم رکھ کر چلا رہی ہے۔ چنانچہ اس کی توسیع کی ایک مثال یہ ہے کہ ماہ اگست ۱۹۳۹ء قصبہ شیموگہ کو بھی تجارتی امتحانات کے لئے دو سال تک ایک مرکز بنا دیا گیا۔

اقوام ہریجن کی ترقی کے سلسلہ میں گورنمنٹ میسور کی مجوزہ پالیسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ گورنمنٹ نے یہ احکام نافذ فرمائے ہیں کہ سرکاری ملازمت میں ہریجن اقوام کے گریجویٹس کے ساتھ خاص رعایت کی جائے۔ اسی بنا پر کہ پس ماندہ اقوام کے گریجو ایٹس کو ماتحت سرکاری ملازمتوں کے قبول کر لینے میں رغبت و رضامندی ہو۔ گورنمنٹ میسور نے یہ حکم صادر فرمایا ہے کہ تقرریات کی قسم بندی کی اغراض کو ملحوظ رکھتے ہوئے ابتدائی مشاہرہ میں بالاوسط بیتالیس (۴۲) روپے ماہوار کا اضافہ کر دیا جائے۔

جان بیمہ

کی طرف گورنمنٹ میسور کی ایک خاص تحریک و توجہ

جان بیمہ کے دستاویز پالیسی داخل کر دینے پر مستدعیہ زر قرضہ میں آزادی

میسور گورنمنٹ لائف انشورنس کمیٹی کے چوتھے سہ ماہی جلسہ کی روئداد سے جن عجیب موثر تغیرات کا اظہار ہوتا ہے کہ جو کمپنی مذکور کی شارع عامہ نے اپنی کارروائی کے سلسلہ میں انجام دی ہیں چنانچہ یہ تجویز ہوا کہ بیمہ کی پالیسی داخل کر کے اگر قرضہ طلب کیا جائے تو شارع عامہ کی پالیسی کی کفالت پر دیا جا سکتا ہے تو اسمیں لحاظ مالیت پالیسی داخل شدہ نوے فی صدی تک اضافہ کیا جائے گا

ایک دوسرا مسئلہ یہ زیر غور لایا گیا کہ تحت مقاصد انجمن پالیسی اسکیم یہ تجویز منظور کی جائے کہ جان بیمہ کی عمر مقررہ منقضی ہو جانے پر اگر بیمہ کرانے والا زندہ و سلامت رہا تو اس کے حین حیات ساتھ وظیفہ کی ادائی کا سلسلہ برابر جاری رہے لیکن بحث مباحثہ سے جب یہ پایا گیا کہ باشندگان ہندوستان کی کبرسنی میں جو اموات واقع ہوتی ہیں انکی تاریخوں کی صحیح اطلاعات و معلومات بہم نہیں پہنچتیں۔ اسلئے تجویز منظور نہ ہوئی تاہم قواعد انجمن پالیسی میں جان بیمہ کرنے والوں کے موافق مناسب ترمیم کر دی گئی ہے ایک مزید و مفید دستور جدید یہ طے پایا کہ آئندہ سے اصل پالیسی کے داخل کر دینے پر ادائی رقم واجب الادا کیلئے اصل پالیسی پر تصدیق ظہری کر دی جایا کرے بجائے اس کے کہ ایک علیحدہ دستاویز مرتب ہو کر جاری کیا جائے۔

(پبلسٹی آفیسر گورنمنٹ میسور۔ بنگلور)

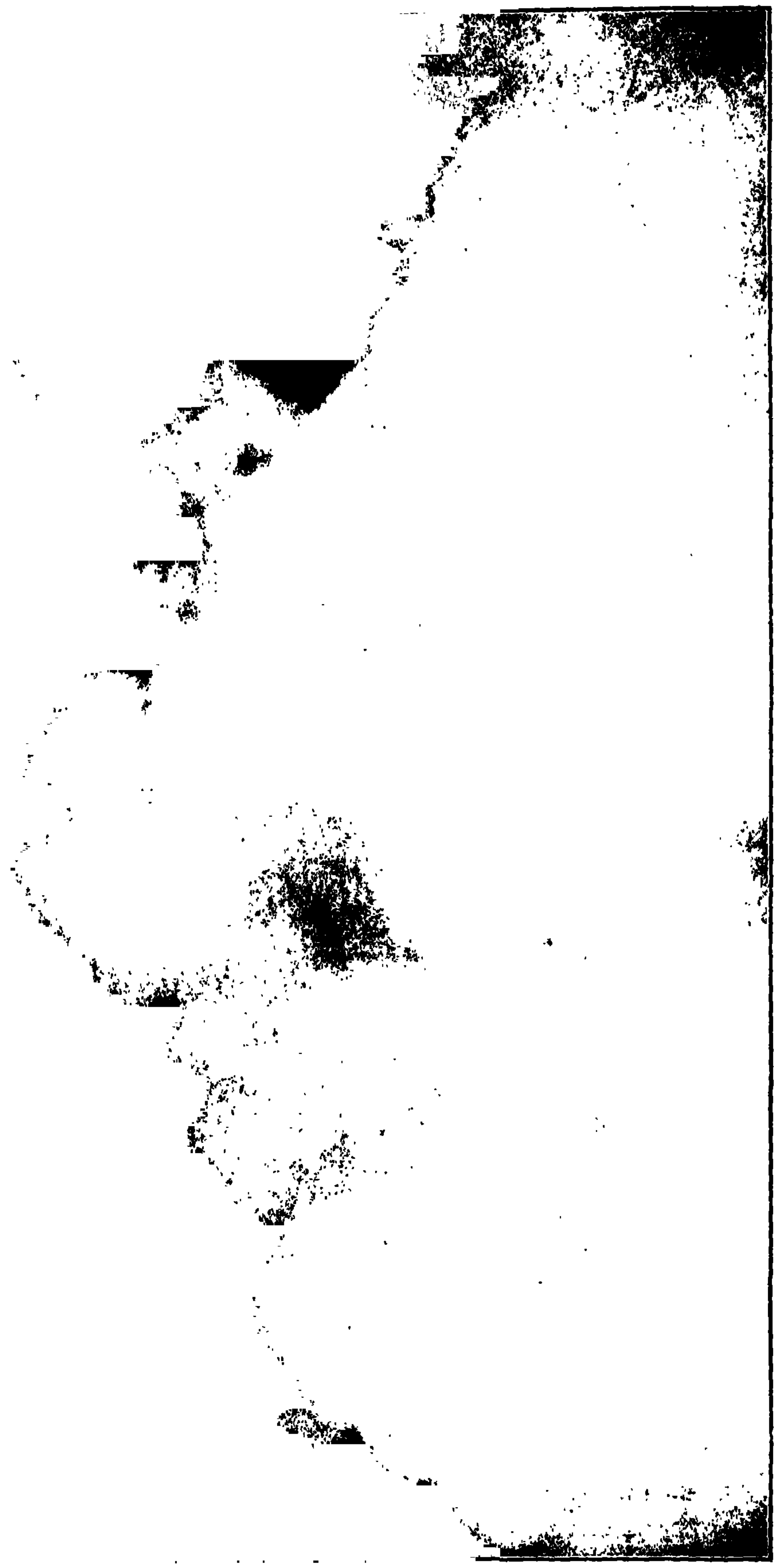
متفقہ آواز

بنی آدم کے خیرخواہوں نے کبھی بھی نشہ آور چیزوں کی عادت ڈالنے کی ترغیب نہیں دی۔ ان نیک خیال لوگوں نے جہاں اس بات کو روکنے کی کوشش کی ہے اسکے ساتھ اس امر کو خیال میں نہیں لائے کہ فوراً اس عادت کو روک دینے سے اس کا کتنا برا اثر طبیعت پر پڑتا ہے۔ بخلاف اس کے ماہرین سائنس اور روحانی علم کے جاننے والے نے ہمیشہ اس بات کو پیش نظر رکھا ہے کہ موجودہ نظام سوسائٹی میں کن بہتر طریقوں پر اس مسئلہ کو حل کیا جا سکتا ہے ان ہر دو کا متفقہ خیال ہے کہ انسان کا معیار چال چلن اعلیٰ ہو۔

ہندوستان کی طرف نظر دوڑائیے جبکہ نشہ آور چیزوں کی روک تھام کی جا رہی ہے انکی جگہ چائے کا استعمال انسان کی جسمانی اور روحانی قوتوں کی راستگی پر اچھا اثر کریگا۔ یورپ کے لوگوں کو اس سے جو فائدہ پہنچا ہے ہندوستان کے لوگ بھی آج وہی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اس ملک کے مزدور پیشہ لوگوں کو دیکھئے کسان میں سے اکثر تو اتنا کماتے ہیں کہ بمشکل وہ بال بچوں کا پیٹ بھر سکتے ہیں۔ ان کی حالت بھیک منگوں کی طرح ہے۔ ان کی لاعلمی اور غلط خیالات کی وجہ سے وہ اپنی اس محنت کی کمائی کے روپے کو دیسی شراب اور تاڑی پر صرف کرتے ہیں۔ اس حالت سے ان کو کیا چیز نجات دے سکتی ہے۔ انہیں تعلیم کی ضرورت ہے ان کی زندگی اور معاشرتی معیار کے بلند کرنے کی ضرورت ہے لیکن اس میں وقت لگے گا اس درمیان انکی تاڑی اور شراب پینے کی عادت کو چھڑانے کیلئے ایک صورت ہے کہ چائے پی جائے۔ یہ بے ضرر اور بے نشہ پینے کی چیز ہے جو بدن میں جوش پیدا کرتی ہے اور تر و تازگی بخشتی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ اس کے استعمال سے تمام لوگوں کا مقصد پورا ہو جائیگا۔ اس خیال کو غور کرتے ہوئے کہ آج کل چائے لوگوں پر کتنا زیادہ اثر رکھتی ہے کلکتہ کے ایک مشہور روزنامہ اخبار کے ایڈیٹر نے کوئی بائیس برس ہوئے لکھا تھا۔

"یہ بات خیال میں نہیں لائی جا سکتی ہے کہ جو قومیں چائے پیتی ہیں وہ کبھی بھی کسی نشے کے پینے کی چیز کی طرف رجوع ہوں اور یہ ممکنات میں سے ہے کہ مستقبل میں چائے پینے والوں کی تعداد بہت بڑھ جائے گی۔ جیسا کہ لوگوں کی موجودہ خواہش ہے اور ان لوگوں کی جن کو دنیا کی بہبودی مد نظر ہے"

چند ماہ ہوئے، مدراس کے وزیر اعظم نے شراب خوری کی روک تھام کے بارے میں بیان کیا ہے کہ یہ غریبوں کی آزادی کا پیغام ہے۔ ایسی نئی آزادی کے آثار کا اس سے پتہ چلتا ہے کہ چائے کس تیزی کے ساتھ ہندوستان کے غریب لوگوں میں پھیل رہی ہے۔



جنگ



اب تک اثرِ خواب ہے، معلوم نہیں کیوں؟

بزمِ ادب

ادبی دنیا کا اگلا نمبر سالنامہ ہوگا جو ۱۵ر دسمبر تک شائع ہو جائے گا اور ۱۶ر سے ناظرین کی خدمت میں روانہ ہونا شروع ہو جائے گا۔ ادبی دنیا کے عام نمبر بھی ڈاک خانے میں بہت بڑی تعداد میں ضائع ہو جاتے ہیں، سالنامہ تو پھر سالنامہ ہے۔ اس لئے ہر پرچہ رجسٹری کے ذریعہ ارسال ہوگا چونکہ ڈاک خانہ رجسٹریوں کی ایک محدود تعداد ہی ہر روز لے سکتا ہے اس لئے اس بارے میں ذرا صبر سے کام لینا ہوگا۔ توقع ہے کہ شائع ہونے کے دو ہفتے کے اندر سالنامہ ہر خریدار کو پہنچ جائے گا۔

سالنامہ میں اب کے کیا کچھ ہوگا۔ اس کے متعلق کوئی بلند بانگ دعوے کرنا غیر موزوں سی بات ہے۔ جن ناظرین نے ادبی دنیا کے گذشتہ سالنامے دیکھے ہیں، انہوں نے ہمیشہ یہ محسوس کیا ہے کہ ہر نیا سالنامہ اپنے پیشرو سے کچھ بہتر ہی ہوتا ہے۔ اس لئے اگر خدا کا فضل شاملِ حال رہا تو ہماری یہ پیشکش بھی ادبی دنیا کی روایات کے مطابق ہوگی اور کاغذ اور بلاک سازی کے بڑھے ہوئے نرخوں کے باوجود ہم انشاء اللہ اس کا وہ بلند معیار برقرار رکھنے کی پوری کوشش کریں گے جو ہمارے معاونین کی امداد اور ناظرین کی حوصلہ افزائی سے قائم ہو چکا ہے:

افسانوں اور ڈراموں کا حصہ اب کے خاص طور پر اچھا ہوگا۔ ادبی دنیا کے قدیم کرمفرماؤں کے علاوہ کچھ نئے افسانہ نگار بھی اس دفعہ ہماری محفل میں شریک ہو رہے ہیں۔ مثلاً جہاں کرشن چندر، فیاض محمود۔ وقار انبالوی، عظیم بیگ چغتائی، ل۔ احمد، اپندر ناتھ اشک، راجندر سنگھ بیدی، خلیل ہمدانی، ممتاز مفتی، فاروق علی خاں، آسی رام نگری۔ ایم ایم بقایا، اختر انصاری، طاہر قریشی، شبیر محمد اختر، نذیر مرغوب، مجید لشاری اور چندر مجوشن سنگھ کے بہترین افسانے اور ڈرامے آپ کے پیش نظر ہوں گے، وہاں محترمہ عصمت چغتائی، دھرم پرکاش آنند، علی عباس جلالپوری، اشرف صبوحی، اور انور اعجاز قیصر کے شاہکار بھی سالنامے کی زینت ہوں گے: ناظرین سے یہ بات پوشیدہ نہیں کہ ہمارے قلمی معاونین میں ہر سال کچھ نئے ادیب شامل ہوتے ہیں۔ جن کی آمد سے ادبی دنیا کے قالب میں نئی زندگی کا خون دوڑنے لگتا ہے اور ہمارے لئے یہ امر بھی فخر و مسرت کا موجب ہے کہ ادبی دنیا نے دنیائے ادب میں متعدد ایسے ادیبوں کا تعارف کرایا جو بعد میں افسانہ نویسی اور مضمون نگاری کے آسمان پر آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے۔ اور پھر ملک بھر کے رسائل میں اُن کے مضامین کی مانگ ہوگئی۔

علمی اور ادبی مضامین کے سلسلے میں اسی قدر کہنا ہے کہ جن بلند پایہ ادیبوں کے مضامین دفتر میں آچکے ہیں اُن میں سے فی الحال ہم صرف پروفیسر براس، نور الحسن ہاشمی، سید شہنشاہ حسین، بسنت سہلئے، اور ابومسلم صدیقی جیسے اہلِ قلم کا ذکر کر سکتے ہیں۔

ان کے علاوہ پروفیسر حمید احمد خاں، شاہد احمد صاحب مدیر ساقی، مختار الدین صاحب آرزو۔ عطاء اللہ صاحب کلیم، مراتب علی نائب، پروفیسر ظہیر الدین احمد اور رفیق میراجی۔ چند ایسے دلچسپ اور اہم مضامین تیار کر رہے ہیں، جو بلند پایہ ادبیات میں ایک خاص درجہ رکھیں گے۔ غالب کے متعلق حمید احمد خاں صاحب کا وہ معرکۃ الآرا مضمون جس کی داغ بیل انہوں نے پچھلے سال رکھی تھی۔ اس سال نظر افروز ہو کر غالبیات کے سلسلے میں ایک بیش بہا حلقے کا اضافہ کرے گا۔ ظہیر الدین احمد اردو کے اس شاعر پر جس سے کبھی انصاف نہیں کیا گیا یعنی نظیر اکبر آبادی پر ایک لطیف اور سیر حاصل بحث سپردِ قلم فرما رہے ہیں۔ باقی مضامین کے عنوان ہم آپ کو ابھی نہیں بتلاتے ؎

قیاس کن زِ گلستانِ من بہارِ مرا

حصۂ نظم حسبِ معمول نہایت شاندار اور کیف آفریں ہوگا۔ ہمارے سحر نگار شاعروں میں سے ساغر نظامی، حفیظ جالندھری، اثر صہبائی، اختر شیرانی، عبدالحمید عدم، کشفی ملتانی، ابن حزیں، احمد ندیم قاسمی، سید احمد حسین امجد، آزاد انصاری، حفیظ ہوشیارپوری، سید علی منظور، روشن دین تنویر، اسد ملتانی، تاجور سامری، فراق گورکھپوری، محمد حسین عرشی، مسعود شاہد، علی احمد، ظفر تاباں، سعید احمد اعجاز، اصغر حسین خاں نظیر،

عباس بیگ محشر، قیوم نظر، مراتب علی تائب، سکندر علی وجد، باقی صدیقی، تابش صدیقی، اندرجیت شرما اور بہت سے اور گراں پایہ سخنوروں کے نتائجِ طبع آپ کے ذوقِ شعر و ادب کی تسکین کا سامان بہم پہنچائیں گے۔

اور ان سب کے علاوہ ہماری بزم میں چند ایسے ممتاز ادیب اور شاعر بھی شامل ہوں گے جن کے مضامین نظم و نثر کے متعلق ابھی کوئی یقینی اعلان نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن ہم ناظرین کو اتنا بتائے دیتے ہیں کہ ہماری آستین میں ابھی بہت سے "دشنے" پنہاں ہیں۔

تصاویر کے لحاظ سے بھی یہ سالنامہ کچھ کم جاذبِ نظر نہیں ہوگا ہمارے ملک کے عدیم النظیر مصور عبدالرحمٰن چغتائی اس دفعہ بھی ایک شاہکار عنایت فرما رہے ہیں۔ جو سالنامے کو چار چاند لگا دے گا۔ پچھلے برس ایشور سنگھ صاحب کی "موجِ رقصاں" بہت مقبول ہوئی تھی، وہ اس دفعہ ایک اس سے بھی اچھی تصویر بنا رہے ہیں۔ سرورق حسبِ معمول ہمارے دوست سید سرفراز تیار کر رہے ہیں۔ ان کی مہارتِ فن کسی تعارف کی محتاج نہیں ہیں امید ہے کہ ان کی اس دفعہ کی کوشش اُن کے تمام پچھلے کارناموں پر سبقت لے جائے گی۔

آج سے تقریباً ایک ماہ بعد سالنامہ آپ کے ہاتھوں میں ہوگا اور حسین نگار کی ہم آج صرف ایک جھلک آپ کو دکھا سکے ہیں۔ وہ اپنی تمام رعنائیوں اور دلفریبیوں کے ساتھ آپ کو دعوتِ نظارہ دے رہا ہوگا۔

گذشتہ ماہ میں ادبی دنیا اور اس کے معاونین کے حلقے میں تین الم ناک حادثے ہوئے۔ یعنی ہمارے کرم دوست مہر لال صاحب ضیا فتح آبادی کی ہمشیرہ محترمہ، ہمارے کرمفرما منشی پیارے لال صاحب شاکر میرٹھی کی نوجوان صاحبزادی، اور ہمارے رفیق میراجی کا نوجوان بھائی داعیِ اجل کو لبیک کہہ گئے۔ آخر الذکر نوجوان کی موت جل کر مرنے سے ہوئی وہ بازار میں سے گذر رہے تھے کہ ایک روغن پکانے والے کی مجرمانہ بے احتیاطی سے روغن اُن پر اُچھل کر پڑا اور وہ چند دن اسی حادثے کی اذیتوں میں مبتلا رہ کر اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔

ہمیں ان تینوں صاحبوں اور ان کے اعزہ سے دلی ہمدردی ہے اور ہماری دعا ہے کہ خداوند تعالیٰ مرنے والوں کو ابدی راحت اور سکون عطا فرمائے۔

سالنامے کے انعامات کے سلسلے میں ادارہ ادبی دنیا حسبِ معمول بہترین افسانوں نظموں اور مضامین کے لئے نقد ہدیے پیش کرے گا جن کی مجموعی مالیت ایک سو روپے ہوگی، اور ہمارے کرم دوست عطاءاللہ صاحب کلیم ایم اے۔ اسسٹنٹ کنٹرولر ملٹری اکاؤنٹس حسبِ معمول سالنامے کے بہترین مضمون کے لئے منصور گولڈ میڈل سیریز کا تیسرا تمغہ عطا فرمائیں گے۔

صلاح الدین احمد

اس ماہ کے ہدیے

اپندر ناتھ اشک	(قفس)	دس روپے
رہبر بی اے	(خوانچے والا)	سات روپے
مظفر احمد	(کلکتہ کا جو ذکر کیا تو نے ہمنشیں)	دس روپے
اشرف صبوحی	(جنگ)	دس روپے

قطعہ

چپ چاپ سرِ دست نہ تنکوں سے جلا لاؤں گا
چھپ چھپ کے سرِ دشت صدف میں گہر لاؤں گا
روتے ہوئے اے وحشتِ ترتیب بہت
وہ سب سرِ بیت دریا کی خبر لاؤں گا

باقی صدیقی

آئینۂ عالم

چین ترقی کی شاہراہ پر

چین کی اصلاحات کا دور ۱۹۲۷ء سے شروع ہوتا ہے۔ مغربی ممالک سے رابطۂ اتحاد قائم ہوتے ہی چین میں بھی سیاسی بیداری کی ایک عام لہر دوڑتی ہوئی نظر آنے لگی۔ جب چینی طلبا یورپ کی یونیورسٹیوں سے فارغ التحصیل ہو کر اپنے وطن میں واپس آئے تو انہوں نے اپنی دنیا کو مغربی ممالک سے بالکل علیحدہ پایا۔ یہاں نہ تو مغرب کی روشنی علم و ہنر انہیں دکھائی دی اور نہ صنعت و حرفت کی ترقی۔ اس کے علاوہ جس چیز کو انہوں نے بہت زیادہ محسوس کیا۔ وہ شہنشاہیت اور ملوکیت کا آہنی پنجہ تھا جو ابھی تک انہیں اپنی مضبوط گرفت میں تھامے ہوئے تھا۔ آخر ۱۹۲۸ء میں چین میں وہ انقلاب رونما ہوا جس کا خوشگوار نتیجہ ہم آج زندہ چین کی صورت میں دیکھ رہے ہیں۔ نئی حکومت نے جو قومی حکومت کے نام سے موسوم ہوئی پیکن کی بجائے نانکن کو اپنا دارالسلطنت منتخب کیا اور قومی تعمیر کے پروگرام پر عمل شروع کر دیا۔ سب سے پہلے جس مسئلے نے اُن کی توجہ اپنی طرف کھینچی وہ ملک میں امن و امان کا قیام تھا۔ چونکہ جمہوریت قائم ہوئے ابھی زیادہ عرصہ نہ گذرا تھا اس لئے قدیم جنگی امراء مختلف مقامات پر سر اٹھا رہے تھے۔ ان کے علاوہ اشتراکی بھی بغاوتیں پھیلا رہے تھے کیونکہ انقلاب بہت بڑی حد تک انہی کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔ لیکن نئی حکومت میں انہیں کوئی حصہ نہیں ملا تھا۔ اس لئے جب تک حکومت ملک میں امن قائم نہ کر لیتی اصلاحات کی طرف متوجہ ہونا ناممکن تھا۔

جنرل چیانگ کائی شک اور سن یٹ سن کے دوسرے ساتھی بہت عرصہ تک بغاوتوں کو فرو کرنے میں لگے رہے اور دشمنوں کو شکست دینے کے لئے انہیں جہاں حربی طریقے اختیار کرنا پڑے۔ وہاں معاشرتی اور اقتصادی طریقوں کے استعمال سے بھی وہ غافل نہ رہے۔ حکومت چین نے مغربی یونیورسٹیوں سے تعلیم یافتہ طبقے کو اپنی طرف کھینچا اور فوجوں کو بغاوتیں دبانے میں لگا کر انہیں ملکی اصلاحات کی طرف متوجہ کیا۔

جنرل چیانگ کائی شک کی دلی تمنا تھی کہ چین متحد ہو جائے اور وہ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے میدان میں آ چکا تھا۔

حکومت نے سب سے پہلے اپنی توجہ سڑکوں کی تعمیر کی طرف کی۔ چین میں ایسے ذرائع آمد و رفت بہت کم تھے۔ جن سے وقت کی بچت بھی ہوتی اور ہر روز کی تعمیر سے بھی چھٹکارا نصیب ہوتا۔ ملک میں پختہ سڑکیں بننا اس لئے بھی ضروری تھیں کہ ان سے اُن فوجوں کی نقل و حرکت میں آسانی پیدا ہو سکتی تھی جو باغیوں کی سرکوبی کے لئے جاتی تھیں۔ حکومت نے اس مقصد کے لئے غیر ملکی انجنیئروں کی امداد حاصل کی اور ان کی رہنمائی میں سڑکوں کی تعمیر کا کام شروع کر دیا اور یہ کام کچھ اس قدر اہم سمجھ کر شروع کیا گیا کہ اس سے جن لوگوں کو نقصان پہنچا ان کی امداد بھی نہ کی گئی۔ ایک تو لوگوں کو پکڑ پکڑ کر ان سے بیگار کے طور پر کام لیا گیا اور دوسرے جس کسان کا کھیت سڑک کے طیار شدہ نقشے کے مطابق راستے میں حائل ہوتا اس پر حکومت قبضہ کر لیتی اور مالک کو اس کے صلے میں کوئی معاوضہ بھی ادا نہ کیا جاتا۔ اس طرح حکومت جاپان کے حملے سے پہلے ۰۰۰۰ ۱۰ کلو میٹر سڑکیں طیار ہو چکی تھیں۔ اس سے پہلے سارے چین میں صرف ۰۰۰ ۵ کلو میٹر کی ایسی سڑکیں تھیں جن پر موٹر کے ذریعے سفر کیا جا سکتا تھا۔ اب شنگھائی سے لے کر تبت تک موٹر کے ذریعے سفر کیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ شمال مغربی علاقے میں بھی کئی سڑکیں بن گئی ہیں اور آمد و رفت میں اتنی آسانی پیدا ہو گئی ہے کہ پہلے جو مسافت ایک ماہ میں طے ہوتی تھی اب چار دن میں طے ہو سکتی ہے اور یہ سب کچھ جاپان کے

حملے سے پہلے ہو چکا تھا۔

سڑکوں کی تعمیر کا سلسلہ تو جمہوریت کی ابتدا سے شروع ہوا اور مجبوراً جنگ کی وجہ سے رُک گیا۔ حکومت جس جس علاقے میں بغاوتوں کو فرو کرتی جاتی تھی۔ اُس علاقے میں پولیس اور فوج کو انتظام کے لئے مقرر کرتی جاتی تھی تاکہ بعد میں امن وامان برقرار رکھنے کی کوششیں جاری رہیں لیکن پولیس کے فرائض کی بہتر انجام دہی کے لئے ضروری تھا کہ اس کے نظام کو درست کیا جائے چنانچہ اس طرف بھی توجہ کی گئی۔ چین میں پہلے جو نظام تھا اسے "پو اچیا" کہتے تھے جس کی رو سے دس سے لے کر ایک سو گھروں تک کے آدمی اپنے سردار چن لیتے تھے جو اپنے علاقے میں انتظام کرتے اور امن قائم رکھنے کے ذمہ دار ہوتے تھے۔ اور ان کا فرض ہوتا تھا کہ حکومت اگر کسی مجرم کو پکڑنا چاہے تو وہ اُسے حکومت کے حوالے کر دیں یا آئندہ کے لئے ان کی نیک چلنی کی ذمہ داری لیں۔ فوج اس نظام کے جمہوری پہلو کو اچھا نہیں سمجھتی تھی وہ یہ چاہتی تھی کہ حکومت مقامی سرداروں کو جو کچھ حکم دے وہ اسے چون وچرا کے بغیر تسلیم کر لیا کریں۔ نیز وہ اپنی تنظیم اس طور پر کریں کہ جنگ کے موقع پر ملک کی حفاظت کے لئے بھی اُن سے امداد لی جا سکے۔ گویا فوج اس طرح ایک ریزرو فوج کی بنیاد رکھ رہی تھی جو ملک کے لئے آگے چل کر مفید ہو۔ مقامی سرداروں اور اُن کی کمیٹیوں نے فوج کے اس مشورے کو مان لیا۔ اب اُن کی حیثیت ایک فوج کی سی ہو گئی اور وہ براہِ راست فوجی حکام کے ماتحت آ گئے۔

پھر کسانوں کی کیفیت کا جائزہ لیا گیا۔ اُن کی حالت بہت بری ہو رہی تھی جس کی وجہ صرف یہی تھی کہ ملک ابھی تک زراعت کے جدید اصولوں سے بے خبر تھا اور زمین کی آمدنی سے خرچ زیادہ ہو رہا تھا اور کسان قرضے کے بوجھ کے نیچے دبے چلے جا رہے تھے۔ حکومت نے اُن کے ٹیکسوں کو ہلکا کیا اور انہیں بتایا کہ زمین کو کس طرح زرخیز کیا جا سکتا ہے اور کس طرح بہتر فصلیں حاصل ہو سکتی ہیں۔ یہ اصول ان کے ذہن نشین کرا کے حکومت نے اُن کے قرضے کے بوجھ کو ہلکا کرنے کے لئے ملک میں قرضہ دینے والی سوسائٹیاں بنائیں جو امداد باہمی کے اصول پر چلتی تھیں اور کسانوں کی امداد اُن کا پہلا فرض تھا۔ کسان ان سوسائٹیوں سے نہایت کم سود پر قرضہ لے سکتے تھے۔ حکومت کا یہ اقدام لوگوں میں اتنا مقبول ہوا کہ تھوڑے ہی عرصے میں اس تحریک نے بہت ترقی کر لی۔ ۱۹۳۳ء میں ان سوسائٹیوں کی تعداد ۵۰۰۰ تھی اور چند ماہ کے اندر اندر یہ تعداد ۵۰۰۰ تک پہنچ گئی لیکن حکومت کسانوں کے لئے اس سے زیادہ کچھ نہ کر سکی۔ وہ نہ تو اپنی خواہش کے مطابق محصولات میں کمی کرنے میں کامیاب ہو سکی اور نہ اجرتوں کی کم از کم شرح مقرر کرنے میں۔ کیونکہ فوجی گروہ کو بغاوتوں کو فرو کرنے کے لئے روپے کی ضرورت تھی اور اگر زراعت کے محصول کم کر دئے جاتے تو خزانے میں رقم کہاں سے آتی اور جنگیں کیونکر جاری رکھی جاتیں۔ اگرچہ حکومت چاہتی تھی کہ کسانوں کی ہر تکلیف کا مناسب علاج کر دیا جائے لیکن بعض موقعوں پر حالات سے مجبور ہو کر وہ ایسا نہ کر سکی جنرل چیانگ کائی شک کی تو یہ پالیسی تھی کہ چین میں کوئی شخص ایسا باقی نہ رہے جس کے پاس کاشت کے لئے زمین نہ ہو لیکن یہ مسئلہ کسانوں کی آرزوؤں کے مطابق حل نہ ہوا۔ ہاں! اس کی بجائے ملک میں ایک مضبوط اور مستقل حکومت قائم ہو گئی جس کے سائے میں رعایا اب امرا کے مظالم اور چیرہ دستیوں سے محفوظ تھی۔

۱۹۳۱ء میں چین میں چند مغربی تعلیم یافتہ ماہرینِ اقتصادیات نے ایک مجلس قائم کی۔ جس کا نام "نیشنل اکنامک کونسل" تھا۔ اس مجلس کے پیش نظر ملک کی اقتصادی حالت کا سدھارنا تھا۔ شروع شروع میں یہ جماعت پرائیویٹ طور پر کچھ کام کرتی رہی لیکن ۱۹۳۳ء میں حکومت اسے ایک باقاعدہ جماعت تسلیم کر لیا۔ جس کا اثر یہ ہوا کہ ملک بھر کے ماہرینِ اقتصادیات اس کونسل میں آ گئے اور ملک کی ترقی کے طریقے سوچنے لگے۔ حکومت نے شروع شروع میں چند وزارتوں سے کچھ کام لے کر اس کونسل کے سپرد کر دیا لیکن بعد میں اسے باقاعدہ طور پر ملک کی ایک انتظامی جماعت بنا دیا گیا اور لیگ آف نیشنز نے بھی اس کی رہنمائی کے لئے اپنی طرف سے چند ماہرین بھیجے

اگر اس کونسل کی مختصر سی زندگی پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ کونسل ملک کے لئے بہت مفید ثابت ہوئی۔ اس کی کارگذاریاں چینی زندگی کے ہر پہلو پر اثر انداز ہوئیں قرض دینے والی سوسائٹیوں کا قیام اور علمِ زراعت کے اصولوں میں اصلاح اور بہترین کاشت کے متعلق مفید مشورے سب کام اسی کے متعلق تھے۔

اس کونسل کے ارکان نے ملک کی تعلیمی حالت کا جائزہ لیا اور حکومت کو ملک میں عام تعلیم کے رواج کا مشورہ دیا۔ اس کے بعد اس نے طبی مراکز قائم کروائے، طبی تربیت گاہیں بنوائیں تاکہ زیادہ سے زیادہ ڈاکٹر مہیا ہو سکیں کچھ عرصے کے بعد آبپاشی کا محکمہ بھی اسی کونسل کے ماتحت آ گیا اور خوراک کی جانچ پڑتال بھی اسی کے سپرد ہو گئی۔ اب اس کے لئے کام کرنے کا ایک وسیع میدان تھا لیکن بعض کام جو یہ کونسل کرنا چاہتی تھی۔ انجام نہ پا سکے مثلاً اس کونسل کے پروگرام میں طغیانیوں کی روک تھام ایک اہم چیز تھی جس میں

اسے کامیابی نہ ہوئی۔ کیونکہ اس کام کے لئے روپے کی بہت ضرورت تھی جس کے لئے کونسل صوبجاتی حکومتوں کی محتاج تھی اور صوبجاتی حکومتیں اپنے اخراجات کی بمشکل کفیل ہوتی تھیں۔ کونسل موت کے اس سیلاب سے تو ملک کو نہ بچا سکی لیکن اس کی سرگرمیاں اور ... پھیلتی گئیں ۱۹۳۱ء میں کونسل نے لیگ آف نیشنز سے چین کی طبی حالت کا معائنہ کرنے اور اس بارے میں رہنمائی کے لئے ایک طبی کمیشن طلب کیا۔ لیگ نے چند ماہر ڈاکٹروں کا ایک مشن چین میں بھیج دیا جس نے حالات کا معائنہ کرنے کے بعد سفارشات کیں کہ ملک میں مختلف طبی مرکز قائم کئے جائیں جو ایک مرکزی طبی تربیت گاہ سے ملحق ہوں۔ اس تربیت گاہ میں طلباء کو ڈاکٹری کی تعلیم دی جائے اور طبی مراکز بالکل جدید سامان سے آراستہ ہوں۔ یہ سکیم جو مشن نے تیار کی تین سال کے لئے تھی۔ حکومت نے ان سفارشات پر فوراً عمل شروع کر دیا اور تو صوبوں میں مختلف مقامات پر جدید وضع کے طبی مرکز قائم ہو گئے جو ایک مرکزی طبی تربیت گاہ سے ملحق تھے۔ حکومت نے جب سکیم کو نہایت کامیابی سے چلتا ہوا دیکھا تو لیگ سے اور ایک کمیشن مانگا۔ جس کے جواب میں لیگ نے چار یا پانچ ماہرین صحت (ماہرین تعلیمات، انجنیئر، ماہرین اقتصادیات اور دو سول سروس کے اعلیٰ حکام بھیجے جنہوں نے حکومت کو مشورے دئیے کہ چین کو اس طرح ترقی دی جا سکتی ہے۔ ۱۹۲۷ء سے لے کر ۱۹۳۳ء تک لیگ نے کئی کمیشن چینیوں کی رہنمائی کے لئے بھیجے اور چین نے ان کی رہنمائی سے استفادہ کیا۔ بعض غیر ملکی حکام بھی حکومت کے مختلف محکموں میں ملازم رہے اور انہوں نے اپنے تجربات سے ملک کو فائدہ پہنچایا۔

ان اصلاحات کو جمہور بھی احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے جس کی وجہ صرف یہ تھی کہ ملک میں تعلیم کا رواج عام تھا اور ملک بیدار ہو چکا تھا۔ حکومت نے اب تعلیم کو بھی زیادہ فروغ دینا چاہا اور اس کے لئے اس کی آنکھ پھر لیگ کی طرف اٹھی۔

۱۹۰۵ء سے ۱۹۲۹ء تک تعلیم کلیتہً غیر ملکی مشنریوں کے ہاتھ میں رہی تھی جن میں اکثریت امریکن پادریوں کی تھی لیکن یہ حقیقت ہے کہ کوئی قوم بھی کسی اور قوم کے مزاج کو نہیں پا سکتی۔ خواہ وہ کتنی ہی نبض شناس کیوں نہ ہو۔ اگرچہ امریکن پادری ۱۹۰۵ء سے چین کی تعلیم پر چھائے ہوئے تھے لیکن وہ ابھی تک محسوس نہیں کر سکے تھے کہ کس قسم کی تعلیم ان کے لئے مفید ہوگی۔ حکومت نے جب اس مسئلے کی طرف توجہ کی تو شروع شروع میں چند قوانین تعلیم کے متعلق منظور کئے اور تمام ملک میں تعلیم کا چرچا کر دیا اور مزید امداد کے لئے لیگ سے درخواست کی۔ لیگ نے مشہور ماہر تعلیمات پروفیسر آر۔ ایچ ٹاونٹی کے زیر قیادت ایک مشن بھیج دیا جس نے حالات کا مطالعہ کرنے کے بعد کچھ سفارشیں کیں، جن میں سب سے اہم یہ تھی کہ نظام تعلیم میں تبدیلی کر دی جائے۔ مثلاً وہاں پرانے نظام کے مطابق پرائمری سکول میں تعلیم حاصل کرنے کی عمر ۶ سال سے ۱۱ سال تک تھی لیکن ملک میں بچوں کی نسبت کے لحاظ سے سکولوں کی تعداد کم تھی۔ ۱۹۲۹ء میں ۶ سے ۱۱ سال تک کے بچوں کی تعداد ۰۰۰۰۰ ۱۴۱ تھی جن میں سے صرف ۰۰۰ ۸۸۳۹ بچوں کو تعلیم مل رہی تھی۔ گویا محض ۲۱ فی صدی بچے سکولوں میں جاتے تھے۔ ملک میں اگرچہ مدارس کی تعداد کم تھی۔ لیکن اس کے باوجود اسی قدر سکولوں میں اس تعداد سے دوگنے بچوں کو تعلیم دی جا سکتی تھی۔

یعنی پرانے اصول کے مطابق وہاں بیس لڑکوں کے لئے ایک استاد مقرر تھا۔ اگر ایک استاد چالیس لڑکوں کے لئے مقرر کر دیا جاتا تو پڑھانے والوں کو بھی دقت پیش نہ آتی، اور تعلیم بھی دوگنی ہو جاتی۔ نہ نئے مدرسے بنانے پڑتے نہ نئے استاد ملازم رکھنے پڑتے۔

پرائمری سکولوں سے جو لڑکے فارغ ہو کر نکلتے تھے۔ ان کی ایک اچھی خاصی تعداد سکولوں کو خیرباد کہہ دیتی تھی اور باقی لڑکے جنرل مڈل سکولوں اور نارمل سکولوں میں جاتے تھے۔ ان نارمل سکولوں میں لڑکوں کو استاد بننے کی تربیت دی جاتی تھی لیکن ایک تو ان کی تعداد بھی ضرورت کے لحاظ سے کم تھی اور پھر یہاں پر تعلیم بھی اچھی نہیں ہوتی تھی۔ مڈل سکولوں کا معیار تعلیم بہت پست تھا اور یونیورسٹی میں جانے والے طلبا کے لئے ہرگز موزوں نہیں تھا۔ اس لئے ضرورت تھی کہ سارا نظام ہی تبدیل کیا جائے۔

مڈل کے بعد تعلیم کا کورس چھ سال کا تھا۔ ملک میں ۵۹ یونیورسٹیاں تھیں لیکن ان یونیورسٹیوں سے صرف ۳۰۰۰ طلبا ہر سال نکلتے تھے۔ جن میں ۵۰۰ طلبا ہر سال غیر ممالک میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے چلے جاتے۔ چونکہ ان کی تعلیم بنیادی طور پر ہی ناقص ہوتی تھی اس لئے بیرونی ممالک میں کچھ حاصل کرنے کی بجائے ان میں سے زیادہ تعداد ایسے نوجوانوں کی ہوتی جو پریشان خیال اور پریشان حال ہو جاتے۔

کمیشن نے اس تمام صورت حال کا جائزہ لیا اور سفارش کی کہ

۱۔ پرائمری سکولوں کی تعداد کو بڑھا دیا جائے یا انہی سکولوں میں زیادہ طلبا کی تعلیم کا انتظام کر دیا جائے۔

۲۔ثانوی سکولوں میں مخصوص تعلیم دی جائے اور نارمل اسکولوں پر خاص توجہ صرف کی جائے۔

۳۔طلبا کو ملکی یونیورسٹیوں کی سند حاصل کئے بغیر بیرونی ممالک کی یونیورسٹیوں میں جانے کی اجازت نہ دی جائے۔

حکومت نے ان سفارشات کو منظور کر لیا اور ۱۹۳۳ء میں ایم بڑنی اسسٹنٹ ڈائرکٹر آف انٹرنیشنل لیبر چین میں آئے تو انہوں نے دیکھا کہ چین کی تعلیمی حالت کو درست کر لیا گیا ہے اور یونیورسٹیوں میں جانے والے طلبا کو مفید تعلیم دی جا رہی ہے اور جنرل مڈل سکولوں میں اتنی اچھی تعلیم دی جا رہی ہے کہ لڑکے یہاں سے فارغ ہو کر اس قابل ہو جاتے ہیں کہ زندگی کے ہر شعبے میں کامیاب ہو سکیں۔ ۱۹۲۶ء میں ثانوی سکولوں کی تعداد ۱۱۴۲ تھی لیکن ۱۹۳۶ء میں ۳۱۲۵ مدارس تھے، اور یونیورسٹیاں ۵۹ کی بجائے ۴۱ کر دی گئی تھیں، اور حکومت نے ایک قانون بنا دیا کہ کسی طالب علم کو غیر ممالک میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے جانے کی اُس وقت تک اجازت نہیں دی جائے گی جب تک کہ وہ یونیورسٹی کا مقرر کردہ نصاب ختم نہ کر لے۔ اگرچہ حکومت نے ایک اعلان کے ذریعے جبری ابتدائی تعلیم کے نفاذ کا حکم دے دیا تھا لیکن بعض وجوہ کی بنا پر اس اعلان پر ابھی تک عمل نہیں ہوا۔ اس دوران میں تعلیم بالغان کی مہم بھی شروع ہو گئی ۱۹۳۳ء میں بالغوں کے واسطے ۴۰۰۰ مدرسے تھے جن میں تعلیم حاصل کرنے والے بوڑھے اور جوانوں کی تعداد ۴۰۰۰۰۰ تھی۔ جو تھوڑے ہی عرصے میں پڑھنے لکھنے کے قابل بن گئے تھے۔

ابھی تعلیمی پروگرام پورے طور پر زیر عمل نہیں آیا تھا کہ جاپان نے چین پر حملہ کر دیا اور اس باعث مزید اصلاحات اور ترقیاں رک گئیں خیال کیا جاتا ہے کہ اگر جاپان اس طرح حملہ نہ کر دیتا تو چین کی حالت آج سے کہیں مختلف ہوتی۔

چین اور جاپان کی جنگ کو جو مارکو پولو پل کے قریب ایک معمولی سے جھگڑے سے شروع ہوئی تھی۔ آج سوا تین سال ہو چکے ہیں۔ اس عرصے کے دوران میں جاپان نے چین کے ایک وسیع حصے پر قبضہ کر لیا ہے جس میں زیادہ تر وہ مقامات واقع ہیں جو چینی صنعت و حرفت کا مرکز تھے۔ اس طرح جاپان نے چین کی تجارت کو بہت ضعف پہنچایا ہے، چین نے بھی جاپانی حملوں کا نہایت پامردی سے جواب دیا ہے لیکن چین نے تین سال کے بعد محسوس کیا ہے کہ جاپان چین کی سرزمین پر قبضہ کرنے کے لئے یہ جنگ نہیں لڑ رہا بلکہ اس کا اصلی مقصد یہ ہے کہ چین کے تجارتی مراکز کو اپنے قبضے میں کر لے اور چین کی تجارت کو تباہ کر کے اُسے اقتصادی طور پر ہمیشہ کے لئے اپنا محتاج بنا لے آج چین یہ محسوس کر رہا ہے کہ موجودہ طریق جنگ اُسے کامیابی کی طرف نہیں لے جا سکتا، بلکہ صرف تجارت کو بچانے کے وسیلے ہی اُسے ایک طویل جنگ میں تباہی سے بچا سکتے ہیں۔ اس لئے چینیوں نے اپنی تجارتی اور صنعتی حالت کو پھر سے سنبھالنا شروع کر دیا ہے، تاکہ اس تجارتی جنگ میں فتح حاصل کر سکیں اس لئے ملک میں نئے سرے سے صنعتی مرکز قائم کئے گئے ہیں، اور ان مزدوروں کو جو جاپانی قبضے کی وجہ سے کارخانوں سے علیحدہ کر دئیے گئے تھے واپس بلا لیا گیا ہے۔ اور حکومت نے تجویز پیش کی ہے کہ ان کارخانوں کو امدادی طور پر چلایا جائے اور کم از کم سات سات آدمی مل کر تجارتی سوسائٹیاں بنائیں۔ ایسی سوسائٹیوں کا کوئی ممبر بھی بیس فی صدی سٹاک سے زیادہ کا مالک نہ ہو۔ ان سوسائٹیوں کے متعلق حکومت نے قوانین بنا دئیے ہیں اور ہدایات جاری کر دی ہیں۔ ان کو کس طرح چلایا جائے کس طرح ایک دوسرے کی امداد کی جائے اور کس طرح منافعے کو باہم تقسیم کیا جائے۔ حاصل کردہ منافع ممبر آپس میں بانٹ لیتے ہیں اور یہ سب سوسائٹیاں ایک مرکزی سوسائٹی سے وابستہ ہیں۔

اس مرکزی سوسائٹی نے چار ماہ کے عرصے میں اپنے لئے چین میں اچھی خاصی جگہ پیدا کر لی ہے، حکومت نے بھی اس کی دل کھول کر امداد کی ہے اور اسے ۵۰۰۰۰۰ پونڈ بطور امداد دے چکی ہے۔ اسے فلپائن کے چینیوں نے بھی ۴۰۰۰۰ پونڈ ہدیے کے طور پر پیش کئے ہیں اور ۲۰۰۰۰ پونڈ بینکروں نے قرض دئیے ہیں تاکہ قوم جواب اپنے اصلی محاذ پر جنگ لڑ رہی ہے اس میں فتح یاب ہو۔

اس سوسائٹی کے مراکز میں ہر قسم کا کام ہوتا ہے اور طرح طرح کی چھوٹی بڑی اشیاء بنائی جا رہی ہیں جو تھوڑے عرصے کے اندر ہی چین کو جاپانی مال خریدنے کی ضرورت سے بے نیاز کر دیں گی۔

حکومت نے بہ حیثیت مجموعی اگرچہ ملک کی ترقی کے لئے بہت کوششیں کی تھیں لیکن ذاتی طور پر جنرل چیانگ کائی شک اور ان کی اہلیہ بھی غافل نہیں رہے انہوں نے نئی زندگی کی تحریک کے نام سے ایک تحریک چین میں جاری کی ہے۔ جو مسیح اور کنفیوشیس کی تعلیم سے متاثر ہے اور چین کے مسائل کا حل روحانیات میں تلاش کرتی ہے۔ یہ تحریک لوگوں کی توجہ اپنی طرف کھینچ رہی ہے۔ اس نے بے شمار لوگوں کے اخلاق کی اصلاح کی ہے اور ان کو فضول خرچیوں سے بچایا ہے۔ اس نے بُری عادات کے خلاف ایک مہم جاری کر رکھی ہے اور ملک کی ایک بہت بڑی تعداد کو افیون سے نجات دلا چکی ہے۔ یہ تحریک

مجروحین کی دیکھ بھال اور پناہ گزینوں کی حفاظت کے سلسلے میں بھی نہایت قابلِ قدر خدمات سرانجام دے رہی ہے۔

اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ چین کی اصلاحات کا سلسلہ درحقیقت ۱۹۲۷ء سے جاری ہؤا لیکن اس قلیل عرصے میں چین جیسے وسیع و عریض ملک میں اس قدر اصلاحات کا نفاذ اس امر کی دلیل ہے کہ اگر آج چین اور جاپان میں لڑائی نہ ہوتی تو چین کی حالت کچھ اور ہی ہوتی۔

تابش صدیقی

رباعی

پھولوں کے ورق میں ہیں دفترِ معنی
اجرامِ فلک میں ہیں پیمبرِ معنی
پہچانی ہے نامہ سے جاں بیں
ورنہ یہ جہاں ہے تمامتر بے معنی

محروم

کیفیتیں

چمن ہنس رہا ہے بہار آ رہی ہے ۔ مسرت سی سبزے پہ لہرا رہی ہے
فلک سے زمیں پر برستے ہیں جلوے ۔ ہر اک شاخ ہاتھوں کو پھیلا رہی ہے
مچلتی ہوئی موجِ آبِ رواں میں ۔ بہار اپنی تصویر کھنچوا رہی ہے
ہیں شبنم کے قدموں پہ کرنوں کے سجدے ۔ تجلی کو انگڑائی سی آ رہی ہے
نسیمِ سحر نکہتیں عام کرتی ۔ ادھر آ رہی ہے ادھر جا رہی ہے
حسینوں کے بندِ قبا کھل رہے ہیں ۔ جوانی طبیعت کو گرما رہی ہے
نگاہوں میں ہیں گرمیاں سوزِ دل کی ۔ رگ و پے میں بجلی سی لہرا رہی ہے
دلِ زار میں ساز سا چھڑ رہا ہے ۔ محبت عجب راگنی گا رہی ہے
برستی ہیں پلکوں سے اشکوں کی بوندیں ۔ گھٹا سی تصور پہ منڈلا رہی ہے

ہے جنبش میں مژگاں کی بیدار حسرت
ہر اک چیز عریاں ہوئی جا رہی ہے

اختر ہوشیارپوری

معارف

(۱)

وہ "خلدِ گوش" تو ہیں جنتِ نگاہ نہیں قصور میرا ہے اُن کا کوئی گناہ نہیں
وہ "لامکاں" ہیں "زمان و مکاں" مرا مسکن سحر کے نور کے لائق شبِ سیاہ نہیں

(۲)

مری سمجھ میں یہ اب جا کے بات آئی ہے حجاب "میری نگاہوں کی نارسائی" ہے
اُٹھے زمان و مکاں کی نہ جب تلک چلمن مرے نصیبوں میں محبوب کی جدائی ہے

(۳)

"شنید" دید کی سیڑھی ہے "دید" بامِ جمال شنید دعوتِ ساقی ہے دید جامِ جمال
وہی "ہمائے سعادت" ہے جس کی نظروں میں شنید صورتِ دانہ ہے دید دامِ جمال

(۴)

شنید دشت نوردی ہے دید عیش ورود شنید و دید ہیں گویا امینِ غیاب و شہود
پتے کی بات کہی ہے چمن کے محرم نے شنید بادِ بہاری ہے دید گُل کی نمود

امینِ حزیں

جنگ

نوعی لحاظ سے انسان ایک ممتاز ہستی ہو یا بقول ڈارون کیڑے مکوڑوں سے ترقی کرتے کرتے انسان بنا ہو۔ مگر پہلے پہل اپنی موجودہ صورت میں جب نظر آیا ہے تو اپنے جدی بھائیوں ہی سا وحشی اور جانور تھا۔ ہر زخ تو ایک ضرور سب سے علیحدہ تھی وہ چاروں ہاتھ پاؤں سے چلتے تھے یہ دو ٹانگوں پر۔ اُن کے تیور معصوم تھے یہ حضرت چوکنے۔ باقی رہنے سہنے کھانے پینے وغیرہ کی ساری باتیں یکساں تھیں۔

ننگ دھڑنگ: درختوں پر بسیرا لیتا یا کھوؤں میں پڑ رہتا۔ سالہا سال یونہی گذر گئے۔ بھوک لگتی درختوں کے پتے پھل۔ پھول اور خودرو نباتات کھا لیتا۔ پیاس معلوم ہوتی دریاؤں، ندیوں نالوں سے پانی پیتا۔ وہ بھی جانوروں کی طرح نوچ کھسوٹ کر اور منہ لگا کر۔ گویا یہ بھی ایک دوپایہ جانور تھا اور سامنے کی سطح زمین اس کا دسترخوان۔ بہتا پانی آبدار خانہ۔

جب یہ چیزیں ختم ہو جاتیں۔ پیٹ بھرنے کا سامان نہ رہتا تو نباتات کی نسبت کمزور اور سریع الحصول پرند اور چرند کرتے۔ درندوں کو دیکھ کر یہ بھی گھات لگاتا کبھی کوئی بکری پکڑ لی کبھی کوئی گائے ہرن یا دوسرا اسی قسم کا آسانی سے ہاتھ آ جانے والا چرندہ اور کچا بھنبھوڑ گیا۔ کچا اس لئے کہ بھوننے جلنے کا فن کسے معلوم تھا۔ نہ آگ جلانی آتی تھی نہ آگ سے کام لینا۔ جانور بھی باقی نہ رہتے اور زندہ رہنے میں دشواریاں پیدا ہو جاتیں تو نقل مکان کر کے دوسری جگہہ چلا جاتا۔

ایک جگہہ سے غذا کی تلاش میں دوسری جگہہ جانا بھی انسان نے جانوروں سے سیکھا تھا۔ اس لئے وہ جہاں جاتا پانی کے کنارے اُترتا کیونکہ پانی کا قرب۔ سبزیوں، پھل پھلاریوں کا گہوارہ ہوتا۔ کھانے پینے کا سامان بافراط ملتا اور جانور بھی پانی کی بدولت ہاتھ آتے رہتے۔ اس طرح انسان مدتوں خانہ بدوشانہ زندگی کے دن گذارا کیا۔ اس عرصے میں چونکہ انسانی نسل برابر بڑھتی رہی کبھی کبھی ایسا بھی ہوا کہ ایک ہی وقت میں اتفاق سے ایک سے زیادہ خاندان ایک ہی جگہہ آ پہنچے اور سب کو ایک ہی طرح کی مزاحمتیں پیش آئیں ——

انسان کا ظہور کسی طور پر بھی تاہم اس کی فطرت ساری مخلوق سے نرالی ہے۔ یہ حضرت نہایت خودکام بنائے گئے ہیں —— اس لئے بمقتضائے فطرت ہر خاندان کی خواہش ہوئی کہ وہی اور صرف وہی قدرتی پیداوار سے متمتع ہو۔ جنگل کی ہر چیز پر وہی متصرف رہے۔ ان میں سے ہر ایک نے چاہا کہ دوسرا چلا جائے۔ دوسروں کو نکالنا چاہا مگر خود نہیں گیا۔ خواہشات اور خودغرضی کا تصادم ہوا۔ زبانی گفتگو کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ بات بڑھی اور قدرتی سادہ ترین ہتھیار کھنچ گئے یعنی دانت، ہاتھ اور پیر چلنے لگے۔ غالباً دنیا کی سب سے پہلی جنگ اسی طرح واقع ہوئی ہوگی۔

سینکڑوں برس تک یہی ہوتا رہا ہوگا کہ غذا کی ضرورت ہوئی جستجو کی۔ کسی شاداب مقام پر قبضہ جمانا چاہا۔ دوسرے آ دھمکے۔ زور آزمائی ہونے لگی۔ طاقت نے غلبہ پایا، کمزور کہیں اور چلے۔ ان تلخ تجربوں نے انسان کو حفظ ماتقدم کے لئے غذا جمع کرنے کا خیال دلایا اور اس کی حفاظت پر تیار کیا۔ یہ الگ بچ کر نکل جاتا اور ایک جتھے سے دوسرا ابھتا در رہتا۔ کچھ صدیاں اسی حالت میں گزریں۔ اس عرصے میں تمدن پیدا ہو گیا۔ ضروریات اور گرد و پیش کے حالات کی رہنمائی سے زراعت اور جانوروں کی پرورش شروع کی۔ خشک سالیوں اور امراض نے انسان کو یہ سبق دیا کہ جس قدر زیادہ اسباب زندگی پر قبضہ ہو سکے کر لیا جائے۔ اس جذبے نے فطرتی خودکامی کے ساتھ مل کر یہ خیال پیدا کیا کہ اگر ممکن ہو تو اُن اسباب زندگی پر بھی قبضہ کر لیا جائے جو دوسروں کے تصرف میں ہیں۔ اس کے لئے ضرورت قوت کی تھی اور ایسے معاملوں میں قوت انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی کارآمد ہوتی ہے۔ اس لئے ہر خاندان نے اپنے اور اپنے رشتہ دار خاندانوں کے ارکان سے جتھے تیار کئے اور دوسروں کے زیر تصرف اسباب زندگی پر یورش ہونے لگی۔

نسل میں افزائش، تمدن میں ترقی جوں جوں ہوتی گئی، خدائی دسترخوان تنگ، قدرت کے قانون میں ترمیم ہوتی گئی۔ چھوٹی چھوٹی جماعتوں میں جیت ہار عموماً طاقت کی کمی بیشی پر منحصر ہے۔ اس لئے حملہ یا مدافعت کو کامیاب بنانے

کے لئے برگوں اور قبیلوں میں سیاسی اتحاد شروع ہوا اور جو جماعتیں نسل یا رنگ یا بولی کے لحاظ سے قریب کی نسبت رکھتی تھیں ایک دوسرے کی شریک ہو گئیں۔ اس طرح چھوٹی چھوٹی حملہ آور ٹولیوں نے بڑی بڑی فوجوں کی شکل اختیار کر لی اور معمولی ہاتھا پائیوں کے بدلے خوفناک جنگیں ہونے لگیں۔ ہتھیار بھی بن گئے۔ جانوں کی قیمت بھی ارزاں ہو گئی!

لیکن اب ایک ایسے شخص کی ضرورت محسوس ہوئی جو ان ہزاروں انسانوں کو اپنے ہی جیسے انسانوں بلکہ ایک ہی دادا کی بچھڑی ہوئی اولاد سے لڑا سکے۔ ایسا جادو چلائے کہ اپنی غرض کے سامنے نہ رحم کا جذبہ قائم رہے نہ حق و صداقت کا۔ آنکھیں بند کر کے لڑتے مارے جائیں ظاہر ہے کہ اس منصب کا مستحق وہی ہو سکتا تھا۔ جو اوروں سے زیادہ شجاع زیادہ دانشمند اور زیادہ خود کام ہو۔ ممکن تھا کہ نوجوانوں میں ایک سے زیادہ بہادر، زیادہ ہوشیار اور خود کام بھی نکل آتا مگر اس کا اطمینان کیا تھا کہ جوش شباب انہیں شجاعت کی حدود سے نکال کر تہور کی حد تک نہ لے جاتا۔ علاوہ ازیں دانشمندی تجربے کی نیاز مند ہے اور بوڑھوں کے آگے کچھ قدرتی طور پر بھی نوجوان سر جھک ہی جاتے ہیں۔ اس لئے یہ خدمت ان سال خوردہ افراد کے سپرد کی گئی جو شجاعت و دانشمندی کے ساتھ تجربہ کاری کی صفت بھی رکھتے تھے۔

ایک شخص کی چشم و ابرو کے اشاروں پر ہزاروں انسانوں کا جنبش کرنا انسانی حیات کا سب سے بڑا منظر ہے۔ ابتدا میں شیوخ قبائل نے خدمت سالاری حاجت روائی کی غرض سے لی تھی مگر تھوڑے عرصے کے بعد شان و عظمت افسری سے جو ذوق آشنا ہوئے تو انہیں سالاری میں لطف آنے لگا۔ شروع شروع میں جنگ منورتا کی تھی۔ پھر جب فتح و ظفر نے ان کو سربلندی سے روشناس کیا تو خوں ریزی اور قتل و غارت میں وہ مزہ آیا کہ مقاتلہ قوت کی نمائش بن گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اب جنگ اسباب زندگی کے بدلے جلال سالاری اور لطف سربلندی یا بہ الفاظ دیگر کشور ستانی اور حکمرانی کے لئے ہونے لگی۔

نپولین کہتا ہے "جنگ ایک وحشیانہ حرکت ہے" مطلب یہ کہ جنگ کا سرچشمہ وحشت ہے، ممکن ہے کہ سرچشمہ جنگ کی بابت نپولین کی رائے صحیح ہو، مگر جہاں تک ہم سمجھتے ہیں یہ خیال درست نہیں۔ دنیا ہزاروں برس آگے نکل آئی ہے، یورپ میں آفتاب علم نصف النہار پر ہے، خروش تمدن و تہذیب سے کارزار ہستی پُر آہنگ ہے زمانۂ وحشت کی یادگاریں محو کرنے کے لئے عرق ریز کوششیں ہو رہی ہیں وحشت و بربریت سے ہر شخص غلط یا صحیح طور پر بیزاری ظاہر کر رہا ہے۔ لیکن بایں ہمہ بقول ایک تشبیہ طراز کے یورپ کا آخری اشارہ جنگ کی منتظر اقوام کا کیمپ ہے، لہذا اگر جنگ کا سرچشمہ وحشت ہوتی تو آج کم از کم یورپ سے جنگ کا تمام ساز و سامان مفقود ہو جاتا۔ حالانکہ اس متاع کی سب سے بڑی منڈی بلکہ اس وقت میدان عمل بھی وہی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ اگر جنگ کا سرچشمہ وحشت نہیں تو پھر کیا ہے؟

موجودہ علم الاخلاق کا یہ ایک بنیادی مسئلہ ہے کہ خود کامی اور خود پرستی نوع انسانی کی ایک ممتاز خصوصیت ہے۔ دنیا میں ایک متنفس بھی ایسا نہیں ملے گا جو خود پرستی سے خالی ہو۔ یہی خود پرستی اور خود کامی قدرتی طور پر باہمی مناقشت اور تصادم کا باعث ہوتی ہے۔ یعنی ہر قوم، ہر جماعت، ہر خاندان بلکہ ہر فرد یہ چاہتا ہے کہ اس عالم اسباب میں سارے کاروبار اسی کے اشاروں پر ہوں نہیں ہو سکے تو ہونے لگیں۔ زندگی کے ہر گوشے میں اسی کی حکومت ہو نہیں ہے تو ہو جائے۔ دنیا کی بہترین چیزیں صرف اسی کے قبضے میں رہیں، اگر نہیں ہیں تو آ جائیں۔ افسری و سیادت خطرات سے خالی نہیں۔ اس کے لئے بڑی بڑی بازیاں لگانی پڑتی ہیں لیکن اس کی دلکشی اور اس کا سرور بھی عجیب ہے یہ نشہ چڑھ کر اترا نہیں کرتا۔ تاوقتیکہ کوئی منہ کے بل اوندھا نہ گرے۔ انسان کی خود پرستی اور خود کامی اسے ترغیب دیتی ہے کہ جس طرح ممکن ہو لطف سیادت حاصل کرے۔ اس لئے درحقیقت جنگ کا سرچشمہ وحشت نہیں بلکہ خود کامی ہے جس کے پیش نظر کبھی اسباب زندگی اور کبھی افسری و سیادت ہوتی ہے۔

تمدن مانع جنگ ہے یا محرک جنگ؟ دوسرا سوال ہے جس پر سینکڑوں بار خامہ فرسائی ہو چکی ہے۔ بڑے بڑے اہل قلم نے اس پر رائے زنی کی ہے مگر آج تک اس کا حل نہیں ہو سکا۔ دراصل اس سوال کے قناعت بخش جواب کے لئے پہلے دو باتوں پر غور کرنا چاہیئے۔

(۱) اسباب جنگ کیا ہیں؟

(۲) تمدن کا ان پر کیا اثر پڑتا ہے؟

ہم نے بیان کیا ہے کہ جنگ کا سرچشمہ اسباب زندگی، یا سیادت کے لئے انسان کی خود کامانہ کوشش ہے۔ تہذیب و تمدن نے زندگی کو نہایت پُرتکلف اور گراں کر دیا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ زندگی جس قدر پُرتکلف ہوتی جائے گی اتنی ہی زیادہ اسباب زندگی کی ضرورت ہو گی اور جتنی زیادہ ضرورت ہو گی اسی قدر اس کے لئے انسان زیادہ سرگرمی سے جد و جہد کرے گا۔ سیادت کا آغاز فرق مراتب سے ہے اور فرق مراتب کی ابتدا تمدن سے ہے۔ گویا جب تک کوئی قوم متمدن نہیں ہوتی، اس وقت تک اس کے افراد یکساں حیثیت رکھتے ہیں

برتری کا خیال پیدا نہیں ہوتا۔ جوں جوں تمدن ان میں گھر کرتا جاتا ہے۔ فرقِ مراتب کی شاخیں نکلتی آتی ہیں۔ جاہ پسند افراد میں فرقِ مراتب واضح ہونے لگتا ہے اور جس قدر فرقِ مراتب واضح ہوتا ہے اسی قدر سیادت طلبی کا شوق زور پکڑتا ہے۔

اگر آپ ایک محض وحشی قبیلے میں جائیں تو نشست و برخاست، گفتار و کردار، وضع و قطع، غرض کسی حیثیت سے بغیر دریافت کئے یہ نہیں معلوم کر سکیں گے کہ ان میں قبیلے کا شیخ یا سردار کون ہے! لیکن کسی گاؤں میں جا کر کچھ اور منظر دکھائی دے گا۔ وہاں عام آبادی میں فرق نظر آئے گا۔ گاؤں کی بہ نسبت قصبے میں یہ فرق زیادہ نمایاں دیکھنے میں آتا ہے۔ پھر شہر کی کیفیت اس سے بھی زیادہ بدلی ہوئی ہوگی۔ اور اگر کسی دربارِ شاہی میں باریابی ہو گئی تو فرقِ مراتب کا ایک محیر العقول طلسم زار دیکھئے گا۔

غور کیجئے کہ صحرا، گاؤں، قصبہ، شہر اور دربار میں بعض امور مشترک ہیں اور بعض متفرق۔ امر مشترک یہ ہے کہ ہر جگہ بالادست اور زیردست ہیں۔ متفرق یہ کہ بعض جگہ تمدن بالکل نہیں، بعض جگہ تمدن ہے لیکن ناقص، بعض جگہ کامل اور بعض جگہ زمانے کے اعتبار سے کامل ترین۔ جہاں تمدن نہیں ہے وہاں دونوں طبقوں کا فرق غیر ظاہر، جہاں تمدن کم ہے، وہاں ظاہر ہے مگر کم جہاں پورا تمدن ہے۔ وہاں پوری طرح یہ فرق ظاہر ہے۔ صاف معلوم ہو گیا کہ تمدن سیادت طلبی کے لئے محرک ہے۔ چنانچہ اس علم کے بعد کہ تمدن اسبابِ جنگ کو کم کرنے کے بدلے بڑھانے والا ہے۔ بآسانی یہ فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ تمدن مانع جنگ ہے یا محرک جنگ؟

اس کی شہادت چاہئے تو یورپ کے تمدنی نقشات اس درجہ روشن ہیں کہ ان کے بیان کی ضرورت نہیں۔ با ایں ہمہ جنگ کی بابت یورپ کا کیا حال ہے؟ اس کا جواب ایک مشہور نقاد مورخ کی زبانی سن لیجئے۔ وہ کہتا ہے۔ "کہ خود پرستی متمدن اقوام میں غیر متمدن اقوام کی بہ نسبت قوی تر ہے۔ جس کی وجہ سے ان کی ضروریات بھی بڑھ جاتی ہیں۔ وہ کشاکش کے لئے مجبور ہوتی ہیں۔ وہ قومیں جو اپنی فطری حالت میں باقی ہیں باوجودیکہ تاخت و تاراج اور یورش و جنگ میں ڈوبی ہوئی ہیں پھر بھی ان میں ایسے اخلاق پائے جاتے ہیں جن سے طمع کی شدت آگے نہیں بڑھتی۔ منافست کی آگ دھیمی رہتی ہے۔ میری مراد اس سے وہ عادت ہے جس کو بہادری (chivalry) کہتے ہیں۔ یہ عادت خونریزی اور جنگ کے موقوف کرنے میں بھی بارہا کامیاب ہوئی ہے۔ متمدن اقوام کی جنگ تمام تر شخصی طمع پر مبنی ہوتی ہے۔ اس میں شجاعت کا مطلقاً وجود نہیں ہوتا۔"

متمدن قوموں میں ہر قوم اپنے ہمسایوں کی طرف حسد کی نگاہ سے دیکھتی رہتی ہے۔ اگر اس کی قدرت میں یہ ہوتا کہ وہ سب کو اپنے زیر نگیں کر لے تو ہرگز دریغ نہ کرتی۔ لیکن چونکہ یہ اس کے بس میں نہیں۔ اس لئے وہ بلی کی طرح دبکی ہوئی ہر ایسی فرصت کے انتظار میں بیٹھی رہتی ہے کہ موقع ملتے ہی جھپٹے اور اچک کر کسی شہر پر قبضہ کرے۔ حق و ناحق کے سوال پر بہری ہو جائے اور اپنی حدودِ سلطنت کو وسیع کر سکے۔ یہ صحیح ہے کہ وہ کسی عذر کے بغیر تلوار نہیں نکالتی وہ بہانے پیدا کرتی ہے۔ مگر اکثر اس کے عذر فرضی اور بہانے غلط ہوتے ہیں۔

جب کوئی سلطنت دوسری سلطنت کا کوئی حصہ دبانا چاہتی ہے تو پہلے وہ یہ دیکھتی ہے کہ اس کے غالب آنے کا امکان بھی ہے کہ نہیں۔ اگر غالب آ سکتی ہے تو پھر کوئی نہ کوئی عذر تلاش کر لیتی ہے اور اس عذر کی بنا پر اعلان جنگ کر دیتی ہے لیکن اگر غالب نہیں آ سکتی تو کیسے ہی قوی عذر ہوں کان نہیں ہلاتی لڑنا تو کجا لڑنے والوں سے گویا آنکھ تک نہیں ملاتی۔

فاضل نقاد نے جنگ کے لئے متمدن اقوام کی سبب آفرینی پر جو مقالہ لکھا ہے حرف بہ حرف صحیح ہے لیکن تاوقتیکہ واقعات سے ثابت نہ کیا جائے مضمون تشنہ رہتا ہے۔ اس لئے ضروری ہوا کہ متمدن اقوام کی تاریخ سے اس صداقت پر چند مثالیں پیش کریں۔

ہندوستان دنیا کی تمام حوصلہ مند قوموں کا منظورِ نظر رہا ہے۔ عہدِ قبل تاریخ سے لے کر اس وقت تک ہر مضبوط بازو والی اور جوشیلی قوم نے اس کے حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس لئے کوئی وجہ نہ تھی کہ فرانس کو اس کا خیال نہ ہوتا۔ علاوہ ازیں وہ ایک مدت تک اس کے بعض قلعوں پر حکومت بھی کر چکا تھا۔ مصر ہندوستان کی کنجی ہے اور بجائے خود بھی سرسبز زرخیز ملک، ان گوناگوں ترغیبات کی وجہ سے فرانس کے اولوالعزم جنرل نپولین کے دل میں فتح مصر کا خیال پیدا ہوا تاکہ ہندوستان کا راستہ کھل جائے۔ اس نے فرانسیسی حکومت کے ممبروں کی ایک مجلس مدعو کی جس میں فتح مصر کا ارادہ ظاہر کیا۔ وجوہ بیان کرتے ہوئے کہا کہ مصر دنیا کی سرسبز ترین زمینوں میں سے ہے اور ہندوستان کا راستہ ہے۔ دوسرے عاملانِ حکومت نے اس تجویز سے اتفاق کرنے میں تردد کیا تو نپولین بولا کہ اگر اس کی تجویز سے اتفاق نہ کیا گیا تو وہ اپنے عہدے سے مستعفی ہو جائے گا، دیکھئے کیا متمدن ضد اور کیا مہذب ہٹ ہے مجبوراً یہ تجویز منظور کی گئی۔ نپولین بیڑے کے ساتھ اسکندریہ کے ساحل پر آیا لیکن جب ملک میں داخل

ہوا۔ تو باشندوں میں ایک فرمان اس مضمون کا شائع کیا کہ ہم اس لئے یہاں آئے ہیں کہ تمہارے ظالم حکمرانوں کے پنجے سے تم کو نجات دلائیں اور فرانسیسیوں کے ساتھ جو بدسلوکیاں انہوں نے کی ہیں اُن کا انتقام لیں۔

جزائرالعرب ایک زرخیز ملک ہے۔ فرانس کی دیرینہ آرزو تھی کہ وہ اس کی نوآبادیوں میں آجائے مگر اس کے لئے فرصت کا انتظار تھا۔ نپولین نے جب مصر پر فوج کشی کرنی چاہی تو اس مہم کے لئے الجزائر کے ایک یہودی مہاجن سے کچھ روپیہ قرض لیا۔ قرض کی ادائیگی میں عمداً دیر کی گئی۔ ایک دن فرانسیسی قونصل امیر الجزائر کے پاس بیٹھا تھا۔ قرض کا ذکر آیا تو قونصل نے کوئی سخت ناملائم لفظ استعمال کیا۔ جس پر امیر کو غصہ آگیا۔ امیر کے ہاتھ میں ایک پنکھا تھا۔ اس نے وہی پنکھا قونصل کے منہ پر کھینچ مارا۔ قونصل نے اس واقعے کی اطلاع اپنی حکومت کو دی۔ بس پھر کیا تھا۔ جنگ کے لئے یہ وجہ کافی سے زیادہ برانگیختہ کرنے والی تھی۔ خوئے متمدن کو بہانہ ہاتھ آگیا! فوجیں پنکھے کا بدلہ لینے چلیں اور الجزائر فتح کرلیا گیا۔

۱۸۹۲ء سے پہلے تک تو تمام مورخین فرانس اور پروشیا کی جنگ کا ذمہ دار فرانس کو قرار دیتے تھے مگر بعد ازیں بھید کھلنے پر معلوم ہوا کہ اس کا اصلی ذمہ دار کوئی اور تھا اور جو تھا اس نے اپنی زبان سے اقرار بھی کرلیا۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ فرانس اور جرمنی میں جب سپین کی بابت اختلاف پیدا ہوا تو فرانس نے موسیو بنڈیٹی کو شاہ پروشیا سے ملنے کی غرض سے بھیجا۔ موسیو مذکور شاہ پروشیا سے ۹ جولائی ۱۸۷۰ء کو ایمس میں ملا۔ اختلاف انگیز نکتے کے متعلق گفتگو چھڑی۔ دیر تک بات چیت ہوتی رہی۔ نتیجہ حسب دلخواہ نہ نکلا۔ شاہ نے موسیو کو جتنے جواب دیئے وہ نامنظوری کی صورت میں تھے تاہم ایسے الفاظ اور ایسے لب و لہجے میں کہ ان میں توہین کا شائبہ تک نہ تھا۔

بسمارک کو معلوم تھا کہ شاہ کا جواب نامنظوری ہوگا لیکن خواہش یہ تھی کہ جواب کا لہجہ سخت ہو۔ تاکہ فرانس کو غصہ آئے اور جنگ کا آغاز اسی کی طرف سے سمجھا جائے۔ چنانچہ جب اس فتنۂ دوراں کو شاہ کے لطف آمیز جواب کا علم ہوا تو اُس نے دل میں سخت پیچ و تاب کھایا اور سوچنے لگا کہ اب کیا چال چلنی چاہئے! بسمارک اپنے تفکراتِ خصوصیہ میں جو اس کے مرنے کے بعد شائع ہوئی ہیں۔ لکھتا ہے۔

"میں نے ارادہ کیا کہ اپنے عہدے سے مستعفی ہو جاؤں میں نے ایک پارٹی دی جس میں مارشل مولٹک اور رون کو مدعو کیا۔ ہم لوگ کھانے کی میز پر تھے کہ تار والا آیا اور اس نے مجھے ایک تار دیا۔ اس تار پر شاہ کے مشیر خاص کے دستخط تھے اور یہ ایمس سے آیا تھا۔ جب اس کا مضمون پڑھا گیا تو میں نے دیکھا کہ سفیر فرانس کے مقابلے میں شاہ کی کمزوری سے میرے دونوں ہم صحبتوں کے چہروں پر غم کے آثار نمایاں ہونے لگے اور انہوں نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا۔ میں نے تار کو کئی مرتبہ پڑھا۔ شاہ نے مجھے اس تار کی اشاعت کی اجازت دے دی تھی۔ میں نے فوراً قلم اٹھایا اور تار کی عبارت کا ایک فقرہ کاٹ کر اس کی جگہ دوسرا فقرہ لکھ دیا جس سے تار کا اثر بالکل بدل گیا۔ اس کے بعد میں مارشل مولٹک کی طرف متوجہ ہوا اور فوج پر اعتماد، جنگ کے نتیجے، اپنی مہمات اور تیاری کی تکمیل تک انتظار وغیرہ کے متعلق چند سوالات کئے۔ مارشل مذکور نے سب کے جواب میں یہ کہا کہ اگر جنگ ناگزیر ہے تو پھر عجلت بہتر ہے، کیونکہ التوا ہمارے لئے مضرت رساں ہوگا۔ اب میں نے ان کو ترمیم شدہ تار سنایا۔ سنتے ہی ان کی شکن ہائے پیشانی صاف ہونے لگیں۔ میں نے ان سے کہا کہ یہ تار آدھی رات سے پہلے فرانس پہنچ جائے گا۔ اس کا اثر لال جھنڈی کے برابر ہے۔ اور ہماری کامیابی اس میں ہے کہ ہمارے مقابلے میں اعلانِ جنگ کیا جائے تاکہ ہم یورپ میں علی الاعلان کہہ سکیں کہ ہم حملہ آور نہیں بلکہ مدافعت کر رہے ہیں۔"

اہلِ ٹرانسوال کے پیغام صلح کے جواب میں لارڈ سالسبری نے تو یہی کہا تھا کہ ٹرانسوال والوں نے آغازِ جنگ کیا۔ مگر حقیقت سے واقف اور حق پرست مورخین اعلان کرتے ہیں کہ ٹرانسوال کے متعلق انگلستان کی نیت مدتوں پہلے خراب تھی وہ ارادتاً اہلِ ٹرانسوال سے چھیڑ چھاڑ کرتا رہتا تھا تاکہ وہ مجبور ہو کر لڑنے پر آمادہ ہوں چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ جب اہل ٹرانسوال کی پریشانی ناقابل برداشت حد تک پہنچ گئی تو انہوں نے مجبوراً اعلانِ جنگ کردیا۔

تہذیب و تمدن کے دعویداروں میں سے ہر ایک اقتدار اور سیادت کا طلبگار ہے۔ اور یہ شرف خون کی ندیاں بہائے اور انسانیت اور شرافت کے خال و خط کو مسخ کئے بغیر حاصل نہیں ہوتا۔ زمانۂ وحشت میں وحشی اگر لڑتے تھے تو زندگی کے لئے مردانہ وار دل کھول کر۔ مگر متمدن دنیا لڑتی ہے محض جوع الارض کے مرض میں مبتلا ہو کر فریب اور بہانوں کے ہتھیاروں سے مختلف پردوں کے اندر سے۔ امن پسندی ان کا صرف دعوٰے ہی دعوٰے ہے ورنہ وحشی دور کی بہ نسبت عصرِ تمدن کی لڑائیوں میں ہر قسم کے نقصان بدرجہا زیادہ ثابت ہوئے ہیں۔

موجودہ مدنیت کے دور میں نقصانات جنگ کا اندازہ نہایت دشوار ہے۔ جس وقت سے انسان نے مہذب بن کر جنگیں شروع کی ہیں فقط جانی

مال ہی ضائع نہیں ہوئے بلکہ اس نے اپنا بہت کچھ کھو دیا۔ کارزار کی اجتماعی اور اخلاقی حالت پر بے انتہا اثر پڑا ہے۔ چنانچہ نپولین کہتا ہے کہ جنگ میں اخلاقی قویٰ اس قدر گر جاتے ہیں کہ ان میں اور جسمانی قویٰ میں تین اور چار کی نسبت رہ جاتی ہے۔ تاریخِ تمدن کے قدیم ترین زمانے سے لے کر اس وقت تک تخمیناً سولہ سو عظیم الشان لڑائیاں ہوئی ہیں۔ ان میں سے اگر صرف قرونِ وسطیٰ کی جنگوں کو ہی لیا جائے تو قریب قریب ستر لاکھ جانیں کام آئیں۔ یوں کیوں نہ کہئے کہ چند صدیوں میں موجودہ آبادی سے کئی گنا زیادہ آدمی کی اولاد ضائع ہوئی۔

جس طرح کہ جنگ میں فنا ہونے والی جانوں کا صحیح اندازہ نہیں کیا جا سکتا اسی طرح ان مصارف کا بھی درست تخمینہ نہیں ہو سکتا جو سلطنتوں کو دورانِ جنگ میں برداشت کرنے پڑتے ہیں حالانکہ ایک بڑا بھاری باقاعدہ دفترِ حساب کتاب کے لئے چوبیس گھنٹے کام کیا کرتا ہے۔ پھر اخلاقی، جذباتی اور نسلی نقصانات کی پڑتال کیونکر ہو سکتی ہے جس کا نہ کوئی محتسب ہے نہ محافظ و نگراں۔ گزشتہ ساٹھ ستر سال کے اندر اندر حامیانِ امن و صلح جو لڑائیاں لڑے ہیں اور ان میں جان و مال کی جو غارت گری ہوئی ہے۔ اس کا اصلی حساب بتانا تو آج کل کی پالیسی نہیں ہاں حالات سے جو سرسری اندازہ کیا گیا ہے وہ اس قدر ہولناک ہے کہ الٰہی پناہ لکھتے ہیں کہ اربوں پاؤنڈ تو روپیہ ضائع ہوا اور پچاس لاکھ کے قریب جانیں، آبادیاں ویران، گھرانے تباہ۔ نوادرِ عالم خراب ہوئے سوا الگ۔

ان عظیم الشان نقصانات کی بنا پر مشکل سے کوئی ایسا فلسفی ملے گا جس نے جنگ کی نکوہش نہ کی ہو۔ مگر ایک فلسفی سے جنگ کی نکوہش عجب نہیں تعجب تو یہ ہے کہ خود بعض ان لوگوں نے جنگ کو برا کہا ہے جن کا شمار دنیا کے مشہور جنگ جو سپہ سالاروں میں ہے۔ نپولین کہا کرتا تھا کہ "جنگ ایک بربری حرکت ہے خواہ وہ کتنی ہی شکلیں بدلے تاہم اس کو عہدِ وحشت کی ناگوار یادگار کہنا چاہئے"۔ ولنگٹن کا قول ہے "اگر تم ایک دن بھی جنگ کو دیکھ لو تو خدا سے دعا مانگو کہ پھر وہ تمہیں روزِ جنگ نہ دکھائے"۔ وہی یہ بھی کہتا ہے کہ "جنگ میں شکست سے بدتر فتح ہے"۔

کہا جاتا ہے کہ تمدنِ جدید کا یہ ایک وصفِ امتیازی ہے کہ اس میں جنگ بھی پابندِ قانون ہے، گو واقعتاً اس باب میں ساری خوبیاں اسلام نے پیدا کی ہیں لیکن آج یورپ یا جہاں کہیں کشورستانیاں ہیں وہاں ان فوجی قوانین کو ہاتھی کے دانت سمجھنا چاہیئے کہ دکھانے کے اور ہیں اور کھانے کے اور۔ اربابِ تمدن کا بیان ہے کہ ان قوانین کا مقصد شدائدِ جنگ کو کم کرنا ہے، مگر افسوس واقعات اس کی تصدیق نہیں کرتے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ہر روز مہلک سے مہلک تر اسلحہ ایجاد ہوتے ہیں اور دنیا کی تباہی کا سامان برابر بڑھتا جاتا ہے۔ اگر قوانینِ جنگ کی اصلی غرض شدائد کی تخفیف ہوتی تو ان اسلحہ کی ایجاد کی یا کم از کم استعمال کی ممانعت ہوتی۔

اصل یہ ہے کہ تمدن و قانون باہم دگر لازم و ملزوم ہیں۔ جن قوموں میں تمدن بالکل نہیں۔ ان میں کوئی قانون نہیں اور جن قوموں میں جس قدر تمدن ہے اسی قدر قانون بھی ہے۔ چونکہ قرونِ آخری میں تمدن نے غیر معمولی ترقی کی ہے۔ اس لئے اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ قانون نے بھی ویسی ہی ترقی کی اور صلح سے گزر کر جنگ تک پہنچ گیا۔ رفتہ رفتہ تمام زندہ قوموں کی زبانوں میں اس موضوع پر بھی ایک معقول ذخیرہ ادب تیار ہو گیا۔ بہادری کا مادہ جس نے ابتدا میں جنگی جذبات کو پرورش کیا تھا۔ مکر و کید اور منافست میں تبدیل ہو گیا۔ اور انسان آدمی سے درندہ بن گیا۔

فرمائیے ایامِ وحشت کی جنگ زیادہ خونخوار تھی یا دورِ تمدن کی!

قوانینِ جنگ کی تفصیل نہایت طویل ہے۔ اس وقت ہم صرف ممنوعاتِ جنگ میں سے چند دفعات مشتے نمونہ از خروارے کے مصداق نقل کرتے ہیں۔

(۱) ہتھیار رکھ دینے کے بعد دشمن کو زخمی کرنا۔

(۲) زخمیوں پر حملہ کرنا۔

(۳) دشمن کی طرف سے جب امان طلب کی جائے تو اس کی منظوری سے انکار کرنا۔

(۴) گرفتاری کی حالت میں دشمن کی توہین و تعذیب کرنا۔

(۵) دشمن پر اچانک حملہ کرنا۔

(۶) ایسے گولوں کا استعمال جس سے دشمن کے زخمیوں کو بے فائدہ تکلیف ہو۔

(۷) زہر میں بجھے ہوئے تیروں، پسے ہوئے شیشے یا ڈم ڈم کی گولیوں کا استعمال۔

(۸) آتش گیر گولوں کا استعمال جب کہ فریقینِ جنگ عیسائی ہوں۔ (یعنی ہم مذہب)

(۹) ایسے گولوں کا استعمال جن کا وزن چار سو کیلوگرام سے زیادہ ہو یا جن میں آتشگیر مادے بھرے ہوں۔

(یہ دفعہ ۱۸۶۸ء میں سینٹ پیٹرزبرگ کی کانفرنس میں طے ہوئی تھی)

(۱۰) زہر کا استعمال، خواہ کنوؤں چشموں نہروں وغیرہ میں ڈالا جائے یا کھانے میں، یا اسلحہ اس میں بجھائے جائیں۔

(۱۱) اعلانِ جنگ کے بغیر دفعتہً حملہ کر دینا۔

(۱۲) جھوٹ بولنا (مگر فتح و نصرت کی جھوٹی خبریں شائع کرنا بالکل جائز ہے)

(۱۳) عہد شکنی کرنا (جیسا کہ آج کل داخلِ سیاست ہے)

(۱۴) سامان کی گاڑیوں پر سرخ جھنڈا، جو مریضوں کی گاڑیوں کی علامت ہے نصب کرنا۔

(۱۵) بلڈاگ سے کام لینا کیونکہ وہ درندہ ہے۔

(۱۶) تجارتی بندرگاہوں پر گولہ باری کرنا۔

(۱۷) عورتوں، بچوں اور بوڑھوں پر تلوار اٹھانا۔

تاریخ کے صفحات گواہ ہیں کہ جب کبھی دو غیر مساوی قوموں میں جنگ ہوئی ہے یعنی طاقت اور ضعف یا اکثریت و اقلیت میں تو عام قوانین دفعتہً ٹوٹ گئے ہیں۔ انسانیت، اخلاقی شرافت، نوعی ہمدردی، تہذیب اور امن پسندی کا سارا جذبہ خود کامی کے دیوتا کی بھینٹ کر دیا گیا۔ اور قوی قوم نے اپنے حریف کو زک دینے کے لئے جو وسائل مناسب معلوم ہوتے ہیں اختیار کئے ہیں۔ مثلاً بوروں اور انگریزوں میں جنگ ہوئی، پھٹنے والے گولوں کا استعمال قانون جنگ کی رو سے ممنوع تھا۔ مگر انگریزوں نے کیا۔ ڈمڈم کی گولیاں سخت مہلک اور ممنوع الاستعمال ہیں لیکن ۱۸۵۷ء کے غدر میں انگریزوں نے چلائیں۔ ہتھیار رکھ دینے کے بعد حریف کی فوج پر ہتھیار اٹھانا جائز نہیں لیکن پلونا کے بعد آدھ گھنٹے تک روسی توپ خانے پلونا پر گولے برساتے رہے۔ تجارتی بندرگاہوں پر گولہ باری قانون کے خلاف ہے، اطالیہ نے ۱۹۱۱ء میں ساحل بیروت پر گولہ باری کی۔ غیر مسلح جوانوں، بوڑھوں، عورتوں اور بچوں کا قتل جائز نہیں، مگر نخلستان طرابلس اور میدان ہائے مقدونیہ و تھریس میں بلا تمیز ہر مسلم قتل کیا گیا۔ یہی نہیں بلکہ اس سے بہت زیادہ شرمناک اور الم انگیز واقعات ہیں جو متمدن دنیا برابر دیکھتی چلی آ رہی ہے۔ جنگِ عظیم کو کچھ زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔ اس میں سائنس کے نام سے جیسی جیسی ہلاکت آفرینیاں کی گئی ہیں کیا وہ قانونِ جنگ کے موافق تھیں۔؟

مختصر یہ کہ بقول حکیم سولن "قانون مکڑی کا تار ہے جو اپنے سے کمزور کو دبا لیتا ہے لیکن اپنے سے قوی سے ٹوٹ جاتا ہے" جب سیادت ایک بھوت بن کر سر پر سوار ہو گئی۔ خودی سما گئی۔ دوسروں کی موت میں اپنی زندگی سمجھ لی، تو پھر لڑائی میں لڑنے والوں، برباد ہونے والوں اور زد میں آنے والوں کے ساتھ دردمندی اور رعایت کے سلوک کیا معنی؟ کمزور اپنی کمزوری کے نتائج کیوں نہ بھگتیں۔

واقعہ یہ ہے کہ ہر قانون، ہر حکم اور ہر قوت کے آگے ٹوٹ جاتا ہے، رہ ہو جاتا ہے اور

غزل

رندوں کی نگاہوں میں یہ ابرِ رواں کیا ہے
بہتی ہوئی مستی ہے اُڑتی ہوئی صہبا ہے،

ایامِ گذشتہ کے ماتم کے لئے باقی
ٹوٹا ہوا ساغر ہے۔ پھوٹی ہوئی مینا ہے،

چھپنے کا سلیقہ بھی آیا نہ ستمگر کو
محسوس ہوا مجھ کو کوئی پسِ پردہ ہے

ہستی کی نمائش بھی تضحیک ہے ہستی کی
ہر پھول کے پردے میں اک خندۂ بیجا ہے،

وہ شوخ نظر اُس کی۔ وہ عہدِ شباب اُس کا
چلتا ہوا جادو ہے۔ اُٹھتا ہوا فتنہ ہے،

ساغر کے عوض ایماں ایماں کے عوض ساغر
کیا شیخ نے بیچا ہے کیا میں نے خریدا ہے،

اشعار مرے سن کر کشفی وہ پکار اُٹھے
اب آپ کو سمجھے ہیں اب آپ کو جانا ہے،

کشفی ملتانی

ایک گیت

اب جانا ہے، اب جانا، اب جانا زمانے کو،
اب چھوڑ دیا میں نے چاہت کے ترانے کو!

سپنوں کے سہارے پر چاہا کہ ملوں تجھ سے،
سُکھ سیج کے سپنے میں یہ بھول ہوئی مجھ سے،
سچّائی سمجھ بیٹھا جینے کے بہانے کو!

جینا ہی مرا کیا ہے، جینے کا بہانہ ہے،
ہر سانس کے پہلو میں اشکوں کا خزانہ ہے،
ہنستا ہوں تو ہنستا ہوں غیروں کے دکھانے کو!

سب عمر مری یونہی گذرے گی تو پھر کیا ہے؟
غم بڑھ کے نہ آئے گا اس غم سے جو دیکھا ہے!
کافی ہے یہی دل کا ہر درد مٹانے کو!

جوں توں ہی چلاؤں گا ٹوٹی ہوئی کشتی کو!
اور چاہے زمانے کا ہر تیر ہی زہری ہو،
چُپ چاپ سہوں گا میں ہر ایک نشانے کو،
اب جان لیا میں نے، اب جانا زمانے کو!

میراجی

غزل

وہی ہیں حسن کی گھاتیں کم و بیش
ہر اک سے ہیں ملاقاتیں کم و بیش

ترے ہجراں نصیبوں پر ابھی تک
گذرتی ہیں وہی راتیں کم و بیش

یہ کیسا انقلاب آیا۔ کہ اب تک
وہی دن ہیں وہی راتیں کم و بیش

نہیں مایوس اب تک تیرے ناکام
کہ جاری ہیں مناجاتیں کم و بیش

حیات اتنی عبث جھجکی ہوئی تھی
اجل میں تھیں وہی باتیں کم و بیش

اُمنڈ آتے ہیں آنسو اہلِ دل کے
چلی جاتی ہیں برساتیں کم و بیش

فراق اب تک نگاہِ یار کی ہیں
وہی باتیں، وہی گھاتیں کم و بیش

فراق گورکھپوری

قفس

شانتی نے جھنجلا کر کاغذ کے ٹکڑے کر دیئے اور اٹھ کر بے چینی سے کمرے میں گھومنے لگی۔ اسے یک سوئی حاصل نہ تھی۔ لکھتے لکھتے اس کا خیال کہیں سے کہیں چلا جاتا تھا۔ صرف چار سطریں لکھنا چاہتی تھی۔ لیکن جو کچھ لکھنا چاہتی تھی اس سے لکھا نہ جاتا تھا۔ جذبات کی رو میں کچھ کا کچھ لکھ جاتی تھی۔ وہ چھ خط پھاڑ چکی تھی۔ یہ ساتواں تھا۔

گھومتے گھومتے، وہ چپ چاپ کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی۔ شام کا سورج دور مغرب میں ڈوب رہا تھا۔ مالی نے کیاریوں میں پانی چھوڑ دیا تھا اور دن بھر کے مرجھائے ہوئے پھول گویا نئی زندگی پا کر کھل گئے تھے۔ ہلکی ہلکی ٹھنڈی ہوا چلنے لگی تھی۔ شانتی نے دور —— ڈوبتے ہوئے سورج کی طرف نگاہ دوڑائی پیلی پیلی سنہری کرنیں، گویا ڈوبنے سے پہلے ان چھوٹے چھوٹے بچوں کے کھیل میں جی بھر کر حصے لینا چاہتی تھیں جو سامنے کے میدان کی ہری بھری گھاس پر آزادی سے کھیل رہے تھے۔ سڑک پر دو غریب نوجوان لڑکیاں ہنستی کھیلتی چہلیں کرتی چلی جاتی تھیں۔ شانتی نے لمبی سانس لی اور پھر مڑ کر اپنے ارد گرد ایک تھکی ہوئی نگاہ دوڑائی —— چھت پر بڑا پنکھا ہلکی بھاری سی آواز سے لگاتار چل رہا تھا۔ دروازوں پر قیمتی پردے آہستہ آہستہ ہل رہے تھے۔ اور بھاری کوچ اور ان پر رکھے ہوئے ریشمیں گدے، اور غالیچے اور بیچ میں رکھی ہوئی چھوٹی چھوٹی تپائیاں اور ان پر پیتل کے ننھے ننھے ہاتھی اور پھولدان —— اور اس نے اپنے آپ کو اس پنچھی سا محسوس کیا جو اس وسیع آسمان کے نیچے کھلی آزاد ہوامیں، آم کی ڈالی سے بندھے ہوئے پنجرے میں لٹک رہا ہو۔

اس وقت نوکر اس کے چھوٹے لڑکے کو زبردستی کھینچتا ہوا لایا۔ دھوبی کی لڑکی سے وہ کھیل رہا تھا۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ، اور شانتی نے لڑکے کو پیٹ دیا —— "کیوں تو ان کمینوں کے ساتھ کھیلتا ہے۔ کیوں کھیلتا ہے تو، اتنے بڑے باپ کا بیٹا ہو کر" اور اس کی آواز چیخ کی حد کو پہنچ گئی۔ حیرت زدہ نوکر نے بڑھ کر بچے کو زبردستی چھڑا لیا۔ شانتی جا کر دھم سے کوچ میں دھنس گئی اور اس کی آنکھوں سے بے تحاشا آنسو بہنے لگے۔

....

وہیں بیٹھے بیٹھے اس کی آنکھوں کے سامنے ماضی کی کتنی تصویریں پھر گئیں۔

....

اُس وقت اس کے خاوند نے لانڈری کا کام شروع ہی کیا تھا۔ بائبل سوسائٹی کے سامنے، جہاں آج کل ایک دنداں ساز دھڑلے سے لوگوں کے دانت اکھاڑنے میں مصروف ہے، ان کی لانڈری تھی۔ آمدنی اچھی تھی، لیکن خرچ بھی کم نہ تھا۔ ۲۵ روپے تو دکان کا کرایہ ہی دینا پڑتا تھا اور پھر کپڑے دھونے اور انہیں استری کرنے کے لئے جو ملو ملیہ لے رکھا تھا۔ اس کا کرایہ الگ تھا۔ اس کے علاوہ دھوبیوں کی تنخواہ، کوئلے، مسالہ اور بیسیوں اور جھگڑے۔ ان تمام اخراجات کو نکالنے کے بعد جو تھوڑا بہت بچتا تھا۔ اس سے مشکل کے ساتھ گھر کا خرچ چلتا تھا اور گھر انہوں نے دکان کے پیچھے کی گلی ہی میں لے رکھا تھا۔

یہ گلی جیسی اب ہے، ویسی ہی تب بھی تھی اگرچہ مکانوں کی صورت اس دس برس کے عرصے میں کچھ بدل گئی ہے، لیکن مکینوں میں کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی۔ اب بھی اس علاقے میں ادنیٰ طبقے کے لوگ بستے ہیں اور تب بھی بستے تھے۔ نمدار اندھیری کوٹھڑیوں میں چار، مجبور، گوجا در شدھ ہندو رہتے ہیں —— ایک ہی کوٹھڑی میں رسوئی، بیٹھک، سونے کا کمرہ اور وہ بھی ایسا، جس میں ساس سسر بیٹا بہو، لڑکیاں لڑکے، سب ایک ہی جگہ سوتے ہیں۔

جس مکان میں شانتی رہتی تھی۔ اس کے نیچے ایک طرف ٹینڈی چمار، اپنے آٹھ لڑکے لڑکیوں کے ساتھ رہتا تھا۔ دوسری چوڑی گلی کی طرف مارواڑی بنئے کی دکان تھی اور تیسری طرف، جدھر دروازہ کھلتا تھا۔ بھنگیوں نے تنور لگا رکھا تھا۔ جس کا دھواں صبح شام ان کی رسوئی میں آجایا کرتا تھا۔ اور شانتی، گرمیوں کے موسم میں بھی رسوئی کی کھڑکی کو بند رکھنے پر مجبور ہو جاتی تھی۔

گرمیوں کے دن تھے اور کمیٹی کا نلکا کافی دور بازار کے موڑ پر تھا۔ اس لئے شانتی نے ارد گرد کے غریبوں کی سہولت کے خیال سے اپنے خاوند کے اصرار پر ان کو نیچے ڈیوڑھی کے نلکے سے پانی لینے کی اجازت دے دی تھی۔

لیکن جب انہیں اس مکان میں آئے کچھ دن بیتے تو شانتی کو معلوم ہوگیا کہ یہ فراخ دلی بہت مہنگی پڑے گی۔ ایک دن جب نہانے کے بعد اس کی نئی صابن دانی نیچے ہی بھول آئے اور شانتی اسے اٹھانے گئی تو وہ ندارد تھی۔ پھر کچھ دن بعد تولیا غائب ہوگیا اور اسی طرح دوسرے تیسرے کوئی نہ کوئی چیز گم ہوتے گئی۔ آخر ایک دن شانتی نے اپنے خاوند سے کہہ سن کر نلکے کی ٹونٹی پر لکڑی کا بکس لگوا اسے چھوٹا سا قفل چڑھا دیا اور اس کی چابی اپنے پاس رکھ لی۔

دوسرے دن جب وہ ایک ہی دھوتی سے بدن ڈھانپے پسینے سے تربتر چولہے کے پاس بیٹھی کچھ پکا رہی تھی تو اس نے اپنے سامنے ایک کالی سی لڑکی کو کھڑے دیکھا۔

لڑکی اس کی ہم عمر تھی۔ اس کا رنگ بے حد کالا تھا اور نہایت ہی میلی کچیلی دھوتی اور بنڈی پہنے ہوئے تھی۔ اپنے گہرے کالے بالوں میں شاید وہ سرسوں ہی کا تیل ڈالتی ہوگی۔ کیونکہ اس کی پیشانی پر بالوں کے نیچے پسینے کی وجہ سے تیل میں ملی ہوئی میل کی ایک لکیر سی بن گئی تھی ــــ چوڑا سا منہ اور چپٹی سی ناک۔ گھن کے مارے شانتی کا گلا بھر آیا اور نفرت سے اس نے منہ پھیر لیا۔ آج تک گھر کی جمعدارن کے علاوہ نیچے رہنے والی نیچ ذات کی کسی لڑکی کو اوپر آنے کی جرأت نہ ہوئی تھی۔ اور نہ خود ہی اس نے کسی سے راہ و رسم بڑھانے کی کوشش کی تھی۔

لڑکی مسکرا رہی تھی اور اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی "کیا بات ہے"! جیسے آنکھوں ہی آنکھوں میں شانتی نے پوچھا۔

ذرا مسکراتے ہوئے لڑکی نے درخواست کی۔ "بی بی جی پانی لینا ہے"۔

"ہمارا نلکا بھنگی چماروں کے لئے نہیں"۔

"ہم بھنگی ہیں نہ چمار"۔

"پھر کون ہو"؟

"میں بی بی جی سامنے کے مندر کے پجاری کی لڑکی . . . ."

شانتی نے دھوتی سے چابی کھول کر اس کی طرف پھینک دی۔

زیادہ دیر تک اس کالی کلوٹی میلی کچیلی لڑکی کی باتیں سننا شانتی کو گوارا نہ تھا۔

. . . .

لیکن اس سیاہ رنگ جسم میں دل کالا نہ تھا اور جلد ہی شانتی کو اس بات کا پتہ چل گیا۔ گومتی روز صبح شام چابی لینے آتی۔ گلی میں پوربیوں کا جو مندر تھا۔ وہ اس کے پجاری کی لڑکی تھی۔ امیروں کے مندروں کے پجاری بھی موٹروں میں گھومتے ہیں۔ یہ مندر تھا غریب پوربیوں کا جن میں سے اکثر چوکیدار، چپڑاسی، سائیس یا مزدور تھے۔ پجاری کا کنبہ بھی گلی کے ایک طرف بھنگیوں کی چارپائیوں کے سامنے سوتا تھا اور جب رات کو کوئی تانگہ ادھر سے گذرتا تو اکثر کسی نہ کسی کی چارپائی اس کے ساتھ گھسٹتی ہوئی چلی جاتی۔ مندر میں ایک کنواں تو تھا، لیکن جب سے ادھر نلکے آئے اس پہ ڈول رسی کبھی نہیں دیکھی گئی۔ جب نزدیک ہی کسی کی ڈیوڑھی یا سیڑھیوں کے نلکے سے پانی بہ آسانی مل جائے تو پھر کنوئیں پر باہیں تھکانے کی کیا ضرورت ہے۔ اسی لئے گومتی اب ہر روز پانی لینے اور کچھ پانی لینے کے بہانے باتیں کرنے صبح شام آ جاتی۔ وہ اپنا ڈول جس میں پان کے دو ایک پتے ہمیشہ تیرا کرتے نلکے کے نیچے رکھ کر اوپر چلی آتی اور پھر باتوں باتوں میں بھول جاتی کہ وہ پانی لینے آئی ہے اور اس وقت تک نہ اٹھتی، جب تک کہ اس کی بڑھیا دادی گلی میں اپنی چارپائی پہ بیٹھے بیٹھے، اس کا نام لے کر کئی بار نہ چیختی۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس دوران میں شانتی اور گومتی آپس میں کچھ نزدیک آگئی تھیں۔ ہاں اتنا ضرور ہوا کہ جب شانتی رسوئی میں کھانا پکاتی یا اندر کمرے میں بیٹھی کپڑے سیتی تو اسے گومتی کا سیڑھیوں میں بیٹھ کر باتیں کرتے رہنا برا نہ لگتا ــــ کئی طرح کی باتیں ہوتیں۔ بھنگیوں کی باتیں چماروں کے گھریلو جھگڑوں کی باتیں، شرابی پوربیوں کی باتیں اور پھر خود گومتی کی اپنی باتیں اس دوران میں شانتی کو معلوم ہوگیا کہ گومتی کی شادی ہوئے کئی برس ہو گئے ہیں لیکن اس نے اپنے خاوند کی صورت تک نہیں دیکھی۔ بیکار ہے، اس لئے نہ وہ اسے لینے آتا ہے اور نہ اس کے پتا اسے اس کے ساتھ بھیجتے ہیں۔

کئی بار چھیڑنے کی غرض سے اور کئی بار محض تفریح کے لئے شانتی اس سے اس کے خاوند کے متعلق کئی طرح کے "جذباتی" سوالات کرتی جن کا جواب دیتے وقت گومتی شرما جاتی تھی۔

لیکن ان سب باتوں کے باوجود اس کی جگہ وہیں سیڑھیوں پر رہی تھی۔

. . . .

پھر کس طرح بچاری کی وہ کالی کلوٹی لڑکی وہاں سے اٹھ کر اس کے اتنے نزدیک آ گئی کہ شانتی نے ایک بار اسی بے ساختہ آغوش میں لے کر کہہ دیا "آج سے تم میری بہن ہو میں گومتی"۔ یہ سب باتیں آج بھی شانتی کو اچھی طرح یاد تھیں۔

. . . .

سردیوں کی رات تھی اور انارکلی میں سب طرف دُھواں دُھواں ہو رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ لاہور کے تمام ہوٹلوں، تندوروں، گلی کوچوں اور گھروں کے رسوئی خانوں سے دن بھر اُٹھتا رہنے والا دھواں اب ایک ہی بار اکٹھا ہو کر انارکلی پر پل پڑا ہے۔ شانتی اپنے ننھے کو کندھے سے لگائے ہاتھوں میں کچھ ہلکے پھلکے لفافے تھامے خرید و فروخت کر کے چلی آ رہی تھی۔ وہ کئی دن کے اصرار کے بعد اپنے خاوند کو اس طرف لانے میں کامیاب ہوئی تھی اور انہوں نے جی بھر کر چیزیں خریدی تھیں۔ انارکلی کے درمیان میں بنگالی رس گلوں کی جو دوکان ہے وہاں سے رس گلے کھانے کے لئے شانتی کا من بڑا مچلا کرتا تھا لیکن اس کے خاوند کو کبھی اتنی فرصت نہ ہوئی تھی کہ وہاں تک صرف رس گلے کھانے کے لئے جا سکیں۔ ہسپتال روڈ کے سرے پر حلوائی کے ساتھ چاٹ والے کی جو دُکان ہے۔ اس کی چاٹ کا مزا چکھنے کو شانتی کا بڑا ہی چاہتا تھا لیکن چاٹ جیسی نکمی چیز کے لئے دُکان چھوڑ کر جانے کی فرصت شانتی کے شوہر کو کہاں تھی۔ کئی دن سے وہ اپنے اُمی کے لئے کچھ گرم کپڑوں کے ٹکڑے خریدنا چاہتی تھی۔ سردی بڑھ رہی تھی اور اُس کے پاس ایک بھی کوٹ نہ تھا۔ اور پھر گرم کپڑا نہ سہی اس کا خیال تھا کہ کچھ اُون ہی لے لی جائے تاکہ ننھے کا سویٹر ہی بنا جا سکے۔ لیکن اس نے جب بھی ان سے کہا، وہ ہاں ہوں کر کے ٹال گئے۔ اس دن وہ ایک مہینے کے لگاتار اصرار کے بعد انہیں اپنے ساتھ انارکلی لے جانے میں کامیاب ہوئی تھی اور اُس دن انہوں نے جی بھر کر بنگالی کے رس گلے اور چاٹ والے کی چاٹ کھائی تھی۔ بلکہ لگے ہاتھوں موہن کے پکوڑوں اور مٹر والے آلوؤں کا مزا بھی چکھا تھا۔ پھر اُمی کے لئے کپڑا بھی خریدا تھا۔ اور اون بھی مول لی تھی۔ اس کے علاوہ چھ پیسے درجن والے بلیڈ اور کال گیٹ کپ سوپ کی ایک دو آنے کی ٹکیہ بھی خرید لی گئی تھی۔ کئی دن سے اس کے شوہر انہیں پرانے کند بلیڈوں کو شیشے کے گلاس میں تیز کر کے استعمال کر رہے تھے۔ اور روز نہانے والے صابن سے ہی حجامت بنائی جاتی تھی اور شانتی نے ان کے روکنے پر بھی یہ دونوں چیزیں زبردستی خرید لی تھیں۔ یہ سب کچھ لے کر دونوں خرچ کر سکنے کے احساس سے خوش خوش چلے آ رہے تھے۔

دسمبر کا مہینہ تھا اور سوکھی سردی پڑ رہی تھی۔ شانتی نے اپنے سستے لیکن گرم شال کو ننھے کے ارد گرد اچھی طرح لپیٹتے ہوئے کہا "گوڑا سوکھا جاڑا پڑ رہا ہے سنتی ہوں شہر میں بیماری پھیل رہی ہے"۔

لیکن اس کے پتی چپ چاپ اپنی، دھوئیں کی تلخی سے نمدار آنکھوں کو ملتے رہے۔

شانتی نے پھر کہا۔ "ہماری اپنی گلی میں کئی لوگ بیمار ہو گئے ہیں۔ پرسوں پنڈی چار کا لڑکا نمونیا سے مر گیا"۔

اس وقت شال میں لپٹا ہوا بچہ دو بار آہستہ آہستہ کھانسا۔ شانتی نے اُسے اور بھی اچھی طرح شال میں لپیٹ لیا۔

اس کی بات کو سُنی ان سُنی کر کے اُس کے خاوند نے کہا "آج بے حد بدپرہیزی کی ہے۔ پیٹ میں ابھی سے گڑبڑ ہو رہی ہے"۔

. . . .

گھر آ کر جب شانتی نے لڑکے کو چارپائی پر لٹایا اور پیشانی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اس کے بالوں کو ہٹایا تو وہ چونک کر پیچھے ہٹی۔ اُس نے خوف زدہ نگاہوں سے اپنے خاوند کی طرف دیکھا۔ وہ سر کو ہاتھوں میں دبائے نالی پر بیٹھے تھے۔

"مُنی کا ماتھا توے کی طرح تپ رہا ہے" گلے کو بھر آنے سے روکتے ہوئے اُس نے کہا۔

لیکن اس کے خاوند کوتے ہوئی۔

شانتی کا حلق رکنے سا لگا تھا اور اس کی آنکھیں پرنم سی ہو گئی تھیں مگر اپنے خاوند کو تے کرتے دیکھ کر بچے کا خیال چھوڑ، وہ اُن کی طرف بھاگی پانی لا کر ان کو کلی کرائی۔ نڈھال ہو کر وہ چارپائی پر دراز ہو گئے۔ لیکن کچھ لمحے بعد انہیں پھر متلی ہوئی۔

شانتی کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ گھر میں وہ اکیلی تھی۔ ساس ماں پاس نہیں۔ کوئی دوسرا رشتہ دار بھی نزدیک نہیں اور نوکر رکھنے کی استطاعت کبھی ہوئی نہیں تھی۔ ایک اُڑی اڑی سی نگاہ اس نے اپنے بخار سے تپتے ہوئے بچے اور بدہضمی سے نڈھال خاوند پر ڈالی۔ اچانک اُسے گومتی کا خیال آیا۔ شانتی کبھی تنہا گلی میں نہیں اتری تھی۔ لیکن بے جا شرم کو چھوڑ کر وہ بھاگی بھاگی گلی میں گئی۔ گومتی اپنی کوٹھڑی کے باہر گلی کی طرف اینٹوں کے ایک چھوٹے سے پردے کی اوٹ میں بیٹھی روٹیاں پکا رہی تھی اور آگ کی روشنی میں اس کا کالا

چہرہ دمک رہا تھا۔ شانتی نے دیکھا، گومتی کا بڑا بھائی ابھی کھاتا کھا کر اٹھا ہے۔ پھر کچھ آگے بڑھ کر اس نے گومتی کو بلایا۔ توے کو نیچے اتار اور لکڑی کو باہر کھینچ کر گومتی اسی طرح بھاگی آئی۔ تب نہایت عجز سے شانتی نے مختصراً اپنی مصیبت کا حال کہا اور اس سے درخواست کی کہ اپنے بڑے بھائی کو بھیج کر فوراً کسی ڈاکٹر کو بلوا دے۔ ان کی لانڈری کے پاس جس ڈاکٹر کی دکان ہے۔ وہ سنا ہے پاس ہی لاج روڈ پر رہتا ہے۔ اگر وہ آجائے تو بہت ہی اچھا ہو۔ اور ساڑی کے پلّو سے پانچ روپے کا ایک نوٹ کھول کر شانتی نے گومتی کے ہاتھ میں رکھ دیا اور کہا کہ فیس چاہے پیشگی ہی کیوں نہ دینی پڑے لیکن بھائی سے کہنا کہ ڈاکٹر کو لے کر ضرور آئے۔ چلتے چلتے اس نے یہ بھی درخواست کی کہ روٹی پکا کر اگر ممکن ہو تو تم بھی ذرا آجانا۔ امّی .....

یہ کہتے کہتے شانتی کا گلا بھر آیا تھا۔ گومتی نے کہا تھا ــــ "آپ گھبرائیں نہیں، میں ابھی بھائی کو بھیجے دیتی ہوں اور خود بھی ابھی آتی ہوں"۔ اور یہ کہہ کر وہ بھاگتی ہوئی چلی گئی تھی۔

شانتی واپس آئی تو سیڑھیاں چڑھتے چڑھتے اس نے محسوس کیا کہ فکر اور اندیشے سے اس کے پاؤں کانپ رہے ہیں اور اس کا دل دھک دھک کر رہا ہے۔

اوپر جا کر اس نے دیکھا کہ اس کے پتی کوٹھے پر سے اتر رہے ہیں۔ ان کے ہاتھ میں خالی لوٹا ہے۔ چہرہ پہلے سے بھی زرد ہو گیا ہے اور ماتھے سے پسینہ چھوٹ رہا ہے۔

شانتی کے اڑے ہوئے رنگ کو دیکھ کر انہوں نے ہنسنے کی کوشش کی اور کہا "گھبراؤ نہیں، سردیوں میں ہیضہ نہیں ہوتا!"

شانتی نے پہلے سہارا دے کر شوہر کو بستر پر لٹایا۔ پھر نالی پر پانی گرایا۔ اور پھر دوسرے کمرے میں بستر بچھا کر بچے کو اس پر لٹا آئی۔ اس وقت گومتی آگئی کھانا تو سب کھا چکے تھے۔ اپنے حصے کا آٹا اٹھا کے، آگ بجھا کر وہ جلدی سے آگئی تھی۔

شانتی نے کہا "امّی کو ادھر کمرے میں لٹا آئی ہوں۔ مجھے ڈر ہے اسے سردی نہ لگ گئی ہو۔ سانس مشکل سے آتا ہے۔ اور کھانسی بڑھ گئی ہے۔ نچلی کوٹھری میں پڑے ہوئے لحاف میں سے ذرا سا گودڑ لے آؤ اور انگیٹھی میں کوئلے ڈال کر اس کی چھاتی کو روئی سے سینک دو۔ ان کے پیٹ میں گڑبڑ ہے میں کچھ تدارک کرتی ہوں۔ کچھ نہیں تو گرم پانی کر کے بوتل ہی پھیرتی ہوں"۔

گومتی نے کہا "بی بی جی۔ انہیں کوئی ہاضمے کی چیز دو۔ ہمارے گھر تھے کی اجوائن ہے۔ میں اس میں سے کچھ لیتی آئی ہوں۔ جب تک ڈاکٹر آئے ذرا گرم پانی سے وہی انہیں دے دو"۔

بغیر کسی ہچکچاہٹ کے شانتی نے میلی سی پڑیا میں بندھی ہوئی کالی سی اجوائن لے لی تھی اور گومتی انگیٹھی میں کوئلے ڈال کر روئی لینے نیچے بھاگ گئی تھی۔

. . . .

باہر شام بڑھ چکی تھی۔ وہیں کمرے کے اندھیرے میں بیٹھے بیٹھے شانتی کی آنکھوں میں اندیشوں اور فکر کے وہ سب دن رات پھر گئے۔ اس کے شوہر کو ہیضہ تو نہ تھا لیکن (GASTROENTERITIS) بدہضمی سخت قسم کی تھی۔ ڈاکٹر کے آنے تک گومتی کے کہنے پر شانتی نے انہیں تخم کی اجوائن دے دی تھی۔ پیاز بھی سنگھایا تھا اور گومتی انگیٹھی اٹھا کر دوسرے کمرے میں بچے کے سینے کو روئی سے سینکنے کے لئے چلی گئی تھی۔ ڈاکٹر کے آنے پر معلوم ہو گیا تھا کہ بچے کو نمونیا ہو گیا ہے اور بے حد احتیاط کی ضرورت ہے۔

خاوند اور بچہ، دونوں کی بہ یک وقت تیمار داری کرنا شانتی کے لئے نہایت مشکل تھا۔ اس نے مجبوری کے انداز میں گومتی کی طرف دیکھا تھا۔ لیکن اسے زبان ہلانے کی بھی ضرورت نہ پڑی تھی۔ بچے کی تیمار داری کا تمام بار گومتی نے اپنے کندھوں پر لے لیا تھا۔ شانتی کو معلوم بھی نہ ہوا تھا کہ وہ کب گھر جاتی ہے؟ کب گھر والوں کو کھانا کھلاتی ہے اور خود کھاتی ہے یا کھاتی کھلاتی بھی ہے کہ نہیں اس نے تو جب دیکھا اسے سائے کی طرح بچے کے پاس پایا۔ کئی دن تک ایک وقت ہی کھا کر اور کھانا پکانے کا کام اپنی بوڑھی دادی کو سونپ کر گومتی نے بچے کی تیمار داری کی تھی۔

. . . .

دوپہر کا وقت تھا۔ اس کے خاوند دکان پر گئے ہوئے تھے۔ امّی کو بھی اب آرام تھا اور وہ چارپائی پر اس کی چھاتی سے لگا سو رہا تھا۔ پاس ہی فرش پر ٹاٹ بچھائے گومتی، پرانے اون کے دھاگوں سے سویٹر بننا سیکھ رہی تھی۔ اتنے دنوں کی تھکی ہاری نیند کی ماری شانتی کی پلکیں دھیرے دھیرے بند ہو رہی تھیں وہ انہیں کھولتی تھی لیکن وہ پھر بند ہو جاتی تھیں۔ آخر وہ اسی طرح پڑی پڑی سو گئی۔ جب وہ جاگی تو اس نے دیکھا امّی رو رہا ہے اور گومتی اسے بڑے پیار سے سریلی آواز میں تھپک تھپک کر لوری دے رہی ہے۔ شانتی نے پھر آنکھیں بند کر لیں۔ اس نے سنا گومتی آہستہ آہستہ گا رہی ہے۔

آری ککو، جاری ککو جنگل بکو بیسر
بھیّا ہاتھے ڈھیلا، چڑٹیا اڑسے جا۔

اور پھر

آری چڑٹیا، دو بیڑا پکاسئے جا
بھیّا ہاتھے ڈھیلا، چڑٹیا اڑسے جا

بچہ چپ ہو گیا تھا۔ لوری ختم کرکے اس نے بچے کو گلے سے لگا کر چوم لیا شانتی کی نیم وا آنکھوں نے دیکھا بچے کے پیلے زرد سے چہرے پر گومتی کا معصوم سا کالا منہ جھکا ہوا ہے۔ دُکھ کے آنسو اس کی آنکھوں میں اُمڈ آئے۔ اُس نے اٹھ کر گومتی سے بچے کو لے لیا تھا اور جب وہ پھر کھاٹ پر بیٹھنے لگی تھی تو دوسرے ہاتھ سے اس نے گومتی کا ہاتھ پکڑ کر چارپائی پر بٹھاتے ہوئے اسے اپنے بازو سے باندھ لیا تھا اور کہا تھا — آج سے تم میری بہن ہوئیں گومتی۔

. . . .

آنکھیں بند کئے ہوئے شانتی ماضی کے انہیں مناظر میں گم تھی۔ اس کی آنکھوں سے چپ چاپ آنسو بہہ رہے تھے کہ اچانک اس کے شوہر اندر داخل ہوئے۔ کسی زمانے میں لانڈری کا کام کرنے والے اور وقت پڑنے پر خود اپنے ہاتھ سے استری گرم کرکے کپڑوں کو پریس کرنے میں بھی جھجک محسوس نہ کرنے والے لالہ دین دیال' اور لاہور کی مشہور فرم "دین دیال اینڈ سنز" کے مالک اور مشہور شیئر بروکر لالہ دین دیال میں بڑا بھاری فرق تھا۔ اس دس برس کے عرصے میں ان کے بال اگرچہ پک گئے تھے لیکن جسم زیادہ موٹا ہو گیا تھا۔ اور لانڈری کے مالک ہونے پر بھی پہلے ڈھلے اور میلے کپڑے پہننے کی جگہ اب انہوں نے نہایت اعلیٰ ریشمی کپڑے کا سوٹ پہن رکھا تھا اور پاؤں میں سفید ریشمی جرابیں اور کالے ہلکے سینڈل پہنے ہوئے تھے۔

شانتی نے جھٹ رومال سے آنکھیں پونچھ لیں۔

بجلی کا بٹن دباتے ہوئے انہوں نے کہا — یہ اندھیرے میں کیوں پڑی ہو اٹھو ذرا باہر باغ میں گھومو، پھرو" اور پھر بولے "اندرانی کا فون آیا تھا کہ بہن اگر چاہیں تو آج سینما دیکھا جائے"۔

"بہن" — دل ہی دل میں شانتی غمگینی سے مسکرائی اور اس کے سامنے ایک اور کالی کلوٹی سی لڑکی کی تصویر کھنچ گئی جسے کبھی اس نے بہن کہا تھا۔ لیکن بظاہر اس نے صرف اتنا کہا۔ "میری طبیعت ٹھیک نہیں"۔

منہ پھلائے ہوئے لالہ دین دیال باہر چلے گئے۔

تب آنکھوں کو پھر ایک بار پونچھ کر اور قدرے چست ہو کر شانتی میز کے پاس آئی اور کرسی پر بیٹھ کر پیڈ کو اپنی طرف کھسکا کر، اس نے لکھا۔

بہن گومتی۔

تمہاری بہن اب بڑی بن گئی ہے۔ بڑے آدمی کی بیوی ہے۔ بڑے آدمیوں کی بیویاں اب اس کی بہنیں ہیں پنجرے میں بند پنچھی کو کب اجازت ہوتی ہے کہ آسمان پھاڑنے والے آزاد سہیلیوں سے مل سکے ہیں نے تمہیں پھر آنے کے لئے کہا تھا۔ لیکن اب تم کل نہ آنا۔ اپنی اس بے بس بہن کو بھولنے کی کوشش کرنا۔

شانتی

اس بار اُس نے ایک سطر بھی نہیں کاٹی اور نہ کاغذ ہی پھاڑا۔ ہاں لکھتے لکھتے پھر آنکھیں بھر آنے سے جو ایک دو آنسوؤں کی بوندیں خط پر گریں۔ انہیں اُس نے سیاہی چوس سے سُکھا دیا تھا۔ پھر خط کو لفافے میں بند کرکے اُس نے نوکر کو آواز دی اور اس کے ہاتھ میں لفافہ دے کر کہا کہ پوربیوں کی گلی میں مندر کے پجاری کی لڑکی گومتی کو دے آئے اور پھر سنبھلتے ہوئے کہا "گومتی کچھ ہی دن ہوئے، اپنے سسرال سے آئی ہے"۔

نوکر خط لے کر چلا ہی تھا کہ شانتی نے اسے پھر آواز دی۔ اور خط اس کے ہاتھ سے لے کر پھاڑ ڈالا۔ پھر آہستہ سے اس نے کہا تم گومتی سے کہنا کہ بی بی جی اچانک آج میکے جا رہی ہیں اور دو مہینے تک واپس نہ آئیں گی۔

یہ کہہ کر وہ پھر کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی اور آسمان سے اترتے ہوئے اندھیرے کو دیکھنے لگی۔

بات اتنی ہی تھی کہ آج دوپہر کو جب وہ برج کھیل رہے تھے۔ تو نوکر نے آکر خبر دی تھی کہ پوربیوں کی گلی والے پجاری کی لڑکی گومتی آئی ہے یہ سنتے ہی، کھیل کو ادھورا چھوڑ کر اور یہ بھول کر کہ اس کے پارٹنر رائے صاحب لالہ بہاری لال ہیں، وہ بھاگ گئی تھی اور اس نے گومتی کو اپنے بازوؤں میں بھینچ لیا تھا اور پھر وہ آپس میں دُکھ سکھ کی باتیں کرتی رہی تھیں۔ شانتی کو معلوم ہو گیا تھا کہ جب گومتی کا شوہر کام کرنے لگا تو اسے آ کر لے گیا تھا اور پھر ان دس سالوں میں وہ چار بچوں کی ماں بھی بن گئی تھی اور گومتی نے اُمّی کا اور دوسرے بچوں کا حال پوچھا تھا۔

اس دوران میں لالہ دین دیال کئی بار بلانے آئے تھے لیکن وہ نہ گئی تھی اور جب دوسرے دن پھر آنے کا وعدہ لے کر اس نے گومتی کو رخصت کیا تھا تو اس کے شوہر نے آکر کہا تھا۔ تمہیں شرم نہیں آتی۔ اس اجڈ اور گنوار عورت کے ساتھ اتنی دیر تک بیٹھی رہیں تمہیں میری عزت کا ذرا بھی خیال نہ آیا اسے بغل میں لے کر ان سب کے سامنے سے گذر گئیں۔ رائے صاحب اور ان کی بیوی ہنسنے لگے اور آخر انتظار کرکے چلے گئے . . . .

اس کے بعد اس کے خاوند نے اور بہت کچھ کہا تھا لیکن شانتی نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ قفس کو قفس ہی سمجھے گی اور اڑنے کی کوشش نہ کرے گی۔ **اُسے اندر ناتھ اشک**

کُنجِ خرابات

مطربہ! ساز بجا، سوز کا نوحہ کیسا!
ساقیہ! جام اُٹھا، یاس کا سکتہ کیسا؟

صحبتِ ساغر و مینا میں تفکر کیا چیز
قربتِ جام و سبُو میں غمِ دُنیا کیسا؟

پہلوئے ساقیٔ نوخیز میں حسرت کیا شے
حسرتِ مغبچہ میں خونِ تمنا کیسا؟

پیرِ میخانہ کے زانو پہ نہیں غم کی جبیں
دوشِ مے نوش پہ بارِ غمِ عقبیٰ کیسا؟

سرِ و مینا کے گھنے سائے ہیں کیا فکرِ مآل
جوئے صہبا کے کنارے غمِ فردا کیسا؟

گردشِ جام سمجھتے ہیں اسے بھی میکش
گردشِ گنبدِ افلاک کا شکوہ کیسا؟

جوشِ بادہ سے یہاں کرتے ہیں سامانِ بہار
موسمِ گُل کے گذر جانے کا کھٹکا کیسا؟

ہر گھڑی جام سے جس جا ہو طلوعِ خورشید
اُس جگہہ فرقِ صباح و شبِ یلدا کیسا؟

مرکزِ کیف پہ قائم ہوں عناصر جس جا
اُس جگہہ دورِ تغیّر سے گذرنا کیسا؟

ساقیٔ حور شمائل ہو جہاں بادہ فروش
اُس جگہہ طنطنۂ جنّتِ ماوےٰ کیسا؟

مطربِ زہرہ خصائل ہو جہاں ساز بدوش
اُس جگہہ زمزمۂ سدرۂ و طوبےٰ کیسا؟

رقص کرتے ہوں جہاں زہرہ جبیں جام بدست
اُس جگہہ گردشِ تقدیر کا رونا کیسا؟

بے نیازی ہو جہاں دولتِ دو عالم سے
اُس جگہہ تذکرۂ دولتِ دارا کیسا؟

جس جگہہ خاک نشینوں کا برستا ہو وقار
اُس جگہہ دبدبۂ قیصر و کسرےٰ کیسا؟

مرگِ مستی ہو جہاں عمرِ دوروزہ سے عزیز
اُس جگہہ کوئی رہینِ دمِ عیسےٰ کیسا؟

حسنِ مخمور کے پہلو میں جہاں سوئے شباب
اُس جگہہ شیب کی یورش کا ہے خطرہ کیسا؟

زندگی رقص کرے زہرہ جبینوں میں جہاں
اُس جگہہ موت کا اعجاز ہے کھٹکا کیسا!

سعید احمد اعجازؔ

کلکتے کا جو ذکر کیا تو نے ہمنشیں

ایک خط

تبدیلِ کلکتے میں آئے ہوئے آج مجھے پورے بیس روز ہو گئے ہیں۔ شہر کا کافی حصہ دیکھ چکا ہوں اور ابھی معلوم نہیں کتنا باقی ہے۔ بھائی عزیز نے مجھے کشمیر سے خط میں پوچھا تھا کہ کلکتہ کیسا ہے! میں نے جواب دیا "انارکلی کی عمارتوں کو دُگنا اونچا کر دیجئے اور تعمیر کے لحاظ سے پچاس گنا بہتر، رونق بیس گنا زیادہ، دُکانیں سو گنا بڑی، سڑک چار گنا چوڑی اور بجائے ہیٹ اور سوٹ والے صاحبوں کے سر سے ننگے دھوتی پوش رہگذروں کا ایک دریا بہا دیجئے اور بازار کو انارکلی سے ساٹھ گنا لمبا کر دیجئے اور پھر یوں سمجھئے کہ آپ شہر میں جس طرف بھی جائیں خواہ وہ چینگر محلہ ہو یا چونے منڈی۔ گندی گلی ہو یا لنڈا بازار۔ شمشان بھومی ہو۔ یا دھونی منڈی، غرض ہر طرف یہی عظیم الشان انارکلی پیشِ نظر ہو جائے تو اُسے کلکتہ سمجھ لیجئے"!

اس پر عزیز نے لکھا کہ واہ یہ کیا بات ہوئی۔ ہمارے کشمیر میں مہاراجہ بہادر سڑکوں کو کشادہ کرنے کا ارادہ فرما رہے ہیں اور پھر ان سڑکوں پر دھوتی باندھ کر ننگے سر پھرنا کونسی بڑی بات ہے۔ سردی تو لگے گی۔ لیکن کلکتے کا لطف تو ہم بھی اٹھائیں گے" میں کہتا ہوں یہ سب ٹھیک سہی لیکن وہ بات کہاں سے لاؤ گے جس کی وجہ سے کلکتے کا ذکر کرتے ہی مرزا غالب کے سینے میں تیر لگتا تھا؟

لیکن سچی بات یہ ہے کہ وہ تیر لگنے والی بات میں نے بھی ابھی تک نہیں دیکھی۔ عزیز کو تو میں نے لکھا نہیں لیکن اپنی جگہ سوچتا ہوں تو کچھ سمجھ میں ہی نہیں آتا۔ یہاں کی تجارت بے شک بڑی ہے۔ جہاں وائٹ وے لیڈلا کی سر بفلک عمارت کے رو برو اسپلینڈ میں ساندہ آئل کمپنی لکھنؤ کا شبینہ دفتر آراستہ ہوتا ہے جو بارہ بیماریوں کی دوا محض اشتہار کی خاطر چار آنے میں فروخت کرتے ہیں اور اگر بر وقت نہ خریدی جائے تو ساندہ آئل کمپنی لکھنؤ کے پتے سے منگوانے پر پورے ایک روپیہ چار آنے میں ملتی ہے۔ لیکن مرزا تو سو پشت سے سپہ گری کرتے چلے آ رہے تھے۔ اس سے انہیں کیا! عمارتیں بڑی ہیں تو ہوا کریں، مرزا کا اپنا ذاتی مکان موجود تھا۔ جس کی چھت باوجود اس کے کہ مینہ ایک گھڑی برسے تو یہ چار گھڑی ٹپکے" لیکن تھی تو اپنے گھر کی۔ اب یہ معلوم نہیں کہ مرزا کے سینے میں کسی لعبت چین کی جادو بھری آنکھوں کا تیر لگتا ہو۔ کیونکہ یہاں چینی ہو ٹل بیشمار ہیں۔ مثلاً ٹینڈ فو اینڈ کمپنی، ین ین اینڈ کمپنی، پنگ پنگ چاؤ اینڈ کمپنی، لی۔ چی چانگ اینڈ کمپنی اور اسی طرح کے دوسرے افیون چی اینڈ کمپنی ہیں ان دکانوں میں ٹینڈ فو، ین ین، پنگ پنگ تو اصل میں ایک ہی ہوتا ہے باقی اینڈ کمپنی میں پچکی ہوئی ناک والی، ابھرے ابھرے گالوں والی، دبے ہوئے سینے والی ایک چینی عورت اور سر سے پیر تک زرد روئی کے بنے ہوئے نرم نرم چانگ چانگ اور ننھی منی میاؤ میاؤ شامل ہوتی ہیں۔ لیکن باوجود ان کمپنیوں کے کواڑوں میں سے گھور گھور کر تکنے کے مجھے آج تک وہ لعبتِ چین نظر نہیں آئی جس کی آنکھوں کے تیر میں حضرت غالب کو گھائل کرنے کی اہلیت ہو۔

بنگالی دیویاں، جہاں تک میں نے دیکھا ہے پردے میں رہتی ہیں اور ہمارے لاہور کی انارکلی یا نسبت روڈ کی دعوتِ نظارہ دینے والی تیتریاں یہاں بالکل ناپید ہیں۔

پھر وہ ہائے ہائے والی شے آخر کہاں چھپی ہوئی ہے؟ قدرتی نظارے اور شہر کے مضافات کی دلفریبی میں؟ یقیناً ساحل سمندر اور پہاڑ سطح ارضی کے دلفریب ترین نظارے شمار کئے جاتے ہیں۔ لیکن سمندر سنا ہے کہ یہاں سے اسی میل دور ہے اور پہاڑ اگرچہ مجھے صحیح طور پر معلوم نہیں لیکن یہاں کی چلچلاتی ہوئی گرمی بتا رہی ہے کہ یقیناً کوسوں دور ہوں گے۔ باقی رہا ہگلی کا نظارہ۔ اس میں شام کے وقت سمندر کے جذر و مد کی وجہ سے کلکتے کی ۲۴ لاکھ آبادی کا پہینوں کا جمع شدہ وہ مواد جس کے دیکھنے سے معدے میں امتلا اور ناک میں بم پھٹنے کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ اس بہتات کے ساتھ تیچھے کی طرف حملہ کرتا ہے کہ اس کے تیروں سے دماغ چھلنی ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ تیر سینے میں تھوڑی لگتے ہیں؟

میری سمجھ میں ایک بات آئی ہے۔ وہ یہ کہ حضرت غالب شراب کے بڑے رسیا تھے۔ باوجود اس کے کہ شراب دیسی تو دیسی، ولایتی بھی اُن دنوں

بہت سستی تھی، (جیسا کہ خود اُن کے بعض خطوط سے ظاہر ہے) اور وہ کلکتے میں تاڑی کی ارزانی سے خوب مستفیض ہوئے ہوں گے۔ تاڑی غریبوں کی شراب ہے جو پیتے ہیں پیٹ بھی بھر جاتا ہے اور نشہ مفت میں رہتا ہے۔ یا دش بخیر ریاض خیرآبادی کہہ گئے ہیں۔

جیسی پائی شراب پی لی، اچھی پی لی خراب پی لی،
مدت سی ہے نشہ نہ ہے نہ کیف پانی نہ پیا شراب پی لی

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کلکتے میں صرف دو قسم کے آدمی بستے ہیں۔ ایک وہ جو یہاں کی سر فلک عمارتوں میں دولت کے کوہ نما ڈھیروں پر بیٹھے ہوئے ٹیلیفون کے ذریعے سے لوگوں کی جیبوں کا روپیہ اس صفائی سے کھینچ لے جاتے ہیں کہ دائیں ہاتھ سے نکالیں تو بائیں کو خبر نہ ہو۔ اور دوسرے وہ مفلس و قلاش جو دن کے چوبیس گھنٹے سڑک کے کنارے بیٹھے ہوئے گذار دیتے ہیں اور پھر سر شام ہی سے اپنے بوریے پر یا بغیر بوریے کے وہیں دراز ہو جاتے ہیں اور اُس وقت تک نہیں اٹھتے جب تک کہ دوسرے دن کی دھوپ ان کے جسم کی رطوبت کو آدھے کے قریب سکھا نہ دے۔

پہلی قسم کے لوگ صبح اور شام کے وقت اپنی بے حد خاموش یا پھر ہوائی جہاز کی طرح شور کرنے والی موٹروں پر سوار نظر آتے ہیں۔ ان میں وہ لوگ جنہوں نے دن میں پیٹ بھر کر کمائی کی ہوتی ہے ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر براجمان ہوتے ہیں اور وہ جنہیں اپنے کسی داؤں کے نتیجے کا انتظار ہوتا ہے۔ ایسے بیٹھتے ہیں گویا ابھی جھپٹ کر اپنے شکار پر جا پڑیں گے اور اس کا سب کچھ اچک لے جائیں گے۔

ان لوگوں پر مجھے دہرا غصہ آتا ہے۔ ایک تو اُن کی امارت کی وجہ سے جس میں شاید غصے کے بجائے رشک و حسد کا عنصر زیادہ ہوتا ہے۔ دوسرے ان کی حرص زر کی وجہ سے۔ اور غصہ کیوں نہ آئے۔ ہم صبح سے شام تک چوٹی سے ایڑی تک پسینہ بہاتے ہیں اور پھر شام کے وقت بجائے یہ سوچنے کے کہ آج کیا کمایا! یہ دیکھتے ہیں کہ آج کتنا خرچ ہوا اور یہ چمکتی ہوئی موٹروں پر بیٹھنے والے گینڈے "خس خانہ و برفاب" والے دفتروں میں بیٹھے بیٹھے ٹیلیفون کے تاروں کے ذریعے سے معلوم نہیں کتنا روپیہ بٹور کر اپنی تجوریوں میں بھر رہے ہوتے ہیں۔

میرے ساتھ والے کمرے میں مسٹر مالک رام ایم اے حال ہی میں وارد ہوئے ہیں۔ شام کے وقت رنگا رنگ کی موٹروں کو گذرتے ہوئے دیکھ کر ان کے منہ میں بھی پانی بھر آتا ہے۔ چند روز تک یہ عالم رہا کہ وہ ہر روز کہتے ہیں "بھائی مظفر! کس رنگ کی موٹر لیں؟ کس کارخانے کی لیں؟" میں بہتیری تجویزیں پیش کرتا ہوں، کئی "قرۃ العین" اور "جنت نگاہ" بتاتا ہوں اور پھر وہ لز رائس سے لے کر ۱۹۰۵ء کی فورڈ تک پیش نظر کر دیتا ہوں لیکن وہ کچھ قطعی فیصلہ نہیں کر سکتے۔ آخر تنگ آ کر پرسوں ایک روپیہ پونے چار آنے کا چھاتہ خرید لائے۔ چنانچہ اب اسی پر سوار ہو کر روزانہ دفتر جاتے ہیں۔

ہاں اس سے مجھے خیال آیا کہ کلکتے میں ایک تیسری قسم موجود تو ضرور ہے۔ جس کی سب سے بڑی شوقین مزاجی یہ ہوتی ہے کہ سر میں ناریل کا تیل لگائے ہوئے گلے میں کھلی آستینوں کا سفید کرتہ اور نیچے سفید باریک دھوتی پہنے جس کا لمبا فالتو پلو بائیں ہاتھ میں تھاما ہوا ہوتا ہے۔ خراماں نظر آتے ہیں۔ ان میں "بڑا بابو" اور "چھوٹا بابو" دونوں شامل ہیں۔ فرق صرف یہ ہوتا ہے کہ بڑے بابو کا پلو ضرور لمبا اور بائیں ہاتھ میں پکڑا ہوا ہوتا ہے اور دائیں ہاتھ میں چھاتہ اور چھوٹا بابو اگر اپنے آپ کو بڑا بابو ظاہر نہ کرنا چاہے تو اس پلو کو کمر میں اٹکا لیتا ہے یا پھر بے چارے کی دھوتی ہی اتنی لمبی نہیں ہوتی کہ اس کے "دامن میں" ہاتھ کا "خار الجھانے" کی ضرورت پڑے۔

خیر یہ لوگ میرے لئے جاذب نظر نہیں ہیں یہ ایک جوئے نغمہ خواں کی طرح یونہی خاموشی سے اپنے من کے گلشن میں بہے چلے جاتے ہیں۔ میں صرف اُن دو طبقوں کو دیکھتا ہوں جن میں سے ایک سمندری تیندوے کی طرح اپنے لمبے لمبے رستے ایسے بازوؤں سے دور ہی سے اپنے شکار کو جکڑ لیتا ہے اور پھر جب اس کے بدن میں خون کا ایک قطرہ بھی باقی نہیں رہتا تو اسے بے رحم موجوں کے سپرد کر دیتا ہے۔ اس کی بے جان لاش سمندر کی ہر موج کے ساتھ اٹھتی ہے اور پھر جہاں وہ موج چاہتی ہے اسے پھینک دیتی ہے۔ ایک مظلوم، بے بس، لاچار لاش جس کی ہست و بود میں اس کی اپنی مرضی کو کچھ دخل نہیں ہوتا۔ دوسرا قلاشوں اور فقیروں کا طبقہ۔

تمام دنیا کے فقیر ہیں تو ایک ہی تیر کے گھائل یعنی نوع انسان کی بے انصافی اور اس کے جذبۂ طلب جاہ و دولت اور حرص و ہوا کے زخم خوردہ لیکن میں نے دیکھا ہے کہ مختلف جگہوں کے فقیروں کا طرز عمل اور عادات و اطوار بہت حد تک مختلف ہیں۔

ہمارے پنجاب کے فقیر ایک خاص قوت کے مالک ہیں یعنی صاحب قوت مدعیٰ ہیں اور اس کے علاوہ یہ قبیلے اور خاندان کی صورت میں حملہ آور ہوتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ مبارز طلبی پرانی روایات کے مطابق اکیلے اکیلے ہی کرتے ہیں۔ مثلاً آپ انارکلی میں گرمیوں کی دھوپ سے جل کر لستی

پینے کے لئے سردار بھگوان سنگھ کی دکان پر کھڑے ہو گئے ہیں۔ فقیروں کا ایک خاندان جس کے ورثے میں وہ خاص علاقہ ہے فوراً آپ کی فضول خرچ طبیعت کو بھانپ جائے گا۔ لیکن ابھی حملہ کرنے میں دیر ہے۔ سردار صاحب اپنے پہلے کے آئے ہوئے گاہکوں سے نبٹ کر آپ کے لئے بھی نہایت میٹھے دہی کی لسی برف سے ٹھنڈی کر کے، گلاس کو لبالب بھر کر آپ کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ آپ نے ابھی بمشکل ایک ہی گھونٹ گلے سے نیچے اتارا ہوگا کہ یکایک آپ کی پشت کی طرف سے ہلکی ہلکی ہوا آنی شروع ہوگی۔ آپ لسی کے مزے لے رہے ہیں اور شاید سمجھتے ہیں کہ گلاس کی خنکی آپ کی پشت تک اثر کر رہی ہے۔ کہ خود بخود یہ ہوا آپ کو دائیں طرف سے آنی شروع ہوگی۔ آپ پھر بھی لسی کے خیال میں مگن ہیں لیکن یکایک ہوا کا رُخ بدل کر آپ کے بائیں طرف آجائے گا اب تو آپ سٹ پٹا کر ادھر کو دیکھا ہی چاہتے ہیں کہ ایک آواز آتی ہے ”بابا بچہ بھوکا ہے!“

اب آپ لسی پی کر دیکھئے، جب تک اس عورت کی گود کا زرد رو بھوکا بچہ آپ کے سامنے ہے۔ آپ ٹھنڈی میٹھی لسی کا ایک بھی گھونٹ زہر ہلاہل سے لذیذ تر سمجھ کر حلق سے نیچے اتار جائیں تو میرا ذمہ۔

”مائی معاف کرو“ کہتے ہوئے آپ پھر گلاس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں لیکن توبہ کیجئے اس جنگ میں معافی کا نام نہیں۔ وہ اور زور سے پنکھا ہلائے گی۔ اس کی باچھیں لجاجت سے کانوں تک کھل جائیں گی۔ اور وہ پھر کہے گی ”بابا یتیم بچہ ہے۔ بھوکا ہے“ (یا اندھا ہے۔ یا لنگڑا ہے یا کانا ہے، یا بیمار ہے۔ جو کچھ بھی وہ ہوگا اور وہ ہوگا ضرور کچھ نہ کچھ!)

اب ایسے موقعے پر لسی پینے والے تین قسم کے ہوں گے۔ ایک وہ جو لکد کوبی تک نوبت لے آئیں گے اور اس میں اُن کی آدھی کے قریب لسی گر جائے گی۔ دوسرے وہ جو جلدی سے لسی کا گلاس زہر مار کر کے سردار جی کو پیسے دے، یہ جا وہ جا ہو جائیں گے۔ تیسرے وہ جو مائی جی کے یتیم، بیمار، اندھے، لولے، لنگڑے یا کانے بچے کے لئے ایک پیسہ عنایت کر دیں گے یہ تو پیسہ لے کے کھسکی لیکن اس کے بعد ایک تانتا بندھ گیا۔ دوسری مائی جی آ گئیں، پھر تیسری، پھر ایک لڑکا، پھر دو لڑکیاں، پھر ایک بچہ جو ابھی بولنا یا چلنا بھی اچھی طرح نہیں جانتا۔ سب کو دیتے جائیے تو آخر میں وہ صاحب تشریف لائیں گے جن کی غیر موجودگی کی وجہ سے پہلی مائی جی بیوہ اور ان کا بچہ یتیم تھا اور حقیقت یہ ہے باقی دو خاتونوں کے مرحوم خاوند اور چھیوں بچوں کے والد ماجد جن کا سایہ ان کے سر سے اس بے چارگی کے عالم میں اٹھ گیا تھا یہی ہیں۔

میرے محبوب پنجابی فقیروں کی یہ صرف ایک قسم ہے جو غالباً پورب سے آکر یہاں آباد ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ بھی چند غیر صوبائی قسمیں ہیں۔ مثلاً تانگے کے پیچھے دوڑنے والے بچے جن کی دو دو میل تک کی دوڑ اور ”اے مائی بی بی پیسہ، اے مائی بی بی بی پیسہ“ کی تکرار بڑی بڑی مضبوط مٹھی کے مالکوں اور بڑی بڑی گٹھ بند دیویوں تک کا دل پسیجنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔

لیکن خالص پنجابی فقیر بڑا سرگرم قسم کا انسان ہوتا ہے۔ یہ لوگ بمبئی، مدراس، رنگون اور کلکتہ تک کمانے کے لئے نکل جاتے ہیں اور لطف یہ کہ کما کر لاتے ہیں۔ یاد ش بخیر ہمارے موچی دروازے میں ایک حافظ جی تھے۔ (اگر [illegible] ہیں تو خدا ان کی ہمت میں اضافہ کرے اور اگر وہ وفات پا چکے ہیں تو اللہ انہیں اپنے جوار رحمت میں جگہ دے) ایک لمبا سا موٹا عصا اُن کے ہاتھ میں ہوتا تھا جس کے سرے پر چند گھونگرو بندھے ہوتے تھے۔ اسی عصا کو زور زور سے زمین پر مارتے اور گھونگرو بجاتے ہوئے اللہ ہو۔ اللہ ہو پکار کر اس قدر بے تحاشا چلا کرتے تھے کہ راہ چلتوں کو آگے سے ہٹنے کی فرصت بھی نہ ملتی تھی۔ آپ ہر سال بمبئی جاتے تھے اور کہتے تھے کہ وہاں کے سیٹھ دیتے تو ایک ہی دھیلہ ہیں لیکن دینے والے بہت ہیں۔ انہیں دنوں سنا تھا کہ ایک دکاندار نے ان کے بارہ سو روپے ہضم کر لئے ہیں۔ اس کے بعد مقدمہ بازی بھی ہوئی لیکن جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے حافظ جی کو عدم شہادت کی وجہ سے کامیابی نہ ہو سکی۔

یا پھر میرے بچپن کے محلہ دار ”سانپ کی سری“ عرف غلام محمد ہیں۔ بڑے خوش مزاج اور بامذاق ہیں بچپن میں ہمارے ساتھ کھیلتے رہے ہیں اور بس پھر کھیلتے ہی رہے۔ رانڈ کا سانڈ مشہور ہے چنانچہ ان کی والدہ محنت مزدوری کر کے ان کا پیٹ بھر دیتی تھیں۔ نوجوانی میں پیر بن گئے۔ وہ زمانہ خوشحالی کا تھا، لوگوں کے اعتقادات بھی ذرا اچھے تھے۔ آج کل کی طرح تنگدستی اور کفر کا دور دورہ نہ تھا۔ لیکن جب سے کاروبار ڈھیلے پڑے ہیں اور عسرت اور بے دینی نے چاروں طرف پاؤں پسارے ہیں۔ ان کی پیری مریدی کا بازار بھی سرد پڑ گیا ہے۔ اب وہ فقیر ہیں۔ داڑھی اور سر کے بال ۹۰ فی صدی سفید ہو چکے ہیں اور بطور ملمع کپڑوں کی غلاظت کے علاوہ سر میں گرد کا انبار اور داڑھی میں تھوکوں کے جوہڑ پھنسائے رکھتے ہیں۔

مدتوں کے بعد میں نے جو انہیں دیکھا تو میو ہسپتال کے دروازے کے سامنے ایک تاریک سے کونے میں اپنے عصائے مبارک پر جھکے ہوئے فرما رہے تھے ”بابا آنکھیں بڑی نعمت ہیں“۔ مجھے آواز کچھ آشنا سی معلوم ہوئی۔ نزدیک گیا تو میرا یار ”سانپ کی سری“ میں نے آہستہ سے کہا ”غلام محمد یہ کیا“ مگر پھیلا رکھا

ہے"! انہوں نے سر اٹھا کر میری طرف غضب ناک آنکھوں سے گھورا لیکن شاید مجھے پہچانا نہیں۔ کہنے لگے "جاؤ بابو۔ فقیروں سے شرارت کر کے کیا لوگے۔ ہمیں کوئی پیسہ مانگنے دو"۔ میں نے چند پیسے دئیے اور چپکے سے چلا آیا۔ اتفاق کی بات چند روز بعد دن کے وقت اپنی دونوں بڑی نعمتوں کے بل پر چلتے ہوئے پھر مل گئے۔ میں نے پھر تو کا یقین جانئے کہ یہ مٹی اور ٹھوکروں سے بنیا ہوا بھوت جو لفرہ مار کے پیچھے چمٹا ہے تو چھوڑنے کا نام اس وقت تک نہ لیا جب تک حسب خواہش مجھ سے پیسے نہ رکھوا لئے۔

پھر کہنے لگے "بابو سنو، وہ میاں صاحب اب ہم سے کوٹھڑی کا کرایہ مانگتے ہیں۔ کہتے ہیں ہم دو روپے کرایہ لیں گے۔ اگر نہیں دیتے تو مکان خالی کر دو"۔ میں نے کہا اول تو مجھے اس بات پر یقین نہیں آتا کہ میاں صاحب نے تم سے کرایہ مانگا ہو اور اگر ان کے کسی منشی وغیرہ نے تم سے مطالبہ کیا بھی ہو تو کیا ہوا آخر کماتے ہو تو دو روپے کرایہ بھی دے دیا کرو۔ "سانپ کی سری" ایک منٹ تک میری بات پر غور کرتا رہا۔ پھر بولا "بابو! اصل میں بات یہ ہے کہ ساری عمر مانگتے ہی گذر گئی۔ ہر چیز مانگتا ہوں۔ مانگ کر کھاتا ہوں۔ مانگ کر پہنتا ہوں اور اب تک مانگے کے مکان ہی میں رہتا بھی رہا ہوں۔ کچھ ایسی عادت پڑ گئی ہے کہ اب دیتے ہوئے شرم سی محسوس ہوتی ہے خواہ وہ مکان کا کرایہ ہی کیوں نہ ہو"۔

میں نے کہا اچھا میں میاں صاحب سے مل کر تمہارا ذکر کروں گا۔ اس پر وہ مسکرا دیا اور کہنے لگا۔ "بابو جانے دو۔ جھوٹ بولنے سے کیا فائدہ۔ تم دو قدم آگے گئے اور "سانپ کی سری" کا خیال بھی تمہارے ذہن سے اتر جائے گا۔ پھر تم میرے لئے میاں صاحب کے پاس کیوں جانے لگے اور حقیقت یہ ہے کہ نہیں جانے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ "سانپ کی سری" سے پیسہ نکالنا کوئی معمولی بات ہے"۔ اب بھی کبھی کبھی ملتا ہے۔ لیکن ہر مرتبہ اسی تپاک کے ساتھ "گلوگیر" ہو جاتا ہے اور جب تک اپنا ٹیکس وصول نہیں کر لیتا اپنی گرفت ڈھیلی نہیں کرتا خواہ اس کے بعد میری جیب میں سوٹ پر سے تھوکوں کے داغ دھلوانے کے لئے دام باقی رہیں یا نہ رہیں۔

اس غریب الوطنی میں، ہوٹل کے اس کمرے میں بیٹھے ہوئے مجھے یکے بعد دیگرے اپنے سارے عزیز فقیر یاد آ رہے ہیں۔ مثلاً وہ چرس کا رسیا، ڈاڑھی منڈا جو ہر وقت مونچھوں پر تاؤ دئیے رہتا ہے۔ عام طور پر مال روڈ پر حکومت کرتا ہے۔ اس میں ایک خوبی یہ ہے کہ پیٹ بھرے شیر کی طرح جس کے پاس سے ہرنوں کے غول کے غول نکل جائیں تو آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا یہ بھی ہزاروں لوگوں کے پاس سے گذر جائے گا اور کچھ نہیں مانگے گا۔ پھر یکایک ایک شخص کا انتخاب کرے گا۔ ایک اور صرف ایک پیسہ مانگے گا۔ اگر آپ ایک پیسہ دے دیں تو پھر دو مانگے گا۔ اگر دو بھی مل گئے تو پھر ایک آنہ۔ اس کے بعد دو آنے اور ساتھ ساتھ ہزاروں قسمیں کھاتا جائے گا بس دو آنے دے دو پھر نہیں مانگوں گا۔ فرض کیجئے کہ کوئی سرپھرا دو آنے بھی دے دے تو پھر یہ چار آنے کے لئے قسمیں کھانی شروع کرے گا۔ اس کے بعد یا بعض اوقات اس سے پہلے ہی آدمی اپنا پیچھا چھڑانے کے لئے تیز تیز چلنا شروع کر دیتا ہے لیکن وہ بھی اتنا ہی تیز چلے گا۔ اب اگر مخیر صاحب دوڑنا شروع کر دیں تو وہ بھی دوڑنے لگتا ہے اور ساتھ ساتھ قسمیں کھاتا چلا جاتا ہے کہ خدا کی قسم اب کے دے دو۔ قرآن کی قسم پھر نہیں مانگوں گا۔ اللہ کی قسم یہ آخری بار ہے۔ رسول کی قسم اور مانگا تو مجھے فقیر نہ کہنا کتا کہنا"۔

لیکن اللہ کی قسم اگر اس دفعہ بھی اسے مل جائے تو وہ آپ کا پیچھا نہ چھوڑے گا یہاں تک کہ یا تو آپ بھاگ کر کسی موٹر میں کود پڑیں یا وہ موٹر کے نیچے آ کر کچلا جائے لیکن پھر بھی میں آپ کو یقین نہیں دلا سکتا کہ واقعی آپ کی رہائی ہو جائے گی یا نہیں۔

ہندوستانی فقیروں میں ایک طبقہ اور بھی ہے جو غالباً راد سے سوامی کہلاتا ہے۔ یہ لوگ اصولاً پیسے کو ہاتھ نہیں لگاتے، صرف اپنی ضروریات صاحب استطاعت لوگوں سے پوری کرا لیتے ہیں۔ یہ فقیر سر سے پیر تک گیرو سے کپڑوں میں ملبوس رہتے ہیں اور فصلی پرندوں کی طرح مختلف موسموں میں ہندوستان کے مختلف حصوں میں نقل مکان کرتے رہتے ہیں۔ گرمیوں میں سرینگر کی سڑکوں پر سینکڑوں اور ہزاروں کی تعداد میں ملتے ہیں۔

ان لوگوں کے تبحر علمی اور پاکیزہ خیالات کا علم مجھے پہلی مرتبہ ۳۵ء میں ہوا۔ میں اپنے ٹھیکے کے کام کے ضمن میں سری نگر میں مقیم تھا۔ میاں قمر الدین میرے بچپن کے ہمجولی میرے ساتھ تھے۔ میاں صاحب نے چوتھی جماعت میں تعلیم کو خیر باد کہہ کر دستکاری اختیار کر لی تھی۔ اور چونکہ اس سفر میں وہ بھی ہیٹ اور سوٹ میں آراستہ تھے۔ اس لئے چند نہایت دلچسپ لطیفے ہوتے جن میں سے ایک کا ذکر ایک سوامی جی کے ضمن میں ضروری ہے۔

سرکاری دفتر میں سوائے ایک آدھ مرتبہ جانے کے ہم دن بھر ہوٹل کے کمرے میں بے کار پڑے رہتے تھے۔ اس لئے تیسرے پہر سارے دن کی کلفت کو دور کرنے کے لئے ہم پرتاپ پارک چلے جاتے تھے۔ اس جگہ پر چند سوامی اپنے خوش عقیدہ پیروؤں کی چھوٹی بڑی ٹولیوں میں بیٹھے لیکچر دیا کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک سوامی جی بڑے شستہ الفاظ میں اپنا اپدیش دیتے تھے۔ اس لئے ہم دونوں بھی ان کے پاس جا بیٹھتے۔ سوامی

جی کی تقریر کا مقصد کسی خاص مذہب کی تلقین یا تبلیغ نہ ہوتا تھا بلکہ آپ خاص روحانیات پر بحث کیا کرتے تھے۔

تین چار روز کے متواتر جانے سے سوامی جی کی تیز بین نگاہیں باوجود ہمارے ہیٹ اور سوٹ کے ہمارے اسلام کو تاڑ گئیں۔ چنانچہ ایک روز فرمانے لگے کہ ہماری مجلس میں چند مسلمان اصحاب بھی باقاعدہ شریک ہو رہے ہیں اس لئے میں حتی المقدور سنسکرت کے الفاظ کا مطلب بھی سمجھاتا جاؤں گا۔ کچھ روز اور گذر گئے تو آپ فرمانے لگے کہ اب آپ لوگ بھی سنسکرت کے کافی الفاظ سمجھنے لگ گئے ہوں گے اس لئے اب مجھے اپنے طریقے پر بولنے دیجئے۔

مہینے بھر سے ہم سوامی جی کے پاکیزہ لیکچر سن رہے تھے۔ ایک دن شام کے وقت ہوٹل کو واپس آتے ہوئے میاں قمرون صاحب کو اپنی سنسکرت دانی کے اظہار کا شوق چرایا۔ سوامی ہمارے ساتھ ہی آرہے تھے۔ یکایک میاں صاحب بولے "سوامی جی اب تو آپ خوب وشسٹ ہوگئے ہیں"۔ سوامی جی حیرت سے میاں صاحب کا منہ تکنے لگے اور اپنے کانوں پر یقین نہ کرتے ہوئے بولے "کیا کہا؟" اور میرا تو یہ حال کہ کاٹو تو لہو نہیں بدن میں۔ میاں صاحب مسکراتے ہوئے پھر بولے "اب تو آپ کافی وُشسٹ ہوگئے ہیں"۔ میں نے میاں صاحب کے زور سے چٹکی لی اور آگے بڑھ کر کہا "سوامی جی، ہم لوگ پٹھان ہیں پشتو میں وشسٹ کے معنی ہیں تگڑا یا توانا۔ میاں صاحب کا مطلب ہے کہ کشمیر کی آب و ہوا نے آپ کی طبیعت پر بہت اچھا اثر کیا ہے اور آپ خوب وشسٹ یعنی تگڑے ہو رہے ہیں"۔ سوامی جی مسکرا دیئے اور بات آئی گئی ہوگئی۔ لیکن میاں صاحب نے مجھے آج تک نہیں بتایا کہ اُن کی سنسکرت میں وُشسٹ کے کیا معنی تھے۔ کہتے ہیں میرا مطلب اسی پشتو کا تھا۔

خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان سوامیوں نے زندگی کے فلسفے کا عطر کھینچ رکھا ہے۔ ایک روز کا ذکر ہے کہ سوامی جی کے درشنوں کو ایک بوڑھی دیوی اپنے بیٹے کا ہاتھ تھامے ہوتے آئیں اور بولیں "سوامی جی، آنکھیں خراب ہوگئی ہیں، اب تو کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا"۔

بڑھیا کی آواز میں یاس و حرماں کا ایک طوفان پنہاں تھا۔ میری منتظر نگاہیں سوامی جی کے چہرے پر گڑ گئیں۔ میرا خیال تھا کہ سوامی جی کوئی چلتا ہوا منتر پھینکنے کے لئے یا کوئی تیر بہدف نسخہ علاج کے لئے تجویز فرمائیں گے۔ لیکن اس کے بجائے سوامی جی کی بھنویں ایک لحظہ بھر کے لئے سکڑیں اور پھر یکایک مسکراتے ہوئے بولے "مائی جی، ستر برس تک ان آنکھوں سے دیکھتی ہی رہی ہو، اب کچھ دنوں کے لئے نہ دیکھا تو کون سا غضب ہو جائے گا۔ جانے دو تھوڑے دن نہ دیکھا سہی۔ اتنی دنیا جو دیکھ رہی ہے"۔ معلوم نہیں سوامی کے الفاظ میں کیا جادو بھرا تھا کہ باوجود ٹکا سا جواب پانے کے بڑھیا گئی تو اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ ایسے جیسے اس کی آنکھیں نئے سرے سے روشن ہوگئی ہوں یا کم از کم اسے کوئی مجرب نسخہ ہاتھ آگیا ہو۔

اس مرتبہ میں کان پور سے کلکتے کی گاڑی پر سوار ہوا تو تھرڈ کلاس کے کمرے میں جگہ کافی تھی۔ چنانچہ میں بھی دوسرے مسافروں کی تقلید میں بستر بچھا کر سو گیا۔ رات کے بارہ یا ایک کا عمل ہوگا کہ یکایک میری آنکھ کھل گئی۔ میرے سامنے والی بنچ پر ایک ادھیڑ عمر کے سوامی جی بیٹھے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد اُن کے پاس لیٹے ہوئے مسافر کو ٹانگیں دراز کرنے میں رکاوٹ جو محسوس ہوئی تو وہ بھی جاگ اٹھا۔ سوامی جی کو دیکھ کر ماتھے پر بل پڑ گئے۔ آپ جانتے ہیں گاڑی میں اور خصوصاً تیسرے درجے میں بعض مسافر خدائی فوجدار قسم کے ہوتے ہیں یا کم از کم ٹی۔ ٹی قسم کے۔ چنانچہ یہ بھی اسی صنف میں سے تھے۔ چھوٹتے ہی بولے:۔

"ارے میاں تمہارے پاس ٹکٹ ہے؟"

"نہیں" سوامی جی نے جواب دیا۔

"کیوں نہیں؟"

"میرے پاس پیسے نہیں تھے ٹکٹ کیسے خریدتا"

"تو پھر گاڑی میں کیوں بیٹھے ہو"

سوامی جی نہایت نرم آواز میں بولے "ذرا بنارس تک جانا تھا"

سوامی جی کی منطق اور حاضر جوابی پر میں عش عش کر اٹھا۔ میں نے کہا سوامی جی کچھ کھائیے گا۔ کہنے لگے اگر کچھ ہے تو دے دو۔ میں نے کچھ کیلے اور سنگترے پیش کئے۔ سوامی جی نے پیٹ بھر کر کھائے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انہوں نے شام کا کھانا نہیں کھایا تھا۔ دو تین سٹیشن گذرنے کے بعد ایک اور سوامی اس ڈبے میں آگئے۔ یہ پہلے سوامی جی کے شناسا تھے۔ دونوں آپس میں کچھ دیر باتیں کرتے رہے۔ اس کے بعد پہلے سوامی جی نے کسی کام کے متعلق دریافت کہ وہ ہوگیا کہ نہیں۔ دوسرے نے نفی میں جواب دیا۔ سوامی جی بولے "بھائی کام ہو جائے تو اچھا، نہ ہو تو اُس سے بھی اچھا!" اس فلسفے کا جو لطف مجھے سوامی جی کی زبان سے آیا وہ کسی بڑے سے بڑے فلسفی کی تقریر سے حاصل نہیں ہوا۔

صبح ہو چکی تھی۔ مسافر چائے، توس، بسکٹ اور حلوہ پوری سے ناشتہ کر رہے تھے، لیکن دونوں سوامی چپ چاپ بیٹھے تھے۔ میں نے اپنی پھل والی ٹوکری اٹھا کر سوامی جی کے سامنے رکھ دی۔ اس میں کوئی بیس پچیس سیر پھل تھا۔ سوامی جی نے پوچھا "سارا پھل دے رہے ہو؟" میں نے کہا "ہاں!" آپ نے دو سنگترے اور دو کیلے اپنے لئے رکھے اور اتنے ہی اپنے ساتھی کو دیئے اس کے بعد ٹوکری اٹھا کر سارے ڈبے کے مسافروں کو بانٹ دی۔

جب واپس آئے تو میں نے کہا سوامی جی کچھ پھل اپنے ساتھ رکھ لیتے تو اچھا ہوتا۔ کہنے لگے "بابا جو ہمیں بھیج رہا ہے وہ ہماری روزی ہم سے پہلے وہاں پہنچا چکا ہے۔ پھر ہم اپنی پیٹھ پر کیوں لادے پھریں؟"

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا پنجاب باوجود اس کے کہ غریب ہے اور اس میں اتنی تعداد میں ایسے کروڑپتی نہیں ہیں جتنے کہ کلکتے میں ہیں لیکن وہاں روپیہ کچھ زیادہ بکھرا ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے فقیروں میں کچھ ہمت، کچھ جرأت، کچھ سکت، کچھ قوت طلب و تقاضا، کچھ قوتِ دعویٰ، کچھ آسرا، کچھ آپ کے دین پر تکیہ اور کچھ اپنی طلب پر بھروسہ ہے۔ وہ مانگتے ہیں اور اس حسنِ یقین کے ساتھ کہ آپ دے کر ٹلیں گے وہ لے کر ٹلیں گے۔ لیکن یہاں؟ . . . . یہاں تو کئی روز تک مجھے یہ بھی علم نہ ہو سکا کہ کلکتے میں فقیر ہیں بھی یا نہیں۔ البتہ جمعے کے روز مسجد ناخدا کے دروازے کے سامنے فقیروں کا ایک جم غفیر دیکھا۔ لیکن یہ فقیر صرف کلکتے کے فقیر نہیں تھے، ان میں کئی تو حسین و جمیل نوجوان پٹھانیاں تھیں جو اپنے ناز و اندازِ معشوقانہ اور مخیر نمازگذاروں سے اپنی بے تکلفی کے بل پر خراج وصول کر رہی تھیں۔ کئی ہمارے لکھنؤ کی نازک آواز میں داغ اور ظفر کی غزلیں گا گا کر لوگوں کو متوجہ کر رہے تھے اور شاید ایک فی صدی یہاں کے فقیر بھی ہوں جس کا مجھے ابھی تک پورا یقین نہیں ہے۔

کلکتے میں فقیروں کی موجودگی کا علم مجھے اس وقت ہوا جب میں نے اخبار سٹیٹسمین میں ایک ہمدرد بنی نوع انسان کا مراسلہ پڑھا جس میں انہوں نے کلکتے کو فقیروں کی وبا سے نجات دلانے کے متعلق اصحاب مقدرت نہیں نہیں بلکہ اصحاب قدرت کو ابھارا تھا۔ اس سرپھرے کو اعتراض تھا کہ ملک کا لاکھوں روپیہ مفید اداروں کے بجائے اِن غیر مستحق لوگوں میں تقسیم ہو کر ضائع ہو جاتا ہے۔ یہ لوگ سوسائٹی کی جونکیں ہیں جو اس کا خون چوستی رہتی ہیں۔ اور سستی اور کاہلی کی وجہ سے یہ لوگ کام نہیں کرتے۔

مجھے اس غریب پر بڑا رحم آتا ہے۔ معلوم نہیں یہ حاتم کا پڑوتا اپنی کتنی دولت فقیروں کو کھلا کھلا کر قلاش ہو گیا ہے اور اب اسے ہوش آیا ہے اور اگر یہ نہیں تو پھر یا تو یہ کسی گرجے کا پادری ہے یا کسی یتیم خانے کا مہتمم اور حقیقت یہ ہے کہ ایسے لوگ بھی فقیروں ہی کی ایک بڑھیا قسم سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ لوگ دوسروں کے منہ کا لقمہ چھیننا چاہتے ہیں۔ بہرحال چونکہ یہ بات بہت مشکل ہے کہ عوام کو فقیر کو خیرات دینے سے منع کیا جائے میں نے ترکیب سوچی تھی کہ خاکساروں یا سکاؤٹوں کی طرز کے والنٹیر بھرتی کئے جائیں جو شام کے وقت سارے کلکتے میں پھیل جائیں اور تمام فقیروں سے ان کی جمع شدہ پونجی اکٹھی کر کے سٹیٹسمین کے مراسلہ نگار پادری صاحب یا مہتمم یتیم خانہ کو دے آئیں۔ اس طرح لوگوں کا مقصد بھی پورا ہوتا رہے گا۔ اور ان صاحب کا بھی ــــ

لیکن آپ یہ بات سن کر حیران ہوں گے کہ بنگالی فقیر کبھی راہگیروں سے سوال نہیں کرتے ان کے گروہ کے گروہ اور قطاروں کی قطاریں سڑک پر یوں بیٹھی رہتی ہیں جیسے کسی جنگی ہسپتال کے مریض ــــ خاموش لیٹے ہوئے، ساکت و صامت، بکھرے ہوئے گرد آلود بالوں اور جسم ڈھانکنے کے لئے ناکافی چیتھڑوں میں لپٹے ہوئے ــــ ایسے، جیسے کوئی آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی بجلی یکایک چمک کر اُن کی آنکھوں کو چندھیا سی گئی ہے۔ ایسے جیسے کسی خوفناک کڑاک نے ان کے دماغ ماؤف کر دیئے ہوں۔ وہ کسی چیز کی طرف غور سے نہیں دیکھتے، اور جب دیکھتے ہیں تو پھٹی پھٹی آنکھوں سے ..... بغیر کسی مقصد و مدعا کے۔ ان کے چہرے، اظہار جذبات سے عاری ہوتے ہیں۔

پنجابی فقیر کی عادات کے بالکل برعکس جس کی دراز دستی او زبان درازی اس کی ڈھٹائی، حوصلے اور عزم کے ساتھ مل کر اس کی کامیابی میں ممد و معاون ہوتی ہے، بنگالی فقیر کی کوتہ دستی اور ہمت شکن عادات و اطوار اس کی ناکامی اور محرومی یا پھر صبر و قناعت میں ممد و معاون ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ ان عادات میں کوئی انفرادی وجہ بھی کارفرما ہوتی ہو لیکن اجتماعی توجیہہ میرے خیال میں یہ ہے۔

ا۔ صاحب حیثیت لوگ یعنی سیٹھ اور حقیقی بڑا بابو موٹروں میں پھرتے ہیں۔

ب۔ نیم بڑا بابو اور نیم چھوٹا ایک ہاتھ میں چھاتہ اور دوسرے میں دھوتی کا پلو تھام کر چلتا ہے۔ خیرات دینے کے لئے اس کا ہاتھ خالی نہیں ہوتا۔

ج۔ حقیقی چھوٹا بابو سوائے ٹریم کے ماہواری پاس کے اور کوئی چیز اپنی جیب میں نہیں رکھتا۔

د۔ پیدل چلنے والا باقی ماندہ طبقہ خیرات دینے کی توفیق نہیں رکھتا۔

ابھی پرسوں کا ذکر ہے کہ مداری قسم کا ایک جینی فقیر ہوٹل کے سامنے سڑک پر تماشا دکھانے کھڑا ہو گیا۔ سب سے پہلے وہ پیتل کی تھالی کو ایک چھڑی کے سرے پر گھما گھما کر آسمان کی طرف پھینکتا رہا جو واپس آ کر اس کی چھڑی پر گھومتی دکھائی دیتی تھی۔ اس کے بعد اس نے لکڑی کے تین ٹکڑوں کے ساتھ توازن اور کشش وغیرہ کے کھیل دکھائے۔ قریباً ۲۰ منٹ تک وہ پوست واستخوان کا ڈھانچہ محنت کرتا رہا۔ کلکتے کے مصروف اور کم فرصت باشندوں میں سے ۳۰۔۴۰ اس کے گرد جمع ہو رہے تھے۔ اس کے بعد وہ پیسے جمع کرنے کے لئے اپنی تھالی اٹھانے کو جھکا ہی تھا کہ سید صاحب تے ہی تمام اکھاڑے میں "ہاتھی آیا" ہو گیا۔ اس پر بھی وہ مایوس نہ ہوا اور اُس نے نئے سرے سے تمام کھیل دکھانے شروع کئے۔ اس دفعہ بھی جب تھالی اٹھانے لگا تو مجمع پھر صاف تھا۔ وہ باہمت انسان تیسری مرتبہ اپنے کام میں مشغول ہو گیا لیکن آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ تیسری مرتبہ بھی یہی نتیجہ نکلا سوائے ایک آدمی کے جو اکھاڑے سے ذرا فاصلے پر کھڑا تھا۔

میرا خیال ہے کہ اس شخص نے تمام تماشوں میں سے اس آخری کھیل کو بہت کامیاب سمجھا یعنی اس کی جادو کی تھالی والے کھیل کو۔ جونہی وہ اُس پر جھکتا تھا، تیس چالیس آدمیوں کا مجمع پلک جھپکنے میں غائب ہو جاتا تھا۔

آپ یقیناً اسے مبالغہ سمجھ رہے ہوں گے اور یہ اعتراض آپ کی زبان پر ہو گا کہ پھر یہ لوگ کھاتے کیا ہیں اور کہاں سے کھاتے ہیں؟

آئیے میں آپ کو بتاؤں۔

حقیقت یہ ہے کہ یہاں کے سیٹھ مالی حیثیت سے جتنے زیادہ مالدار ہیں اتنی ہی زیادہ اُن کی مذہبی حس تیز ہے۔ مثلاً یہاں کے ایک چوٹی کے سیٹھ صاحب کا حکم ہے کہ جب اُن کے اہلکار صبح دفتر میں کام کے لئے حاضر ہوں تو بلا امتیاز عہدہ جنرل منیجر سے لے کر چپراسیوں تک دوش بدوش کھڑے ہو کر سنسکرت کے پاکیزہ اشلوک گائیں۔ آپ نے اکثر سکولوں میں دیکھا ہو گا کہ حاضری لگنے سے پہلے تمام بچوں کو سکول کے صحن میں کھڑا کر کے بہ آوازِ بلند قومی ترانہ گوانے کا رواج ہے۔ بعینہٖ یہی سماں میں نے سیٹھ صاحب کے دفتر میں دیکھا ہے۔

اور ایسے ہی دھرماتما سیٹھ اپنی بے حساب دولت میں سے ان فقیروں کا حصہ بھی لگا رکھتے ہیں۔ اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ سمندر کے قرب کی وجہ سے چونکہ پانی کی فراوانی ہے اور چونکہ ہوا کے بعد یہی ایک سب سے اہم چیز ہے جس پر انسان کی زندگی کا دارومدار ہے اس لئے ان بڑے بڑے دھرماتماؤں کے نوکروں کو روزانہ، اکثر یا کبھی کبھی جیسے جیسے اُن پر کوئی مصیبت پڑے۔ یہ حکم ہوتا ہے کہ ایک بڑی یا چھوٹی (حسبِ ضرورت یا مصیبت) دیگ پانی کی چڑھائیں۔ اس میں مزہ تبدیل کرنے کے لئے نمک، مرچ، ہلدی اور کسی قدر چاول اور دال کی آمیزش کر دیں۔ یہ مزیدار پانی جب تیار ہو جائے تو قرب و جوار کے فقیروں کو مفت کھلا دیں تاکہ وہ امرا کی جان و مال کو دعائیں دینے کے لئے زندہ رہیں۔

ان فقیروں کے پاس تھالی، کٹورہ کشکول یا ٹین کا ڈبہ کوئی چیز نہیں ہوتی۔ پھر اس "پانی" کو کھانے کی کیا ترکیب ہوتی ہے (سڑک پر گرے ہوئے ردی کا غذ جن پر یہ پانی بالٹیوں میں سے نکال نکال کر بہایا جاتا ہے)۔ زمین پر پھیلائے جاتے ہیں اور فقیر ایک ہاتھ سے اس پانی کو نیچے بہنے سے روکتا جاتا ہے اور دوسرے کو اس سیّال مادے سے آلودہ کر کے زبان سے چاٹتا جاتا ہے۔ لیکن کیا یہ خوراک روزانہ اتنی مقدار میں دستیاب ہو جاتی ہے کہ ان بے نواؤں کے لئے قوت لایموت بہم پہنچا سکے۔ یا کیا یہ خوراک اتنی کافی مقدار میں تقسیم کی جاتی ہے کہ شہر کے تمام گداگر اس سے مستفید ہو سکیں؟ . . . ہرگز نہیں۔ ہم نے ان فقیروں کا وہ نظارہ بھی دیکھا ہے جب وہ بھوک سے بے تاب ہو کر سڑک پر پڑے ہوئے کوڑے کرکٹ کے ڈھول پر جھکے کسی قریب کے ہوٹل کے جھوٹے ٹکڑوں کی تلاش کر رہے ہوتے ہیں۔ میں نے انہیں سڑک پر گرے ہوئے اُن غلیظ پتوں کو چاٹتے دیکھا ہے جن پر کسی پیٹ بھرے راہرو نے کھانے کی کوئی شے لگی رہنے دی ہو۔ میں نے انہیں تربوز اور کھیرے کے چھلکوں کو چباتے دیکھا ہے۔

کچھ دنوں سے یہاں کچے ناریل بک رہے ہیں۔ ان میں ابھی گودا پوری طرح پیدا نہیں ہوا لیکن بعض والوں میں گری کی ایک باریک سی تہ جم رہی ہے۔ دھوپ میں پھرنے والے صاحبِ استطاعت لوگ دو دو تین تین پیسے میں خرید کر ان کا میٹھا پانی پیتے ہیں اور اپنی پیاس بجھاتے ہیں۔ لاکھوں ناریل روزانہ بک جاتے ہیں اور ان کے خالی شدہ خول سڑکوں پر یوں لڑھکتے نظر آتے ہیں۔ جیسے کسی میدانِ جنگ میں انسانی کھوپڑیاں گھوڑوں، مویشیوں اور انسانوں کے پاؤں تلے روندی جا رہی ہیں۔

پرسوں کا ذکر ہے میں کسی کام کی غرض سے دھرم تلے سے گذر رہا تھا پان والی دُکانوں کے سامنے ناریل کے خول حسبِ معمول بکھرے پڑے تھے ایک فقیر کو میں نے دیکھا کہ ایک خالی شدہ ناریل کی ٹھیکریاں جن پر گری کی تہہ بہت دنوں تک جمی رہنے سے گل سڑ گئی تھی ناخنوں سے کرید کرید کر بیٹھا

چاٹ رہا ہے۔ یہ متعفن نیم سیال سفید مادہ اس کی ناک، منہ، ڈاڑھی اور مونچھوں پر لپا ہوا تھا۔ زمانے کی بے دردی کے ہاتھوں انسان کی یہ بے عزتی ہوتے ہوئے دیکھ کر میرے سینے میں ایک ٹیس اٹھی اور مجھے بے حال کر گئی۔

میں نے ایک گراس کے ہاتھوں سے ناریل کے چھلکے لے لئے اور اسے چند پیسے دئیے۔ اس نے اپنا سر اٹھایا اور اپنی سرخ سرخ آنکھوں سے میری طرف کچھ اس انداز سے دیکھا جس میں شکریے، اطمینان یا بے چارگی کا اظہار نہ تھا بلکہ حیرت جھلک رہی تھی۔ بھوک، مفلسی، بے چارگی اور تلاشی کے اس دیوتا کی نظریں میرے سینے کو چھلنی کرتے ہوئے نکل گئیں۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں ایک مجرم ہوں اور اس دیوتا کے سامنے کسی سنگین جرم کی جواب دہی کے لئے پیش کیا گیا ہوں۔ میں، جیسے ہوٹل کا ملازم صبح و شام ہوٹل کے لذیذ ترین کھانوں کی فہرست سناتا ہے۔ میں، جو اپنی پسند اور زبان کے چٹخارے کو ملحوظ رکھتے ہوئے اسے بہترین کھانوں کا حکم دیتا ہوں۔ میں، جس کا پیٹ دن میں چار مرتبہ بھرا جاتا ہے۔ میں، جو رات کو کمانی دار پلنگ پہ ایک فٹ موٹے گدیلے پر سوتا ہوں۔ میں، جو کلکتے کے باشندوں کو دھوکا دے کر ان سے جھوٹی عزت کرانے کے لئے ہیٹ اور سوٹ پہن کر پھرتا ہوں۔ تمام رات بجلی کے پنکھے کو چلاتا ہوں تاکہ گرمی میرے آرام میں مخل نہ ہو۔ دن میں چار مرتبہ نہاتا ہوں تاکہ میرے جسم پر میل کا کوئی ذرہ لگا نہ رہ جائے۔ میں ایک مجرم تھا اور اس داورِ محشر کے نمائندے کے سامنے اپنے گناہوں کو گن رہا تھا لیکن ..... یا اللہ! ان گناہوں کی فہرست کتنی طویل ہے۔

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے مجھے بھی کئی روز کے فاقے کے بعد یہی غلیظ سفید مادہ کھانا چاہئے۔ نہیں، بلکہ اس کے سخت چھلکے کو چبانا چاہئے تاکہ اس کی نوکیں میری آنتوں کو چیر چیر ڈالیں۔ مجھے اس دیوتا کے قدموں پہ گر کر معافی مانگنا چاہئے . . . صرف مجھے نہیں، اس سامنے والے جوہری کو بھی جس نے اپنے بیش بہا جواہر اور زیورات کی حفاظت کے لئے بندوق کا پہرہ بٹھا رکھا ہے۔ اس بزاز کو بھی جس نے چھ دکانیں ملا کر ایک دکان بنا رکھی ہے اور گاہکوں سے روپیہ سمیٹنے کے لئے چار خزانچی بٹھا رکھے ہیں۔ اس غلے کے بیوپاری کو بھی جس کے بڑے بڑے گودام چھت تک بھرے پڑے ہیں۔ اور جو پیسے کے بغیر گندم کا ایک دانہ تک بھی کسی بھوکے کو نہیں دیتا۔ اس سیٹھ کو بھی جس نے صبح کے وقت اپنے دفتر میں سنسکرت کے پاکیزہ اشلوک گانے کا حکم دے رکھا ہے۔

میرا دل چاہتا تھا کہ عذاب کا ایک فرشتہ بجلی کے کوندے مارتا ہوا ہم سب کو اکٹھا کر کے لے آئے اور اس کے سامنے سر بسجود کر دے۔ آہ!

اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے!

منظر احمد

منظر

ستاروں کی دنیا ہے کتنی حسیں
ہنسی سے جواں ہیں ستاروں کے پھول
نہ کیوں رشک کھائے فلک پر زمیں
نہیں آسماں پر کوئی بھی ملول

سہانی ہے کیا چاند کی روشنی
پہنچ جاؤں گر میں فلک کے قریب
روپہلی ہے چھٹکی ہوئی چاندنی
تو جاگ اٹھیں میرے بھی سوئے نصیب

منور ہے کیا آسماں کی بساط
امنڈتا ہی آتا ہے سیلِ نشاط

بشیر صادق

صبح

کیا صبح کا پیارا منظر ہے، کیا روح فزا نظارے ہیں
موتی سے ہوا میں لٹتے ہیں، شبنم کے رواں فوارے ہیں

شب کو یہ حسن کی دنیا تھے اور روح و روانِ نظارہ
اب بجھنے والی شمعیں ہیں یا عرشِ بریں کے تارے ہیں

سورج کی سنہری کرنوں سے مشرق کی فضا زرریز ہوئی
جو دھندلے دھندلے منظر تھے، زرّیں زرّیں نظارے ہیں

جنگل کے گلابی پھولوں پر اب رنگِ شفق یوں غالب ہے
نظروں کو دھوکا ہوتا ہے، یہ پھول ہیں یا انگارے ہیں

گلشن کی مصفّا نہروں میں جو ہلکی ہلکی موجیں ہیں
یہ ننھی ننھی جانوں کے گنگا جمنی گہوارے ہیں

کچھ ننھے ننھے سے طائر شاخوں پہ چہکتے پھرتے ہیں
کیا دلکش ان کے نغمے ہیں، یہ کیسے پیارے پیارے ہیں

پھولوں کی لچکتی شاخوں پر، بیٹھے، جھولے، پھر اُڑ نکلے
کیا پیارے جھولنے والے ہیں۔ کیسے نازک گہوارے ہیں

اے محشر اُٹھ سوتا کیا ہے، اب موت کا وقفہ ختم ہوا
ہے دورِ حیاتِ تازہ کا زندہ زندہ نظارے ہیں

عباس بیگ محشر

غزل

کب سے ہے ابتدا؟ ــــ نہیں معلوم
ہے کہاں انتہا؟ ــــ نہیں معلوم

کس طرح چل رہی ہے کشتیِ عمر
کون ہے ناخدا؟ ــــ نہیں معلوم

موت تو ایک امر فطری ہے
کیونکر اب تک جیا نہیں معلوم

آنے جانے میں سانس کے ابتک
کیا دیا، کیا لیا نہیں معلوم

کس سے پوچھوں، کہ شرم آتی ہے
اپنے گھر کا پتا، نہیں معلوم

یہ مرا، وہ مرا، جہان مرا
میں ہوں کس کا، ذرا نہیں معلوم

جس سے پورا ہو مدعا دل کا
ہے مجھے ایسی دعا، نہیں معلوم

عمر ساری گذار کر، امجد!
ہوا معلوم، کیا؟ "نہیں معلوم"!

احمد حسین امجد

خوانچے والا

گنگو رام برہمن کا لڑکا تھا۔ اس کے باپ نے بہتیرا جتن کیا کہ وہ کچھ نہ کچھ پڑھنا لکھنا سیکھ جائے اور نہیں تو کم سے کم پھیرے کروانا اور کتھا کرنا ہی اُسے آجائے۔ مگر گنگو تھا کہ اس معاملے میں کورا ہی رہا۔ باپ کے لاکھ سر پٹکنے پر بھی ایک حرف تک سے واقف نہ ہوا اور وہ بے چارہ اسی حسرت کو دل میں لئے چلتا بنا۔

یہ ٹھیک ہے کہ گنگو کے باپ نے کوئی دھن دولت اور جائیداد ورثے میں نہ چھوڑی تھی۔ مگر یہ بھی کیا کم احسان تھا کہ اس نے گنگو کے سر پر کسی بڑے کنبے کا بوجھ نہ ڈالا تھا۔ گنگو کی ماں اسے پانچ چھ سال کا چھوڑ کر مر گئی تھی۔ گو اس وقت اس کے باپ کی عمر بہت زیادہ نہ تھی، پھر بھی اس نے شاید کسی مجبوری سے یا شاید مصلحت پسندی اور دور اندیشی سے دوسرا بیاہ نہیں کیا۔ اس لئے اب گھر میں صرف دو افراد گنگو اور گنگو کی بیوی جمنا رہ گئے تھے۔ پہلے ان دونوں کا گذارا بھی باپ کی کمائی سے چلتا تھا۔ مگر اب گنگو نے خود فکر کی اور مٹھائی کا خوانچہ لگانا شروع کر دیا۔

تب سے اب تک نہ جانے کتنے سال گذر گئے۔ گنگو دہلی کے چاوڑی بازار میں ایک ہی جگہ بیٹھا ہوا آواز لگایا کرتا ہے: "اکنی کی پاؤ مٹھائیاں کھاؤ۔ اکنی کی پاؤ مٹھائیاں کھاؤ!"

پہلے پہل اس آواز کے لگانے میں اسے کچھ شرم محسوس ہوا کرتی تھی مگر اب تو وہ اتنا عادی ہو گیا تھا کہ اونگھتے اونگھتے بھی پکارے جاتا تھا اور بعض دفعہ جب نیند آجاتی تو اسے یوں محسوس ہوتا کہ گاہک سامنے کھڑا مٹھائی مانگ رہا ہے۔ وہ چونک کر ترازو سنبھالتا اور اُس کے منہ سے نکلتا: "اکنی کی پاؤ مٹھائیاں کھاؤ!"

یہ زندگی نہ صرف اس کی رگ رگ میں بس چکی تھی بلکہ گاہکوں سے نپٹنے کا صحیح مذاق بھی اُس میں پیدا ہو گیا تھا۔ مزدور لوگ جن کی زندگی میں مٹھائی کی لذت کو کبھی کبھار ہی دخل ہوتا ہے چلتے پھرتے پیسے دو پیسے کی خرید لیتے اور اُس سے پوچھ بیٹھتے: "کیوں بھئی اچھی تو ہے؟"

"اچھی کیوں نہیں۔ دیکھنے میں اچھی، چکھنے میں میٹھی۔ پاؤ بھر کھاؤ تو پیٹ بھر جائے اوپر سے پانی کا گلاس پی کر دن بھر مجے اُڑاؤ۔ کسی چیز کی گنج ہی نہیں رہتی!"

گنگو اپنے ننگے اور گنجے سر کو ہاتھ سے سہلا کر جواب دیتا۔

اس کے بعد دوسرا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا تھا۔ کیونکہ گاہک اور گنگو دونوں جانتے تھے کہ اس میں گھی نہیں لگتا۔ اس لئے نہ گاہک پوچھ کر اپنا جی تھوڑا کرتا تھا اور نہ گنگو کہہ کر اپنی عاقبت بگاڑتا تھا۔

کافی رات گذرے جب لوگوں کی آمد و رفت کم ہو جاتی تھی تو جمنا آتی۔ گنگو اس کے سر پر خوانچہ رکھ دیتا۔ وہ آگے آگے چلتی اور گنگو پیچھے پیچھے۔ وہ اپنی چھڑی بدستور ہلاتا جاتا تھا گویا اب بھی مکھیاں اُڑا رہا ہو اور ساتھ ساتھ آواز بھی لگاتا جاتا تھا۔ "اکنی کی پاؤ مٹھائیاں کھاؤ!"

یوں گنگو کو چھ سات آنے ہر روز بن جاتے تھے۔ جس میں سے ایک آنہ بازاری میں چلا جاتا تھا۔ باقی اسے اور جمنا کے لئے کافی تھا۔ اس نے نہ کبھی زیادہ کی تمنا کی اور نہ اس زندگی سے نکلنے کی کوشش۔ اگرچہ اس نے برہمن کا کام اختیار نہیں کیا تھا، پھر بھی وہ برہمن کا بیٹا تھا اور تقدیر کے کرشموں پر اس کا یقین کامل تھا۔

(۲)

جوانی میں جن باتوں کی طرف انسان کی نظر بھی نہیں جاتی۔ بڑھاپے میں وہی باتیں مشکلات کی صورت میں ایک عذاب بن جاتی ہیں۔ اب گنگو بھی بوڑھا ہو گیا تھا۔ اس کے مضمحل اعضاء آرام چاہتے تھے۔ پہلے تو سردی گرمی خواہ کوئی بھی موسم ہوئے فکر بازار میں بیٹھا رہتا تھا۔ مگر اب تو ایک ہی جگہ بیٹھے ہوئے ایک ہی کام کئے جانا اُسے ناگوار گذرتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ پاؤں پسار کر چارپائی پر لیٹا رہے۔ جمنا اس کی ٹانگیں دبائے یا تیل ڈال کر سر سہلائے۔ یا صرف پاس بیٹھی ہوئی میٹھی میٹھی باتیں سنائے۔ بڑھاپے میں سب لوگ ہری بھجن کرتے ہیں۔ مگر اسے تو خوانچے ہی سے فرصت نہیں ملتی تھی۔

اس وقت گنگو کو اس بات کا احساس ہوتا تھا جسے جمنا بڑی مدت سے محسوس کر رہی تھی یعنی بھگوان نے انہیں کوئی لڑکا بالا کیوں نہیں دیا۔

کئی دفعہ انہیں محلے میں نہنترن اور وکشنا وغیرہ مل جاتی تھی۔ جب کبھی

ایسا ہوتا تو اُس دن گنگو کے دماغ میں چھٹی منانے کا خیال پیدا ہوتا تھا مگر گھر میں بیٹھے بیٹھے بھی اُس کا جی اکتانے لگتا تھا۔ اس لئے یہ سوچ کر کہ جو کام ہر روز کرنا ہے اسے ایک دن چھوڑنے سے کیا فائدہ، وہ خوانچہ اٹھا کر چل دیتا اور اسی جگہ بیٹھ کر "آکنی کی پانچ مٹھائیاں کھاؤ" کی آواز لگایا کرتا۔

بہت سوچنے پر بھی کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کون سا کام اسے اٹھارہ گھنٹے روزانہ کی محنت سے چھٹکارا دلا سکتا اور وہ کیونکر اپنی روزی دوڑ دھوپ کے بغیر کما سکتا ہے۔ آخر اس کے خیالات کا سلسلہ یہاں پہنچ کر منقطع ہو جاتا کہ اگر اس کی تقدیر میں سکھ لکھا ہوتا تو وہ ان پڑھ ہی کیوں رہ جاتا؟

اس طرح تقدیر اور زندگی کی الجھن میں پڑا ہوا گنگو اپنے بڑھاپے کے دن کاٹ رہا تھا۔

وہ حسب معمول سویرے ہی بازار میں جا بیٹھتا اور رات گئے تک سر پہ خوانچہ رکھ کر چلا جاتا۔ اگر وہ جوانی میں کوشش کرتا تو ممکن تھا کہ کتنے ہی اور کام اس کے لائق نکل آتے۔ مگر اب تو صرف خوانچہ بیچنے کے سوا دوسرا کام تصور میں لانا بھی مشکل تھا۔ شاید وہ یہی سمجھے ہوئے تھا کہ ایشور نے مجھے اسی کام کے لئے بنایا ہے۔

(۳)

پھاگن کے دن تھے۔ سردی گذر چکی تھی۔ سہانا موسم آ گیا تھا۔ دن اور راتوں میں بھی اعتدال پیدا ہو گیا تھا۔ گنگو اپنی مقررہ جگہ پر خوانچہ لگائے بیٹھا تھا کہ ایک لمبے قد کا آدمی جس کے ماتھے پر چندن کا ٹیکا لگا ہوا تھا۔ اور کان پر جنیؤ لٹک رہا تھا۔ اس کے سامنے آ کر رکا اور اُس سے پوچھنے لگا۔

"تمہارا ہی نام گنگیشور ناتھ ہے نا؟"

"جی ہاں" گنگو نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

"اور تم براہمن بھی ہو؟"

"کیوں نہیں؟ براہمن ہوں، میرے پتا کا نام پنڈت رامیشور ناتھ تھا"

گنگو نے کچھ گھبراہٹ اور کچھ حیرانی سے جواب دیا۔

"گھبرانے کی کچھ بات نہیں" اس آدمی نے کہا "میں تمہیں ہی ڈھونڈ رہا تھا۔ تمہارے پتا ہمارے کل پروہت تھے۔ اب میں تم سے یہ پوچھنے آیا ہوں کہ اگر تمہیں کوئی اچھا کام سونپا جائے تو کیا تم اس خوانچے کو چھوڑ کر وہ کام کر لو گے؟"

"خوانچے کو چھوڑ کر اچھا کام" گنگو نے دہرایا۔ اسے اپنی دیرینہ خواہش پوری ہوتی نظر آئی۔ اس نے آنے والے کے منہ کی طرف تکتے ہوئے پھر کہا:

"کوئی اچھا کام ہو تو کیوں نہیں کروں گا بھائی! پیٹ ہی تو بھرنا ہے۔ تم کام بتاؤ، تو میں ہامی بھروں!"

"تمہیں مندر میں ایک پجاری کی ضرورت ہے"۔

"بھائی پجاری تو میں بن جاؤں۔ پر مجھے کوئی پڈھ یا نہیں آتی"۔

"وِدیا کی تو کوئی ضرورت ہی نہیں۔ صبح سویرے مورتی کو اشنان کرا دیا کرنا اور چرن امرت وغیرہ تیار کر دینا۔ تمہیں کھانے پینے کو کافی مل جایا کرے گا۔ وہاں بیٹھے ہری بھجن کرتے رہنا"۔

بلّی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔ جو گنگو چاہتا تھا۔ وہی ہو گیا۔ اس نے ہامی بھر لی۔ وہ آدمی بات طے کر کے چلا گیا۔ گنگو کل سے مندر کا پجاری بن جائے گا۔ خوانچہ لگانے سے چھٹکارا حاصل ہو گا۔ سارا سارا دن ٹھاکر جی کی پوجا اور ہری کیرتن میں بتایا کرے گا۔

یہ خیال کتنا خوش کن تھا۔ اسے وہاں بیٹھنا مشکل ہو گیا۔ جی میں آتا تھا کہ دوڑ کر گھر پہنچ جائے اور جمنا کو یہ خوشخبری سنائے۔ کئی دفعہ تو اس کے جی میں آیا کہ زور زور سے چلائے "میں مندر کا پجاری ہوں مندر کا پجاری ہوں"۔ اس کے ساتھ ہی خیال گذرتا کہ بڑے بڑے سیٹھ ساہوکار پوجا کرنے آیا کریں گے اور اسے پروہت جی کہہ کر نمسکار کیا کریں گے۔ اس طرح اس کے دل میں ذاتی عزت کا خیال جڑ پکڑ رہا تھا۔ اور اس نے اپنا نام گنگیشور ناتھ تو لمبی مدت کے بعد سنا تھا۔ برسوں کا بھولا ہوا خاندانی وقار رگ رگ میں اس طرح موج زن ہونے لگا۔ جس طرح ساون کے مہینے سوکھی ندیاں امڈ آتی ہیں۔

وہ جوں توں کر کے کچھ دیر تو بیٹھا رہا۔ آخر بیٹھنا ناممکن ہو گیا۔ نہ معلوم کب رات ہو اور کب جمنا آئے۔ اتنی خوشی کو تنِ تنہا سنبھالے رکھنا اس کے امکان سے باہر تھا۔ وہ اسے جلد سے جلد جمنا کے ساتھ بانٹ لینا چاہتا تھا۔ اس لئے سرِ شام ہی خوانچہ اٹھا کر گھر کو چل دیا۔

(۴)

اب گنگو مندر کا پجاری تھا۔ صبح اٹھ کر مورتیوں کو اشنان کراتا تھا۔ مندر کا فرش دھوتا تھا۔ دھوپ دیتا اور چندن گھس کر رکھتا تھا۔ اس کام سے اسے ایک گونہ دلچسپی تھی اور اس دلچسپی کے باعث ہی خوشی بھی حاصل ہوتی تھی۔ یہ مسلمہ بات ہے کہ کسی کام میں دلچسپی زیادہ دیر تک نہیں رہتی۔ آخر عادی بننا پڑتا ہے۔ دو چار دن میں ہی گنگو کی دلچسپی کم ہونے لگی۔ چنانچہ وہ خوشی بھی نہ رہی۔ اُسے دیوتا پر ہر طرح بھروسہ تھا۔ ہری بھجن کو وہ مکتی کا ذریعہ سمجھتا تھا۔ خوانچہ لگاتے ہوئے ہزار جان سے چاہتا تھا کہ اسے فرصت ملے تو ہری بھجن

کرے۔ آرام سے رہے اور جمنا کو پاس بٹھا کر اس کی میٹھی میٹھی باتیں سنے۔ اب فرصت بھی تھی اور ہری بھجن کے لئے مندر کا مقدس ماحول بھی تھا۔ مگر اس کا دل اس میں نہیں لگتا تھا۔ "اکنی کی پاؤ مٹھائیاں کھاؤ!" یہ آواز ایک سریلے راگ کی طرح اس کے سینے میں اُبھر اُبھر کر رہ جاتی تھی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ یہ راگ دیواروں کو سنائے۔ مگر پھر نادانی سمجھ کر خاموش رہتا۔

لیکن خاموشی سے دل کے جذبات نہ دبتے تھے بلکہ اور بے چین ہوا اُٹھتے تھے۔ وہ کئی مرتبہ مندر کے دروازے پر آ کھڑا ہوتا۔ بازار میں نگاہ دوڑاتا۔ ٹھیلی والے مزدور پاس سے گذرتے تو اسے یارائے ضبط نہ رہتا ان کی طرف دیکھتا ہی رہتا اور . . . . جب وہ نظروں سے اوجھل ہو جاتے تو خود بخود کہہ اُٹھتا۔ "اکنی کی پاؤ مٹھائیاں کھاؤ!"

اس کے لئے یہ موہنی منتر تھا۔ جسے سن کر اس کی روح اس طرح رقص کرتی تھی جس طرح سانپ بین سن کر جھوم اُٹھتا ہے ہری بھجن صرف اس کے اعتقاد کو شانتی بخشتا تھا۔ مگر یہ جملہ اس کی روح کے لئے کیف انگیز تھا۔ اس کے لئے اعتقاد پر روح کو قربان کرنا بہت مشکل تھا۔

رفتہ رفتہ مندر کی زندگی جسے اس نے دیوتاؤں کا بردان سمجھا تھا۔ تکلیف دہ ثابت ہونے لگی۔ وہ چاہتا تھا کہ دوڑ کر چاوڑی بازار میں جائے اور اپنی پرانی جگہ پر جا بیٹھے۔ گاہکوں کو مٹھائیاں تول تول کر دے اور کہے۔ "دیکھنے میں اچھی چکھنے میں میٹھی۔ پاؤ بھر کھانے سے پیٹ بھر جاتا ہے!"

یہی اس کا دھرم اور یہی دیوتا تھا۔

اسے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ اپنے اسی پرانے خوانچے کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ اپنا خوانچہ بیچتے ہوئے دیوتاؤں کا نام لینا دھرم ہے مگر دیوتاؤں کے آسرے پر نکمے بیٹھ کر کھانا پاپ ہے۔ جب اسے لکھنا پڑھنا کچھ نہیں آتا تو وہ مندر کا پجاری بھی نہیں بن سکتا۔ اسے تو محض خوانچہ بیچنے کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔

یہ خیال دن بدن زور پکڑ رہا تھا اور اب وہ مندر میں اس طرح محسوس کر رہا تھا گویا پردیس میں کہیں بھٹک گیا ہو۔

(۵)

گنگو ٹھاکروں کو بھوگ لگا کر بیٹھا ہی تھا۔ ہوا ذرا تیز چل رہی تھی۔ آنگن میں پیپل کے سوکھے پتے کھڑکھڑا کر زمین پر گر رہے تھے۔ کہ وہی بھگت جی جو گنگو کو مندر میں بلا کر لائے تھے آن پہنچے اور اُسے غمگین دیکھ کر بولے۔

"گنگیشور جی کیا بات ہے! اس طرح اداس بیٹھے ہو۔"

"بات تو کچھ بھی نہیں بھگت جی۔ میرا جی نہیں لگتا!"

"ذرا جی نہ لگنے کی بھی ایک ہی کہی۔ مندر رہنے کو ہے۔ کھانے پینے کی ہر طرح سہولت ہے۔ پھر بھی کوئی تکلیف ہو تو ہم سے کہو۔"

"آپ کے پرتاپ سے تکلیف تو کچھ نہیں۔"

"پھر جی کیوں نہیں لگتا۔؟"

"یہ تو میں نہیں جانتا۔ طبیعت بجھی بجھی سی رہتی ہے۔"

"دیکھو گنگیشور جی دل لگا کر کام کرو۔ اس جیون میں ہری بھجن بڑی مشکل سے نصیب ہوتا ہے۔"

"یہ تو میں اچھی طرح جانتا ہوں پر من بندہ ہے نہ مانے، تو کیا کروں؟"

"آخر نہ ماننے کا کوئی سبب تو ہوگا؟"

"سبب! سبب تو بس ایک ہے . . . . کہ میں . . . . پجاری بننے کے لیک . . . نہیں ہوں۔" گنگو نے جھجکتے جھجکتے کہا۔

"او ہو۔ کیسی بات کرتے ہو۔" بھگت جی نے ہنس کر کہا "تم لائق کیوں نہیں ہو۔ کام تو سب ٹھیک کرتے ہو۔ دیکھو نا۔ ٹھاکروں پر پھول چڑھے ہیں۔ چندن گھسا رکھا ہے۔ اور فرش دھلا دھلایا چمک رہا ہے۔"

"یہ تو سب ٹھیک ہے . . . ." گنگو نے ہاتھ کی انگلیاں چٹکاتے ہوئے آنکھیں نیچی کرلیں اور آدھی بات اُس کے لبوں پر آتے آتے رُک گئی۔

"ہاں ہاں کہتے کیوں نہیں! کمی کیا ہے؟"

"مہاراج میں ان پڑھ ہوں" گنگو نے من کی بات ادا کی۔

"ان پڑھ ہو تو کیا ہوا۔ آخر براہمن کے بیٹے ہو۔ تمہارا کام پوجا پاٹ کرنا ہے۔ تمہارے پتا کتنے ودوان پنڈت تھے۔ لوگ آج بھی ان کے نام کی مالا جپتے ہیں۔ کیا تم اتنے بڑے باپ کے بیٹے ہو کر خوانچہ ہی بیچتے رہو گے؟"

"بھگت جی اپنے اپنے بھاگ ہیں، ان کے بھاگ میں 'ودوان' بننا لکھا تھا وہ ودوان بن گئے۔ میرے بھاگ میں ان پڑھ رہ کر کھانچہ بیچنا لکھا ہے تو میں کھانچہ ہی کیوں نہ بیچوں!"

"پر تم ساری عمر خوانچہ ہی بیچتے رہے ہو۔ اب بڑھاپے میں نہیں بیچا جاتا تو کیا کوئی زبردستی ہے؟"

"ہاں مہاراج اپنا ہی من جبردستی کر رہا ہے۔ جیسے ساری عمر بیچا ہے اب تھوڑے دن اور بیچ لوں گا۔"

اور دوسری صبح چاوڑی کے چوک میں وہی جانی پہچانی آواز آ رہی تھی "اکنی کی پاؤ، مٹھائیاں کھاؤ۔"

رہبر بی اے۔

آجاؤ!

بہار آئی ہے، اے نو بہار، آجاؤ!

یہ نورِ ماہ میں ڈوبی ہوئی جواں راتیں! تمہارے گیسوئے مشکین و عنبریں کی قسم!
یہ مستِ نکہتِ صہبائے ارغواں راتیں! جبینِ لالہ فشاں — نگہِ شرمگیں کی قسم
یہ دلنواز و دل افروز و داستاں راتیں! شبابِ نو کی قسم — حسنِ شبنمیں کی قسم
بڑھا رہی ہیں مرا خلفشار، آجاؤ! نہیں ہے دل پہ کچھ اب اختیار — آجاؤ!
بہار آئی ہے، اے نو بہار آجاؤ! بہار آئی ہے، اے نو بہار، آجاؤ!

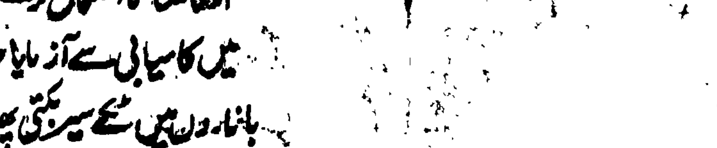
ہے تارِ بربطِ ابرِ بہار۔ زمزمہ ریز! نویدِ صبحِ شبستانِ آرزو بن کر
رگِ حیات میں ہے آج، گردشِ خوں تیز بہارِ دائمِ بستانِ آرزو بن کر
تمہاری یاد ہے زخمِ جگر سے محوِ ستیز سکونِ زندگی و جانِ آرزو بن کر
ہو کس طرح مجھے حاصل قرار! — آجاؤ! متاعِ عشق کے سرمایہ دار — آجاؤ!
بہار آئی ہے اے نو بہار، آجاؤ! بہار آئی ہے، اے نو بہار، آجاؤ!

شمیمِ حسن سے نکہت فروش ہے دنیا! فروغِ حسنِ شبِ ماہتاب نذر کروں!
مئے شباب سے مستی بدوش ہے دنیا ریاضِ خلد کا رنگیں شباب، نذر کروں!
کہ خوابِ عشرتِ نو میں خموش ہے دنیا اور ایک ساغرِ چشمِ پرآب — نذر کروں
فضائیں دہر کی ہیں گلفشار — آجاؤ! تم ایک بار — مگر ایک بار آجاؤ!
بہار آئی ہے اے نو بہار۔ آجاؤ! بہار آئی ہے اے نو بہار، آجاؤ!

ساغر جلیلی






MADE IN GERMANY

قواعدِ زبانِ اردو پر ایک نظر

ا۔حرف اور لفظ کی اصلیت ہمارے قواعد نویس حرف اور لفظ کی تعریف یوں کرتے ہیں کہ انسان کے منہ سے جو مختلف آوازیں نکلتی ہیں۔ ان کو لفظ کہتے ہیں اور زبان و دہان کے اختلافِ جنبش سے آوازوں میں جو فرق پیدا ہوتے ہیں اُن کا نام حرف ہے (ملاحظہ ہو مصباح القواعد صفحہ ۲۴)

اور ڈاکٹر عبدالحق صاحب صدر انجمن ترقی اردو حرف کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ "سادہ آوازوں کو تحریری علامات میں لانے کا نام حرف ہے" لیکن آپ نے لفظ کی کوئی تعریف ہی نہیں کی (بہ حوالہ قواعدِ اردو مؤلفہ ڈاکٹر صاحب موصوف صفحہ ۴)

تاہم ڈاکٹر صاحب حرف کی اصلیت سمجھانے کے لئے لکھتے ہیں کہ یہ اس زمانے کی یادگار ہیں جب کہ لوگ اپنے خیالات تصویریں بنا بنا کر ظاہر کرتے تھے۔ وغیرہ وغیرہ یعنی وہی مصر کے تصویری کتبے جن سے اہلِ یورپ نے عبرانی۔ عربی۔ یونانی اور رومی وغیرہ قدیم زبانوں کے حروف تہجی کا میل ملایا ہے۔ انہی سے اردو کے حروف ہجا کی اصلیت واضح کی گئی ہے۔ یہ صحیح ہے۔ مگر انسان کی بول چال کے لئے حروف کے وضع کئے جانے اور اُن کو تحریر میں لانے کا زمانہ ایک نہیں ہے۔ مطلب یہ کہ مصر کے تصویری حروف جن سے ہماری بعض مغربی اور مشرقی زبانوں کے طرزِ تحریر ایجاد کئے گئے۔ ان کے رواج کو تقریباً پانچ چھ ہزار سال ہی گذرے ہیں حالانکہ انسان از روئے قدرت حیوانات میں شامل ہے اور جس طرح حیوانات اور جانور بعض سادہ آوازیں اپنے منہ سے نکال کر اپنی خاص خاص ضرورتیں پوری کر لیتے ہیں، ایک انسان کا بچہ بھی جب بولنے پر آتا ہے تو کچھ غوں غاں کیا کرتا ہے یعنی عالمِ شیر خوارگی میں وہ اپنے منہ سے ما۔ ما۔ با۔ با۔ بُو۔ بُو۔ نا۔ نے وغیرہ اس قسم کی آوازیں نکالا کرتا ہے اور جب اس کی پہلی جسمانی ضرورت یعنی پیاس بہت تنگ کرتی ہے تو وہ اپنے منہ سے "مم" یا "نن" اس قسم کا کوئی مرکب لفظ بولتا ہے یعنی وہ "م" یا "ن" کی آوازوں کو دہراتا ہے۔ جیسے کہ بکری ممیاتی ہے تو میں میں کر کے میم کی قدرتی آواز کو دہراتی ہے اور کوا اپنی کائیں کائیں سے سارے جہان کے کوّے اپنے گرد جمع کر لیتا ہے۔ وہ دراصل "کاف" کو دہراتا ہے۔ غرض ان سادہ آوازوں کے بولنے میں ایک انسان کا بچہ اور حیوانات اور جانور برابر کے شریک ہیں۔ مگر انسان اُن پر ترقی پا کر انہی سادہ آوازوں یعنی م۔ ب۔ ت۔ ن۔ د اور ج وغیرہ کو جو کہ قدرتی حروف ہیں۔ مرکب کر کے الفاظ وضع کر لیتا ہے اور ان ہی الفاظ سے وہ جملے بنا کر استعمال کیا کرتا ہے تو وہ حیوانِ ناطق کہلانے لگتا ہے لیکن حیوان اپنی حد سے آگے نہیں بڑھ سکتا (ہاں طوطا مینا جو کچھ بولتے ہیں وہ صرف انسان کے سکھانے سے ہماری نقل کرتے ہیں ورنہ وہ کچھ سمجھ کر نہیں بولتے)

لہٰذا میرے نزدیک حرف کی تعریف یہ ہے کہ وہ سادہ قدرتی آوازیں جن کے بولنے میں حیوان اور انسان دونوں برابر کے شریک ہیں۔ دراصل انہی سے ہر زبان کی بول چال کے لئے حروف وضع کئے جاتے ہیں۔ مثلاً ایک انگریز بچہ جس کے والدین خالص یورپین ہوں۔ ٹ۔ ڈ۔ ڑ۔ اور ط وغیرہ کو صحیح طور پر نہیں بول سکتا۔ اسی طرح ایک عرب بچے کو "پ" بولنا ہو تو وہ اپنے گلے سے "ب" کی آواز نکالے گا۔ مگر ایرانی بچہ "پ" کو بخوبی بول سکتا ہے۔

غرض یہ حروف اردو زبان کے لئے ا ب پ ت وغیرہ پینتیس کے قریب ہیں جو قدرتی سادہ آوازیں ہیں اور ان کے کچھ معنی بجز اس کے کہ یہ آوازیں عالمِ شیر خوارگی میں بچے کے کام آتی ہیں۔ اور کچھ نہیں ہیں پھر وہ انہی سادہ آوازوں کو جو دو یا دو سے زیادہ ہوں اکٹھا کر کے جب بولنے لگتا ہے تو ایسے مرکب لفظ بن جاتے ہیں جیسے "مم" یا "نن" میں "میم" اور "نون" کو دو دو مرتبہ جمع کیا گیا ہے یہ بچے کے قدرتی الفاظ ہیں جو اگرچہ اب ہمارے نزدیک مہمل سہی مگر ہم بھی بچپن میں انہی کے ذریعے اپنے مافی الضمیر کا اظہار کیا کرتے تھے۔

غرض لفظ کی تعریف یہ ہے کہ بعض سادہ قدرتی آوازیں جو ہمارے منہ سے خود بخود صادر ہوتی ہیں۔ مثلاً ا ب پ ت اور ج وغیرہ کی آوازیں) ہم جب ان میں سے کم از کم دو کو جمع کر کے بولتے ہیں تو وہ لفظ کہلاتا ہے۔

اور یہ ہمیشہ بامعنی ہوا کرتا ہے۔ جیسے "ٹ۔ اور ن" دو قدرتی سادہ آوازیں ہیں ان کو مرکب کرو تو ٹن اور نٹ دو لفظ بن گئے۔ ٹن ہماری اردو زبان کا اصلی لفظ نہیں مگر انگریز اس کو بولتے ہیں تو یہ درحقیقت بےمعنی نہ ہوا کیونکہ کسی نہ کسی زبان میں اس کے کچھ معنی ضرور ہیں۔ اسی طرح "نٹ" انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں مستعمل ہے۔ مگر دونوں زبانوں میں اس کے معنی مختلف ہیں۔ لہٰذا ایک حرف تو بےمعنی ہو سکتا ہے۔ لیکن لفظ کبھی بےمعنی نہیں ہو سکتا۔ اس لئے ہمارے صرفیوں کا کسی لفظ کو مہمل قرار دینا اصلیت سے بہت دور ہے۔

۱۔ حروف ہجا کی بحث | حرف جس کی اوپر تعریف کی گئی ہے۔ ہر ملک کی بول چال کے لئے انہی سے الفاظ بنائے جاتے ہیں۔ مگر چونکہ ان پر آب و ہوا کا قدرتی اثر پڑتا ہے ان کی تعداد ہر جگہ یکساں نہیں ہوتی۔ مثلاً انگریزی زبان کے حروف تہجی کل ہم ۲۶ ہیں۔ لیکن اردو کے حروف ہجا کے تعین کرنے میں ہمارے قواعد والوں میں بہت اختلاف پایا جاتا ہے۔ مثلاً پرانے قواعد اردو نو اردو زبان کے صرف پنتیس حروف بتاتے ہیں مگر ڈاکٹر عبدالحق صاحب کے قواعد اردو میں ان کی تعداد پچاس لکھی ہے۔ مصباح القواعد میں ان کی تعداد اکیاون درج ہے اور آئین اردو میں جو کہ حال کی تالیف ہے یہ حروف تہجی ترپن تک بڑھا دیئے گئے ہیں۔ مگر ان سب پر سید انشاء اللہ خاں سبقت لے گئے ہیں کیونکہ وہ اردو کے حروف ہجا کی تعداد کم از کم پچاسی اور زیادہ سے زیادہ پچانوے ثابت کرتے ہیں۔ چنانچہ آپ دریائے لطافت میں جو اردو کی سب سے پہلی قواعد کی کتاب ہے اور آج سے ایک سو پنتیس برس قبل تصنیف ہوئی۔ تحریر فرماتے ہیں۔

موخفا اینکہ چوں زبان اردو عطرِ زبان ہائے دیگر است حروفے کہ دریں زبان بہ تلفظ در مے آید۔ ہشتاد و پنج حرف است نزدِ فصیحان اہلِ تحقیق۔ و نزد عوام و تحقیق ناآشنایان نود و پنج حرف است۔ وغیرہ وغیرہ۔

میں اس بحث کو زیادہ بڑھانا نہیں چاہتا۔ ہمارے قواعد والوں کو اپنی زبان کے حروف ہجا کی تعداد صحیح طور پر معین کر دینی چاہیئے تاکہ آئندہ اس امر کے متعلق کوئی اختلاف باقی نہ رہے۔

۳۔ کلمہ کے اقسام | یہ ایک اور متنازعہ فی امر ہے۔ پرانے قواعد نویس تو کلمے کے تین اقسام لکھا کرتے تھے یعنی اسم، فعل اور حرف۔ مگر وہ لوگ انگریزی گریمروں سے ناواقف تھے۔ ڈاکٹر عبدالحق صاحب نے انگریزی گریمروں کے مطالعہ کرنے کے بعد اپنے قواعد اردو کے صفحہ ۷ پر تحریر کیا ہے کہ کلمہ یا لفظ کی دو قسمیں ہیں۔ اول مستقل (کلمے) جو اپنی ذات سے پورے معنی رکھتے ہوں۔ دوئم غیر مستقل جو اپنی ذات سے پورے معنی نہ رکھتے ہوں۔ جب تک وہ کسی دوسرے لفظ کے ساتھ مل کر نہ آئیں۔ وہ مستقل کلموں کی یہ پانچ قسمیں لکھتے ہیں یعنی اسم (۱)، صفت (۲)، ضمیر (۳)، فعل (۴) اور (۵) تمیز اور غیر مستقل کلموں کی وہ چار قسمیں بتلاتے ہیں (۱) (۲) ربط عطف (۳) تخصیص اور (۴) فجائیہ۔

لیکن آئین اردو کے مؤلف ڈاکٹر صاحب موصوف سے بھی دو قدم آگے بڑھ گئے ہیں کیونکہ وہ اردو کلمے کے اقسام تیرہ بتاتے ہیں یعنی اسم، ضمیر، صفت، فعل، متعلقات فعل، ربط، عطف، ندا، جواب، تفسیر، تمنا، تزئین کلام اور طبعی (بہ حوالہ آئین اردو صفحہ ۳۶)

غرض جتنے منہ اتنی باتیں۔ گویا جس قدر اردو قواعد کی کتابیں نئی نئی لکھی جا رہی ہیں ان میں سابقہ اردو گریمروں کے مستند اصول و قواعد سے بہت اختلاف کیا جا رہا ہے اور یہ اچھی بات نہیں ہے۔ لہٰذا ہمارے قواعد دانوں کو یا ہندوستانی یونیورسٹیوں کو لازم ہے کہ وہ ان علمی امور کے اختلافات مٹانے کی طرف جلد متوجہ ہوں۔

۴۔ علم صرف کی وسعت | قواعد اردو کی قدیم کتابوں میں صرف کی تعریف یہ لکھی ہے کہ صرف وہ علم ہے جس سے کلموں کی پہچان اور ان کے تغیر و تبدل کی شناخت حاصل ہوتی ہے۔ (بہ حوالہ قواعد اردو مرتبہ منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز صفحہ ۱)۔ لیکن ڈاکٹر عبدالحق صاحب اس کی نسبت صرف اسی قدر لکھتے ہیں کہ صرف میں الفاظ سے بحث ہوتی ہے (ملاحظہ ہو قواعد اردو مؤلفہ ڈاکٹر صاحب موصوف صفحہ ۷۱) آئین اردو میں علم صرف کی کوئی تعریف نہیں کی گئی فقط حاشیے میں لکھا ہے کہ صرف کے معنی ہیر پھیر۔ الٹ پلٹ کرنے کے ہیں۔ لیکن مصباح القواعد (صفحہ ۱۳) میں یہ تحریر درج ہے کہ صرف اس علم کا نام ہے جس میں حروف و حرکات کے تغیر و تبدل سے مختلف طرح کے الفاظ اور مختلف قسم کے معنی پیدا ہوتے ہیں مقصود اس سے یہ ہے کہ بولنے والا صحیح لفظ بولے۔

مگر علم صرف کی یہ تمام تعریفیں ناقص ہیں۔ میں لکھ چکا ہوں کہ حروف وہ سادہ آوازیں ہیں جو ایک انسان اور حیوان دونوں کے منہ سے خارج ہوتی ہیں۔ انہی کو ہم نے جمع کیا تو معلوم ہوا کہ ان کے بولنے میں ہم اپنے ہونٹوں۔ دانتوں۔ تالو۔ زبان۔ حلق اور گلے سے کام لیتے ہیں۔ اسی لئے بعض آوازیں حلقیہ ہیں۔ بعض شفویہ (ہونٹوں سے نکلی ہوئی جیسے۔ ب۔ ف اور میم وغیرہ) بعض سنیّہ (جن کا تعلق دانتوں سے ہے) بعض لہویہ (تالو سے متعلق) اور ذلقیہ (وہ جو ہماری زبان کی جڑ سے نکلتی ہیں) تو علم صرف کا پہلا کام یہ ہے کہ اس میں حروف کے تلفظ کو بیان کیا جائے اور پھر اردو عبارت

کی تلاوت جس طرح کہ درست طور پر ہونا چاہئے۔ اس کے اصول اسی طرح قلمبند کئے جائیں جیسا کہ عربی زبان دانوں نے قرآن مجید کی تلاوت کے لئے خاص خاص اصول و قواعد مقرر کئے گئے ہیں (۲) اردو زبان کے الفاظ کس طرح عربی اور فارسی اور ہندی زبانوں سے مستعار لئے گئے اور پھر کس کس طرح ان کے لکھنے میں حروف تہجی کو وضع کرنا پڑا یہ ساری داستان آج تک کسی قواعد اردو میں درج نہیں ہے۔ حالانکہ ہمارے صرفیوں کا یہ خاص غرض ہے کہ وہ بیان کرتے کہ کسی طرح مصری ہیروگلفس سے عبرانی حروف بنائے گئے اور ان ہی سے کوئی حروف تہجی جن سے پھر فارسی حروف وضع ہوئے اور یہی فارسی نسخی حروف ہیں کہ جن کو ہم اپنے اردو حروف تہجی کے لکھنے میں استعمال کرتے ہیں (۳) علم صرف کا ایک اور کام اشتقاق الفاظ کا بیان کرنا ہے۔ جو کہ آج تک صرف لغات نویسوں کے ذمے ہے حالانکہ قواعد اردو کی کتابوں میں بھی اس کے متعلق کچھ نہ کچھ ضرور درج ہونا چاہئے۔ کہ الفاظ کس کس طرح حروف سے مرکب ہوتے اور پھر ان سے کس کس طرح دوسرے الفاظ مشتق کئے جاتے ہیں تاوقتیکہ ایسا نہ کیا جائے۔ ہمارے زبان دان کامل انشا پرداز ہرگز نہیں بن سکتے۔ کیونکہ علم صرف کا مقصد ہی یہ ہے کہ ہم "الفاظ" کی اصلیت، ان کے جملوں میں استعمال اور ان کے مختلف معانی جاننے پر ہر طرح قادر ہوں (۴) ہر قواعد اردو میں زبان کی موجودہ حالت واضح کرنے کی غرض سے بعض نامور ادیبوں کی تصنیفات سے مختصر اقتباسات بھی ضرور مندرج ہونے چاہئیں۔ تاکہ جو کہ جو شخص علم صرف کو بطور فن حاصل کیا چاہتا ہے۔ وہ اس کے بہترین نمونوں سے بھی کماحقہ واقف ہو۔ چنانچہ سید انشاء اللہ خان نے آج سے ۱۳۵ برس قبل کی زبان اردو کے نمونے دریائے لطافت میں اسی غرض کو مدنظر رکھ کر پیش کر دیئے ہیں جو دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ (۵) علم صرف کا آخری کام یہ ہے کہ وہ جب الفاظ اور جملوں کے تعلقات کو بیان کر کے نثر کا لکھنا پڑھنا اس قدر آسان کر دے کہ مبتدی اس میں کوئی غلطی نہ کر سکے تو پھر نظم کے لئے رستہ صاف کرنے کو علم عروض کے بعض سادہ اصول و قواعد پیش کرے۔ کیونکہ عروض اور [illegible] قواعد زبان در اصل دو مختلف چیزیں نہیں ہیں اس لئے پراسوڈی (PROSODY) یعنی علم عروض کو انگریزی قواعد دانوں نے علم قواعد ہی کا ایک حصہ بتایا ہے مگر ہمارے ہاں عربی علم زبان کا تتبع کر کے اس کو ایک جداگانہ علم فرض کیا گیا ہے جو صحیح نہیں ہے [illegible] علم بلاغت اور علم معانی بھی در اصل علم صرف ہی کے بعض قواعد مثلاً تشبیہ و استعارہ وغیرہ کی وضاحت ہے تو یہ بھی مختصر علم صرف میں بیان کئے جا سکتے ہیں۔

البتہ علم نحو صرف سے کچھ مختلف ہے اور ہم فی الحال اس کے متعلق یہاں کچھ لکھنا نہیں چاہتے۔ الحاصل ہمارے قواعد اردو یا گریمر کی کتابیں توجہ طلب ہیں اور ان میں جو نقص "علم صرف" کے بعض اصول و قواعد کے متعلق پائے جاتے ہیں وہ جلد رفع کئے جانے کے لائق ہیں اور ان کو بہت واضح طور پر سائنس کے اصولوں کے مطابق لکھنے کی اشد ضرورت ہے۔

شبیر علی خاں سرخوش

رقص

رقص تیرا سحاب کی صورت — اور سراپا شباب کی صورت
تمکنت میں ہیں شوخیاں مستور — برقِ زیرِ سحاب کی صورت
تختۂ گُل پہ اک بہار کا نقش — تو نے کھینچا سراب کی صورت
نغمہ اور لَے سے پاؤں کی جُنبش — نشّہ آور شراب کی صورت
ہے وہ پُرکیف قوّتِ اظہار — جلوۂ بے نقاب کی صورت
ایک جانب لطیف خندۂ گُل — اک طرف اضطراب کی صورت
کبھی مانندِ آتشِ خفتہ — اور کبھی التہاب کی صورت
بجلیاں کوندتی نظر آئیں — قلب کے پیچ و تاب کی صورت
وہ تھرکنا، تھرک کے رُک جانا — تھا سوال و جواب کی صورت
بڑھ کے پھر اُلٹے پاؤں پھر جانا — اشتیاق و حجاب کی صورت
اللہ اللہ وہ حُسن اور وہ فن — بخششِ بے حساب کی صورت

حسنِ قدرت کمالِ فن کی ہے
طرفہ تر انتخاب کی صورت

خادم محی الدین

محسن

جزیرے بھر میں گینا اپنے حسن اور شوخی میں یکتا تھی اور کوتو اسے دل سے چاہتا تھا۔ گینا جب سر پر مٹی کا گھڑا دھرے اپنی جھونپڑی سے نکل کر جھرنے کی طرف جاتی تو کوتو اس کی مست چال اور رس بھی آنکھوں کو دیکھ کر بے خود ہو جاتا۔ گینا اس کی طرف دیکھ کر مسکرا دیتی اور پھر کوتو کو ایسا معلوم ہوتا جیسے جزیرے کی کل کائنات، اس کا دل و دماغ، اس کی قوت سب اس کی مسکراہٹ میں سمائے جا رہے ہیں، اُسے یقین ہو جاتا کہ گینا اُسے چاہتی ہے، دل سے چاہتی ہے اور پھر اُس کے سوا وہ کسی اور کو کیوں چاہنے لگی، کوتو جیسا جوانمرد اور نڈر آدمی جزیرے بھر میں بھی تو نہیں تھا۔ گذشتہ ماہ جب سمندر ایک خوفناک اژدہے کی طرح پھنکاریں مار رہا تھا اور چاروں طرف طوفان اٹھ رہا تھا کوتو ہی پاس کے شہر سے اناج اور دوسری ضروری چیزیں اپنے جزیرے میں لایا تھا اور پھر ایسے وقت جب کہ سمندر میں طغیانی بڑھی ہوتی اور دوسرے ماہی گیر اپنی جھونپڑیوں میں دبکے رہتے تو وہ بے خوف و خطر کشتی کو لہروں میں ڈال کر مچھلی کی تلاش میں نکل پڑتا۔ اپنی جان پر کھیل کر اُس نے بارہا طوفان میں پھنسے ہوئے ماہی گیروں کی جانیں بچائی تھیں اور یہ میں اُسے خاص ملکہ تھا۔ جزیرے کے تمام ماہی گیر اس کو عزت و حرمت کی نگاہ سے دیکھتے تھے پھر اگر اُسے یہ گمان تھا کہ گینا اس سے محبت کرتی ہے تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہ تھی۔

ابھی پچھلے ہفتے اُس نے لاکا کو سمندر کی خوفناک لہروں سے بچایا تھا۔ لاکا پاس کے کسی جزیرے میں ماہی گیر تھا۔ اگرچہ ماہی گیروں کی کوئی خصوصیت اُس میں موجود تھی، اُسے ٹھیک طرح تیرنا بھی تو نہیں آتا تھا۔ اور یہی وجہ تھی کہ کشتی الٹ جانے کے بعد وہ ایک بے حس و حرکت تختے کی طرح غوطے کھانے لگا تھا، اگر کوتو وقت پر پہنچ جاتا تو لاکا کب کا سمندر کی تہ میں مچھلیوں کی غذا بن چکا ہوتا۔ ہلکا پھلکا جسم، پیلے پیلے رنگ اور بڑے بڑے بالوں کی وجہ سے اس میں ایک نسائیت سی آگئی تھی۔ اس کی گہری سیاہ آنکھوں میں ہمیشہ نیند کا ہلکا سا خمار جھلکتا رہتا۔ جس کی وجہ سے دیکھنے والا فوراً اس کی طرف کھنچنے لگتا۔ ایک ہفتے سے وہ اپنے محسن کوتو کے ساتھ اس کی جھونپڑی میں رہتا تھا اور دن رات اس سے چمٹا رہتا، کوتو جب جھلملاتے ہوئے تاروں کی روشنی میں اپنی کشتی لے کر مچھلی پکڑنے نکلتا تو لاکا اُس کے ساتھ ہو جاتا کو تو کو اُس کی ذات سے کوئی خاص مدد نہ ملتی بلکہ اُلٹا اُس کی حفاظت کرنی پڑتی۔ پھر بھی اپنی عقیدتمندی کا اظہار کرنے کے لئے لاکا ہمیشہ اپنے محسن کے پیچھے سائے کی طرح لگا رہتا۔

لاکا کا نسوانی حسن گینا کو اپنی طرف متوجہ کئے بغیر نہ رہ سکا، جب لاکا کسی کام کی غرض سے گینا کی جھونپڑی کے سامنے سے گذرتا تو گینا دروازے میں آکر کھڑی ہو جاتی اور اُسے کن انکھیوں سے دیکھنے لگتی، ایک ہفتے کے عرصے میں وہ اپنی مختلف حرکات سے لاکا کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانے میں کامیاب ہو گئی۔ لاکا اب اُسے دیکھ کر چلتے چلتے رک جاتا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں وہ سب کچھ کہہ جاتا جسے زبان سے ادا کرنے سے قاصر تھی۔

اب گینا آگ لینے یا کسی اور بہانے کوتو کی جھونپڑی میں بھی آنے جانے لگی۔ کوتو یہ دیکھ کر بہت خوش ہوا کہ اب گینا کو اس کی مدد کی ضرورت ہے۔ وہ خیال کرتا گینا کا باپ بے چارہ کافی بوڑھا ہو چکا ہے آخر وہ کب تک گینا کی دیکھ بھال کرے گا۔ گینا کو ضرور کسی دوسرے شخص کا سہارا لینا پڑے گا، اور کوتو سے بہتر اور موزوں شخص جزیرے بھر میں اور ہو ہی کون سکتا ہے؛ یہ خیال آتے ہی اُس کی آنکھیں چمکنے لگتیں اور وہ اپنے جسم میں پہلے سے زیادہ طاقت محسوس کرنے لگتا اور فخر سے اُس کی گردن تن جاتی۔

کوتو لاکا، اور گینا بہت جلد آپس میں بے تکلف ہو گئے، کوتو کو اپنے معمولی فرائض کے علاوہ اب ایک اور فرض بھی ادا کرنا پڑتا۔ ساحل سے لوٹتے وقت وہ درختوں سے تازہ تازہ کھجوریں اور ناریل توڑ کر ساتھ لاتا اور گینا کے بوڑھے باپ کے سامنے اس طرح لا ڈالتا جیسے وہ اس کا اپنا باپ ہے اور جس کی دیکھ بھال کرنا اس کا اخلاقی فرض ہے۔

لاکا فطرتاً کاہل اور سست تھا اسی لئے وہ بہت دنوں تک اپنے محسن کی رفاقت کا دم نہ بھر سکا۔ وہ اکثر بخار یا درد سر کا بہانہ کر کے جھونپڑی میں منہ ڈھانپ کر پڑ جاتا اور کوتو کے جاتے ہی بستر سے اٹھ کر ساحل پر پہنچ جاتا اور درختوں کے جھنڈ میں بھٹکتا پھرتا، دوپہر کی چلچلاتی ہوئی دھوپ میں جب جزیرے کے سب ماہی گیر سمندر کی موجوں میں اپنی روزی تلاش کرنے میں مشغول ہوتے

لاکا گینا کو ساتھ لئے کہیں دور ساحل پر کھجوروں کے سائے میں بیٹھا ہوا خوش فعلیوں اور قہقہوں میں معروف رہتا۔

اوّل اوّل جب کوتو نے اُسے ساتھ جزیرے میں لایا تھا۔ اس وقت لاکا کا خیال تھا کہ وہ بہت جلد اپنے جزیرے کو واپس چلا جائے گا مگر اب واپس جانے کے خیال سے وہ کانپ اٹھتا، اس کے اپنے جزیرے میں اس کی زندگی بھکاریوں سے بدتر تھی، وہاں اُسے کوتو جیسا جفاکش محسن، اور گینا جیسی رسیلی آنکھوں والی شوخ لڑکی کہاں ملے گی، وہ گینا کی مسکراہٹ اور آنکھوں کے تصور ہی سے تڑپ جاتا۔ پھر ساحل کی چمکتی ہوئی ریت، درختوں کے ٹھنڈے سائے جھرنے کا میٹھا پانی حتیٰ کہ خود کوتو اس کا محسن بھی تھوڑی دیر کے لئے اس کی یاد سے محو ہو جاتا۔

لاکا اور گینا کی حد سے بڑھی ہوئی بے تکلفی کو دیکھ کر کبھی کبھی کوتو کو شک ہونے لگتا، مگر جب گینا مسکرا کر اس پر ایک نگاہِ غلط انداز ڈالتی تو پھر وہ سب کچھ بھول جاتا، وہ لاکا کے نسوانی حسن، اس کی کمزوری اور ناتوانی کا خاکہ اڑانے لگتا اور اس کے بھونڈے مذاق پر گینا کھلکھلا کر ہنس پڑتی کوتو کو ایسا معلوم ہوتا جیسے اس نے ساری دنیا پر فتح پالی ہے لاکا پر بھی، اسے بے اختیار اپنے آپ پر ہنسی آجاتی، وہ سوچتا بھلا گینا لاکا ایسے کمزور اور ناتواں مرد کو کیوں چاہنے لگی، اور پھر ایک فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ وہ لاکا کو رحم کی نگاہوں سے دیکھنے لگتا، کمزور اور ناتواں لاکا! اُسے واقعی لاکا سے ہمدردی تھی۔

مگر لاکا اور گینا کے تعلقات زیادہ دن تک کوتو سے پوشیدہ نہ رہ سکے، اور اُس کا شک آہستہ آہستہ یقین کی صورت میں تبدیل ہو گیا، اب اُسے معلوم ہوا کہ لاکا اس کے ساتھ سمندر میں جانے سے احتراز کرتا ہے،

وہ اب کھنچا کھنچا سا رہنے لگا، گینا جب کبھی اس کی طرف مسکرا کر دیکھتی تو کوتو کو اس کی مسکراہٹ میں زہر جھلکتا دکھائی دیتا، وہ غصے سے کانپنے لگتا۔ اور لاکا پر حقارت آمیز نظریں ڈال کر جھٹ منہ پھیر لیتا اور اپنے کام میں مشغول ہو جاتا، اب وہ پہلے سے بھی زیادہ محنتی اور جفاکش بن گیا تھا۔ وہ رات بھر بستر پر کروٹیں بدلتا رہتا، اور کافی اندھیرا ہونے پر بھی اُٹھ بیٹھتا اور کشتی لے کر سمندر کی لہروں میں گم ہو جاتا، یا پھر مچھلیاں بیچنے کے بہانے دو دو تین تین دن تک شہر کے گلی کوچوں میں دیوانوں کی طرح بھٹکتا پھرتا، لاکا کی حریصانہ نگاہیں، گینا کے بوڑھے باپ کا خشک چہرہ، جزیرے کے ماہی گیر اس کے مداح اور اُس کے خیر خواہ سب ریت کے نشان کی طرح اس کی یاد سے مٹ گئے مگر گینا ——! وہ بہتیری کوششوں کے باوجود بھی اُسے نہ بھلا سکا، اس کی سیاہ چمکیلی آنکھیں اور دلکش اعضا اب بھی اس کے دل و دماغ پر اسی طرح حاوی تھے بلکہ اُن کی گرفت کوتو کے جال کی طرح دن بدن سخت ہوتی جا رہی تھی۔

کوتو کبھی رشک سے دیوانہ ہو جاتا پھر وہ اس کانٹے کو نکال پھینکنے کے منصوبے باندھنے لگتا جو اُس کی راہ میں حائل تھا، کبھی سوچتا گینا سے صاف صاف اپنے مقصد کا اظہار کر دے۔ پھر سوچتا لاکا کو اپنے گھر جانے پر مجبور کرے مگر ایسی صورت میں ممکن ہے گینا بھی اس کے ساتھ چلی جائے پھر تو اُسے اپنے مقصد میں بری طرح ناکامی ہوگی بارہا اس نے خیال کیا کہ لاکا کو مچھلی پکڑنے کے بہانے دور کہیں سمندر میں لے جا کر غرق کر دے! غرق ——؟ مگر جب وہ خود غرق ہو رہا تھا، کوتو ہی نے تو اُسے بچایا تھا، کوتو جو اس کا محسن اس کا مربّی تھا۔

وہ کئی دن تک پریشان حال رہا مگر کوئی فیصلہ نہ کر سکا، اُس کی زندگی اجیرن ہو رہی تھی، جب وہ سمندر میں جال ڈالے پڑا رہتا تو اُسے اپنی جھونپڑی میں واپس آنے کی خواہش ہوتی اور جب جھونپڑی میں ہوتا تو لاکا اور گینا کی آنکھوں میں جھلکتی ہوئی بے باک محبت کو دیکھ کر وہاں سے بھاگ جانا چاہتا، وہ بیمار معلوم ہو رہا تھا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اس کے دیوتا نے اس کی ساری قوت، ساری شکتی اس سے چھین لی ہے۔ اور وہ بالکل ناتواں ہو گیا ہے، کمزور، لاکا سے بھی زیادہ کمزور۔

ایک رات کوتو شدید انتظار کے بعد بھی گھر واپس نہیں آیا۔ لاکا دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا، نصف شب کے قریب وہ جھونپڑی سے نکل کر درختوں کے جھنڈ کی طرف چلنے لگا۔ چاند پوری تابانی سے چمک رہا تھا لاکا نے چاند کی طرف دیکھا پھر اپنی نظریں ہٹا کر درختوں کے جھنڈ پر گاڑ دیں، وہاں ایک دوسرا چاند اُس کا منتظر تھا۔ جو اس کے من کی دنیا کو منور کئے ہوئے تھا، ایک پیکرِ محسوس ایک ایسا چاند جس میں لہروں کی سی حرکت تھی اور مچھلیوں کی تڑپ۔

وہاں پہنچ کر اس نے گینا کو بے تابی سے اپنی آغوش میں لے لیا، وہ دونوں خوش خوش اپنی آئندہ زندگی کے منصوبے باندھنے لگے، آج لاکا اسے دور کہیں بڑے شہر میں لے جائے گا۔ ماہی گیروں کے جزیروں سے بہت دور مشین اور بجلی کی دنیا میں، وہاں وہ بالکل محفوظ رہیں

گے کوتو کی بے پناہ قوت بھی ان تک نہ پہنچ سکے گی، وہ رات ان کی جزیرے میں آخری رات تھی، صبح تک وہ دور کسی دوسری دنیا میں پہنچ جائیں گے۔ جہاں گینا، لاکا اور محبت کے سوا کچھ نہ ہوگا۔

درختوں کے جھنڈ سے نکل کر وہ ساحل کی طرف چلنے لگے۔ قریب کی جھاڑی میں کچھ آہٹ سی ہوئی۔ مگر انہیں معلوم کرنے کی فرصت ہی نہ تھی کہ وہ کس کی آہٹ ہے، ممکن ہے کوئی جانور اپنے شکار کی تلاش میں باہر نکلا ہو اور اُن کے پیروں کی آہٹ سُن کر دوبارہ اپنی کمین گاہ میں چھپ گیا ہو۔

ساحل پہ بالکل خاموشی چھائی ہوئی تھی، پانی کی سطح پر ماہی گیروں کی کشتیاں روپہلی لہروں میں جھوم جھوم کر بہتے ہوئے رقص کر رہی تھیں۔ لاکا نے ایک چھوٹی سی کشتی کو انتخاب کیا اور اُسے کنارے پر کھینچ کر احتیاط سے باندھ دیا اور بہ نہایت اطمینان کے ساتھ گینا کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے اپنی جھونپڑی کی طرف لوٹ گیا، ساحل پر ایک متحرک سایہ کشتی کے گرد منڈلایا اور ایک شدید ضرب کی آواز سکوت کو توڑتے ہوئے سمندر کی تہہ میں ڈوب گئی۔

نصف گھنٹے کے بعد لاکا اور گینا اپنا مختصر سا سامان لیے ہوئے پست جھونپڑیوں میں سے گزرنے لگے۔ ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ جفاکش ماہی گیر دن بھر کی تکان سے چور ہو کر خراٹے لے رہے تھے اور چاند اُن کی میٹھی نیند سے خوش ہو کر مسکراتا ہوا آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا۔

ساحل پر پہنچ کر دونوں کشتی میں بیٹھ گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے کشتی لہروں کو چیرتی ہوئی تیزی سے گذر گئی، ابر کا ایک بھٹکتا ہوا ٹکڑا چاند پر آکر رُک گیا اور ساحل پر ایک ہلکا سا دھندلکا چھا گیا یکایک پاس کی جھاڑی سے ایک جگر خراش قہقہہ فضا میں بلند ہوا اور ساحل کے سکوت کو چیرتا ہوا سطحِ آب پہ پھیل گیا، پھر ہر طرف خاموشی تھی۔ ہیبت ناک خاموشی ——

دوسری صبح کوتو خلافِ معمول دن چڑھے تک اپنی جھونپڑی میں پڑا خراٹے لے رہا تھا۔ وہ سکون و اطمینان کا مجسمہ معلوم ہو رہا تھا۔

مگر جزیرے بھر میں ایک بے چینی سی پھیلی ہوئی تھی، بچے بوڑھے سب گھبرائے ہوئے ساحل کی طرف دوڑے جا رہے تھے، اور وہاں اچھا خاصا مجمع لگا ہوا تھا۔ لاکا اور گینا کی بھیگی ہوئی لاشیں جال میں پھنسی ہوئی تازہ مچھلیوں کی طرح ریت پر پڑی ہوئی تھیں، اُن کے چہرے پر اب بھی خوشی کی جھلک نمایاں تھی، گینا کا بوڑھا باپ ٹکٹکی باندھے سمندر کی سطح کو گھور رہا تھا، اس کے چہرے پر خوشی یا رنج کی کوئی علامت نہ تھی، جس سمندر سے اُسے سالہا سال تک روزی ملتی رہی۔ بھلا اُس سے وہ شاکی کیوں ہوتا، وہ مطمئن نظر آرہا تھا، بالکل مطمئن۔

دو ماہی گیر اپنی بہادری کی داستان بیان کرنے میں معروف تھے، کس طرح صبح کے وقت اُن کی لاشیں سمندر پر تیرتی ہوئی نظر آئیں۔ اور وہ کتنی جانفشانی سے انہیں اپنی کشتی میں ڈال کر گھر واپس لائے تھے۔ مگر کوئی یہ نہ بتا سکا کہ وہ ڈوبے کیسے، مجمع سے مختلف آوازیں آرہی تھیں۔

"شاید جان بوجھ کر خودکشی کی ہو" ایک نے کہا

"نہیں! طوفان میں پھنس گئے ہوں گے" دوسرا بولا۔

"کشتی میں سوراخ ہوگا" تیسرے نے لاشوں پر رحم آمیز نگاہیں ڈالتے ہوئے کہا۔

پھر وہ سب لاشوں کو اٹھا کر کوتو کی جھونپڑی کی طرف لے چلے، انہیں کوتو سے ہمدردی تھی۔ گہری ہمدردی، وہ سوچ رہے تھے۔ لاکا اور گینا کے مرنے کا غم کوتو شاید ہی برداشت کر سکے۔

اور وہ برداشت بھی کیسے کر سکتا تھا! آخر وہ لاکا کا محسن تھا نا۔

محمد فاروقی



خواب کی دنیا

یہاں اکثر سنے تھے حسن کے رازِ نہاں میں نے — یہاں پہروں کہی تھی دردِ دل کی داستاں میں نے
یہاں ڈھونڈا تھا سجدوں کے لئے اک آستاں میں نے — یہاں پائی تھی آخر اک بہشتِ جسم و جاں میں نے
یہی تھی ہمنشیں! میرے شباب و خواب کی دنیا

وہ آجاتا تو شب رشکِ سحر معلوم ہوتی تھی — ہر اک شے حسن سے جنّت نظر معلوم ہوتی تھی
جوانی کی نظر صہبا اثر معلوم ہوتی تھی — خوشی میں زندگانی مختصر معلوم ہوتی تھی
یہی تھی ہمنشیں! میرے شباب و خواب کی دنیا

بھری برسات میں پچھلے پہر گھر کر سحاب آتا — بہاریں لوٹ پڑتیں، ذرّے ذرّے پر شباب آتا
جنوں کا زور ہوتا دَور میں جامِ شراب آتا — مثالِ موجِ مے ساقی کے چہرے پر حجاب آتا
یہی تھی ہمنشیں! میرے شباب و خواب کی دنیا

بہارِ کیف و مستی لے کے آتیں چاندنی راتیں — محبت رنگ لاتی اور بڑھ جاتیں ملاقاتیں
بیاں کرتے تھے دونوں حُسن و الفت کی کراماتیں — اسی میں رات کٹتی، ختم ہی ہوتی نہ تھیں باتیں
یہی تھی ہمنشیں! میرے شباب و خواب کی دنیا

محبت کے نشے میں حُسن کا دریا بہاتے تھے — مجھی کو ابتدائے عشق کا قصّہ سناتے تھے
کہیں میں مسکرا دیتا تو فوراً روٹھ جاتے تھے — منانے پر مرے، رُخ پھیر کر کچھ گنگناتے تھے
یہی تھی ہمنشیں! میرے شباب و خواب کی دنیا

کبھی قبلِ سحر پورا نہ ہوتا میرا افسانہ — جھکولے نیند کی موجوں میں کھاتی جانِ میخانہ
نشے میں شمع بنتی زینتِ آغوشِ پروانہ — یونہی اکثر چمکتی رات بھر تقدیرِ غمخانہ
یہی تھی ہمنشیں! میرے شباب و خواب کی دنیا

اندھیری رات میں اُن کا چلا آنا قیامت تھا — مری حیرت پہ پہروں پھول برسانا قیامت تھا
صدائے جنبشِ داماں سے گھبرانا قیامت تھا — سحر کے نور میں ہنس کر سما جانا قیامت تھا
یہی تھی ہمنشیں! میرے شباب و خواب کی دنیا

سکندر علی وجد


SHAHBAZ
LAHORE
جس نے
اردو صحافت کی دنیا
میں ہر لحاظ سے بلند پائیگی
کی ایک نظیر قائم کر دی ہے۔
ملت اسلامیہ
کا
بیباک ترجمان
روزنامہ
شہباز
لاہور
ادارۂ تحریر
بدل اشتراک

بھگوان

وسنت اپنی بوڑھی ماں کو سپردِ آتش کر کے لوٹ رہا تھا!

دورِ گریہ سے اس کی آنکھیں سرخ سرخ انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں اس کی آتشیں پتلیوں پر سے آنسو بھاپ بن کر اڑتے جا رہے تھے۔

وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا چلا آ رہا تھا!

اب اس گاؤں میں کون ہے میرا! ایک ماں تھی آج وہ بھی سدا کے لئے چھوڑ گئی" یہ سوچ کر اس کی آنکھیں پھر پرنم ہو گئیں! سامنے سے دو کسان بیلوں کو ہانکتے لا رہے تھے۔ اس نے آنکھ چرا لی اور کترا کر نکل گیا۔ آج اس کا دل یہی چاہتا تھا کہ وہ روتا ہی جائے "اور اس کے آنسو کبھی نہ تھمیں۔ مرگھٹ سے اس کی جھونپڑی کافی دور تھی اور اسے اپنی ننگی پیٹھ پر سورج دیوتا کی تیز نظریں چبھتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں اس نے سوچا "چلو ذرا سستا لیں باغ میں، پھر گھر چلیں، گھر میں اب کون بیٹھا ہے جو راہ تک رہا ہوگا!"

آم کے پیڑ سے ٹیک لگا کر وہ بیٹھ گیا۔

سامنے دھرتی کے سینے سے سرخ چیونٹے اور چیونٹیاں ایک قطار میں چل کر ایک لال لکیر سی بنا رہی تھیں، کچھ آ رہی تھیں کچھ جا رہی تھیں، کچھ چلتے چلتے آپس میں مس ہو کر ٹھہر جاتی تھیں جیسے کچھ بات کہہ رہی ہوں — اور پھر اپنی راہ لیتی تھیں! ننھی ننھی جانوں کا یہ کھیل دیکھتے دیکھتے وسنت کے تھکے ہوئے جسم کو باغ کی ٹھنڈی اور سوندھی ہوا نے نیند کی دنیا میں پہنچا دیا۔ جب وسنت کی آنکھ کھلی تو کپاسی دھوپ شیشم کی چوٹیوں پر کھیل رہی تھی، وہ گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ بڑی بڑی آنکھوں میں ابھی نیند بھری ہوئی تھی آم کے بور کی خوشبو نے ہوا میں مل کر فضا کو اور خواب آور بنا دیا تھا۔ وسنت نے دو چار انگڑائیاں لے کر نیند کو دور پھینکا پگڑی اٹھا کر بے پروائی سے پاگل دماغ کے گرد لپیٹ لی۔ رات سے اس نے کچھ نہیں کھایا تھا اسے بھوک محسوس ہو رہی تھی۔ وہ گھر کی طرف چلا جا رہا تھا اس کی پیٹھ پر آم کے درخت کی چھال نے عجیب نقوش ابھار دیئے تھے۔ راستے میں جنگلی بیریوں سے تھوڑے کھٹے کھٹے بیر توڑ کر وہ ٹھونگتا ہوا چل دیا ابھی تھوڑی ہی دور گیا ہوگا کہ ریل کی سیٹی کی آواز سے چونک پڑا۔ پیپل والے تالاب کے اس طرف ریل سگنل نہ گرنے کی وجہ سے رکی کھڑی تھی، اور اس کے سامنے انجن کی بتی کی روشنی میں آہنی پٹریاں چمک رہی تھیں اب رات ہو چلی تھی!

معلوم نہیں کیا سوچ کر وسنت پٹری پٹری ہوتا ہوا ریل تک پہنچ گیا اور خاموشی سے ایک ڈبے میں چڑھ بیٹھا۔ اندر کے مسافر اسے عجیب نظروں سے دیکھنے لگے۔ وہ ان کی کڑی نگاہوں کی تاب نہ لا سکا اور کھڑکی سے باہر جھانکنے لگا۔ ریل اب آہستہ آہستہ رینگ رہی تھی۔ ساتھ ہی کھڑکی سے نکلتی ہوئی روشنی میں وسنت کا سایہ بھی چل رہا تھا۔ باقی ہر طرف بھیانک اندھیرا تھا۔ دور کبھی کبھی گاؤں کی کسی جھونپڑی کا دیا ٹمٹماتا ہوا دکھائی دے جاتا تھا۔ ریل اب تیزی سے بھاگ رہی تھی —— آہ اب وہ اس ندی پر سے گذر رہی تھی جس میں صبح وسنت نے اپنی پران پیاری ماتا کو راکھ کی صورت میں بہا دیا تھا! خود بخود دو تلملاتے ہوئے آنسو کھڑکی سے باہر پیچھے کو دوڑتی ہوئی زمین پر گر پڑے۔

وسنت پھر باہر نہ دیکھ سکا!

اس نے منہ اندر کر لیا! ڈبے میں ایک آدمی بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔ ایک عورت کم سن بچے کو سلانے کی کوشش کر رہی تھی اور کچھ لوگ بستر بچھا کر رات کے آرام کا سامان کر رہے تھے۔ چھت پر بتی کے گرد پروانوں کا ہجوم تھا جو پورے ڈبے میں چکر کاٹنے کے بعد واپس آ کر پھر وہیں سر ٹکراتے تھے، پاس ہی ایک چھپکلی اپنے پیٹ کی فکر میں تاک لگائے ان کے انتظار میں ٹھہری ہوئی تھی یہ منظر دیکھ کر وسنت نے اپنے دل میں کہا "بھگوان" اور اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ مگر گھنٹوں آنکھیں بند کرنے پر بھی اس کو نیند نہ آئی وہ دوپہر میں کافی سو چکا تھا۔ جب دوبارہ اس کی بھیگی ہوئی پلکیں ایک دوسرے سے جدا ہوئیں تو اس نے دیکھا کہ تمام لوگ سو رہے ہیں اندھیری رات میں ہوا سائیں سائیں کر رہی ہے ریل کی چھک پک چھک پک بدستور جاری ہے پروانے اسی طرح سر ٹکرا رہے ہیں۔ چھپکلی ایک ننھے سے کیڑے کو منہ میں دبائے نگلنے کی کوشش کر رہی ہے اور...... دفعتاً ایک سرد جھونکے نے اس کے لاغر برہنہ جسم میں کپکپی پیدا کر دی

وسنت نے پگڑی اتاری، دہری کی اور سردی سے بچنے کے لئے سیٹ کے نیچے دراز ہوگیا۔ سامنے کی سیٹ پر وہی اخبار میں حضرت ایک نرم گدیلے پر اونی کمبل اوڑھے ہوئے خراٹے لے رہے تھے۔ وسنت نے آہستہ سے اپنے دکھی من میں وہی لفظ دہرایا۔ "بھگوان" اور اپنی آنکھیں موند لیں!

(۲)

کلکتے جیسا شہر بھلا وسنت جیسے دہقانی نے کاہے کو کبھی دیکھا تھا۔ ہر طرف موٹریں، گاڑیاں، ٹرام، چہل پہل، عالی شان عمارتیں، شاندار ہوٹل، وہاں کے رہنے والوں کو دیکھ کر اس کے ماتھے پر ضرور بل آگئے تھے۔ انسان بھگوان کو مسکرانے کا موقع دے رہے تھے۔ ایک سنسار یہ بھی ہے اور گاؤں کا سنسار بھی سنسار ہے ایک ہوٹل کے سامنے سے گذرتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا۔۔۔ اس نے دیکھا اندر سفید سفید پتھر کی میزوں پر صاف ستھرے کپڑے پہنے ہوئے لوگ طرح طرح کی مٹھائیاں کھا رہے ہیں اور وہیں سڑک کے کنارے غلیظ کپڑوں میں ملبوس ایک بھکاری سڑی دال اور پھپھوندی لگی ہوئی روٹی کے ٹکڑے چبا رہا ہے یہ دیکھ کر خود بخود اس کا ہاتھ دل کی طرف بڑھ گیا۔۔۔ اس نے آہستہ سے من میں کہا "بھگوان" اور آگے بڑھ گیا۔ تھوڑی دور جاکر کیا دیکھتا ہے کہ ایک بنگلہ کے سامنے کچھ میزیں کرسیاں پڑی ہیں اور لوگ اُن پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ اسی لمحے ایک آدمی اٹھا اور کہنے لگا "میرے مترو! اگر اپنے پیارے دیس کو آزاد کرانا ہے تو ہم کو چاہئے کہ پریم اور شانتی سے مل کر رہیں اپنے سے نربل، اناتھوں اور غریبوں کی مدد کریں وہ بھی ہم جیسے آدمی ہیں۔ آخر ان کے بھی پران ہیں!" ایسی اچھی باتیں سن کر وسنت کا چہرہ خوشی سے دمکنے لگا۔ آج پہلی مرتبہ اُس نے اس شہر میں انسان کی صورت دیکھی تھی، خواہ مخواہ اس کا جی اس شخص سے ملنے کے لئے تڑپنے لگا مگر قدم بڑھاتے ہی دربان نے روک دیا کہ "یہ پرائیویٹ جلسہ ہے" وہ اس انتظار میں پھاٹک سے لگ کر کھڑا رہا کہ جب یہ باہر نکلیں گے تو مل لوں گا۔ لیکن تھوڑی دیر بعد جب وہ موٹر میں بیٹھے باہر جاتے دکھائی دیئے تو وہ سوائے ہاتھ اٹھا کر پرنام کرنے کے اور کچھ نہ کر سکا وہ سوچنے لگا کہ بڑے لوگ صرف جلسوں اور تقریروں ہی میں غریبوں سے ہمدردی جتاتے ہیں، دیکھو نا میرے پرنام کا جواب بھی نہ دیا۔ یہ سوچ کر وہ بد دل سا ہوگیا مگر پھر آشا نے روپ کھایا اس نے سوچا کہ اِن سے گھر پر ملنا چاہئے۔ شاید کہیں نوکر رکھا دیں۔ صورت سے بھی دیالو معلوم ہوتے تھے، یہ سوچ کر اس نے دربان سے اُن کا پتہ پوچھ لیا اور اسی وقت ان کے گھر کی طرف چل کھڑا ہوا۔ راستے میں اس نے دیکھا کہ وہی صاحب اپنی خوشنما موٹر میں بیٹھے فرّ سے گذر گئے۔ ان کی موٹر چلی جانے کے بعد ایک اپاہج بھکاری بھی گھسٹتا ہوا اسٹرک پار کرنے لگا۔۔۔ وسنت وہاں سے چل دیا! راستے میں اُس نے ایک شخص کا ٹرنک اُس کے مکان تک پہنچا دیا جو اسی سمت تھا۔ مزدوری میں اُسے تانبے کے دو ٹکے مل گئے!

(۳)

"میری ماں مرگئی ہے میرا کوئی نہیں آپ کی باتیں سن کر آیا ہوں! میری آشاؤں کو نہ توڑیئے آپ بڑے آدمی ہیں، دیالو ہیں کرپا کرکے مجھے کہیں نوکر رکھا دیجئے" وسنت نے کہا

"ہاں ہاں ٹھیک ہے" مقرر صاحب بولے "مگر کوئی کس کس کی مدد کرے تمہاری طرح ہزاروں روز آتے ہیں!"

"آپ کی کرپا ہو جائے تو سب کچھ ہو سکتا ہے، کل آپ کہہ رہے تھے کہ بڑے لوگوں کو اناتھوں اور غریبوں کی مدد کرنا چاہئے" وسنت نے کہا

"اچھا دیکھو صبح آؤ ہم سفارش لکھ دیں گے" کہہ کر مقرر صاحب اندر چلے گئے، وسنت اپنے مورکھ من میں آشاؤں کی منوہر کلیاں چٹکاتا واپس لوٹا۔ بارش ہو رہی تھی اور وہ تمام بھیگ گیا تھا۔ اُس نے اپنی دھوتی کے کونے سے دو پیسے کھولے اور ایک معمولی سے ہوٹل کی طرف لپکا! اس جیسے ٹکر گداؤں کے لئے ہوٹل والے نے ہوٹل کے باہر ہی ایک چھپکے میں بغیر ڈنڈی کے پیالیاں اور چٹکی ہوئی پرچیں لٹکا رکھی تھیں، اُس نے ایک ثابت سی پیالی اتاری اور چائے مانگی، ہوٹل کے چھجے کے نیچے بیٹھ کر وہ چائے پی رہا تھا کہ اتنے میں ایک کتے کا بچہ پانی میں بھیگتا ہوا آیا اور پانی سے بچنے کے لئے سیدھا ہوٹل کے اندر گھس گیا مگر اندر جاتے ہی کسی نے اُس کے اس زور سے لات ماری کہ چیختا چلّاتا باہر بھاگا اور چھجے کے نیچے کھڑا ہو کر سردی کی وجہ سے کوں کوں کرنے لگا۔ وسنت تڑپ گیا، اس نے چائے کی پیالی کو چھوڑ کر کتے کے بچے کو گود میں اٹھا لیا اور بے اختیار اپنے برہنہ سینے سے لگا لیا اُس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور پلا چائے کی پیالی کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔۔۔ وسنت نے باقی چائے پرچ میں ڈال کر اس کے سامنے رکھ دی جسے وہ لپ لپ کر پینے لگا۔ گلّہ پر چائے کی قیمت دیتے ہوئے وسنت نے دیکھا کہ مالک کی گود میں بھی ایک خوبصورت سا کتے کا بچہ بیٹھا ہوا بسکٹ کھا رہا ہے۔ وسنت ایک آہ بھر کر چپ چاپ ایک سمت ہو لیا کتے کا بچہ جسے ابھی اس نے چائے پلائی تھی اُس کے پیچھے دُم ہلاتا ہوا دوڑ رہا تھا!

(۴)

دوسرے دن اپنے حسّاس دل میں آرزوؤں کو لئے ہوئے وہ مقرر صاحب کے بنگلے پر پہنچا ـــ معلوم ہوا کہ وہ کہیں گئے ہوئے ہیں شام تک آئیں گے، اُس نے دل میں سوچا "چلو کہیں مزدوری ہی ڈھونڈیں، کچھ پیسے مل جائیں تو ایک دھوتی خرید لی جائے"۔ دھوتی کا خیال آتے ہی اُس کی نظریں ایک عالیشان دکان کی طرف اٹھ گئیں جہاں ایک شخص کے سامنے ریشمی اور قیمتی کپڑوں کے تھان کھلے پڑے تھے، وہ بھی دیکھنے کو کھڑا ہو گیا، اس کے پاس ہی ایک بھکارن بھی کھڑی تھی جس کی ساڑھی اور چولی تار تار ہو رہی تھی، وہ سر جھکا کر ایک پیسہ مانگ رہی تھی!

"چل ہٹ آگے جا" دُکاندار نے بھکارن کو دھتکارا!

"پیسہ نہیں تو تن ڈھانکنے کو کوئی پھٹا پرانا کپڑا ہی مل جائے"! بھکارن نے التجا کی!

"ارے جا دور رہو اب سے کھڑی مغز چاٹ رہی ہے" کپڑا خریدنے والے صاحب بولے اور پھر دکاندار کی طرف مخاطب ہو کر "سیٹھ صاحب کوئی اچھا سا کپڑا دکھائیے قیمتی ہو تو کچھ پرواہ نہیں مگر ہو بڑھیا، سنے ڈیزائن کا"!

وسنت نے یہ سن کر اپنے دل کو اس زور سے دبایا کہ اس کی پسلیوں میں درد ہونے لگا، اُس نے اپنی ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے آسمان کی طرف دیکھا اور آہستہ سے دل میں کہا "بھگوان" پھر اپنی پگڑی اُتار کر بھکارن کے قدموں میں پھینک دی اور ایک طرف بھاگ نکلا ـــ! بھاگتا بھاگتا وہ ایک مندر کی طرف جا نکلا، مندر کے سنہرے کلس کو دیکھتے ہوئے اُس نے سوچا کہ "چلو آج بھگوان سے پوچھ ہی لیں کہ آخر یہ سب کس کارن"! وہ اندر گھسنے والا ہی تھا کہ پجاری نے اُسے روک دیا ـــ وسنت نے دیکھا کہ بھگوان کی مورتی سے روپہلی کرنیں نکل رہی ہیں اور مورتی کے چرنوں میں طرح طرح کی مٹھائیاں اور پھل پھول پڑے ہوئے ہیں، وہ یہ سب دیکھ ہی رہا تھا کہ پجاری نے دھکا دیتے ہوئے اُسے کہا "ہٹو!"

"کیوں؟" وسنت نے چھاتی اُبھار کر کہا۔

"دیکھتے نہیں رائے صاحب پوجا کر رہے ہیں؟" پجاری بولا۔

"مگر بھگوان!..... تمہارے بھگوان کے گھر میں تو سب برابر ہیں؟" اُس نے پوچھا۔

"جاؤ باہر کھڑے رہو، بڑے آئے کہیں کے"! پجاری منہ بنا کر بولا۔

وسنت نے پجاری پر حقارت سے نظر ڈالی اور آتے ہوئے گھنٹہ اس زور سے بجایا کہ تمام مندر گونج اُٹھا۔ اس کی سانس تیزی سے چل رہی تھی وہ سینہ پھلائے گردن اکڑائے شہزادوں کی طرح قدم رکھتا مندر کی سیڑھیوں سے اتر رہا تھا۔ مندر کے دروازے کے سامنے بہت سے بھکاری اندھے لولے لنگڑے اپاہج کوڑھی اور بیکس پڑے ہوئے تھے جن میں عورتیں بھی تھیں اور مرد بھی، کوئی اپنے زخم دکھا کر بھیک مانگ رہا تھا تو کوئی بھکارن اپنے بھوک سے بلبلاتے ہوئے بچے کو دکھا دکھا کر لوگوں کے رحم و کرم کے جذبے کو ابھار رہی تھی، وسنت نے اپنے دل میں کہا "کاش بھگوان اپنے حصّے میں سے تھوڑا سا ان لوگوں کو بھی دے دیتا جو اس کے دروازے پر بیٹھے ہوئے ہمیشہ اسی کے نام کی مالا جپتے رہتے ہیں"! کوئی کہہ رہا تھا "بابا اندھے کو دلواؤ، آنکھیں بڑی نعمت ہیں"! یہ سب کچھ دیکھ کر وسنت کے دل میں خیال آیا کہ کاش وہ بھی اندھا ہوتا اور بھگوان کے دروازے کی یہ سوبھا نہ دیکھتا ـــ یہی سوچتا وہ وہاں سے چل دیا! شام ہو چلی تھی اس نے مقرر صاحب کے بنگلے کا رُخ کیا! بنگلے کے سامنے باغیچے میں مخملی گدوں والی کرسیاں پڑی ہوئی تھیں اور مقرر صاحب چند دوستوں کے ساتھ گپ شپ میں مشغول تھے۔ وسنت بھی پرنام کر کے ایک خالی کرسی پر بے دھڑک بیٹھ گیا۔! یکایک سب اُس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ایک دیہاتی جس کے جسم پر پورے کپڑے بھی نہ تھے۔ یوں بڑے لوگوں کے پہلو بہ پہلو ایک مخملی کرسی پر بیٹھے؟!

آخر مقرر صاحب ہی بولے "اے لڑکے کرسی پر سے اٹھو اُدھر بیٹھو اسٹول پر!"

"آپ نے سویرے بلایا تھا میں آیا تھا مگر آپ ملے نہیں" وسنت نے کرسی پر سے اٹھتے ہوئے کہا!

"عجب بے تہذیب ہو" مقرر صاحب نے حقارت سے کہا۔

وسنت "بے تہذیب" کا مطلب نہ سمجھا وہ اسے مقرر کے حقارت آمیز لہجے کی وجہ سے ایک گالی سمجھا، اُس کے تن بدن میں آگ لگ گئی وہ دانت پیستا ہوا مقرر صاحب کی جانب بڑھا اور نزدیک آ کر کہا "آپ نے بڑی کرپا کی آپ کو اب کبھی نہیں ستاؤں گا"! یہ کہہ کر کالر پکڑ کر وہ گھونسہ رسید کیا کہ مقرر صاحب تیورا کے زمین پر گر پڑے ـــ پکڑیو پکڑیو کا شور مچا مگر وسنت جا چکا تھا۔

(۵)

بارش ہو رہی تھی اور وسنت دھرتی کا سینہ کوٹ رہا تھا ـــ سڑک بن رہی تھی! اکیلی دُکھی جوانیاں، غمزدہ بڑھاپے، کومل اور البیلی کلائیاں مٹی اور پتھروں سے مصروفِ پیکار تھیں۔

سڑک کے کنارے تپائی پر ٹھیکہ دار کے منشی صاحب حاضری کا رجسٹر لئے بیٹھے ہوئے تھے۔ اور ایک جوان لڑکی جو شاید دیر سے آئی تھی کھڑی ہوئی کام کرنے کی اجازت چاہ رہی تھی۔ مگر منشی صاحب نے جو بظاہر زندگی کی پچاس پچپن بہاروں کو ایک طویل اور ختم نہ ہونے والی خزاں سے بدل چکے تھے، اس کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہ کیا۔ آخر وہ غریب لڑکی ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں لئے ہوئے واپس جانے لگی، وسنت اُس کی چھلکتی ہوئی آنکھوں کی تاب نہ لا سکا۔ وہ چیخ پڑا "بھگوان" اور اس نے اپنی پوری طاقت سے موگری کو زمین پر دے مارا۔

مگر موگری زمین پر پڑنے کے بجائے خود اُسی کے پاؤں پر پڑی اور پنجے کی ہڈیاں چور ہو کر رہ گئیں! وہ آہ کر کے گر پڑا اس کے پاؤں سے خون کے فوارے نکلنے لگے۔ سب مزدور جمع ہو گئے۔ آخر ٹھیکیدار صاحب بھی اُٹھ کر آئے اور کہنے لگے "جب کام کرنا نہیں آتا تو کیوں کرتے ہو؟" وسنت کا جی چاہا کہ ٹھیکیدار کا گلا اتنی زور سے دبائے کہ آنکھیں باہر نکل پڑیں مگر اس نے صرف آہستہ سے "بھگوان" کہنے ہی پر اکتفا کیا! اُسی وقت ایک رحم دل گاڑی والے نے وسنت کو خیراتی ہسپتال پہنچا دیا۔ وہاں اُس کی اُسی طور سے خاطر مدارات کی گئی جس طرح عام طور پر اُس جیسے غریبوں کی ہوتی ہے۔ لاوارثوں کو کون پوچھتا ہے۔ ان کی پروا کیسے ہو سکتی ہے۔ جب خود بھگوان ان کی طرف سے بے پروا ہو جائے ——!

وسنت کو اسپتال سے تیسرے روز ہی خارج کر دیا گیا۔ وہ گھسٹتا گھسٹتا باہر نکل آیا۔ زخم ابھی ذرا بھی اچھا نہ ہوا تھا۔ ہلنے جلنے سے اور تکلیف بڑھ گئی۔ ساتھ ہی ساتھ اُس کی بھوک بھی بڑھ رہی تھی مگر اب تو وہ کوئی کام کرنے کے قابل نہیں رہا تھا۔

"آج بھگوان مجھ سے بھیک منگوا ہی کر چھوڑے گا" اس نے دل میں سوچا۔

مگر کیا وہ بھیک مانگے گا؟ اور بھگوان کو ہنسنے کا موقع دے گا ——!

اوں ہونہہ! دن گذر گیا —— رات آئی!

بند دکان کے چبوترے پر لیٹا ہوا وسنت کروٹیں بدل رہا تھا اس کے پاؤں میں ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں۔ تمام جسم بخار کی وجہ سے پھنک رہا تھا۔ پاس ہی ایک کتا بیٹھا ہوا ہمدردی کے طور پر دم ہلا رہا تھا —— اُس گھڑی دکان کے بالاخانے پر عیش و آرام کی زندہ تصویریں —— بھگوان کے چہیتے دولت مند! شرابی قہقہے لگا رہے تھے —— ادھر وسنت درد کے مارے بے ہوش ہوا چاہتا تھا —— اس کے کپکپاتے ہونٹوں سے تھوڑی دیر کے بعد ایک مدھم سی آواز نکل جاتی تھی "...... ماں...... ماں......"

دکھی پریم نگری

موسم سرما کا چاند

موسم سرما کی راتوں میں کوئی دیکھے تجھے
دیکھنے والا ہے لیکن کون شاعر کے سوا!

مضطرب ہو کر نکل آیا ہوں اپنے گھر سے میں
چاندنی سے دل کے دریا میں تلاطم آ گیا

ایسا نظارہ تجلّی گاہِ ہستی میں نہیں
قلزمِ سیمیں میں ہیں ڈوبے ہوئے ارض و سما

ٹھنڈی ٹھنڈی چاندنی یا نور کا سیلاب ہے
یا کوئی شعلہ اُٹھا ہے برف میں لپٹا ہوا

مضطرب انوار کا ہے ایک بحرِ بیکراں
جس میں ہر اختر ہے گویا ایک لرزاں بُلبُلا

رقصِ معصومانہ ہے گویا کسی دوشیزہ کا
عفتِ مریم کی یا فطرت نے اوڑھی ہے ردا

دامنِ آلودۂ ہستی کو دھونے کے لئے
خضر نے کھولا ہے یا فوارۂ آبِ بقا

یا سیہ کارانِ غافل کو جو دیکھا خواب میں
فطرتِ معصوم نے رخ سے دیا پردہ اُٹھا

پاک کر دے روح کو میری بھی اے نورِ قمر
میں بھی ہوں آلائشِ ہستی کی ظلمت میں گھرا

جاودانی زندگی کی آرزو رکھتا ہوں میں
مرغِ جاں تا کے گرفتارِ طلسماتِ فنا!

کر رہا ہوں چاندنی کے کھیت میں مستانہ رقص
چاندنی میں کاش گھل جائے تنِ خاکی مرا

تجھ سے مل کر کاش بن جاؤں سراپا نور میں
طُور کے شعلے میں ہو جاؤں چراغِ طُور میں

مسعود شاہد

دنیائے ادب

تازہ ترین رسائل کے اہم مضامین

(اس مضمون کو رسائل پر کسی قسم کی تنقید نہیں سمجھنا چاہئے۔ کیونکہ اس میں فقط چند خاص اور اچھے مضامینِ نظم و نثر کا ذکر ہوتا ہے۔ معمولی یا ادنیٰ مضامین کا مطلقاً تذکرہ نہیں کیا جاتا)

(رسائل کا ذکر حروف تہجی کے اعتبار سے ہے)

نیا ادب اور کلیم (اگست و ستمبر)

ایرنسٹ ٹولر۔ جرمن یہودی مصنف جس نے اسی سال امریکہ میں خودکشی کر لی۔ یورپ کے اُن نامور اہلِ کمال میں سے تھا جن کے آرٹ پر گذشتہ جنگ عظیم اور اس کی ہولناکیوں نے ایک فیصلہ کن اور نہ بھولنے والا اثر ڈالا جناب سبطِ حسن نے ارنسٹ ٹولر کی زندگی اور آرٹ پر یہ فاضلانہ اور دلچسپ مضمون سپردِ قلم کر کے اردو دان طبقے کو ایک ایسی ادبی شخصیت سے روشناس کرایا ہے جو ترقی پسند ادب کے حلقوں میں ایک خاص امتیاز رکھتی ہے۔ وہ آج سے چھیالیس برس پہلے ایک اوسط درجے کے یہودی خاندان میں پیدا ہوا اور اُس فضا میں پل کر جوان ہوا جو قیصر کی عسکریت سے بوجھل ہو رہی تھی۔ ہر طرف فوجی مظاہروں، آہنی قوانین اور سرمایہ داری کی روایات کا زور تھا اور عوام ایک دبی دبی اور بے چارگی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ ٹولر کہ ایک حساس دل اور تیز فراست لے کر پیدا ہوا تھا۔ اس سماجی نظام کے نقائص کو شدت سے محسوس کرنے لگا۔ اور طالب علمی کی زندگی ہی میں وہ اُس ذہنی انقلاب سے آشنا ہو گیا تھا جس نے آگے چل کر اس کی زندگی کا رخ ہی بدل دیا، نہ صرف اُس کی زندگی کا بلکہ اُن ہزارہا انسانوں کی زندگی کا جو ٹولر کی تخلیقات سے سچے معنوں میں متأثر ہوئے۔

جنگ عظیم شروع ہونے والی تھی۔ اور وہ بظاہر پیرس کی یونیورسٹی میں لیکن دراصل انسانیت کے دبستان میں تعلیم حاصل کر رہا تھا، پڑھائی میں اس کا جی بہت کم لگتا تھا چھٹیاں ہوئیں تو وہ ارد گرد کے شہروں کی سیر کو چل نکلا اس سفر میں اُسے پہلے پہل وہ روشنی دکھائی دی جس نے بعد میں اُس کی تمام زندگی کی شاہراہ کو منور کر دیا۔ اس احساس کو وہ یوں بیان کرتا ہے۔

"اب تک آزادی کے مسئلے پر غور نہیں کیا تھا یونیورسٹی میں آزادی پر جو لیکچر دیئے گئے تھے انہیں پا سکتا کی تھی۔ یہ بات کہ میرا دوست سٹانسلاس چھ سال کی عمر سے محنت مزدوری کرتا اور اس مختصر آمدنی سے اپنے والدین کی پرورش کرتا تھا اتنی ہی قدرتی اور لازمی معلوم ہوتی جتنی یہ بات کہاں کے بھیجے ہوئے روپے سے میں آزادی سے تفریحیں کروں اور زندگی کا لطف اٹھاؤں لیکن دفعتہً مجھے اپنا یہ حق مشروط نظر آنے لگا۔ میں نے پہلی بار دیکھا کہ میری خارجی آزادی کی بنیاد کس چیز پر ہے۔ روپے پر! میں اب ایک ایسے نظامِ زندگی کے اٹل اور ابدی ہونے پر شبہ کرنے لگا جس میں ایک شخص تو صاحبِ صندوق و پیسہ بنائے اور دوسرا دانہ دانہ کے لئے محتاج ہو اس خیال کے بعد بھی میں روپے سے محبت کرتا لیکن میرا ضمیر مجھے ملامت کرتا تھا۔ میرا وہ دن خراب ہو گیا میری ساری دنیا خواب ہو گئی۔ زندگی کی وہ قدریں جو کل تک ابدی اور اٹل تھیں۔ آج مشکوک ہو گئیں۔ میں خود اپنے پر شبہ کرنے لگا۔"

اس ذہنی انقلاب کی ابتدا تھی کہ یورپ میں جنگ چھڑ گئی اور اس کا سیلاب سپاہی اور ادیب۔ تاجر اور فلسفی۔ کاریگر اور شاعر سبھی کو بہا لے گیا۔ ٹولر بھی اس سیلاب کا ایک تنکا تھا۔ لیکن تیرہ ماہ کے بعد جب وہ فوج سے نکلا تو "احساسات کی تیز دھار کُند ہو چکی تھی، اونچے سے اونچے خیالات پست ہو چکے تھے۔ زندگی جہنم زار اور موت ایک بے معنی لفظ ہو گئی تھی۔ ہم ایک ایسی مشین کے پرزے تھے جو کبھی آگے بڑھتی تھی۔

نہ جانے کہاں کبھی پیچھے رہتی تھی نہ جانے کیوں! ہمارا سارا جوش ختم ہو چکا تھا۔ ہمت پست ہو چکی تھی اور انفرادیت کا نشان تک مٹ گیا تھا!"

اس کے بعد جرمنی میں جنگ کے خلاف مزدوروں نے آواز بلند کی۔ اور میونک، ڈرسڈن اور دوسرے شہروں میں ہڑتالیں ہوئیں۔ اسی سلسلے میں ٹولر گرفتار ہو کر قید کر دیا گیا۔ قید خانے میں اُس نے یورپ کے ان مشہور مصنفین کی کتابیں پڑھیں جنہوں نے انسان کے اجتماعی رنج و راحت کا جائزہ لیا تھا۔ ان کتابوں کے مطالعہ سے اس کے خیالات اور نکھر گئے۔ ایک جگہ لکھتا ہے کہ

"میں نے دیکھا کہ سچ مچ دنیا میں اتنی دولت ہے کہ سب کھا پی سکتے ہیں۔ انسانی دماغ نے ایسی مشینیں نکالی ہیں کہ قدرت پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ سچ مچ پتھر کو سونا اور سونے کو روٹی بنایا جا سکتا ہے۔ اس کے باوجود لوگ بھوکوں مرتے ہیں حالانکہ گیہوں سمندر میں پھینکا جاتا ہے۔ سینکڑوں محل خالی پڑے ہیں اور ان کے پھاٹک کے سامنے سے ہزاروں بے گھر انسان گذر جاتے ہیں۔ پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ غریب انسان ذہن کی پیداوار سے محروم ہے اور انسانیت کی شریف ترین قوتیں جھوٹے دیوتاؤں کی چوکھٹ پر بھینٹ چڑھائی جاتی ہیں۔"

جیل ہی میں اس نے اپنے وہ عظیم ڈرامے لکھے جن کے باعث اسے ترقی پسند ادب میں ایک نہایت ممتاز حیثیت حاصل ہو گئی۔ اس کے ڈراموں میں ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ ایک مسلسل اور مستقل نزاع کے محور پر گھومتے ہیں۔ یہ نزاع بدلتے ہوئے سماجی حالات، گرتے اور اُبھرتے ہوئے سوشل نظام اور گذشتہ اور آئندہ تخیلات کے درمیان بڑی شدت سے جاری ہے اور گذشتہ جنگ عظیم نے جو مختلف ترکے چھوڑے ان میں سے شاید یہ نزاع اہم ترین ترکہ ہے جو موجودہ نسل کو ملا ہے۔ ان ڈراموں کی دوسری خصوصیت وہ شدید اثر ہے جو اس کے آرٹ پر جنگ کے بعد کے حالات نے ڈالا۔

ٹولر جرمنی کے اندرونی انقلاب کی تباہیوں سے عام لوگوں کی بہ نسبت زیادہ متاثر ہوا تھا اور اُس کے دل و دماغ نے اس اثر سے جو نتائج نکالے تھے اُس کے آرٹ میں اُن کا اظہار ایک قدرتی بات تھی۔ اس لئے اس کے ڈرامے اس کیفیت سے سراسر رنگین ہیں جسے اس کے مخالف نقاد ایک خاص "رجحان" کا نام دے کر اُس کے ڈراموں کی قدر و قیمت کو کم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ٹولر نے خود ان خصوصیات کی نسبت جو کچھ لکھا ہے اس کی ایک جھلک دیکھئے:-

"اس لفظ "رجحان" کا استعمال کتنا مہمل ہے، کوئی خیال، کوئی عمل، کوئی لفظ کوئی کلچر رجحانات سے خالی نہیں۔ صرف "نروان" میں پہنچنے کے بعد آدمی رجحانات سے بچ سکتا ہے۔ البتہ فیصلہ کن چیز تو یہ ہے کہ آرٹ میں رجحان کس طرح ظاہر کیا جاتا ہے۔ آیا یہ رجحان روح کی گہرائیوں سے پیدا ہوتا ہے جس میں مذہبی شدت اور قوت ہوتی ہے یا صرف کھال جتنا گہرا ہے۔ جہاں تک ان سرکاری نقادوں کا تعلق ہے۔ ان کو تو ہر جگہ سیاسی تعصب اور رجحان ضرور نظر آئے گا۔ البتہ ایسا ڈرامہ جس میں موجودہ سماجی نظام کی تعریف کی گئی ہو۔ ان کے معیار پر پورا اترے گا ...... مجھے قید خانے میں تمام نئے ڈرامے مل جاتے ہیں لیکن یہ دیکھ کر کتنا دکھ ہوتا ہے کہ میرے ہمعصر اُن نزاعوں سے کس طرح پہلو بچاتے ہیں جنہوں نے ہمارے عہد کو اتنا المناک بنا رکھا ہے وہ ان نزاعوں کو سمجھتے ہی نہیں۔ ایسے لوگوں کی بڑی کمی ہے جو نئے اجتماعی تجربے کی بنا پر کوئی چیز "تخلیق" کر سکیں۔ یہ لوگ اس تجربے کا اتنا ہی اہم جزو ہیں جتنا شاخ اپنے درخت کا ــــ ہمارے ڈرامہ نگار سرمایہ دار سماج سے تعلق رکھتے ہیں جس طرح سرمایہ دار سماج نے اپنی یک رنگی کھو دی ہے، ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی ہے، خلفشار میں مبتلا ہے اور روشنی اور حرارت سے محروم ہو چکی ہے اسی طرح اس کے ڈرامہ نویس بھی اسی خلفشار کی تصویر پیش کرتے ہیں۔ دوسرے ڈرامہ نگار سماج کے مختلف طبقات کے گرد منڈلاتے ہیں۔ ممکن ہے کہ سو سال میں کوئی بڑے دماغ کا ادیب کسی غیر جانبدار سرزمین پر اپنے قدم رکھے۔ آج کل کے طوفانی سمندر میں لائق لوگ ہر طوفان کے ساتھ بہہ جاتے ہیں نہ پتوار پاس ہوتا ہے۔ نہ بادبان، اُن کو کوئی ادبی ضرورت لکھنے پر مجبور نہیں کرتی۔ اُن کا کوئی حیاتی تجربہ بھی نہیں۔ وہ کسی خیال کے پرستار بھی نہیں۔ انہیں کسی تکلیف یا راحت کا احساس بھی نہیں۔"

یہاں پر سبط حسن صاحب لکھتے ہیں اور بجا لکھتے ہیں کہ ڈرامے کی بنیاد نزاع پر ہے۔ ٹولر کا خیال ہے کہ آج کل کے ڈرامہ نگاروں کا فرض ہے کہ وہ اس نزاع (CONFLICT) کو ڈرامہ کی شکل میں پیش کریں جو پوری سماج کے مختلف طبقوں اور خود فرد کے اندر حشر بپا کئے ہوئے ہے۔

ناظرین ادبی دنیا ترقی پسند ادب کی نسبت ہمارے ناچیز خیالات سے واقف ہیں۔ راقم الحروف نے ستمبر کے شمارے میں محترمہ عصمت چغتائی کے "اسکیچ آف بینچے" پر تبصرہ کرتے ہوئے ضمناً اس رجحان کا ذکر کیا تھا جو ہمارے بعض "ترقی پسند مصنفین" کی تحریروں میں پایا جاتا ہے۔ وہ ادب کی ترقی محض مزدور اور کسان طبقے کی زندگی کو اپنی کہانیوں اور ڈراموں کا موضوع بنانے ہی میں سمجھتے ہیں۔ ہم نے

لکھا تھا کہ اگر ایک مصنف یا مصنفہ اپنے خاص ماحول کی صحیح اور فن کارانہ ترجمانی کرتی ہو تو وہ اس نام نہاد ترقی پسند ادیب کی بہ نسبت سماج اور ادب کی بہت زیادہ خدمت انجام دیتی ہے جو خود مزدور نہیں جس کا پیغام مزدور تک نہیں پہنچتا لیکن جو مزدور کی زندگی کی آئینہ داری کا دعوے دار ہے۔ ٹولر نے بھی جو ترقی پسند ادب کے اماموں سے ہے کچھ اسی قسم کی باتیں کہی ہیں بقول صاحب مضمون ٹولر ادب کو زندگی کا ایک مظہر تصور کرتا تھا۔ وہ ادب جس میں زندگی نہ ہو ادب کہلانے کا مستحق نہیں ایسے حیات بخش اور حیات زا ادب کو وہ عوامی ادب کے نام سے یاد کرتا ہے۔ عوامی ادب کیا چیز ہے، اور بعض لوگوں کا یہ خیال کہ ترقی پسند ادب کے موضوعات کسانوں اور مزدوروں کی زندگی تک محدود ہیں۔ ان سوالات پر ٹولر اپنے ایک خط میں یوں روشنی ڈالتا ہے:۔

"ان دنوں عوامی ادب کے بارے میں بہت کچھ کہا جا رہا ہے۔ اس کی ضرورت ہے لیکن اسے کسی جماعت کے حکم سے تو تیار نہیں کیا جا سکتا۔ انسانیت کے ابدی مسائل کو اس طرح بیان کیا جائے جیسے وہ عوام کے تجربے میں آتے ہیں یہی عوامی ادب ہے اور یہی اس کا ماحصل عوامی ادب کا کام یہ نہیں ہے کہ عوام کی سیاسی جماعتوں کی قرار دادوں کا پروپیگنڈا کرتا رہے ... عوامی شاعر انسانی زندگی کے المیہ عناصر سے بے پروا نہیں ہو سکتا ـــــ وہ المیہ عناصر جو مزدوروں کے علاوہ سرمایہ داروں کی زندگی میں بھی نمایاں ہیں۔ سیاست دان کی حیثیت سے میں لیوڈن ڈراف (جرمنی کا رجعت پسند فوجی افسر) کا جانی دشمن ہوں لیکن ترقی پسند شاعر کی حیثیت سے میں اس کی شخصیت کو شاعری کا جامہ پہناؤں تو لیوڈن ڈراف کی انسانی خصوصیات کو فراموش نہیں کر سکتا۔ . . . . عوامی ادب کا ایک اور فرض بھی ہے وہ یہ کہ سرمایہ دارانہ عہد کے عظیم الشان اور روحانی، ذہنی ورثے کی حفاظت کرے اور اُسے صحیح معنی میں عوام کی ملکیت بنا دے"!

فاضل مضمون نگار نے ٹولر کے انداز تفکر پر نظر ڈالتے ہوئے آگے چل کر بتایا ہے کہ انفرادی زندگی اور اجتماعی زندگی، انفرادی موت اور اجتماعی موت سے پیدا ہونے والے ذہنی اثرات میں جو فرق اور تضاد ہے، ٹولر نے اُسے اپنے ڈراموں میں نہایت کامیابی سے نمایاں کیا ہے۔ ہمیں ہندوستان میں شاید اجتماعی موت اور زندگی کی کیفیات محسوس کرنے کا بہت کم موقعہ ملا ہے کیونکہ اب تک کوئی ایسا موقعہ پیش نہیں آیا کہ پوری ہندوستانی قوم کو براہ راست موت کا مقابلہ کرنا پڑا ہو اس لئے ہم نے وہ کیفیتیں محسوس نہیں کیں جن کا تعلق ایک قوم کی موت یا پھر موت کے بعد زندگی کی نمود سے ہوتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامۂ آزادی نے ایک حد تک اجتماعی زندگی اور موت کا منظر ہمارے سامنے پیش کر دیا تھا۔ پھر آپ نے ادب پر اس کا اثر بھی دیکھ لیا۔ ہمارا ادب اب تک اُن عناصر سے متأثر ہے جو ۱۸۵۷ء کے بعد ہماری سماجی زندگی میں ظاہر ہوئے۔ جنگِ یورپ ایک نہایت خوفناک تجربہ ثابت ہؤا، خصوصاً جرمنی کی اجتماعی زندگی کے لئے۔ اس لئے جن لوگوں نے جنگِ عظیم کے ذہنی اور نفسیاتی ردِ عمل کا مطالعہ کیا ہے وہ اس خیال سے اتفاق کریں گے کہ ۱۹۱۸ء میں جرمن ادیب ایرنسٹ ٹولر کے سوا کوئی دوسرا ادیب "واحد فرد" اور "عوامی فرد" کے اُس ذہنی تضاد کو جو زندگی اور موت کے پسند کرنے سے متعلق انسان میں پیدا ہوتا ہے اتنی کامیابی سے ڈرامے کی شکل میں نہیں پیش کر سکتا۔"

ٹولر کا سب سے ممتاز ڈرامہ عوام اور انسان ہے اور یہ اس کے دوسرے ڈراموں "مشین شکن" اور "ہنکیمن" کی طرح قید خانے ہی میں لکھا گیا تھا۔ ٹولر جہاں سرمایہ داری کا مخالف ہے وہاں وہ عوام کی ذہنی پستی اور کمزوریوں سے بھی بخوبی آشنا ہے اور وہ اپنے آرٹ میں اپنے گہرے مطالعے اور باریک نگاہی کا نمایاں ثبوت پیش کرتا ہے

وہ ایک عہد کا نمائندہ ہے۔ اس کا ادب ایک مخصوص دور کی پیداوار ہے یہ عہد اور یہ ادبی دور جنگِ عظیم کا نتیجہ ہے اور ٹولر کے ادب کی خصوصیات جنگِ عظیم کے بعد کے عام ادب کی خصوصیات ہیں۔ جنگِ عظیم میں لاکھوں انسانوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح کٹتے دیکھ کر ٹولر پر بھی وہی اثر ہؤا جس اثر کے لئے جنگِ عظیم کے بعد کا ادب مشہور ہے یعنی انسانیت سے عام ہمدردی اور انسانی زندگی کا عام احترام لیکن جو ادیب عوام سے قریب نہ آئے اور جنہوں نے جنگِ عظیم کے بنیادی اسباب کی چھان بین نہ کی بھٹک گئے اور بہت دور نہ چل سکے۔ البتہ جنہوں نے یہ محسوس کیا کہ دنیا کو اس تباہی سے بچانے اور انسانی زندگی اور انسانیت کو زندہ رکھنے کے لئے اس سماجی زندگی کو بُرا بھلا کہنے سے کام نہ چلے گا بلکہ اُسے بدلنے کی ضرورت ہے۔ وہ ادیب البتہ ادبی خدمت انجام دے سکے۔ ٹولر انہیں میں تھا اُس کے تمام ڈراموں اور نظموں پر جنگِ عظیم کا اثر جھلکتا ہے۔ اُس نے انسانیت اور انسانی زندگی کے احترام کو ادبی انداز میں پیش کیا ہے۔ اس کے تمام موضوعات کی روح یہی عقائد ہیں۔ ٹولر نے جنگِ عظیم کے بعد کے تمام آرٹسٹوں کی طرح کوئی ایسا شاہکار نہیں پیش کیا ہے جس کو بقائے دوام کی صف

میں جگہ دی جائے۔ البتہ یہ پیشین گوئی کرنا دشوار ہے کہ زمانہ اسے
کب تک جینے دے گا۔ بقائے دوام کی صف میں جگہ پانے والے
صدیوں میں ایک بار پیدا ہوتے ہیں۔ ٹولران میں نہ تھا لیکن وہ ایسی
ضرور تھا جنہوں نے آنے والی نسلوں کے لئے نئی راہیں بنائی ہیں
اور وہ حالات پیدا کئے ہیں جن کے بغیر ترقی پسند ادب کے موجودہ
دور کا وجود محال نہیں تو مشکل ضرور ہوتا۔"

مضمون نہایت دلچسپ اور خیال افروز ہے، لیکن اس بات کا افسوس ہے کہ طباعت اور تصحیح پر پوری توجہ صرف نہیں کی گئی جس کے باعث دو تین جگہ سے عبارت بے ربط ہو گئی ہے۔

تیسری جنس۔

چودھری محمد علی صاحب نے یہ دلچسپ افسانہ ایک نئے اور اچھوتے موضوع پر لکھا ہے اور وہ ہے۔ میلان ہم جنس۔ آرٹ اور ادب کے ذریعے سے جنسی موضوعات پر بحث و تمحیص کرنا مغرب کے لئے اب کوئی نئی بات نہیں رہی۔ ایک وقت تھا کہ محض فرانس کے ادیب اور شعراء ہی اس اخلاقی جرأت کے مرتکب ہوتے تھے لیکن اب انگلستان اور امریکہ میں بھی مسئلۂ جنس ویسا ناپسندیدہ موضوع نہیں رہا جیسا مثلاً آسکر وائلڈ کے زمانے میں تھا۔ آسکر وائلڈ کی مشہور تصنیف "ڈورین گرے کی تصویر" سے اردو داں طبقہ کسی حد تک آشنا ہے۔ اس کتاب میں جنسیات کے اس مسئلے پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے جسے میلان ہم جنسی کہا جاتا ہے۔ آگے چل کر مغربی ادبیات میں اس مسئلے پر جو چیزیں ہمیں ملتی ہیں ان میں فرانسیسی مصنف آندرے ژید کا مشہور ناول "دو نغمے" ریڈکلف ہال انگریزی مصنفہ کا "چاہِ تنہائی" کیپٹن میکنزی کا ناول "غیر معمولی عورتیں" اور مس مارجری بُومَن کا ناول "ہوٹل" قابلِ ذکر ہیں۔

اردو میں اس قسم کی جرأت ایک نئی چیز معلوم ہوتی ہے۔ لوگ عام طور پر اجنبی اور بظاہر ممنوع باتوں سے ذرا گھبراتے ہیں اور ہمارے مصلح نقاد اس قسم کی آزادہ روی کو کچلنے کے لئے ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ دیکھئے اس جرأت کا حشر کیا ہوتا ہے، لیکن حق یہ ہے کہ محمد علی صاحب نے اپنے موضوع کو نہایت چابکدستی اور سلیقے سے نبھایا ہے۔

احمدی خانم عرف مدّی کی سیرت کا مطالعہ بہت غائر ہے۔ اگرچہ یہ نہیں کھلتا کہ تمام عمر ایک خاص میلانِ جنسی کے زیر اثر رہ کر جب جوانی کی کنی گلنے پہ آئی" تو اس نے ایک توکّل پسند شاہ صاحب کی پناہ کیوں لے لی۔ شاید اس لئے کہ شاہ صاحب کو "جی چاہے انگنی پر ڈال دیجئے۔ جی چاہے چادر کی طرح کاندھے پر لٹکا لیجئے"۔ شاید اس لئے کہ شاہ صاحب کے زرخیز توکّل میں اُسے اپنے آنے والے بڑھاپے کا سہارا نظر آیا، شاید اس لئے کہ عورت آخر عورت ہے اور ترغیبِ جنسی سے نہ سہی نفسیاتی طور پر مرد پر تکیہ کرنا اس کی فطرت میں داخل ہے۔ تحصیلدار صاحب اور مدّی کے باپ، اُن کے ملازم کی تصویریں بھی فن کارانہ کاوش کا پتہ دیتی ہیں۔ ہم میں سے اکثر نے اپنی زندگی میں ایک نہ ایک کیریکٹر ایسا ضرور دیکھا ہے۔

تحصیلدار صاحب ایک نیک نہاد اور علائقِ دنیا سے فارغ انسان تھے۔ پھر وہ حسن علی کے ہاتھوں میں کھلونا بن گئے تھے تو کیا تعجب ہے۔ اور غیر ذمہ دار لوگ اگر حسن علی کے بے ریش و بروت چہرے اور تحصیلدار صاحب کی بھبوا داڑھی کا مقابلہ کر کے مسکراتے تھے تو انہیں کون روک سکتا تھا۔ اور حسن علی کے داماد بنی احمدی خانم کے دُولہا کا ٹائپ تو بہت عام ہے۔ بی بی کھاتے پیتے گھر کی ہوئیں اور خود ہوئے بدصحبت اور بے کار، تو زیور پر دست درازی اور رفتہ رفتہ بد مزگی سے طلاق پر نوبت ایک منطقی سلسلہ ہے۔ افسانے میں پلاٹ کے لحاظ سے قطعاً کوئی خامی نہیں اور جگہ جگہ زبان و بیان کے جو نازک پیچ دیئے ہیں وہ اس کی دلچسپی میں اضافہ کر دیتے ہیں۔

چند سطور ملاحظہ کیجئے۔ احمدی خانم کا سراپا بیان ہو رہا ہے:-

"کبھی آپ نے دوہرے درجے کے مدقوق کو دیکھا ہے، اگر بیماری سے قطع نظر کیجئے تو رنگت کی نزاکت ویسی ہی تھی۔ آنکھیں بڑی نہ تھیں مگر جب نگاہ نیچے سے اوپر کرتی تھی تو واہ واہ۔ معلوم ہوتا تھا کہ مندر کا دروازہ کھل گیا، دیبی جی کے درشن ہو گئے۔ مسکراہٹ میں نہ شوخی نہ شرارت، نہ بناوٹ کی شرم، نہ بھداوٹ کی کوشش۔ لکڑی لوہے کے قلم کو کیسے موقلم کر دوں کہ آپ کے سامنے وہ مسکراہٹ آجائے۔ بس یہ سمجھ لیجئے کہ خدا نے جو ہی مسکراہٹ اس کے لئے تجویز کی تھی، وہی تھی۔ مدّی اپنی طرف سے کوئی اضافہ نہیں کرتی تھی۔ . . . . ایسی خوبصورت عورت بلا مرد کی حفاظت کے زندگی بسر کرے اور عشاق نہ ہوں، بڑے تعجب کی بات ہے، مگر واقعہ یہی ہے۔ ایک روز میں نے کہا مدّی! اگر ہم جادوگر ہوتے تو جادو کے زور سے تم کو تتلی بنا کر ایک چھوٹی سی ڈبیا میں بند کر کے اپنی پگڑی میں رکھ لیتے۔ اس فنِ شریف سے واقف کار حضرات جانتے ہیں کہ جو حربہ میں نے استعمال کیا تھا وہ کم خالی جانے والا نہ تھا مگر اس کے جواب میں وہی بے تکلف مسکراہٹ کی ڈھال جو تلوار کا منہ

موڑ دے۔"

آپ نے دیکھا! رنگت کی نزاکت بیان کرنے کے لئے فن کار کہاں سے تشبیہ لایا ہے! یہ جرأت صرف اسی آرٹسٹ کا حصہ ہے جو حقیقت کا دامن کسی حالت میں نہیں چھوڑنا چاہتا۔ پھر آنکھوں کا اور نگاہیں نیچے سے اوپر کرنے کا طلاجلا تصور کیجئے تو کیا سچ مچ آپ کے خیالوں کی دبی آپ کے سامنے نہیں آجاتی! مگر عام لوگ ان دھندلے دھندلے احساسات سے ایک قطعی تصور نہیں بنا سکتے، فن کار اس صورت گری پر قادر ہے، اور یہی فرق دیکھنے اور دکھانے والے میں پایا جاتا ہے۔

اور مسکراہٹ کی تصویر دیکھئے تو مسکرانے والی کی ساری سیرت آئینے میں اُتر آتی ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ نہ کسی نازک تشبیہ سے مدد چاہی گئی ہے نہ کوئی رنگین استعارہ بنالیا ہے بس جیسی وہ مسکراہٹ تھی خود بخود آپ کے سامنے آگئی ہے۔ اور اپنے ساتھ احمدی خانم کو بے نقاب لے آئی ہے۔ اُس کی فطرت کی گہرائیوں میں جو خوبیاں اور سرکشیاں پوشیدہ ہیں، اُس نے اپنے لئے جو فیصلے کر رکھے ہیں، اُس کی زندگی کی شراب جس انداز کی مینا میں ڈھل رہی ہے یہ سب کچھ آپ کو ایک سادہ مسکراہٹ کے آئینے میں نظر آجاتا ہے اور یہی فن کار کا کمال ہے

اب آپ خود بخود دبیز اور چھوٹی چھوٹی قلم کاریوں کا لطف اٹھائیے۔ جن سے افسانے میں زندگی کے رنگ بھرے ہیں۔

"مدی کا دل سسرال میں کم لگتا تھا۔ بیاہ کا تجربہ کچھ اچنبھے میں ڈالے تھا۔ شادی کے بعد اگر عورت پر کنوارپنے کی آب نہیں رہ جاتی تو سہاگ کی رونق چہرہ چمکا دیتی ہے۔ مگر مدی کے چہرے پر نہ اسی بات کا پتہ چلتا تھا نہ اُسی کا ۔۔۔۔ (چند برس بعد) ۔۔۔۔ اڑوس پڑوس کی عورتیں ہر وقت اُن کے گھر میں موجود رہتی تھیں۔ اُن سے بھی جو ہو سکتا تھا۔ آنے جانے والیوں کے ساتھ سلوک کرتی تھیں۔ گھر میں کپڑا سینے کی مشین تھی۔ دن بھر لوگوں کے کپڑے مفت سیا کرتی تھیں کسی کو اگر روپے کی ضرورت ہوتی تو وہ قرض کے نام سے دے دیتی تھیں۔ جب کسی کا کہیں ٹھکانا نہ لگے وہ بی مدی کے یہاں چلا آئے روٹی اپنی پکائے۔ دال بی مدی کی ہانڈی سے لے لے، پان تک بھی بی مدی کے پاندان سے کھائے ۔۔۔۔"

احمدی خانم کے اقبال اور گھربار کو زوال کی نظر بد لگنے سے پہلے اس کی زندگی کس انداز سے گزر رہی تھی اور شاہ صاحب کے "سایۂ عاطفت" میں آنے سے قبل وہ مرحوم تحصیلدار صاحب کا تھوڑا سا اثاثہ سنبھالے اس بے رنگ دو

دنیا میں کیونکر جی لگانے کے اسباب مہیا کر رہی تھی، یہ جاننے کے لئے چند سطور اور پڑھئے۔

اُس زمانے میں ایک عورت نہ معلوم کہاں کی باہر سے آئی اس کو بھی بی مدی نے رکھ لیا۔ عورت سلیقہ مند تھی، اپنا بار بھی اُن پر نہیں ڈالتی تھی بلکہ پیسے دو پیسے کا سلوک خود ہی کر دیتی تھی۔ کچھ انگوٹھیاں کچھ کیلیں، صابون وغیرہ بیچتی تھی۔ صبح ہوئی اور برقع اوڑھ کر نکل گئیں۔ دوپہر کو آئیں۔ کھانا کھایا، آرام کیا، اس کے بعد پھر نکل گئیں۔ شام کو لوٹیں۔ یہ مساۃ آئی تھیں تو یہ کہہ کر کہ دو چار دن میں دوسری جگہ چلی جائیں گی۔ مگر مدی سے کچھ ایسی محبت ہو گئی کہ گھر کی طرح رہنے لگیں۔ محبت یگانگی کی وہ پینگیں بڑھیں کہ سگی بہنیں مات تھیں۔ صورت شکل کی تو معمولی تھیں مگر قد کشیدہ تھا۔ جب برقع اوڑھ کر راستہ چلتی تھیں تو معلوم ہوتا تھا کہ مرد بھیس بدلے ہوئے چلا آتا ہے ۔۔۔۔ مدی اور اس عورت سے دو سال دوستی رہی۔ اس کے بعد لڑائی ہو گئی۔ کس بات پر بگاڑ ہو گیا۔ یہ کسی کو معلوم نہیں۔ وہ عورت جس راہ آئی تھی اسی راہ چلی گئی۔ بی مدی اجڑی بجڑی رنڈاپا کھیلنے لگیں۔ جوئندہ یابندہ، تھوڑے دنوں کے بعد ایک اور ہم جنس مل گئیں۔ اس کے بعد اور بھی ملا کیں مگر ؎

نہ بے وفائی کا ڈر تھا نہ غم جدائی کا
مزہ میں کیا کہوں آغازِ آشنائی کا

وہ پہلی سی بات پھر نصیب نہ ہوئی۔"

ہمارا خیال ہے کہ اب آپ نے اس کہانی کے موضوع یعنی "تیسری جنس" اور میلان ہم جنسی کی دلچسپ نفسیاتی کیفیات کا ایک ہلکا سا اندازہ ضرور کر لیا ہوگا۔ چودھری محمد علی صاحب نے جس خوبصورتی سے اس غیر معمولی مسئلے پر روشنی ڈالی ہے وہ کچھ انہی کا حصہ ہے۔

نیرنگِ خیال (ستمبر)

ہمارے مزاح نگار

اردو ادب میں مزاح کو ابھی وہ درجہ حاصل نہیں ہوا جو اس صنف کی اہمیت کے پیش نظر اسے ملنا چاہئے تھا اور اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں اچھی قسم کا مزاح لکھنے والے بہت کم ہیں۔ کیوں کم ہیں، اس لئے کہ مزاح نگاری شاعری کی طرح وہبی ہوتی ہے، اکتسابی نہیں۔ پھر شاعر اس قدر زیادہ کیوں

ہیں اس کا جواب یہ ہے کہ شاعروں کی بھی دو قسمیں ہیں، ایک تو فطری شاعر ہیں، اور دوسری قسم کے زبردستی شاعری کرتے ہیں۔ فطری شاعر تعداد میں بہت کم ہیں۔ مگر غیر مزاح نگاروں سے اس لئے زیادہ ہیں کہ شاعری ہماری بہت پرانی میراث ہے۔ مزاح نگاری، خصوصاً مغربی قسم کی مزاح نگاری کی طرف ابھی چند سال سے توجہ ہوئی ہے اور اگر جمہور کا مذاق درست رہا تو وہ دن دور نہیں جب اردو میں بھی اچھا مزاح لکھنے والے کافی تعداد میں پائے جائیں گے۔ محمود نظامی صاحب نے اپنے اس مضمون میں ہماری موجودہ مزاح نگاری کا بہت اچھا جائزہ لیا ہے اور شروع ہی میں بتایا ہے کہ چند سال اُدھر اردو مزاح کی کائنات نہ ہونے کے برابر تھی۔ ہنسی کا گول گپا۔ حکایاتِ شیخ چلی اور قصہ ملا دوپیازہ و بیربل جیسی خرافات ہی ہمارے مزاحیہ لٹریچر کی نمائندگی کرتی تھیں۔ مگر اب ماشاء اللہ اچھا مزاحیہ ادب روز بروز بڑھ رہا ہے اور اس میں مرزا جی سے لے کر مضامین رشید تک سبھی قسم کی کتابیں موجود ہیں"۔

صاحبِ مضمون کا خیال ہے کہ ظریفانہ ادب کا ذوق اس قدر بڑھ رہا ہے کہ ملک کے مختلف جرائد و رسائل میں جو مزاحیہ مضامین آئے دن چھپتے رہتے ہیں، اگر ان پر ایک نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ لکھے پڑھے لوگوں کے سروں پر مزاح نویسی کی وحشت سوار ہو گئی ہے۔ اور مزاحیہ لکھنا گویا فیشن ہو گیا ہے"!

ہماری ناچیز رائے میں نظامی صاحب کا یہ قول جرائد پر تو واقعی صادق آتا ہے لیکن رسائل کے بارے میں مبالغہ آمیز ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ شمالی ہند خصوصاً پنجاب کے تمام روزانہ اور اکثر ہفتہ وار اخبارات میں مزاح کے کالم التزاماً دیئے جاتے ہیں لیکن بلند پایہ رسائل میں مزاحیہ مضامین شاذ و نادر ہی چھپتے ہیں۔ اس کی یہ وجہ نہیں کہ ان کو مزاحیہ مضامین موصول نہیں ہوتے۔ بلکہ یہ ہے کہ اکثر خود ساختہ مزاح نگاروں کے مضامین میں آورد اور کاوش اس درجہ پائی جاتی ہے کہ انہیں پڑھ کر ہنسی کی بجائے رونا آتا ہے۔ ہاں اخبارات کی بات اور ہے۔ وہاں ہر قسم کے موضوعات پر مزاح نویس ایڈیٹر کو ایک آدھ کالم روزانہ لکھنا پڑتا ہے اور اخباری مزاح نویس کا میدان اُس مزاح نگار سے بہت وسیع ہوتا ہے جو ایک خاص عنوان لے کر اس پر ایک مزاحیہ مضمون سپردِ قلم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اخبار کا ایڈیٹر سیاست، معاشرت، شہریت، قومیت، عصبیت، حریت اور بہت سے دوسرے میدانوں میں اپنا اشہبِ قلم بے تکان دوڑاتا ہے اور جب یہ عرصہ تنگ ہو جاتا ہے تو جہالت کے کرشموں اور ہمعصروں کی فروگذاشتوں کو ہدفِ طعن بنا لیتا ہے۔ یہ موضوع بھی پرانا ہو جاتا ہے تو کسی چڑیا چونے کی کہانی ہی کو نمک مرچ لگا کر بیان کر دیتا ہے۔ پھر اور کچھ نہیں تو ایک شعر لے کر اس کی ساخت اور وزن پر بحث شروع کر دی۔ اب عروض و قافیہ کے اسرار و رموز بے نقاب ہونے جو شروع ہوئے تو کئی دن لگ گئے اور بیسیوں مزاحیہ کالم اپنے پڑھنے والوں سے سرخرو ہو گئے۔

یہی باعث ہے کہ لکھے پڑھے حلقوں میں اخباری قسم کے مزاح کا بہت چرچا ہو گیا ہے اور خالص مزاح نویسی ادب میں وہ درجہ حاصل نہیں کر رہی جو اس کا حق ہے۔

محمود نظامی صاحب نے بجا طور پر نقادوں کو صلائے عام دی ہے کہ وہ "اس صنفِ ادب کا جائزہ لے کر خود ساختہ مزاح نگاروں کا پول کھولیں اور حقیقی مزاح نگاروں کی ہمت افزائی کر کے ان کو اپنی موجودہ سطح سے اُبھرنے کا حوصلہ دلائیں"۔ اس کے بعد انہوں نے مزاح نویسی کے چند اصول بیان کئے ہیں۔ جن پر عمل کرنے سے مزاح نویسی کی بے عنوانیاں رد کی جا سکتی ہیں اور وہ یہ ہیں:۔

(۱) "مزاح چونکہ آرٹ ہے اس لئے اس میں سنجیدگی اور متانت کا خیال ہر وقت پیشِ نظر ہے اور اس میں وہ سوقیت نہ آنی چاہیئے جس سے وہ ذوقِ سلیم پر گراں گذرے۔ (سنجیدگی سے مراد غالباً بلندی اور پاکیزگی ہے۔ ورنہ سنجیدگی عام معنوں میں تو مزاح کے برعکس ہے۔ ایڈیٹر)

(۲) مزاح میں وہ لہجہ نہ اختیار کیا جائے جس سے کسی انسان کے احساسات کو ٹھیس لگے ورنہ اس کی حیثیت پھکڑ کی سی ہو جائے گی۔

(۳) مزاح میں حتی الوسع یہی کوشش کی جائے کہ اس میں کوئی عمومی افادیت پنہاں رہے (اس سے ہمیں اختلاف ہے۔ ایڈیٹر)

یہاں پہنچ کر صاحبِ مضمون نے موجودہ مزاح نگاروں کے مجمعے پر ایک نگاہ دوڑائی ہے اور انہیں چار قسموں میں بانٹا ہے۔ لکھتے ہیں:۔

"اول مزاح کی وہ قسم ہے جس میں لکھنے والا اپنے ماحول کے میلانات اور معاشرت کے معتقدات سے اپنا مواد تلاش کرتا ہے اور اپنے تجربات کی مدد سے اُن میں ایک خاص افادی نکتہ پیش کرتا ہے۔ ملا رموزی، میر ولی اللہ، فلک پیما وغیرہ کے بعض مضامین اور رشید احمد کی ساری تحریریں اسی قسم کی چیزیں ہیں۔ مزاح کی دوسری قسم وہ ہے جس میں لکھنے والا گرد و پیش کی وسیع کائنات پر نظر ڈال کر ہماری روزمرہ کی چیزوں میں سے بعض کو اپنا موضوعِ تحریر بناتا ہے جیسے پطرس اور شوکت کے مضامین تیسری قسم میں وہ مزاح آتا ہے جس میں محض زبان کی دلکشیوں سے لطف پیدا کیا جاتا ہے۔ جیسے فرحت کی تحریریں یا خواجہ حسن نظامی کے کچھ مضامین مزاح کی

چوتھی قسم وہ ہے جس میں ان سب کا امتزاج کرنے کی سعی کی جاتی ہے
یہ مزاح ظرافت کہلانے کا مستحق ہے۔ جیسے سندباد جہازی اور
سالک کی تحریریں"۔

نظامی صاحب نے یہاں سے مزاح کا تاریخی جائزہ شروع کیا ہے۔ اور یہ بیان کرنے کے بعد کہ "چونکہ ادب اردو کا بیشتر حصہ نظم میں ہے۔ اس لئے ہمیں اپنی بہترین ظرافت کے شاہکار نظم میں نظر آتے ہیں۔ سودا کی اکثر نظمیں اور حضرت اکبر الہ آبادی کا سارا کلام ظرافت کے اعلیٰ معیار پر پورا اترتا ہے" وہ اس بحث کو ختم کر دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ بیچارے نظیر اکبرآبادی کا بھی ذکر نہیں کرتے۔ آگے نثر کا حصہ ہے اور شاید ان کی یہ بات بالکل صحیح ہے کہ ہمیں اردو کی اولین ظرافت کے نمونے مرزا غالب کی تحریروں میں نظر آتے ہیں۔ غالب کا رنگ غالب کے ساتھ ختم ہوگیا۔ ہاں جب غدر کے بعد انگریزی نے اردو ادب پر اثر کیا تو لکھنؤ میں اودھ پنچ نے اردو میں ایک نئی قسم کی ظرافت داخل کی اور لوگوں میں مزاح کا ایک ذوق اور طلب پیدا کر کے چند اچھے مزاح نگار مہیا کئے۔ منشی سجاد حسین، مرزا محمد بیگ ستم ظریف، پنڈت تربھون ناتھ ہجر، جوالا پرشاد برق، اکبر الہ آبادی، احمد علی کسمنڈوی اسی اخبار کے نامہ نگار تھے۔ اور اودھ پنچ کی چشمک جب اودھ اخبار سے ہوئی تو رتن ناتھ سرشار نے اپنی مخصوص ظرافت سے جو بیشتر ان کی تخلیق "خوجی" میں نمودار ہوئی، اردو مزاح کی شاہ راہ پر ایک سنگ میل کا اضافہ کیا۔ اودھ پنچ کی ظرافت کچھ عرصہ بعد ابتذال کی طرف مائل ہوگئی، ہاں اس نے اخبارات کے لئے مزاح نویسی کی ایک ایسی روایت چھوڑی جو آج تک زندہ ہے اور شاید سالک اور سندباد جہازی اس روایت کی بہترین مثال ہیں۔

یہ بالکل درست ہے کہ "سالک کی طبیعت مزاح کے لئے بہت رسا ہے۔ وہ ہر سنجیدہ سے سنجیدہ چیز میں بھی اپنی تحریر کے لئے مواد تلاش کر لیتے ہیں" مگر صاحب مضمون ہمیں معاف رکھیں اگر ہمیں ان کے اس قول سے قدرے اختلاف ہو کہ وہ "ایسی صفائی اور جرأت سے خود ارباب حکومت کی گوشمالی کر جاتے ہیں کہ وہ طلب تحریر ہونے کے باوجود اپنی فضیحت پر آپ ہی ہنستے ہیں" اس گوشمالی کی سند لائیے۔ حسرت صاحب کے متعلق بھی آپ کا یہ قول بالکل بجا ہے کہ ان کو سیاسی اور پھبتی کہنے میں ید طولےٰ حاصل ہے۔ اس لئے وہ اس کے فانی مسائل میں اپنی نکتہ آفرینی سے ایسی جان ڈال دیتے ہیں کہ ان کو کسی ضرب المثل کا سا رتبہ مل جاتا ہے"۔ لیکن بعض دفعہ ہم نے یہ بھی محسوس کیا ہے کہ ایک ضرب المثل یا محاورے کو لافانی بنانے کے لئے انہوں نے مطائبات کا پورا کالم لکھ ڈالا۔ اور شاید "تعلیم بالغاں" کے سلسلے میں ہم لوگوں کو اس کے استعمال کا طریقہ سکھانے کے لئے کسی قواعد اردو کی بجائے مطائبات کے کالم کو بجا طور پر ترجیح دی۔

سالک اور حسرت کے تفصیلی تذکرے کے بعد صاحب مضمون پھر اودھ پنچ کی مناسبت سے سجاد حسین کے ناولوں اور سرشار کے فسانۂ آزاد کی طرف لوٹتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ:۔

"فسانۂ آزاد اپنے پلاٹ کے اعتبار سے ایک بے ربط کتاب ہے مگر
اس کتاب میں ظرافت کو اس قدر دخل ہے کہ وہ اس کے تمام عیوب
پر حاوی ہو جاتی ہے۔ اور ہم سرشار کے بے ساختہ مزاح سے اس
قدر مسحور ہو جاتے ہیں کہ ہماری توجہ کتاب کے نقائص کی طرف
مبذول نہیں ہوتی...... اس کتاب میں جو چیز سب سے زیادہ
جاذب نظر ہے وہ خوجی ہے، گو خوجی کے کردار میں انسانی فطرت
کا ہو بہو نقشہ نظر نہیں آتا۔ مگر اردو میں خوجی ہی ایک ایسا کردار ہے
جس کی شخصیت کو ہم نہایت وضاحت سے سمجھ لیتے ہیں اور
اس کے ہر فعل اور ہر حرکت میں دلچسپی لینے اور اس سے ہمدردی کرنے پر مجبور
ہو جاتے ہیں...... خوجی اردو میں مزاحیہ کردار نگاری کی طرف
پہلا قدم ہے اور غالباً آخری بھی ہوتا اگر اس عرصے میں چچا چھکن
منصۂ شہود پر جلوہ گر نہ ہو جاتے"۔

آگے چل کر وہ خوجی کو گھٹانا اور چچا چھکن کو بڑھانا شروع کرتے ہیں۔ اور یہاں تک کہہ جاتے ہیں کہ "خوجی کی حیثیت ایک ایسے غیر فطری بے غیرت بزدل مسخرے کی ہے جس میں خوبیاں کم مگر برائیاں لاتعداد ہیں اور سرشار کی ظرافت گھٹیا قسم کی ہے اور وہ اس میں لطافت اور شگفتگی کی بجائے بھانڈوں کا سا تمسخر پیدا کر جاتے ہیں۔ ہم نے جب چند سطریں پہلے خوجی اور اس کے خالق کی منقبت دیکھی تھی تو اس منقصت کے لئے تیار نہ تھے۔ اور شاید آپ بھی نہ ہوں اس لئے ہمیں چچا چھکن کی تعریف میں کچھ پاسداری کی جھلک نظر آئی۔ مگر آگے چل کر محمود صاحب نے اپنا دامن یہ کہہ کر صاف کر دیا ہے کہ "ہمیں یہ امر نظر انداز نہیں کرنا چاہئے کہ چچا چھکن مغربی دماغ کی پیداوار ہے اپنا بنایا ہوا کردار ہے، بالکل طبعزاد شے نہیں"۔

یہ اور بات ہے کہ خود خوجی کا کیرکٹر بھی غالباً سینکو پینزا کا چربہ ہے سرشار نے جب ڈان کو ہٹے کو "خدائی فوجدار" کا لباس پہنایا تو کیا عجب ہے کہ تحت الشعور میں وہ سینکو پینزا کا ایک مشرقی بدل بھی تیار کر چکا ہو۔ البتہ

یہ ماننے کی بات ہے کہ جس طرح کا فرق جیروم کے جیروم کی مخلوق میں اور سینکوینز میں پایا جاتا ہے۔ چچا چھکن بھی خوبی سے قریباً اسی قدر زیادہ تکمیل یافتہ ہے۔

سرشار کے بعد صاحبِ مضمون کی نظر یکایک مولانا نذیر احمد پر جا پڑتی ہے اور وہ مراۃ العروس میں اکبری کے قصے، بنات النعش میں حسن آرا کی کہانی، توبۃ النصوح میں مرزا ظاہر دار بیگ کے تذکرے کو مولانائے ممدوح کے شگفتہ مزاج کا آئینہ دار قرار دیتے ہیں۔ ہمیں اس بارے میں اُن سے پورا اتفاق ہے مگر اس صورت میں کہ وہ مزاح کی تعریف کا دائرہ اس قدر وسیع کر دیں کہ اس میں اسٹائل کی وہ خوبیاں بھی آجائیں جنہیں ہم شگفتگی اور نکتہ دری کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ ڈپٹی نذیر احمد صاحب تو امہات الامہ کے بعض مقامات پر بھی ایسا طرزِ بیان اختیار کرتے ہیں کہ پڑھنے والے کے لبوں پر مسکراہٹ آ ہی جاتی ہے۔ مگر اس صورت میں ہمیں بہت سے صاحبِ طرز شگفتہ نگاروں کو اس دائرے میں شامل کرنا پڑے گا۔ جس طرح انگریزی ادب میں آلڈس ہکسلے کو ہیومرسٹ یا مزاح نگار نہیں سمجھا جاتا لیکن جب آپ اُس کے مضامین پڑھتے ہیں تو ان میں جابجا شگفتہ نگاری کے ایسے نمونے نظر آتے ہیں کہ انہیں آپ بلاتکلف اعلیٰ درجہ کی ہیومر کے مقابلے میں رکھ سکتے ہیں، اسی طرح ہمارے ہاں بھی ایسے متعدد مصنف ہیں جن کے مضامین سٹائل کی لطافت اور شگفتگی کے باعث مزاح کی اس وسیع تعریف میں شامل کئے جا سکتے ہیں مگر ہمیں اس قدر کھینچا تانی کی ضرورت ہی کیا ہے۔ جب صاحبِ مضمون نے ظفر علی خاں جیسے صاحبِ طرز ادیب کا ذکر مزاح نگاروں کے زمرے میں نہیں کیا اور شاید بجا طور پر نہیں کیا تو اُن کا مولانا نذیر احمد کو اس حلقے میں لانا کچھ تکلف سا معلوم ہوتا ہے۔ شاید کوئی صاحب کہیں کہ ظفر علی خاں طنز نگار ہیں مزاح نگار نہیں۔ بالکل درست۔ لیکن ہمیں تو یہاں موجودہ مضمون ہی کے اندازِ نظر کے مطابق بحث کرنا ہے۔ صاحبِ مضمون نے طنز نگاری اور مزاح نگاری میں کوئی تفریقی خط نہیں کھینچا پھر اگر روزنامہ صحافت کی مزاح نگاری بیشتر طنزیہ ہونے کے باوجود خالص مزاح نگاری کہلا سکتی ہے تو بے چارے مولوی ظفر علی خاں نے کیا قصور کیا تھا کہ انہیں اس محفل میں آنے نہیں دیا گیا۔ ان کی بیشتر سیاسی نظمیں طنزیہ شاعری کی بہترین مثالیں ہیں۔ اور ستارۂ صبح کے زمانے کے متعدد ادبی مضامین اور وہ اسکیچ جو انہوں نے قیامِ حیدرآباد کے دنوں میں لکھے مزاح نگاری کے اس معیار پر جو زیرِ نظر مضمون میں قائم کیا گیا ہے، بخوبی پورے اتر سکتے تھے۔ یہی کیفیت کم و بیش سجاد حیدر یلدرم (صاحبِ افسانۂ لیلیٰ مجنوں) کی ہے اور تو اور مصورِ غم راشد الخیری مرحوم کے بعض مضامین بھی اس ذیل میں پیش کئے جا سکتے ہیں مگر جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں ہمیں اس حلقے کو وسیع کرنے کی ایسی ضرورت ہی کیا ہے۔

مولانا نذیر احمد کے بعد صاحبِ مقالہ ببوق اور سید محفوظ علی کا سرسری ذکر کرتے ہیں اور پھر اردو کے مزاحیہ ڈرامے کا تذکرہ کرتے ہوئے عبدالماجد دریابادی کے "زود پشیماں" اور مرزا عظیم بیگ چغتائی کے "مرزا جنگی" کا نام لیتے ہیں اگرچہ چغتائی صاحب سے انہیں شکایت ہے کہ مرزا جنگی میں ڈرامائی کشمکش بالکل مفقود ہے۔ خیر کشمکش نہ سہی مزاح تو ہے۔ آگے چل کر انہوں نے مزاح نگاری کی نشو و نما کے فطری اسباب یوں بیان کئے ہیں:۔

"سرشار کے بعد خود ہمارے زمانے تک ظرافت کی حیثیت ایک ایسے درخت کی سی تھی جو آبیاری کے بغیر خشک ہو رہا تھا۔۔۔۔۔۔ دراصل ادب کا ارتقا بھی فطری اسباب کا تابع ہے۔ یہ بھی اپنی نشو و نما کے لئے آسودگی اور فارغ البالی کا ماحول چاہتا ہے، آخر ذہنی چین کے بغیر اُدبا کا دماغ ظرافت نگاری کی طرف کیونکر مائل ہو سکتا ہے اور ان میں ہنسنے ہنسانے کی تحریک کیونکر پیدا ہو سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس درمیانی عہد میں یاد رہے کہ اس عہد کے ایک طرف سرشار اور سجاد حسین ہیں۔ اور دوسری جانب سالک اور حسرت ہیں۔۔۔۔۔ ایڈیٹر ہیں مزاح کے نمونے بالکل نظر نہیں آتے مگر موجودہ عہد میں تعلیم و تعلم کی فراوانی اور سیاسی سکون نے ہمارے ادبا کو پھر اس طرف مائل کیا ہے اور وہ اس جمود و سکوت کو توڑ کر مسرت زائی کے لئے اپنے قلموں کو جنبش دیتے نظر آتے ہیں۔۔۔۔۔"

اگر نظامی صاحب صرف یہ کہتے کہ مزاح پیٹ بھرنے ہی کو سوجھتا ہے تو ہمیں ایک حد تک اُن سے اتفاق ہوتا لیکن جب وہ آسودگی سے مراد شخصی آسودگی نہیں بلکہ سیاسی سکون لیتے ہیں تو ہم مجبوراً اختلاف کی اجازت چاہتے ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ بیسویں صدی کی ابتدا سے بلکہ انیسویں صدی کے اختتام ہی سے ہمارے دیس اور سماج پر ایسا سکون چھا رہا تھا کہ شاید ویسا سکون انہیں صدیوں سے میسر نہیں آیا تھا۔ جنگ عظیم اور اس کے بعد کا زمانہ البتہ ہیجان، اضطراب اور کشمکش کا زمانہ ہے اور گذشتہ پچیس برس سے نہ صرف سماجی اور سیاسی سکون قطعاً مفقود ہے بلکہ فرد بھی زندگی کی کشمکش میں بُری طرح مبتلا ہے۔ ہماری ناچیز رائے میں اگر ہمارے عہد میں مزاح نگاری کو نئی زندگی ملی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمیں زندگی کی تلخ حقیقتوں سے گریز کی ضرورت ہے اور ہم تلخابۂ حیات میں مزاح کا نمک ملا کر خوشی سے پی جاتے ہیں۔ بلکہ ہم تو یہاں تک سمجھتے ہیں ہمارے مزاح نگار خود بھی ایک کیفیت گریز ہی میں وہ چیزیں لکھ جاتے ہیں

ایک لمحے کے لئے ہمارے غمگین چہروں پر عارضی مسرت کی لہر دوڑا دیتی ہیں۔ اس ردِ عمل اور گریز کی ایک واضح مثال مرزا عظیم بیگ چغتائی کا اندازِ نگارش ہے لیکن جب تک اُردو ادب میں نفسیاتی تجزیے کا رواج نہ ہو جائے۔ ہم اس پہلو پر بحث کرنا مناسب نہیں سمجھتے۔ صاحبِ مضمون نے چغتائی کے مزاح پر تنقید کرتے ہوئے بڑے شدومد سے یہ بات کہی ہے کہ "چغتائی کے پاس ہنسانے کے لئے ایک ہی مضمون ہے اور وہ مارپیٹ ہے۔"

یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ مارپیٹ یا صحیح تر الفاظ میں اذیت اور ایذا ہی ایک ایسی چیز ہے جس سے انسان نے آج تک مزاح کی مختلف صورتیں پیدا کرنا سیکھا ہے۔ میراثیوں کی چپڑاس، کیلے کے چھلکے پر سے پھسلنے کا منظر، سائیکل سے گرتا ہوا سوار، کسی کی چندیا پر بے خبری میں ایک دھول، یہ سب باتیں ہمیں ہنساتی ہیں، اگرچہ ان میں بجائے خود ایذا کے علاوہ اور کوئی ہنسنے ہنسانے والی بات نہیں ہے۔ فلموں میں اس ایذا رسانی پر ہنسنے کے مظاہروں کا بہت اچھا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ پردۂ سیمیں پر ہمیشہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے مسخرے ہیرو کی انگلیاں بند ہوتے ہوئے دروازے میں آگئیں اور لوگ ہنس دیئے اور اسی طرح کی بے شمار اور درد افزا کیفیتوں نے ہمیں اتنا ہنسایا کہ پسلیوں میں درد ہونے لگا۔ چارلی چپلن، ہیرلڈ لائڈ، لارل ہارڈی اور دوسرے مسخروں کے تماشے اس کی کھلی ہوئی دلیل ہیں۔ چغتائی مارپیٹ کی انہی مختلف حالتوں کو الفاظ کی صورت دیتے ہوئے نہ صرف مذاق کو صحیح تحریک دیتا ہے بلکہ زندگی اور حقیقت کی ترجمانی بھی کرتا ہے اُس کے کردار تقریباً ہمیشہ وہ نوجوان لڑکے لڑکیاں ہوتے ہیں جن کا خون تازہ اور گرم، جن کے دل امنگوں سے لبریز اور جن میں روحِ حیات کی مچلتی ہوئی موجیں ایک دوسری سے ٹکرانے کو بے تاب ہوتی ہیں۔ کیا آپ نہیں جانتے کہ کالجوں میں پہلے سال کے طلبا کو بے طرح اذیت پہنچا کر ہمارے ملک کے نوجوان ہر سال لطف اندوز ہوتے اور قہقہے لگاتے ہیں، کالجوں کے ہوسٹلوں میں سوئے ہوئے طلبا کی چارپائیاں الٹانا ایک ایسا مشغلہ ہے جس سے پنجاب کے بہت سے کالجوں میں پڑھے ہوئے نوجوان مضمون نگار اچھی طرح واقف ہوں گے۔

محمود صاحب نے اپنے پسندیدہ مزاح کی ایک مثال بھی اس مضمون میں نہیں دی لیکن حیرت ہے کہ جس قسم کے مزاح کے وہ مخالف ہیں یعنی چغتائی صاحب کا اندازِ تحریر، اس کی متعدد مثالیں دی ہیں اور چغتائی صاحب پر مخالفانہ تنقید میں دو ڈھائی صفحے صرف کر دیئے ہیں۔ تنقیدی مضمون میں توازن سب سے ضروری چیز ہے۔ صاحبِ مضمون نے ایک خاص مزاح نگار کو مخالفانہ تنقید کا ہدف بنا کر یہ توازن بگاڑ دیا ہے جس سے اس مضمون کی غیر جانبداری پر حرف آنے کا اندیشہ ہے۔

نظامی صاحب نے بعض باتیں بڑے پتے کی کہی ہیں۔ مثلاً وہ کہتے ہیں کہ بعض اچھے بھلے لکھنے والے شائقین کے مجبور کرنے پر مزاح نگاری کرنے لگتے ہیں اور نتیجتاً اس صنف میں ناکام رہتے ہیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے تمکین کاظمی، ایم اسلم اور حاجی لق لق کے "ظریفانہ" مضامین کی مثال دی ہے۔ حاجی لق لق کی نسبت لکھتے ہیں۔

> اُن کا مزاح کچھ بلند مرتبہ نہیں۔ تحریریں بے ساختہ پن ضرور ہے لیکن ان کے مخاطب ایسے لوگ ہوتے ہیں جنہیں ادب سے زیادہ لگاؤ نہیں ہوتا ورنہ وہ یقیناً اچھا لکھ لیتے۔"

یہ بھی انہوں نے بالکل ٹھیک لکھا ہے کہ ہمارے خود ساختہ مزاح نگار جب اپنے "مجموعے" شائع کرتے ہیں تو

> "اُن کے دیباچہ نگار جہاں پردہ پوشی سے کام لے کر اُن کی فروگذاشتوں کو اُن پر صاف گوئی سے واضح نہیں کرتے، وہاں بے ضرورت جانبداری سے ادب میں اُن کا صحیح مرتبہ بھی قائم نہیں ہونے دیتے۔ ...... مگر ان نامساعد حالات نے اس صنف کو ایک فائدہ بھی پہنچایا ہے، یعنی اس سے وہ لوگ بھی اس کی طرف متوجہ ہو گئے ہیں جنہوں نے اس پر پہلے کبھی قلم نہیں اٹھایا تھا مگر جن کی طبیعتوں کو اس سے فطری مناسبت ضرور ہے۔ اس سے میری مراد خواجہ حسن نظامی صاحب کی چٹکیاں اور گدگدیاں سے نہیں بلکہ ولی اللہ اور فلک پیما سے ہے۔ میر ولی اللہ ایک بہت سلجھا ہوا مذاق رکھتے ہیں۔ اگر وہ لکھتے رہتے تو یقیناً وہ طنزیات میں رشید کی ہمسری کو پہنچ جاتے۔ مگر وہ ایک چھوٹے سے مجموعے "ماہ چہ دیں" پر اکتفا کر کے خاموش ہو گئے۔ فلک پیما بھی ایک نکتہ رس اور ندرت پرور طبیعت کے مالک ہیں۔ ان کی ذہانت نے اس شگفتہ طرز کی طرح ڈالی ہے، جس میں فلسفہ طرازی، طنز نگاری اور ظرافت نگاری سب کچھ شامل ہیں۔"

چغتائی صاحب کے بعد محمود صاحب کی تنقید کی زد میں شوکت تھانوی آتے ہیں۔ ان کی نسبت صاحبِ مضمون کا خیال ہے کہ (۱) وہ زیادہ لکھنے کے باعث اناپ شناپ کے قائل ہیں (۲) ان کے مزاح کا معیار چغتائی کے معیار سے چنداں بلند نہیں اگرچہ حسنِ بیان اسے قدرے بلند کر دیتا ہے (۳) ان کے بیشتر افسانے بیگم کی داستان یا گھر کے قصوں پر مشتمل ہیں (۴) وہ مبالغہ سے کام لیتے ہیں۔ اور اگرچہ ان کے ہاں اچھے مضامین بھی نظر آجاتے ہیں مگر بازاری الفاظ و محاورات

اور عامیانہ خیالات کی بھرمار ہے۔

اس سلسلے میں انہوں نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے۔ وہ یقیناً قابلِ توجہ ہیں:۔

"شوکت جہاں اہم اور سنجیدہ موضوعات سے مضحک خیالات مرتب کرتے ہیں وہاں اکثر خوب کامیاب ہوتے ہیں لیکن جہاں وہ روزمرہ کی زندگی کے واقعات بیان کرنے میں خانگی معاملات کو موضوعِ مضمون بناتے ہیں وہاں ان میں وہ بے ساختگی اور آمد غائب ہو جاتی ہے: حالانکہ اگر معاملہ الٹ ہوتا تو شاید یہ اتنا قابلِ گرفت نہ ہوتا۔ ان کا مبالغہ اتنا بڑھ جاتا ہے کہ طبیعت مکدر ہونے لگتی ہے، اس قسم کے خیالات کہ "بیگم کا ہمیشہ سے دستور رہا ہے کہ ہمارے مقابل میں قصائی تو کیا اگر کوئی بھنگی بھی ہوگا۔ تو اسی کی طرف داری کریں گی اور ہم کو جلائیں گی" کچھ اچھے مزاح کا نمونہ نہیں۔۔۔۔۔ میاں بیوی کے جھگڑے یا میاں کے متعلق بیوی کی بدظنی یا اسی قسم کی اور باتیں جو ازدواجی زندگی میں عام پیش آتی ہیں ظرافت کے لئے بہت اچھا مواد مہیا کر سکتی ہیں بشرطیکہ ان میں اعتدال کو خیرباد نہ کہا جائے۔۔۔۔ لیکن انہوں نے گھریلو زندگی کا جو مرقع پیش کیا ہے اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ گھر میں ان کی حیثیت محض خواجہ سرا کی ہے، لکھنؤ میں رہنے کی وجہ سے ان میں نسوانیت کا رنگ بہت غالب ہے، ہر جگہ بیوی کے مقابلے میں دبے جاتے ہیں۔۔۔۔"

محمود صاحب روا روی ذرا دور نکل گئے ہیں۔ اور شاید خود "ناکتخدا" ہیں۔ ورنہ ممکن ہے کہ بیوی کے مقابلے میں "دبنا" انہیں شانِ مردانگی کے اتنا منافی معلوم نہ ہوتا۔

ہمارا خیال ہے کہ ان معائب کے باوجود جو نظامی صاحب نے گنوائے ہیں، شوکت صاحب اگر صرف "سودیشی ریل" لکھ کر مزاحیہ نگاری ختم کر دیتے تو بھی اردو مزاح کی تاریخ میں اُن کا نام ہمیشہ زندہ رہتا۔ "سودیشی ریل" اس قدر مقبول ہوئی کہ آج شاید ہی کوئی ایسا شخص ہو جس نے یہ بے نظیر اسکیچ نہ پڑھا ہو۔ اور ہماری معلومات کے مطابق اس کے ترجمے ہندوستان کی اور زبانوں میں بھی ہو چکے ہیں۔ اگرچہ بقولِ جنابِ حسرت "سودیشی ریل" بھی کسی مغربی مضمون کا چربہ ہے۔

شوکت سے بحث کر کے ملا رموزی پر ایک چھلتی ہوئی نگاہ ڈالتے ہیں اور اُن کے ملّاپن اور قدامت پرستی کا تذکرہ کرتے ہوئے اُن کے مصلحانہ انداز کا مقابلہ رشید احمد صدیقی [illegible]

"صدیقی اپنے مضمون کو دعنائی طرح شرح و بسط سے بیان کرنے کی بجائے محض معنی خیز اشارے کرتے ہیں، رموزی تطویلِ کلام سے کام لے کر محتسب کا سا درشت لہجہ اختیار کر لیتے ہیں، رشید احمد مزاحیہ نگار پہلے ہیں نکتہ چیں بعد کو۔ رموزی نکتہ چیں پہلے ہیں مزاحیہ نگار بعد کو۔ رموزی کے ہر مضمون میں (تھرڈ کلاس سفر کے متعلق چٹکلوں اور کالج کے لونڈوں پر پھبتیوں، کا اعادہ ہے، ہر جگہ ان کی تکرار ہے، تمام مضامین ننھے میاں کی والدہ سے شروع ہوتے ہیں، انہیں کے گرد چکر کاٹتے ہیں، انہیں پر ختم ہو جاتے ہیں۔ ہر مضمون میں اپنے مشق پر دپینڈے اور مدح سرائی کی کوشش کی ہے، اور اس سے جو جگہ بچ گئی ہے وہ یا تو اپنے دوستوں کی قصیدہ خوانی کے لئے وقف ہے، یا پھر اپنے مخالفین کی مذمت اور تذلیل کے لئے مخصوص۔۔۔۔ ان کی تمام تحریریں، احساسِ ہیچ مقداری کی مظہر ہیں اور ان کا حسدان تحریروں میں جگہ جگہ نظر آتا ہے بلکہ بعض اوقات تو ان کی حالت یقیناً قابلِ رحم ہو جاتی ہے۔"

"قابلِ غور بات یہ ہے کہ صاحبِ مضمون نے ملا رموزی کی ایجاد "گلابی اردو" کا ذکر بالکل نہیں کیا۔ حالانکہ ایک زمانے میں اس کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ لوگ گلابی اردو اور اس کے ذیل میں مختلف سیاسی اور معاشرتی پہلوؤں پر ملاجی کی ظریفانہ رائے زنی سے محظوظ ہونے کے لئے شام کے "زمیندار" کا ایسی بے چینی سے انتظار کرتے تھے جیسے آج کل جنگ کی خبروں کا انتظار کیا جاتا ہے۔ اگرچہ ملا صاحب نے اردو زبان و ادب میں اپنی حیثیت قائم کر لینے کے بعد بے پروائی سے کام لیا اور اپنے آرٹ میں ایک کمزوری اور تخریب پیدا کر لی لیکن اوّل اوّل انہوں نے اردو طنز نگاری کی جو خدمت انجام دی اس سے کسی کو انکار کی گنجائش نہیں ہو سکتی۔

ملا رموزی کے بعد مرزا فرحت اللہ بیگ کا تذکرہ ہے لیکن صاحبِ مضمون انہیں "ہیومرسٹ" نہیں سمجھتے۔ محض ایک شگفتہ نگار کا درجہ دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ

"ان کی زبان میں ایک مخصوص چٹخارہ، ایک خاص چاشنی ہے، جس کی وجہ سے ہمیں اس کے مطالعہ سے وہ مسرت ہوتی ہے، جو اعلیٰ پایہ کی انشا سے ہونی چاہئے۔ خود زبان کی چاشنی ایسی چیز ہے جس پر بعض اوقات ہلکے مزاح کا رنگ غالب آ جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ مرزا فرحت اللہ بیگ کی تحریروں میں اس بے ارادہ ظرافت کی آمیزش نظر آنے لگتی ہے جو اس طرز میں خود بخود غیر شعوری طور پر پیدا ہو جاتی ہے۔۔۔۔"

اور ذرا آگے چل کر یوں رُخ بدلتے ہیں

"فرحت اللہ بیگ نے مولانا نذیر احمد کی کہانی کچھ اُن کی کچھ میری زبانی" کے عنوان سے مولوی نذیر احمد خاں مرحوم کی جیتی جاگتی تصویر لفظوں میں کھینچی ہے ہمارے ادب میں کردار نگاری کا ایک ایسا اچھا نمونہ ہے جس کا جواب آج تک پیدا نہیں ہو سکا۔ یہ مضمون عرصے تک کردار نگاری کرنے والوں کو بہترین نمونے کا کام دے گا۔ اس مضمون کی کامیابی سے متاثر ہو کر مرزا فرحت نے "ایک وصیت کی تکمیل" کے عنوان سے اس قسم کا ایک اور مضمون بھی لکھا ہے لیکن چونکہ اس مضمون میں محض مزاح کی دلکشیوں کو پیدا کرنے کی انہوں نے کوشش کی ہے اس لئے اس میں نہ تو وہ پہلے مضمون کی سی روح ہے نہ ابدیت۔ یہ مضمون پہلے کے سامنے ایک بدشکل ڈھانچہ ہے مرزا صاحب کو جب سے یہ کہہ دیا گیا ہے کہ وہ مزاح نگار بھی ہیں، ان کو اپنی اس تازہ قابلیت کا احساس سا ہو گیا ہے اور اپنی اسی قابلیت کے زعم میں وہ اب کبھی کبھی اپنی زبان کی لطافتوں کی مدد کے علاوہ خود بھی مزاح پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر ان کا یہ مزاح بری طرح پھیکا پڑ جاتا ہے۔"

گویا مرزا فرحت اللہ بیگ کی زبان کچھ اور ہے اور "وہ خود" کچھ اور ہیں۔ بظاہر صاحبِ مضمون کا مدعا یہ معلوم ہوتا ہے کہ مرزا صاحب کے خیالات تو بالکل پھیکے ہوتے ہیں لیکن جب وہ انہیں اپنی لطیف زبان کا جامہ پہناتے ہیں تو اس پھیکے پن میں بھی نہ صرف لطافت بلکہ مزاح پیدا ہو جاتا ہے۔ ہماری ناچیز رائے میں کسی آرٹسٹ کی سب سے بڑی کامیابی یہی ہو سکتی ہے کہ وہ غیر دلچسپ مواد کو بھی ایک ایسے دلکش طریقے پر پیش کر سکے جو اُسے نہ صرف قابلِ قبول بلکہ مسرت انگیز بنا دے۔ مرزا صاحب کو شاید ایسی حقیقی داد اس سے پہلے نہیں ملی ہوگی۔

شوکت تھانوی کے ضمن میں صاحبِ مضمون نے رشید احمد صدیقی پر ایک سرسری نگاہ ڈالی تھی، اب وہ ان کا تفصیلی جائزہ لیتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ

"رشید احمد کا مقصد مسرت زائی کے علاوہ تلقین بھی ہے .... ان کی زبان حد درجہ علمی ہے ان کا سارا مزاح ان کے الفاظ میں مرکوز ہوتا ہے۔ اگر ان کا مفہوم سمجھ میں آجائے تو ان کی لطیف ظرافت سے لطف اندوز ہونا مشکل نہیں رہتا ..... ان کے مضمون میں دنیا بھر کے متعلق اور غیر متعلق مسائل آپ کی نظر کے سامنے سے گذر جاتے ہیں، چارپائی ایک غیر اہم سی شے ہے لیکن جب وہ اس موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں تو دنیا بھر کے مسائل آپ کے سامنے آجاتے ہیں ..... زندگی پر تنقید کرنے اور اپنے ملک کے مسائل پر فلسفیانہ رنگ میں بحث کرنے کی وجہ سے ان کے مزاح میں درد انگیز غور و فکر کا احساس بھی ہے .... بعض اوقات ان کے اشارات اس قدر مغلق اور عسیر الفہم ہوتے ہیں کہ ان کو سمجھنے کے لئے انسانی فہم و ادراک کام نہیں کرتے ..... بعض اوقات مقامی لطائف کو واوین کے درمیان رکھ کر انہیں معنی خیز بنانا چاہتے ہیں، مگر پڑھنے والا عقبی زمین سے ناواقف ہونے کی وجہ سے مقامی رنگ کا لطف نہیں لے سکتا ..... وہ یہی کیوں نہ کیا کریں کہ جن مضامین میں ایسے اشارے ہوں ان کو علیحدہ کتابی صورت میں سو دو سو کی تعداد میں چھپوا کر اپنے یار دوستوں میں بانٹ دیا کریں"

نظامی صاحب کا یہ اندازِ تنقید جو اُن کے آخری فقرے سے عیاں ہے ان کے مضمون کی متانت پر کچھ خوشگوار اثر نہیں ڈالتا۔ بہر حال آگے دیکھئے، شکر ہے کہ اس کے فوراً بعد وہ پطرس کا تذکرہ کرتے ہوئے بہت اچھے پیرائے میں نہایت معقول باتیں کہہ جاتے ہیں۔

"پطرس کا نصب العین انبساطِ قلب کے سوا کچھ نہیں ہوتا ..... پطرس کی حقیقت اُس تیز نظر نقاش کی سی ہے جو زندگی کی حقیر سے حقیر شے میں اپنا مواد ڈھونڈھ لیتا ہے ..... جب "کتے" کے موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں تو اس کی تمام وہی خصوصیات جن سے آپ صدیوں سے مانوس چلے آتے ہیں، آپ کے سامنے اس طرح پیش کرتے ہیں جس سے آپ کچھ یوں گمان ہونے لگتا ہے گویا ان کا انکشاف آپ پر پہلی مرتبہ ہوا ہے ..... اردو میں پیروڈی کا رواج پطرس کے خاص اجتہاد کا نتیجہ ہے .... پطرس اپنے مافی الضمیر کی وضاحت کے لئے ایک نپے تلے محاکات سے کام لیتے ہیں جس کی مدد سے ان کا تخیل سینما کے مناظر کی طرح خود بخود آپ کے سامنے آجاتا ہے۔"

یہاں تک تو جو کچھ انہوں نے لکھا ہے ہمیں اس کے اکثر حصے سے اتفاق ہے سوائے اس کے کہ اردو میں پیروڈی کا وجود پطرس سے بہت پہلے بھی تھا ہاں مغربی انداز میں پیروڈی لکھنے کی اولیت کا فخر انہیں کو حاصل ہے۔ تذکرۂ محمد، گل ترتیبہ مولوی عبدالباری آسی میں کم از کم ایک پیروڈی غالب کے کلام پر موجود ہے جو پطرس کی پیروڈی سے بہت پہلے لکھی گئی تھی پیروڈی کے ذکر سے ہمیں

یاد آیا کہ اب اردو میں چند بہت اچھے پیروڈی لکھنے والے پیدا ہو گئے ہیں اگرچہ صاحبِ مضمون کو اس سے انکار ہے۔ مثلاً ہری چند اختر نہ صرف پیروڈی بہت لطیف لکھتے ہیں بلکہ اُن کے مزاحیہ مضامین کا پایہ بھی بہت بلند ہوتا ہے مثال کے طور پر "غالب کی سوانح عمری" ان کا ایک ایسا کارنامہ ہے جسے اردو کے بہترین مزاحیہ مضامین کے مقابلے میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ ہمیں حیرت ہے کہ محمود صاحب نے انہیں مزاح نگاروں کے تذکرے میں جگہ نہیں دی۔

پطرس کی مزاح نگاری اردو ادبیات میں غیر معمولی درجہ رکھتی ہے اور کسی صاحبِ ذوق کو اس سے انکار نہیں ہو سکتا لیکن ہمارے خیال میں پطرس کا مرتبہ ظاہر کرنے کے لئے صاحبِ مضمون پر یہ ہرگز لازم نہیں تھا کہ وہ اُسی سانس میں اردو کے بعض دوسرے صاحبِ طرز مزاح نگاروں کی تنقیص کر جاتے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"پطرس کے ہاں نہ تو حضرت چغتائی کی طرح سنجیدگی ہی مفقود ہوتی ہے، نہ جناب شوکت کی طرح واقعات نگاری کی افراط ہے نہ پروفیسر صدیقی کی طرح انشا کی بوجھل فلسفیانہ توضیح ہے نہ فاضلِ الٰہیات ملا رموزی کی طرح "اکتا دینے والا" خالص ملّائی وعظ ہے۔ ان کے ہاں محض ایک چیز ہے اور وہ اشیاء کی اور جذبات کی سچی مصوری۔"

اس قسم کے اندازِ تحریر سے یہ شبہ ہونے لگتا ہے کہ صاحبِ مضمون کو تنقید سے زیادہ پاسداری مدِ نظر ہے۔

بحیثیت مجموعی یہ مقالہ نہایت خیال انگیز ہے اور کافی محنت سے لکھا گیا ہے۔ پیرایۂ بیان نہایت دلچسپ ہے اور زبان بھی خاصی صاف ہے کہیں کہیں کچھ لغزشیں بھی ہیں مثلاً ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

"ہماری توجہ کتاب کے نقائص کی طرف مبذول نہیں ہوتی"

"مبذول" دوسرے کی توجہ کے لئے تو ضرور استعمال کرتے ہیں لیکن اپنی توجہ کے لئے یہ لفظ موزوں نہیں ہے۔ یہ اسی طرح پر ہے جیسے کہہ دیں کہ ہم آپ کو کچھ عنایت کرنا چاہتے ہیں۔"

ایک جگہ لکھا ہے "ناچار دوسری دُکان کا دروازہ کھٹکھٹایا" دروازہ مکان کا کھٹکھٹایا جاتا ہے کیونکہ اکثر بند ہوتا ہے۔ دُکان کا دروازہ کھٹکھٹایا نہیں جاتا۔ وہ تو ویسے ہی کھلی ہوتی ہے، جب ہی تو آپ وہاں پر کتابیں دیکھنے جاتے ہیں۔

ہمارے ہاں جو الفاظ بالاتفاق مذکر یا مؤنث ہیں انہیں اُلٹا باندھنا فصاحت کے خلاف ہے۔ مثلاً اس مضمون میں "صنف" کو مذکر اور "انتشار"۔ "وعظ" اور "اجتہاد" کو مؤنث باندھا گیا ہے جو کسی قاعدے یا رواج کے مطابق درست نہیں ہے۔

ہمیں امید ہے کہ اس مضمون سے متأثر ہو کر دیگر اہلِ ذوق بھی اس طرف توجہ فرمائیں گے اور ادب کے اس ضروری شعبے کی ترقی میں ممد و معاون ثابت ہوں گے۔

صلاح الدین احمد

ضرورت

نقد و نظر

آتشِ خاموش

از احسان دانش۔ حجم دو سو صفحے، قیمت ایک روپیہ
ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ دانش مزنگ لاہور

احسان کی شاعری کے بہت سے مجموعے شائع ہوتے ہیں لیکن زیرِنظر مجموعہ ایک خاص انداز کی نظموں پر مشتمل ہے۔ "معروضِ مرتب" میں جنابِ قیر طاہر(؟)، نے لکھاہے کہ اس مجموعے سے اُن نظموں کو خارج کر دیا گیا ہے جن کے برداشت کرنے کے لئے نہ سوسائٹی میں لچک ہے اور نہ موجودہ دور کے تاجرانہ ماحول میں اس صداقت کی گنجائش" لیکن ہمارے خیال میں اس مجموعے کی نظموں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس صداقت کے لئے کافی سے زیادہ گنجائش نکالی گئی ہے۔ پہلے تو نظموں کو غزلوں سے علیحدہ کرتے ہوئے ان کا عام عنوان ہی "ارضِ احمر" رکھا گیا ہے جسے دیکھتے ہی خیال آتا ہے کہ اس کلام میں "خواجہ" کے "خونِ رگِ مزدور" سے "لعلِ ناب" بنانے کا نسخہ درج ہوگا۔ اور اس آتشِ خاموش کی چُپ چاپ وہی "خوفناک خاموشی" ہوگی جس کے متعلق شاعر نے لکھا ہے ؎

"فغانِ با اثر ہے بے زبانی فاقہ مستوں کی
کوئی چپکے سے کہہ دے کان میں سرمایہ داروں کے
ڈرو ان پستیوں میں رہنے والوں کی خموشی سے
کہ پھٹ جاتے ہیں سینے زلزلے سے کوہساروں کے

ان نظموں کے متعلق اسی مجموعے کی ایک نظم "نفیرِ وقت" کا ایک مصرع بالکل صحیح معلوم ہوتا ہے کہ

"جراثیم ان کی ہر موجِ نفس میں ہیں بغاوت کے"

بہرحال ہمیں اس جگہ "آتشِ خاموش" کی روشنی میں احسان کی شاعری کو ایک چلپتی ہوئی نظر سے دیکھنا ہے اس لئے سب سے پہلے اُس کے متعلق چند باتیں کہہ کر اُن کے دلائل اسی کتاب کی نظموں سے مہیا کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ احسان کے موضوعاتِ شعری میں غربت اور مناظرِ قدرت کی کثرت ہے۔ ابتدا میں چونکہ اُس نے اپنی تحریکِ طبعی کا مرکز مناظرِ قدرت کو بنایا تھا۔ اس لئے اب بھی کہ اُس کی ذہنیت زمانے اور مشقِ سخن کے ساتھ ساتھ پختہ تر ہو چکی ہے اُسے اپنے مقررہ موضوع یعنی غربت اور ناداری کے متعلق خیالات کے اظہار کو بھی تحریک اگر ہوتی ہے تو عموماً مناظرِ قدرت ہی سے ہوتی ہے۔ ورنہ وہ عام زندگی میں کسی واقعے کو دیکھتا ہے اور پھر اُس کی نظریں اُسے جھٹ اُس نقطے پر پہنچا دیتی ہیں جہاں سے نادار طبقے کے مصائب ہی اُس کے کلام کا مطمحِ نظر اور اُس کی دلچسپی کا باعث بن کر رہ جاتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے سرمایہ داری اور دولت کی غیر منصفانہ تقسیم کے خلاف ایک مستقبل جہاد شروع کر رکھا ہے۔ اس جہاد کا اظہار اُس کی نظموں کے عنوانات سے کافی حد تک ہو جاتا ہے

"مزدور کی عید" —— "برسات اور مزدور" —— "مزدور کی دیوالی" —— "فقدانِ معاش" —— "امیر ملک کے فقیر باشندے" —— "تیلن اور لیڈی" "کُتّا اور مزدور" —— "مزدور کا چالان" —— "مزدور کے جاہل طبقے سے" —— "کابینٹ اور مزدور" وغیرہ وغیرہ۔

"برسات اور مزدور" میں وہ خالص منظریہ شاعری سے نظم کو شروع کرتا ہے

اُٹھا ہے ابر پھر آئی ہے برسات
بلند و پست پر چھائی ہے برسات
گھٹا کے اُودے اُودے نرم آنچل
درختوں پر جھکے ہیں ہو کے بوجھل

.. ..

چھڑکتی ہے ہوا میں عطر ہر سُو!
نئی بھیگی ہوئی مٹی کی خوشبو
نگاہوں کو اُمیدیں مل رہی ہیں!
دلوں میں چٹکیاں سی مل رہی ہیں

یوں "نئی بھیگی ہوئی مٹی کی خوشبو" کے گہرے مطالعے اور احساس کے ساتھ دلوں میں چلمنوں کے ہلنے کی اچھوتی نزاکت کو بیان کرتا ہوا کہتا ہے کہ یہ سب کیفیات ہر ایک دل کے محسوس کرنے کی نہیں ہیں۔

اسے محسوس کر سکتا ہے شاعر
ترانے اُڑ رہے ہیں بن کے طائر
جوانی ہے پشیمانِ عبادت!
خلاؤں میں ہے اِک شانِ عبادت
ہے آج ایماں کی رفعت غیر محدود
کہ جیسے کوئی بندہ ہے نہ معبود

یہاں تک وہ مکمل طور پر ایک تصور کو بڑھاتا اور نشو و نما دیتا چلا جاتا ہے۔ لیکن اس منظر سے جس میں وہ پرانے انداز کے ساتھ ساتھ اپنے اچھوتے انفرادی رنگ بھی بھرتا جا رہا ہے اچانک پلٹا کھاتا ہے اور وہ بارگراں جو اُس کی ذہنیت پر ایک نہ مٹنے والے نقش کی طرح چھا چکا ہے۔ اس خوشگوار منظر کی پروا نہ کرتے ہوئے اُبھر آتا ہے۔

مگر اس وقت اِک بے چارہ مزدور
سرور و کیف کے عالم سے ہے دور

اور پھر پہلا تمام کیف انگیز منظر روح فرسا خیالات سے آلودہ ہو جاتا ہے اور چونکہ ذہن اب تک ایک خوشگوار کیفیت سے لہرا رہا ہے۔ وہ اس نئی بات کو سن کر گویا ایک جھٹکا سا کھاتا ہے اور اُسے تضاد کی وجہ سے اِس نئی مصائب سے پُر کیفیت کا زیادہ گہرا احساس ہوتا ہے۔ احسان کا یہی طریقہ ہے وہ پہلے آپ کو بالکل ظاہری اور سطحی باتوں میں اُلجھاتا جائے گا۔ لیکن جب اپنے مقصد کی طرف پلٹے گا تو غیر متوقع ہونے کے لحاظ سے بہت مؤثر بیان کی تخلیق کرے گا۔ اور اس کے ساتھ اس کا اخلاص بھی اُس کے فن کا مددگار ہوتا ہے۔ اس کے اخلاص کا اظہار اُس کے بعض مصرعوں کی ساخت ہی سے ہوتا ہے۔ بعض الفاظ کے استعمال ہی سے یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ ان لفظوں کا کہنے والا جو کچھ محسوس کر رہا اور سوچ رہا ہے۔ وہی کچھ کہہ رہا ہے مثلاً ایک نظم "ہسپتال" کو اس طرح شروع کرتا ہے۔

حفیظ جاوید کی علالت سے تھا کچھ ایسا ملال مجھ کو
کہ رُک کے انسانیت کا جذبہ گیا سوئے ہسپتال مجھ کو

اس اخلاص کی بنیاد یہاں تک حقیقت پر ہوتی ہے کہ احسان کی تشبیہات بھی بالکل نئی اور عملی زندگی کے عین مطابق پیدا ہو جاتی ہیں مثلاً "برات" میں کہتا ہے۔

باراتیوں کا سیل ہے یُوں رہگذار میں
جیسے چلت حساب دلِ سُود خوار میں

لیکن اس قدر حقیقت پرست ہونے کے باوجود اُس کے احساس اور تخیل کی نزاکت برقرار رہتی ہے۔ اور بعض دفعہ اُسے سب بے جان اشیاء بھی جاندار نظر آتی ہیں۔

گرم لُو کا زور، گھبرائے ہوئے سے راستے
دُھوپ کی تیزی میں تیورائے ہوئے سے راستے

یُوں اُس کی نظموں میں اُس کے مقاصد کے لحاظ سے ایک یکرنگی ہونے کے باوجود اچھوتا پن اور تنوع پیدا ہو جاتا ہے۔ بعض جگہ اُس کے کلام میں ایک نزاکت پیدا ہوتی ہے۔

نغمہ زن گرمی کی دیوی کا رباب آتشیں
لڑکھڑاتا سا فلک، کروٹ بدلتی سی زمیں

اور بعض جگہ ایک اندھی قوتِ حیات کا اظہار ہوتا ہے۔

نطقِ عالم پر سکوتِ آتشیں چھایا ہوا
مشاطۂ خاور کا تکبر جوش میں آیا ہوا!

اور اس شعر میں دیکھئے۔ زندگی کی دلکشی اور بیزاری کا ایک نفیس امتزاج پیدا کیا ہے۔

کانٹوں کے دوش پر ہے گُلِ جانفزا کا رتھ
ظلمت کے بیل کھینچ رہے ہیں ضیا کا رتھ

مردانہ اندھی قوتِ حیات کا اظہار اس ٹکڑے میں دیکھئے جس کا عنوان ہے۔ "میری موسیقی پسندی" ہے

تری یہ بزمِ موسیقی مرے کس کام کی مطرب
مری نظروں میں کچھ رتبہ نہیں ان سرد تانوں کا
میں جاں دیتا ہوں فوجی بینڈ کے خونی ترانوں پر
اِدھر لہرا بجا، خوں اُس طرف کھولا جوانوں کا

ہمیں اس بات پر اعتراض ہے کہ تیسرے مصرعے میں شاعر کو بینڈ کا ترانہ خونی کیوں محسوس ہوتا ہے۔ شاید وہ فوجی سپرٹ کو بیدار کر کے ناانصافی کا انتقام لینے پر تُلا ہوا ہے۔ لیکن ہمارے خیال میں فوجی تیاری جارحانہ اقدام کے لئے نہیں بلکہ ایسے اقدامات کی مدافعت کے لئے ہونی چاہئے۔ اس لئے "خونی" کی بجائے اس جگہ "جنگی" ہوتا تو بہتر تھا۔ مگر اس انتہا پسندی کی وجہ اُس

کا وہ جوش اور تعصب ہے جو ایک مظلوم کے دل میں سمندر کے پیچ و تاب کی مانند پیدا ہو جاتا ہے۔ اُسے موجوں کی جھاگ سے یہ ڈر نہیں کہ کہیں شاید اُس کی قوت فضول ضائع ہو جائے گی، وہ کف آلود دہن سے اپنی بات کہتا ہے۔

اللہ یہ نیرنگیٔ فطرت کیا ہے !
تقسیمِ زر و نظامِ دولت کیا ہے ؟
منعم کہ ہے جس پر تری رحمت کی نظر
اُس کو تری رحمت کی ضرورت کیا ہے

اور یہ انداز اُسے ہر موجودہ نظام سے باغی بنا دیتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ ایک "بارات" کو بھی "جنازہ" سمجھتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ مقامِ مسرت نہیں کہ

دوشیزگی کی لاش لئے جا رہے ہیں لوگ

اور اُس کی یہ بغاوت ایک ایسے خواب کی صورت میں نشو و نما پاتی ہے (باغی کا خواب) جو ہمارے خیال میں اُردو زبان کی سب سے زیادہ پُرجوش اور تخریب آلود نظم ہے۔ اس نظم کے جنسی پہلو پر زیادہ بحث اس مقام پر نہیں کی جا سکتی۔ اس لئے اتنا ہی جتا دینا کافی ہوگا۔ کہ یہ نظم ایک ایسے اذیت پرست کا تخیل ہے جو موجودہ تہذیب و تمدن کی لازمی تخلیق ہے۔ اس نظم میں

ع بج رہے ہیں راستے ٹاپوں سے تاشوں کی طرح

اور ہر شخص اور نظام کے خلاف ایک اُبلتا ہوا جذبۂ عمل ہے لیکن افسوس کہ "خواب آلود" ہے۔ اگرچہ اس میں

خون کے چھینٹوں سے ہر رستے میں گلکاری سی ہے،
قصرِ استبداد ڈھا دینے کی تیاری سی ہے،
اور عام ہیں تیغیں بھی، بندوقیں بھی اور پستول بھی،
جا بجا ہے مارنے مرنے کی خونی گفتگو،
سرخ سایوں کی طرح پھیلا ہے رستوں میں لہو
پھر رہے ہیں نوجوان خونی رجز گاتے ہوئے
زخمیوں کو روندتے مردوں کو ٹھکراتے ہوئے
آ رہے ہیں لاٹھیاں تولے کسانوں کے ہجوم
شہر کے ناکوں پہ ہیں کڑیل جوانوں کے ہجوم

اور اس افراتفری میں

برہمن مندر میں ٹکڑے، شیخ مسجد میں حلال
خون کی ہولی ہے ندروں پر برستا ہے گلال
دیش ریشہ مالکِ اخبار اسپتے کی طرح
جا بجا مقتول ایڈیٹر ضمیمے کی طرح
فاقہ مستوں کے گنڈاسے ہیں امیروں کے گلے
لوٹتی ہیں بے سری لاشیں مکانوں کے تلے
انقلابی سرخ پرچم اُڑ رہے ہیں شہر میں
لیڈروں کے سر لئے پھرتے ہیں کتے شہر میں

یہ سب کیفیتِ خوابی اس اندازِ نظر کا نتیجہ ہے کہ شاعر کی سمجھ میں موجودہ نظام کے قرار کے لئے کوئی طرزِ استدلال نہیں آتا، اُس کی عقل حیراں ہے: عجب نظمِ جہاں آباد ہے

ایک انساں صید ہے اور دوسرا صیاد ہے

اپنے حقوق طلب کرنا کوئی گناہ نہیں، ناانصافی کو دور کرنا کوئی جرم نہیں غیر مناسب حالات کے خلاف پُرزور احتجاج ہر شخص کا فرض ہے اور شاعر ہمیں اس راستے پر گامزن ہونے کے لئے پوری طرح آمادہ نظر آتا ہے۔

وہ دوا دو نگا تمدن کی علالت کے لئے
شافیٔ مطلق کو مجبوراً شفا دینی پڑے !

اس تمام خون خرابے کے بعد "دو آتشہ" کے عنوان کے تحت میں غزلیات بھی ہیں۔ جن میں سے احسان کے اندازِ تغزل کا اندازہ کرنے کو چند شعر ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

اب تو کچھ ایسا رہینِ دور اندیشی ہے دل
مسکراتا ہے اگر کوئی تو تھراتا ہوں میں

اس شعر میں "رہینِ دور اندیشی" کی ترکیب اچھوتی ہونے کے ساتھ ہی ایک اور لحاظ سے بھی قابلِ غور ہے اور وہ یہ کہ شاعر کا ذہن اقتصادیات میں اس قدر اُلجھا ہوا ہے کہ وہ اپنے تغزل میں بھی "اقتصادی محاورہ" ہی استعمال کرتا ہے۔

یہ پچھلی رات، یہ خاموشیاں، یہ ڈوبتے تارے
نگاہِ یاس بہکی پھر رہی ہے التجا ہو کر

اور ایک شعر دیکھئے !

نسیمِ صبح نے آ کر وہ راگنی چھیڑی
ہر ایک پھول نے کانٹے کو جھک کے پیار کیا

ایک اور شعر دیکھئے۔ بے رنگ، ساکن تمناؤں کو کیا چلتی پھرتی صورت دے دی ہے ؎

تمنائیں کنیزوں کی طرح خدمت میں رہتی ہیں
مرے دل میں کسی کا رات بھر دربار ہوتا ہے

یہاں تک تو خوبیوں ہی کا بیان تھا۔ اب ایک دو خامیوں پر بھی نظر ڈال لی جائے تو اچھا ہو،

بعض الفاظ کی غیر ضروری جمع۔

۱۔ چھما چھم کی صدائیں آرہی ہیں۔
۲۔ راس آتا تھا اُنہیں عیاریوں کا کاروبار
۳۔ خنکیاں نظریں اُٹھاتی تھیں، تپش بیمار تھی
۴۔ روح کی بے چینیاں بڑھ کر سکوں ہونے کو تھیں
۵۔ کیسا حقیقتوں پہ ستم ڈھا رہے ہیں لوگ
۶۔ ابتری پھیلی ہوئی، سفاکیوں کا زور ہے۔

حروف کا غیر مناسب حد تک دبنا۔

۱۔ آتی ہے خونِ تیلے سے تجھے بوئے گلاب
۲۔ گھگی بندھ جاتی ہے تاروں کی فرازِ چرخ پر
۳۔ سایہ ہے کھیتی پہ تیری ابرِ آتش بار کا

تعقید کی ایک مثال

قہقہے باچھوں میں بیکل ہیں تری او بدنصیب!

ایک مثال لفظ کی غلط صورت کے استعمال کی:۔

دست و پا میں اضطرابی، روح میں برقِ عمل۔

اضطراب کی بجائے اضطرابی کا لفظ استعمال کرنا ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔ یہ غلطی ایک سے زیادہ جگہ پر دہرائی گئی ہے۔

کتابت اور طباعت کے لحاظ سے یہ کتاب خاصی ہے لیکن ہمیں توقع ہے کہ احسان صاحب دوسرے ایڈیشن میں اس کا زیادہ خیال رکھیں گے ہمیں اُمید ہے کہ اپنے جوش و خروش، بے ساختگی اور صاف گوئی کے لحاظ سے بہت جلد اس کتاب کے دوسرے ایڈیشن کی نوبت آجائے گی۔

دِلّی کی دوسو برس کی تاریخ

از سید حسن، بی ایم اے ایل ایل بی، ناشرین۔ مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی۔ حجم ۴۸ صفحات۔ کتابی سائز۔ قیمت درج نہیں ہے۔

"آب حیات" میں آزاد مرحوم میر تقی کے بیان میں لکھتے ہیں کہ کس طرح جب میر صاحب نے لکھنؤ پہنچ کر ایک اجنبی کی حیثیت سے کسی مشاعرے میں شرکت کی تو کچھ لوگوں نے اُن کے لباس اور حُلیے کو دیکھ کر اُنہیں چھیڑنے کو پوچھا کہ آپ کہاں سے وارد ہوئے، اس پر میر صاحب نے فی البدیہہ جواب دیا ؎

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو
ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے
دلّی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب
رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
اُس کو فلک نے لُوٹ کے ویران کر دیا
ہم رہنے والے ہیں اُسی اُجڑے دیار کے

ان اشعار سے جہاں میر صاحب کی شخصیت نظروں کے سامنے آجاتی ہے۔ وہاں دلّی کی انفرادیت کا نقش بھی کچھ کم گہرا نہیں ہوتا۔ اور بات بھی صحیح ہے کہ اگر نگاہِ غور سے دیکھا جائے تو شہروں کی بھی انسانوں ہی کی طرح اپنی اپنی "شخصیت" ہے جس کی نشو و نما میں کسی مقام کی جغرافیائی، تاریخی اور اقتصادی حالت کو بہت دخل ہوتا ہے۔ ہندوستان میں اور ہندوستان سے باہر آج کلکتہ اور بمبئی کا طوطی بول رہا ہے۔ اور یہ شہر سوٹ پہنے اور دھوتی کے پلّو کو کمر میں اٹکائے اکڑے پھر رہے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود دلّی کی انوکھی شان اب بھی قائم ہے البتہ ایک نئے رنگ میں۔ دلّی ہندوستان کی جان ہے۔ اور اس کی قدامت، اس کے نت نئے جنم اور اس کا واقعاتی ماحول ایسا نہیں کہ جب تک ہندوستان کرۂ ارضی پر قائم ہے، اس کی رنگینی میں فرق آئے۔ زیرِ نظر مقالے میں سید صاحب نے ایک مخصوص اور محدود دلّی کو اپنا موضوعِ تحقیق بنایا ہے۔ اس میں تیمور کے حملے سے قبل کے دو سو سال کی دلّی کا جائزہ لیا گیا ہے اور صاحبِ مقالہ کے لفظوں میں "دہلی کے نابود شدہ اور موجودہ آثار سے بحث کی گئی ہے اور ان کا اسلامی اور ہندی فنون سے ربط اور ارتقائے فنون میں ان کی جگہ اور قدر و قیمت دکھلانے کی کوشش کی گئی ہے"۔۔۔۔ سید صاحب کی کوشش ہماری نظروں میں مستحسن ہے۔ خاص کر اس صورت میں کہ ٹھوس علمی تحقیق کی طرف ہمارے ملک میں عموماً اور اُردو لکھنے اور پڑھنے والوں میں خصوصاً بہت کم توجہ دی جاتی ہے۔ اُمید ہے کہ سید صاحب نے جس مفصّل کتاب کا ذکر کیا ہے اس کے شائع کرنے کا جلد ہی انتظام کیا جائے گا۔ تاکہ دلّی کی دو سو برس کی تاریخ کے متعلق اس دلچسپ مقالے کا مواد پھیل کر پڑھنے والوں کے لئے اور بھی دلچسپی مہیا ہو سکے اور سید صاحب کے ذوقِ تحقیق کی پوری پوری داد دی جا سکے۔

غالبیات

دلّی ہی وہ شہر ہے جہاں اُس شخص کی نشو و نما ہوئی جس کے کلام نے نہ صرف اُردو شاعری پر بے حد اثر کیا بلکہ اُردو میں دلچسپی لینے والے صاحبوں کو تنقیدِ شعری کی طرف مائل کرنے میں بھی بہت کام کیا۔ غالب کے متعلق اُردو میں اگرچہ ابھی خاطر خواہ لٹریچر پیدا نہیں ہوا۔ لیکن اس سلسلے میں جو کچھ کام اب تک ہو چکا ہے وہ بہت اُمید افزا ہے۔

سبدِ چین اور ذکرِ غالب

از مالک رام ایم اے۔
ملنے کا پتہ:- مکتبہ جامعہ دہلی

سبدِ چین میں مرزا غالب کا وہ نایاب فارسی کلام ہے جو کلیات فارسی میں درج نہیں ہو سکا۔ یہ کلام غالب نے اپنی موت سے دو سال پیشتر کتابی صورت میں شائع کر دیا تھا۔ لیکن وہ کتاب اب نایاب تھی۔ جناب مالک رام ایم اے نے اس نایاب کتاب کا ایک نسخہ نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا محمد حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی کے کتب خانہ سے دستیاب کر کے اس کو مکتبہ جامعہ کے زیرِ اہتمام از سرِ نو شائع کیا ہے اور ساتھ ہی وہ کلام فارسی بھی یکجا کر دیا ہے "جو مختلف کتابوں میں منتشر پڑا تھا" جن حضرات کے پاس غالب کی کلیات فارسی میں موجود ہو انہیں غالب کا کلام مکمل صورت میں اپنے پاس رکھنے کے لئے اس نسخے کو خریدنا ضروری ہے۔ اس مجموعے کے پہلے ایڈیشن میں ترتیب کا کوئی خاص لحاظ نہیں رکھا گیا تھا۔ لیکن اب مرتّب نے اس نقص کو دور کر کے قصائد، ترکیب بند، ترجیع بند، مثنوی، قطعات، نظم، غزلیات، متفرق اشعار اور رباعیات کے عنوانات کے تحت میں تمام کلام کو سلیقے سے ترتیب دے دیا ہے تاکہ کلیات کے بعد اس سے آسانی کے ساتھ مدد لی جا سکے۔ کتاب کی خوبی میں غالب کی تصویر نے بھی ایک ممتاز اضافہ کیا ہے۔ اس مجموعے کی قیمت چھ آنے ہے۔

"ذکرِ غالب" اُردو کے سب سے بڑے شاعر کی مختصر لیکن جامع سوانح عمری ہے۔ اس میں پوری طرح دادِ تحقیق دینے کے بعد جناب مؤلف نے غالب کے متعلق نہ صرف پہلے موجودہ حالات کو باقاعدہ لکھ دیا ہے۔ بلکہ میرزا کی زندگی کے بعض پہلوؤں پر نئے مواد سے بھی روشنی ڈالی ہے۔ شروع میں ڈاکٹر عابد حسین صاحب کے قلم سے ایک مختصر سا دیباچہ بھی درج ہے۔ جس میں وہ لکھتے ہیں کہ "ذکرِ غالب" اُس تمام تحقیقات کا نچوڑ ہے جو اب تک غالب کی سیرت کے متعلق ہو چکی ہے۔ اور اس کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں واقعات بہ حساب سنین ترتیب دیئے گئے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ اس کے علاوہ مالک رام صاحب نے بڑی محنت اور کاوش سے بہت سی نئی معلومات بھی حاصل کی ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ میرزا صاحب کی ایک نئی تصویر اور اُن کے آگرے والے مکان کے فوٹو نے کتاب کی دلچسپی میں اور بھی اضافہ کر دیا ہے"

اس کے علاوہ آخر میں "ہمارے ماخذ" کے عنوان کے تحت غالب کے متعلق لٹریچر کی فہرست بھی دے دی ہے۔ اگر اس کتاب کے ساتھ انگریزی تحقیقی کتابوں کی طرح انڈکس کا اضافہ بھی کر دیا جاتا تو بہت اچھا ہوتا اب بھی یہ کتاب مداحینِ غالب کے لئے ایک قیمتی سرمایہ ہے۔ اس کی قیمت آٹھ آنے ہے۔

نادر خطوطِ غالب

مرتبہ سید محمد اسمٰعیل صاحب رسا ہمدانی، قیمت آٹھ آنے ملنے کا پتہ کاشانۂ ادب گھسیاری منڈی لکھنؤ

اس مجموعے میں جناب رسا ہمدانی نے مرزا غالب کے ستائیس غیر مطبوعہ خطوط کو یکجا کیا ہے۔ شروع میں پچیس صفحوں کا ایک مقدمہ بھی درج ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ خطوط غالب کے اُن تین شاگردوں کے نام لکھے گئے تھے جو صوبۂ بہار کے رہنے والے تھے۔ یعنی جناب کرامت ہمدانی، جناب صفیر بلگرامی اور جناب صوفی منیری بہاری۔ غالب نظم پر اثر انداز ہونے کے علاوہ سادہ اُردو نثر کے بھی اولین رہنماؤں میں سے ہیں اور اس بات کے شاہد اُردوئے معلّٰی اور عودِ ہندی کے مجموعے ہیں ان ستائیس غیر مطبوعہ خطوط کو اسی سلسلے کی ایک اور کڑی سمجھنا چاہیئے۔ ان خطوط میں غالب کے دوسرے خطوط کی تمام خوبیاں جلوہ گر ہیں۔ اور میرزا کا بے پناہ مذاق اُسی طرح ان خطوط کو زعفران زار بنائے ہوئے ہے جیسے ہم ان کے پہلے خطوط سے عادی بن چکے ہیں ایک شگفتگی ہے جو ہر خط میں اُن کی قنوطیت کے باوجود طاری و ساری ہے۔ ایک تشبیہ دیکھئے، لکھتے ہیں۔

"تمہارے اشعار کی کاپی دیکھی۔ ہائے کیا بُری کاپی ہے اپنے اشعار کی اور اس کاپی کی مثال جب تم پر کھلتی کہ تم یہاں ہوتے اور بیگماتِ قلعہ کو پھرتے چلتے دیکھتے۔ صورت ماہ دو ہفتہ کی سی، اور کپڑے میلے، پائنچے لیرلیر۔ جوتی ٹوٹی۔ یہ مبالغہ نہیں بلکہ واقعہ ہے۔ تمہاری مثنوی ایک معشوق خوبرو ہے مگر بدلباس ہے"

ایک جگہ لفظی تحقیق سے کیا کیا باتیں نکلتی ہیں:-

"چلپی کے متعلق جو تم نے دریافت کیا ہے تو یہ لفظ صحیح

ہے، غلط نہیں۔ ابھی ابھی میں نے عبدالرزاق شاکر کا قصیدہ دیکھا ہے اور اُن کا مطلع درست کیا ہے، وہ مطلع یہ ہے ؎

ہے تمہارا آفتاب آفتابِ آسماں + دیکھ لو اپنی ہتھیلی میں حبابِ آسماں

دیکھو اس میں "ہتھیلی" ہے "سیفی" نہیں۔

اور یہ لکھ کر نیچے لکھتے ہیں: "نجات کا طالب ——— غالب!

ظرافت اور "اب عناصر میں اعتدال کہاں" کا رنگ بھی قائم ہے "میری حالت نہ پوچھو، اب اگرچہ تندرست ہوں لیکن ناتواں اور سست ہوں حواس کھو بیٹھا، حافظے کو رو بیٹھا۔ اگر اُٹھتا ہوں تو اتنی دیر میں اُٹھتا ہوں جتنی دیر میں ایک قدِ آدم دیوار اُٹھے" ——— ممکن ہے یہاں تشبیہ کے ذوق نے حقیقت سے کسی حد تک اغماض کرنے پر مجبور کر دیا ہو۔ بہرحال یہ خطوط پہلے خطوں کی طرح غالب کی شخصیت کا آئینہ ہیں۔

افسانۂ پدمنی از محمد احتشام الدین دہلوی ایم اے (علیگ) کتابی سائز حجم ڈیڑھ سو صفحے۔ ملنے کا پتہ: کتب خانہ علم و ادب دہلی

آج سے قریباً دس سال پیشتر راقم الحروف کو ماہنامہ "بہارستان" کے چند پرانے نمبروں میں ایک قسط وار مضمون کے پڑھنے کا موقعہ ملا تھا، یہ مضمون علاؤ الدین خلجی اور ہندوستان کی مشہور رانی پدمنی سے متعلق تھا۔ دریافت پر معلوم ہوا کہ یہ مضمون پوری صورت میں شائع نہیں ہوا، جا افسوس اس وقت ہوا وہ اسی موضوع کو کتابی صورت میں دیکھنے سے جاتا رہا خصوصاً کہ صاحبِ مضمون اور صاحبِ کتاب ایک ہی شخصیت ہے۔

ہندوستان میں اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ وہ مسائل جن سے ہندو مسلم تنازعے کا ذرا سا بھی احتمال ہو تحقیق کے ذریعے پبلک کے پیش نظر کئے جائیں۔ لیکن اس قسم کی کوششوں میں حق و صداقت سے علیحدگی کسی صورت میں نہیں ہونی چاہئے خواہ صداقت تلخ ہی کیوں نہ ہو جائے۔ پدمنی کا بیان نہ صرف اپنی رنگینی کی وجہ سے قابلِ توجہ ہے بلکہ اس واقعہ پر جس قدر لٹریچر اردو، ہندی گجراتی، مرہٹی بنگالی، فارسی اور دوسری زبانوں میں پیدا ہو چکا ہے وہ بھی اس امر کا تقاضا کرتا ہے کہ شعر و ادب کے آئندہ رومان نوازوں کے لئے اس دل نشیں بیان کی اصلیت پر غور کیا جائے۔

مولوی احتشام الدین صاحب نے اس کتاب میں اصلیت معلوم کرنے کی بہت شاندار کوشش کی ہے اور ہم اُن کے ذوقِ تحقیق کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اُنہوں نے تمام اُن مؤرخین کا جائزہ لیا ہے۔ جنہوں نے پدمنی کے واقعہ کا کم یا زیادہ ذکر کیا ہے۔ اس کے علاوہ ادب سے بھی دلائل مہیا کئے ہیں۔ اور نتیجہ یہ نکالا ہے کہ پدمنی کے رومان سے علاؤ الدین خلجی کو کوئی تعلق نہیں بلکہ . . . . . لیکن یہ سب باتیں بذاتِ خود مفصّل طور پر پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ اُمید ہے کہ اردو پبلک اس قیمتی کتاب کی قدر کرے گی۔

"م"

L. NO. 2482. REGD. L. NO. 2482.

Printed & Published by Salah-ud-din Ahmad at the Gilani Press, Hospital Road, Lahore. The Title & pictures printed at the